اصغر گونڈوی

آثار و افکار

مقالہ نگار:
محمد اقبال احمد خاں

نگرانِ کار:
ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ
پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، جامعہ سندھ

مشمولات

صفحہ

ترتیب (ابواب کے مندرجات کی تفصیل) : ۳

مقدمہ : (تمہید، مقالے کا تعارف، مآخذ اور تشکر) : ۶

باب اول : سوانح حیات ۳۶

باب دوم : نقوش و آثار ۱۷۱

باب سوم : شخصیت ـــ عہد بہ عہد ۲۲۷

باب چہارم : نظریۂ فن (۱) : نثر ۳۱۲

باب پنجم : نظریۂ فن (۲) : شعر و غزل ۳۸۰

باب ششم : شخصیت اور شاعری ۴۲۵

باب ہفتم : تقابلی مطالعہ ۵۳۹

باب ہشتم : شاعری میں اصغر کا مقام و مرتبہ ۶۲۳

باب نہم : حاصل مطالعہ ـــ اصغر ایک نظر ۶۹۳

ضمیمہ اول : اردو شاعری کی ذہنی تاریخ از : اصغر گونڈوی ۷۰۲

ضمیمہ دوم : اردو کی نشوونما از : اصغر گونڈوی ۷۲۱

کتابیات : ۷۳۰

ترتیب

صفحہ

مقدمہ (تمہید، مقالے کا تعارف، مآخذ اور تشکر) : ۶

باب اوّل : سوانح حیات

۱- نام و نسب ۳۸
۲- تعلیم و تربیت ۳۹
۳- ملازمت و مشاغل ۶۲
۴- ازواج و اولاد ۱۰۸
۵- مرض الموت اور وفات ۱۶۴
۶- مراسم تدفین اور مزار ۱۶۷

باب دوم : نقوش و آثار

۱- شعرگوئی ۱۷۳
۲- آثار نظم ۱۹۰
۳- آثار نثر ۲۱۹

باب سوم : شخصیت — عہد بہ عہد

۱- عقائد و افکار ۲۳۹
۲- دور رندی و سرشاری ۲۷۳
۳- توبہ ۲۷۶
۴- بیعت ۲۸۲
۵- حلیہ و وضع و قطع ۲۹۷
۶- امثر و جگر ۳۰۳

باب چہارم : نظریۂ فن (۱) : نثر

۱- اردو زبان کے متعلق اصغر کے نظریات ۳۱۷

۲- اصغر کا نظریۂ نثر ۳۲۱

۳- اصغر کی نثر نگاری ۳۲۶

۴- اصغر کا نظریۂ تنقید ۳۳۲

۵- اصغر بحیثیت نقاد ۳۵۶

۶- خلاصۃ البحث ۳۷۸

باب پنجم : نظریۂ فن (۲) : شعر و غزل

۱- تاثیر و اثر انگیزی ۳۸۳

۲- ادب میں صالحیت ۳۸۶

۳- نظم و نثر کا بنیادی فرق ۳۹۰

۴- اصغر کا نظریۂ غزل ۴۰۰

۵- موضوعات شعری ۴۰۳

باب ششم : شخصیت اور شاعری

۱- شخصیت اور شاعری کا ربط ۴۲۷

۲- اصغر کی شخصیت کے بنیادی خدوخال ۴۳۹

۳- شاعری میں شخصیت کی جلوہ گری ۴۴۸

۴- اسلوب و انداز ۴۸۹

باب ہفتم : تقابلی مطالعہ

۱- اصغر اور درد ۵۳۱

۲- اصغر اور غالب ۵۵۵

۳- اصغر اور مومن ۵۵۶

۴- اصغر اور اقبال ۵۵۹

۵- اصغر اور حسرت ۵۶۹

۶- اصغر اور فانی ۵۷۵

۷- اصغر اور یگانہ ۵۹۳

۸- اصغر اور جگر ۶۰۳

باب ہشتم : شاعری میں اصغر کا مقام و مرتبہ

۱- ناقدین کے اعتراضات پر محاکمہ ۶۲۶

۲- ستایشی آرا کا تنقیدی جائزہ ۶۷۳

۳- اصغر کی انفرادیت ۶۸۷

۴- شاعری میں اصغر کا مقام و مرتبہ ۶۹۲

باب دہم : حاصل مطالعہ ــ اصغر بہک منظر ۶۹۳

ضمیمہ اوّل : اردو شاعری کی ذھنی تاریخ از : اصغر گونڈوی ۷۰۲

ضمیمہ دوم : اردو کی نشوو نما از : اصغر گونڈوی ۷۲۱

کتابیات : ۷۳۰

مقدّمہ

تمہید ، مقالے کا تعارف ، مآخذ و تشکر

قوم بظاہر منتشر اور بے ربط افراد کا مجموعہ لیکن حقیقتاً ایک مکمل وحدت ہے - انفرادی اعمال و افکار سے ایک اجتماعی سرمایہ وجود میں آتا ہے جسے " قومی میراث " سے تعبیر کیا جاتا ہے - افراد کے کارنامے " قومی میراث " میں اضافے کا سبب اور ان کی زندگیوں کے نشیب و فراز آئندہ نسلوں کے لیے سرمایۂ عبرت و بصیرت بنتے ہیں - وہ " قومی روایات " کے امین و محافظ ہیں اور انہیں آگے بڑھاتے اور ماضی کو حال و مستقبل میں منعکس کرتے ہوئے، قوم کی شاہراہ حیات میں روشنی و نور کا سامان بہم پہنچاتے ہیں -

ایسے بزرگوں کے کارناموں کو زندہ کرنے ہی میں قومی زندگی و ترقی کا راز مضمر ہے لیکن بدقسمتی سے ہم میں اسلاف کے کارناموں کو زندہ و قائم رکھنے کا وہ شغف و انہماک نہیں رہا، جو کبھی ہمارے لیے وسیلۂ حیات تھا - اسی لحاظ سے اب اردو ادب میں ایسے اشخاص کی زندگیوں کے بھرپور جائزے کی ضرورت ہے جنھوں نے قومی میراث کی تشکیل و تعمیر میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں - میری نظر میں اصغر گونڈوی ایسے ہی بزرگوں میں ہیں جنھوں نے بڑی خاموشی سے " قومی ورثہ " کے استحکام و بقا میں نمایاں حصہ لیا --- لیکن قوم ان کی جامع شخصیت کے اس رخ سے آگاہ نہ ہو سکی -

...

شاعر یا ادیب خلاء میں پروان نہیں چڑھتا - انسانوں کا جو ہجوم اس کے گرد ہوتا ہے، اس کے بہاؤ کے ساتھ کبھی تو وہ خود بہنے لگتا ہے لیکن کبھی چٹان کی طرح اس کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے - اس طرح شاعر یا ادیب کی مثال اس چٹان کی سی ہوتی ہے جس پر بہاؤ کی لہروں کے ہلکے گہرے نشان بھی ہوتے ہیں ---- جسے " اجتماعی ذہنیت " یا " روح عصر " کہا جاتا ہے اور بہاؤ کو روکے رکھنے کی مرئی اور محسوس اور روحی قوت بھی - اسی کا نام اس کی انفرادیت ہے -

اصغر کی شخصیت پر " اسلامی ہند ایرانی تہذیب " کا نقش اور چھاپ تھی -

جس کے بنیادی اقدار مساوات، رواداری اور انسان دوستی تھے، جو لازمہ تھا اسلامی شریعت اور اسلامی تصوف کی تعلیمات کا ـــــ اور شعر و شاعری، تہذیب و شائستگی، رومانیت و نفاست کہ یہ ہندو ایران، خصوصاً تہذیب لکھنؤ کی دین تھی ۔

احیاء ملت کی کوششوں میں ایک طرف خانوادہ "ولی اللہی کی خالص دینی تحریک ـــ تحریک مجاہدین و تحریک دیوبند کی شکل میں نمودار ہوئی دوسری طرف مغرب سے متاثر ہو کر علی گڑھ تحریک نے جنم لیا۔ ان دو مختلف رجحانات میں اصغر کا رجحان دلدادگان اسلام و مشرقیت ـــ یعنی : شبلی، اکبر اور اقبال کی طرف تھا کہ ان کے یہاں مشرق کی روایت اور مغرب کی جدّت کا بے حد حسین امتزاج تھا، گو اس امتزاج میں رنگ غالب اسلامی مشرقیت ہی کا تھا ۔

...

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے ۔ نظریہ "پاکستان کو ایک زندہ معاشرے میں متشکل کرنا سیاست دانوں سے زیادہ ان بزرگوں کا کام ہے جو خار زار سیاست سے دامن بچائے ہوئے نظریہ "پاکستان کے جیتے جاگتے پیکر ہوں۔ اس نظریے کی بنیاد اسلامی عقائد و اصول پر ہے ۔ ایسی مملکت میں ان افراد کے سوانح حیات اور کارناموں کی اہمیت بہت زیادہ ہو جاتی ہے جنہوں نے اسلامی شعائر کو اپنی زندگیوں میں رچا بسا کر اپنے گرد تقدس و پاکیزگی کی ایک فضا قائم کی ـــ اردو شعراء میں اقبال کے علاوہ اصغر ہی واحد شخص ہیں جنہوں نے اپنی اسلامی اور صوفیانہ شاعری کے ذریعے قومی کردار کی پاکیزہ تشکیل میں حصہ لیا ـــ اور اب، جبکہ پاکیزگی و تقدس کا وہ حصار روز بروز کمزور اور آہستہ آہستہ منہدم ہوتا جا رہا ہے، ان کی شاعری کو پہلے سے زیادہ پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے کی ضرورت ہے ۔

...

ادب میں حالی کی " بیروی مغربی " کے خلاف جو ردّعمل ہوا اور جس نے بعد میں ایک مستقل تحریک کی شکل اختیار کر لی اس کا نقیب و امام لکھنؤ کا "اردھ پنچ " تھا ـــ لیکن اسی لکھنؤ میں حالی کی آواز پر لبیک کہنے والے بھی پیدا ہو گئے ۔ اگرچہ پورے طور پر وہ " پیروی مغربی " نہ کر سکے، لیکن دائرہ ادبیہ اور انجمن معیار کی کوششوں نے " لکھنؤ کی غزل " کے جسم سے سوقیت، ابتذال، سطحیت اور بے کیفی کے بدنما داغ دھو ڈالنے میں بڑا کام کیا ـــ آخر " دبستان لکھنؤ " میں زبان کی تراش خراش اور نوک پلک کے ساتھ ساتھ اثر آفرینی کا رجحان بھی پیدا ہوا ـــ ان تمام تہذیبی، ثقافتی اور ادبی تحریکات و رجحانات کا اثر، اصغر پر پڑنا ضروری تھا ۔

...

بیسویں صدی کے ابتدائی تیس سال اردو غزل کے لیے انتہائی سخت تھے ۔ اس پر جو جو حملے ہوئے ، ارباب علم سے پوشیدہ نہیں ۔ ان " " فرعون " سے غزل کو باہر نکالنے اور اس میں خیالوں بھرنے اور نیا بانکپن ، نئی توانائی اور نئی رعنائی پیدا کرنے میں جن بزرگوں نے اپنا خون جگر صرف کیا ، ان میں حسرت اور فانی کے ساتھ اصغر بھی تھے ۔ جگر اور فراق کا تعلق بھی اگرچہ اسی گروہ سے ہے لیکن ان کا شمار حسرت ، فانی اور اصغر کے چھوٹوں میں ہے ۔ ان دونوں خوردوں نے انہیں بزرگوں کی ہموار کی ہوئی راہ پر اپنے رہوار شاعری کو آگے بڑھایا ۔

ان اصحاب ثلاثہ میں سے فانی پر جناب مغنی تبسّم نے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں پی ایچ ڈی کا مقالہ پیش کیا ہے ۔ فانی ہی پر لکھنؤ یونیورسٹی میں جناب محمد یوسف صدیقی پی ایچ ڈی کا کام کر رہے ہیں ۔ حسرت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اب ان پر نورالعین صاحب لاری گورکھپور یونیورسٹی میں اور افسر قریشی صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پی ایچ ڈی کی سطح کا کام کر رہے ہیں ۔ جگر پر ڈاکٹر محمد اسلام کو لکھنؤ یونیورسٹی سے اور ڈاکٹر احمر رفاعی کو سندھ یونیورسٹی ، حیدرآباد سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہو چکی ہے ـــــ لیکن اصغر گونڈوی کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی ، یہ سعادت میرے حصے میں تھی ـــــ ،

اسے میں اپنی خوش قسمت خیال کرتا ہوں کہ مجھے اصغر گونڈوی پر تحقیقی کام کی اجازت ملی جن سے مجھے بوجوہ ایک گونہ تعلق خاطر رہا ہے ، اسکی تفصیل آگے آتی ہے :

میرا تعلق برّصغیر ہند کے اسی علاقے سے ہے جہاں اصغر کی زندگی اوّل سے آخر تک بسر ہوئی ۔ ان کی عمر کے آخری نو ، دس سال الہ آباد میں اس طرح گزرے کہ وہ وہیں آسودۂ خاک ہوگئے ـــــ الہ آباد میرا وطن ثانی تھا ! اصغر کی قیام گاہ رستم کی منڈی کٹرہ اور (بلیڈیر پریس الہ آباد) کو اگر مرکز مان لیا جائے تو تین میل کے حدود کا تمام علاقہ جو میرے اور اصغر ، میرے اساتذہ اور مشفق بزرگوں یا دوسرے لفظوں میں اصغر کے احباب اور مخالفین کی آماجگاہ اور میدان کار رہا ہے ، آج بھی مقالہ نگار کی نظر میں زندہ و تازہ ہے ۔

اصغر کے احباب اور مخالفین میں سے بیشتر اصحاب سے میرا کسی نہ کسی طرح کا تعلق ضرور رہا ہے ۔ یہ متعلقہ حضرات یا تو والد مرحوم مولوی نیاز محمد خاں صاحب کے قریبی دوستوں میں تھے یا میرے شفیق بزرگ اور استاد تھے ۔ مثلاً یونیورسٹی کے اساتذہ میں مولانا ناصر ، ڈاکٹر زبید احمد ، پروفیسر نعیم الرحمن ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ، فراق گورکھپوری ،

پنڈت شری کرشن ، پروفیسر ایس سی دیب اور ڈاکٹر تارا چند ، والد مرحوم کے دوست تھے اور ان میں سے بیشتر اصحاب یونیورسٹی کے تعلیمی دوران میں میرے استاد بھی تھے -

پروفیسر سید ضامن علی (مخالف اصغر) سے والد صاحب کے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے ، اگرچہ مجھے ان کی شاگردی کا شرف حاصل نہیں رہا ، لیکن ان کے حقیقی بھانجے میرے هم جماعت تھے ، ان دونوں رشتوں سے میں خوردانہ اور نیازمندانہ ان کی خدمت میں حاضر هوتا تھا - گورنمنٹ کالج الہ آباد کے اساتذہ میں سے قاضی خورشید احمد (مخالف اصغر) اور مولوی سراج الحق (معتقد اصغر) ، دونوں بزرگوں کے حلقۂ درس میں شامل ہونے کا مجھے فخر حاصل ہے - صغیر احمد صدیقی (اصغر پر جن کا مضمون نقوش کے شخصیات نمبر میں شائع هوا هے) بیسک ٹریننگ کالج الہ آباد میں میرے نگران خاص اور مشفق استاد تھے - سر شاہ سلیمان ، میرے هم وطن تھے ، اس ناتے سے والد مرحوم اکثر و بیشتر ان کے یہاں جایا کرتے تھے اور میں بالعموم ان کے همراہ هوتا تھا -

آخری ایام میں اصغر کا قیام بلوینڈیر پریس کی ایک بنگلیا میں تھا جسکے احاطے کی دیوار سے ملی هوئی کائستھ پاٹھ شالہ یونیورسٹی هاسٹل کی عمارت تھی - اس کے ریزیڈنٹ ٹیوٹر میرے هم وطن بابو جمنا پرشاد سری واستو، والد مرحوم کے مخلص دوستوں میں تھے - گرمی کی اکثر دوپہر هم (والد صاحب اور میں) انھیں کے یہاں گزارتے ----- اصغر کے انتقال کے موقع پر ان کے آخری مراسم کا سارا منظر میں نے کائستھ پاٹھ شالہ هاسٹل کی بالائی منزل سے دیکھا تھا جس کا نقشہ آج تک میری آنکھوں میں هے -

ان حقائق اور مناسبات کے پیش نظر اصغر پر کام کرنے کا شاید دوسروں کے مقابلے میں ، مجھے بہتر موقع و حق حاصل هے کہ اصغر نے جس ماحول و فضا میں مدتوں نغمہ ونور بکھیرا ، میں نے اسی فضا میں آنکھیں کھولیں ، هوش سنبھالا اور عمر کی تیس بہاریں اس طور گزاریں کہ " نغمہ و نور " کی یہ بارش سانس بن کر رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی اور یہ آج بھی خون بن کر شریانوں میں گردش کر رهی هے جو واقعات دوسروں تک بالواسطہ پہنچے ، انھیں میری آنکھوں نے دیکھا ، کانوں نے سنا اور میرے دماغ نے محسوس کیا ----- بہت سے واقعات ، مجھ تک ان لوگوں کے ذریعے پہنچے هیں جو اصغر کے رفیق بزم اور شریک رزم رهے هیں -

چونکہ میں نے اسی " چمن " کے گوشے گوشے سے تمتع حاصل کیا ، اور خرمن خرمن سے خوشہ چینی کی هے ، جس کے پتے پتے پر اصغر چھائے هوئے تھے ، اس لیے شاید میری رسائی آسانی کے ساتھ ، ان کی شاعری کے رموز و علائم کے پیچھے چھپی هوئی روح تک هو سکے -

اصغر سے تعارف طالب علمی کے زمانے میں ہوا ۔ گورنمنٹ کالج الٰہ آباد میں مولوی سراج الحق صاحب ہمیں اردو اور فارسی پڑھایا کرتے تھے ۔ وہ تدریس کے دوران میں اصغر کے ایسے جاندار اور پھڑکتے ہوئے شعر سناتے کہ دل پر نقش ہو جاتے ۔ انھیں دنوں " سرود زندگی ،، ہاتھ لگ گئی ۔ اس کے ظاہری و معنوی حسن کا دل پر ایسا نقش جما کہ آج تک قائم ہے ۔ میرے پھوپھی (حقیقی پھوپی زاد بہن کے شوہر) محمد شریف خاں، جو میرے محلہ دار بھی تھے، بسلسلۂ ملازمت ، اعظم گڑھ میں تعینات تھے ۔ ان کے صاحبزادے فروغ احمد خاں، جو میرے ہم سن تھے ، شبلی جارج ہائی اسکول، اعظم گڑھ میں زیر تعلیم تھے ۔ ان دنوں اعظم گڑھ کی فضا اصغر کی شاعری سے گونج رہی تھی ۔ میرے بھانجے فروغ احمد ، اصغر کی شاعری سے بڑے متاثر تھے ۔ ادھر میں الٰہ آباد سے ، وہ اعظم گڑھ سے چھٹیوں میں گھر (قصبہ کراکت جونپور) پہنچتے تو ہماری صحبتیں اصغر کے اشعار سے لہک اٹھتیں –– یہ سلسلہ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۱ء تک قائم رہا ۔

مارچ اپریل ۱۹۴۱ء میں ایم ۔ اے (فارسی) کے امتحان سے فراغت کے بعد ایک روز افتخار احمد صدیقی صاحب جو میرے ایم ۔ اے کے ساتھی تھے (اب استاد شعبۂ اردو، پنجاب یونیورسٹی) کی قیام گاہ کی طرف جا نکلا ۔ فرصت بھی تھی اور بے فکری بھی ، باتوں ہی باتوں میں کھلا کہ افتخار صاحب بھی اصغر کے شیدائیوں میں ہیں ۔ انھوں نے اپنی بیاض میں اصغر کے پہلے مجموعۂ کلام " نشاط روح ،، کی نقل بھی کر رکھی تھی ، مجھے ابھی " نشاط روح ،، کے مطالعے کا موقع نہیں ملا تھا، افتخار صاحب سے وہ بیاض مستعار لایا، چھٹیاں تو تھیں ہی، بڑے ذوق و شوق سے اپنی بیاض میں اس کے منتخب اشعار اتارے، تقریباً سارا دیوان نقل ہو گیا!

اس طرح ابتدائی عمر ہی سے اصغر سے ایک طرح کا ذہنی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اب اس " ربط خاص ،، کو چھتیس سینتیس سال ہوگئے ہیں ۔ اس حیثیت سے بھی مجھے اصغر کی زندگی اور کلام پر ہمدردانہ غور و فکر کا دوسروں سے شاید زیادہ موقع حاصل رہا ہے––

اصغر کی زندگی میں ان پر مدح و قدح میں بہت کچھ لکھا گیا ۔ عام قاری کے لیے تعصب و عقیدت کے ان تو بہ تو پردوں میں سے اصغر کی شخصیت و شاعری کا واضح چہرہ دیکھنا سکن نہ رہ گیا تھا۔ پھر ان ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی تعریف و تنقیص میں صرف ان کی شاعری سے بحث کی گئی تھی، اصغر کی دوسری حیثیات : صحافت ، بچوں کے لیے آسان و رواں اسلوب نثر ، عالمانہ انداز تحریر ، انشائے لطیف کی رنگین و مرصّع طرز نگارش ، ناقدانہ بصیرت ، اعلیٰ انسانی اوصاف ––––، بالکل نظر انداز ہوگئی تھیں ۔ مقالہ نگار نے اُسی

کمی کو پورا کرنے اور اصغر پر ایک جامع تحقیقی مقالہ لکھنے کی کوشش کی ہے ۔

مقالہ ھذا کی اس حیثیت سے بھی بہت اھمیت ھے کہ اصغر کے شرکائے رزم و بزم میں سے بیشتر راھی ملک عدم ھو گئے، جو زندہ ھیں (خدا انہیں تادیر سلامت رکھے) میں نے ان کی یادوں کی لووں کو اکسا اکسا کر، ان کی مدھم روشنی میں اصغر کی زندگی کے بعض بڑے اھم واقعات کے خاکے تیار کیے ھیں ، جو اس سے پہلے منظرعام پر نہیں آئے تھے۔

آخر میں اس کا اظہار ضروری ھے کہ میں نے اصغر پر باقاعدہ تحقیقی کام مئی ۱۹۶۹ء سے جناب غلام مصطفیٰ خان صاحب صدر شعبۂ اردو ، سندھ یونیورسٹی ۔ حیدرآباد کی نگرانی میں شروع کیا ۔ مواد کی تلاش میں نہ صرف یہ کہ پاکستان کے مختلف شہروں (لاھور ، پنڈی ، پشاور ، ساھیوال ، کراچی) کے چکر لگائے بلکہ ھندوستان کا سفر (مئی جون ۱۹۷۰ء) بھی اختیارکیا ۔ تحقیق کی راہ میں جو دشواریاں پیش آئیں ان کا اعادہ عبث ھے ۔ میرے لیے یہی تسکین بہت ھے کہ ایک کام ھو گیا ۔ خداوند تعالیٰ مشکور فرمائے ۔ آمین ـــــ ،

......

مقالے کو حسب ذیل دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے :

باب اوّل : سوانح حیات

باب دوم : نقوش و آثار

باب سوم : شخصیت ، عہد بہ عہد

باب چہارم : نظریۂ فن (۱) : نثر

باب پنجم : نظریۂ فن (۲) : شعر و غزل

باب ششم : شخصیت و شاعری

باب ہفتم : تقابلی مطالعہ

باب ہشتم : شاعری میں اصغر کا مقام و مرتبہ

باب نہم : حاصل مطالعہ : اصغر، یہک نظر

باب اول میں اصغر کے حالات " از مہد تا لحد " بڑی تحقیق و کاوش سے جمع کیے گئے ہیں ۔ ان کی ولادت ، وفات ، ملازمت ، شادی اور اولاد کی ولادت کے علاوہ ان کے دوسرے حالات کے سنین کا تعین بڑی " دیدہ ریزی " سے کیا گیا ہے ۔ اصغر، جگر، نسیم جگر اور ان کی بڑی بہن کے سلسلے میں جو روایتیں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھیں اور جن پر مرور زمانہ نے " صداقت " کی مہر ثبت کر کے اصغر کی شخصیت اور شاعری کے صحیح خدو خال کو دھندلا اور کجلا دیا تھا، جرح و تعدیل سے ان کی اصل حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

اصغر کی تعلیم و تربیت کے باب میں بھی بعض غلط اور گمراہ کن روایات عام ہو گئی تھیں ان پر ذرایتاً روشنی ڈالی گئی ہے ۔ ابتدا میں " باقاعدہ تعلیم " کا ذکر ہے، جسے عموماً لوگوں نے " تعلیم کا منتہا " سمجھ کر ، یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اصغر کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے ---- اس مفروضے پر ناقدانہ نظر ڈال کر، اصغر کی ان تمام کوششوں اور کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے، جو انھوں نے اپنی تزئین ذہنی پر صرف کیں ---- تربیت بلا شبہ ایک ارتقائی عمل ہے جسے کسی مخصوص دور حیات تک محدود کر کے اس پر پوری زندگی کا قیاس سرتا سر غیر علمی اور غیر منطقی ہے ---- اصغر کی تربیت سے بحث کرتے

وقت برابر پیش " نقطۂ نظر " سامنے رہا ہے ۔ چنانچہ ابتدائی تربیت سے لے کر ، آخر عمر تک ان تمام احباب و اصحاب ، مجالس و محافل اور ادارات کا ذکر کیا گیا ہے، جن سے انہیں وابستگی رہی اور جن سے انھوں نے لازماً کسب فیض کیا ـــــ یہ حصہ میرے نزدیک اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ اس سے اصغر کی شخصیت کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے ۔

باب دوم میں " نقوش و آثار " کے تحت اصغر کے تمام سرمایۂ نظم و نثر کا احاطہ کیا گیا ہے، اردو دان طبقہ اصغر سے بحیثیت شاعر روشناس ہے ۔ عوام تو خیر معذور ہیں، خواص میں بھی بہ استثنائے معدودے چند بیشتر کو یہ تک معلوم نہیں کہ وہ اچھے نثار و نقاد بھی تھے ۔ نثر میں ان کا ایک منفرد مقام تھا اور اردو تنقید کی تاریخ اگر کبھی تفحص و تفصیل کے ساتھ لکھی گئی تو حالی کے بعد ، ترقی پسند تحریک سے پہلے اصغر پر نظر کا ٹھہرنا لازمی ہے ۔ ان کے تنقیدی شاہکار " اردو شاعری کی ذہنی تاریخ " کا علم کم لوگوں کو ہے ۔ چنانچہ مقالے میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کی مدت تالیف ، تسوید و تبییض نیز گم ہونے کی داستان کے علاوہ اس کے مشمولات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے ، اسی طرح " دیوان مظہر جانجاناں " کی تالیف اور اس کا حشر ، بھی زیر بحث آئے ہیں ، اسی باب میں اصغر کے سلسلۂ تحائف (تحفہ جاپان ، تحفہ جرمنی وغیرہ) تراجم ، اداریے ، مکاتیب ، بیانیہ و تنقیدی مقالات کا احاطہ بھی کر لیا گیا ہے ۔ اسی باب میں اصغر کی شعرگوئی کے محرکات ، اس کی ابتدا (تاریخی شواہد کی روشنی میں سال کا تعین) ان کے اساتذہ ، مدت استفادہ ، تلامذہ مجموعات شعری کے ذکر کے علاوہ مستردات (وہ تمام اشعار جو اصغر نے اپنے دواوین سے خارج کر دیئے) اور غیر مدون کلام، بھی جمع کر دیا گیا ہے ۔ شعری مجموعوں کے سلسلے میں بعض گمراہ کن روایات پر ناقدانہ نظر ڈال کر حقیقت حال کی نقاب کشائی کی گئی ہے ـــــ پھر ان شعری مجموعوں کے سال تدوین و طباعت اور ان کے مختلف ایڈیشنوں کی داستان تفصیل سے بیان کی گئی ہے ـــــ مقالہ کا یہ حصہ جو اپنی ماہیت و نوعیت کے اعتبار سے تحقیقی ہے بڑی کاوش سے تیار کیا گیا ہے اور پہلی بار منظر عام پر آ رہا ہے ۔

باب سوم " شخصیت عہد بہ عہد " میں اولاً اصغر کے عقائد و افکار کا جائزہ لیا گیا ہے کہ شخصیت کی ترتیب و تشکیل اور تہذیب و تکمیل میں یہی بنیاد کا کام دیتے ہیں۔ پھر اصغر کی زندگی کے تین واضح دور قائم کیے گئے ہیں ۔ ولادت سے ریلوے کی ابتدائی

ملازمت تک کا دور ان کی زندگی کا ابتدائی دور ہے ۔ اس دور کے حالات پردۂ خفا میں ہیں، اس سے متعلق کوئی ایسا واقعہ نظر میں نہ آ سکا، جس کی روشنی میں آنے والے اصغر کے متعلق کوئی رائے قائم کی جا سکے ، یا جسے ان کی شخصیت کے ارتقائی مراحل کا مرحلہ اول قرار دیا جا سکے ۔

دوران ملازمت کے آخری پانچ سال کی مدت کو ان کے " شباب کی رنگینیوں اور کام جوئیوں " کا دور کہا گیا ہے، جس میں وہ مستغرق مئے و مینا بھی رہے اور مقرب بزم حسینان بھی ـــــ اس کے بعد ان کی زندگی کا تیسرا دور آیا جب انھوں نے در توبہ پر دستک دی اور دعائے استغفار مستجاب ہوئی ۔ اس دور میں ان کی روح میں ایک زبردست انقلاب آیا اور وہ ہمیشہ کے لیے معصیتوں کے گرداب سے باہر نکل آئے ۔ تردامانی کا دور ختم ہوا اور ایک مرد حق آگاہ کے رشتۂ ارادت نے تصوف کو ان کا طریق حیات بنا دیا ـــــ اصغر کو عموماً لوگوں نے اسی دور میں دیکھا۔ چوں کہ اصغر کی رندی و سرشاری کا کسی کو علم نہیں اس لیے وہ ان کے کلام میں تصوف و رنگینی (جو ان کے نزدیک متضاد ذہنی کیفیتیں ہیں) کے امتزاج کا کوئی حل نہ پیش کر سکے اور اصغر ان کے لیے معمہ بن کر رہ گئے ۔ اصغر کی داستان زندگی کا یہ باب بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس لیے بڑا اہم ہے کہ اس کے مطالعہ سے یہ معمہ حل ہو جاتا ہے ـــــ اسی باب میں اصغر کے خد و خال اور وضع قطع کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے کہ یہ سیرت و شخصیت کا مظہر ہوتے ہیں ۔ اسی میں اصغر اور جگر کے تعلق کی نوعیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ اصغر کی مجلسی شخصیت پوری طرح یہیں جلوہ گر ہوتی ہے ۔

باب چہارم " اصغر کا نظریۂ فن ـــ نثر " میں " اردو زبان " اور " نثر " کے متعلق اصغر کے نظریات کو یکجا کر دیا گیا ہے ۔ اور ان کے مختلف اسالیب نثر کا جائزہ لیتے ہوئے جدید نثر نگاروں میں ان کے مقام و مرتبے کی تعین کی کوشش کی گئی ہے ۔ اسی میں ان کے تنقیدی نظریات بھی جمع کر دیئے گئے ہیں اور اردو تنقید میں اصغر کے اولیات کا احاطہ کر کے معاصر نقادوں میں، ان کی حیثیت و اہمیت واضح کی گئی ہے ۔

باب پنجم میں " اصغر کا نظریۂ فن ـــ شعر و غزل " زیر بحث لایا گیا ہے ۔ کسی شاعر یا ادیب کا مطالعہ لوگ اپنے خیالات و عقائد کی روشنی میں کرتے ہیں، شاعر یا ادیب کی تخلیق میں اگر ہماری پسند کی چیزیں نظر آ جاتی ہیں تو ہم اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں۔ اگر ہمارے پسندیدہ خیالات سے اس کی تحریر خالی ہوتی ہے تو

اس کی تنقیص پر اتر آتے ہیں ۔ یہ حقیقتاً شاعر کے بجائے اپنا تجزیہ و مطالعہ ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ تنقید نگار شاعر کے آئینے میں اپنا عکس دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے ---- میرے نزدیک اس طرح کا مطالعہ نہ ہمدردانہ ہوتا ہے نہ منصفانہ ۔ ہمدردی اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے شعر و ادب سے متعلق شاعر کے عقاید و نظریات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے، پھر ان کی روشنی میں اس کے کلام کو پرکھا جائے ---- اس باب میں " شعر و غزل " سے متعلق اصغر کے خیالات کو ، جو ان کی تحریروں میں بکھرے ہوئے تھے، جمع کر دیا گیا ہے ۔ اس سے ان کی شاعری کے بعض سربستہ گوشے کھل کر سامنے آتے ہیں ---- مثلاً ان کی غزل میں پاکیزگی و معصومیت کہاں سے آئی اور ان کے اشعار میں جسم کی حرارت ، تنفس کی گرمی اور جنسی تلذذ کیوں نہیں ہے ---- اصغر چوں کہ غزل کے شاعر ہیں، اس لیے اسی باب میں غزل کے بنیادی موضوعات تصور حسن و عشق ، کی طرف اشارے کیے گئے ہیں (تفصیلی بحث عقاید و افکار میں کی گئی ہے) اور تصور محب و محبوب کو بھی سمیٹ لیا گیا ہے اس لیے کہ اس سے اصغر کی زندگی کے رویے کے سمجھنے اور ان کی انفرادیت کے تشخص و تعین میں بڑی مدد ملتی ہے ---- یہ باب بھی اس اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ اصغر کو اس طرح سمجھنے کی کوشش اس سے پہلے نہیں کی گئی ۔

باب ششم " شخصیت و شاعری " میں یہ نکتہ پیش کیا گیا ہے کہ شاعر و ادیب اپنے ادب پاروں میں اپنی ہی عکاسی کرتا ہے ۔ وہ اپنے کو لاکھ چھپانے کی کوشش کرے اس کا " آپ " ، " دانستہ یا نادانستہ " ، " محسوس یا نامحسوس " طریقہ پر، اس کی تخلیق میں در آتا ہے ---- اس بنیاد پر اصغر کی شخصیت و مزاج کے سات واضح اوصاف ---- طہارت و پاکیزگی[1] ، رنگینی و نفاست پسندی[2] ، جذب و کیف و والہانہ از خود رفتگی[3]، توازن و سنجیدگی[4] ، حیا و بے نفسی[5] ، مسرت و طمانیت[6] اور اجتہاد[7] ---- ان کے کلام کی روشنی میں تلاش کئے گئے ہیں اور ان کی تصدیق و شہادت ان کے معاصرین کی تحریروں سے بہم پہونچائی گئی ہے ---- اصغر کا مطالعہ جہاں تک مجھے علم ہے اب تک اس انداز میں نہیں کیا گیا۔ اس لحاظ سے یہ باب بھی نیا اور اہم ہے ۔

باب ہفتم میں بعض پیشرو اور معاصر شعرا سے اصغر کا مقابلہ و موازنہ کرکے ، ان کی انفرادیت واضح کرنے کے لیے بنیاد فراہم کی گئی ہے ۔

باب ہشتم میں اصغر کی شاعری کے متعلق مخالف و موافق آرا جمع کی گئی ہیں ۔

آخر میں ان پر محاکمہ کر کے اپنی رائے کا اظہار کیا گیا ہے اور شاعری میں ان کے مقام
کا تعین کیا گیا ہے -

باب دہم : " حاصل مطالعہ ---- اصغر ، بیک نظر " پورے مقالے کا خلاصہ
و تکملہ ہے -

مختصر یہ کہ مقالے میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی آمد
سے ہندوستان کی رومان پرور فضا میں ، اسلامی روح اور ایرانی نفاست و نزاکت ، کچھ
اسطرح هم آهنگ هوئے کہ ان تینوں کی آمیزش و آویزش سے ایک تہذیب وجود میں آئی
جسے اسلامی هند ایرانی تہذیب ---- یا تہذیب مشرق کہا جا سکتا ہے - اس
تہذیب کے بنیادی اقدار مساوات ، رواداری ، انسان دوستی ، تہذیب و شائستگی اور
ذوق جمالیات (هر قسم کے جمال کی تحسین و قدرشناسی) تھے ---- مغربی اقوام
خصوصاً انگریزوں کی تسخیر هند سے اس تہذیب پر ضرب کاری لگی - ردعمل کے طور پر
اسلامیان هند میں مغربی افکار و تہذیب سے ایک طرف بیزاری پیدا هوئی- دوسری
طرف اسلامی معاشرے کی از سر نو تنظیم کی کوششیں شروع هوئیں ---- اس تنظیم نو
کے دو مختلف رخ تھے - ایک خالصتہً اسلامی اور مشرقی تھا جس کے سرخیل علما و
مجاهدین امت تھے - دوسرے کے سربراہ سر سید اور ان کے رفقائے کار تھے - علی گڑھ
تحریک مغرب سے اثر پذیری کی تحریک تھی - اول الذکر رجحان نے علما کو همیشہ
" بیرونی طاقت " سے بر سر پیکار رکھا- اگرچہ میدان جنگ میں وہ مات پر مات کھاتے
رہے لیکن ان کی تحریک دب دب کے ابھرتی اور مر مر کے زندہ هوتی رهی ---- انہیں
عوامل و رجحانات سے اصغر کی شخصیت کے تار و پود تیار هوئے تھے - اصغر نے اپنے
ماحول سے انہیں عوامل و عناصر کا انتخاب کیا اور اپنے عقائد و افکار کو زیادہ سے
زیادہ مزین و آراستہ کیا جو " اسلامی هند ایرانی تہذیب " کی بنیاد تھے - ان میں
اسی " مشرقی تہذیب کے آخری نمونہ " کا بانکپن ہے - یہی بانکپن هر جگہ ان کے شعر و
ادب میں جاری و ساری ہے -

اصغر بنیادی طور پر شاہ ولی اللہ ، مظہر جانجاناں ، اکبر ، شبلی اور اقبال کے
قبیلے کے بزرگ تھے - لیکن ان کے یہاں سیاست کی مصلحت بینی سے زیادہ مذهب کی شرافت
اور تصوف کی پاکیزگی ہے - انہوں نے فکر و عمل کی تطہیر سے معاشرہ کو طاهر و طیب بنانے
کی کوشش کی اور "بدنام زمانہ غزل " کو فرشتوں کی معصومیت اور حوروں کی پاکیزگی عطا کی -

...

مقالے کی ترتیب میں جن کتب ، جرائد و رسائل اور اخبارات سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی تفصیل کتابیات میں دے دی گئی ہے ۔ لیکن تین ابواب کی بنیاد ، جو خالصتاً تحقیقی ہیں (سوانح حیات ، نقوش و آثار اور شخصیت عہد بہ عہد) ، جن بزرگوں کی نگارشات ، جواب استفسارات ، بالمشافہ گفتگو اور مراسلات پر قائم کی گئی ہے ، جب تک اصغر سے ان کے تعلق کی نوعیت ظاہر نہ کی جائے تحقیق و کاوش کی اہمیت واضح نہیں ہوتی ۔ اس لیے ذیل میں ان بزرگوں کے نام ، اصغر سے ان کے تعلق کی نوعیت ، تعلق کی مدت پر مختصراً مگر جامع روشنی ڈالی گئی ہے ۔

تفصیل میں جانے سے پہلے اس امر کی وضاحت بھی ضرور ہے کہ اصغر کے قدیم ترین احباب کے اقوال کو دوسروں کے بیانات پر ترجیح دی گئی ہے ۔ نزاعی مسائل میں جرح و تعدیل سے رائے قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ ذیل میں اصغر کے احباب و اعزہ کی تفصیل دی جاتی ہے ۔

(۱) سید رشید احمد :

اصغر کے قدیم ترین احباب میں سرفہرست ہیں ابھی بقید حیات ہیں ۔ آپ کا تعلق ابو سرائے فیض آباد کے روسا اور شرفا کے خاندان سے ہے ۔ رشید صاحب اصغر سے ۱۹۱۳ء کے اوائل (جنوری تا مارچ) میں اپنے دوست قاضی محمد حامد حسرت مدیر قیصر ہند کے ذریعہ ، فیض آباد میں متعارف ہوئے ۔ کوئی سال بھر بعد جب ۱۹۱۴ء کے آغاز میں بحیثیت پولیس آفیسر گونڈہ میں تعینات ہوئے تو اصغر کے مہمان ہوئے ۔ اصغر سے رشید صاحب کا تعلق پورے چوبیس سال رہا کہ یہی مدت رشید صاحب کی گونڈہ میں (ضلع اور صدر) تعیناتی کی ہے ۔ اصغر کے انتقال سے صرف چند روز پہلے ان کا تبادلہ دوسری جگہ ہوا تھا ۔ جن لوگوں کو رشید صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے (مقالہ نگار کو اپنے سفر ہندوستان میں ۲۳ ، ۲۲ دن رشید صاحب کے دولت کدہ پر قیام کا موقع ملا ہے) وہ اس بات کی تصدیق فرمائیں گے کہ وہ دل میں اتر جانے کی ایسی صلاحیت و مہارت رکھتے ہیں جو شاذ ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ۔ پھر ان کے پیشہ نے بھی ان کی تحقیق و تفتیش کی صلاحیت کو جلا دی ہے ۔ علمی تحقیق کے جدید اصولوں سے واقفیت ، فطری و پیشہ ورانہ صلاحیت تفتیش اور انتہائی قرب کی وجہ سے اصغر کی زندگی کا کوئی گوشہ آپ کی نظروں سے اوجھل اور پوشیدہ نہیں رہا ۔ اس " ربط خاص " کی وجہ سے ، اصغر کے بارے میں رشید صاحب کی روایت

کو استناد کا درجہ حاصل ھے ۔ رشید صاحب کا ایک گراں قدر مقالہ " اصغر صاحب "، جامعہ ، دھلی ، اپریل اور مئی ۱۹۶۷ء کے شماروں میں ، دو اقساط میں شائع ھوا ۔ جو انھوں نے اپنی پرانی یادداشتوں اور اصغر کے قریب ترین احباب (کنور وشوناتھ وکیل گونڈہ جو اصغر کو ۱۹۰۹ء سے جانتے تھے) سے تحقیق کر کے لکھا ھے ۔ اس مضمون کو اصغر کے سوانحی ابواب کی اساس بنایا گیا ھے ۔

(۲) مرزا احسان احمد وکیل :

کنڑہ ، اعظم گڑھ کے رھنے والے ، اصغر کو اردو داں طبقہ سے متعارف کرانے والے پہلے شخص ھیں ۔ ابھی بقید حیات ھیں ۔ آپ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل نہیں ھو سکا ۔ لیکن اصغر پر تحقیق کے سلسلے میں آپ سے برابر مراسلت رھی ۔ آپ نے اس پیرانہ سالی میں بھی بڑی مستعدی سے میرے استفسارات کے جواب دیئے ۔ اصغر کی زندگی کے ابتدائی سرسری نقوش مرزا صاحب ھی کی جنبش قلم کا نتیجہ ھیں جو بطور مقدمہ نشاط روح طبع اول (دسمبر ۱۹۲۵ء) میں شامل کئے گئے تھے ۔ اور آج بھی بجنسہ چلے آ رھے ھیں ۔ سرسری ھوتے ھوئے بھی ان واقعات کی اھمیت یوں زیادہ ھے کہ انھیں اصغر سے براہ راست حاصل کیا گیا تھا ۔ مرزا صاحب سے اصغر کی پہلی ملاقات انھیں کے دولت کدے پر ، اعظم گڑھ میں ۱۹۱۹ء میں ھوئی تھی ۔ اس کے بعد سے ۱۹۳۶ء تک (۱۸۰۱۷ سال) یہ تعلق برابر قائم رھا ۔ مرزا صاحب اور اصغر کے تعلقات دوھرے تھے ایک براہ راست ، دوسرے جگر کے واسطے سے ---- مقدمہ نشاط روح کے مندرجات کے علاوہ مرزا صاحب نے خطوط کے ذریعے ، بہت سے معاملات میں رھنمائی فرمائی ۔ ان رشتوں کی استواری و خوشگواری اور دیرینہ تعلق کی بنا پر جو مرزا صاحب اور اصغر کے درمیان تھے ، مرزا صاحب کے بیان کی اھمیت و استناد بہت زیادہ ھے ۔

(۳) بشیر احمد صدیقی :

آپ بھدوھی بنارس اسٹیٹ کے رھنے والے ھیں ۔ آپ کے والد شمس الحق صاحب بحیثیت پولیس سب انسپکٹر اترولیا ۔ اعظم گڑھ میں (۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۲ء) تعینات تھے ۔ بشیر صدیقی صاحب ۱۹۱۹ء میں مرزا احسان احمد صاحب کے دولت کدے پر اصغر صاحب سے متعارف ھوئے ۔ ۱۹۲۳ء تا ۱۹۳۲ء جناب اقبال سہیل سے کبھی کبھی ملنے جایا کرتے ۔ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۵۰ء مستقلاً اعظم گڑھ میں قیام رھا ۔ پہلے شبلی جارج ھائی اسکول میں ھیڈماسٹر ، بعد میں جب وہ کالج ھو گیا تو اسی کے پرنسپل ھوگئے ۔ بشیر صدیقی

جناب رشید احمد صدیقی کے برادر نسبتی ہیں ۔ اس رشتہ سے بھی اصغر سے بہت قریب تھے ۔ الہ آباد جب بھی جاتے اصغر کے یہاں قیام کرتے ۔ صدیقی صاحب بقید حیات ہیں، آپ کا قیام ۱۱/۴۵ ناظم آباد کراچی میں ہے ۔ میری ان سے اصغر پر گفتگو (۲۰-۵-۱۹۶۹ء، ۲۲-۵-۱۹۶۹ء، ۱۱-۱-۱۹۷۰ء، ۱۲-۱-۱۹۷۰ء) گفتگو ہوئی ہے۔ حافظہ بلا کا پایا ہے ۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند، راست گفتار بزرگ ہیں ۔ بشیر صاحب کے بیان کردہ واقعات کی حرف بحرف تصدیق دوسرے ذرائع سے ہوئی ۔۔۔ اصغر کے معاملے میں بشیر صاحب سند کا درجہ رکھتے ہیں ۔

(۴) خواجہ مسعود علی ذوقی :

اصغر کے قریبی دوست خواجہ بشیر علی، ساکن گونڈہ کے صاحبزادے تھے، ۱۰، ۱۱ سال کی عمر سے بحیثیت والد کے دوست کے اپنے یہاں آتے جاتے دیکھا تھا ۔ ۷، ۸ سال تعلیم کے سلسلے میں باہر رہے ۔ اس کے بعد دوبارہ گونڈہ آئے تو اصغر کے کمال شاعری سے متعارف ہوئے ۔ ۲۲-۱۹۲۳ء کے درمیان ذوقی صاحب علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے، اصغر صاحب جب بھی علی گڑھ جاتے تو ہموطنی کے ناطے ان سے ضرور ملتے ۔ آخر میں ذوقی صاحب کے مراسم ان سے انتہائی مخلصانہ ہوگئے جو آخر دم تک قائم رہے ۔ یوں تو ذوقی صاحب اصغر کو ۲۲، ۲۴ سال سے جانتے تھے، لیکن ان کے مخلصانہ تعلقات کی مدت ۱۲، ۱۳ سال ہے ۔ ذوقی صاحب اصغر کے ہم وطن، ان کے رفیق دیرینہ کے صاحبزادے، جگر کے جگری دوست اور خود اصغر کے عازمندوں میں تھے اس لیے اصغر کے متعلق ان کی معلومات بالواسطہ تھیں ۔۔۔ آپ کا بیان سند کا درجہ رکھتا ہے ۔

(۵) مولانا افسر موہانی :

مشہور صحافی، شاعر اور وارثی سلسلے کے بزرگ ہیں ۔ "جام جہاں نما" سال ہا سال آپ کی ادارت میں نکلتا رہا ۔ جس میں اصغر کی مخالفت اور موافقت میں مضامین شائع ہوتے رہے ۔ اصغر سے پہلا تعارف ۷ اپریل ۱۹۱۵ء کے وارثی مشاعرے میں، لکھنؤ میں ہوا ۔ اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں مدیر گونڈہ گزٹ ہو کر گئے اور ۱۹۲۲ء تک مستقلاً وہیں رہے ۔ اصغر کو بہت قریب سے دیکھا تھا ۔ تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہونے کی وجہ سے دونوں خواجہ تاش تھے ۔ پچھلے سال (مئی جون ۱۹۷۰ء) جب میں ہندوستان گیا تھا تو فالج سے صاحب فراش تھے ۔ خط کا جواب دینے میں بڑے مستعد ہیں ۔ خود نہیں لکھ سکتے تو کسی شاگرد حاضر باش سے لکھواتے ہیں ۔ مولانا کے مکاتیب سے اصغر کی

بعض غزلوں کے سمجھنے کے تعین میں بڑی مدد ملی ---- اس ضعیفی اور بیماری کی حالت میں مولانا نے خاکسار کو ہمیشہ جواب باصواب سے مفتخر و سرفراز فرمایا - جس کے لئے حد درجہ سپاس گزار ہوں -

(۶) رشید احمد صدیقی :

علی گڑھ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر اور اردو کے بلند پایہ طنز نگار ہیں - اصغر سے پہلی ملاقات ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ جوبلی کے موقع پر ، آپ ہی کے دولت کدہ پر ، جناب اقبال سہیل کی وساطت سے ہوئی - یہ تعلق ۱۱ سال قائم رہا اور روز بروز ترقی کرتا رہا - دونوں بزرگوں کے آپس کے تعلقات انتہائی مخلصانہ تھے - حق یہ ہے کہ اصغر کو پڑھے لکھے طبقہ میں متعارف کرانے میں رشید صدیقی کا بڑا ہاتھ ہے - آپ کا مضمون اصغر صاحب مطبوعہ نیرنگ خیال لاہور ۱۹۳۰ء (مشمولہ گنج ہائے گرانمایہ) تاثراتی مضامین میں بڑا اہم ہے - اس سے اگرچہ سال و ماہ کا اندازہ نہیں ہو پاتا لیکن اصغر کی شخصیت و شاعری کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے - رشید صدیقی صاحب ، اصغر کے عزیز ترین اور قریب ترین دوستوں میں تھے - اس لیے اصغر کے متعلق ان کی تحریری شہادتیں بڑی وقیع ہیں ---- اصغر پر تحقیق کے سلسلے میں ، افسوس ہے کہ ان کی قدیم تحریروں کے علاوہ ان سے اور کوئی نئی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں - جواب کے معاملے میں بڑے مستعد ہیں - جواب سے ہمیشہ سرفراز فرمایا - آپ کی اس عنایت خاص کے لیے حد درجہ ممنون ہوں -

(۷) مولانا عبدالماجد دریابادی :

اصغر کے قدیم ترین دوستوں میں ہیں - آپ کا اصغر سے کوئی دس بارہ سال تعلق رہا - مولانا بہت ضعیف ہو چکے ہیں ، بینائی بہت کم رہ گئی ہے لکھنے میں حد درجہ تکلف ہوتا ہے - اصغر کے معاملے میں زیادہ رہنمائی نہیں فرما سکے تاہم " مسودہ خطوط مشاہیر حصہ دوم " سے اصغر کے دو بڑے اہم خطوط نقل کرا کے اور تین اصل خط جو مولانا کے نام تھے ارسال فرمائے (یہ خطوط مقالہ نگار کے پاس محفوظ ہیں) ان سے اصغر کی افتاد طبیعت اور ان کی زندگی کے بعض اہم واقعات پر روشنی پڑتی ہے ------ یہ تاریخی دستاویزات بڑی اہم ہیں ، ~~ان کا عکس مقالے کی زینت ہے~~ -

(۸) مولانا سراج الحق مچھلی شہری :

مولانا جون ۱۹۲۸ء میں اپنے والد صاحب کے ایک دوست جناب مقبول حسین صاحب صدائی کی وساطت سے ، اصغر صاحب سے ان کے مکان ، رستم کی مٹڈی کٹرہ ، الہ آباد ، میں ملے - مولانا کو اصغر صاحب سے اتنا خصوصی تعلق ہو گیا کہ ساڑھے آٹھ سال صبح و شام ، وقت و ناوقت ، خلا و ملا میں برابر ان کے ساتھ رہے - اصغر کو نہ صرف یہ کہ بہت قریب سے دیکھا ہے بلکہ بحیثیت شاگرد ظاہری و معنوی کے خوب استفادہ کیا ہے - اصغر کی الہ آباد کی زندگی کا کوئی گوشہ مولانا کی نظر سے پوشیدہ نہیں - اس وقت جناب سید رشید احمد کے بعد اصغر کے متعلق ، ان سے بہتر معلومات کسی کو حاصل نہیں - اس مقالے کی تیاری میں مولانا کے مضمون " اصغر کے چند ادبی افادات ،، مطبوعہ اصغر مرتبہ عبدالشکور صاحب سے بیش از بیش استفادہ کیا گیا ہے - اس کے علاوہ طویل جوابات کے ذریعہ مولانا نے بڑی رہنمائی فرمائی - خصوصاً اُردو شاعری کی ذہنی تاریخ ،، کی تحقیق میں مولانا کی فراہم کردہ معلومات بڑی وقیع اور مفید ثابت ہوئیں مولانا ہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے اوّل اوّل مجھے اصغر سے روشناس کرایا - نومبر ۱۹۶۹ءمیں جب مولانا پاکستان تشریف لائے تھے از راہ شاگرد نوازی غریب خانہ کو رونق بخشی اور مجھے مفتخر و شادکام فرمایا - مواد کی فراہمی ، الہ آباد کی زندگی سے متعلق بعض اہم معلومات بہم پہونچانے میں مولانا کی توجہ خاص شامل رہی ہے - خداوند تعالیٰ آپ کو اجر جزیل عطا فرمائے - میرا بال بال جذبۂ تشکر و سپاس گزاری سے زمزمہ سنج ہے -

(۹) مولانا سید فرزند علی :

رام پور کے رہنے والے ، ۱۹۱۹ء میں ریاست بلرام پور گونڈہ پہنچے - ۱۹۲۳ء میں ایف سی کالج لاہور آ گئے ، ۳۰ جون ۱۹۷۱ء کو فرائض منصبی سے سبکدوش ہوئے - مولانا پرانی وضع کے بزرگ ہیں ، ستر کے قریب عمر ہے مگر ماشاء اللہ بڑے چاق و چوبند ہیں - اصغر و جگر کو بہت قریب سے دیکھا ہے - اصغر کے دوستوں میں چودھری حامد حسین (جو اصغر کے خسر بھی تھے) بابو کلیان سنگھ اور سید رشید احمد صاحب سے بڑے خصوصی تعلقات تھے - بلرام پور اور گونڈہ میں دو مختلف "مکتب شاعری " کے لوگ جمع ہو گئے تھے - ایک " پرانی چال ،، کے لوگ ، جن کے سرخیل جناب یسین علی صاحب، آنجہانی مہاراجہ بلرام پور کے میر منشی ، کاکوری کے رہنے والے بڑے باذوق بزرگ تھے - شاعری و موسیقی کے رسیا تھے - ان کا دولتکدہ رئیسانہ تفریح --- شعر و موسیقی --- کا مرکز تھا

بہتیں محفلیں جمتیں ۔ دوسرے کے سرگروہ سید رشید احمد صاحب ، اصغر و جگر کے مداحوں میں تھے ---- مولانا کا تعلق رشید صاحب کے گروہ سے تھا ۔ آپ نے اصغر و جگر کی زندگی سے متعلق بعض ایسے واقعات بتائے جن کے مولانا عینی شاہد ہیں (بالمشافہ گفتگو از مولانا سید فرزند علی صاحب بتاریخ ۲۰ مارچ ۱۹۶۹ء) ۔ مقالے کی تیاری میں مولانا کے بیان کردہ واقعات سے ، بڑی مدد لی گئی ہے ۔ ان بیانات سے بعض دوسری روایات کی بھی تصدیق ہوتی ہے ۔

(۱۰) سید حامد علی :

آپ پروفیسر سید ضامن علی ، صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے برادر حقیقی تھے ۔ انڈین پریس الہ آباد میں تین سال سے کچھ زائد عرصہ (جون ۱۹۲۷ء تا اکتوبر ۱۹۳۰ء) بطور رفیق کار اصغر کے ساتھ رہے ۔ بظاہر تعلقات مخلصانہ بباطن معاندانہ تھے ۔ اصغر سے کد کی وجہ یہ ہوئی کہ " ہندستانی " کی ادارت کے لیے آپ بھی امیدوار تھے ۔ باوجود کوششوں و سفارشوں کے ناکام رہے ۔ آخر اصغر کے مخالف ہوگئے ۔ ان کو بدنام کرنے کے لیے ایک ادبی محاذ قائم کر لیا ۔ ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۳ء کے جونپور ، فیض آباد ، گورکھپور اور الہ آباد کے اخبارات و رسائل ، ایشر مولانا حامد علی کے موافقین اور اصغر کے مداحوں کی " گل افشانیوں " سے بھرے پڑے ہیں ۔ ان تمام مضامین کو جناب سید حامد علی نے سرکوب الہ آبادی کے قلمی نام سے ، اصغر گونڈوی کی شاعری ، کے زیر عنوان کتابی شکل میں ، الہ آباد سے ۱۹۳۲ء میں شائع کر کے، اپنے خیال میں اصغر سے پورا پورا انتقام لے لیا ہے ---- ان " مخاصمانہ تحریروں " میں بعض باتیں بڑے کام کی نکل آئیں ۔ مثلاً" اصغر کے انڈین پریس الہ آباد پہونچنے اور " ہندستانی " میں منتقل ہونے کے سنین کے تعین میں ان سے بڑی مدد ملی ۔

(۱۱) عبدالشکور عاشائی بریلوی :

آپ کی اصغر سے پہلی ملاقات ۱۹۲۳ء کے حدود میں علی گڑھ میں ہوئی ، جہاں اصغر اکثر رشید صدیقی صاحب سے ملنے جاتے تھے ۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ کوئی ۱۲ سال تک قائم رہا ۔ شکور صاحب نے کبھی اصغر سے اپنے خصوصی تعلقات کا دعویٰ نہیں کیا .... اصغر سے متعلق آپ کی تحریروں میں بعض باتیں " کانالے دوش " کے قبیل کی ہیں جو بلا تحقیق و تنقید درج کر دی گئی ہیں ۔ تاہم شکور صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اصغر پر کتاب مرتب کی ۔ یہ کتاب " اصغر " مختلف مقالات کا مجموعہ ہے

جسے سعید برادرس نے اسرار کریمی پریس الہ آباد سے ۱۹۲۵ء میں شائع کیا تھا ۔ اصغر کے متعلق بنیادی باتیں معلوم کرنے کے لیے یہ کتاب ناگزیر ہے ۔ مقالے کی تیاری میں اس سے بڑا استفادہ کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ شکور صاحب نے پیرانہ سالی اور بیماری کے باوجود میرے خط کا جواب دیا ، جس سے پہلی بار کسی سیاسی جماعت سے (تحریک ریشمی رومال) اصغر کے تعلق کا علم ہوا ۔ جب ان بزرگوں کی شفقتوں اور نوازشوں کی طرف نظر کرتا ہوں تو میرا سر عقیدت اور احسان مندی سے جھک جاتا ہے ۔

(۱۲) جناب علی ظہیر :

آپ سید سروان ۔ الہ آباد کے رہنے والے، جناب امیر علی ، پرنسپل کوئنس کالج بنارس ، سکریٹری پبلک سروس کمیشن الہ آباد کے چھوٹے بھائی ہیں ۔ علی ظہیر صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے بقول خود " روحانیت و تصوف " کے اسرار و رموز اصغر سے حاصل کئے ۔ ان کے عقیدتمندوں اور مریدوں میں (اصطلاحی معنوں میں نہیں) ہیں ۔ پہلی بار ۱۹۲۹ء میں اصغر صاحب کے مکان واقع جانسین گنج ، الہ آباد میں ، ان سے ملے ۔ ان دنوں علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے ۔ یہ سلسلہ ۷ ۸ ۱۰ سال قائم رہا۔ علی ظہیر صاحب نے اصغر کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان کے " حلقہائے خلوت " میں اکثر شریک ہوتے ہیں ۔ اور بقول خود " اصغر صاحب کی موتی برسانے والی زبان اسرار معرفت سے دل و دماغ کو روشن کرتی " ـــ اپنے دوران سفر ہندوستان میں علی ظہیر صاحب سے بوجہ نہ ملنے کی وجہ سے نیاز حاصل نہ ہو سکا ـــ علی ظہیر صاحب کے حقیقی بھتیجے (علی امیر صاحب کے صاحبزادے) حسن امیر صاحب بیسک ٹریننگ سنٹر ۔ الہ آباد میں ۵ سال میرے رفیق کار رہے ہیں ۔ اس کے علاوہ علی ظہیر صاحب میرے خسر جناب محمد الدین قریشی صاحب جو صلاح پور انگلش مڈل اسکول الہ آباد کے ہیڈماسٹری کے زمانے میں ، اسکول میں درس دیتے رہے ـــ ان دونوں رشتوں کے پیش نظر ، جب اصغر کے سلسلے میں آپ کو خط لکھا گیا تو آپ نے بڑے تفصیلی جوابات (۲ ستمبر ۱۹۷۰ء اور ۲ نومبر ۱۹۷۰ء) مرحمت فرمائے آپ کے خطوط سے اصغر کی الہ آباد کی زندگی سے متعلق بعض بڑے اہم واقعات کی تصدیق و توثیق ہوئی ۔ اسکے علاوہ اصغر کے واقعہ کی " رویت رسول اکرم صلعم " کی تفصیل آپ ہی کے خط سے ہوئی ، جسکی تصدیق مولانا سراج الحق، لطیف احمد عباسی اور دوسرے اصحاب سے ہوئی ۔ حسن امیر صاحب جن کا ذکر سطور بالا میں گزر چکا ہے، اصغر کے متعلق بہت سے واقعات علی ظہیر صاحب کی زبانی سنایا کرتے تھے ۔ ان سب سے مقالے کی تیاری میں مدد لی گئی ہے ۔ علی ظہیر صاحب کے خطوط میرے پاس محفوظ ہیں ۔ میں آپ کی شفقت بزرگانہ کے لئے ممنون ہوں ۔

(۱۳) جلیل احمد قدوائی :

مشہور شاعر و مصنف ـ حسرت ـ اصغر ، عزیز ، جگر اور رواں کو قریب سے دیکھنے والے بزرگوں میں ہیں ـ ان شاعروں کو اپنی تحریروں سے زندہ کرنے میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے ـ اصغر کا کلام جگر صاحب کی زبانی سن کر (۱۹۲۲ء میں) ان سے متعارف ہوئے ـ انہیں دنوں رشید احمد صدیقی صاحب اور خواجہ منظور حسین صاحب کی ادارت میں علی گڑھ میگزین کے چھپنے والے شماروں کے صفحات ، اصغر کے اشعار سے مزین ہوتے کہ یہ دونوں حضرات اصغر کے شیدائیوں میں تھے ---- اصغر سے آپ کی پہلی ملاقات ۱۹۲۲ء میں جناب سعید معروف کے کمرے میں ، (علی گڑھ یونیورسٹی ہوسٹل) ہوئی ـ اس کے بعد جب قدوائی صاحب ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۳ء ، الہ آباد یونیورسٹی میں ایم اے (اردو) کے طالب علم تھے تو قرب زیادہ بڑھا جو آخردم تک قائم رہا ـ قدوائی صاحب اصغر کی زندگی اور ان کے طرز بود و ماند کے عینی شاہد ہیں ـ میں جناب جلیل قدوائی سے دو تین بار کراچی میں ملا ـ دوبار انجمن ترقی اردو کے دفتر میں اور ایک بار آپ نے از راہ شفقت اپنے دولتکدہ (واقع حسین ڈسلوا کالونی ـ کراچی) پر دعوت کا شرف بخشا ـ قدوائی صاحب سے جگر کے کافی طویل اور پرلطف صحبتیں رہیں (۱۸ مئی ۶۹ء) مقالے کی ترتیب میں قدوائی صاحب کی تحریروں اور بالمشافہ گفتگو سے بہت مدد لی گئی ہے میں جناب جلیل قدوائی کی شفقت ، بے تکلف انداز گفتگو اور علم پروری سے حددرجہ متاثر ہوا خداوند تعالیٰ جزائے خیر دے ـ

(۱۴) نواب سید شمس الحسن :

ذی علم ، معارف پرور اور ذی ثروت خاندان کے چشم و چراغ ---- نواب صدیق حسن خان صاحب کے سعادتمند اخلاف میں سے ہیں ـ ناظم آباد کراچی میں قیام ہے ـ آپ کے والد محترم نواب علی حسن خانصاحب اواخر انیسویں اور اوائل بیسویں صدی میں ہند کے ان رؤسا میں سے تھے جنھوں نے اسلامیان ہند کی ہر علمی ، مذہبی اور ثقافتی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اسکی سرپرستی و پشت پناہی کی ـ اس دور کا کوئی شاعر ، ادیب ، عالم اور لیڈر ایسا نہ ہوگا جس سے نواب صاحب کو خصوصی تعلق نہ رہا ہو ـ بھوپال ہاؤس والے نواب علی حسن خان صاحب ہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۵ء جگر صاحب کی ہر طرح کی ناز برداری کی ـ اصغر کے بھی مخلصانہ مراسم نواب علی حسن خانصاحب اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد سے تھے ـ جناب سید شمس الحسن صاحب

کی پہلی ملاقات ، اصغر سے بھوپال ہاؤس لکھنئو میں ۳۲-۱۹۳۱ء کے حدود میں ہوئی - جو ترقی کرتے کرتے خصوصی تعلق پر منتج ہوئی - نواب صاحب سے اصغر کی زندگی کے بہت سے واقعات ، ان سے گفتگو کے دوران میں معلوم ہوئے ، جو میں اور ان کے درمیان (۷ جنوری ۱۹۷۰ء تا ۱۲ جنوری ۱۹۷۰ء کے درمیان قریب قریب روز) گفتگو اور مسلسل ہوئی - نواب صاحب کے " ذخیرۂ نوادر " سے جگر اور اصغر کے خطوط کے نقول بھی حاصل ہوئے، جن سے بہت سے واقعات روشن ہو کر سامنے آئے - اس کے علاوہ نواب صاحب کی تالیف " جگر مرادآبادی " کے مسودہ سے بھی میں نے بیش از بیش فائدہ اٹھایا - نواب صاحب کے یہاں سے چودھری حامد حسین (خسر جناب اصغر)اور نسیم جگر (بیوہ اصغر و جگر) کے خطوط کی نقلیں بھی ملیں - جن سے اصغر کے متعلقین کی زندگی کے بعض اہم پہلو سامنے آئے -

(۱۵) صغیر احمد صدیقی :
یو پی میں شعبۂ تعلیم سے متعلق تھے - ۱۹۶۸ء میں بحیثیت انسپکٹر مدارس الہ آباد سے ریٹائر ہوئے - اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کالجیٹ اسکول علی گڑھ میں بحیثیت پرنسپل مامور ہوئے ، ۱۹۷۰ء (مئی جون) میں جب تحقیقی کام کے سلسلے میں راقم مقالۂ ہندوستان گیا تو آپ علی گڑھ ہی میں تھے - صغیر صاحب کے بڑے بھائی جناب جمیل احمد صدیقی بحیثیت پولیس سب انسپکٹر ، ۲۵-۱۹۲۴ء کے حدود میں گونڈہ میں تعینات ہوئے - اس وقت صغیر صاحب چھٹی ساتویں کے طالب علم تھے - اصغر کو اسی وقت سے جانتے تھے لیکن اصغر سے قریب ۱۹۳۳ء میں بڑھا جب آپ الہ آباد میں ایم اے اردو کے طالب علم تھے - یہ تعلق آخر دم تک قائم رہا ---- صغیر صدیقی صاحب ٹیچنگ ٹریننگ کالج الہ آباد میں میرے نگران خاص اور مشفق استادوں میں تھے ---- آپ نے نقوش شخصیات نمبر جلد دوم میں " اصغر گونڈوی " کے عنوان سے مقالہ سپرد قلم کیا ہے - اس میں اصغر کی زندگی اور شخصیت کے بعض بڑے اہم مگر دھندلے اور مجمل واقعات پہلی بار نظروں کے سامنے آئے ہیں - سوانحی ابواب کی تیاری میں اس مقالے نے بھی بنیاد کا کام دیا ہے - مقالہ پڑھنے کے بعد بعض سوالات ذہن میں پیدا ہوئے جو استفساراً صدیقی صاحب کی خدمت میں لکھے گئے لیکن افسوس کہ باوجود متعدد یاددہانیوں کے جواب سے محروم رہا -

مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ بھی بہت سے بزرگ و احباب ایسے ہیں جن کی تحریروں ، تشریحی و توضیحی نوٹوں اور نجی گفتگوؤں سے مقالے کی تیاری میں مدد لی گئی ہے - مثلاً مولانا مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی ، جناب عابد علی عابد مرحوم، مولانا عبدالمجید سالک مرحوم

مولانا غلام رسول مہر ، جناب قیصر مرادآبادی ، مولانا شاہد حسن سوز فاروی ----- ان تمام حضرات نے اصغر کو دیکھا ہے ۔ جناب سوز الہ آباد کے رہنے والے جناب نوح ناروی کے شاگرد ہیں ۔ الہ آباد کے مشاعروں میں اصغر کو بہت قریب سے دیکھا ہے ۔ اصغر کی زندگی کے واقعات بڑا لطف لے لے کر بیان کرتے ہیں ۔ آج کل مدینہ مسجد لال کرتی ، راولپنڈی میں حجرہ نشین ہیں ۔ عمر ۶۵ کے قریب ہے (تاریخ ولادت ۱۲ فروری ۱۹۰۷ء) حافظہ بہت خراب ہو گیا ہے ۔ لیکن بعض پرانی یادداشتوں سے استفادہ کا موقع بہم پہنچایا ---- جب میں نے ان سے اپنا الہ آباد کا تعلق اور اصغر پر تحقیق کرنے کا بتایا تو چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئے ۔ بڑی شفقت و محبت سے ملے ۔ غلبۂ نسیان پر بار بار افسوس کرتے رہے ۔ اور اپنی اس بے بسی کے احساس کو مٹانے کے لیے ٹھیک دوپہر میں (یہ واقعہ ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء کا ہے) مجھے ایک اور صاحب کے مکان پر لے کر گئے ۔ میں سوز صاحب کی اس بزرگانہ شفقت کا حد درجہ ممنون ہوں ۔

ان بزرگوں کے علاوہ جناب تسکین قریشی ، ساکن محلہ بھی اسرائیل میرٹھ سے خط و کتابت کے ذریعہ بعض واقعات کی تحقیق میں مدد ملی ۔ تسکین قریشی صاحب پرانی وضع کے بزرگ ہیں ۔ جگر کے قریب ترین دوستوں میں ہیں ۔ " گوشۂ جگر " (جامعہ ملیہ دہلی) کے محرک و بانی ہیں ۔ جگر جیسے لاابالی و بے نیاز شاعر کے " مسودات و بیاضات " کو محفوظ کرا کے ، تسکین صاحب نے اردو ادب پر احسان عظیم کیا ہے ---- اصغر کو خود نہیں دیکھا تھا لیکن اصغر کی زندگی کے ان گوشوں سے متعلق ، جن کا تعلق جگر اور نسیم جگر سے تھا ، معلومات فراہم کرنے میں بڑی کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا ۔ تسکین صاحب کی قدیم وضعداری ، اساتذہ ، مروت ، شفقت اور علم دوستی کے اعتراف میں گردن ، ہمیشہ جھکی رہے گی ۔

(۱۲) ڈاکٹر محمد اسلام ۔ ڈاکٹر احمر رفاعی : جناب ڈاکٹر اسلام نے لکھنؤ یونیورسٹی سے اور جناب ڈاکٹر رفاعی نے جامعہ حیدرآباد سندھ سے جگر پر پی ایچ ڈی کے مقالات مرتب کئے ہیں ۔ مقالۂ ہذا کی ترتیب میں ان دونوں حضرات کے مقالوں سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ جناب اسلام کے مقالے کی اہمیت یوں زیادہ ہے کہ آپ نے اپنی تحقیقی مطالعہ کے دوران میں گونڈہ کی خوب خاک چھانی ہے ، ان بزرگوں سے ملے ہیں جنہیں اصغر و جگر سے ہم نشینی وہم جلیسی کا موقع ملا تھا ۔ خود بھی اسی نواح (ضلع بہرائچ) کے رہنے والے ہیں ۔ ان دونوں اصحاب کی شکرگزاری کے لیے رسمی الفاظ ناکافی ہیں ۔

اصغر کے احباب کے علاوہ جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے ، مقالے کی تیاری میں اصغر

کے قریب ترین اعزہ کی قدیم تحریروں ، پرانے خطوط اور مراسلوں ، استفسارات کے جوابوں اور بالمشافہ گفتگووں سے بھی مدد لی گئی ھے -- ان کی فہرست اور قرابت داری کی نوعیت کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ھے -

(۱) چودھری حامد حسین :

تحصیل صدر بارہ بنکی سے چار میل دور موضع " ھڑا " کے رھنے والے تھے - بہ سلسلہ ملازمت گونڈہ اور ریاست بلرام پور میں تمام عمر رھے - بلرام پور اسٹیٹ میں محکمہ جنگلات سے متعلق تھے - اصغر کے احباب میں تھے - ان کی خوش دامن (چھٹی اور نسیم کی والدہ) سے عقد کر لیا تھا - اس رشتہ سے اصغر کے خسر ہوئے - لیکن ان کے درمیان دوستی ھی کا رشتہ غالب رہا - نیا رشتہ حائل نہیں ہوا- اصغرصاحب کی وفات کے بعد ان کی مطلقہ (چھٹی) اور بیوہ (نسیم) کے ساتھ باقر احمد صاحب (برادر نسیم) ضلع دار کے ھمراہ ، رھتے تھے وھیں انتقال کیا - چودھری حامد حسین نے سید رشید احمد صاحب اور سید مرتضیٰ علی صاحب کے نام جو خطوط لکھے ھیں (اور جن کی نقول میرے پاس محفوظ ھیں) ان سے حاجی قلی (عبدالخالق برادر نسیم جگر) ، منشی اصغر کی چھوٹی صاحبزادی کی شادی ، اور اسی قبیل کے دوسرے واقعات پر روشنی پڑتی ھے- چودھری صاحب چوں کہ خاندان کے افراد میں سے ھیں اس لیے آپ کی تحریر سند کی حیثیت رکھتی ھے -

(۲) جگر مرادآبادی :

۱۹۱۷ء کے اوائل میں اصغر کے دوست قاضی محمد حامد حسرت کی رھنمائی پر گونڈہ میں اصغر سے ملے - دو سال بعد ۱۹۱۹ء میں اصغر نے اپنی چھوٹی سالی نسیم کی شادی جگر سے کرا دی ، جو ۵ سال بعد طلاق پر منتج ھوئی ---- اس کے بعد جگر گونڈہ سے غائب ھوگئے اور ۱۵ ، ۱۲ سال میں بھی میں شیراز کی بارگاہ میں "شعلہ طور " فراھم کرتے رھے - لیکن اصغر سے رشتہ و رابطہ برابر قائم رہا - اصغر نے ۱۹۱۹ء ھی میں اپنے مرشد قاضی عبدالغنی منگلوری رحہ سے بیعت کرا دیا تھا لیکن قاضی صاحب نے اصغر کے سپرد کرتے ھوئے خصوصی توجہ کا حکم دیا ---- جگر نے تمام زندگی اصغر سے بطور مرشد استفادہ کیا - جس کا انھوں نے جابجا اعتراف و اعلان کیا ھے - جگر کے حافظہ کی خرابی ، لاابالیانہ کیفیت مزاج اور سنین یاد نہ رکھ سکنے کے نقص کے باوجود ان کی بکھری ھوئی تحریروں سے ، اصغر کی زندگی کے بہت سے گوشے روشنی میں آئے - اس مقالے کی تیاری میں جگر کے

پرانے خطوط ، " اعلان حق " ، مشمولہ شعلہ طور طبع اول ۱۹۳۲ء ، شعلہ طور کی غزلیات اور دوسری تحریروں سے ، بڑی مدد لی گئی ہے ۔ اصغر و جگر کا تعلق بیس سال رہا ، ان کے درمیان مصاہرتی رشتے کے علاوہ ، روحانی و اخلاقی اور دوستانہ و مخلصانہ رشتہ اتنا شدید تھا ، اور دونوں میں اس درجہ قرب تھا کہ ایک کو اگر دوسری کی زندگی کا رازدار کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو ـــــ اس حیثیت سے " جگر کی تحریریں " تحقیقی مقالے کے سلسلے میں بڑی اہم تاریخی دستاویزات ہیں ۔

(۳) نسیم جگر :

بقید حیات ہیں ۔ جگر منزل گونڈہ (یوپی) میں قیام ہے ۔ مئی جون ۱۹۷۰ء میں جب تحقیق کے سلسلے میں ہندوستان گیا تو باوجود شدید خواہش کے ویزا کی دشواریوں کی وجہ سے گونڈہ ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا ۔ جس کا بڑا دکھ ہوا۔ آخر میں مشکل کا حل ، جناب سید رشید احمد صاحب (جن کے دولتکدہ پر میرا قیام تھا) اور میرے ایک ہموطنی جناب افضل علی شیخ ، ریسرچ اسکالر پونا یونیورسٹی نے (جو اتفاق سے وہاں اپنی تحقیق کے سلسلے میں میرے لئے فرشتۂ رحمت بن کر آگئے تھے ، اس طرح پیش کیا کہ مئی جون کی گرمی میں میری خاطر گونڈے کے سفر کی زحمت گوارا فرمائی اور شام تک میرے سوالنامے کا تفصیلی جواب لا کر ، میری روحانی اذیت کا ازالہ کیا ۔ یہ تفصیلی گفتگو(رشید صاحب اور بیگم نسیم جگر کے درمیان) ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء کو دن کے تین بجے، ان کے دولتکدہ (جگر منزل) پر ہوئی ۔ جواب کے آخر میں نسیم جگر اور ان کے بھتیجے (حاجی گلی کے صاحبزادے) نیاز گونڈوی کے دستخط ہیں ۔ ضعیفی اور پیرانہ سالی کی وجہ سے نسیم صاحبہ خود جواب نہ لکھ سکیں ۔ بیشتر جوابات نیاز گونڈوی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں ۔ آخر میں بعض باتیں سید رشید احمد صاحب کی تحریر کردہ ہیں ۔ ان جوابات سے اصغر کی ازدواجی زندگی ، بچوں کی تعداد ، نسیم کی شادی ، جگر و نسیم کے تعلقات ، ننھی کی شادی اور اسی قسم کے دوسرے بہت سے واقعات پر روشنی پڑتی ہے ۔ اس کے علاوہ نسیم خاتون کا ایک خط بنام سید مرتضیٰ علی صاحب ، نواب سید شمس الحسن صاحب کے ذخیرۂ خطوط میں دستیاب ہوا ہے (جس کی فوٹو کاپی مقالہ میں لگا دی گئی ہے) ۔ اس سے ننھی کی رخصت کی تاریخ کا تعین ہوتا ہے ـــــ مذکورہ بالا دونوں تحریریں بڑی اہم تاریخی دستاویزات ہیں ۔

نسیم خاتون کا تعلق (آپ کا اصل نام یہی ہے) اصغر سے کوئی ۲۲، ۲۳ سال رہا ۔ جب اصغر نے ۱۲-۱۹۱۳ء میں ان کی بڑی بہن (چھٹن) سے شادی کی تو اس وقت نسیم کی عمر ۱۰، ۱۱ سال کی تھی ۔ اس وقت سے وہ برابر اصغر کے ساتھ انھی کے مکان میں

رهیں (شادی کے بعد چھٹی کے بچے کتبہ کا بار اصغر نے اٹھا لیا تھا)-- جگر سے طلاق کے بعد بھی مطلقہ کی حیثیت سے انھی کے ساتھ رہیں --- پھر اصغر سے شادی کے بعد قریب قریب دس سال ان کی خلوت و جلوت میں شریک رہیں ---- ان حالات میں اصغر کی زندگی کا شاید ھی کوئی ایسا گوشہ ہو جو چھپا رہ گیا ہو - اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے علاوہ آپ نے بہت کچھ اپنی ماں ، بڑی بہن ، چودھری حامد حسین اور بڑے بھائیوں (حاجی عبدالخالق اور باقر احمد) سے سنا - ان سے زیادہ معتبر راوی اصغر کے معاملے میں اور کون ہو سکتا ہے ---- افسوس ہے کہ پیرانہ سالی کی وجہ سے حافظہ خراب ہو گیا ہے (اس وقت ان کی عمر ۷۰ سال کے قریب ہوگی) اس وجہ سے ان کے تخمینے اور اندازے مشتبہ ہیں لیکن ان کے بیان کردہ واقعات معتبر اور مسلم ہیں -

(۴) نیاز احمد گونڈوی :

نسیم خاتون کے بھتیجے (حاجی گلّی کے صاحبزادے) ہیں اور انھیں کے ساتھ جگر منزل میں رہتے ہیں - جگر صاحب کے تربیت یافتہ ہیں - آپ ھی نے نسیم صاحبہ کا انٹرویو جناب رشید احمد سے کرایا تھا - اور تمام سوالات کے جوابات لکھے تھے نسیم صاحبہ کو جتنے خطوط لکھے گئے ، ان کے جواب نیاز صاحب کے رہین منت ہیں ----- ابو سرائے فیض آباد میں اتفاقاً جناب سید دہال احمد دہال گونڈوی سے ملاقات ہوگئی - ان کے ذریعہ بعض سوالات لکھ بھیجے اس کا جواب بھی نیاز صاحب نے مرحمت فرمایا - لیکن ان سوالات سے متعلق معلومات نسیم صاحبہ ھی سے حاصل کی گئی تھیں - ان تحریروں سے بھی مقالہ میں مدد لی گئی ہے -

(۵) جناب عبدالحئی عباسی :

موضع کھوری ضلع ساگر (سی- پی) کے رہنے والے اصغر صاحب کے چھوٹے داماد ہیں - آپ کی شادی اصغر کی چھوٹی صاحبزادی عائشہ خاتون عرف ننھی سے ، ان کے انتقال کے بعد (۷ ستمبر ۱۹۳۷ء) الہ آباد میں ہوئی - ننھی سر تیج بہادر سپرو کی بہو بھلا دیوی کی تربیت یافتہ انتہائی سلیقہ شعار خاتون تھیں - اصغر سے آنکھوں کی چمک ، ذہانت اور شائستگی ورثہ میں پائی تھی - شادی کے دو سال بعد ، جولائی ۱۹۳۹ء میں بسلسلہ زچگی ، جبلپور میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئیں - عبدالحئی عباسی صاحب سی پی سے منتقل ہو کر پاکستان آ گئے - آجکل ۳۵۲ خواجہ ہاؤس ششمائی کمپاؤنڈ کراچی میں قیام ہے - وہیں وکالت کر رہے ہیں - آپ کو دو خط بڑے تفصیلی لکھے لیکن جواب آپ کی

شان بے نیازی کی نذر ہو گیا ۔ جس کا افسوس ہے ۔ عباسی صاحب سے کسی واقعہ کی تصدیق یا تکذیب نہیں ہوئی ۔

(۶) مولانا عبدالغنی درگس :

عبدالحئی صاحب عباسی کے بہنوئی ضلع ہردوئی ، یو پی کے رہنے والے ہیں ۔ شادی کے بعد کھوئی میں آباد ہو گئے تھے ۔ ۲۵۰ مریڑ حسن ، راولپنڈی میں قیام ہے ۔ پرانی وضع کے صوفیاء و درویشوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو مقصد زندگی بنا لیا ہے ۔ پنڈی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا ، بڑی شفقت سے ملے اور جب " غایت آمد ،، معلوم ہوئی تو کھل اٹھے ۔ اصغر کے متعلق بہت سی باتیں آپ کی زبانی معلوم ہوئیں ۔ اصغر سے آپ کی ملاقات تو کبھی نہیں ہوئی لیکن اپنی سلہج (نعمی) نسیم خاتون اور چودھری حامد حسین صاحب کی زبانی سنے ہوئے حالات ، حافظہ میں محفوظ ہیں ۔ اصغر کی روحانیت کے قائل اور نعمی کی محبت ، شائستگی اور ذہانت و فطانت میں رطب اللسان ہیں ۔ عمر ۶۵ اور ستر کے درمیان ہوگی لیکن حافظہ اچھا ہے ۔۔ مولانا درگس کے تین صاحبزادگان ۔۔۔ لطیف احمد صاحب عباسی ، خلیل احمد صاحب عباسی اور وشیں احمد صاحب عباسی سے بھی اپنی تحقیق کے سلسلے میں ملاقات کی ۔ خلیل صاحب تو مولانا درگس کےساتھ ہی رہتے ہیں ۔ البتہ لطیف احمد صاحب عباسی سے ان کے دولتکدے (۵۷ بی سٹلائٹ ٹاؤن ۔ راولپنڈی) پر ملاقات ہوئی ۔

(۷) لطیف احمد عباسی :

چھیالیس سینتالیس کے لگ بھگ ہوں گے ۔ یونیورسل کالج پنڈی شعبہ اردو میں استاد ہیں ۔۔۔ آپ سے دوبار بڑی تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں ۔ پہلی ملاقات ۲۶ مئی ۱۹۷۱ء کی شام کو سات بجے ، آپ کے کالج میں ہوئی ، وہیں سے ہم لوگ ، اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ظفر احمد خان کے مکان پر آ گئے ، جہاں ۱۱ بجے رات تک نشست رہی۔ دوسرے روز یعنی ۲۷ مئی کو ۶ بجے شام ہم لوگ آپ کے دولتکدہ پر حاضر ہوئے ۔ یہ نشست بھی کوئی ڈھائی تین گھنٹے کی رہی ۔ لطیف صاحب اپنی سادی (نعمی مرحومہ) اور اصغر صاحب کا ذکر جب کرتے ہیں تو از سر تا پا کیفیت میں ڈوب جاتے ہیں ۔ آپ نے سادی کی زبانی اصغر صاحب سے متعلق بہت سی باتیں بتائیں ۔ جن کی تحقیق مجھے دوسرے ذرائع سے ہو چکی تھی ۔۔۔ البتہ ایک نئی بات معلوم ہوئی وہ فرماتے تھے کہ سادی نے بتایا کہ ایک

جوشی نے بابو (اصغر صاحب ۔ ننھی کیا گھر کے تمام لوگ حتیٰ کہ ان کے مرشد بھی، اصغر کو بابو کہتے تھے) کا ہاتھ دیکھ کر انھیں " چیت من " (––– یعنی ذی ہوش یا " روح بیدار ") کہا تھا ۔ اصغر کی روحانیت کے قائل اور ان کی نفاست پسندی کے بڑے مداح ہیں ۔ سادی کی تمام نفاست ، شائستگی ، اخلاق و محبت کو اصغر صاحب کا ورثہ کہتے ہیں ۔ اصغر صاحب کی نفاست پسندی کے سلسلے میں فرمانے لگے کہ سادی کہا کرتی تھیں کہ " بابو " کو " SWEET PEAS " کی خوشبو بہت پسند تھی ۔ اسی کا تیل سر میں لگاتے تھے ۔ واقعہ " رویت رسول صلعم " کی تصدیق آپ نے بھی کی ۔ آپ کا کہنا ہے کہ ماموں کے پاس " نشاط روح " ایک نسخہ اصغر صاحب کے ہاتھ کا ترمیم و تصحیح شدہ تھا ۔ اس میں " نعت سرور کائنات صلعم " کے بعض اشعار پر " ص " کا نشان لگا ہوا تھا ۔ میں نے ایک روز سادی سے پوچھا کہ یہ " ص " کیوں بنائے گئے ہیں تو انھوں نے کہا کہ " بابو یہ نعت خود لے کر روضۂ اطہر پر حاضر ہونا چاہتے تھے لیکن نہ پہونچ سکے تو اپنے ایک دوست کے ذریعے ارسال کی جو حضور صلعم کی خدمت اقدس میں پیش ہوئی ––– اس کے بعد ایک روز خواب میں بابو کو حضور کی زیارت نصیب ہوئی ۔ نشان کا مطلب یہ ہے کہ ان اشعار کو حضور کی بارگاہ سے شرف قبولیت کی سند عطا ہوئی ہے ۔

لطیف صاحب کا کہنا ہے کہ اصغر صاحب کے انتقال کے بعد ان کی سنہری جیبی گھڑی ، سنہری کمانی کی عینک ، واٹرمین کا فاؤنٹین پن ، ایک اورکوٹ میں نے سادی کے پاس دیکھا تھا ۔ اس کے علاوہ لکڑی کے ایک صندوق میں اصغر صاحب کا غیر مطبوعہ کلام ، خطوط اور دیگر مسودات تھے ، اصغر صاحب کا ایک بڑا قدآدم (BUST) فوٹو بھی تھا –– اب نہ معلوم یہ چیزیں کہاں گئیں ––– ننھی کے ذوق ادب کی تعریف کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ انھیں ، حافظ ، سعدی ، نظیری ، مولانا روم ، غالب اور اقبال کے بہت اشعار یاد تھے ––– اسی سلسلے میں ننھی کا ایک شعر سنایا ۔ جو درج ذیل ہے ؎

بات وہ کیا ہے کہ جس بات کے سو پہلو ہوں
ایک پہلو تو رہے بات بدلنے کے لئے

لطیف صاحب نے صمیم جگر سے متعلق بھی ایک واقعہ سنایا ۔ وہ کہتے ہیں کہ اصغر صاحب کے اس شعر پر کہ ؎

بڑا غضب ہے گریباں ہے چاک ہونے کو
تمہارے حسن کی ہوتی ہے آج پردہ دری

نسیم صاحبہ نے جواباً یہ شعر کہا تھا ؎

هم حسن کو تیرے کبھی عریاں نہ کریں گے
وحشت میں کبھی چاک گریباں نہ کریں گے

اس واقعہ کی تصدیق کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوتی بلکہ جگر صاحب کی شہادت نسیم صاحبہ کے متعلق اس کے بالکل خلاف ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

" میری اہلیہ محترمہ عام عورتوں کی طرح مطلق آرٹسٹ (   )
واقع نہیں ہوئی ہیں ۔"

(مکاتیب جگر ۔ ص ۲٦)

(۸) رئیس احمد عباسی :

جناب لطیف عباسی کے سب سے چھوٹے بھائی ، گورنمنٹ کالج ساہیوال میں اردو کے استاد ہیں ۔ بیالیس تنتالیس کا سن ہوگا آپ سے یکم مئی ۱۹۷۰ء کو کالج لائبریری میں کوئی دو تین گھنٹے ملاقات رہی ۔ آپ کی گفتگو سے یہ عقدہ کھلا کہ وہ "صندوق اور فوٹو" جس کا ذکر لطیف احمد عباسی نے بھی بعد میں کیا تھا ، آپ کی دوسری ماں نے (یعنی حشی عباسی صاحب کہ دوسری بیوی جو لکھنئو جھوائی ٹولہ کے حکیموں کے خاندان سے ہیں اور دنھی کی وفات کے بعد بیاہ کر آئی تھیں) ---- سوتاپے کی جھال میں جلا ڈالا ۔ اس کا ماموں کو بڑا صدمہ ہوا لیکن کر کیا سکتے تھے ۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر ماں نے بکس جلایا نہ ہوتا تو میں خود " اصغر " پر پی ایچ ڈی کرتا ۔ مواد گھر ہی میں موجود تھا ۔ رئیس صاحب کی معلومات کا ذریعہ بھی ان کی ماں یعنی دنھی ہیں ۔ بقول خود اس وقت پانچ سال کے ہوں گے ۔ لہذا کچھ زیادہ یاد نہیں کچھ دھندلے دھندلے نقوش حافظہ میں رہ گئے ہیں ۔۔۔۔۔۔

xxxxxx

ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے جن کے مفید مشوروں ، رہنمائیوں ، شفقتوں اور مواد کی فراہمی میں امداد و اعانت کے بغیر یہ مقالہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا ان حضرات میں استاذی العلام ڈاکٹر غلام مصطفی خانصاحب مدظلہ کا خاص طور پر ممنون ہوں جن کی رہنمائی اور نگرانی میں مقالہ لکھا گیا ہے ۔ اگر آپ نے مرحلہ اوّل ------ " عنوان کی منظوری " سے لے کر ، مقالے کی تکمیل تک ہمت افزائی نہ فرمائی ہوتی ، تو اصغر سے جس تعلق و عقیدت کا اظہار ابتدائی سطور میں کیا گیا ہے ، سینہ میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو کر رہ گیا ہوتا ۔ مشرقی وضع کے بزرگوں کے لیے " شکریہ " کا لفظ استعمال کرنا ان

کی شان میں گستاخی اور مشرقی آداب و روایات کے خلاف ہے ۔ لیکن " جذبۂ تشکر سے سرشاری " اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود انسان ۔ ہاں اس کے اظہار کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں ۔ میں مشرقی روایت کی نزاکتوں اور شرافتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے تمام تر جذبۂ تشکر و احسان مندی ، کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اس امید کے ساتھ حاضر ہوتا ہوں کہ ع

" شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را "

دلدار بھائی (ڈاکٹر فرمان فتحپوری) کے لئے " شکریہ " کا لفظ لکھنا ان کے خلوص و محبت کی توہین ہے کہ اس سے " بیگانگی " کی بو آتی ہے ۔ ان کے لئے میرا تمام وجود جذبات امتنان و احسان مندی ، سے لبریز ہے ـــ اگر آپ نے میری ہمت نہ بندھائی ہوتی اور استاذ محترم جناب ڈاکٹر مصطفی خانصاحب کی خدمت میں رسائی کا وسیلہ نہ بنے ہوتے تو یہ مقالہ نہ لکھا جاتا ـــ احباب میں جناب توکل حسین قدوائی ، جناب شاہ الحق صدیقی ، جناب ڈاکٹر محمد اسلام ، جناب ایوب قادری ، جناب ریاض الدین ، جناب محمد آغا سہیل ، جناب محمد اقبال مرزا ، جناب حفیظ الرحمن خان وغیرہم کا حد درجہ ممنون ہوں کہ آپ حضرات سے تبادلۂ خیالات کے اکثر مواقع ملتے رہے ۔ جن سے میں نے بہت استفادہ کیا ۔

احسان فراموشی ہوگی اگر اپنے محسن و شفیق بزرگ جناب بشیر حسین صاحب ضیائی کی عنایات کا اعتراف نہ کروں ۔ آپ نے مواد کی فراہمی میں جس دیدہ ریزی اور بالغ نظری سے میری رہنمائی فرمائی وہ ایک عالم ہی کا حصہ ہے ۔ آپ کے ذاتی کتب خانہ کا دروازہ ہروقت میرے لئے کھلا رہا ۔ مجھے اس کے اعتراف و اعلان میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ایسے "نوادر" خصوصاً پرانے رسائل کے فائل بڑی بڑی لائبریریوں میں بھی مشکل سے ملیں گے ۔ ضیائی صاحب نے تمام چیزیں میرے تصرف میں دے دی تھیں ۔ میں نے ان سے بقدر ظرف و استعداد استفادہ کیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دم سے میری طرح کے بہت سے " تشنگان راہ تحقیق " کی پیاس بجھتی ہے ۔

چھوٹوں میں اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ظفر احمد خان ، استاد جغرافیہ ، گورنمنٹ کالج راولپنڈی اور رفیق کار سید معین الرحمن ، جو کسی طرح چھوٹے بھائی سے کم نہیں ، کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے ۔ اوّل الذکر نے مقالے کی ترتیب و تہذیب میں گران قدر مشورے دیئے اور معین صاحب نے مسودات کو پڑھ کر جب تک اپنے مخصوص انداز میں " سر نہیں ہلا دیا " ، اپنی تحریر پر اعتماد نہیں جما ۔

مقالہ ہرگز تکمیل کو نہ پہنچتا اگر میری رفیقۂ حیات اور بچوں نے مجھے گھر کے بکھیڑوں سے بے نیاز نہ کر دیا ہوتا ۔ واقعہ یہ ہے کہ تحقیق کی اس طویل مدت میں ، ان کی وجہ سے جو یکسوئی و دلجمعی حاصل رہی ، ان سے مقالے کی تیاری میں بڑی مدد ملی ۔ ان کا شکریہ ادا کرنا " رسم پرستی " ہے ان کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے ۔

آخر میں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ مقالے کی ظاہری زیب و زینت اور ٹائپنگ برادرم شمشیر احمد بٹ کی رہین منت ہے ۔ ان کی اس خصوصی زحمت کشی کے لئے حد درجہ ممنون ہوں ۔

محمد اقبال احمد خان

......

باب اوّل

سوانح حیات

صفحہ

۱- نام و نسب ۳۸

۲- تعلیم و تربیت ۳۹

۳- ملازمت و مشاغل :

(الف) ریلوے ۶۲

(ب) سرکاری ۶۹

(ج) بساط خانہ کی دوکان ۷۰

(د) جھنگ کا کاروبار ۷۲

(ہ) صحافت ۷۷

(و) اردو مرکز ، لاہور ۷۹

(ز) انڈین پریس ، الہ آباد ۹۲

(ح) ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد ۱۰۰

۴- ازواج و اولاد :

(الف) پہلی شادی ۱۰۸

(ب) دوسری شادی ۱۱۱

(ج) تیسری شادی ۱۲۳

(د) اولاد ۱۵۹

۵- مرض الموت اور وفات :

(الف) فالج کا پہلا حملہ ۱۶۵

(ب) دوسرا حملہ ۱۶۵

(ج) تیسرا حملہ اور وفات ۱۶۶

۶- مراسم تدفین اور مزار ۱۶۷

نام و نسب :

اسغر حسین نام ۔ اصغر تخلص ، نسلاً شیخ صدیقی[1] ۔ آبائی وطن ضلع گورکھپور ۔ ان کے والد منشی تفضل حسین بسلسلۂ ملازمت ۱۸۸۲ء میں گونڈہ آئے ۔ تفصیلی حالات معلوم نہ ہو سکے کہ گونڈے سے بدل کر وہ کہاں کہاں گئے (اور پنشن کب لی) ۔ مولوی سراج الحق صاحب کی مختلف تحریروں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ کچھ دنوں[*] (زیادہ سے زیادہ ۶ ، ۷ سال) مچھلی شہر[2] ضلع جون پور اور فیض آباد[3] میں برسر کار رہے ۔ ۱۸۹۸ء کے لگ بھگ دوبارہ گونڈہ آئے (اصغر ۱۸۹۸ء[4] کے قریب گونڈہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے) ۔ اور آخر دم تک گونڈے ہی میں رہے ۔ یہیں سے بحیثیت صدر قانون گو پنشن لی اور گونڈہ کو اپنا وطن بنا لیا ۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں (جب مرزا احسان احمد صاحب نے اعظم گڑھ سے نشاط روح شائع کی تو) وہ بقید حیات تھے[5] ۔ منشی تفضل حسین صاحب کا انتقال ۱۹۲۹ء[6] میں الہ آباد میں ہوا اور وہ وہیں سپرد خاک ہوئے ۔

اصغر یکم مارچ ۱۸۸۴ء[7] (بروز ہفتہ[8]) بمطابق ۳ جمادی الاوّل ۱۳۰۱ھ) گونڈے میں پیدا ہوئے ، عمر کے آخری دس سال چھوڑ کر ، تمام زندگی گونڈہ میں رہے ۔ اسی نسبت سے گونڈوی کہلائے ۔

۱۔ اصغر ۔ مرتبہ عبدالشکور ۔ مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۲۵ء ۔ ص ۲۹

*۔ مولوی سراج الحق صاحب کی اصل عبارت یہ ہے ۔ " میرے وطن مچھلی شہر کے بعض ذی وجاہت حضرات نے مشاعرہ کیا اور الہ آباد سے بیشتر شعرا کو بلایا ۔ اصغر صاحب کو لانے کے لیے مجھے تعینات کیا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ وہاں پہنچا مگر سخت ناکامی ہوئی ۔ انھوں نے شرکت سے انکار کر دیا ۔ میں نے ہر طرح ترغیب دی یہ بھی کہا کہ آپ کے والد صاحب وہاں برسر کار رہ چکے ہیں آپ بھی لڑکپن میں وہاں رہے ہیں ۔ کچھ بوڑھے لوگ آپ کے والد کے دوست ابھی زندہ ہیں وہ آپ سے اور آپ ان سے مل کر امید ہے کہ خوش ہونگے ۔ مگر جناب ان کو نہ جانا تھا نہ گئے " ۔ لڑکپن کی عمر ۷ ، ۸ سال سے ۱۱ ، ۱۲ سال تک ہوتی ہے ، اصغر ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے ۔ اس حساب سے یہ واقعہ ۱۸۹۱-۹۲ء تا ۱۸۹۶-۹۷ء کا ہونا چاہیے ۔

۲۔ ایضاً ۔ ص ۲۰-۲۱

۳۔ بحوالہ سراج الحق صاحب کی ایک قدیم تحریر جو کسی کی فرمائش پر ، اصغر کے ایماء پر لکھی گئی تھی اور اصغر کی نظر سے گذر چکی ہے ۔

۴۔ اصغر گونڈوی ۔ تحریر سید عبدالرشید احمد ۔ چٹان لاہور شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۸

(باقی حواشی اگلے صفحہ پر)

تعلیم و تربیت :

اصغر کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں لوگوں نے بڑی قیاس آرائیاں کی ہیں - بعض لوگوں نے اسے والہانہ شوق اور جدت طرازی میں کچھ افسانوی رنگ دے دیا ہے ، جس سے حقیقت کھل کر سامنے آنے کے بجائے اور چھپ گئی ہے - آگے بڑھنے سے پہلے ان بیانات کا استقصاء اور تجزیہ ضروری ہے تاکہ حقیقت کو سمجھنے میں ان سے مدد ملے -

دراصل ، اس معاملہ میں سب سے پہلی سہل انگاری مرزا احسان احمد صاحب کی طرف سے ہوئی - ان تمام قیاس آرائیوں کا سرچشمہ ان کے " مقدمہ نشاط روح " کے مندرجات ہیں - وہ رقمطراز ہیں :

" ابتدائی تعلیم معمولی اور غیر مستقل طور پر ہوئی - کچھ دنوں انگریزی مدرسہ میں تعلیم پا کر چھوڑ دیا - انٹرنس کے امتحان کے لیے تیاری کی لیکن خانگی پریشانیوں کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے - تاہم اس تھوڑی سی مدت میں فطری صلاحیت کی وجہ سے اتنی استعداد پیدا ہوگئی کہ انگریزی کتابوں کا کافی لطف اٹھا سکتے ہیں یہی حال عربی و فارسی کا ہے - جو کچھ قابلیت پیدا کی ہے وہ صرف ان کے ذاتی مطالعہ کتب اور غور و فکر کا نتیجہ ہے - اور حقیقت یہ ہے کہ ایک صحیح الفطرت شخص کو خارجی وسائل کی رہنمائی کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے - خود اس کی فطرت کی تجلی اس کے دل و دماغ کو منور کرتی رہتی ہے چنانچہ باوجود اس کے کہ حضرت اصغر نے باقاعدہ طور پر علوم و فنون کی تحصیل نہیں

(حواشی از گذشتہ صفحہ)

۵- مقدمہ نشاط روح - از مرزا احسان احمد - طبع اول مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ ص ۲ مرزا صاحب کی اصل عبارت یہ ہے " عرصہ سے مستقل طور پر گونڈے میں ہیں جہاں ان کے والد ایک مدت سے قانون گو تھے لیکن اب پنشن پاتے ہیں -"

۶- منشی تفضل حسین کے انتقال کے متعلق میرے استفسار پر تسنیم خاتون (بیوہ اصغر و جگر) نے لکھا " الہ آباد میں انتقال ہوا - اصغر صاحب کے انتقال سے ۶-۷ برس پہلے " - اصغر کا انتقال نومبر ۱۹۳۶ء میں ہوا ہے اس حساب سے منشی تفضل حسین صاحب کا سال وفات ۱۹۲۹-۳۰ء ہوا -- اسی استفسار کے حاشیے پر " محلہ کٹرہ والے مکان کے قیام کے دوران ان کا انتقال ہوا " درج ہے -- اصغر نے کٹرہ والا مکان اگست ۱۹۲۹ء میں چھوڑ چکے تھے (مکتوب جناب علی ظہیر بنام راقم مقالہ ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء) - اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ منشی تفضل حسین کا انتقال اگست ۱۹۲۹ء سے قبل ہوا -

۷- " نشاط روح " طبع اول - ص ۳-- زمانہ کانپور جنوری ۱۹۳۷ء صفحہ پر اصغر کا سال ولادت ۱۸۸۲ء لکھا ہے جو غلط ہے -

۸- بحوالہ تقویم ہجری و عیسوی شائع کردہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی ۱۹۵۲ء

کی ۔ ان کی نظر میں علمی اور ادبی حیثیت سے جو وسعت و لطافت ہے وہ قابل رشک ہے [۱]۔"

جناب صغیر احمد صدیقی صاحب فرماتے ہیں :

" اصغر صاحب کی ابتدائی زندگی باقاعدہ تعلیم و تربیت سے ناآشنا رہی --- ابتدائی تعلیم کی تفصیل نہیں معلوم ہوا اس کے کہ باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے ۔ ویسے گونڈہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے تھے مگر آٹھویں جماعت کا امتحان نہ پاس کر سکے ۔ ان کے ایک ہم جماعت جناب ڈاکٹر محمدحفیظ سید صاحب کا بیان ہے کہ امتحان میں ناکامیابی کے باوجود ان کی ذہانت و فطانت کے سب معترف تھے ۔ اصغر مرحوم کو دل و دماغ کی جو صلاحیتیں فطرت نے ودیعت کی تھیں وہ درس و تدریس ، آزمائش و امتحان کے رسوم و قیود کی کب متحمل ہو سکتی تھیں ۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ انھوں نے کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی ، ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں کو کبھی ان کی علمیت کی کمی کا احساس نہیں ہوا [۲]۔"

عبدالشکور صاحب " اصغر اور اس کا کلام " میں لکھتے ہیں :

" بچپن ناز و نعم میں بسر ہوا ۔ جوانی عشق کی بادیہ پیمائی آشفتہ سری کی نذر ہوئی ۔ اسکول اور کالج کی بکواس سے گریزاں اور درس و تدریس کے سلسلے سے بھاگتے رہے ۔ نہ ابتدائی صحبت اچھی تھی اور نہ تعلیم و تربیت معقول [۳]۔"

ان بیانات سے جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ اسی ترتیب سے درج ذیل ہیں :

(الف) مرزا احسان احمد (۱) " ابتدائی تعلیم معمولی اور غیر مستقل تھی " ۔

(۲) کچھ دنوں انگریزی پڑھ کر چھوڑ دیا ۔ انٹرنس کے امتحان کی تیاری کی لیکن خانگی پریشانیوں کی وجہ سے چھوڑ دیا " --- اس جملہ سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ انٹرنس تک تعلیم باقاعدہ حاصل کی تھی یا پرائیویٹ طور پر ۔ سیاق و سباق سے یہ خیال پیدا

۱۔ " مقدمہ " نشاط روح/از مرزا احسان بیگ ۔ ص ۷-۶ ۔ طبع دوم صدیق بک ڈپو لکھنو ۔

۲۔ نقوش لاہور شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۳۸۲

۳۔ اصغر ۔ مرتبہ عبدالشکور ۔ مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۳۵ء ۔ ص ۱۶۰

ہوتا ہے کہ شاید تعلیم چھوڑنے کے بعد پرائیوٹ طور پر انٹرنس کی تیاری کی ہو ۔ جو حقیقت کے خلاف ہے اور جس کی صراحت آگے کی گئی ہے ۔

(۳) " تھوڑی سی مدت میں فطری صلاحیت کی وجہ سے اتنی استعداد پیدا ہوگئی کہ وہ انگریزی کتابوں کے مطالعہ سے کافی لطف اٹھا سکتے تھے "

(۴) " جو کچھ قابلیت پیدا کی ہے وہ صرف ان کے ذاتی مطالعہ کتب اور غور و فکر کا نتیجہ ہے .... (کیونکہ) صحیح الفطرت شخص کو خارجی وسائل کی رہنمائی کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے " ...... اس سے تفصیلی بحث آگے کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ باوجود اپنی صحیح الفطرتی اور ذاتی مطالعہ کتب و غور و فکر ، کے قدم قدم پر اصغر کو خارجی وسائل کی رہنمائی حاصل رہی ۔

(ب) صغیر صدیقی صاحب بھی قریب قریب یہی کہتے ہیں ۔ البتہ ان کے اس بیان کی کہ " وہ آٹھویں جماعت پاس نہ کر سکے " احسان صاحب کی تحریر سے تردید ہوتی ہے اور امر واقعہ بھی کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے جس کی تصدیق قرائن مابعد سے ہوتی ہے ۔۔ صدیقی صاحب کے بیان کا آخری حصہ " اصغر مرحوم کو ...... کب متحمل ہو سکتی تھیں " مرزا احسان احمد کی صدائے باز گشت معلوم ہوتا ہے ۔

(ج) شکور صاحب کا بیان ان دونوں حضرات کے مقابلہ میں زیادہ عقیدت مندانہ ، مبالغہ آمیز اور گمراہ کن ہے ۔ اس کا یہ ٹکڑا کہ " بچپن ناز و نعم میں بسر ہوا " ان کے ذہن کی اختراع ہے ، اصغر کے کسی سوانح نگار نے اس کا ذکر کہیں نہیں کیا ۔

۲- " جوانی عشق کی بادیہ پیمائی اور آشفتہ سری کی نذر ہوئی " ۔۔ یہ بحث دوسرے موقع پر کی گئی ہے اور یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ " عشق کی بادیہ پیمائی اور آشفتہ سری " کا یہ دور اتنا مختصر اور عارضی تھا کہ " پوری جوانی " کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا ۔ رہا ان کا یہ ارشاد کہ " اسکول اور کالج کی بکواس سے گریزاں اور درس و تدریس سے بھاگتے رہے " اگر وہ اس سے اصغر کو کوئی مافوق الفطرت ہستی ثابت کرنا چاہتے ہوں تو اور بات ہے ورنہ حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ اصغر نے کالج میں یقیناً تعلیم نہیں پائی لیکن انٹرنس تک تعلیم حاصل کی ہے ۔ اس زمانہ میں انٹرنس تک پڑھ لینا معمولی تعلیم نہیں سمجھی جاتی تھی ۔ ہم اسے معمولی تعلیم ہی کہیں پھر بھی اسے " اسکول اور کالج کی بکواس " سے تعبیر نہیں کر سکتے ۔ اور نہ اس سے اصغر کے مستثنیٰ اور گریزاں ہونے کا کوئی ثبوت ہمیں ملتا ہے ۔ ان کے اس جملے سے کہ " نہ ابتدائی صحبت اچھی تھی نہ تعلیم و تربیت معقول " خواہ مخواہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ " اصغر بچپن ہی میں بری صحبتوں میں پڑ گئے تھے اور اسی لئے ان کا جی پڑھائی کی طرف سے اچاٹ ہو گیا تھا

اور وہ درس و تدریس سے بھاگتے تھے " ۔ وہ یہ دکھا کر ، جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے شاید یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ علوم متداولہ کی تحصیل سے بے نیازی کے باوجود اصغر بہت بڑے اہل حال و قال ، صوفی اور شاعر تھے ۔ یہ اصغر کی کرامت تھی یا ان کے مرشد کی کرامت ۔ اس تاثر کے پیچھے حقیقت سے زیادہ عقیدت کارفرما نظر آتی ہے اور عقیدت خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو علمی و تحقیقی کام کے لیے سم قاتل ہوتی ہے ۔

ان روایات کے تجزیہ سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کے راوی اور اصغر کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور اس کے مدارج کیا تھے ۔ عمروں کے تفاوت ، فکر و نظر کی وسعت و ہم آہنگی ، زمان و مکان اور صحت مذاق کے عناصر کو ہم کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے ۔

ان تصریحات کی روشنی میں جب ہم ان روایات کا جائزہ لیتے ہیں تو شکور صاحب کا بیان سب سے زیادہ بے بنیاد اور ناقابل اعتماد ٹھہرتا ہے انھیں اصغر سے صرف نیاز حاصل تھا[1] انھوں نے کہیں یہ نہیں فرمایا کہ " مجھے اصغر سے بڑا قرب حاصل رہا ہے" محض " نیاز " کی بنیاد پر بچپن کے حالات کا علم وہ بھی صحیح علم مشکل نہیں ۔ ان کے بیان کا ماخذ مرزا احسان احمد صاحب کی تحریر ہے جس میں زیب داستان کے لیے کچھ اضافہ کر دیا گیا ہے ۔ اس لیے ان کے افسانوی تحریر کو " کعبۂ تحقیق " کے طواف میں " بیرون در " سے گزر کر " درون خانہ "[*] آنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی ۔

جناب صغیر صدیقی صاحب کی کل مدت ملاقات تین سال ہے[2] (۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۶ء) وہ اس وقت ایم اے کے طالب علم تھے (لاکھ اصغر کے عقیدت مند سہی) اس عمر میں یہ حوصلہ کہاں اور کس کو ہوتا ہے کہ عقیدت و حفظ مراتب کے پیش نظر وہ کسی بزرگ محترم کے حالات زندگی کے جزئیات پر گفتگو کرے ۔ اپنی تحریر میں ایک نام ڈاکٹر حفیظ سیدصاحب کا انھوں نے ایسا لکھا ہے ، جن کا بیان یقیناً" بڑا اہم اور قابل اعتماد ہوتا تھا ، مگر ان کی زبانی صرف اصغر کی " ذہانت و فطانت " بیان کر کے چپ ہو گئے ہیں ۔ پھر ان کے بیان میں ایک بڑی زبردست واقعاتی غلطی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ " وہ آٹھویں جماعت کا امتحان نہ پاس کر سکے " اس سے ان کے بیان پر سے اور اعتماد اٹھ جاتا ہے ۔

۱۔ اصغر ۔ مرتبہ عبدالشکور ۔ مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۳۵ء ۔ ص ۱۶۲

*۔ بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند — کہ برون در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

عراقی

۲۔ نقوش لاہور شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۲۸۳

اب رہ گیا مرزا احسان احمد صاحب کا بیان - اس کو یقیناً ان دونوں حضرات کے بیانات پر ترجیح و تفوق حاصل ہے - "نشاط روح" اوائل دسمبر ۱۹۲۵ء میں اصغر کے سامنے چھپی اور علی گڑھ یونیورسٹی کی جوبلی کے موقع پر شائع کی گئی - اس سے مرزا صاحب کے بیان کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے لیکن جیسا کہ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ مرزا صاحب نے کلام کے مقابلہ میں "حالات زندگی" جمع کرنے پر کوئی خاص کوشش و توجہ نہیں صرف کی ورنہ وہ بھی نسبتاً زیادہ مستند اور مفید ہوتے -

مرزا احسان احمد صاحب جناب اصغر اور ان کے کلام سے جگر صاحب کی وساطت سے متعارف ہوئے - بقول ڈاکٹر محمد اسلام صاحب جگر صاحب کی اصغر صاحب سے پہلی ملاقات ۱۹۱۹ء[1] میں ہوئی ، سید رشید احمد صاحب گونڈے میں جگر کی آمد[2] ۱۹۱۷ء میں بتاتے ہیں - مرزا احسان احمد صاحب مقدمہ داغ جگر[3] میں ۱۸-۱۹۱۷ء لکھتے ہیں -

ان تمام مختلف بیانات میں یوں تطبیق پیدا کی جا سکتی ہے کہ جگر صاحب گونڈہ کی ادبی محفل میں ۱۹۱۷ء میں روشناس ہوئے ، اصغر سے ان کی ملاقات بھی اسی[4] وقت ہوئی لیکن تعلقات بڑھتے بڑھتے دو ایک سال لگ گئے یہاں تک کہ ۱۸-۱۹۱۷ء[۵ الف] میں دونوں نے مل کر چشمہ کا ایک کارخانہ قائم کر لیا جس کے آرڈر جگر صاحب شہر شہر گھوم پھر کر حاصل کرتے اور اصغر صاحب گونڈہ میں قیام کر کے اس کی تعمیل کرتے[5] - اسی سلسلے میں جگر اعظم گڑھ گئے اور اپنی شاعری اور سحور کن آواز سے اعظم گڑھ کے ادبی حلقہ میں ایک خاص مقام بنا لیا - انہوں نے پہلے پہل اصغر کو اعظم گڑھ والوں سے متعارف کرایا اور ان کا کلام سنایا - انہیں سے مرزا صاحب کو ان کا کلام ملا[6] - اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ مرزا صاحب اصغر کے کلام سے ۱۹۱۹ء[7] اور ۱۹۲۰ء کے درمیان متعارف ہوئے -

---

۱- جگر حیات اور شاعری - ص ۵۹-

۲- نجی خط - ص ۳

۳- جگر اور اس کی شاعری - مرتبہ انور عادل - ص ۱۵۰ -- مرزا صاحب کی اصل عبارت یہ ہے "چنانچہ چار پانچ برس کا عرصہ ہوا کہ وہ اس سلسلے میں گونڈے بھی گئے جہاں اصغر حسین صاحب سے ملاقات ہوئی -" -- داغ جگر ۱۹۲۱ء میں پہلی بار طبع ہوئی- اس طرح یہ واقعہ ۱۹۱۷ء کا ہوا -

۴- رشید صاحب "دونوں کو ایک ہی چیز سمجھتے -- نجی خط رشید صاحب -

۵- چٹان شمارہ ۱۷ جولائی ۱۹۶۵ء - ص ۱۹

۵الف "مقدمہ" داغ جگر - بحوالہ جگر اور اسکی شاعری - مرتبہ انور عادل - ص ۱۵۱

۶- نشاط روح - ص ۳

۷- جگر اوّل اوّل اعظم گڑھ ۱۹۱۹ء میں پہونچے - مقالات احسان - ص ۲۱۷ -- مرزا صاحب "یاد جگر" میں لکھتے ہیں "اس تعلق کی ابتدا ۱۹۱۹ء سے ہوئی" - میری ایک استفسار کے جواب میں بھی مرزا صاحب نے جگر سے پہلی ملاقات کا سال ۱۹۱۹ء ہی لکھا ہے

اس بات کی تصدیق مرزا صاحب کی تحریر سے بھی ہوتی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" حضرت اصغر شاعرانہ حیثیت سے بالکل غیر معروف نہیں ہیں ۔
ان کی نظمیں اکثر جرائد ادبیہ میں شائع ہوتی رہی ہیں جن کی
وجہ سے وہ مخصوص حلقوں میں کافی طور پر روشناس ہیں ۔ لیکن
عام ادبی دنیا اب تک ان کی حقیقی شاعرانہ عظمت سے ناآشنا ہے
اس بنا پر جب حضرت جگر کے دیوان کی ترتیب و اشاعت کے دوران
میں مجھ کو ان کا کچھ کلام ہاتھ آیا ،تو اسی وقت سے میرا ارادہ
تھا کہ " بزم ادب " کی طرف سے ایک منتخب مجموعہ ارباب سخن
کی خدمت میں پیش کیا جائے ۔ چنانچہ تمہید کے طور پر میں نے
دسمبر ۱۹۲۱ء کے علی گڑھ میگزین میں " کلام اصغر " کے عنوان سے
ایک مختصر سی تنقید لکھی تھی [1] ۔"

اقتباس بالا سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کلام اصغر ، مرزا صاحب کو کلام جگر کی ترتیب و اشاعت کے دوران میں ہاتھ آیا تھا ۔ جگر کا پہلا مجموعہ " داغ جگر " کے نام سے ۱۹۲۱ء میں مرزا صاحب نے شائع کیا [۲] ۔ لیکن ان کے کلام پر تعارفی نوٹ " اہالیان لکھنؤ اور دہلی کے لیے ایک خوان ادب " جنوری ۱۹۲۰ء کے مخزن میں شائع ہوا ۔ گویا جنوری ۱۹۲۰ء سے پہلے مرزا صاحب جگر اور ان کے کلام سے متعارف ہو چکے ہیں ۔ دسمبر ۱۹۲۱ء [*] علی گڑھ میگزین میں اصغر پر مرزا صاحب کا تنقیدی مضمون شائع ہوا ــــ لہذا یہ بات محقق ہو جاتی ہے کہ مرزا صاحب ، اصغر کے نام اور کلام سے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان روشناس ہو چکے تھے ۔ لیکن اشاعت " نشاط روح " سے پہلے صرف ایک ملاقات [۳] کا پتہ چلتا ہے ۔ تاہم اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ۲۵-۱۹۱۹ء کے درمیان متعدد ملاقاتیں ہو چکی تھیں جب بھی مدت ملاقات اشاعت نشاط روح کے وقت ۵ ، ۷ سال سے زیادہ نہیں بنتی ۔

۱۔ نشاط روح ۔ ص ۲-۳

۲،۳۔ جگر حیات اور شاعری ۔ از ڈاکٹر محمد اسلام ۔ ص ۱۸۹۔ اسلام صاحب نے داغ جگر کا سال طباعت ۲۲ء لکھا ہے جو غلط ہے ۔

*۔ دسمبر ۱۹۲۱ء علی گڑھ میگزین کی ابتدائی سطور میں مرزا احسان بیگ صاحب رقمطراز ہیں " حضرت جگر کے وساطت سے ان کے کلام کا معتدبہ ذخیرہ ہم کو ملا ہے جو عنقریب مع ان کے ذاتی حالات کے بزم ادب کی طرف سے ارباب ذوق کی خدمت میں پیش کیا جائے گا ۔"

۴۔ جناب بشیراحمد صدیقی نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہ " آپ سے اصغر صاحب کی پہلی ملاقات کب (کس سال) اور کہاں ہوئی؟ " فرمایا " مرزا احسان صاحب کے گھر پر ، ۱۹۱۹ء میں ، جب میں گرمی کی چھٹیوں میں اعظم گڑھ گیا تھا ۔ اس وقت میں ایف اے کا طالب علم تھا ــ زبانی گفتگو ــ لیکن مرزا احسان صاحب کوئی سال نہیں بتاتے

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ مرزا صاحب کے پیش نظر صرف کلام کی تدوین تھی ، حالات زندگی کو انھوں نے کوئی اہمیت نہیں دی ۔ اس کی تصدیق ان کی تحریر سے بھی ہوتی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" میں نے وعدہ کیا تھا کہ عنقریب جناب اصغر کا کلام مع ان کے ذاتی حالات کے ارباب ذوق کی خدمت میں پیش کروں گا لیکن افسوس ہے کہ متعدد اسباب کی وجہ سے اتنی مُدّت تک مجھ کو ساکت رہنا پڑا ۔ لیکن اس خیال سے بالکل غافل نہیں رہا ۔ چنانچہ اس اثناء میں وقتاً فوقتاً جو کلام اخبارات و رسائل میں نظر پڑا ، جمع کرتا رہا ۔ بلکہ اسی ضرورت سے ایک بار حضرت اصغر کی خدمت میں گونڈہ بھی گیا لیکن اس جہاد کا کوئی معتدبہ نتیجہ نہ نکلا .... غرض مجھ کو جناب اصغر سے خود کوئی معتدبہ مدد نہ ملی بلکہ ان کی اس شان بے خیالی پر افسوس ہوا ۔!.......... حضرت جگر کی وساطت سے مجھ کو حضرت اصغر کا تھوڑا سا کلام شروع ہی میں مل گیا تھا ......"[1]

اس پورے اقتباس میں دو چیزیں توجہ طلب ہیں ، اوّل تو یہ کہ جناب احسان صرف ایک بار حضرت اصغر کے پاس گونڈہ گئے لیکن ان کو جمع کلام کے سلسلے میں ان سے کوئی مدد نہ ملی ۔ دوسری بات یہ ہے کہ حالات زندگی کے بارے میں حضرت اصغر سے پوچھ گچھ کی کوئی تفصیل نہیں ملتی نہ اس کا کوئی ذکر ہے ۔ ان کو تو صرف کلام جمع کرنے کی فکر تھی ۔ اگر سوانح حیات کو اہمیت دیتے تو اس کی تفصیل وہ ضرور اصغر سے معلوم کرتے ۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا ۔ میرے خیال میں انھوں نے زیادہ سے زیادہ اصغر سے ان کی تاریخ ولادت ، آبائی وطن ، والد کا نام، گونڈے میں قیام کی مدت ، اور سرسری طور پر یہ پوچھ لیا کہ کہاں تک تعلیم پائی ہے ۔ اور بس ۔ اس لیے ان کا بیان " کچھ خواب ہے ، کچھ اصل ہے ، کچھ طرز ادا ہے[2] " سے زیادہ کی اہمیت کا حامل نہیں ۔ لہٰذا تعلیم و تربیت کے بارے میں ان کے بیان پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا ۔

۱۔ نشاط روح / طبع دوم ۔ ص ۳

۲۔ پورا شعر حسب ذیل ہے ؎

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرز ادا ہے

اصغر

اب بحث اس نقطہ پر پہنچ گئی ہے جہاں اصغر کی تعلیم و تربیت تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے -

اصغر کی ابتدائی تعلیم (فارسی ، عربی - اردو) دستور قدیم کے مطابق مکتب میں ہوئی (افسوس ہے کہ اصغر کے اساتذہ اور مدرسہ کا نام نہ معلوم ہو سکا) - والد کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا - گھر میں فارسی اور دینیات کی کتابوں اور طویل داستانوں کا خاصا ذخیرہ تھا - والد کی صحبت اور خصوصی توجہ سے اصغر میں بھی مطالعہ کا شوق پیدا ہوا جو تمام عمر قائم رہا - فارسی سے شغف اور اس کا ذوق والد ہی کے فیضان صحبت کا نتیجہ ہے - جس نے آگے چل کر ان کی شاعری کے اسلوب اور لفظیات کی تعیین و تخلیق میں نمایاں حصہ لیا - گھر کے ماحول اور دینیات کے مطالعہ نے ان کو مذہب اور تصوف کی طرف راغب کیا اور طویل داستانوں کی طلسماتی دنیا سے ان میں تخیل پرستی اور رومانیت آئی -

ابتدائی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۸۹۸ء کے لگ بھگ وہ گونڈہ ہائی اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں انگریزی مڈل (آٹھویں درجہ کا امتحان ان دنوں تعلیمی بورڈ کے تحت ہوتا تھا - جو مڈل کہلاتا تھا) پاس کیا - ۱۹۰۶ء میں جب وہ دسویں درجہ میں تھے اور انٹرنس کا امتحان دینے والے تھے کہ باپ کے ایماء پر تعلیم ترک کر دی ...... اس زمانہ میں متوسط طبقہ کے نوجوانوں کے لئے ، اتنی انگریزی تعلیم ، ملازمت کے لیے کافی سمجھی جاتی تھی - چنانچہ اصغر نے بھی اس کے سہارے ملازمت کی تلاش شروع کر دی[1]..... لیکن دوران ملازمت میں ان کو ایک ایسا نادر موقع اور ایک ایسا رہنما مل گیا ، جس کی صحبت میں انھوں نے انگریزی ادب سے کافی استفادہ کیا اور انگریزی زبان کی خاصی استعداد پیدا کر لی -

یہ ہے مرزا صاحب کے " کچھ دنوں انگریزی مدرسہ میں تعلیم پا کر چھوڑ دیا " کی حقیقت - واقعہ یہ ہے کہ اصغر نے پورے آٹھ سال (۱۸۹۸ء تا ۱۹۰۶ء) تک باقاعدہ اسکول میں انگریزی تعلیم حاصل کی - وہ آگے پڑھنا چاہتے تھے کہ باپ کے ایماء پر تعلیم

۱- چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۸ء ص ۸-۷ --- تحریر سید رشید احمد صاحب - میں نے ابتدائی حالات ، بلکہ بعد کے واقعات کے سلسلے میں بھی ، زیادہ تر بھروسہ سید رشید احمد صاحب کی تحریر پر کیا ہے --- اس وقت تک اصغر کے متعلق جتنی تحریریں شائع ہوئی ہیں ، ان میں سب سے زیادہ قابل اعتماد رشید صاحب ہی کی تحریر ہے ، کیونکہ رشید صاحب کا تعلق اصغر صاحب سے ۱۹۱۳ء سے آخر دم تک رہا ہے ، ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۵ء - رشید صاحب اور اصغر صاحب دونوں گونڈے میں رہے ہیں ، ان کا صبح و شام کا ساتھ رہا ہے - ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۶ء برابر خط و کتابت رہی ہے - رشید صاحب کا بیان یوں بھی زیادہ مستند ہو جاتا ہے کہ انھوں نے گونڈے کے ان گلی کوچوں اور لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے ، بلکہ انھیں میں اپنی زندگی کے ۲۳ سال گزارے ہیں جن میں اصغر پیدا ہوئے ، پلے بڑھے اور اصغر ہوئے - پھر ان کا پیشہ (پولیس) ایسا تھا کہ ان سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی -

ترک کرنا پڑی لیکن اپنے شوق سے مطالعہ برابر جاری رکھا (رہا یہ کہ خانگی پریشانیوں کی وجہ سے تعلیم ترک کر دی تو اس کی کوئی صراحت رشید صاحب کی تحریر میں موجود نہیں) جن دنوں وہ ریلوے میں ملازم تھے اور ان کی تعیناتی جرول روڈ ضلع بہرائچ ، میں تھی ان کا افسر بالا (P.W.I) ایک شریف اینگلوانڈین تھا ۔ وہ اصغر کی ذہانت و فطانت سے کافی متاثر تھا اور اصغر نے بھی اپنے حسن کارکردگی سے اس کو اپنا گرویدہ بنا لیا ۔ وہ اصغر کا دوست ہو گیا ۔ اس کی صحبت میں اصغر نے انگریزی ادب کا خاصا مطالعہ کیا اور اس کے رمز شناس بن گئے ۔ اس اجمال کی تفصیل رشید صاحب سے سنیے ۔ وہ فرماتے ہیں :

" ریلوے ملازمت کے دوران اصغر کچھ عرصہ تک .P.W.I جرول روڈ کے تحت بحیثیت ٹائم کیپر تعینات تھے .... وہاں کا P.W.I ایک شریف اینگلوانڈین تھا .... وہ ان کے (اصغر کے) اصول اور خوبیوں سے واقف ہو کر ان کی کافی عزت و قدر کرتا تھا .... اصغر کبھی وہاں (جرول روڈ) رہتے کبھی گونڈہ چلے آتے ۔ اپنے معمولی فرائض کی انجام دہی کے بعد جو تین چار گھنٹے میں تمام ہو جاتے ۔ انھیں فرصت ہی فرصت رہتی ۔ وہ روزمرہ کے فرائض ادا کرنے کے بعد اپنا سارا وقت اردو ، فارسی اور انگریزی کے مطالعہ پر صرف کرتے ۔ انگریزی سے ہنوز وہ بہت معمولی طور پر آشنا تھے ۔ اور بطور خود ادبیات انگریزی کے سمجھنے کے اہل نہ تھے ۔ اس میں ان کے اینگلوانڈین افسر نے جو اصغر کی فطانت ، شوق مطالعہ اور ذوق سلیم سے کافی متاثر تھا ان کی بڑی رہنمائی کی .... انگریزی ادبیات سے ابتداً جو کچھ واقفیت اور دلچسپی اصغر کو پیدا ہوئی وہ اسی کی تعلیم اور فیضان صحبت کا نتیجہ تھا [۱]"

اس بیان کی روشنی میں مرزا صاحب کا یہ بیان ضعیف ہو جاتا ہے کہ " تاہم اس تھوڑی سی مدت میں فطری صلاحیت کی وجہ سے اتنی استعداد پیدا ہوگئی کہ انگریزی کتابوں کا کافی لطف اٹھا سکتے تھے [۲]" آگے چل کر رشید صاحب رقمطراز ہیں :

۱۔ چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۸

۲۔ نشاط روح طبع اول ۔ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۵ء ۔ ص ۲

" انھوں نے فارسی کتب کے مطالعہ کے علاوہ کچھ عربی کی کتابوں سے بھی استفادہ کی کوشش کی تھی ، علامہ ابن عربی کی فصوص الحکم اور اسی قسم کی دیگر کتابیں اور انگریزی میں آسکر وائلڈ وغیرہ کی تصانیف ان کے زیر مطالعہ رہی تھیں ۔ اس طرح ان میں نقد و استدلال کا خاصا شعور و ملکہ پیدا ہو گیا تھا جو مطالعہ کے ساتھ بتدریج ترقی کرتا رہا ۔[1] "

اقتباسات بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اصغر نے حسب استطاعت و توفیق عربی ، فارسی اور انگریزی کا خاصا مطالعہ کیا تھا یہاں تک کہ ان میں نقد و نظر کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی ۔ " وہ دقیق سے دقیق اور پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مسائل کی تہ تک اس آسانی سے پہونچ جاتے تھے کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا تھاکہ اس مرحلہ سے ان کو پہلی بار سابقہ پڑا تھا ۔[2] " اپنی لیاقت و ذہن رسا کی وجہ سے ان کا شمار " اردو کے بہت سے شعرا سے کہیں زیادہ ذی علم و ذی استعداد[3] " لوگوں میں ہوتا تھا ۔ فارسی کا تو خیر ان دنوں چرچا ہی تھا ، کوئی شخص جب تک اس میں ڈوب نہ جائے ، تہذیب و شائستگی سے عاری سمجھا جاتا تھا لہذا اس کے شعر و ادب میں اصغر کا درک و بصیرت حاصل کرنا کوئی اتنی بڑی بات نہ تھی ، جبکہ فکر و نظر و تہذیب و معاشرت کے تمام شعبوں میں فارسی چھائی ہوئی تھی البتہ انگریزی میں اتنی استعداد بہم پہنچا لینا کہ انگریزی کتاب کے ترجمہ پر الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر شاہ محمد سلیمان کا ان الفاظ میں اعتراف کہ " اگر میں بھی ترجمہ کرتا تو اس سے بہتر نہ ہو سکتا[4] " یا یا " برنرڈشا کی طنز پر قہقہے لگانا[5] " معمولی بات نہیں ہے ۔

سچ یہ ہے کہ جن لوگوں نے محض سرٹیفکٹ اور ڈگری کو نظر میں رکھ کر ، اصغر کی انگریزی کی لیاقت اور علمیت کا اندازہ لگایا ہے ، ان کا اس نتیجہ پر پہنچنا کہ "انگریزی کی خواندگی کچھ زیادہ نہ تھی[6] " یا " آٹھویں جماعت کا امتحان پاس نہ کر سکے[7] " کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے لیکن خلاف واقعہ ضرور ہے ۔

۱۔ اصغر صاحب ۔ از سید رشید احمد ۔ جامعہ دہلی ۔ اپریل ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۰۲

۲ ، ۳۔ گنج ہائے گرانمایہ ۔ ص ۱۳۰ ۔ مطبوعہ آئینہ ادب ۱۹۶۴ء

۴۔ نقوش شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۳۸۵

۵۔ انتخاب اصغر ۔ مرتبہ جمیل نقوی ۔ مطبوعہ ۱۹۵۲ء (اردو مرکز ۔ لاہور) ص ۳۱

۶۔ گنج ہائے گرانمایہ ۔ مطبوعہ آئینہ ادب ۔ ص ۱۳۰

۷۔ نقوش شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۳۸۳

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اصغر نے کوئی سرٹیفکیٹ یا ڈگری (سوا مڈل کی سند کے) حاصل نہیں کی تھی لیکن انگریزی کی باقاعدہ تعلیم انٹرنس تک پائی تھی ۔ اپنے اینگلوانڈین دوست کی رہنمائی کی بدولت نہ صرف یہ کہ انگریزی ادب سے روشناس ہوئے بلکہ اس کے رمز شناس بھی ہوئے ۔ آسکروائلڈ کی تصنیفات اور برنارڈشا کے ڈراموں سے متمتع و مستفید ہوئے ۔ ورڈسورتھ کے تصانیف اور اس کی شاعری سے آشنا ہوئے[1] ۔ عربی میں فصوص الحکم کے علاوہ بھی بعض کتابیں پڑھیں اور فارسی میں دیوان حافظ ، مثنوی مولانا روم ، حالات ، ملفوظات و مکتوبات شیخ احمد سرہندی[2] ، مظہر جانجاناں کے حالات اور فارسی کا کلام[3] اور نہ معلوم کیا کیا پڑھا ـــــ مختصر یہ کہ اصغر کا مطالعہ خاصا وسیع تھا ۔ مطالعہ کی کثرت اور اخذ و استنباط کی صلاحیت سے ان میں نقد و استدلال کا ایسا ملکہ و شعور پیدا ہو گیا تھا کہ بڑے بڑے مشرب مآب ان کی ہمہ جہت شخصیت کے معترف و مداح تھے[4] ۔ یہ بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اصغر کو زندگی کے مختلف مراحل میں ایسے ایسے ارباب علم و فضل کی معیت و صحبت حاصل رہی جس کے فیضان و برکت سے ، ان میں " تحقیق و کاوش کا بہت بلند ذوق و شعور پیدا ہو گیا[5] ۔"

اگرچہ تعلیم و تربیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن اب تک اصغر کے صرف تعلیمی پہلو پر گفتگو کی گئی ہے ـــــ تربیت کا پہلو معرض بحث میں نہیں آیا ۔ اب ان کی تربیت کا کچھ ذکر مقصود ہے ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں اس زمانے کے ماحول پر نظر ڈالنا ہوگی ۔ اصغر ۱۸۸۴ء میں گونڈے (مضافات لکھنؤ[6]) یعنی اودھ میں پیدا ہوئے ۔ اودھ جو اس وقت علم و فضل ، شعر و ادب اور رقص و موسیقی کا گہوارہ و مسکن تھا ۔ اس کے مضافاتی شہر اور قصبات بھی اسی حد ایرانی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے جس میں مذہب کا ظاہر (رسوم و شعائر) انفرادی و اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا محرک ، اور مذہب کی روح (تصوف اور بھگتی کی شکل میں) ـــــ جس کا مقصد غائی

۱ـ یادگار نسیم ـ ص ۲۲
۲ـ انتخاب اصغر ـ مرتبہ جمیل نقوی ـ ص ۳۲
۳ـ چند شخصیتیں چند تاثرات ـ ڈاکٹر زور ـ مطبوعہ ۱۹۶۲ء بار اول ـ ص ۳۵-۲۷
۴ـ گنج ہائے گرانمایہ ـ مطبوعہ آئینہ ادب ـ ص ۱۳۰
۵ـ چند شخصیتیں چند تاثرات ـ ص ۲۷
۶ـ لکھنؤ سے گونڈے کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ ۶۰ ، ۷۰ میل ہے ۔

انسان دوستی تھا ـــ سب سے بڑا صب العین تھا ۔ معاشی نظام جاگیر دارانہ تھا جس کے بعض اقدار معاشرت میں روح بن کر سمائے ہوئے تھے اور جن کا احترام و التزام مذہبی روایات واقدار سے کسی طرح کم نہ تھا ۔ انگریزوں کے روز افزوں اقتدار کے باوجود فارسی علمی و تہذیبی زبان تھی ، شعر و ادب سے شغف ، مشاعروں کا قیام و اہتمام ، رقص و موسیقی کی محفلوں کا انعقاد ، " ارباب نشاط " سے دلبستگی ـــ بلکہ دل لگی تہذیب و شائستگی کی نشانی اور ریاست و امارت کی شان سمجھی جاتی تھی ۔ جس میں " طوائف " صرف ہوس کی تشنگی بجھانے کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ اسکی " صحبت " بہترین " تربیت گاہ " اور اس کا " بالاخانہ " " واحد ادارہ " تھا ۔ جہاں سے علم مجلسی ، شعر و شاعری ، فنون لطیفہ (خصوصاً رقص و موسیقی) اور تہذیب و شائستگی کی دستار فضیلت ملتی تھی ۔ اس معاشرہ کے پروردہ روسا و امرا کے علاوہ طبقہ متوسط کے افراد کی شخصیت پر بھی ، اس تہذیب کی چھاپ بڑی گہری ہوتی تھی ـــ جس کا جزو اعظم مذہب سے شغف ، حفظ مراتب کا لحاظ اور معاشرتی اقدار کی پاسداری تھا ۔ یہ وضع داری تھی اور وضع داری بہت بڑی خوبی سمجھی جاتی تھی ۔

اصغر نے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا تو گھر سے لے کر باہر تک کی بھی فضا ایک ہی رنگ میں رنگی نظر آئی ۔ لہذا ان کی شخصیت کا اس رنگ میں اس حد تک اور اتنا پختہ رنگ جانا کہ تمام عمر اس پر کسی دوسرے رنگ کا نہ چڑھنا ، یہی نہیں بلکہ اس کا صرف اسی رنگ کو قبول کرنا جو ان کے اس بنیادی رنگ سے میل کھاتا ہو ، جس نے آگے چل کر ان کی شخصیت و سیرت کے اس بنیادی رنگ کو تیز تر اور شوخ تر کر دیا ، کوئی تعجب کی بات نہیں ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے والد پڑھے لکھے باذوق ، مطالعہ کے شائق ، داستانی دنیا کے سیاح ، مذہبیات و دینیات[*] کے دلدادہ متوسط درجہ کے ایک متمول سفید پوش بزرگ تھے ۔ ہر باپ کی طرح اصغر کے والد نے بھی اصغر میں اپنے ظاہری و باطنی صفات پیدا کرنے کی کوشش کی اور ننھے اصغر نے بھی " باپ کی شخصیت " کو اپنے لئے نمونہ بنایا ـــ

---

[*] گھر میں دینیات کی کتابوں کے ذخیرہ سے ان کے مذہبی و دینی رجحان کا پتہ چلتا ہے ۔ اسکے علاوہ سر پر پٹے اور چہرہ پر داڑھی میں بھی میری نزدیک ، فیشن سے زیادہ مذہبی رجحان ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے ... اگر ان کے تفصیلی حالات معلوم ہوتے تو میں ممکن تھاکہ اس بات کا بھی انکشاف ہوتا کہ وہ بھی پیری مریدی کے قائل بلکہ کسی بزرگ کے مرید تھے ۔ تاہم اصغر کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ، ان کے والد کے ظاہری و باطنی اوصاف کا ، جتنا کچھ بھی ہمیں علم ہے ، نظر میں رکھنا انتہائی ضروری ہے ۔

اس بات کی تصدیق سید رشید احمد صاحب کی تحریر سے بھی ہوتی ہے - وہ لکھتے ہیں :

" منشی تفضل حسین قدیم مشرقی تہذیب و تمدن کا نمونہ تھے، کشیدہ قامت ، خوش رو ، ادھیڑ عمر سے آگے نکلتے ہوئے چہرے پر فرنچ وضع کی خوشنما گھنی داڑھی ، بڑی بڑی روشن خلافسی آنکھیں اور سر پر لمبے بالوں کے پٹے ، کم سخن اور کم آمیز فرصت کا سارا وقت مطالعہ میں بسر ہوتا - کبھی افیون سے بھی شوق فرماتے تھے ----- اصغر نے باپ کے چہرے کے تیکھے نقوش اور سحور کن آنکھیں ورثہ میں پائی تھیں اور زندگی کے سفر میں آگے بڑھ کر اپنے باپ ہی کی وضع و قطع اختیار کی -[1] "

اقتباس بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اصغر نے نہ صرف یہ کہ باپ کی شکل و صورت قد و قامت اور باپ جیسے تیکھے نقوش پائے تھے اور آگے چل کر انہیں کی وضع قطع اختیار کی تھی بلکہ ان کے باطنی اوصاف --- کم گوئی ، کم آمیزی ، نفاست پسندی ، مشرقی تہذیب و تمدن سے لگاؤ ، مطالعہ کا شوق ، مذہبی رجحان ، ضبط نفس[*] اور تہیہ و اطاعت کا شدید میلان --- بھی ورثہ میں پائے تھے - اصغر کی تربیت و تعمیر کی یہی وہ بنیادی خشت ہے جس پر ان کی شخصیت کی دیوار اٹھی جو " ثریا " تک سیدھی گئی - ان کی شخصیت کی یہی وہ ڈلک ہے جو کسی صحبت ، کسی مرحلہ اور زندگی کے کسی حصہ میں ماند نہیں پڑی -

کسی فرد کی شخصیت کی تعمیر اس کے فطری و موروثی اوصاف ، خاندانی روایات و اقدار ، سیرت و کردار کے پیش نظر نمونے ، اور اخلاق و اعمال کی معاشرتی پسند و ناپسند کے معیار سے ہوتی ہے ---- فرد کے فطری و موروثی اوصاف بمنزلہ زمین ، خاندانی روایات ، اقدار و سیرت و کردار بمنزلہ مسالہ اور اخلاق و اعمال کا معاشرتی معیار بمنزلہ سنگ و خشت

۱- چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۷

*- رشید صاحب کا یہ جملہ کہ " کبھی افیون سے بھی شوق فرماتے تھے " بڑا اہم اور معنی خیز ہے - اسکے معنی یہ ہوئے کہ منشی تفضل حسین صاحب نے افیون چھوڑ دی تھی - حالانکہ اس کا اگر چسکا پڑ جائے تو نہیں چھوٹتا --- منشی صاحب کے اسی فعل کو میں نے " ضبط نفس " اور تہیہ و اطاعت سے تعبیر کیا ہے --- یہی چیز آگے چل کر ہمیں اصغر کے کردار میں نظر آتی ہے - وہ بھی شراب کے عادی اور بختی ہونے کے باوجود اس سے ایسی توبہ کرتے ہیں کہ پھر کبھی ادھر کا رخ نہیں کرتے -

کے ہوتے ہیں ۔ ان عوامل و عناصر سے مل کر شخصیت کی جو بنیاد اٹھتی ہے وہ انتہائی پختہ ، محکم اور مضبوط ہوتی ہے ۔ اس بنیاد پر اٹھنے والی سیرت و کردار کی فلک بوس عمارت پر خواہ کیسا ہی رنگ و روغن کیوں نہ چڑھا دیا جائے ---- یعنی " بنیادی شخصیت " بدستور قائم رہے گی ---- جب بھی کسی زلزلہ سے عمارت گرے گی تو نیچے سے وہی " پختہ بنیاد " نکل آئے گی ۔ یہاں ایک بات اور ذہن میں رکھنے کی ہے کہ " بنیادی شخصیت " کے خدو خال حالات کے غبار سے کبھی کبھی دب ضرور جاتے ہیں ۔ مٹتے نہیں ۔ جس طرح مردہ بیج ۔ ذرا سی نمی اور روشنی پا کر دوبارہ پھوٹ آتا ہے -- اسی طرح سازگار ماحول اور مساعد حالات میں " بنیادی شخصیت " دوبارہ برگ و بار لاتی --- اور اگر حالات میں مداومت ہو تو تناور درخت بن جاتی ہے ۔

جن لوگوں نے اصغر کی ابتدائی تربیت کے متعلق یہ کہا ہے کہ " معمولی اور غیر مستقل تھی[1] " یا " ابتدائی زندگی باقاعدہ تعلیم و تربیت سے ناآشنا رہی ، جوانی میں بے راہ ہو گئے اور منہیات میں بالکل ڈوب گئے[2] " یا یہ کہ " نہ ابتدائی صحبت اچھی تھی نہ تعلیم و تربیت معقول[3] " انھوں نے نہ تو اصغر کی فطری صلاحیتوں اور موروثی اوصاف کو سامنے رکھا ، نہ ان کے والد کی سیرت و کردار کے موثر و دیرپا نقوش نظر میں رکھے اور نہ اس زمانہ کے عمومی اخلاق و اقدار ذہن میں رکھے -- یوں بھی تعلیم و تربیت کو صرف اسکول اور کالج تک محدود کر دینا درست نہیں ہے ۔ چلئے اگر یہ بھی مان لیں کہ اسکول اور کالج ہی بچہ کی واحد تربیت گاہ ہیں جب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اصغر نے بائیس سال کی عمر تک (۱۸۸۳ء تا ۱۹۰۶ء) باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل کی -- یہ عمر کا وہ حصہ ہے ، جس میں بیشتر حالات میں پختگی آ جاتی ہے ۔

رہا ان کا جوانی میں بے راہ ہو جانے کا مسئلہ تو یہ ایک الگ بحث ہے ۔ اس کا ابتدائی تعلیم و تربیت کے نقص یا فقدان سے اتنا تعلق نہیں ہے جتنا کہ " جوانی کی افتاد[4] " سے ، اس سے تفصیلی بحث آگے آئے گی ---- یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے وہ یہ کہ باوجود اس کے کہ اصغر " بادۂ شبینہ کی سرمستیوں میں ایسے کھوئے گئے ، ایسے

۱۔ نشاط روح ۔ ص ۶

۲۔ نقوش شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۲۸۳

۳۔ اصغر ۔ مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۱۲۰

۴۔ " در عہد جوانی چناں کی افتد دانی " یہاں یہ اشارہ شاید بے محل نہ ہو کہ بائیس سال کی عمر تک اصغر کے کردار میں بے راہ روی کی کوئی مثال نہیں ملتی ۔

ہمہ تن غرق و شرابور ہونے کہ حلقہ شیدہ کے بے آشاموں پر سبقت لے جانے میں ان کا نام ہو گیا "[1] ـــــ اور باوجود اس کے کہ " وہ اپنے نام نہاد دوستوں کی وساطت سے تفریح و تفنن کے لئے ارباب نشاط کے کوچہ میں پہنچ گئے "[2] ـــــ ان کی ابتدائی تربیت سے آراستہ " بنیادی شخصیت " گناہ و معصیت کے اس بار کی زیادہ مدت تک متحمل نہ ہو سکی اور بہت جلد اس گناہ پرور ماحول سے نکل بھاگی ـــــ اسمیں ان کی فطری سلامت روی کے ساتھ ساتھ ان کی ابتدائی تربیت کا بھی فیضان تھا ۔

شخصیت کو غیر نامیاتی اور جامد سمجھ لینا ، تعلیم و تربیت اور اس کے اثر کو کسی خاص حصۂ زندگی تک محدود و مخصوص کر دینا اور اس پر بھی زندگی کا قیاس کر لینا ، انتہائی گمراہ کن اور بڑا ہی غیر علمی طریقہ ہے ۔ شخصیت ایک نامیاتی اور ارتقا پذیر حقیقت ہے ۔ وہ قدم قدم پر زندگی سے نمو و بالیدگی اور آب و رنگ حاصل کرتی رہتی ہے جن لوگوں نے " تعلیم و تربیت کے مفروضہ نقص " سے اصغر کی شخصیت کی غلط تصویر پیش کی ہے اور پھر اس کے ذریعہ ایک دم سے ان میں یا ان کے مرشد میں معجزاتی اور کراماتی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے اصغر کو سمجھتے وقت حقائق کی بہت سی اہم کڑیوں کو لاعلمی سے یا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا ہے ـــــ پچھلی سطور میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ نہ صرف یہ کہ " اصغر کی ابتدائی زندگی باقاعدہ تعلیم و تربیت سے ناآشنا " نہیں تھی بلکہ یہ کہ اعلی تربیت سے آراستہ و مزین تھی ـــــ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہی اصغر جو بقول ان حضرات کے تعلیم و تربیت سے ناآشنائے محض تھے جب ریلوے میں ٹائم کیپر ہو جاتے ہیں تو باوجود موقع پانے اور سابقہ روایت کی موجودگی کے " پہلے کے بابوؤں کی طرح نہ اپنے ماتحت بارہ ماسیوں کی مزدوری میں کوئی کاٹ کپٹ کرتے (ہیں) ، نہ اپنا کوئی حصہ بناتے (ہیں) ، اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے برعکس " ان کی معمولی فروگذاشتوں اور حاضری میں دیر سویر کو نظر انداز کر دیتے اور وقت ضرورت ان کی مدد کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے "[3] ـــــ اور اصغر کی یہ کیفیت اس وقت تھی جو ان کی زندگی کا بدترین دور تھا (۱۹۰۷ء تا ۱۹۱۲ء) ۔ جب بقول صغیر احمد صدیقی صاحب وہ " منہیات میں بالکل ڈوب گئے " تھے ۔ جب عیش سامانیوں اور عشرت کوشیوں کے لئے

۱ـ چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ـ ص ۸
۲ـ ایضاً
۳ـ چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ـ ص ۱۸

ہر وقت پیسوں کی ضرورت تھی ۔ اصغر نے اس عہد سیہ کاری میں بھی اپنی شخصیت کی چمک برقرار رکھی ۔ اسی دور میں ان کی احسان دوستی اور اعلیٰ اصاسی اخلاق نے ، ان کے بارہ ماسیوں اور ریلوے کے دیگر ملازمین سے انھیں " بابو[1] " کا پر محبت و پر تکریم خطاب دلوایا ، جو تمام زندگی ان کے نام کا جزو رہا ۔ یہاں تک کہ ان کے مرشد بھی انھیں اسی نام سے یاد فرماتے[2]۔

اصغر کی شخصیت کو بھی طرح سمجھنے کے لئے ، ان کے سوانح نگار پر یہ زبردست ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کے اس اہم دور (بچپن اور عنفوان شباب) سے گزر کر ، اسکے بعد کی زندگی کے مختلف ادوار ، ہر دور میں اثر انداز ہونے والے ان عناصر و شخصیات کو بھی مدنظر رکھے جنھوں نے ان کی " بنیادی شخصیت " کو تابناک و روشن کر کے جاذب نظر اور دلکش بنا دیا ـــ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہماری نظر ان کے محسن اور دوست بابو راج بہادر[3] پر پڑتی ہے جن کے شاید احسان سے دب کر اور جوانی کی لہر اور ترنگ میں آ کر انھوں نے اپنے کو شراب میں غرق کر دیا تھا۔ انھیں کے ساتھ ساتھ کنور وشو ناتھ صاحب وکیل[4] بابو راج بہادر کے سالے ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے " حلقۂ شبینہ " میں وہ برابر کے شریک تھے ۔ ان دونوں حضرات کو شعر و شاعری کا چسکا تھا ۔ ظاہر ہے کہ ان کی طبیعت پر ان حضرات کا رنگ ضرور چڑھا ہوگا۔ ریلوے کی ملازمت کے دوران میں ان کا ساتھ اس " شریف اینگلوانڈین " سے ہو جاتا ہے ، جس نے ان میں انگریزی ادب کا ذوق پیدا کیا ۔ انھیں دنوں وہ قصبہ جرول کے رئیس و تعلقدار سید علی حیدر صاحب دل[5] سے متعارف ہوتے ہیں جن کی زودگوئی اور قادرالکلامی کا یہ عالم تھا کہ " حقہ کی ہر کش پر شعر نازل ہوتے چلے آتے .... جس میں زبان و بیان اور ردیف و قافیہ کے عجیب کرتب ، داؤ پیچ اور پینترے دکھائے جاتے ـــ اور یاران نکتہ دان کے لیے عرش ہنر کی صلائے عام ہوتی[6] " کون کہہ سکتا ہے کہ یہی صحبتیں ان

۱- چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۱۸

۲- نقوش شخصیات نمبر جلد دوم - ص ۱۳۸۳ ، اصغر مرتبہ عبدالشکور - اصغر اور اسکی شاعری - ص ۲۱۶

۳- چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۸

۴- ایضاً

۵- ایضاً - ص ۱۹

۶- ایضاً

کے لئے شعر و شاعری کی محرک اور زبان و بیان کے کرتب دکھانے کا سبب نہ بنی ہوں ۔ اس سے جب ہم ذرا اور آگے بڑھتے ہیں تو ان کی بساط خانے کی دوکان کو " دوستوں کی سیر و تفریح اور گپ بازی کا اڈا پاتے ہیں جہاں اکثر قدیم و جدید شعرا کا کلام اور دیگر علمی موضوعات پر ..... نقد و تبصرہ کی محفل گرم ہوتی تھی[1] " جس میں " قدیم اسکول کے ایک ذی علم بزرگ حکیم عبدالباری اصاری[2] " کی شخصیت بھی ہمیں نظر آتی ہے " جو اپنے روایتی اور کتابی علم کے سہارے[3] " تھوڑی ہی دور سہی ، لیکن ان کے ساتھ چلتے نظر آتے ہیں ـــ کیا عجب ہے کہ روایتی علم سے آگاہی ، اس پر نظر اور اس کی ترکستان کو جانے والی راہیں ، اصغر پر انہیں صحبتوں میں کھلی ہوں ۔ اور اس طرح قدیم و جدید کی پرکھ اور نقد و تبصرہ کی صلاحیت ان میں پیدا ہوتی ہوء جو بعد میں چل کر " متوازن ، مستند اور بے لوث تنقید[4] " کا ملکہ اور " اعلی تحقیق و کاوش کا ذوق[5] " بن کر ابھری ہو ـــ یہ تو بہرحال مسلّم ہے کہ اصاری صاحب ، قاضی عبدالغنی منگلوری کے مرید تھے ۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ انہیں کی صحبت کے اثر سے، اصغر قاضی صاحب کی طرف مائل ہوئے ہوں ـــ اس بات کا اعتراف تو ان کے سبھی سوانح نگاروں نے کیا ہے کہ قاضی صاحب کی شخصیت نے " اصغر کو یکسر بدل دیا[6] " ـــ لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جب ان کی آتش سناکی نے " روح کی تشنگی کو ناقابل برداشت حد تک تیز تر[7] " کر دیا تو وہ خود اس کو بجھانے کے لیے بیتاب ہوگئے یہ ان کے دبادخانہ" دل میں دبی ہوئی تلاش حق کی وہی خواہش تھی جسے ان کے بچپن کی تربیت نے بیدار کر دیا تھا ، جس پر حالات کی ایک گرد سی پڑ گئی تھی ـــ یہ الگ بات ہے کہ جب یہ بیج پھوٹ نکلنے کے لیے بے چین ہو گیا تو قاضی صاحب کی ذات گرامی روشنی اور نمو کا سرچشمہ بن گئی ـــ یہاں ایک بات کی طرف اشارہ رہ گیا ۔ وہ یہ کہ اصغر اپنے " عہد نشاط " میں طائفہ رامش و رنگ کے ایک فرد کی طرف بھی مائل رہے ہیں جو بعد میں تائب ہو کر ان کی زندگی کا ہمسفر بن گیا ۔ کون کہہ سکتا ہے

۱۔ چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۰

۲۔ ایضاً

۳۔ گنج ہائے گرانمایہ مطبوعہ آئینہ ادب بار پنجم ۱۹۶۳ء ۔ ص ۱۳۰

۵۔ چند شخصیتیں چند تاثرات ۔ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ ۔ بار اول ۱۹۶۲ء ۔ ص ۲۷

۶۔ نقوش شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۲۸۴

۷۔ ایضاً ۔ ص ۱۲۸۳

کہ ان کی طبیعت کی رنگینی کے لئے وہاں غذا نہ ملی ہو نیز اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ موسیقی سے انھیں جو طبعی مناسبت نظر آتی ہے (جس سے ان کی شاعری میں بلا کی وجد آفرین اور روح پرور کیفیت پیدا ہو گئی ہے) اسکی تہذیب و تربیت کا سامان وہاں ملا ہو اور اس صلاحیت کی سیرابی و آبیاری وہاں ہوئی ہو ۔۔ اصغر کی تعلیم و تربیت میں ان عوامل نے ۲۰-۱۹۱۹ء تک حصہ لیا ۔ اس کے بعد ان میں بعض نئے عوامل کا اضافہ ہوا ۔ وہ ۲۰-۱۹۱۹ء کے قریب اعظم گڑھ میں متعارف ہوئے اس کا سلسلہ آخیر عمر تک قائم رہا ۔ اعظم گڑھ " پورب دیس "* کا " غرناطہ و بغداد " ۔۔ شبلی کا زاد بوم ۔۔ ان کا آراستہ و پیراستہ کردہ تھا ۔ شبلی کی طبیعت جسے عجم کا حسن اور عرب کا سوز دروں قدرت کی طرف سے ارزانی ہوا تھا ، جب سرسید کی حرارت نفس اور مغرب کی دراکی فکر سے مستنیر ہو کر اور مجلیٰ ہو گئی ۔۔ اور مشرق و مغرب کی دوآتشہ مے علم و عرفان سے سرشار ہو کر جب شبلی خود پیر مغان بنے تو انھوں نے پینے پلانے کا وہ اہتمام کیا کہ " شبلی منزل میں دُرد آشاموں کا جمگھٹا لگ گیا ۔ یہی چیز شبلی کے لیے کفارۂ عصیان ہو گیا "[1] ۔۔۔ اس میخانۂ علم و عرفان (اعظم گڑھ) میں قرآن و حدیث تاریخ و سیر ، فقہ و فلسفۂ اسلام ، شعر و ادب اور علوم مغرب کے جام لنڈھائے گئے۔

ہر " رند دُرد آشام " اپنے زمانہ کا عطار و رومی ، رازی و غزالی اور سینا و فارابی تھا ۔۔۔ اصغر یہیں مولانا اقبال سہیل ، مرزا احسان احمد ، مولانا سید سلیمان ندوی ، مولانا عبدالسلام ندوی ، شاہ معین الدین ندوی اور اسی حلقہ کی وساطت سے مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم سے متعارف ہوئے ۔۔۔ اسی حلقہ نے اصغر کو علی گڑھ سے

---

*۔ لکھنئو اور کانپور سے مشرق کا تمام علاقہ پورب کہلاتا ہے ۔ اسکی بولی کو " پوربی " کہتے ہیں ۔ چنانچہ میر نے لکھنئو میں جو قطعہ پڑھا تھا اس میں " پورب کے ساکنو " پر بڑا زور دیا تھا ۔ یوں تو مسلمانوں کے زمانہ میں چھوٹے چھوٹے شہروں میں علما و فضلا کا جمگھٹ تھا لیکن جونپور اور اس کے بعد لکھنئو کو جو شہرت حاصل ہو رہی ہے وہ تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں ۔۔ اعظم گڑھ ان دونوں کے بعد ، بیسویں صدی میں مرکز علم و فضل بنتا ہے ۔ لکھنئو نے تو اپنی مسند اب بھی برقرار رکھی ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ جونپور کی حیثیت علم و فضل کے " تکیہ " سے زیادہ نہیں ۔ میر کا قطعہ یہ ہے

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہمکو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دہلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے جہاں منتخب ہی روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویرانہ کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

۱۔ حکم ہے پیر مغاں کا کہ جوانی نہ گنواؤ ۔
خیر کفارۂ عصیاں ہے پیو اور پلاؤ حالی

روشناس کیا جہاں وہ پروفیسر رشید احمد صدیقی ، مولانا احسن مارہروی ، مولانا سلیمان اشرف ، مولانا ابوبکر محمد شیث جیسے بزرگوں سے ملے ۔ پھر علی گڑھ والوں نے ان کی ایسی قدردانی کی کہ لاہور والوں نے انھیں "ثریا"[1] سمجھ کر لپک لیا ۔ یہاں ان کی صحبت علامہ سیماب اکبر آبادی فانی ، یگانہ چنگیزی ، علامہ تاجور نجیب آبادی جیسے صاحب کمال شعرا و ادبا سے رہی ، یہیں انھیں شیخ عبدالقادر جیسے نقاد فن سخن شناس اور شاعرِ بزرگ سے ملنے کا اتفاق ہوا اور یہیں انھیں اقبال کے کلام سے زیادہ خود اقبال کو قریب سے دیکھنے ، سمجھنے اور ان سے استفادہ کا موقع ملا ۔ اصغر کی شخصیت کی تعمیر و تربیت میں ان بزرگ شخصیتوں کا نمایاں حصہ تھا ۔ اصغر حسب ذوق و توفیق "ہر گوشہ" سے متمتع ہوئے ۔ اور اقبال کا اثر تو ان کے کلام میں اتنا نمایاں ہے کہ ان کا کوئی سوانح یا تنقید نگار ، اس سے آنکھیں بچاکر نہیں گزر سکتا ۔[2]

اصغر کے دوران قیام لاہور سے متعلق جناب عابد علی عابد نے اپنا ایک تاثر قلم بند فرمایا ہے جس میں اصغر کی علمی لیاقت اور قابلیت پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔ اس سے اتنا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ۲۷-۱۹۲۶ء میں اصغر کی تعلیمی حالت کیا تھی ۔ وہ رقمطراز ہیں :

> " میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اصغر نے انگریزی کی تعلیم کس منزل تک حاصل کی تھی ۔ عربی سے میرا خیال ہے وہ بہ قدر ضرورت آگاہ تھے فارسی خوب جانتے تھے اور کلاسیکی شاعری کی تمام

---

۱ ۔ سرمستیوں میں شیشۂ مے لے کے ہاتھ میں اتنا اچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے
اصغر

۲ ۔ اصغر اور اقبال کے تعلق کو سمجھنے کے لیے صرف ایک مثال کافی ہوگی ۔ " سرودِ زندگی" میں فارسی کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎ در حریمش امتیاز این و آن بے سود بود ... الخ ۔ اور آخری شعر ہے ؎ تو بہر شغلے کہ می باشی ہماں معبود تست آں شکست و ریخت ہم میخانۂ معبود بود ۔ اس کے بعد یہ عبارت درج ہے " یہ غزل قیام لاہور کے زمانے میں لکھی گئی تھی ۔ علامہ سر اقبال نے اسے سن کر بہت پسند فرمایا اور خود بھی دو شعر اسی وقت موزوں کرکے دیئے اور ہدایت فرمائی کہ انھیں بھی اپنی غزل کے ساتھ رکھنا "۔ سر علامہ اقبال

چشم آدم آں سوئے افلاک پوشِ فہم عیاقت ازخیال مہر و مہ اندیشہ گرد آلود بود
من درون سینہ خود سومناتے ساختم آستان کعبہ را دیدم جبیں فرسود بود

اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اصغر ، اقبال سے نیازمندانہ ملتے تھے اور اقبال بھی ان سے خوش ہو کر ملتے تھے ۔ اس جذب و کشش کے نتیجہ میں اصغر نے اقبال سے بہت کچھ لیا ہوگا ۔

تلمیحات ، علامات اور اصطلاحات انھیں گویا نوک بر زبان تھیں۔
اردو ادبیات کی تاریخ سے آگاہ تھے اور اردو شاعری پر جو کچھ
بیتی ہے اس پر بھی مطلع تھے .... ان سے جو
صحبتیں رہی ہیں ان میں یوں تو میں نے بہت کچھ سیکھا ہے
لیکن فارسی شاعری کی علامات و رموز بالخصوص مجھ پر انھیں کے
ذریعہ روشن ہوئے ہیں اور ان میں سے کن کن سے رموز اردو
میں منتقل ہوئے ہیں یہ بھی انھیں نے مجھے بتایا ہے ----"

(نقوش ۳۸-۳۷ مطبوعہ ۱۹۵۵ء - ص ۵۰۸)

لاہور کے بعد ۱۹۲۸ء میں اصغر الہ آباد پہنچے جو مغربی علم و ادب کا کیمرج و آکسفورڈ اور مشرقیت کا پریاگ و الہ آباد تھا - جہاں ہندو مسلم تہذیب کے گنگا جمنی[1] سنگم پر مغرب کی سرسوتی[2] نے مل کر اس کو صحیح معنوں میں تربینی[3] بنا دیا تھا - دانش و بینش کی اس تربینی میں غوطے لگا کر ، دیوتاؤں اور اہل اللہ کی اس سرزمین پر ایسے ایسے پنڈت[4] جمع ہو گئے تھے کہ اس کی پوری فضا میں علم و عرفان برس رہا تھا - یہاں اصغر کا تعلق سر شاہ محمد سلیمان[5] ، ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو[6] ، ڈاکٹر تارا چند[7] ،

۱- الہ آباد کا قدیم نام پریاگ تھا جو ہندو تہذیب کا زبردست مرکز تھا - اکبر کے زمانہ میں اس کا نام الہ آباد رکھا گیا - صوبہ کا دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے اسکی بڑی اہمیت تھی (الہ آباد - از سید محمد فاروق زمانہ اگست ۱۹۱۲ء - ص ۱۰۲) - یہاں دو دریا گنگا اور جمنا آ کر ملتے ہیں - ہندوؤں کے نزدیک یہ بڑا مقدس مقام ہے ---- مسلمانوں کے زمانہ میں صوفیا اور فقرا کا زبردست گڑھ بن گیا - یہاں مسلمان صوفیا کے بارہ " دائرے " تھے جو اسلامی تعلیم و تہذیب کے زبردست مراکز تھے - انھوں میں ایک بزرگ حضرت شاہ محب اللہ رحہ تھے جو دارا کے ہمعصر تھے اور جنھوں نے اکبر کے ملحدانہ خیالات کا رد لکھا تھا (اصغر - عبدالشکور - ص ۵۱) -

۲-۳- ایک دریا کا نام ہے ---- ہندو عقیدے کے مطابق جنت کا دریا ، جو گنگا اور جمنا میں زیر آب آ کر الہ آباد میں ملتا ہے - اس جگہ کو تربینی --- تین دریاؤں کا سنگم کہتے ہیں - دوسری روایت کے مطابق دریائے سرسوتی پنجاب کے جنوب مغرب ریگستان سرہند میں چھپ کر زمین کے نیچے بہتا ہوا الہ آباد میں جمنا اور گنگا کے سنگم پر مل جاتا ہے (زمانہ اگست ۱۹۱۲ء - ص ۱۰۲)

۴- کہتے ہیں ---- پنڈت کے اصل معنی ہیں عالم -

۵- چیف جسٹس ہائی کورٹ الہ آباد - بڑے عالم و فاضل بزرگ تھے - شعر و ادب کے اچھے پارکھ تھے - ریاضیات و طبیعیات میں بھی خاصا نام پیدا کیا ہے - آخر عمر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے ہیں - ۱۹۳۶-۳۷ء میں انتقال کیا - عمرزیادہ نہ تھی-

۶- سرتیج بہادر سپرو کشمیری برہمن ، الہ آباد میں چوٹی کے بیرسٹر تھے- بڑے نکتہ سنج و دقیقہ رس تھے - مسلم ایرانی تہذیب میں ڈوبے ہوئے ، فارسی واردو شعر و ادب کے محسن ، مربی اور سرپرست تھے -

۷- ڈاکٹر تارا چند - ماتھر کائستھ - الہ آباد یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ میں پروفیسر تھے- بڑے ذی علم تھے - فارسی و اردو کا ذوق بڑا پاکیزہ تھا - مسلم دوست و مسلم نواز تھے - تقسیم کے بعد مدتوں ایران میں ہندوستان کے سفیر کبیر رہے ہیں -

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی[1] ، ڈاکٹر زبید احمد[2] ، ڈاکٹر حفیظ سید[3] ، مولانا محمد علی حامی[4] اور پنڈت سری نراین[5] مسرا جیسے دانشوروں سے ہوا ۔ " پنڈت جی کے متعلق تو صغیر صدیقی صاحب یہاں تک فرماتے ہیں کہ " میرا خیال ہے کہ اصغر صاحب کے نظریۂ شعر و ادب پر پنڈت جی کے خیال کا بھی اثر پڑا ہے ۔ "[6] ـــــ اس ماحول سے اصغر ایک دو سال نہیں ، اپنی آخری زندگی کے پورے ۸ سال (۱۹۲۸-۳۶ء) اکتساب فیض کرتے رہے ـــــ اور اصغر کی " بنیادی شخصیت " جو قدم قدم پر جلا پاتی رہی اس " کارگاہ الماس تراشی " میں کیسے کیسے خراد پر چڑھی اور کس کس زاویہ سے اسے جلا دی گئی کہ وہ " تاج انسانیت و تاج شاعری " کا بیش قیمت اور درخشاں نگین بن گئی ـــــ اصغر کی شخصیت کی تربیت و تعمیر اور تہذیب و تربیت کے متعلق رائے قائم کرنے سے پہلے ان تمام گوشوں کو کریدنا اور اس پورے طومار کو کھنگا لنا پڑے گا ۔ ورنہ ان کی شخصیت کی جو تصویر پیش کی جائے گی وہ ناقص ، نامکمل اور یک رخی ہوگی ۔ یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک اور تامل نہ ہونا چاہیے کہ ان کی تعلیم و تربیت کے متعلق رائے قائم کرتے وقت ان کے بیشتر سوانح نگاروں نے ان عوامل کو نظر انداز کر کے ان کی یک رخی تصویر پیش کی ہے ـــــ جبھی تو " ان کی ابتدائی زندگی " کو " باقاعدہ تعلیم و تربیت سے ناآشنا " کہہ کر یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ " اصغر " بہت ہی معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے " یا یہ کہہ کر کہ " صرف نظر سے ان کا اتنا مکمل ارتفاع ہوا کہ ...... اتنے مکمل علاج کی کوئی اور نظیر کم ازکم اردو ادب کی تاریخ میں نہیں مل سکتی[7] ۔ معجزاتی رنگ بھرنا چاہا ہے ۔ یہ دونوں تعبیریں انتہا پسندانہ ہیں ـــــ یہاں اس سے خدانخواستہ دنیا کے پیر و مرشد کی نظر کیمیا اثر کی تحقیر و تخفیف مقصود ہے نہ اس کا انکار ـــــ

۱- صدر شعبۂ فارسی و عربی ۔ الہ آباد یونیورسٹی ۔ لسانیات میں بڑا مقام حاصل تھا ۔ کسی زمانہ میں حیدرآباد میں بھی تھے ۔

۲- شعبۂ عربی و فارسی میں پروفیسر تھے ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے ریٹائر ہونے کے بعد صدر شعبہ ہوئے ۔ بڑے فاضل بزرگ تھے ۔ علم عروض ، بدیع و بیان پر اچھی نظر تھی ۔

۳- پرانی وضع کے بزرگ تھے ۔ شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی میں استاد تھے ۔ طبیعت بہت ہی مزاح پرور اور بذلہ سنج پائی تھی ۔ بڑے عبادت گزار اور مستجاب الدعوات تھے ۔

۴- شعبۂ اردو میں پروفیسر تھے ۔ اصغر کے ہم جماعت تھے ۔

۵- شعبۂ انگریزی الہ آباد یونیورسٹی میں استاد تھے ۔ ادب و فلسفہ کے عالم متبحر اور شعر و سخن کا بہت سنجیدہ اور بلند مذاق رکھتے تھے ۔

۶- نقوش لاہور شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۲۸۴ ۔

۷- نقوش لاہور شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۲۸۳

" صرف نظر سے اتنے مکمل علاج " کیے - باب میں اتنا عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ " نظر سے خاک کو کیمیا بنانے والی ہستیاں[1] " رہی ہیں ، ہیں اور ہوتی رہیں گی - لیکن ساتھ ہی ساتھ " خدائے بخشندہ کی بخشش[2] " اور خاک کا جوہر قابل ہونا بھی شرط ہے - اگر خاک ہی میں کیمیا بننے کی صلاحیت نہ ہو تو اسے کون کیمیا بنائے گا - اگر " صرف نگاہ سے کامل و اکمل علاج " ہو سکتا تو حضور اکرم صلعم نے ابوجہل کو اصان ، مسلمان نہ بنا لیا ہوتا - آنجناب نے تو بہت چاہا - (یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کو کہنا پڑا اَلَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ[3]) لیکن نہ مشیت ایزدی ، نہ جوہر قابل وہ بنائے کیسے وہ بنتا کیسے ؟ ---- اصغر میں خود جوہر ذاتی تھا ، استعداد و صلاحیت تھی ، ابتدائی تعلیم و تربیت سے سیرت میں پہلے سے وہ بنیاد موجود تھی کہ جہاں مشیت ایزدی ہوئی ، مرشد کی نظر پڑی وہ کندن یا بقول جگر " مسلمان[4] " ہو گئے -

اگر شخصیت کی تعمیر اور ذہن کی تشکیل میں (کہ یہی تعلیم و تربیت سے عبارت ہے) زندہ شخصیات کے ساتھ ساتھ معنوی شخصیات و ادبی و علمی آثار) کا بھی ہاتھ ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے تو اصغر کی ذہنی تربیت کو سمجھنے کی کوئی کوشش اس وقت تک صحیح و مکمل نہیں کہی جا سکتی جب تک ان تمام مصنفات و مولفات ، ملفوظات و مکتوبات کلیات و دواوین ، سیر و سوانح اور ذہنی و تہذیبی تاریخ کی کتابوں کو پیش نظر نہ رکھا جائے جو اکثر و بیشتر اصغر کے زیر مطالعہ رہیں --- اس سلسلے میں سب سے پہلے ہماری نظر " کلام الٰہی " پر جاتی ہے جو انسانیت کے لئے رشد و ہدایت کا سرچشمہ (ھُدًى لِلنَّاسِ[5]) اور مسلمانوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ منبع نور و ہدایت ہے - اصغر کی تحریروں[6] اور ان کو قریب سے دیکھنے والوں کی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں قرآن سے عشق تھا اور اس کا مطالعہ ان کا بڑا گہرا تھا - جب بھی وہ قرآن پڑھتے یا اس کی تلاوت ان کے سامنے کی جاتی تو ان پر رقت و گداز کی ایسی کیفیت طاری

۱- " آنا نکہ خاک را بنظر کیمیا کنند "
۲- ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ
۳- الغاشیہ - ۲۰۳
۴- ساقی نے آج بندۂ احسان بنا دیا   ڈالی وہ اک نظر کہ مسلمان بنا دیا
۵- البقرہ - ۱۸۵
۶- یادگار نسیم - مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۰ء - ص ۲۲

هو جاتی که طبیعت بے قابو هو جاتی ۔ اس ضمن میں مولانا سراج الحق صاحب رقمطراز هیں[1] :

" اصغر صاحب کو قرآن سے عشق تھا ، خوش آواز قاریوں سے قرآن سنتے اور بے اختیار روتے .... جب کسی قاری کا نام سن پاتے ضرور اس سے ملتے یا اس کو اپنے یہاں بلواتے ، دعوت کرتے ، قرآن سنتے اور روتے ۔ کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ شام کے وقت بیٹھے باتیں کر رہے ہیں ، نماز مغرب کا وقت آ گیا مجھے امامت کرنے کا حکم دیا ۔ اب میں قرأت کر رہا ہوں کہ اچانک مقتدیوں کی طرف سے ایک دبی سی چیخ یا ہچکی کی آواز سنائی دی ۔ میں نماز میں کچھ چونک سا پڑا پھر قرأت کرنے لگا ۔ سلام پھیرنے کے بعد دیکھا کہ بقیہ لوگ سنت کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں اور اصغر صاحب ہیں کہ دوسری طرف منہ پھیرے چہرہ مل رہے ہیں یعنی طبیعت کو صاف کرنے اور آنسو پونچھنے میں مشغول ہیں[2]۔"

قرآن سے عشق ، اس میں غور و تدبر اور خلوص کے ساتھ ، اس کی تعلیمات پر کاربند ہونے کی کوششوں نے ان کے ذہن و فکر کی کیسی تطہیر ، اور اقوال و اعمال میں کیسی پاکیزگی اور جذبات میں کیسی متانت ، سنجیدگی اور توازن پیدا کیا ہوگا ، اس کا سمجھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ۔ قرآن کے علاوہ ان کا بیشتر رجحان تصوف اور دینی کتابوں کی طرف تھا ۔ مولانا سراج الحق صاحب نے ایک استفسار کے جواب میں کہ ان کے زیر مطالعہ کیسی کتابیں رہتی تھیں ، تحریر فرمایا :

" تصوف کی فارسی کتابیں ـــ درویشوں کے ملفوظات یا مکتوبات ـــ ایک طرف تصوف دوسری طرف ہردارڈشا کے افسانے[3]۔"

۱۔ مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہر ضلع جونپور کے رہنے والے ، الہ آباد گورنمنٹ کالج میں فارسی کے استاد تھے ، اصغر سے شاگردانہ ، نیازمندانہ اور مریدانہ مراسم تھے ۔ ان کی خدمت میں ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۶ء برابر حاضر رہے ۔ زندگی کے آخری ۸ ، ۹ سال میں ان کے بہت ہی زیادہ قریب رہے ۔ ابھی ماشاء اللہ بقید حیات ہیں ۔ راقم مقالہ کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہے اور اس پر فخر ہے ۔ اس مقالہ کا بیج دراصل انھوں نے ہی میرے ذہن میں بویا تھا ۔ یعنی طالب علمی کے زمانہ ہی میں ۳۶-۱۹۳۴ء اصغر سے عشق پیدا کر رہا تھا ۔ اور اب اسکی ترتیب میں مفید معلومات بہم پہنچا کر ، اسکی تکمیل ، تہذیب کا سبب بنے ۔

۲۔ اصغر ۔ از عبدالشکور ۔ ص ۵۱-۵۰

۳۔ مکتوب مولانا سراج الحق بنام راقم مقالہ ۲۲ فروری ۱۹۶۹ء ۔

ایک دوسرے سوال کے جواب میں کہ " کوئی خاص صنف یا شاعر جس سے اصغر کو بہت شغف رہا ہو " تحریر فرمایا :

" اقبال ، حسرت موہانی ، غالب ، مومن [1]"

جناب سید رشید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں :

" وہ نثر میں علامہ شبلی ، ابوالکلام آزاد اور شاعری میں غالب ، مومن ، اقبال اور حسرت سے متاثر تھے ۔ مہدی افادی ، سجاد انصاری اور اقبال سہیل کے بھی بڑے معترف و مداح تھے [2]۔"

ان کے علاوہ مثنوی مولانا روم ، دیوان حافظ عراقی ، جامی ، امیر خسرو ، ابو سعید ابی الخیر نظامی کی مثنویات ، کلیات اور دیگر تصنیفات[3] ، شیخ سرہندی کی زندگی کے واقعات و مکتوبات[4] مرزا مظہر جان جاناں کا کلام ، مکتوبات و ملفوظات[5] ، فصوص الحکم ابن عربی[6] ، آسکر وائلڈ کے مندرجات[7] ، ورڈس ورتھ کی شاعری اور نقد و تبصرہ[8] ، ان کے علاوہ دیگر انگریزی ادب کے نقادوں[9] کی تحریرات کے اثرات ، ان کی زندگی و سیرت اور افکار و نظریات میں تلاش کرنا ہوں گے ۔

اس جگہ ان تمام کتابوں کا احاطہ جو ان کے زیر مطالعہ رہیں ، نہ ممکن ہے نہ مطلوب ، یہاں تو صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اصغر کے زیر مطالعہ رہنے والی کتابوں میں قرآن اور دینی و مذہبی کتابوں کے علاوہ بیشتر کتابیں وہ تھیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح تصوف سے یا اہل تصوف سے تھا یا شعر و ادب سے یا دونوں سے ۔ صوفیانہ کلام کی مواظبت ، اور صوفیا کے احوال و اقوال کے پیش نظر نمونوں نے ایک طرف ان کے اندر تصوف اور اہل تصوف سے وابستگی و شیفتگی اور صوفیانہ روح کی تولید و تہذیب کی تو دوسری طرف صوفیاء اور اہل اللہ کے اسوۂ حسنہ نے پاکیزگی عمل کی دعوت دی ۔

۱۔ مکتوب مولانا سراج الحق بنام راقم مقالہ ۲۲ فروری ۱۹۶۹ء

۲۔ چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۸

۳۔ اصغر ۔ عبدالشکور ۔ ص ۵۳

۴۔ انتخاب اصغر ۔ مرتبہ جمیل نقوی ۔ ص ۳۲

۵۔ چند شخصیتیں چند تاثرات ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور مطبوعہ ۱۹۶۲ء ۔ ص ۳۵-۲۷

۶ ۷۔ چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۸

۸۔ یادگار ضیغم ۔ مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد ۔ ص ۲۲

۹۔ یادگار ضیغم ۔ ص ۲۵

آسکر وائلڈ اور برنارڈ شا اگرچہ صوفی نہیں تھے لیکن ان کے اور اصغر کے طبائع میں بعض صفات مشترک تھے ۔ آسکر وائلڈ کے متعلق سید بادشاہ حسین صاحب شہزاد کے حوالے سے رقمطراز ہیں :

" آسکر وائلڈ کے پہلو میں ایک زنانہ دل[1] تھا یہی وہ بھوت تھا جو اس کے ایوان زندگی پر مسلط تھا .... وہ عیش پرست اور حسن[2] کا متلاشی تھا ۔ الفاظ[3] میں موسیقی ، زبان میں سلاست ، تخیل[4] میں بلندی اور جذبات لطیف پر قابو[5] ، اس کی شاعری میں نمایاں[6] ہیں ۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں :

" .... وہ خاموش طبع[7] ، تنہائی پسند[8] اور متین[9] لڑکا تھا ۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے[10] عام لڑکوں سے الگ تھلگ ہی رہا ۔ عامیانہ مذاق سے علیحدہ رہنے کے لئے اس نے اپنے بال بڑھا لئے[11] اور پوشاک کی نفاست[*] میں وہ خاص اہتمام کیا کرتا تھا[12] ۔"

آگے لکھتے ہیں :

" ...... ان کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ باعث کشش تھی وہ آسکر کی خوش گفتاری تھی ۔ اس کا لہجہ نہایت شیریں اور ایسا نرم تھا جیسا کہ گوش گل پر پیغام شبنم .... صدائے لب گویا غنچہ کی چٹکنے کی آواز تھی کہ سامعین کے دل اس سے کھلے جاتے تھے[13] ۔"

۱۔ زنانہ دل ۔ جذبات لطیف کا منبع ۔ راقم مقالہ

۲۔ حسن پرستی اور زندگی سے محبت ، جس کی انتہا بیشتر عیش پرستی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی رہی ہے ۔ یہ چیز ہمیں اصغر میں قدم قدم پر نظر آتی ہے ۔ اسی چیز نے ان کو معصیت کی دلدل میں پھنسا دیا تھا لیکن " جذبات لطیف " پر قابو نے انھیں اس سے نکال دیا ۔ تفصیل آگے آئے گی ۔

۳،۴،۵۔ یہ تمام خوبیاں ہمیں کلام اصغر میں بھی نظر آتی ہیں ۔

۶۔ آسکر وائلڈ از سید بادشاہ حسین ۔ نیرنگ خیال لاہور ، ۱۹۳۰ء ۔ ص ۲۰

۷۔ اصغر بھی خاموش طبع تھے ۔ شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۳۸۲

۸۔ اصغر بھی تنہائی پسند تھے ۔ ایضاً ۔ ص ۱۳۸۶

۹۔ اصغر میں بھی متانت تھی ۔ ایضاً ۔ ص ۱۳۸۳

۱۰۔ اصغر بھی عام روش سے علیحدہ رہتے تھے ۔ ایضاً ۔ ص ۱۳۸۵

۱۱،۱۲۔ نیرنگ خیال ۱۹۳۰ء ۔ ص ۲۰

*۔ لباس کے معاملہ میں اصغر بھی بڑا اہتمام کرتے تھے ، جس کا حال ان کے قلمی خاکوں سے معلوم ہوگا ۔ لیکن یہاں ایک نجی گفتگو کا حال جو مقالہ نگار کی جناب بشیر احمد صدیقی سے ۱۹۶۹/۵/۲ء کو ہوئی تھی ، درج کیا جاتا ہے جو شاید بے محل نہ ہو ۔ وہ فرماتے ہیں ۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بات بڑی طویل ہوتی جا رہی لیکن یہاں اصغر کی دو قلمی تصویریں پیش کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا ...... جناب صغر احمد صدیقی اپنی پہلی ملاقات کے سلسلے میں رقمطراز ہیں :

" تھوڑی دیر میں اصغر صاحب تشریف لائے - ادھیڑ عمر کے
بزرگ صورت انسان - لانبا قد - قدرے کھلتا ہوا -- سانولا رنگ
ٹوپی سر پر - چہرے پر خوبصورت فرنچ کٹ ڈاڑھی ، آنکھوں میں ایک
غیر معمولی چمک - لانبا کرتہ اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے ،
روشن روشن صاف صاف ، نکھری نکھری ...... لطافت اور وقار کے
ساتھ چہرہ پر ایک تبسم ذوق پذیرائی لئے ہوئے [۱]"

دوسری تصویر جناب رشید احمد صدیقی کی ملاحظہ ہو :

" ہائے ان کا باغ باغ ہونا - زبان سے مرحبا یا مبارک سلامت
کچھ نہ کہتے البتہ آنکھوں میں خوشی کی چمک کہ مجھے اپنے
قلب میں اترتی معلوم ہوتی - لبوں پر مسکراہٹ اور باتوں میں
شادمانی کی وہ گھلاوٹ کہ بیان سے باہر ہے - خوشی کا اظہار
اپنے کسی ارادہ یا اشارہ تک سے نہ ہونے دیتے لیکن سر سے پاؤں
تک شگفتہ اور زمزمہ سنج معلوم ہوتے [۲]"

دونوں میں ان ظاہری مماثلتوں کے علاوہ بھی بعض باطنی مماثلتیں تھیں - مثلاً* آسکروائلڈ اپنے زمانہ میں " جمالیاتی تحریک کا سب سے بڑا مبلغ اور قائد تھا [۳]" اصغر بھی جمالیات کے پرستار تھے اس لیے قدرتی طور پر ان کا میلان اس کی طرف ہوا - آسکروائلڈ کی دوسری سب سے دلکش اور جاذب خصوصیت اس کی ذہانت و فطانت ، بذلہ سنجی و ظرافت تھی [۴] - اصغر میں بھی یہ

(حاشیہ از گزشتہ صفحہ)

* وضع قطع پرانی وضع کے سوفیا کی تھی - لباس کے معاملہ میں بڑا اہتمام کرتے تھے - بڑے صاف ستھرے رہتے - لیکن اس اہتمام میں تکلیف کا ذرا سا بھی شائبہ نہ تھا - صفائی اور نفاست طبیعت ثانیہ بن گئی تھی " -- جناب بشیر صدیقی اصغر سے بقول خود ۱۹۱۹ء میں متعارف ہوئے اور آخر دم تک ان سے تعلق رہا - انھوں نے اصغر کو بہت قریب سے دیکھا ہے - آپ جناب رشید احمد صدیقی کے برادر نسبتی ہیں - تمام عمر شعبۂ تعلیم سے منسلک رہے ، ۱۹۳۲ء تا ۱۹۵۰ء شبلی ہائی اسکول اور شبلی کالج سے متعلق رہے، ۱۹۵۰ء میں بحیثیت پرنسپل ریٹائر ہوئے ، اور پاکستان آ گئے - اوّل اوّل پاکستان سنٹرل گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہیڈماسٹر تھے - بعد میں بورڈ آف سٹڈیز انٹرمیڈیٹ اینڈ سکنڈری ایجوکیشن کے سکریٹری ہو گئے - اس سے ریٹائر ہونے کے بعد عائشہ باوانی کالج کراچی میں پرنسپل ہوئے - اب بھی ماشاء اللہ چاق و چوبند ہیں- بڑے باحواس ، متشرع اور نفاست پسند بزرگ ہیں - اس وقت ۷۴، ۷۵ سال کی عمر ہوگی -

۳- نیرنگ خیال ۱۹۳۰ء - ص ۲۱ -
۱- نقوش شخصیات نمبر جلد دوم - ص ۱۲۸۲-۱۲۸۵
۲- گنج ہائے گرانمایہ بار سوم ۱۹۳۹ء نئی فرینڈز پبلشر اردو بازار - راولپنڈی - ص ۱۰۲-۲۰۳

GOOD ENGLISH: HOW TO SPEAK & WRITE IT.
CHAPTE: A CONCISE ENCYCLOPAEDIA OF ENG. LIT.
COMPILED BY A.C. COWLEY P. 628

صفت بدرجۂ اتم موجود تھی ۔ ممکن ہے کہ اسی خصوصیت نے ان کو آسکروائلڈ کی طرف ملتفت کیا ہو جہاں ان کے ذوق کی تسکین و تہذیب ہوتی ہو ۔۔۔۔۔۔ اسی طرح برنارڈشا کی طرف میلان کا سبب بھی وہی طنز و ظرافت کی چاٹ ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ طنز و ظرافت دونوں کی " سوتہ ،، نہاںخانۂ دل میں ایک ہی جگہ سے نکلتی ہے ۔ دونوں اصلاح احوال کے جذبہ سے سرشار ہو کر نکلتے ہیں ۔ لیکن دونوں کا مقصد ایک ہوتے ہوئے بھی راہیں مختلف ، منزل ایک ہوتے ہوئے بھی رفتار جداگانہ ہوتی ہے ۔ ایک تند و تیز دھارے کی طرح راہ کی ناہمواریوں سے ٹکراتی ، توڑتی پھوڑتی ، شور مچاتی آگے بڑھتی ہے ، دوسری جوئے نغمہ خواں کی طرح دھیمی اور پرسکون رفتار سے بہتی ، اپنی سبک خرامی اور نغمگی سے دوسروں کے دل میں پھلجھڑیاں چھوڑتی اور زمزمہ سنجی کی کیفیت پیدا کرتی آگے بڑھتی ہے ۔۔۔۔ ایک میں تلخی اور زہرناکی ہوتی ہے دوسری میں شیرینی و حلاوت ، ایک میں غصّہ اور جھنجھلاہٹ ہوتی ہے دوسری میں سنجیدگی و بردباری ۔۔۔ ایک " فاسد مادہ ،، کا علاج نشتر سے کرتی ہے ، دوسری مرہم سے ، ایک زہر کو زہر سے مارتی ہے ، دوسری شہد سے ۔۔۔ لیکن ہیں دونوں توام ۔ ایک ہی جذبۂ اصلاح کے دو پہلو ، ایک ہی صفت کے دو رخ ۔ اس قدر ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور ایک دوسرے کے سہارے آگے بڑھتے ہوئے کہ بعض اوقات ایک کا تصور دوسرے کے کی بغیر ناممکن ہو جاتا ہے ۔۔ اصغر بذلہ سنج ، ظریف اور شوخ طبیعت نے برنارڈشا کی لطیف طنز میں اپنے ذوق کا سامان پایا جس سے ان کے ذوق طنز و ظرافت کی سیرابی و تسکین بھی ہوتی اور اصلاح و تہذیب بھی ۔۔۔۔ اسی طرح انھوں نے غالب و اقبال سے فلسفیانہ انداز ، مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے عالمانہ وقار اور مورخانہ بصیرت و طرز استدلال ، سجاد انصاری اور مہدی افادی سے شاعرانہ نثر اور ادب لطیف کا اسلوب نگارش اور حسرت و مومن سے تغزل کی چاشنی اور رنگینی لی ۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اصغر کی ابتدائی تربیت اتنی اچھی ہوئی تھی کہ اس سے ان کی بنیادی شخصیت کا ایک محکم اور مضبوط ڈھانچہ بن گیا تھا جو حادثات زندگی کے شدید سے شدید جھٹکے یا زلزلے سے نہ ٹوٹا نہ مسمار ہوا ۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ بعد کے ادوار کا رنگ اس پر چڑھتا اترتا رہا ۔۔۔ کبھی اس نے شخصیت کے بنیادی رنگ کو دبا دیا (۔۔۔ صرف پانچ سال کے لئے ۱۲-۱۹۰۷ء ۔ لیکن اس میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی چمک بدستور قائم رہی[1]) اور کبھی اس کو ابھار ، نکھار کا تیز تر اور شوخ تر کر دیا ۔ (۱۹۱۲ کے بعد سے مرتے دم تک) ۔۔۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصغر کی فطری صلاحیتوں

۱۔ مقالہ ہذا ۔ ص۵۳

نے تعلیم و تربیت کے مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ۔ ان کی شخصیت برابر ارتقائی مدارج طے کرتی رہی اس کی ترقی کسی مرحلہ میں رکی نہیں انھوں نے ہر خرمن سے خوشہ اور ہر گوشے سے تمتع حاصل کیا [1] ، جہاں پہنچے حسب ذوق و استطاعت استفادہ کرتے اور اپنے فطری اوصاف اور صلاحیتوں کو جلا دیتے رہے ۔

ملازمت و مشاغل :

(۱) ریلوے کی ملازمت : (وسط ۱۹۰۶ء تا اوائل ۱۹۱۳ء) ۔

اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اصغر نے ۱۹۰۶ء میں انٹرنس کا امتحان دینے سے پہلے تعلیم ترک کر دی ۔ اس کے بعد ملازمت کی تلاش شروع ہوئی آخرکار وسط ۱۹۰۶ء یا اوائل ۱۹۰۷ء [2] کے حدود میں انھیں بیس روپے ماہوار پر ریلوے کے دفتر میں ٹائم کیپر کی جگہ

۱۔ " تمتع زہر گوشۂ یافتم زہر خرمنی خوشۂ یافتم "

۲۔ رشید صاحب نے ملازمت کے سال کا کوئی تعین نہیں کیا لیکن ان کی تحریر میں بعض ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے تاریخ تقرر کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں " ۱۹۰۶ء میں امتحان دینے سے پہلے باپ کے ایماء پر ملازمت ترک کر دی " ۔ یوپی میں ہائی اسکول کے امتحان عموماً مارچ اپریل میں ہوتے تھے ، اسطرح ظاہر ہے کہ جنوری فروری ۱۹۰۶ء میں تعلیم ترک کی ہوگی ۔۔۔ دوسری جگہ بحوالہ بابو کنور وشوناتھ پرشاد راوی ہیں کہ " وہ (کنور وشوناتھ پرشاد) ۱۹۰۹ء میں بلرام پور سے گونڈہ پریکٹس کے لیے منتقل ہوئے ، انھیں ایام میں ان کی ملاقات اصغر سے ان کے رشتہ کے بہنوئی بابو راج بہادر کی وساطت سے ہوئی ۔۔۔۔۔ جن کی مے نوشی کی ابتدا کنور صاحب کے گونڈے آنے سے سال ڈیڑھ سال پہلے ہی راج بہادر کے یہاں ہو چکی تھی ۔ اس حساب سے قریب ۵سال تک اصغر کا شغل مے نوشی جاری رہا (جامعہ اپریل ۱۹۶۷ء ص ۴۹۸) ۔ یہاں دو باتیں قابل غور ہیں آنے سے سال ڈیڑھ سال قبل ۔۔۔ یعنی ۸-۱۹۰۷ء میں اصغر نے شراب نوشی شروع کی ۔

(۲) ۵ سال تک شغل مے نوشی جاری رہا ۔۔۔ ترک ملازمت و مے نوشی کا سال ۱۳-۱۹۱۲ء ہے یعنی اواخر ۱۹۱۲ء یا اوائل ۱۹۱۳ء اس سے بھی ابتدائے مے نوشی کی تاریخ اوائل ۱۹۰۸ء یا اواخر ۱۹۰۷ء آتی ہے ۔

ان حقائق کو سامنے رکھ کر ابتدائے ملازمت کی تاریخ کا تعین کیا جائے تو اوائل ۱۹۰۶ء اور اوائل ۱۹۰۸ء کے درمیان کہیں آئے گی ۔ تاہم کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی مگر دو باتیں اب بھی ایسی ہیں جن سے کسی قدر قطعیت کے ساتھ تاریخ کا تعین کیاجاسکتا ہے۔

(۱) ابتدائے مے نوشی اوائل ۱۹۰۸ مانا جائے جب اوائل ۱۹۱۳ء میں ۵ سال بنتے ہیں ، یا اواخر ۱۹۰۷ء مانا جائے تو اواخر ۱۹۱۲ء نکلتے ہیں ۔ دونوں صورتوں میں اتنا تو یقینی ہے کہ ملازمت کے بعد فوراً ہی تو اصغر نے مے نوشی شروع نہیں کر دی ہوگی ، آخر کچھ دنوں نیازمندانہ آتے گئے ہوں گے ، پھر آہستہ آہستہ تکلفات کے پردے اٹھے ہوں گے ، بے تکلفی بڑھی ہوگی ، جب کہیں جا کے مے نوشی کی نوبت آئی ہوگی۔ میرے اس خیال کی تائید جناب سیدرشیداحمد کی تحریر سے بھی ہوتی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں " مختصر یہ کہ راج بہادر نے رفتہ رفتہ اصغر کو رام کرکے اپنے رنگ میں رنگ لیا " (چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۸)۔ اگر ان تمام مراحل و منازل کی کم از کم مدت ۶ ماہ تا ایک سال مانی جائے تو ملازمت کا آغاز وسط ۱۹۰۷ء یا اوائل ۱۹۰۷ء میں ہوتا ہے ۔

(۲) رشید صاحب کا ایک جملہ اور بھی کچھ دور " آغاز ملازمت " کے سلسلہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں " ملازمت کا معرکہ اس آسانی سے سر ہو جانے پر وہ بابوراج بہادر

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مل گئی ۔ اگرچہ اصغر نے بڑی دیانت داری ، محنت اور مستعدی سے کام کیا لیکن اس کے باوجود یہ سلسلہ ۶ ، ۷ سال سے زیادہ نہ چل سکا ۔ یعنی ۱۹۱۲ء کے اواخر یا ۱۹۱۳ء[1] کے اوائل میں انھوں نے ریلوے کی ملازمت کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا اور گھر بیٹھ رہے ۔ ہوا یہ جو بزرگ (بابو راج بہادر) ان کی ملازمت کا وسیلہ بنے تھے ان کی ترک ملازمت کا بھی سبب ہوئے ۔ سید رشید احمد صاحب ، اصغر کی ملازمت کے سلسلے میں رقمطراز ہیں :

> " .... بابو راج بہادر گونڈہ ہی ۔ این ڈبلیو آر ڈیژنل ہیڈ کوارٹر کے بڑے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے .... بڑے تیز طرار اور چلتے ہوئے .... اپنی انگریزی دانی کی وجہ سے انگریز حکام میں بہت باثر و مقبول .... اصغر کی برجستہ گفتگو ، ذہانت و ذکاوت اور بذلہ سنجی سے کافی متاثر اور خوش ہوئے .... اور حکام سے کہہ سن کر ان کو بیس روپیہ ماہوار مشاہرہ پر ریلوے میں ٹائم کیپر مقرر کرا دیا ۔[2] "

اصغر بابوراج بہادر کے احسان و اخلاق سے بہت متاثر ہوئے اور نیازمندانہ ان کے یہاں آنے جانے لگے ۔ بابو راج بہادر شعر و شاعری کے دلدادہ[3] ، شراب کے رسیا اور " ارباب نشاط " کے کوچے کے راہ شناس و " سالک " تھے ، انھوں نے اصغر کو بھی " راہ و رسم منزل " سے آشنا کر دیا اور اپنے رنگ میں رنگ کر شراب نوشی اور اہل نشاط سے دل بستگی

(حاشیہ از گذشتہ صفحہ)

کی امداد و مہربانی کے لیے بہت ممنون تھے " (چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۸) یہاں " آسانی سے معرکہ " سر ہو جانا " سے خیال ہوتا ہے کہ شاید ملازمت بہت جلد مل گئی ـــــ لیکن میرا خیال ہے کہ آسانی سے مراد ان کی مدت کی کمی نہیں بلکہ بھاگ دوڑ اور پریشانی و سرگردانی کی کمی ہے ـــ مانا کہ ملازمت کا معرکہ آسانی سے سر ہو گیا ۔ لیکن سال ڈیڑھ سال تو لگے ہی ہوں گے ـــــ اگر کم از کم مدت ۶ ماہ بھی مانی جائے جب بھی وسط ۱۹۰۶ء آتا ہے ، اور اگر سال ڈیڑھ سال مانی جائے تو وسط ۱۹۰۷ء آتا ہے ـــــــ اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اصغر نے ملازمت کا آغاز ۱۹۰۶ء کی آخری سہ ماہی تا وسط ۱۹۰۷ء کے درمیان کیا ـــــ اس طرح کل مدت ملازمت ، ، ساڑھے چھ سال ہوئی ۔

(۳) شروع میں دکھایا جا چکا ہے کہ اصغر نے جنوری فروری ۱۹۰۶ء میں تعلیم ترک کی ، لاکھ ملازمت کا مرحلہ بآسانی طے ہوگیا تاہم پانچ چھ ماہ تو لگے ہی ہوں گے اس طرح بھی وسط ۱۹۰۶ء ہی آتا ہے ۔

۱۔ مکتوب جناب سید رشید احمد بنام مقالہ نگار مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ ہذا ص ۔ اصغر کا دور رندی (توبہ)

۲۔ چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۸

۳۔ ایضاً

کی عادت ڈال دی[1] ۔ لیکن ایک رات شراب پیتے وقت دفعتۃً اصغر پر کچھ عجیب ماورائیت کا عالم طاری ہو گیا اور لوگوں کو مخاطب کر کے رقت آمیز لہجہ میں کہا :

"لوگو ! گواہ رہنا اصغر کا یہ آخری جام شراب ہے ۔ آج سے وہ بے خوشی سے توبہ کرتا ہے ۔ خدا اسے معاف کرے اور اپنے عہد پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے[2] ۔"

اس واقعہ کے بعد شراب سے توبہ کرلی ...... اور ریلوے کی ملازمت ، بابو راج بہادر کی رفاقت اور حلقۂ شہدہ کی شرکت ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی (تفصیل آگے " دور رندی و سرشاری " میں آئے گی) ۔

یہ سارا ڈرامہ ۶ ، ۷ سال[*] کے عرصہ میں ختم ہو گیا یعنی ۲۰ ، ۲۱ سال کی عمر سے ۲۵ ، ۲۶ سال کی عمر تک ـــــ اگرچہ یہ زمانہ اصغر کے انتہائی شباب کا تھا اور وہ فسق و فجور میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن ان کے کردار میں اپنے فرض کی طرف سے کسی قسم کی کوتاہی یا کسی دوسری بدعنوانی (رشوت وغیرہ) کا پتہ نہیں چلتا ۔ برخلاف اس کے ان کے سوانح نگار ، اس دور میں بھی ان کی دیانت داری ، فرض شناسی ، انسان دوستی اور مستعدی کی شہادت دیتے ہیں ۔ اس ضمن میں سید رشید احمد صاحب رقمطراز ہیں :

" وہ اپنے فرائض منصبی بڑی مستعدی ، دیانتداری اور صفائی سے انجام دیتے .... دوسروں کے محسوسات کا احترام کرتے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا افسر ان کے اصول اور خوبیوں سے واقف ہو کر ان کی کافی عزت و قدر کرتا تھا[3] ۔"

اصغر کا ہیڈ کوارٹر " جرول روڈ اسٹیشن" تھا جو گونڈہ[4] سے بارہ بنکی[5] کو جانے والی بی این ڈبلیو ریلوے لائن پر دریائے سرجو کے کنارے واقع ہے ۔ یہ اسٹیشن قصبہ جرول (ضلع بہرائچ) سے چار میل کے فاصلہ پر ویران جگہ میں بنا ہوا ہے ۔ اس دور افتادہ علاقہ کے عوام

۱- چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۸

۲- ایضاً - ص ۱۷

۳- ایضاً - ص ۱۸

*- اصغر وسط ۱۹۰۶ء یا اوائل ۱۹۰۷ء میں ملازم ہوئے اور اواخر ۱۹۱۲ء یا اوائل ۱۹۱۳ء میں ملازمت ترک کر دی ۔

۴- گونڈہ لکھنؤ سے ۶۰ ، ۷۰ میل شمال مشرق کی سمت میں واقع ہے ۔

۵- بارہ بنکی لکھنؤ سے ۱۵ میل مشرق میں واقع ہے ۔

اب بھی موجودہ دور کی معاشرت و تہذیب اور اسکے رنگ و روغن سے عاری ھیں ، آج سے نصف صدی قبل ان کی کیا حالت رھی ھوگی اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ھے ...... اس وقت وہ فطرت کے بہت قریب اور تہذیب و شائستگی کے مروجہ معیار سے کوسوں دور تھے -- اصغر کا دن رات کا سابقہ اسی قسم کے اجڈ اور گنوار بارہ ماسیوں سے تھا لیکن ان کا رویہ ان سے (بارہ ماسیوں سے) بڑا ھمدردانہ ، انسانیت اور شرافت کا تھا اور وہ ان سے بہت خوش تھے - اس امر کی شہادت جناب سید رشید احمد ان الفاظ میں دیتے ھیں :

" ان کے (اصغر) مزدور جن کو ریلوے کی اصطلاح میں بارہ ماسی کہتے ھیں اپنے " اصغر بابو " سے بہت خوش اور مانوس تھے ، اس لیے کہ وہ پہلے کے بابوؤں کی طرح نہ ان کی مزدوری میں کاٹ کپٹ کرتے اور نہ اپنا کوئی حصہ بٹاتے - برخلاف اس کے وہ ان کی معمولی فروگذاشتوں اور حاضری میں دیر سویر کو نظرانداز کر دیتے اور وقت ضرورت ان کی مدد کرنے میں تامل نہ کرتے - ان کے بارہ ماسی ان کو " بابو " کہہ کر خطاب کرتے .... جس میں محبت اور تکریم دونوں طرح کے جذبات شامل ھیں [1] - "

مختصر یہ کہ ریلوے کی ملازمت کا یہ " ۷ سال کا زمانہ انھوں نے بڑی عزت و توقیر کے ساتھ گزارا -

(۲) **بیکاری** : (اوائل ۱۹۱۳ء تا اوائل ۱۹۱۵ء) -

اصغر نے وفور جذبات میں ملازمت تو ترک کر دی لیکن ڈیڑھ دو سال تک [2] انھیں بہت سخت تکلیف اٹھانا پڑی - دو دو بیویوں* کا خرچ ، بوڑھے والدین کا بار ، ان کے

۱- چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۱۸

۲- بحوالہ مکتوب سید رشید احمد بنام راقم مقالہ ، محررہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء - ص ۴ --- رشید صاحب فرماتے ھیں " ترک ملازمت کا سال ۱۳-۱۹۱۲ء ھی درست معلوم ھوتا ھے اس کے بعد کچھ ایام بیکاری میں بسر ھوئے - جن کی مدت ڈیڑھ دو سال سے کم نہیں " --- ایک دوسری جگہ رقم فرماتے ھیں " اس کے بعد قریب دو سال بیکاری میں بسر ھوئے " اس طرح مدت بیکاری اواخر ۱۹۱۲ء یا اوائل ۱۹۱۳ء سے اواخر ۱۹۱۴ء یا اوائل ۱۹۱۵ء ھوئی - یہی حدود ۱۹۱۵ء ، بساط خانہ کی دوکان کے قیام کا زمانہ بھی ھے - مکتوب مذکور جناب سید رشید احمد - ص ۳

*- تفصیل کے لیے دیکھئے مقالہ ھذا ص ۱۱۳ " ازواج و اولاد "

ذاتی ضروریات ۔۔۔ لیکن باوجود اتنی کڑی آزمائش کے ان کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش اور ان کے عزم و ارادہ میں ذرا سا بھی تزلزل نہ پیدا ہوا۔ وہ ڈیڑھ دو سال کی بے کاری و بے روزگاری کی طویل مدت بڑے صبر و سکون سے جھیل گئے ۔ آخر اس ظلمت شب* میں اصغر کو آب حیات کا سرچشمہ دکھائی دیا۔ یعنی اصغر کی بے غرض دوستی اور بے لوث تعلقات آڑے آئے ۔

(۲) بساط خانہ کی دوکان:

(۱۹۱۵ء تا اوائل ۱۹۱۷ء) ان کے بعض مخلص دوستوں سے ان کی حالت نہ دیکھی گئی اور انھوں نے اصغر کو راضی کر کے ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ چوک بازار گونڈہ میں ایک بساط خانہ کی دوکان رکھوا دی[1] ۔ اصغر نہ اس میدان کے مرد تھے ، نہ ان ترکیبوں کو طبعاً پسند کرتے تھے، جن سے دو دن میں دوکان داری چمک اٹھتی ہے ۔ اس لیے دوکان زیادہ دنوں تک نہ چل سکی اور دو ہی سال میں ختم ہو گئی ۔۔ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ دوکان ابتدائے سال ۱۹۱۵ء میں قائم ہوئی اور جب اوائل ۱۹۱۷ء میں جگر گونڈے پہنچے ہیں، اس وقت تک رہی کیونکہ جگر پہلی اور دوسری بار ان کی دوکان ہی پر ملے ہیں[2] ۔ اس کی تفصیل جناب سید رشید احمد کی زبانی سنیے :

" وہ ریلوے کی ملازمت ترک کر کے گھر آ بیٹھے تھے ۔ ان کی بیکاری کے پیش نظر بعض احباب کی رائے ہوئی کہ وہ تجارت کریں چنانچہ لوگوں نے کچھ سرمایے کا انتظام کر کے چوک بازار گونڈہ میں انھیں ایک دوکان رکھوا دی ۔ جہاں صبح و شام یار دوستوں کا جمگھٹا رہتا، پان سگریٹ اور چائے کے دور چلتے دوکان کیا تھی چوک بازار میں سیر و تفریح اور گپ بازی کا ایک اڈہ یا ٹھکانا بن گیا تھا۔[3] "

آگے چل کر لکھتے ہیں :

" اصغر کی دوکان داری کا بھی حشر سن لیجئے ۔ ہندوستانی روایتی دوکان داری میں کامیابی کے جو گر ہیں اور گاہکوں کسی

---

*۔ دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند کاندریں ظلمت شب آب حیاتم دادند

۱۔ بحوالہ مکتوب سید رشید احمد بنام راقم مقالہ محررہ ۱۲/۳/۶۹ء ۔ ص ۳ ۔۔ رشید صاحب کی اصل عبارت یہ ہے " دوستوں کی تحریک و اعانت سے ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ بساط خانہ کی دوکان کی ابتدا ہوئی ۔ قریب دو سال یہ شغل رہا " ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اواخر ۱۹۱۴ء یا اوائل ۱۹۱۵ء سے اواخر ۱۹۱۶ء یا اوائل ۱۹۱۷ء تک دوکان رہی ۔

۲۔ مکتوب جناب تسکین قریشی بنام جناب احمر رفاعی مرقومہ ۲ ستمبر ۱۹۵۹ء بحوالہ مقالہ پی ایچ ڈی جناب احمر رفاعی ۔ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۔ ص ۲۰

۳۔ چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۰

خلصیات کا جائزہ لے کر ، ان کو جھوٹ سچ بیانات سے خریداری
پر جس طرح مائل کیا جاتا یا پھنسایا جاتا ہے یہ دروغ بافی
اصغر کے بس کی بات نہ تھی ۔ اصغر نہ صرف اس سے بیگانہ تھے
بلکہ اسے مذموم اور ناجائز سمجھتے تھے ۔ اس لیے ان کی دوکانداری
میں گھاٹے کے سوا رکھا ہی کیا تھا چنانچہ اس کا وہی حشر ہوا
کہ سال دو سال کے اس کاروبار میں کسی نفع اور ترقی کے بجائے
رفتہ رفتہ دوکان یار دوستوں کی خاطر تواضع کی نذر ہوگئی اور جو
کسر باقی رہی تھی اسے فہرست باقی داراں نے پوری کر کے حساب
صاف کر دیا [1]۔"

اصغر کی دوکانداری کی ناکامی کے اسباب جو کچھ رشید صاحب نے تحریر فرمائے ہیں
" روایتی دوکانداری کے گروں سے بیگانگی یا ان کو مذموم سمجھنا " --- اپنی جگہ لاکھ درست
سہی لیکن میرے نزدیک اس کے اور بھی اسباب تھے ۔ مثلاً

(۱) اس قسم کے " بنئے پن " سے طبعی عدم مناسبت ۔ لیکن سب سے بڑا سبب
یہ تھا کہ

(۲) کسی کاروبار کے جمانے میں جس توجہ ، انہماک ، دلچسپی اور خلوص کی ضرورت
ہوتی ہے ، اس دور میں ، اصغر میں اس کی کمی تھی ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان میں صلاحیت
نہیں تھی ، میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بعض اسباب ایسے تھے جن کی وجہ سے اصغر
نے یکسوئی ، توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ دوکان نہیں کی ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ زمانہ اصغر
کی بھرپور جوانی کا ہے اگرچہ " شراب و شاہد " سے تائب ہو چکے ہیں لیکن ان کی بیقرار ،
رنگین ، تفریح پسند اور " ہو حق " میں دلچسپی لینے والی طبیعت کو قرار نہیں آیا ہے ۔
چنانچہ انھوں نے اس کی تسکین کی ایک اور راہ نکال لی ---- شعر و شاعری کی محفلیں
جمانے ، بذلہ سنجیوں اور لطیفہ گوئیوں کی مجلسیں گرم کرنے ، جوانی کی بظاہر بے ضرر رنگینیوں
کے لئے بزم احباب آراستہ کرنے کی راہ ---- چوک بازار میں بساط خانے کی دوکان نے ان مشاغل
کے لیے میدان عمل بہم پہنچا دیا ۔ اسطرح " دوکان " " جنت نگاہ " اور " فردوس گوش "
کے ساتھ ساتھ تسکین قلب کا سامان بھی بن گئی ۔ ممکن ہے کہ چوک بازار کی گھما گھمی میں
" ذوق نظر " کی تسکین کا سامان بھی ہو مگر اتنا تو بہرحال محقق ہے کہ وہاں (دوکان میں)
یار دوستوں کے قہقہے اور چہچہے ہوتے ، شعر و شاعری ہوتی ، علمی مذاکرات ہوتے اور

---

۱ - چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۲۰

نقد و تبصرہ کی محفلیں گرم ہوتیں[1] ۔ اس ماحول سے " ربط لطیف "* میں گو اصغر کو اپنی ذہانت و فطانت کی جی کھول کر داد[2] ملی اور ان کی ذوق شعری کی بھی خوب خوب تسکین ہوئی[3] لیکن اس نے دوکان داری جیسے " پتہ مار " ، خشک اور غیر دلچسپ کام کے لئے، نہ ان کے پاس وقت چھوڑا نہ ان میں " دماغ صحبت مشتریاں "* ہی باقی رکھا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دوکان دو سال سے زائد نہ چل سکی ۔

(۳) عینک کا کاروبار : (وسط ۱۹۱۷ء یا اوائل ۱۹۱۸ء یا اوائل ۱۹۲۲ء ۔

یہی زمانہ تھا جب جگر پھرتے پھراتے گونڈہ پہونچے[۴ ×] اور اصغر کے دوست دیرینہ قاضی محمد حامد حسرت[۵] کی وساطت سے اصغر سے ملے ۔ اصغر اور جگر میں

۱- چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۲۰

* - " اب اس نگاہ ناز سے ربط لطیف ہے مجھ کو دماغ صحبت روحانیاں نہیں " اصغر

۲-۳، چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۲۰

۴- جناب محمد اسلام نے گونڈہ میں جگر کی آمد کا سال ۱۹۱۹ء بتایا ہے (جگر حیات اور شاعری - ص ۵۹) - لیکن سید رشید احمد صاحب ۱۹۱۷ء سردیوں کا زمانہ بتاتے ہیں - (مکتوب بنام راقم مقالہ مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء - ص ۳) - میری نزدیک رشید صاحب کا بیان زیادہ قرین قیاس اور صحیح ہے - اس خیال کو جناب مرزا احسان احمدصاحب کی تحریر سے بھی تقویت پہونچتی ہے - وہ " داغ جگر " کے مقدمہ میں جو ۱۹۲۱ء میں طبع ہوا رقمطراز ہیں " چار پانچ برس کا عرصہ ہوا کہ وہ اس سلسلے میں گونڈہ بھی گئے جہاں اصغر حسین صاحب سے ملاقات ہوئی " (مقالات احسان - ص ۳۶۰) -

×- جناب احمر رفاعی " جگر آثار و افکار " میں رقمطراز ہیں " جگر کے گونڈہ پہونچنے کا تعین ہو جاتا ہے - ہمارے تخمینے کے مطابق ۱۹۱۶ء کے اواخر یا ۱۹۱۷ء کا شروع ہوگا ـــــ " آگے لکھتے ہیں " اس طرح وہ ۱۹۱۶ء تک یقیناً گونڈہ پہنچ چکے تھے " ـــ لیکن میرے خیال میں ۱۹۱۷ء کا اوائل ہی زیادہ صحیح ہے - تفصیل آگے آئے گی -

۵- قاضی محمد حسرت ، مشہور صحافی ، فیض آباد سے ہفتہ وار " قیصر ہند " نکالتے تھے، بعد میں ۲۱-۱۹۲۰ء میں سید جالب دہلوی کے ساتھ " ہمدم " لکھنؤ میں چلے گئے - اصغر کے بڑے گہرے اور پرانے دوست تھے ، سب سے پہلے اصغر سے سید رشید احمد صاحب کی انھیں کے یہاں ملاقات ہوئی ـــ جناب ڈاکٹر محمد اسلام نے اصغر سے جگر کی ملاقات کا سبب جس فیض آبادی دوست کی تحریک کو ٹھہرایا ہے (جگر حیات اور شاعری - ص ۵۹) - وہ ہی قاضی محمد حامد حسرت ہیں - اس گتھی کو جناب سید رشید احمد نے میرے استفسار کے جواب میں اس طرح سلجھایا " اس ملاقات میں جس فیض آبادی دوست کا ذکر و حوالہ ہے، وہ دراصل قاضی محمد حامد حسرت سے مراد ہے ، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ گونڈہ آنے سے پہلے جگر کا قیام کچھ دن فیض آباد میں رہا تھا جہاں وہ بلرام پور والی سرائے واقع محلہ رکاب گنج میں مقیم تھے - ایک روز جگر بازار چوک فیض آباد میں " خان بہادر " نام کے جوتے کے ایک دوکاندار کی دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ قاضی محمد حامدحسرت کے بڑے بھائی قاضی محمد یوسف صاحب کا اس طرف سے گزر ہوا - جن سے " خان بہادر " کے مراسم تھے - انھوں نے قاضی صاحب سے جگر صاحب کا تعارف کراتے ہوئے ان کے کلام اور انداز غزل سرائی کی تعریف کی - اس طرح قاضی صاحب جگر کو اپنے یہاں (دفتر اخبار قیصر ہند) لے گئے اور اپنے بھائی حسرت سے ملایا - مختصر یہ کہ حسرت نے جگر سے کہا کہ گونڈہ جانا ہو تو اصغر سے ضرور ملیں جو ان کے کلام کی کافی قدر کریں گے" (مکتوب سیدرشید احمد بنام راقم مقالہ محررہ ۲ مارچ ۱۹۶۹ء - ص ۶) -

" داغ جگر " پر دسمبر ۱۹۲۱ء کے معارف میں شاہ معین الدین ندوی صاحب نے تبصرہ لکھا ہے ۔
معارف نمبر ۲ جلد ۸ دسمبر ۱۹۲۱ء - ص ۲۸۰

بعض ایسی طبعی مناسبتیں تھیں جنھوں نے دونوں کو ایک دوسرے کی طرف کھینچا ۔ مثلاً دونوں " شاہد و شراب " کی لذت چشیدہ و ذوق آشنا ، دونوں شعر و شاعری کے دلدادہ اور سب سے بڑھ کر دونوں محبت کے بھوکے ، خلوص کے پیکر ، انسان دوست اور اعلیٰ انسانی اقدار کے جویا و قدردان ---- پہلی ہی نظر میں دونوں ایک دوسرے کے گھائل ہو گئے اور ایک دوسرے کی چوٹ دل پر تمام عمر لئے رہے ۔ اس طبعی مناسبت کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے سے قریب سے قریب تر ہوتے گئے ۔ یہاں تک کہ دونوں نے مل کر عینک کا کاروبار شروع کر دیا جس کی آمدنی سے کنبہ کا خرچ چلتا[1] ۔ آخر میں جب قرب بہت بڑھ گیا تو اصغر نے اپنی چھوٹی سالی نسیم (نسیم بیگم) کی شادی جگر سے کر دی ۔ عینک کے کاروبار کا سلسلہ بقول سید رشید احمد ۶ سال تک رہا[۲] ۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :

" جگر ایک مدت سے بی ۔ این ۔ یوجل کمپنی چشمہ سازان ۔ آگرہ کے سفری نمائندہ کی حیثیت سے کام کرتے تھے ..... وہ جہاں جاتے باوجود اپنی رندی و سرمستی کے اپنے پیشے میں بہت کامیاب رہتے ۔ انھیں چشمہ کی تجارت کا کافی تجربہ ہو گیا تھا ......بالآخر جگر نے اصغر کو بھی چشمہ کی تجارت پر مائل کیا اور آگرہ کی نمایندگی ترک کر کے اصغر کے ساتھ خود اپنا کام کرنے لگے ۔ جس کی یہ صورت قرار پائی کہ جگر حسب معمول باہر سفر کر کے آرڈر حاصل کرتے اور اصغر گونڈے میں قیام کر کے ان آرڈروں کی تعمیل کرتے[۳] ۔" ....

جو مال موجود نہ ہوتا اسے دساور سے منگوا کر سپلائی کرتے[۴] ۔"

چنانچہ چھ سال تک اس تجارت کا سلسلہ قائم رہا اور اس صورت سے خاندان کی پرورش ہوتی رہی[۵] ۔"

اگر رشید صاحب کے اس بیان کو تسلیم کر لیا جائے کہ " یہ سلسلہ ۶ سال تک قائم رہا " تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کارخانہ ۱۹۲۰ء کے حدود میں قائم ہوا جو دسمبر ۱۹۲۵ء تک تو یقیناً قائم رہا[۶] بلکہ گمان غالب یہ ہے کہ اوائل ۱۹۲۶ء (جنوری فروری) میں،

۱، ۲، ۳، ۴- چٹان شمارہ ۱۷ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۱۹

۲- مکتوب بنام راقم مقالہ مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء - ص ۳

۵- چٹان شمارہ ۱۷ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۱۹

۶- جناب جلیل قدوائی رقمطراز ہیں " اس زمانہ میں (علی گڑھ یونیورسٹی کی طلائی جوبلی کے موقعہ پر) اصغر صاحب گونڈے میں چشمہ کا کاروبار کرتے تھے " (تنقیدیں اور خاکے - ص ۵۵-۵۳) ---- مرزا احسان احمد صاحب نے مقدمہ نشاط روح میں لکھا ہے " گونڈہ میں ان کا چشمہ کا ایک مستقل کارخانہ ہے جو ایک مدت سے کام کر رہا ہے " ص ۸ ------ نشاط روح اوائل دسمبر ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی اس وقت یہ کارخانہ چل رہا تھا ۔

جب اصغر " اردو مرکز " لاہور کے مہتمم و ناظم ہو کر گئے ہیں اس وقت بند ہوا ہوگا [1] - لیکن بعض قرائن و شواہد سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس معاملہ میں سید رشید احمد صاحب سے تسامح ہو گیا - یہ سلسلہ ۲ سال نہیں ۸ تا ۹ سال رہا یعنی وسط ۱۹۱۷ء یا اوائل ۱۹۱۸ء سے اوائل ۱۹۲۶ء تک - دلائل حسب ذیل ہیں :

(۱) رشید صاحب کے اقتباس بالا کا آخری جملہ ہے " ۲ سال تک اس تجارت کا سلسلہ قائم رہا اور اس صورت سے خاندان کی پرورش ہوتی رہی " - اس جملہ کے تجزیے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خاندان کی پرورش میں جگر صاحب برابر کے شریک تھے - یہاں یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ جب تک جگر خاندان کے فرد نہ ہو جائیں وہ خاندان کا خرچ چلانے کے پابند نہیں ہو سکتے - یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جگر خاندان اصغر کے فرد کب اور کیسے بنے؟ یہ تو اوپر اشارۃً کہا جا چکا ہے کہ جگر کی شادی اصغر صاحب کی سالی نسیم سے ہوئی تھی لیکن کب اس کا کوئی علم نہیں - جناب ڈاکٹر محمد اسلام اپنی کتاب " جگر حیات اور شاعری " صفحہ ۴۷ پر شادی کا سال ۱۹۲۰ء تحریر فرماتے ہیں - ان کی عبارت یہ ہے " " وہ (جگر صاحب) گھومتے پھرتے گونڈہ پہنچے وہاں ان کی اصغر سے ملاقات ہوئی انھوں نے ان کے دکھے ہوئے دل کو پہچانا اور اس پر مرہم رکھا ، اصغر نے ان کے سکون قلب کی خاطر [2] اپنی سالی نسیم بیگم سے غالباً" ۱۹۲۰ء میں ان کا

۱- مرزا احسان احمد صاحب نے مقدمہ نشاط روح میں صفحہ ۸ پر جو یہ لکھا ہے کہ " اصغر مرحوم جب ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں رسالہ ہندوستانی کے اڈیٹر ہو کر گئے تھے تو یہ کارخانہ بند کر دیا گیا تھا " غلط ہے ، کارخانہ ۱۹۲۶ء کے اوائل ہی میں بند ہو گیا کیوں کہ اصغر وہاں نہیں تھے -

۲- سید رشید احمد صاحب نے اس شادی کے سلسلے میں لکھا ہے " رفتہ رفتہ جگر پر اصغر کی نظر التفات زیادہ ہوتی گئی اور ان کی گرفتاری کے لیے کچھ طوق و سلاسل تیار کئے جانے لگے - جس کے نتیجہ میں بالآخر اصغر کی سالی نسیم کے ساتھ جگر کا عقد ہوگیا " (چٹان شمارہ ۱۷ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۱۹) --- لیکن میرے خیال میں " طوق و سلاسل " اور " سکون قلب کی خاطر " دونوں بیانات میں افراط و تفریط ہے - حقیقت یہ ہے کہ " توبہ " کے بعد اصغر میں اصلاح پسندی کا بہت شدید جذبہ پیدا ہو گیا تھا - جس خاندان کی اصلاح اور کفالت انھوں نے اپنے ذمہ لی تھی ، اس کا ایک اہم ترین مسئلہ نسیم کی شادی تھا ، نسیم اور ان کے لواحقین کے متعلق شرفائے اطراف کی جو رائے اور خیال تھا وہ کچھ اچھا نہ تھا شرفاء انھیں " پاؤں کی جوتی " تو بنا سکتے تھے ، اور ہر وقت اس کی گرد جھاڑنے اور اس پر پالش کرنے کو تو تیار ہو سکتے تھے لیکن" گلے کا ہار " بنانے کو کوئی آمادہ نہ ہوتا - اصغر کو یہ خیال گھن کی طرح کھائے جاتا ہوگا- نسیم کی تربیت انھوں نے بچوں کی طرح کی تھی ، ان سے انس لازمی چیز ہے ، ادھر جگر تھے رند لاابالی لیکن کھرے انسان ، نہ کوئی آگے نہ پیچھے ، خود چوٹ کھائے ہوئے ، دوسروں کی چوٹ کو سمجھ سکتے تھے - اصغر نے انھیں دونوں معاشرہ کے ٹھکرائے ہوئے انسانوں کو ملا دیا - اس میں نہ ان کی کوئی ذاتی غرض تھی نہ لالچ (جیسا کہ بعض حضرات نے اظہار خیال فرمایا ہے - تفصیلی بحث آگے آئے گی) نہ تنہا جگر کے " سکون قلب " کا خیال - بلکہ اس رشتہ سے انھوں نے دو دلوں کو سکون پہنچانے کی کوشش کی -

عقد کرا دیا " ۔ اسلام صاحب سال کے تعین میں خود متذبذب ہیں لیکن رشید صاحب نے حتماً شادی کا سال ۱۹۱۹ء تحریر فرمایا ہے --- اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مشترکہ خاندان کا خرچ جگر نے ۱۹۱۹ء کے بعد ہی چلایا ہوگا ۔ اب اگر یہ بات مان لی جائے کہ کارخانہ ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا (جیسا کہ رشید صاحب کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے) تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک سال تک (۱۹۱۹-۲۰ء) خاندان کی کفالت جگر نے کیسے کی؟ ۔ اس کی دو ہی ممکن صورتیں ہو سکتی ہیں (۱) یا تو جگر نے سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں لیا --- جگر کے مزاج اور طبیعت کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ بعید نہیں معلوم ہوتی ۔ لیکن ایسا ہے نہیں جیسا کہ آگے دکھایا جائے گا یا (۲) جگر نے کسی دوسرے ذریعہ سے اس کمی کو پورا کیا -- مثلاً بحیثیت سفری نمایندہ کے ان کی جو آمدنی ہوتی تھی اس سے ۔ لیکن یہ بھی درست نہیں --- اس بحث کو ختم کرنے کے لیے تھوڑی دیر کو ہم یہ مانے لیتے ہیں کہ جگر نے ایک سال تک (۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۰ء) کنبہ کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ الٹا اس پر بار ہو کر رہے ۔ پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ اتنی بڑی گاڑی کو کس نے گھسیٹا ۔ سوائے اصغر کے کوئی اور نظر نہیں آتا ۔ لیکن اصغر کے متعلق ہم گذشتہ صفحات میں یہ دیکھ چکے ہیں کہ اوائل ۱۹۱۷ء میں دوکان ختم ہوگئی ۔ ۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۰ء اصغر کے کسی اور ایسے کاروبار کا پتہ نہیں چلتا جس سے اتنے بڑے کنبہ کا خرچ چل سکے لہذا انسان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کارخانہ کا قیام ۱۹۲۰ء سے قبل بلکہ ۱۹۱۹ء سے بھی بہت پہلے ہو چکا تھا ۔

(۲) سید رشید احمد صاحب نے میرے استفسار کے جواب میں اپنے مکتوب مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء میں تحریر فرمایا ہے کہ " اصغر کی پہلی لڑکی کی شادی .... ۱۹۲۰-۲۱ء کے دوران ہوئی " --- اب اگر یہ درست ہے ، اور ہمارے پاس اس کی تردید کی کوئی شہادت نہیں ہے ، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر چشمہ کا کارخانہ ۱۹۲۰ء میں قائم ہوا اور ۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۰ء کے درمیان اصغر نے کوئی اور کام بھی نہیں کیا تو

۱۔ " نسیم کا عقد جگر کے ساتھ ۱۹۱۹ء میں گونڈہ میں ہوا " مکتوب جناب سید رشید احمد بنام مقالہ نگار ، مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء ۔ ص ۶

*۔ احمر رفاعی صاحب شادی کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں " نسیم خاتون سے نکاح جگر کے گونڈہ پہونچنے کے تھوڑی ہی عرصہ بعد ہو چکا تھا " --- تھوڑی عرصہ کی انھوں نے کوئی تعیین نہیں کی ۔ لیکن آمد جگر کو ۱۹۱۶ء لکھتے ہیں ۔ اسطرح خواہ مخواہ خیال ہوتا ہے کہ ۱۹۱۷ء تک شادی ہو گئی ۔ اگر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے تو غلط ہے ۔ (تفصیلی بحث آگے آئے گی) ۔

شادی کا جھگڑا کیسے پھیلا بیٹھے اور شادی بھی پہلی پہلی جس میں ماں بھی موجود تھی[1] جو باوجود تعلقات کی ناخوشگواری اور کشیدگی کے ہر طرح کے ارمان پورا کرنا چاہتی ہوگی اور اصغر بھی کم از کم دنیا ہی کو دکھانے کے لیے سہی ، اس کو کسی قسم کی شکایت کا موقع دینا نہ چاہتے ہوں گے ، ایسی صورت میں اس قیاس کو کہ کارخانہ ۱۹۲۰ء سے بہت پہلے قائم ہو چکا تھا ، تقویت پہنچتی ـــــ تمام کارخانہ کی تاریخ کم از کم دو تین سال پہلے کی ہوگی جس سے کہ اصغر مالی حیثیت سے اس قابل تو ہو گئے ہوں کہ اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکیں ۔

(۳) مرزا احسان احمد جگر صاحب کے سلسلے میں " مقدمہ داغ جگر " میں رقمطراز ہیں :

" چار پانچ برس کا عرصہ ہوا کہ وہ اسی سلسلے میں گونڈہ بھی گئے جہاں اصغر حسین صاحب سے ملاقات ہوئی .... یہی وہ سحر تھا جس نے حضرت جگر کے دل و دماغ کو اس طرح مسحور کر لیا کہ انھوں نے وطن ، اعزہ اور احباب سب کو اس نادرۂ روزگار کے قدموں پر نثار کر دیا چنانچہ آج چار برس سے گونڈہ میں مستقل طور پر مقیم ہیں اور بحیثیت ایجنٹ کے اصغر صاحب کے کارخانے میں کام کر رہے ہیں ۔[2] "

" داغ جگر " کا سال طباعت اواخر (اکتوبر نومبر) ۱۹۲۱ء ہے (کیوں کہ جناب شاہ معین الدین ندوی نے معارف نمبر ۶ جلد ۸ ، دسمبر ۱۹۲۱ء میں صفحہ ۲۸۰ پر تبصرہ فرمایا ہے ۔) اب اگر اس بیان کو پیش نظر رکھا جائے تو وقت تحریر (اکتوبر نومبر ۱۹۲۱ع) سے چار سال پہلے اکتوبر نومبر ۱۹۱۷ء آتے ہیں ـــــ گویا اکتوبر نومبر ۱۹۱۷ء یا اس سے کچھ پہلے کارخانہ قائم ہو چکا تھا ـــ اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ جگر صاحب اوائل ۱۹۱۷ء (موسم سرما جنوری فروری) میں گونڈے آئے ۔ اسی وقت ان کی اصغر سے ملاقات ہوئی ، آہستہ آہستہ رسم و راہ بڑھی ، ان دنوں اصغر کی دوکان چل رہی تھی " جگر کی اصغر سے ابتدائی ملاقاتیں ان کی دوکان ہی پر ہوئیں[3] " لیکن دوکان ان کے

۱۔ اصغر کی پہلی بیوی کا انتقال ۱۹۲۲ء میں ہوا ۔ چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ص ۱۸

۲۔ مقالات احسان ۔ ص ۳۶

۳۔ مکتوب جناب تسکین قریشی بنام جناب ڈاکٹر احمر رفاعی مرقومہ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۹ء ۔ بحوالہ جگر آثار و افکار ۔ مقالہ پی ایچ ڈی جناب احمر رفاعی ۔ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۔ ص ۲۰

مزاج کے موافق اور خاندان کی کفالت کے لئے ناموزوں تھی - اصغر پریشان ہوں گے ، جگر صاحب کو عینک کے کاروبار کا خاصا تجربہ تھا چنانچہ انھیں کی تحریک ، مشورے اور شرکت میں وسط ۱۹۱۷ء تا اوائل ۱۹۱۸ء* کارخانہ قائم کیا گیا - اس طرح یہ کارخانہ ۲ سال کے بجائے (جیسا کہ رشید صاحب نے تحریر فرمایا ہے) ۸ سال تک قائم رہا - ایک سال تک مزید تعلقات میں شدت اور پختگی آئی ہوگی یہاں تک کہ ۲۷ جون ۱۹۱۹ء سے پہلے کسی تاریخ میں اصغر نے جگر سے خسیم کی شادی کر دی - ممکن ہے شادی کے جو اسباب میں نے اوپر درج کئے ہیں ، ان کے علاوہ اس میں جگر کے لیے جذبۂ احسان مندی بھی ہو -

(۵) صحافت : (۱۹۱۲ء تا ۲۱-۱۹۲۰ء) -

اصغر نے صحافت کو مستقلاً بطور پیشہ اختیار نہیں کیا تھا - جن دنوں[1] وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے ، انھیں دنوں ان کے دوست قاضی محمد حامد حسرت[2] نے فیض آباد سے (یوپی) ایک اردو ہفت روزہ " قیصر ہند[3] " کے نام سے جاری کیا - اس کی ابتدائی ترتیب و تدوین کے لئے اصغر کو گونڈے سے بلایا[4] ، یہ زمانہ جنگ بلقان[5] کا تھا - مسلمانوں میں بڑا ہیجان تھا ، کچھ دنوں کے بعد عالمی جنگ اول[6] شروع ہوگئی - لوگ جنگ کی خبروں کے سننے کے لیے بے چین رہتے تھے ، اصغر کے حقیقت نگار قلم سے ان دنوں بڑے ہی معتدل اور متوازن اداریے و شذرے نکلے جسے سنجیدہ طبقے نے بہت سراہا اور پسند کیا - پرچہ کی دھوم مچ گئی اور اس کی مقبولیت اور شہرت اتنی بڑھی کہ تھوڑی ہی مدت میں اخبار خاصا چل نکلا[7] - جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اصغر نہ پیشہ ور صحافی تھے نہ " قیصر ہند " کے مستقل ملازم یا مدیر ، نہ قیصر ہند " کی اتنی آمدنی تھی کہ

---

*- یہ نتیجہ قائم کیا جا چکا تھا کہ سید رشید احمد صاحب کا مضمون (مسودہ) جگر صاحب نظر سے گزرا اس میں وہ صفحہ ۱۳ پر رقمطراز ہیں " ۱۹۱۷ء میں گونڈہ میں جگر کی آمد و رفت شروع ہو کر ۱۹۱۸ء سے وہ اصغر کے ساتھ چشمہ کا کاروبار کرنے لگے "

۱- اواخر ۱۹۱۲ء یا اوائل ۱۹۱۳ء میں - تفصیل اوپر گزر چکی ہے -

۲- قاضی محمد حامد حسرت - حضرت پور ضلع گونڈہ کے رہنے والے تھے ، فیض آباد سے قیصر ہند اور " پیغام " جاری کیا - ۲۲-۱۹۲۱ء میں سید جالب دہلوی کی معاونت میں " ہمدم " لکھنؤ چلے گئے تھے - مشہور صحافی تھے - اصغر کے خاص دوستوں میں تھے -

۳- قیصر ہند ۱۹۱۳ء میں جاری ہوا - مکتوب سید رشید احمد بنام مقالہ نگار ۶۹/۲/۱۲ء ص ۳

۴- چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۷

۵- جنگ بلقان اول ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو شروع ہوئی اور ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء کو صلح پر ختم ہوئی - جنگ دوم جولائی ۱۹۱۳ء میں شروع ہوئی اور ۱۰ اگست ۱۹۱۳ء میں صلح پر ختم ہوئی

۶- عالمی جنگ اول - ۲۸ جون ۱۴ء سے شہزادہ فرڈیننڈ کے قتل سے شروع ہوچکی تھی لیکن آسٹریا نے سربیا کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء کو کیا - یہ جنگ ۱۹۱۸ء تک جاری رہی اور ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو صلح پر ختم ہوئی - (باقی حواشی اگلے صفحہ پر)

وہ اس پر سہارا کر کے فیض آباد میں بیٹھ رہتے - ہوتا یہ تھا کہ اصغر گھر پر رہ کر (گونڈے میں) رہ کر یا فیض آباد میں عارضی قیام کر کے اداریے و شذرے لکھتے اور اسطرح قاضی محمد حامد حسرت کی بلا عوض و معاوضہ معاونت کرتے - ۷/۸ سال کے بعد جب قاضی محمد حامد حسرت ، بحیثیت معاون مدیر جناب سید جالب دہلوی روزانہ ہمدم لکھنؤ میں چلے گئے تو "قیصر ہند" (جس کا نام بدل کر "پیغام" رکھ دیا گیا تھا) کو چلانے کی ذمہ داری ان کے بڑے بھائی قاضی محمد یوسف پر آ پڑی - اصغر نے اس وقت بھی فیض آباد میں عارضی قیام کر کے "پیغام" کو زندہ رکھنے کی کوشش کی لیکن اصغر کا مستقل قیام فیض آباد میں نہ ہونے کی وجہ سے اخبار زیادہ دنوں تک نہ چل سکا اور ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ---- اصغر کی صحافت کا یہ گمنام دار سلسلہ کوئی ۹/۸ سال جاری رہا --[1][2][3][4][5][6][7]

(حاشیہ از گذشتہ صفحہ)

۷- چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۷

۱- ۲-۳- مکتوب جناب سید رشید احمد بنام مقالہ نگار ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء - ص ۳

۴- سید جالب دہلوی - مشہور صحافی - ۱۹۱۲ء میں روزانہ "ہمدم" لکھنؤ سے منسلک ہوئے - جہاں ۱۹۲۸ء تک رہے اس کے بعد اپنا اخبار "ہمت" جاری کیا - ۵ جولائی ۱۹۳۰ء کو رہگرائے عالم جاودانی ہوئے - (زمانہ ستمبر ۱۹۳۰ء) - آپ رسالہ "ہندستانی" ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی ادارت کے لیے بھی امیدوار تھے (اصغر گونڈوی کی شاعری - سرکوب الہ آبادی - ص ۹۰) - مگر تقرر سے پہلے انتقال ہو گیا -

۵- "ہمدم" مولانا عبدالباری نے ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے روزانہ "ہمدم" جاری کیا جس کے مدیروں میں مولانا سید جالب دہلوی بھی شامل رہے ہیں - یہ اخبار تقسیم ہند کے وقت تک زندہ رہا - ("صحافت پاکستان اور ہندوستان میں" ڈاکٹر عبدالسلام خورشید مطبوعہ مجلس ترقی اردو لاہور ۱۹۶۳ء - ص ۳۲۶) -

۶- قاضی محمد یوسف صاحب کا انتقال ۱۰ دسمبر ۱۹۶۹ء بعمر ۸۴ سال ہوا - مکتوب سید رشید احمد مرقومہ ۲۱ دسمبر ۱۹۶۹ء

۷- قیصر ہند کے اجرا ۱۹۱۳ء سے "پیغام" کے بند ہونے (۱۹۲۱-۲۲ء) تک اصغر کا تعلق اس سے برابر رہا - حسرت کے لکھنؤ جانے کے بعد بند ہوا - اگرچہ حسرت کے لکھنؤ جانے کی صحیح تاریخ نہیں معلوم ہوئی لیکن بعض قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ۲۲-۱۹۲۱ء یا اس کے قریبی زمانے میں ہمدم سے منسلک ہوئے - مثلاً رشید صاحب نے ۷/۸ سال کے بعد (قیصر ہند کے اجرا کے) روزانہ ہمدم لکھنؤ گئے لکھا ہے "مکتوب جناب سید رشید احمد بنام مقالہ نگار ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء یعنی قیصر ہند ۱۹۱۳ء میں جاری ہوا - اس کے معنی حسرت ۲۲-۱۹۲۱ء میں لکھنؤ گئے تھے - اس کی توثیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حسرت کی ایک نظم افسانہ غم کے عنوان سے "نقاد" دسمبر ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی ہے - جس پر حسرت کے نام کے ساتھ ایڈیٹر قیصر ہند درج ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک قیصر ہند کے ایڈیٹر تھے ---- لہذا لکھنؤ ۱۹۲۱ء یا اس کے بعد گئے ہوں گے -

صحافت سے یقیناً اصغر کو کوئی مالی نفع نہیں ہوا لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ جب وہ " اردو مرکز " لاہور میں مہتمم یا ناظم مقرر ہو کر گئے اور اس کے بعد انڈین پریس الہ آباد اور " ہندوستانی اکیڈمی " الہ آباد میں لکھنے پڑھنے کے کام پر مامور ہوئے تو صرف یہ کہ ان کو لکھنے پڑھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی بلکہ سابقہ تجربے سے ان کو بڑی مدد ملی - اور اس خدمت کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ----- اسی زمانہ میں (۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۶ء) اصغر کی نثر نگاری کے جوہر کھلے - اس دس سالہ دور میں انھوں نے بڑے معرکۃ الآراء تنقیدی مضامین ، مقالات اور کتابیں لکھیں - (جن کی تفصیل مقالہ ہذا - آثار نثر کے تحت صفحہ ۲۱۹-۲۲۶ پر دی گئی ہے) ---- مختصر یہ کہ اصغر نے بحیثیت نثر نگار ، صحافی اور شاعر ۲۳-۱۹۲۲ء تک اپنی حیثیت دنیائے ادب میں قائم کر لی تھی -

(۲) اردو مرکز - لاہور : (وسط فروری ۱۹۲۶ء تا مارچ ۱۹۲۷ء -

جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پنجاہ سالہ طلائی جوبلی (دسمبر ۱۹۲۵ء) کے موقع پر ، اصغر کی غزل کو مشاعرہ کی بہترین غزل قرار دیا گیا اور اس کے صلے میں انھیں طلائی تمغۂ انعام میں ملا[1] تو ان کی شہرت یو پی کے حدود سے نکل ارض پنجاب تک پہنچ گئی ---- انھیں دنوں* " اردو مرکز " لاہور نیا نیا قائم ہوا تھا[2] --

---

۱- انتخاب اصغر - مرتبہ جمیل نقوی ۱۹۵۲ء - ص ۲۷

*- اردو مرکز کا جامع اور وسیع پروگرام حسب ذیل تھا : (۱) اردو کے اس حصۂ ادب شاعری کو (جو محفوظ رکھنے کے قابل ہے اور) جو دراصل اسکی آئندہ ترقیات کا اصلی ہیولیٰ بھی ہے جلد سے جلد انتخاب کے بعد مجلدات کی صورت میں ترتیب دینا (۲) اردو میں ایک مخزن العلم (انسائیکلوپیڈیا) تیار کرنا (۳) اردو زبان کے فتوحات ادبیہ کا ایک منتخب مجموعہ سال بسال مجلدات کی شکل میں تیار کرتے رہنا -(۴) گران قدر نایاب مطبوعہ و غیر مطبوعہ اردو کتابوں کی ترتیب و تہذیب اور حسب استطاعت ہر قسم کی علمی و ادبی اردو تصنیفات و تالیفات کی اشاعت - (۵) اردو مرکز کی مجلس مشاورت (جو دراصل حقیقت اردو زبان کے لیے ایک دارالافتاء ہے) کے ذریعہ علمی ضروریات کے مناسب جدید الفاظ کی اختراع اور متنازعہ فیہ امور ادبیہ کے متعلق ناطق فیصلہ -

۲- سید رشید احمد نے " اردو مرکز " کا قیام ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ بتایا ہے (چٹان شمارہ ۲۲ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۱۵) جس سے خواہ مخواہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ " اردو مرکز " ۱۹۲۶ء میں قائم ہوا --- اسی طرح اصغر رفاعی صاحب نے بھی اردو مرکز کا قیام ۱۹۲۶ء ہی لکھا ہے (جگر آثار و افکار - ص ۲۵) - لیکن صراحت نہیں فرمائی کہ یہ تاریخ انھوں نے کہاں سے لی - وہ ایک نام ڈاکٹر منوہر سہائے انور کا ضرور لیتے ہیں لیکن اس عبارت سے یہ کہیں مترشح نہیں ہوتا کہ یہ ان کا بیان ہے یا ڈاکٹر منوہر سہائے کا - جناب عابد علی عابد لکھتے " مجھے سال تو ٹھیک یاد نہیں لیکن تخمیناً کہہ سکتا ہوں کہ ۱۹۲۳ء کے بعد اور ۱۹۲۶ء سے پہلے مولانا تاجور مرحوم نے ایک ادارہ " اردو مرکز " کے نام سے لاہور میں قائم کیا - (نقوش ۲۸-۲۷ ۱۹۵۵ء - ص ۵۰۸) - لیکن ان تمام حضرات کے مقابلے میں سب سے بہتر اور مستند رائے جناب مظہر لدھیانوی کی ہے - وہ لکھتے ہیں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مولانا تاجور نجیب آبادی کی نظر انتخاب اصغر پر پڑی[1] ، جو اس کے چیف ایڈیٹر[2] ، روح رواں اور انتظام و اصرام میں دست خاص رکھتے تھے ۔ چنانچہ ان کو بطور ناظم و مددگار گونڈہ سے بلوایا ۔ اس کی تصدیق جناب جلیل قدوائی کے اس بیان سے ہوتی ہے " یہ علی گڑھ ہی کا اثر تھا کہ جلد ہی پنجاب نے ان کے ادبی کمال کا اعتراف کیا اور " اردو مرکز " نے انھیں لاہور بلا لیا ۔"[3] ---- اصغر کے ساتھ یہیں کے اور بھی شاعر و ادیب مثلاً علامہ سیماب اکبرآبادی ، جگر مرادآبادی ، فانی بدایونی ، یاس یگانہ چنگیزی[*] ، روش صدیقی ، اس ادارے سے منسلک ہوئے ۔ مقامی حضرات میں پنڈت میلا رام وفا ، عابد علی عابد ، میاں تصدق حسین خالد ، مولانا حامد علی خان ، جناب نظیر لدھیانوی ،

(حاشیہ از گذشتہ صفحہ)

* مولانا نے اگست ۱۹۲۵ء میں عطر چند کپور اینڈ سنز کے اشتراک سے سر شیخ عبدالقادر اور خان بہادر نور الہی انسپکٹر آف اسکولز کی نگرانی میں " اردو مرکز " کے نام سے تصنیف و تالیف کا ایک ادارہ قائم کیا ۔" راقم الحروف اور اختر شیرانی مرحوم اس ادارے کے اولین ارکان تھے (تذکرہ شعرائے اردو ۔ نظیر لدھیانوی ۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس ۱۹۵۳ ۔ ص ۳۱۲) --- یہاں بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جناب نظیر لدھیانوی خود بھی رکن رہے ہیں اس لیے ان کا بیان مستند ہے ۔

۱۔ احسان اللہ خاں نام ، تاجور تخلص ، نجیب آباد ضلع بجنور (یوپی) کے رہنے والے یوسف زئی پٹھان تھے ۔ ابتدائی تعلیم مذہبی ماحول میں ہوئی ۔ دیوبند سے دستار فضیلت حاصل کرنے کے بعد لاہور چلے آئے ۔ ۱۹۱۵ء میں اورینٹل کالج میں داخل ہوئے (یاران کہن ۔ عبدالمجید سالک ۔ ص) ۔ مولوی فاضل اور منشی فاضل کرنے کے بعد دیال سنگھ اسکول میں مدرس اور آخر میں اردو کے پروفیسر ہو گئے ۔ فروری ۱۹۵۱ء میں لاہور میں انتقال کیا ۔ اچھے ادیب ، صحافی اور شاعر بلکہ شاعر گر تھے ۔ مدتوں مخزن ، ہمایوں ، ادبی دنیا اور شاہکار کی ادارت کرتے رہے ۔ ۱۹۱۸ء میں " انجمن ارباب علم (مخزن جنوری ۱۹۱۹ء ۔ ص ۵۲-۵۳) اور اگست ۱۹۲۵ء میں " اردو مرکز " قائم کیا ۔ اردو زبان کی ترویج واشاعت و صحت زبان اور مذاق شاعری کو پنجاب میں عام کرنے میں مولانا نے زبردست خدمات انجام دی ہیں ۔

۲۔ رباعیات رواں مرتبہ اردو مرکز لاہور ۔ ص ۲۰

۳۔ " انتخاب اصغر " ۔ مرتبہ جمیل نقوی ۔ مطبوعہ اردو مرکز لاہور ۱۹۵۲ء ۔ ص ۲۹

*۔ تذکرہ شعرائے اردو ۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس ۔ لاہور ۱۹۵۳ء ۔ ص ۳۱۲

اختر شیرانی اور مولانا مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی ان کے علاوہ اور بھی بہت سے چھوٹے بڑے شاعر و ادیب شامل تھے ـــ ان میں سر شیخ عبدالقادر[1] اور پنڈت برج موہن کیفی[2] دتاتریہ بطور خاص قابل ذکر ہیں ۔ یہ دونوں حضرات مع خان بہادر شیخ نور الٰہی[3] خاص اراکین مجلس مشاورت تھے ۔

اصغر اردو مرکز کب آئے اور کب تک رہے اس کے متعلق ان کے جاننے والوں اور سوانح نگاروں نے کوئی قطعی اور حتمی بات نہیں لکھی ۔ اس سلسلے میں صرف قیاس سے کام لیا گیا ہے ۔ جناب سید رشید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں :

" علامہ اقبال کے لطف و کرم اور فیض صحبت کی کشش سے ڈیڑھ دو سال یہاں کام کر کے اوائل ۱۹۲۸ء میں گھر واپس چلے آئے ۔ اور انڈین پریس الہ آباد کے شعبہ تالیف و تراجم سے متعلق ہوگئے جہاں ان کے داماد محمد صدیق پہلے سے کام کر رہے تھے[4] ۔"

لیکن مولانا عبدالمجید سالک مرحوم " سرگذشت " ۱۹۳۶ء کے واقعات کے تحت صفحہ ۳۹۹ پر " مولانا " اصغر گونڈوی " کے زیر عنوان رقمطراز ہیں :

" مولانا اصغر گونڈوی کا بھی انہیں دنوں انتقال ہوا ۔ مجھے ان سے اس زمانہ میں نیاز حاصل ہوا جب وہ مولانا تاجور کے " اردو مرکز " کے سلسلے میں چند ماہ کے لئے لاہور میں مقیم تھے ۔"

ان دونوں بیانات سے اتنا تو واضح ہو جاتا ہے کہ اصغر کا قیام لاہور میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال اور کم سے کم چند ماہ رہا لیکن یہ صحیح طور پر نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کس تاریخ سے کس تاریخ تک رہے ـــ رشید صاحب کے قیاس کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اصغر کی لاہور میں آمد وسط ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ ہی آتی ہے (اگر ڈیڑھ سال مانی جائے) ـــ اس لیے صحیح تاریخ و مدت کے تعین کے لئے ہمیں دوسری معاصر شہادتیں

۱ـ سر شیخ عبدالقادر ـ بارایٹ لا ـ پنجاب کے مشہور سیاسی و ادبی رہنما ، ادیب و ادیب گر ـ اردو کے بڑے حامیوں اور خادموں میں تھے ـ آپ کے رسالہ " مخزن " نے اوائل بیسویں صدی میں اردو شعر و ادب کو نیا رخ اور ایک نئی سمت دی ـ مولانا آزاد و حالی نے جو خواب ۷۵-۱۸۷۴ء میں دیکھا تھا ، اور سرسید تحریک نے جس راہ پر شعر و ادب کو لگانا چاہا تھا ، مخزن نے اس میں بڑی اعانت کی اور اس کو بہت آگے بڑھایا ـ شیخ عبدالقادر کا انتقال ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو ہوا (مخزن فروری ۱۹۵۱ء ـ ص ۱۲)ـ

۲ـ پنڈت کیفی اردو و ادب کے بڑے جانے پہچانے بزرگ ہیں ـ تمام عمر اردو کی خدمت میں گزار دی ـ انجمن ترقی اردو میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے دست راست تھے ـ اردو کی محبت میں اپنا ملک چھوڑ دیا تھا لیکن بعد میں حالات سے مایوس ہو کر ہندوستان چلے گئے ـ شاعر ، ناثر ، ناقد ، محقق سبھی کچھ تھے ـ ۱۹۵۱ء میں رہگرائے عالم جاودانی ہوئے ـ

(باقی حواشی اگلے صفحہ پر)

پر بھروسہ کرنا ہوگا ۔ لیکن اس سلسلے میں پہلے ہمیں ان شہادتوں کو لینا ہوگا جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح ان کے ورود لاہور کی تاریخ سے ہے ۔ ان میں سے چند بیانات درج ذیل ہیں :

(۱) جناب بشیر احمد صدیقی پرنسپل عائشہ بوانی کالج کراچی نے اپنی گفتگو میں جو راقم مقالہ سے ۲ مئی ۱۹۶۹ء کو ہوئی فرمایا " اصغر لاہور علی گڑھ جوبلی کے بعد گئے ۔"

(۲) میرے استفسار پر کہ اصغر لاہور کب آئے تھے اور ان کے ذمے وہاں کیا کام تھا ۔ مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی نے تحریر فرمایا :

" صحیح تاریخ تو مجھے یاد نہیں ۔ غالباً ۱۹۲۶ء کی بات ہے کہ لاہور کے " اردو مرکز " میں .... مرزا یگانہ ، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی ، اختر شیرانی وغیرہ ادیب و شاعر جمع ہو گئے تھے .. .. حضرت اصغر کی شہرت دسمبر ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ کے جوبلی کے مشاعرے سے شروع ہوئی ۔ اس کے بعد وہ لاہور آئے تھے ۔[1]"

(۳) جناب ظہیر لدھیانوی رقمطراز ہیں :

" مولانا اصغر حسین اصغر .... ۱۹۲۶ء میں لاہور بھی آئے اور اردو مرکز کے مہتمم مقرر ہوئے ۔[2]"

" علی گڑھ جوبلی کا جشن پنجاہ سالہ دسمبر ۱۹۲۵ء کے آخری ہفتہ میں ہوا ۔[3]"

(حواشی از گذشتہ صفحہ)

۳۔ شیخ نورالٰہی ان دنوں صوبۂ پنجاب میں انسپکٹر آف ٹریننگ انسٹی ٹیوشن کے عہدے پر فائز تھے ، ۱۹۳۲ء میں ڈپٹی ڈائرکٹر پنجاب تھے ۔ بڑے علم دوست و علم پرور بزرگ تھے

۴۔ چٹان ۔ لاہور شمارہ ۲۴ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۵

۱۔ مکتوب مولانا شہاب مالیر کوٹلوی بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲۷ اپریل ۱۹۶۹ء ۔

۲۔ تذکرہ شعرائے اردو مطبوعہ ۱۹۵۳ ، عشرت پبلشنگ ھاوس لاہور ۔ ص ۲۲۷

۳۔ چٹان لاہور شمارہ ۱۷ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۹ ـــ یہ علی گڑھ یونیورسٹی کی سلور جوبلی کی تقریبات ۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۲۵ء کی تاریخوں میں ہوئیں ۔ ۲۹ دسمبر کو ایک خطبہ علامہ یوسف علی نے پڑھا تھا ۔ راقم مقالہ نے یہ خطبہ سید رشید احمد صاحب کے پاس ، ابو سرائے فیض آباد میں محفوظ دیکھا ہے ۔

ان شہادتوں سے اتنا تو محقق ہو گیا کہ اصغر لاہور دسمبر ۱۹۲۵ء کے آخری ہفتہ میں یا اس کے بعد لاہور پہنچے* لیکن ابھی تک یہ معلوم ہو سکا کہ اگر وہ ۱۹۲۶ء میں آئے تو کب آئے ۔ اصغر کی تاریخ آمد کے سلسلے میں جناب قیصر مرادآبادی کے ایک اقتباس سے بڑی مدد ملتی ھے ۔ وہ اپنے مضمون " میں نے بھی جگر کو دیکھا ھے " میں جگر صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ھیں :

" میں تو جگر صاحب کی اور اپنی پہلی ملاقات کو جو ۱۹۲۶ء میں ہوئی کل ھی کی بات کہنے پر مجبور ھوں ..... ۱۹۲۵ء اپنا چولا بدل کر ۱۹۲۶ء بن گیا اسی زمانے میں ایک روز جمیل صاحب دو نادیدہ مہمانوں کو لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے ایک خاصی عمر کے دوسرے کم سن ۔ جمیل صاحب نے ایک مہمان کو مخاطب کر کے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا دیکھئے جگر صاحب میں آپ کو اس شخص سے ملانے کے لئے لایا ھوں یہ آپ کا نادیدہ مشتاق ھے ۔ .... جگر کا نام سنتے ھی میں تڑپ کر اٹھا انھیں اپنے گلے سے لگایا .... اثنائے گفتگو میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جگر صاحب ، اصغر صاحب ، روش صاحب اور دو ایک دوسرے شاعر تاجور نجیب آبادی کے قائم کردہ " اردو مرکز " .... میں ملازم رکھ کر بلائے گئے ھیں .... یہ میری ..... جگر صاحب سے پہلی ملاقات تھی .... تین چار روز کے بعد شام کے وقت ایک دن جگر صاحب ھمارے ہوسٹل میں پھر آ گئے ..... جگر صاحب نے اپنا کلام سنانا شروع کیا .... یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا کہ لاھور کی جامع مسجد میں فجر کی اذان ہوگئی .... لاھور کے مختصر سے قیام میں جگر صاحب سے اکثر ملاقاتیں رھیں مگر بعد میں زور شور کم ہو گیا امتحان سر پر آ گیا تھا .... امتحان سے فارغ ہو کر میں جون ۱۹۲۶ء تک

---

*۔ اصغر کی موجودگی علی گڑھ میں ۳۰ دسمبر ۱۹۲۵ء تک یوں ثابت ہوتی ھے کہ اسی تاریخ کو انھوں نے " نشاط روح " کا ایک نسخہ بدست خاص حسب ذیل عبارت لکھ کر ، خواجہ منظور حسین صاحب کو دیا تھا ۔ " ھدیۂ نیاز ۔ بجناب خواجہ منظور حسین صاحب بی اے علیگ ۔
اصغر
۳۰ دسمبر ۱۹۲۵ء
یہ نسخہ خواجہ صاحب کے پاس محفوظ ھے ، مقالہ نگار نے اس کی زیارت وھیں کی ۔ اس سے یہ بات محقق ہوتی ھے کہ اصغر ۳۰ دسمبر ۱۹۲۵ء کے بعد کسی تاریخ میں لاھور گئے ہونگے۔
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مرادآباد آ گیا .... ایک روز میں اپنے عزیز دوست مرزا عابد علی بیگ صاحب کے گھر بیٹھا ہوا جگر صاحب کی باتیں کر رہا تھا .... جگر صاحب کے اشعار جھوم جھوم کر پڑھتے ہوئے میں نے گھوم کر جو دیکھا تو جگر صاحب میرے پیچھے کھڑے ہیں ۔!!

اس طویل اقتباس سے اتنا واضح ہوتا ہے کہ اصغر اور جگر جون ۱۹۲۶ء سے بہت پہلے لاہور آ چکے تھے ۔

مزید تحقیق اور چھان بین کی غرض سے راقم نے ۵ اپریل ۱۹۶۹ء کو خط کے ذریعہ قیصر صاحب سے کچھ سوالات کئے جس کے جوابات حاشیہ پر لکھ کر انھوں نے وہی خط لوٹا دیا ..... خط کا متعلقہ حصہ بجنسہ نقل کیا جاتا ہے تاکہ پوری بات نظر کے سامنے آ جائے

سوال(۱) آپ نے جگر سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر اوائل ۱۹۲۶ء میں کیا ہے .... (جون ۱۹۲۶ء میں امتحان سے فارغ ہو کر آپ مرادآباد واپس جا چکے تھے جہاں آپ کی جگر سے دوبارہ ملاقات ہوئی) .... کیا اندازاً یہ فرما سکیں گے کہ رات بھر جو شعر خوانی جگر صاحب نے آپ کے کمرے (حضوری باغ) میں کی وہ کس مہینے کی بات ہے؟

جواب (جناب قیصر مرادآبادی)۔ امتحان مئی میں ہوتا تھا ۔ یاد نہیں ۔ دو تین ماہ پہلے کی بات ہے ۔

سوال(۲) آپ کے اندازے کے مطابق جب جگر صاحب سے آپ کی ملاقات ہوئی ہے تو انھیں آئے ہوئے کتنی مدت ہو چکی تھی؟

جواب(جناب قیصرمرادآبادی)۔ " مہینہ معلوم نہیں ۔ جگر جب مجھ سے ملے ہیں تو دو ایک ماہ بعد ملے ہیں شاید "

ان بیانات کی روشنی میں اگر نتیجہ قائم کیا جائے تو کچھ اس طرح ہوگا :

قیصر صاحب سے جگر صاحب کی ملاقات امتحان (مئی) سے دو تین ماہ پہلے ہوئی۔ یعنی وسط مارچ کی کسی تاریخ میں ـــــ(منشی فاضل کے امتحان عموماً ۱۵ مئی کے بعد ہوتے تھے ۔) ۔ اور وہ دو ایک ماہ پہلے آ گئے تھے ، کا مطلب یہ ہوا کہ وسط فروری کے

(حاشیہ از گذشتہ صفحہ)

×۔ قیصر صاحب منشی فاضل کے امتحان میں، یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ۱۹۲۶ء میں رول نمبر۹۶ کے تحت شریک ہوئے ۔ میرٹ کے لحاظ سے ان کا نمبر ۹۹ ہے ، انھوں نے ۲۷۷ نمبر حاصل کر کے درجہ سوم میں امتحان پاس کیا ۔ بحوالہ پنجاب یونیورسٹی گزٹ مطبوعہ ۲ اگست ۱۹۲۶ء ــــ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امتحان وسط مئی کے حدود میں ہوا ہوگا ۔

۱۔ " جگر اور اس کی شاعری " ۔ مرتبہ انور عارف ۔ بار اول ۱۹۶۲ء ۔ ص ۲۱۱-۲۰۵

لگ بھگ آئے ۔ اس خیال کو جناب محمد عبداللہ قریشی کی تحریر سے مزید تقویت پہنچتی ہے ۔ وہ رقمطراز ہیں :

" علامہ تاجور نے .... اردو مرکز کی بنیاد رکھ کر ہندوستان کی مقتدر ادبی شخصیتوں اصغر گونڈوی ، یاس عظیم آبادی ، جگر مرادآبادی اور سیماب اکبرآبادی وغیرہ کو لاہور بلایا ۔ اپریل ۱۹۲۶ء میں علامہ سیماب کے نامور شاگرد ساغر نظامی نے مجھے یہ مژدہ سنایا کہ دفتر " پیمانہ " آگرہ سے مستقلاً لاہور منتقل کر دیا گیا [1] "

اس کا مقصد ہے کہ اپریل سے بہت پہلے جگر اور اصغر لاہور آ چکے تھے ---- اپریل میں انتقال دفتر کا مژدہ سنایا ۔ ظاہر ہے کہ آتے ہی تو انتظامات مکمل ہوئے نہیں ہوں گے آخر ماہ ، ڈیڑھ ماہ فیصلہ کرنے اور دفتر لانے میں لگے ہوں گے ، اس طرح بھی فروری ہی آتا ہے ۔

جلیل قدوائی صاحب نے میرے اس سوال کے جواب میں کہ اصغر صاحب لاہور کب گئے ؟ فرمایا " کہ ۱۹۲۶ء میں گئے ، کس مہینے میں گئے یاد نہیں ۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ وہ پہلے پہنچے جگر کو بعد میں بلوایا [2] " ---- قیاس یہ ہے کہ اصغر لاہور وسط جنوری ۱۹۲۶ء اور وسط فروری کے درمیان کسی تاریخ کو پہنچے ۔ اوائل جنوری میں ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ علی گڑھ سے جاتے ہی فوراً تو آ نہیں گئے ہوں گے ۔ آخر ۱۵ ، ۲۰ روز تو آنے میں لگے ہوں گے ۔

اب یہ طے کرنا رہ جاتا ہے کہ وہ واپس کب گئے ۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ سید رشید احمد صاحب ڈیڑھ دو سال بعد اوائل ۱۹۲۸ء لکھتے ہیں لیکن مولانا سالک چند ماہ ۔ بادی النظر میں یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ کس کی رائے زیادہ صحیح ہے لیکن حسب ذیل وجوہات کی بنا پر میرے نزدیک مولانا سالک کی بات مرجح نظر آتی ہے ۔

(۱) مولانا سالک بھی لاہور میں تھے ۔ اصغر سے ان کے دوستانہ مراسم تھے ۔ اصغر اکثر ان کے گھر تشریف لے جاتے اور علمی و ادبی مذاکرات میں حصہ لیتے [3] ۔ اس قرب کی

۱۔ نقوش لاہور شخصیات نمبر جلد دوم ۔ منشی محمدالدین فوق ۔ عبداللہ قریشی ۔ ص ۱۳۸۹

۲۔ زبانی گفتگو بتاریخ ۱۸ مئی ۱۹۶۹ء ---- یہ تفصیلی گفتگو ان کے مکان حسین ڈسلوا ٹاؤن نارتھ ناظم آباد ۔ کراچی میں ہوئی ۔

۳۔ سرگذشت ۔ عبدالمجید سالک ۔ ص ۳۹۹

وجہ سے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اصغر جاتے وقت مولانا سالک سے ملے ہوں گے اور ان کے ذہن میں اس وقت اصغر کے قیام لاہور کی مدت کا اندازہ قائم ہو گیا ہوگا جو چند ماہ سے زیادہ نہ تھا ۔

(۲) اس کے علاوہ ایک اور دستاویزی شہادت ایسی ہے جس سے مولانا سالک کی رائے کو تقویت پہنچتی ہے ۔ مولانا سالک نے ۱۲ مارچ ۱۹۲۷ھ کے زمیندار میں " افکار و حوادث " کے کالم میں کسی سید محمد صدیق بجنوری صاحب ایم اے کے مقالے پر جسو بہارستان لاہور میں اصغر کی شاعری سے متعلق شائع ہوا تھا تبصرہ کرتے ہوئے بڑی طنز و تعریض سے کام لیا تھا اور زور قلم میں یہاں تک لکھ گئے تھے کہ " اصغر تو اچھے خاصے شاعر ہیں ۔ صوبہ جات متحدہ کے نام نہاد نقادوں کا مدت سے یہ شیوہ چلا آتا ہے کہ ان کے یہاں کوئی تک بند بھی پیدا ہو جائے تو سب سے پہلے اس کا مقابلہ اقبال سے کرنے لگتے ہیں .... اساتذہ کرام کی عمر بھر کی محنتیں رائگاں ہو جائیں اور کلام اصغر بدستور یہ نعرہ لگاتا رہے گا " فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ إِن كُنتُمْ شَاعِرِينَ " ۔

اس کے جواب میں اصغر نے ۱۴ مارچ ۱۹۲۷ھ کو ایک خط گونڈہ سے حکیم محمد یوسف حسن صاحب مدیر نیرنگ خیال لاہور کو بھیجا جو حکیم صاحب کے نوٹ کے ساتھ جون ۱۹۲۷ھ کے " نیرنگ خیال " میں صفحہ ۷۰-۶۷ پر شائع ہوا تھا ۔ وہ نوٹ اور اصغر کے مکتوب کا کہیں کہیں سے اقتباس درج کیا جاتا ہے :

نوٹ مدیر نیرنگ خیال

" یہ مضمون زمیندار کے " افکار و حوادث " کے جواب میں لکھا گیا تھا ۔ اب اس کی جگہ " زمیندار " میں " نکاہات " کا کالم ہے اور " افکار و حوادث " روزانہ " انقلاب "[۱] میں منتقل ہو گیا اور حضرت اصغر " اردو مرکز " لاہور سے واپس گونڈے تشریف لے گئے ہیں اور جوابی مضمون " نیرنگ خیال " میں شائع ہو رہا ہے ۔ انقلاب ۔ انقلاب اے انقلاب[*] ۔"

۱۔ " انقلاب " یہ ایک روزنامہ تھا جسے مولانا غلام رسول صاحب مہر اور مولانا عبدالمجید صاحب سالک نے ۲ اپریل ۱۹۲۷ھ کو جاری کیا ۔ اس سے قبل ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ھ کو دونوں نے بعض اختلافات کی بنیاد پر " زمیندار " سے قطع تعلق کر لیا تھا ۔(سرگذشت عبدالمجید سالک ص)۔

*۔ یہ علامہ اقبال کی ایک فارسی نظم گیت کا مصرعہ ہے ....
خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب انقلاب ، انقلاب اے انقلاب

گونڈہ
۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء

جناب مکرم !

۱۲ مارچ کے " افکار و حوادث " میں نشاط روح کے سلسلے میں کچھ ارشاد ہوا ہے مجھے بھی اس کے متعلق کچھ عرض کرنے کی اجازت دیجئے .... اس سلسلے میں علامہ سر اقبال کا نام نامی کئی بار آ چکا ہے اور اب اس باب میں میرا مزید سکوت ایک قسم کی تائید اور اس لیے اعانت جرم سے کم نہیں .... رہی علامہ اقبال کی ذات ۔ اس بارے میں صرف اسی قدر عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ اگر میں صحیح طور پر ان کا قدرشناس ہو سکوں اور وہ میرا شمار اپنے مداحوں اور نیازمندوں میں کرنے لگیں تو یہی چیز میرے لئے انتہائی فخر و عزت کا باعث ہوگی چہ جائے کہ موازنہ و مقابلہ ۔ استغفراللہ !

.... لاہور کے قیام میں جو لمحے استفادے کے موصوف کی صحبت میں بسر ہو جاتے ہیں انھیں حاصل زندگی اور اس " معصیت قیام " کا کفارہ سمجھتا ہوں .... میری اس تحریر کی اصل غرض صرف یہ تھی کہ میں اپنے نیازمندانہ عقیدت کا اظہار کر دوں جو مجھے علامہ ممدوح سے ہے .... بات کسی قدر طویل ہو گئی امید ہے کہ معاف فرمائیے گا ۔

احقر

اصغر (گونڈوی)

حکیم صاحب کے نوٹ اور اصغر کی تحریر میں بعض جملے ایسے ہیں کہ ان سے میرے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ اصغر اردو مرکز کی ملازمت ترک کر کے ۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء کو گونڈے پہنچ چکے تھے ۔ مثلاً

(۱) " حضرت اصغر اردو مرکز لاہور سے واپس گونڈے تشریف لے گئے ہیں " ۔ سے صریحاً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اصغر لاہور کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر گونڈہ پہنچ چکے ہیں .... یہاں یہ خیال گزر سکتا ہے کہ " گونڈہ واپس تشریف لے گئے ہیں " سیدھا سادہ جملہ ہے جس کے معنی صرف یہ ہیں کہ " آجکل گونڈے تشریف لے گئے ہیں (پھر آ جائیں گے " ـــــ لیکن میرے نزدیک یہ تفسیر درست نہیں ۔ اگر یہ کہنا ہوتا تو حکیم صاحب جملے سے پہلے " آجکل " ضرور لگاتے ۔ اور جملہ یوں ہوتا " آجکل گونڈے تشریف لے گئے ہیں" یا " آجکل گونڈہ گئے ہوئے ہیں " ـــــ اس صورت میں " اردو مرکز ۔ لاہور سے " کا اضافہ بے محل اور بے معنی ہوگا ۔

(۲) اس کے علاوہ لفظ " واپس " خود " ھمیشہ کے لئے چلے جانے " پر دلالت کرتا ھے -

(۳) حکیم صاحب کی عبارت کو اگر بغور پڑھا جائے تو اس خیال کو مزید تقویت پہنچتی ھے - " انقلاب - انقلاب - انقلاب اے انقلاب " بڑا برمحل اور معنی خیز ھے - اس تین " انقلاب " کے مجموعہ سے بنے ھوئے " سادہ " سے مصرعہ میں لکھنے والے کے ذھن میں کتنے " انقلابات " چکر لگانے لگے اس کو سمجھنے کے لئے تھوڑے سے غور و فکر کی ضرورت ھے - ذیل میں ان کی طرف خفیف سے اشارے کئے جاتے ھیں - تاکہ جو بنیاد قائم کی گئی ھے اس کے لیے محکم دلائل فراھم ھو سکیں -

(۱) پہلا " انقلاب ، تو یہ کہ سالک و مہر جو " زمیندار " کے ایک طرح سے کرتا دھرتا ، چلانے والے اور روح رواں تھے اسے چھوڑ کر چلے گئے -

(۲) دوسرا یہ کہ جاری بھی کیا تو " انقلاب " ---- یہاں لفظ ، انقلاب " کی رعایت بھی ملحوظ خاطر رھے -

(۳) تیسرا یہ کہ " زمیندار " کا کالم ، افکار و حوادث " " انقلاب " میں منتقل ھو گیا اور " زمیندار " میں یہ انقلاب آیا کہ اس کی جگہ " فکاھات " نے لے لی -

(۴) چوتھا یہ کہ سالک صاحب کی زبان طعن نے سید محمد صدیق بجنوری کے ساتھ اس شخص کی ذات کو بھی نشانہ بنایا جو انتہائی مرنجاں مرنج ، متین و سنجیدہ اور خود سالک صاحب کے دستوں اور نیازمندوں میں تھا - اور زبان طعن دراز بھی ھوئی تو اس وقت جب وہ یہاں سے جا چکا -

(۵) پانچواں یہ کہ جواب " افکار و حوادث " میں چھپنے کے بجائے نیرنگ خیال میں چھپ رہا ھے -

میرے دعوے کی آخری دلیل یہ ھے کہ اصغر کا مکتوب مذکورہ نوٹ کے ساتھ تین ، ساڑھے تین ماہ کے بعد شائع ھوا ، اگر مارچ ۱۹۲۷ھ کے بعد اصغر صاحب آئے ھوتے تو یہ نوٹ بے معنی و بے محل تھا -

میرے اس سوال پر کہ " آپ کو کچھ علم ھے کہ لاھور سے گونڈہ آنے کے بعد وہ دوبارہ اردو مرکز کب گئے "؟ جناب جلیل قدوائی نے اپنی ۱۸ مئی ۱۹۲۸ھ کی گفتگو میں قطعی طور پر یہ فرمایا کہ " گونڈہ آنے کے بعد اصغر صاحب دوبارہ لاھور نہیں گئے -"

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ھے کہ " اصغر وسط جنوری اور وسط فروری ۱۹۲۶ھ کے درمیان اردو مرکز - لاھور آئے اور ۱۲ مارچ ۱۹۲۷ھ سے

سے پہلے گونڈہ واپس چلے گئے ۔[1]"

اس سلسلے میں ڈاکٹر منوہر سہائے انور کا یہ ارشاد کہ

" ۱۹۲۷ء کے اواخر میں ایک بد طینت ، کج اندیش ، حریص مکار

اور خودغرض شخص کی درازدستیوں سے " اردو مرکز " کے مالی کھیل

(میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور) نے دست کشی کر لی ۔

یہ حالت دیکھ کر پہلے جگر ، پھر یاس اور آخر میں اصغر لاہور

سے چلے گئے ۔[2]"

محل نظر ہے[3] ـــــ بات قطعی اور آخری یہی ہے کہ اصغر ۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء کے بعد لاہور نہیں آئے ۔

رہا یہ مسئلہ کہ جگر کب گئے ، یہ ہماری بحث سے فی‌الحال خارج ہے (اس سے تفصیلی بحث آگے کی گئی ہے) ۔ البتہ یہ کہ اصغر کیوں گئے اس سے تفصیلی بحث آگے آئے گی ۔

بعض معاصرین کی تحریرات سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اصغر " اردو مرکز " میں مہتمم ہو کر آئے تھے[4] لیکن واضح طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کا دائرۂ کار کیا تھا ، ذمہ داریاں اور وظائف کیا تھے اور کون کون سے امور کی انجام دہی ان سے متعلق تھی ۔ اندازاً کہا جا سکتا ہے کہ دفتری انتظام و انصرام کے علاوہ ، دوسرے ارکان کے کام کی نگرانی بھی ان کے ذمہ ہوگی اور دوسروں کی طرح ان کے ذمہ بھی " انتخابات کا کام ہوگا " ـــ یہاں رہ کر انھوں نے کون کون سے " انتخابات " کئے اس کا پتہ نہیں چلتا البتہ اس بات کی شہادت ضرور ملتی ہے کہ " اردو مرکز کے بعض انتخابات شعری " ان کے کئے ہوئے ہیں ۔ اس سلسلے میں جناب عابد رضا صاحب بیدار اپنے مضمون " اصغر کا مطالعہ " میں "اصغر کا کلام اور متفرق تحریریں " کے زیر عنوان لکھتے ہیں :

" ادبی مرکز لاہور کے شائع کردہ بعض انتخابات شعری "[5]

۱۔ قیاس یہ ہے کہ ۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء کا " زمیندار " لے کر اسی روز شام کی میل سے وہ روانہ ہوگئے اور ۱۳ مارچ کو کسی وقت (دوپہر کے بعد) گونڈہ پہنچے چونکہ چوٹ تازہ تھی اس لیے دوسرے ہی روز ۱۴ مارچ کو خط لکھ مارا ۔

۲۔ نگارش امرتسر ۵-۶ ۔ جگر نمبر ۔ ص ۲۷) ۔

۳۔ جام جہاں نما لکھنؤ اپریل لغایت جون ۱۹۳۰ء میں "مضمون " تحمل الہ آبادی بنام اصغر گونڈوی " کے عنوان سے ایک مضمون چھپا ہے اسمیں یہ عبارت بھی درج ہے ۔ " اصغر صاحب تین برس سے الہ آباد میں ہیں " ـــــ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جون ۱۹۲۷ء میں اصغر الہ آباد پہنچ چکے تھے ۔

۴۔ تذکرہ شعرائے اردو ۔ بار اول ۱۹۵۳ء ۔ نظر لدھیانوی ۔ ص ۲۲۸

۵۔ " اصغر کا مطالعہ " ۔ جناب عابد رضا بیدار " آجکل جون ۱۹۵۷ء ۔ ص ۳۷

اس امر کی تصدیق جناب رشید احمد صدیقی کی تحریر سے بھی ہوتی ہے - وہ رقمطراز ہیں :

"کچھ دنوں لاہور کے ادبی مرکز میں علمی خدمات انجام دیں - منتخبات کے بعض سلسلے اصغر صاحب ہی کے مرتب کئے ہوئے ہیں"[1]

کوشش کے باوجود اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ اصغر نے "اردو مرکز" لاہور میں کیا خدمات انجام دیں ، کون کون سے انتخابات ان کے کئے ہوئے ہیں ، دوسری لوگوں نے کیا کیا کیا ، یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے لیکن جب ہمارے سامنے یہ حقیقت آتی ہے کہ مولانا تاجور نے اس کو صحیح معنوں میں ادارہ بنانا چاہتا تھا - یعنی ان کے پیش نظر انفرادیت کو اجتماعیت میں ضم کر دینا اور افراد کے آثار و افکار کے بجائے ادارہ کی کارکردگی کا اشتہار و اعلان تھا تو کوئی حیرت نہیں رہ جاتی ------ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ افراد کے کارناموں کی تشہیر کے بجائے "اردو مرکز" کے کام کی تشہیر ہوتی تھی- بعض لوگوں کو یہ رویہ پسند نہیں آیا لہذا انھوں نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی - اس سلسلے میں مولانا مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی[2] کی مثال پیش کی جا سکتی ہے - وہ تحریر فرماتے ہیں :

"میرے ذمہ مہاتما بدھ کی سیرت و سوانح لکھنے کا کام تھا - میں نے دو مختصر باب لکھ بھی لئے تھے لیکن جب مجھے اپنے ماموں زاد بھائی مولوی عبدالستار خاں ایم اے مرحوم سے جو گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ تھے یہ معلوم ہوا کہ میری تالیف کسی اور کے نام سے شائع ہوگی اور بعد تحقیق اس خبر کو جب میں نے صحیح پایا تو میں نے کتاب لکھنے سے انکار کر دیا اور علاحدگی اختیار کر لی -"[3]

۱- گنج ہائے گراں مایہ - مطبوعہ نعری فرینڈز پبلشرز اردو بازار راولپنڈی - بار سوم ۱۹۳۹ء ص ۱۰۳

۲- مولانا مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی شروع میں اردو مرکز سے منسلک تھے بعد میں علیحدہ ہوگئے - اسکے بعد ۱۹۲۹ء میں تاجور صاحب کے ساتھ ادبی دنیا لاہور میں آگئے اور ساتھ ہی ساتھ روزانہ سیاست میں بھی ترجمہ کا کام کرتے رہے - کچھ ہی روز بعد فارسی کی مدرسی بمبئی میں مل گئی - اور وہ وہاں چلے گئے اب تک بمبئی میں ہی ہیں (بحوالہ مکتوب مولانا شہاب بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲۷ اپریل ۱۹۶۹ء)

۳- مکتوب مولانا شہاب بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲۷ اپریل ۱۹۶۹ء

اس بات کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ اصغر کے بعض بڑے اعلیٰ پایہ مقالات و مضامین " اراکین اردو مرکز " کے نام سے شائع ہوئے ہیں (جس کا ذکر بعد میں آئے گا) - سوال یہ ہے کہ اگر یہ بات تھی تو اصغر نے اس کو کیوں کر گوارا کر لیا اور کیوں نہیں علاحدگی اختیار کرلی - اسکے متعلق کوئی حتمی اور قطعی بات تو نہیں کہی جا سکتی لیکن ان کی سیرت و مزاج کو دیکھتے ہوئے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ وہ ذاتی "نمود و نمائش " کو پسند نہیں کرتے تھے (تفصیلی بحث سیرت و شاعری میں آئے گی) اس لیے ممکن ہے اوّل اوّل اس کو کوئی اہمیت نہ دی ہو بعد میں علاحدگی کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہو گیا ہو -

اس احتیاط و التزام کے باوجود کہ افراد کی تصنیفات و تالیفات کا اعلان ان کے نام سے نہیں کیا جاتا تھا - بعض معاصر شہادتوں سے اس کا کچھ نہ کچھ علم ہو جاتا ہے ----- مثلاً مولانا شہاب کے جس خط کا حوالہ اور اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جگر صاحب کے ذمہ میر انیس کے مراثی کا انتخاب تھا[1] - اس ضمن میں ایک دوسری جگہ ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں :

" اصغر صاحب کے ذمہ کیا کام تھا مجھے معلوم نہیں البتہ جگر صاحب کے ذمہ انتخاب مراثی انیس کی خدمت تھی ...... اختر شیرانی مرحوم کے سپرد فسانۂ آزاد میں سے خوجی کی داستان کا انتخاب تھا اور میرے ذمہ مہاتما بدھ کی سوانح کی ترتیب و تالیف تھی جو نامکمل رہی - جگر صاحب اکثر ہمارے کمرے میں آتے ، انیس کے مرثیے سناتے اور انتخاب کے ذیل میں اپنی کی ہوئی شکست و ریخت بھی دکھاتے -"[2]

غرضیکہ اب یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ اصغر نے اردو مرکز میں رہ کر کیا کیا کام کیا اور کون کون سے انتخابات شعری ان کے کئے ہوئے ہیں البتہ اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ بعض مقالے اور مضامین جو " اراکین اردو مرکز " کے نام سے شائع ہوئے ہیں اصغر کے لکھے ہوئے ہیں -

---

١- مکتوب مولانا شہاب بنام مقالہ نگار مرقومہ ٢٧ اپریل ١٩٦٨ء

٢- مراسلہ مولانا شہاب - رسالہ جامعہ دہلی جون ١٩٦٧ء - ص ٣٣٥

مثلاً " رباعیات رواں "[1] اور " پیام زندگی "[2] کے مقدمے ۔ (ممکن ہے رباعیات رواں اور پیام زندگی کے مراثی کا انتخاب اصغر ہی کا کیا ہوا ہو) ۔ اس کے علاوہ " اردو مرکز " کے عنوان سے تمام کتابچوں کے شروع میں ۲۰ صفحات کا جو تعارف نامہ ہے ، میری خیال میں وہ بھی اصغر ہی کا لکھا ہوا ہے جو جناب تاجور چیف ایڈیٹر کے نام سے شائع ہوا ہے ۔

اصغر اردو مرکز سے اتنی جلد کیوں چلے گئے ----- اس کے وجوہ مختلف ہو سکتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ ان سبھی وجوہ نے مل کر انھیں جانے پر مجبور کر دیا ہو ۔

(۱) میری استفسار پر کہ " اصغر لاہور سے اتنی جلدی کیوں چلے گئے؟" جناب قدوائی نے فرمایا " کام ہی نہیں تھا یہاں رہ کے کیا کرتے ۔ اصل میں " اردو مرکز" کا پروگرام بڑا جامع اور وسیع تھا جس کیلئے کثیر رقم کی ضرورت تھی ۔ شروع شروع میں تو عطر چند کپور اینڈ سنز نے سرمایہ لگایا لیکن جب کتابیں نہ نکلیں تو انھوں نے ہاتھ کھینچ لیا --- لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے ۔ اصغر بھی اسی وجہ سے چلے گئے ۔"[3]

۱۔ یہ مقدمہ " رباعیات رواں پر ایک سرسری نظر " کے عنوان سے حذف و اضافہ کے بعد زمانہ کانپور نومبر ۱۹۲۸ء میں اصغر کے نام سے شائع ہوا ہے ۔ صفحات ۲۹۸-۲۸۹

۲۔ " پیام زندگی " اردو مرکز کا سلسلہ انتخاب ہے جو بارہ جلدوں* میں شائع ہوا تھا ۔ اسکی جلد اوّل میں (کہ یہ انتخاب مراثی ہی) یہ مقدمہ درج ہے جسے ایک طرح سے " اردو مرثیہ " کی تاریخ کہنا چاہیے ۔ مقدمہ بڑا طویل ہے ۔ کتاب کے اڑتالیس (۲۵ تا ۷۲) صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۔ یہی مضمون تاریخ مرثیہ گوئی کے عنوان سے جناب رشید احمد صدیقی کے نوٹ کے ساتھ رسالہ سہیل علی گڑھ میں ، اصغر کے نام سے شائع ہوا تھا ۔ رسالہ سہیل جس میں یہ مضمون شائع ہوا ہے دستیاب نہ ہو سکا اس لیے شمارہ نمبر اور سن کا حوالہ دینا ممکن نہیں البتہ جناب جلیل قدوائی اور عابد رضا بیدار کے شواہد دیے جاتے ہیں " اردو مرکز کی فرمائش پر انھوں نے مرثیہ گوئی کی تاریخ بھی لکھی تھی جو پہلے " سہیل " نے پھر انتخابات مراثی انیس کے مقدمے کے طور پر عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور نے شائع کی تھی " (انتخاب اصغر مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ بار اول ۱۹۵۲ء ۔ ص ۳۰) ۔ جناب عابد رضا بیدار "اصغر کا مطالعہ " میں " اصغر کا کلام اور متفرق تحریریں " کے تحت جو فہرست درج کی ہے اس میں لکھا ہے " مرثیہ گوئی کی تاریخ رسالہ سہیل علی گڑھ " آجکل جون ۱۹۵۷ء ۔

*۔ جلدیں انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے کے تحقیقی شعبہ میں شمارہ الف ۲۹/۱۰۲ تا الف ۲۹/۱۱۳ موجود ہیں ۔ صرف جلد نہم نہیں ہے ۔

۳۔ گفتگو بتاریخ ۱۸ مئی ۱۹۶۹ء بمکان جناب جلیل قدوائی حسین ڈلسلوا ٹاؤن ۔ ناظم آباد کراچی ----- گفتگو کامفہوم جناب قدوائی کا ہے الفاظ مقالہ نگار کے ۔

(۲) جناب مظہر لدھیانوی لکھتے ھیں :

"مولانا اصغر حسین اصغر گونڈوی (صوبہ جات متحدہ) کے باشندے تھے ۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رکن تھے[1] ۔ عالم باعمل اور متشرع بزرگ تھے ۱۹۲۶ء میں لاھور بھی آئے اور یہاں " اردو مرکز " کے مہتمم مقرر ھوئے ۔ انھیں ایام میں یاس عظیم آبادی (المتخلص بہ یگانہ چنگیزی) بھی مرکز سے وابستہ تھے ان کی اصغر سے چل گئی اس لئے علیحدہ ھو گئے بعد میں اصغر بھی چلے گئے[2] ۔"

اقتباس بالا سے یگانہ اور اصغر کی مزاج کا پتہ چلتا ہے ممکن ھے کہ طبیعت اچاٹ ھو جانے کا ایک سبب یہ چپقلش بھی رھی ھو جو بعد میں لاھور چھوڑنے کا سبب ھوئی ھو۔

(۳) دبی دبی زبان سے یہ بھی سننے میں آیا ھے کہ اصغر کی جناب تاجور سے بھی نہیں بنی ۔ اسی لئے اصغر چلے گئے ۔ اگرچہ یہ سنی سنائی باتیں[3] ھیں اس لیے زیادہ قابل اعتماد اور لائق اعتبار نہیں تاھم بعض قرائن کی موجودگی سے اس شبہ کو تقویت پہنچتی ھے ۔

(الف) پہلی بات تو یہ کہ تاجور صاحب ادب میں معرکہ آرائی اور ھنگامہ خیزی کے کچھ زیادہ قائل تھے باوجود اپنی علم دوستی اور علم پروری کے مزاج کے تیز تھے ۔ عین ممکن ھے کہ کسی بات پر اصغر سے بھی الجھ پڑے ھوں لیکن چونکہ اصغر لڑنے جھگڑنے والے آدمی نہیں تھے اس لیے انھوں نے خاموشی سے علیحدگی اختیار کر لینے ھی میں مصلحت سمجھی ھو ---- علامہ تاجور کی اس مزاجی کیفیت کے متعلق مولانا مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی کا اقتباس ملاحظہ ھو ۔ فرماتے ھیں :

"مولانا تاجور عالم تھے بڑے شاندار آدمی تھے لیکن علمی کاروبار میں سیاست سے زیادہ کام لیتے تھے ۔ شاگردوں کی ایک فوج ان کے گرد رھتی تھی ۔ تحریری ، تنقیدی اور تحقیقی کام ان کی یادگار اتنے نہیں جتنے ان کے ادبی معرکے یادگار ھیں ....[4]"

۱۔ تذکرہ شعرائے اردو ۔ مظہر لدھیانوی ۔ ص ۲۲۷

۲۔ تذکرہ شعرائے اردو ۔ جناب مظہر لدھیانوی ۔ مطبوعہ عشرت پبلشنگ ھاوس ۔ لاھور بار اول ۱۹۵۳ء ۔ ص ۲۲۷

۳۔ مجھے حوالہ یاد نہیں رھا کہ کس نے کہا یا کہاں پڑھا تھا ۔

۴۔ مکتوب مولانا شہاب بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲۷ اپریل ۱۹۶۹ء

جناب قیصر مرادآبادی کی رائے بھی ان کے متعلق قریب قریب ایسی ہی ہے - وہ لکھتے ہیں :

"یگانہ اور تاجور کو میں اچھا آدمی نہیں جانتا تھا - خود پسند، مغرور اور خبث باطن کے شکار تھے -[۱]"

میرے استفسار پر حکیم یوسف حسین صاحب مدیر نیرنگ خیال نے فرمایا :

"تاجور سے لڑائی تو نہیں ہوئی ہوگی کیونکہ اصغر صاحب بہت ہی شریف، سنجیدہ اور لڑائی جھگڑے سے بھاگنے والے انسان تھے - شریفانہ انداز میں استعفیٰ دیا ہوگا اور چلے گئے ہوں گے ----- تاجور حکمرانی کرتے ہوں گے، اصغر نے یہ پسند نہیں کیا ہوگا -[۲]"

(ب) ۱۹۲۶ء کے بعد مولانا تاجور کا تعلق لاہور کے اعلیٰ رسائل و جرائد --- ادبی دنیا اور شاہکار سے مدتوں رہا لیکن ان میں سے کسی رسالے میں اصغر کا کلام نظر نہیں آتا ---- جب کہ علامہ تاجور نے بڑے بڑے گمنام شاعروں کو ابھارنے اور اچھالنے کی کوشش کی ----- اصغر صاحب کی طرف سے ان کی بے اعتنائی اور سردمہری سمجھ میں نہیں آتی سوا اس کے کہ یہ مان لیا جائے کہ مولانا، اصغر صاحب سے خوش نہیں تھے - ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہاں سے جانے کے بعد اصغر نے لاہور کے رسائل کو اپنا کلام نہ بھیجا ہو --- ایسا نہیں ہے - اسی زمانے کے "نیرنگ خیال"، "ہمایوں" اور بہارستان میں[۳] ان کا کلام برابر چھپتا رہا ہے -

(ج) اس شبہ کو اصغر کے آخری مکتوب کے ایک جملے سے بھی تقویت پہنچتی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں :

"لاہور کے قیام میں جو لمحے استفادۂ موصوف (علامہ اقبال) کی صحبت میں بسر ہو جاتے ہیں انھیں حاصل زندگی اور "معصیت قیام" کا کفارہ سمجھتا ہوں -[۴]"

"معصیت قیام کا کفارہ" غمازی کرتا ہے کہ اصغر بھی لاہور میں خوش نہیں تھے اور جب

۱- مکتوب جناب قیصر مرادآبادی بنام مقالہ نگار مرقومہ ۵ اپریل ۱۹۶۹ء

۲- گفتگو مقالہ نگار از جناب حکیم یوسف حسین مدیر نیرنگ خیال بتاریخ ۲۰ اگست ۱۹۶۹ء راولپنڈی -

۳- نیرنگ خیال عید نمبر ۱۹۲۷ء، عید نمبر ۱۹۳۲ء، سالنامہ ۱۹۳۳، ۱۹۳۳ء، ہمایوں ستمبر ۱۹۲۹ء، دسمبر ۱۹۲۹ء، جنوری ۱۹۳۰ء، جنوری ۱۹۳۲ء، بہارستان نومبر ۱۹۲۶ء

۴- مکتوب اصغر بنام مدیر نیرنگ خیال مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء

مولانا سالک جیسے رفیق و دوست کی تحریر سے ان کے جذبات کو ٹھیس لگی تو " دل کانٹا زبان سے نکل پڑا " ۔

(۴) اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ " اردو مرکز " کی اس پالیسی کو کہ وہ افراد کی کوشش و کاوش دماغی کو ان کے نام سے شائع کرنے کے بجائے ادارہ کے نام سے شائع کرتا تھا ، بعض لوگوں نے پسند نہیں کیا اور وہ علیحدہ ہو گئے ۔ ممکن ہے کہ شروع شروع میں اصغر نے اسے کوئی اہمیت نہ دی ہو لیکن بعد میں احساس ہوا ہو اور وہ خاموشی سے علیحدہ ہو گئے ہوں ۔

(۵) ڈاکٹر محمد سہائی انور جو خود بھی کسی وقت "اردو مرکز " کے رکن تھے[1] اصغر کے لاہور چھوڑ جانے کے بارے میں رقمطراز ہیں :

" ۱۹۲۷ء کے اواخر میں ایک بد طینت ، کج اندیش ، حریص ، مکار اور خود غرض شخص کی درانداز یوں سے اردو مرکز کے مالی کفیل (میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز ۔ لاہور) نے دست کشی کر لی ۔ یہ حالت دیکھ کر پہلے جگر ، پھر یاس اور آخر میں اصغر چلے گئے ۔"[2]

اردو مرکز لاہور سے ، اصغر کے اتنی جلدی چلے جانے کے تمام اسباب جو ممکن ہو سکتے تھے دے دیئے گئے جو صرف قیاسات نہیں ہیں ۔ ان میں بڑی حد تک حقیقت[3] بھی ہے۔ لیکن میرے نزدیک بنیادی اور اصل وجہ یہ تھی کہ اردو مرکز تجارتی اغراض و مقاصد کے تحت قائم کیا گیا تھا ۔ خدمت زبان و ادب کی حیثیت ثانوی تھی ۔ لہذا جب مالکان ادارہ نے یہ محسوس کیا کہ یہ تجارت نفع بخش نہیں ہے تو انھوں نے ہاتھ کھینچ لیا[*] ۔ ادھر کام کرنے

۱۔ رباعیات رواں ۔ مرتبہ اردو مرکز لاہور ۔ ص ۱۷

۲۔ نگارش امرتسر جلد ۵-۶ ۔ جگر نمبر ۔ ص ۲۷

۳۔ یہ بات اصغر نے ابتدا ہی میں محسوس کر لی تھی ۔ چنانچہ ۱۱ اگست ۱۹۲۶ء ہی کو جبکہ اصغر کو آئے ہوئے ابھی بمشکل ۶ ، ۷ ماہ ہوئے تھے ، مولانا عبدالماجد دریابادی کو تحریر فرمایا " اردو مرکز کے متعلق میں نے زبانی سب کچھ عرض کر دیا تھا اور اتنے دنوں کے تجربے کے بعد میں یہی سمجھ سکا ہوں کہ تجارتی اغراض کے تحت اردو کی خدمت مقصود ہے " ۔۔ مکتوب اصغر بنام مولانا عبدالماجد دریابادی ۔ مرقومہ ۱۱ اگست ۱۹۲۶ء ۔(اصل خط مقالہ نگار کے پاس محفوظ ہے جو حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ نے از راہ شفقت ارسال فرمایا) ۔

* ۔ مجھے ڈاکٹر محمد سہائی انور سے اتفاق نہیں کہ صرف کسی کی درانداز یوں سے ایسا کیا گیا تھا ۔

والوں نے بھی شروع شروع میں بڑی مستعدی دکھائی اور انتخابات کے انبار لگا دیئے ---
کہ تمام کاموں میں سب سے آسان کام یہی تھا - باقی کام جس یکسوئی ، جاں سوزی ،
صبر و حوصلہ ، پتہ ماری اور سرمایہ کثیر کے متقاضی تھے ان کا فقدان تھا ----- ابھی
انتخابات کی طباعت میں جو زر کثیر صرف (پچاس ہزار روپے)[1] ہوا تھا اسی کی واپسی
کی کوئی شکل نہیں پیدا ہو رہی تھی - منافع تو رہا ایک طرف - نتیجہ یہ ہوا کہ
بے دلی اور بیزاری کی ایک عام فضا طاری ہوگئی - کام ڈھیلا پڑ گیا - ان حالات میں
جب اصغر نے یہ محسوس کیا کہ ادارہ کا مستقبل کچھ زیادہ روشن اور امید افزا نہیں تو
انہوں نے چلے جانے ہی میں مصلحت سمجھی - اور وسط مارچ ۱۹۲۷ء میں چلے گئے -

کام کی سرد رفتاری اور سرمایے کی کمی کی تصدیق مولانا غلام رسول مہر کی تحریر
سے بھی ہوتی ہے - میرے استفسار پر کہ " اصغر اتنی جلدی کیوں چلے گئے - سنا ہے کہ
یگانہ سے نہیں بنی - خود علامہ تاجور سے بھی نہ بن سکی - یہ کہاں تک درست ہے -
اس کے جواب میں مولانا نے تحریر فرمایا :

" یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ یگانہ سے ناسازگاری کے باعث اصغر
گئے - یہ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ تاجور سے اصغر مرحوم کی
نہ بنی - تاجور بھی وسیع القلب آدمی تھے اور اصغر صاحب تو
کسی سے لڑنے کے وہم میں بھی مبتلا نہیں ہو سکتے تھے - جب مرکز
کا کام ڈھیلا پڑ گیا اور اصغر کے لئے ہندوستانی اکیڈمی میں اسامی*
نکل آئی یعنی رسالہ " ہندوستانی " الہ آباد کی ایڈیٹری ، تو وہ
چلے گئے[2]۔"

(۸) انڈین پریس الہ آباد : (وسط ۱۹۲۷ء تا اکتوبر ۱۹۳۰ء) -

"اردو مرکز " لاہور کے بعد اصغر انڈین پریس الہ آباد کے
شعبہ ترجمہ و تالیف سے منسلک ہوئے - اس سلسلے میں سید رشید احمد صاحب لکھتے ہیں :

۱- رباعیات رواں - اردو مرکز لاہور - ص ۱۵ - اصل عبارت "........ ان مجلدات کی
اشاعت پر اب تک اس قدر کا پچاس ہزار روپیہ صرف ہو چکا ہے -"

۲- مکتوب مولانا غلام رسول مہر بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲۱ فروری ۱۹۶۹ء -

*- یہاں مولانا سے سہو ہو گیا ہے - اصغر مارچ ۱۹۲۷ میں لاہور سے چلے گئے تھے - اس کے
بعد انڈین پریس الہ آباد میں گئے - " ہندوستانی " کی ادارت پر ان کا تقرر تو اکتوبر
۱۹۳۰ء میں ہوا ہے -

"(اصغر) اوائل ۱۹۲۸ء میں گھر چلے آئے ...... اور انڈین پریس الہ آباد کے شعبہ تالیف و تراجم سے متعلق ہو گئے جہاں ان کے داماد محمد صدیق* پہلے سے کام کر رہے تھے -[۱]"

جناب رشید احمد صاحب کے بیان سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ لاہور سے آتے ہی اوائل ۱۹۲۸ء[x] میں وہ انڈین پریس سے منسلک ہو گئے - اصل میں رشید صاحب سے اس معاملہ میں تسامح ہو گیا ہے - اصغر صاحب اوائل ۱۹۲۸ء میں نہیں اوائل ۱۹۲۷ء ہی میں گونڈہ آ گئے تھے جیسا کہ پچھلے صفحات میں تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے - اگر رشید صاحب کی یہ بات وقتی طور پر تسلیم کر لی جائے کہ وہ اوائل ۱۹۲۸ء میں انڈین پریس سے منسلک ہو گئے تھے (اگرچہ ایسا ہے نہیں - تفصیلی بحث آگے آئے گی) تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک سال کا وقفہ اوائل ۱۹۲۷ء تا اوائل ۱۹۲۸ء اصغر نے کہاں اور کیسے گزارا - اتنا تو یقینی ہے کہ لاہور سے واپسی کے بعد اصغر کہیں اور نہیں گئے جیسا کہ جناب جلیل قدوائی نے فرمایا :

"جہاں تک مجھے علم ہے لاہور سے آ کر وہ کہیں اور نہیں گئے - کیا کیا میں کچھ نہیں کہہ سکتا- البتہ اس کے بعد وہ انڈین پریس الہ آباد ہی میں آئے[۲] -"

----- باوجود کوشش کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ۳ ، ۴ ماہ کی مدت میں اصغر نے کیا کیا لیکن گمان غالب یہی ہے کہ وہ گونڈہ ہی میں رہے کہیں اور نہیں گئے -

اصغر الہ آباد انڈین پریس الہ آباد سے بسلسلہ ملازمت کب متعلق ہوئے - اسکے متعلق کوئی قطعی بات تو نہیں کہی جا سکتی لیکن حسب ذیل شواہد و دلائل سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اوائل ۱۹۲۸ء کے بجائے ۱۹۲۷ء کے پہلی شش ماہی میں کسی وقت الہ آباد پہنچے ہیں -

---

*- اصل نام صدیق احمد ہے (بحوالہ ٹائیٹل پیج سرود زندگی طبع اوّل انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۵ء) -

۱- هفت روزہ چٹان - لاہور شمارہ ۲۴ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۱۵

x- جناب علی ظہیر صاحب نے بھی اپنے مکتوب میں راقم کو اوائل ۱۹۲۸ء لکھا - ان کی عبارت درج ذیل ہے - " وہ انڈین پریس میں اوائل ۱۹۲۸ء میں برسر کار ہوئے " - مکتوب بنام مقالہ نگار ۲ ستمبر ۱۹۷۰ء

۲- گفتگو بتاریخ ۱۸ مئی ۱۹۶۹ء - حسین ڈسلوا ٹاؤن - ناظم آباد - کراچی

(۱) انڈین پریس الہ آباد کے بانی اور منیجر بابو چنتا منی گھوش کا انتقال ۱۱ ستمبر ۱۹۲۸ء کو ہوا ۔ اصغر نے ان کے انتقال پر ایک طول طویل مضمون لکھا جو زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے ۔ اصغر کی سیرت طبیعت اور مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے رسماً یہ مضمون محض آنجہانی بابو چنتا منی کے صاحبزادگان کی تالیف قلب یا ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لکھا ہو .... اس کے برعکس مضمون کے لب و لہجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے سنی سنائی باتوں پر اعتبار نہیں کیا ہے بلکہ مرنے والے کے اعلیٰ اخلاق کا اسے ذاتی تجربہ ہے ، وہ ان کے بہت قریب رہا ہے اور ان سے بہت متاثر ہے ـــــ اس قرب کے لئے کم از کم مدت اگر سال سوا سال کی مانی جائے خصوصاً اصغر کی کم آمیز اور دیر آشنا طبیعت کے پیش نظر تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اصغر اگست ستمبر ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ انڈین پریس پہنچے

(۲) میرے اس استفسار پر کہ اصغر گونڈوی انڈین پریس الہ آباد میں کب ملازم ہو کر آئے ؟ مولانا سراج الحق مچھلی شہری نے تحریر فرمایا :

" میں جون ۱۹۲۸ء میں پہلے پہل ملا تھا اس وقت یہ بھی سنا تھا کہ حال ہی میں آئے ہیں [۱]۔"

ـــ حال ہی میں آئے ہیں سے یہ خیال ہوتا ہے کہ تین چار مہینے ہوئے ہوں گے ـــــ یعنی اوائل (فروری مارچ) ۱۹۲۸ء جیسا کہ رشید صاحب نے تحریر فرمایا ـــــــ لیکن خود دوسری جگہ مولانا نے تحریر فرمایا :

" یاد نہیں اندازہ ہے ۱۹۲۷ء میں آئے [۲]۔"

یہ بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ مولانا نے پہلے بھی لکھا تھا بعد میں جب میں نے یہ لکھا کہ میرے اندازہ کے مطابق وہ ۱۹۲۸ء میں آئے تو اوپر والا جملہ تحریر فرمایا تھا ۔

(۳) اواخر ۱۹۲۷ء یوں بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ سرکوب الہ آبادی[*] نے لکھا ہے :

" اصغر صاحب کی شاعری سے میں اس وجہ سے واقف ہوں کہ میرا ان

۱۔ جواب خط مقالہ نگار ۲۲ فروری ۱۹۶۹ء

۲۔ مکتوب مولانا سراج الحق مچھلی شہری بنام مقالہ نگار ۱۷ فروری ۱۹۶۹ء

*۔ جناب سرکوب الہ آبادی کا اصل نام سید حامد علی تھا ، پروفیسر سید شاہ علی صدر شعبہ اردو کے بڑے بھائی تھے ۔ جن دنوں اصغر انڈین پریس الہ آباد میں ملازم تھے یہ ان کے رفیق کار تھے ۔ ہندوستانی کی ادارت کے امیدوار تھے لیکن جب منتخب ہوئے تو اصغر کے خلاف محاذ قائم کر لیا (تفصیل آگے آئے گی) بڑی جلدی انتقال کر گئے ۔ ان کے مرنے کے بعد ہنگامہ ذرا کم ہو گیا ۔

کا ساتھ تین برس ادبی کام میں رہا ۔"[1]

ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں :

" میرا اور اصغر صاحب کا ساتھ تین برس تک ایک ادبی کام میں رہا ہے اس سبب سے بیجا نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ اصغر صاحب کی شاعری سے میں بخوبی واقف ہوں ۔"[2]

اصغر اور سرکوب کے تین سال کے ساتھ کام کرنے کی تصدیق جناب صدرالدین احمد صدیقی صاحب کی تحریر سے بھی ہوتی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" سرکوب صاحب وہ شخص ہیں جن کا اور اصغر صاحب کا ساتھ انڈین پریس میں تین برس تک ادبی کام میں رہا ہے ۔"[3]

[4]
----- اصغر صاحب انڈین پریس الہ آباد کی ملازمت ترک کرکے اکتوبر ۱۹۳۰ء میں ہندوستانی اکیڈمی سے منسلک ہو گئے ۔ اس سے تین سال پہلے کے معنی ہوئے کہ اکتوبر ۱۹۲۷ء کے قریب قریب اصغر انڈین پریس پہنچے ۔ لیکن حسب ذیل شہادت سے انڈین پریس میں آمد وسط ۱۹۲۷ء ثابت ہوتی ہے :

(۲) جام جہاں نما ۔ لکھنؤ اپریل تا جون ۱۹۳۰ء میں ایک مضمون جناب تحمل الہ آبادی " بنام اصغر گونڈوی " شائع ہوا ہے ۔ اس میں حسب ذیل جملہ بھی آتا ہے :

" اصغر صاحب تین برس سے الہ آباد میں ہیں "

اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو انڈین پریس الہ آباد میں اصغر کی آمد جون ۱۹۲۷ء محقق ہو جاتی ہے ۔

انڈین پریس الہ آباد میں اصغر ترجمہ و تالیف کے شعبہ میں ملازم ہوئے تھے ۔[5] وہاں وہ اسکول کے حسابی کورس تیار کرتے اور معلومات عامہ کے کتابچے انگریزی سے ترجمہ کرتے تھے ----- دراصل یہ کتابچے انگریزی زبان سے ترجمہ نہیں کئے جاتے تھے جیسا کہ

۱۔ اصغر گونڈوی کی شاعری حصہ اول ۔ برکات اکبر پریس الہ آباد ۔ ص ۸۲
۲۔ ایضاً ۔ ص ۳۶
۳۔ " تعمیر " فیض آباد ۲۸ مئی ۱۹۳۳ء مضمون جناب صدرالدین احمد صدیقی ۔ بحوالہ " اصغر گنڈوی کی شاعری " ۔ ص ۵۳
۴۔ مولانا سراج الحق مچھلی شہری مدظلہ کی ایک پرانی تحریر مملوکہ مقالہ نگار ------- مولانا کی اصل عبارت یہ ہے :
" اب اکتوبر ۱۹۳۰ء سے ہندوستانی اکیڈمی کے سہ ماہی اردو رسالہ " ہندوستانی " کی ادارت پر مامور ہیں " ----- نیز اصغر گونڈوی کی شاعری ۔ ص ۲۰ ------
اصل عبارت " اصغر صاحب اکیڈمی میں اکتوبر ۱۹۳۰ء سے ملازم ہوئے تھیں ۔"
۵۔ چٹان لاہور شمارہ ۲۲ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۵
۶۔ مکتوب مولانا سراج الحق مرقومہ ۱۷ فروری ۱۹۶۹ء

مولانا نے فرمایا ہے ، بلکہ انگریزی مواد کو سامنے رکھ کر اصغر نے بچوں کے مذاق ، دلچسپی اور نفسیات کے پیش نظر چھوٹے چھوٹے کتابچے " تحفے [۱] " کے نام سے اپنی زبان میں لکھے تھے (تفصیل آگے آئے گی) ---- یہیں سے مثنوی گلزار نسیم کا انتخاب ، فحش اور مبتذل اشعار حذف کر کے " یادگار نسیم " کے نام سے نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ طالبعلموں کے لئے شائع کی تھی ---- اس پر ایک فاضلانہ مقدمہ بھی تھا اور آخر میں نسیم کی غزلیات بھی شامل کر دی تھیں ---- ان ہلکی پھلکی نثر کی پھڈیوں کا نام " تحفہ " کیوں رکھا گیا - مولانا سراج الحق صاحب کی زبانی سنیے :

> " (اصغر صاحب) خود کہتے تھے کہ چونکہ مجھے تحفۂ اثنائے عشریہ شاہ عبدالعزیز دہلوی سے بہت فیض ملا ہے اس لئے میں نے اس کے اعتراف و تشکر میں اس سلسلۂ معلومات کے نام بھی تحفہ کے لفظ سے شروع کر کے رکھے [۲] - "

---- اصغر اصلاح پسند تھے انھوں نے اس سلسلۂ تحائف سے بچوں کے اصلاح نفس کا کام اسی طرح لینا چاہا جیسے تحفۂ اثنائے عشریہ سے شاہ عبدالعزیز نے لیا - انڈین پریس ہی کے زمانہ میں انھوں نے ایک کتاب " اردو شاعری کی ذہنی تاریخ " لکھنا شروع کی تھی (تفصیل آگے آئے گی)

(۹) ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد :(اکتوبر ۱۹۳۰ء تا نومبر ۱۹۳۶ء)-

یہی زمانہ تھا جب صوبہ جات متحدہ میں ورنا کیولر زبانوں کی پرداخت و نشو و نما کے لئے گورنر مع اپنے وزراء کے تدابیر پر غور کر رہے تھے ---- قانونی کاؤنسل نے ۲۳ دسمبر ۱۹۲۵ء کو ایک رزولیوشن منظور کیا جس میں جدید سائنس اور دیگر شاخہائے علم کی کارآمد کتابوں کو دیسی زبانوں میں ترجمہ کے لئے ایک ادارہ کے قیام پر زور دیا گیا تھا [۳] ---- ۷ اپریل ۱۹۲۶ء کو یہ معاملہ پھر کونسل میں اٹھایا گیا اور ایک رزولیوشن پر بحث ہوئی جس میں " ہندوستانی اکیڈمی " کے قیام کی سفارش کی گئی تھی ---- چنانچہ

۱- مکتوب مولانا سراج الحق مچھلی شہری مرقومہ ۱۷ فروری ۱۹۶۹ء

۲- ایضاً

۳- زمانہ (کانپور) فروری ۱۹۲۷ء

" هندوستانی اکیڈمی " قائم ہوگئی جس کا افتتاحی جلسہ ۳۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو آنجہانی سرتیج بہادر سپرو کی صدارت میں منعقد ہوا تھا[1] ------ ہندوستانی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ نے یہ طے کیا کہ اردو اور ہندی زبانوں میں علیحدہ علیحدہ دو سہ ماہی رسالے شائع کئے جائیں ۔ رسائل کے انتظام کے لئے حسب ذیل حضرات پر مشتمل ایک اڈیٹوریل بورڈ تشکیل دیا گیا :

(۱) ڈاکٹر تارا چند ...... جنرل سکریٹری -- الہ آباد یونیورسٹی (شعبہ تاریخ)

(۲) ڈاکٹر بینی پرشاد ... پروفیسر سیاسیات ۔ الہ آباد یونیورسٹی

(۳) مسٹر ضمیم الرحمن.... لکچرر فارسی و عربی ۔ الہ آباد یونیورسٹی

(۴) سیدمحمد ضامن علی... صدر شعبہ اردو ۔ الہ آباد یونیورسٹی

رسائل کے ایڈیٹروں کے لیے مختلف اخبارات میں اشتہار بھی دیئے گئے اور یہ اعلان بھی کیا گیا کہ یکم جولائی ۱۹۳۰ء سے رسائل جاری ہو جائیں گے[2] ۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا ۔

۱۔ زمانہ (کانپور) اپریل ۱۹۲۷ء ۔ اس موقع پر مولانا صفی لکھنوی نے حسب ذیل نظم پڑھی تھی :

(۱) ڈاکٹر تیج بہادر سپرو	نکتہ رس قدرشناس اردو
(۲) آپ ہی کو ہے یقیناً زیبا	مسند آرائی بیت العلما
(۳) ہے صدارت کے لئے فوز عظیم	سعی مشکور و نہر تعلیم
(۴) واہ کیا بزم ادب دی ترتیب	جاگ اٹھے اردو و ہندی کے نصیب
(۵) جمع ایوان ادب کے ارکان	اکبری دور کی پیدا اک شان
(۶) کہ یوں ہی انجمن علمی کی	خان خانان نے بنا ڈالی تھی
(۷) نہ وہ میخانہ نہ وہ ساقی ہے	آج تک نام مگر باقی ہے
(۸) اب ہیں صوبے کے گورنر میرس	ہنر آموز ہنرور میرس
(۹) ان کے ہاتھوں سے کھلاہے در علم	جو ہیں خود جوہری گوہر علم
(۱۰) شکر لازم ہے بہر طور ان کا	دور زریں ہے صفی دور ان کا

رباعی : "اردو ہندی اکیڈمی بیش بہا
عہد میرس کی یادگار زریں
گنگا جمنی ، خلوص مادر اصلا
ایوان ادب کہیں کہ بیت العلما "

۲۔ زمانہ فروری ۱۹۳۰ء

جون ۱۹۳۰ء میں اکیڈمی کی از سر نو تنظیم ہوئی ------------ اور جنوری ۱۹۳۱ء میں " ہندستانی " کا پہلا شمارہ نکلا [1] - " ہندستانی " کے شعبۂ اردو کے نگراں اور ایڈیٹر جناب اصغر تھے - آپ کا تقرر اس اسامی پر اکتوبر ۱۹۳۰ء بمشاہرہ ۱۵۰--۱۰--۲۵۰ روپے ماہوار پر ہوا [2] --- یہاں یہ اشارہ شاید بے محل نہ ہو کہ یہ تنخواہ اس زمانے میں بہت اچھی تھی ---- اصغر نے بھی ۲ سال تک ادارت کے خدمات بحسن و خوبی انجام دیئے - جس کا اعتراف زمانہ مارچ ۱۹۳۲ء کی " علمی خبریں " صفحہ ۱۹۲ میں حسب ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے :

" پچھلے سال سے ...... تماہی رسالہ مولانا اصغر اور مسٹر رام چندر ٹنڈن کی ایڈیٹری میں شائع ہو رہا ہے گو اس کے بعض پہلوؤں کے متعلق ملک کے ادبی حلقوں میں بہت کچھ مباحثہ ہو رہا ہے لیکن بحیثیت مجموعی دونوں رسالوں کا شمار بہترین پرچوں میں ہونے لگا ہے - ان کی کامیابی پر ہم فاضل ایڈیٹروں کو مبارکباد دیتے ہیں -"

لیکن " ہندوستانی " کی ادارت سنبھالتے ہی اصغر کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا --- ہوا یہ کہ اس اسامی کے لئے اصغر کے علاوہ بہت سے امیدوار تھے - چنانچہ اصغر نے ایک خط جس میں اپنے تقرر کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو مطلع کیا ہے - اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے :

" ہندوستانی ایکاڈمی سے ایک اردو اور ایک ہندی رسالہ نکلنے والا تھا - اس کے لئے اشتہار دیا گیا تھا - سیکڑوں درخواستیں آ گئی تھیں - مجھے بھی بعض احباب نے مشورہ دیا کہ ع

اک فالہ تو بھی پیش کش صبح گاہ کر ؎

چنانچہ میں نے بھی درخواست دے دی تھی ....
مختصر یہ کہ میرا تقرر اس جگہ پر ہو گیا ....[3] "

۱- " ہندستانی " کے نام سے ہندوستانی اکیڈمی سے ایک ساتھ دو رسائل شائع ہوتے تھے ایک اردو میں ، دوسرا ہندی میں - اردو کے ایڈیٹر مولوی اصغر حسین صاحب اصغر اور ہندی کے پنڈت رام چندر ٹنڈن تھے - (زمانہ مارچ ۱۹۳۲ء)

۲-۳ ، مکتوب اصغر بنام مولانا عبدالماجد دریابادی مرقومہ ۲۱ نومبر ۱۹۳۰ء -------- اصل خط مقالہ نگار کے پاس محفوظ ہے - جو مولانا مدظلہ نے از راہ شفقت ارسال فرمایا -

ان سیکڑوں امیدواروں میں سے حسب ذیل حضرات بطور خاص قابل ذکر ہیں [1] :

(۱) سید جالب دہلوی ـــــ ایڈیٹر روزنامہ ہمدم ۔ ہمت لکھنؤ

(۲) مولوی محمد یحییٰ تنہا

(۳) چودھری رحم علی الہاشمی

(۴) مولوی نور الرحمن

(۵) سید حامد علی ـــ برادر پروفیسر سید ضامن علی ۔ صدر شعبۂ اردو ۔ الہ آباد یونیورسٹی ۔ الہ آباد

(۶) مولوی محمد معین کیفی چریاکوٹی [2]

ان حضرات میں سید جالب دہلوی کا ۱۰ جون ۱۹۳۰ء کو انتقال ہو چکا تھا ۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا ، چودھری رحم علی الہاشمی اور مولوی نور الرحمن وغیرہ الہ آباد سے باہر کے تھے ، سید حامد علی مقامی آدمی تھے ، انڈین پریس الہ آباد میں اصغر کے رفیق کار تھے ۔ ممکن ہے کہ وہیں پیشہ ورانہ چشمک رہی ہو ، اپنے بھائی پروفیسر ضامن علی صدر شعبۂ اردو کے اثر و رسوخ کی بنیاد پر خاصے پرامید تھے کہ ان کا انتخاب ہو جائے گا لیکن جب اصغر کے مقابلے میں ناکام رہے تو ناگواری غصہ میں بدل گئی اور غصہ اکاڈمی کے مجلس منتخبہ پر اتارنے کے بجائے اصغر پر اتارنے لگے اور اخبار و رسائل میں اصغر کے خلاف مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا جس میں بعض دوسرے حضرات بھی شامل ہو گئے ۔ اس کی تفصیل نواب علی ہاشمی صاحب کی زبانی سنیے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" الہ آباد میں ایک جماعت اصغر صاحب کے خلاف تیار کی گئی اور اس کا یہی کام ہے کہ وہ اصغر صاحب کی ذات اور ان کے کمالی کلام پر نکتہ چینی کرے خواہ وہ نکتہ چینی لوچ و لچر ہی کیوں نہ ہو ۔ اس جماعت کے صدر .... کالج الہ آباد [3] کے ایک پروفیسر ہیں جو خود تو سامنے آنے کی جرأت نہیں کرتے محض ایک

۱۔ اصغر گونڈوی کی شاعری از سرکوب الہ آبادی حصہ اول ۔ ص ۹۰

۲۔ گفتگو بشیر احمد صدیقی سابق پرنسپل عائشہ باوانی کالج کراچی بتاریخ ۲۰ مئی ۱۹۶۹ء جناب بشیر صدیقی نے فرمایا" کیفی صاحب امیدوار تھے جب منتخب نہیں ہوئے تو اصغر صاحب کے خلاف ہو گئے ۔

۳۔ سید ضامن علی برادر سید حامد علی ۔ اور قاضی خورشید احمد وائس پرنسپل گورنمنٹ کالج الہ آباد ۔ قاضی صاحب ریاضیات کے استاد تھے ، شعر و شاعری کا بڑا شوق تھا۔ الہ آباد میں کالج کے مشاعروں میں بیشتر طلبہ کی غزلیں قاضی صاحب کا عطیہ ہوتی تھیں۔ بڑے پرگو تھے ۔ ایک نشست میں سو ڈیڑھ سو شعر کہہ دینا ان کے نزدیک کوئی بات نہیں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نثی کی آڑ میں شکار کھیلنے کے خوگر ھیں ۔ یہ باد سموم
اصغر صاحب کے خلاف الہ آباد میں اس وقت سے چلنا شروع ھوئی
جب سے انھوں نے اکاڈمی رسالہ کا چارج اپنے ھاتھ میں لیا [۱] ۔"

اس سبب کے علاوہ مخالفت کے بعض دوسرے اسباب بھی تھے جو درج ذیل کئے جاتے ھیں :

(۱) اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ اصغر قدیم طرز شاعری ، خصوصاً لکھنؤ کی شاعری کے سخت خلاف تھے [۲] ۔ اور وقتاً فوقتاً اس کی مخالفت زبان و قلم سے کرتے رھتے تھے ۔ ان کی تحریر سے ایک اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ھے :

" دور صفویہ نے جس طرح فارسی شاعری سے روح معنویت سلب کر کے
اسے آورد و صنع سے گرانبار کر دیا تھا اسی طرح اودھ کی شاعری
کے زیر اثر اردو شاعری بھی صنائع و بدائع اور ضلع جگت میں مبتلا ھو
کر بے تابی و سطحیت کا مسخرا بن کر رہ گئی [۳] ۔"

اس سلسلے میں کہیں کہیں اصغر کی تحریروں میں حد درجہ شوخی ، تیزی اور دلآزاری کی حد تک نشتریت آ گئی ھے ۔ اقتباس ذیل ملاحظہ ھو :

" غزل کے معنی از معشوق سخن گفتن کے کہے جاتے ھیں لیکن آزاد و
بے قید طبائع کے نزدیک اس کا مفہوم ھوس پرستانہ مشاغل کا اعتراف و
اعلان ھے ۔ اس قسم کے کسی عام لکھنوی شاعر کی وہ غزل اٹھا کر دیکھو

(حاشیہ از صفحہ گذشتہ)

تھی ۔ اصغر کے سخت مخالف تھے ۔ ان کے اکثر اشعار پر تنقید فرماتے جو بیشتر لفظیات پر ھوتی ۔ عام اعتراض یہ تھا کہ " چار شعر کہہ کر شاعر بنا پھرتا ھے " ۔ ایک روز طلبہ کے سامنے یہی اعتراض کر رہے تھے کہ میرے ایک ھم جماعت اسداللہ خاں ، جو اقبال احمد جج ھائی کورٹ الہ آباد کے کوئی قریبی عزیز تھے اور اعظم گڑھ کے رھنے والے تھے ، بول بیٹھے " قاضی صاحب شہر کا ایک بچہ شہر ھوتا ھے اور گدڑ کے جھول کے جھول بچے اس کا مقابلہ کرینگے "۔ یہ دراصل قاضی صاحب کی پرگوئی پر چوٹ تھی ۔ قاضی صاحب بڑے برھم ھوئے اور اسداللہ خاں چپکے سے کھسک گئے ۔ لیکن قاضی صاحب کا تو یہ معمول تھا ۔ دوسرے روز پھر وھی اصغر کی شاعری وھی ان کی ھڈی کی چندی اور بال کی کھال نکالنا ۔ مقالہ نگار کو قاضی صاحب سے چار سال تک ریاضیات پڑھنے کا شرف حاصل رھا ھے (۳۷-۱۹۳۳ء) ۔

۱۔ اخبار تعمیر ۔ فیض آباد ۔ ۲۰ اپریل ۱۹۳۳ء بحوالہ " اصغر گونڈوی کی شاعری حصہ اول ص ۳۸۔

۲۔ اصغر گونڈوی کی شاعری حصہ اول ۔ ص ۱۲۲

۳۔ مقدمہ رباعیات رواں مطبوعہ اردو مرکز لاھور ۔ ص ۲

جس میں ولواشتیاق و محبت کے اظہار پر اتر آیا ہو لیکن اس کا یہ
اشتیاق مرثیت کے تلازمین سے اس قدر مسجّل ہوگا کہ تم اس کی حقیقی
کیفیت دلی کا کسی طرح صحیح اندازہ نہیں کر سکو گے وہ اپنے ان
اشتہآت شباب کو " مرنے " سے تعبیر کرے گا پھر اس کے اور تمام
لوازم " نبض کا چھوٹنا " ، " سکا ڈھلنا " ، " نزع کی ھچکیاں "
" میت جنازہ " انتہا یہ کہ " شمع لحد " ، " تربت " اور
" سوم کے پھول " جمع کر دے گا ۔ حالانکہ شاعر کے پاس جا کر
ان تمام ھنگاموں کی کیفیت معلوم کرو تو یہ " کسی بالاخانے پر ایک
خفیف سی دل لگی " نکلے گی اور بس ۔"[۱]

ظاھر ھے کہ اس قسم کی " سخت تنقید " کو وہ لوگ کس طرح برداشت کر سکتے
تھے جنھوں نے شاعری کو صرف زبان و بیان کے پھنترے اور کرتب دکھانے تک محدود کر رکھا تھا
اور خود کو ایک خاص مرکز شعر و ادب (لکھنئو) سے منسوب کر کے اپنے " سکہ بند اور
ٹکسالی شاعر " ہونے پر اظہار تفاخر کرتے تھے ۔ ایسے لوگوں کا مخالفت کے لئے اٹھ کھڑا ہونا
کوئی تعجب کی بات نہیں ۔

(۲) بشیر احمد صدیقی صاحب نے اپنی گفتگو کے دوران میں جو مقالہ نگار سے
۲۰ مئی ۱۹۶۹ء کو عائشہ بوانی کالج کے دفتر میں ہوئی ، اس مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی
بتائی کہ " اصغر و جگر شاعری میں بڑی تیزی سے شہرت کے منازل و مدارج طے کر رہے تھے
یہ بات استادان فن کو گراں گزری چنانچہ عزیز ، محشر وغیرہ نے ان کے خلاف محاذ قائم کر لیا تھا
(۳) اس کے علاوہ ایک سبب اور بھی جو قابل عبرت بھی ھے اور قابل افسوس بھی ---
وہ تھا " فرقہ وارانہ عصبیت " ۔ چنانچہ خلوص کے ساتھ تنقید و تبصرہ کرنے کے بجائے ذاتیات
پر حملے کئے جاتے تھے اور اصغر کو مطعون ٹھہرانے کے لئے بعض ایسی کوتاھیاں اور غلطیاں بھی ان
کے کھاتے میں ڈال دی جاتی تھیں جن کا ذمہ دار " ادارہ " تھا وہ کسی طرح نہ تھے ۔
مثلاً مدتوں اسی بات پر بحث ہوتی رہی کہ " تماھی اور ھندستانی " صحیح نہیں ھے ---
حالاں کہ یہ فیصلہ اصغر کا نہیں تھا " ادارہ " کا تھا ۔ اس کے صحیح ہونے پر اصغر نے
نہیں جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا تھا ۔

ان تمام اعتراضات کی فہرست مرتب کیجئے اور اس " فرد جرم " پر نظر ڈالئے جو
اصغر کے خلاف مرتب کی گئی تھی تو بنیادی اعتراضات صرف دو نظر آئیں گے ۔

۱۔ مقدمہ پیام زندگی حصہ اوّل ۔ مطبوعہ اردو مرکز ۲۷-۱۹۲۶ء ۔ ص ۲۲
*۔ اصغر نے لفظ " تماھی " کی موافقت بڑے فاضلانہ انداز میں کی ھے لیکن " تماھی " کے
(باقی حواشی اگلے صفحہ پر)

(١) " اصغر انتہائی نااھل ھیں نہ ان کو زبان آتی ھے نہ شاعری ----- اگر شعر کہہ سکتے ھیں تو دنگل میں آ کر شعر کہیں " - اس قسم کے بہت سے چیلنج[١] اصغر کو دیئے گئے لیکن اصغر نے جواب میں خاموشی اختیار کر لی - بعض موافقین نے جواب دیئے لیکن اس سے بات ختم ھونے کے بجائے بڑھتی گئی --- آخر اصغر کے منع کرنے سے ان لوگوں نے بھی قلم روک لیا - اگر کوئی صاحب تفصیل جاننا چاھیں تو اس زمانے کے رسائل و اخبارات ملاحظہ فرمائیں -

(٢) اصغر خود شعر نہیں کہتے کسی دوسرے سے کہلواتے ھیں[٢] - یہ بات یہیں ختم نہیں ھوتی بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ھیں :

" جن اشخاص نے غزلیں ان کو کہہ کے دیں وہ خود اقرار کرتے ھیں کہ ھم نے صدا* غلط اور مہمل شعر کہہ کے دیے تھے .... جب انھوں نے دیکھا کہ اصغر کی طرف داری میں ملک کا مذاق خراب ھو رہا ھے اور مہمل اور غلط (اشعار) .... بھی صحیح سمجھے جاتے ھیں .... چنانچہ انھوں نے راز فاش کر دیا ..... اصغر کو چیلنج دیے گئے اور ان کی خاموشی سے ملک کو معلوم ھو گیا کہ اصغر صاحب کا دیوان کشکول گدا ھے جو بھیک کے ٹکڑوں سے بھر دیا گیا ھے"[٣]

ان اعتراضات کے متعلق کوئی رائے دینا میرا منصب نہیں - فیصلہ قارئین پر چھوڑا جاتا ھے -

---

(حاشیہ از گذشتہ صفحہ)

مقابلے میں " سہ ماھی " کو ترجیح دیتے ھوئے لکھتے ھیں : " ----تماھی اصولی حیثیت سے صحیح ھو لیکن سہ ماھی کے ھوتے ھوئے اس کا استعمال ایک غیر ضروری اجتہاد ھے -"
(اداریہ - رسالہ ھندستانی - جولائی ١٩٣١ء - ص ٥٠٢-٥٠١

x- اسی طرح " تماھی " کے انتخاب کے سلسلے میں رقمطراز ھیں : " صورت یہ پیش آئی کہ ھندستانی اکیڈمی کے اردو اور ھندی کے رسالوں کے لئے ایک ایسے نام کی تلاش ھوئی جو دونوں کے لیے یکساں کام دے سکے اور جسطرح ھندستانی اکیڈمی کا اطلاق اردو اور ھندی دونوں شعبوں پر یکساں طور پر ھوتا ھے اسی طرح خیال ھوا کہ رسالوں کا نام بھی ایسا ھونا چاھیے جس سے لفظی تفریق میں کمی ھو اور ھندی اور اردو میں جو خلیج حائل ھے بڑھنے نہ پائے - اس خیال کے زیر اثر اردو اور ھندی ایڈیٹوریل بورڈوں نے تماھی کے لفظ کو رسالہ کے سر ورق کے لئے قبول کرلیا - ان تمام حالات کے بعد ھم نہیں سمجھتے کہ "تماھی" کے متعلق کسی منصف مزاج شخص کو اعتراض کی گنجائش باقی رہ سکے - (ایضاً - ص ٥٠٣-٥٠٢

١- تعمیر - فیض آباد ٢٨ اگست ١٩٣١ء، ٠٢، ١٢، اور ٢٠ اپریل ١٩٣٢ء - " راستی " جونپور ١٦ مارچ ، ٧ نومبر ١٩٣٣ء ، جام جہاں نما - لکھنئو - جون ١٩٣٠ء ، جنوری ١٩٣١ء - اودھ پنچ لکھنئو - ٥، ١٢ مئی ٥٠ اکتوبر ١٩٣١ء ٥٠ اپریل ١٩٣٢ء --- " مہر " ماہ اکتوبر ١٩٣٣ء - ان کے علاوہ رسالہ " نگار " لکھنئو اور " سہیم " آگرہ بحوالہ - اصغر گونڈوی کی شاعری حصہ اول - ص ١١٠-١٠٩-

(باقی حواشی اگلے صفحہ پر)

غرضیکہ اصغر کے مخالفین نے اصغر کو بدنام و رسوا کرنے اور نیچا دکھانے کے لئے مضامین کے انبار لگا دیئے جنہیں بعد میں سید حامد علی سرکوب[۱] الہ آبادی نے مرتب کر کے "اصغر گونڈوی کی شاعری " کے نام سے برکات اکبر پریس الہ آباد سے غالباً[۲] ۱۹۳۲ء میں شائع کر دیا تھا ۔ اس کتاب کی " فقاہت " کا اندازہ حسب ذیل تبصرہ سے ہو جائے گا جو زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۳۲ء میں ، اس پر کیا گیا تھا :

" قبولیت عام اور شہرت دوام خداداد چیزیں ہیں ۔ اس میں کسی کا اجارہ نہیں لیکن بعض لوگوں کو دوسروں کی شہرت و نیک نامی گوارا نہیں ہوتی ۔ دنیا ایسے لوگوں سے نہ کبھی خالی تھی نہ اب ہے ۔ اصغر گونڈوی کو تغزل میں جو شہرت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں لیکن بعض حضرات ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنا ضروری سمجھتے ہیں ۔ انہیں حضرات میں سے اس رسالہ کے مصنف بھی ہیں جنہوں نے یہ کتاب مرتب کی ہے .... اس کتاب سے ذاتیات کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں[۳] ۔"

(حواشی از گذشتہ صفحہ)

۲- بحوالہ مضمون سید حامد علی ۔ اصغر گونڈوی کی شاعری ۔ حصہ اول ۔ ص ۱۲۲ ۔۔ حامد صاحب کی اصل عبارت درج ذیل ہے : " اس وقت جتنے مشہور شاعر ہیں ان میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ اس کے کچھ لوگ مخالف نہ ہوں چنانچہ اعتراض بھی ان پر کیا کرتے ہیں لیکن ان شاعروں کی نسبت یہ نہیں کہتے کہ وہ دوسروں سے شعر کہلاتے ہیں پھر آخر اصغر کی نسبت کثرت کے ساتھ کیوں لوگ کہتے ہیں کہ وہ دوسروں سے شعر کہلاتے ہیں "

۳- مضمون جناب ابو نصر خلیق مطبوعہ اخبار راستی جونپور ۱۷ اگست ۱۹۳۲ء ۔ بحوالہ اصغر گونڈوی کی شاعری حصہ اول ۔ ص ۷۵-۷۶

۱- سرکوب الہ آبادی کا اصل نام سید حامد علی اور تخلص حامد تھا ۔ پورا تعارف صدرالدین احمد صدیقی صاحب کی زبان سے سنیے " سرکوب صاحب وہ شخص ہیں جن کا اور اصغر صاحب کا ساتھ انڈین پریس (الہ آباد) میں تین برس تک ادبی کام میں رہا ہے اور انہیں نے اصغر صاحب کے راز شاعری کو فاش کیا ہے اور اسی وقت سے اصغر صاحب پر برابر چملدح ہونے لگے اور اصغر صاحب لوگوں کی نگاہ سے گرنے لگے ۔ نام ان کا حامد علی اور تخلص حامد ہے لیکن جب جدید رنگ میں کہتے ہیں اور ادب لطیف والوں کی خبر لیتے ہیں تو اس وقت تخلص سرکوب کرتے ہیں " ۔ تنویر فیض آباد ۲۸ مئی ۱۹۳۲ء ۔ بحوالہ اصغر گونڈوی کی شاعری حصہ اول ۔ ص ۵۲-۵۳

۲- کتاب پر سنہ طباعت نہیں لکھا ہے چونکہ اسپر تبصرہ ستمبر ۱۹۳۲ء میں ہوا ہے اس لئے قیاساً ۱۹۳۲ء لکھا گیا ہے ، ممکن ہے کہ اواخر ۱۹۳۲ء میں طبع ہوئی ہو ۔

۳- زمانہ (کانپور) ستمبر ۱۹۳۲ء ۔ تنقید کتاب ۔ ص ۱۲۸

اس ناخوشگوار بحث کو اسی تبصرہ پر ختم کیا جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں شاید اتنا لکھنا بے جا نہ ہو کہ یہ تبصرہ ایک ہندو اہل قلم بابو دیا نرائن نگم کے رسالے "زمانہ" کان پور میں شائع ہوا ہے ۔ جن کا شستہ ، سنجیدہ اور معتدل مزاج ، " زمانہ " کی ثقاہت اور سنجیدگی کا ضامن تھا ۔ جنھوں نے کبھی پارٹی بازی کو نہیں سراہا اور نہ کبھی اپنے دامن کردار کو گرد عصبیت سے داغدار کیا ۔

مختصر یہ کہ " ہندوستانی " کی ادارت سنبھالنے کے بعد ابتدائی تین چار سال اصغر کے لیے بڑی ابتلا و آزمائش کا دور تھا لیکن اپنی اصول پسندی اور طبیعت و مزاج کے عین مطابق اصغر نے کوئی غیر سنجیدہ اور اخلاق سے گرا ہوا رویہ اختیار نہیں کیا ۔ اس کے برعکس تحمل ، بردباری اور متانت کے ساتھ ان تمام " طوفانوں " سے گزر گئے ۔ یہاں تک کہ دنیا کی مخالفتوں و موافقتوں سے ہمیشہ کے لئے بے نیاز ہو کر معبود حقیقی سے جا ملے ۔

اصغر کے عہد ادارت میں " ہندستانی " کے جتنے شمارے نکلے ان میں ان کے اداریے ، اکیڈمی کی روداد تبصرے اور مضامین و مقالے شائع ہوئے ۔ جس سے تفصیلی بحث آگے آئے گی ۔

ازواج و اولاد :

پہلی شادی (۱۹۰۲ء)

اصغر نے تین شادیاں کیں ۔ پہلی شادی والدین نے اوائل عمر ہی میں کر دی تھی ۔ اس شادی کے متعلق جناب سید رشید احمد صاحب رقم طراز ہیں :

> " پہلی شادی موضع شاہ پور میں ہوئی تھی جو قصبہ نواب گنج ضلع گونڈہ کے مضافات میں دریائے سرجو کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے [1] "

اس بیوی سے اصغر کے تعلقات کشیدہ رہے ۔ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی ۸ ، ۹ سال تک تو معاملہ لشتم پشتم چلتا رہا ۔ ۱۲-۱۹۱۳ء کے بعد تعلقات میں اس درجہ ناخوشگواری پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے خسر کے ساتھ رہنے لگیں آخر انھیں کے یہاں

۱۔ مضمون سید رشید احمد صدیقی ۔ چٹان لاہور ۔ شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ص ۱۸

۱۹۲۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا ـ[1]

اس کشیدگی کا کوئی سبب نہ معلوم ہو سکا ـ رشید صاحب صرف اتنا لکھ کر خاموش ہو گئے ہیں کہ

"جب باعث کشیدگی کسی نے پوچھا تو یہی کہہ کر ٹال دیا کہ میاں بیوی کے معاملے میں دوسروں کو دخل نہ دینا چاہیے ـ"[2]

لیکن اصغر کی ابتدائی زندگی کے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں ان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہ جاتی (تفصیلی بحث آگے آئے گی) ـ

معاصرین میں سے کسی نے پہلی شادی کی کوئی قطعی اور حتمی تاریخ نہیں لکھی لیکن بعض قرائن و شواہد ہمارے پاس ایسے ہیں کہ اگر ان کو سامنے رکھا جائے تو گو قطعی نہ سہی تاہم شادی کے انعقاد کی تاریخ کا ایک سرسری سا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے ـ

(۱) مثلاً* رشید صاحب نے اپنے مکتوب مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء میں مقالہ نگار کو تحریر فرمایا "اصغر صاحب کی بڑی لڑکی کی شادی غالباً* ۲۱-۱۹۲۰ء میں ہوئی تھی ـ میں شریک تھا ـ" اس واقعہ کو صحیح تسلیم کر کے (اور کوئی وجہ اس کے جھٹلانے کی ہمارے پاس نہیں ہے) اگر شادی کے وقت لڑکی کی عمر ۱۵، ۱۶ سال کی مانی جائے، جیسا کہ دیہاتوں میں شرفا کے یہاں دستور تھا تو اس کا سال ولادت ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۶ء کے درمیان آتا ہے ـ

(۲) دوسری طرف شادی کے وقت اگر اصغر صاحب کی عمر ۱۸ تا ۲۰ سال فرض کر لی جائے جیسا کہ دیہاتوں میں مسلمانوں کے متوسط طبقہ میں معمول تھا تو شادی ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء کے درمیان ہونا چاہیے ـــ ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء یوں صحیح نہیں معلوم ہوتے کہ اس وقت اصغر چھٹی اور ساتویں جماعت کے طالب علم تھے ـ ہرچند کہ پرانے زمانے میں

۱ـ مضمون سید رشید احمد صدیقی ـ چٹان لاہور شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء

*ـ جناب بشیر احمد صدیقی نے ۲۰ مئی ۱۹۶۹ء کی گفتگو کے دوران میں فرمایا کہ "اصغر صاحب کی پہلی بیوی کا انتقال تو اس وقت ہوا جب ان کا قیام بلونڈیر پریس (الہ آباد) میں تھا ـــ ۱۹۲۲ء کے بجائے میرے خیال میں ۱۹۳۲ء ہوگا" ـــ اگر انتقال کا واقعہ قیام بلونڈیر پریس کے زمانہ کا تسلیم کیا جائے تو یہ واقعہ ۱۹۳۴ء کے حدود کا ہونا چاہیے ـ کیوں کہ ۱۹۳۳ء تک ان کے شہر میں (جانسن گنج ـ الہ آباد) قیام کی شہادت ملتی ہے (انتخاب اصغر ـ ص ۳۲ ـ شخصیات نقوش نمبر جلد دوم ـ ص ۱۳۸۲) ـ بلونڈیر میں وہ فالج کے حملے کے بعد منتقل ہوئے (شخصیات نمبر جلد دوم ص ۱۳۸۷) اور فالج کا حملہ ان پر ۱۹۳۳ء میں ہوا ـ (مضمون جناب رشید احمد چٹان لاہور شمارہ ۳۱ جولائی ۱۹۶۷ء) ـ لیکن میرے خیال میں بشیر صدیقی صاحب کو تسامح ہوا ـ رشید صاحب ہی کا بیان درست معلوم ہوتا ہے ـ اسکی تصدیق و توثیق دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے ـ

۲ـ چٹان لاہور شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ـ ص ۱۹

شادی کے وقت ان باتوں پر کوئی خاص توجہ نہ دی جاتی تھی تاہم پڑھے لکھے گھرانوں میں تعلیم کی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی اور یہ خیال عام ہو چلا تھا کہ شادی کے بعد عموماً لڑکے نہیں پڑھتے اس لئے زیادہ قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ شادی ۱۹۰۲ء[1] میں مڈل کا امتحان سے فراغت کے بعد ہوئی ہو ـــ میرے خیال میں یہ زمانہ مارچ تا جون کا ہوگا کیونکہ یوپی کے دیہاتوں میں شادیاں عموماً اسی زمانے میں ہوتی ہیں ـــ ۱۵ جون کے بعد عموماً برسات شروع ہو جاتی ہے ۔ گونڈہ چونکہ ترائی کے علاقہ میں ہے ، بارش بہت ہوتی ہے ، برسات میں ذرائع آمد و رفت مسدود ہو جاتے ہیں ۔ اس لئے شادی مئی جون میں ہوئی ہوگی ۔ ۱۹۰۲ء میں ۱۶ مئی تا ۱۵ جون[2] ربیع الاوّل اور ربیع الآخر کے مہینے تھے ۔ اس سے پہلے محرم صفر کے مہینے تھے جن میں شادیاں نہیں ہوتیں ـــ اس لیے قیاس یہی ہے کہ اصغر کی شادی یکم مئی تا ۱۵ جون ۱۹۰۲ء کے درمیان کسی تاریخ کو ہوئی ہوگی ۔

(۲) اگر شادی کا سال ۱۹۰۲ء تسلیم کر لیا جائے تو لڑکی کا سال ولادت اس کے بعد ـــ ۶-۱۹۰۵ء ماننا پڑے گا ۔ میرے خیال میں ۶-۱۹۰۵ء ہی درست ہے کیوں کہ ترک تعلیم کے سلسلے میں جناب مرزا احسان احمد صاحب لکھتے ہیں :

> " انٹرنس کے امتحان کے لئے تیاری کی لیکن خانگی پریشانیوں کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے ۔[3] "

ـــ جناب سید رشید احمد رقم طراز ہیں :

> " ۱۹۰۲ء میں انگریزی کا درجۂ مڈل پاس کر لیا تھا اور انٹرنس میں پڑھ رہے تھے کہ ۱۹۰۶ء میں انگریزی تعلیم کا سلسلہ باپ کے ایماء سے ترک کرنا پڑا ۔[4] "

اب اگر ان دونوں بیانات میں مطابقت پیدا کی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شادی ۱۹۰۲ء میں ہوئی ، سال ڈیڑھ سال ازدواجی زندگی کوگزرے ۔ ۱۹۰۵ء کے اواخر یا ۱۹۰۶ء کے اوائل میں زچگی کا مسئلہ پہاڑ بن کرسامنے آیا ۔ اصغر جو خود بڑے حساس اور فہیم تھے

۱۔ اصغر نے مڈل ۱۹۰۲ء میں پاس کیا ـــ بحوالہ چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ص ۸
۲۔ تقویم ھجری و عیسوی ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی ۔
۳۔ مقدمہ نشاط روح ۔ ص ۸
۴۔ چٹان لاہور شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۸

بوجھ محسوس کرتے ہوں گے اور خاصے پریشان ہوں گے (خانگی پریشانی جس کی طرف مرزا صاحب نے اشارہ فرمایا ہے) ۔ باپ کا ذرا سا اشارہ ہوا (باپ کا ایماء ہوا ۔ بقول سید رشید احمد صاحب) اور اصغر نے جو ذہنی طور پر پہلے ہی سے تیار ہوں گے، فوراً تعلیم ترک کر دی ـــ ورنہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ منشی تفضل حسین جو صدر قانون گو تھے (اس زمانہ میں صدر قانون گو خاصا پڑھا لکھا اور صاحب حیثیت شمار کیا جاتا تھا) اور جنھوں نے اصغر کو انٹرنس تک تعلیم دلائی تھی دو تین ماہ (انٹرنس کا امتحان مارچ اپریل میں ہوتا تھا اور اصغر نے تعلیم جنوری فروری میں چھوڑی ہوگی) مزید نہیں پڑھا سکتے تھے ۔ نیز اصغر جو خاصے ذکی و فہیم تھے دو تین ماہ اور صبر نہیں کر سکتے تھے ۔ اس کا سبب اس کے علاوہ کچھ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ بعض بہت ہی اہم خانگی مسائل درپیش تھے جنھوں نے باپ بیٹے دونوں کو ہلا دیا تھا ۔ اور میرے نزدیک یہ مسئلہ دیگر اور مسائل کے ساتھ (جو ابھی تک ہمیں نہیں معلوم ہو سکے) اصغر کی متاہلانہ زندگی کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ بچی کی ولادت کا مسئلہ بھی رہا ہوگا۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ پہلی بیوی سے اصغر کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے ، میرے خیال میں اس کا اصل سبب اصغر کی رنگین اور پرمعصیت زندگی تھی ۔ ملازمت میں آنے کے بعد اصغر کی زندگی میں ایک دور ایسا آیا تھا جب وہ راگ و رنگ اور شراب و کباب میں پڑ گئے تھے[1] ۔ اس دور رنگیں میں انھیں ارباب نشاط سے بھی دل بستگی پیدا ہو گئی تھی ۔ یہ چیز ان کی بیوی کو ناگوار گزری ہوگی ، شروع شروع میں انھوں نے اصغر کو اس طرز زندگی سے منع باز رکھنے کی کوشش کی ہوگی لیکن جب وہ نہیں باز آئے ، بلکہ اسکے برعکس تائب ہونے کے بعد ان کی طرف راغب ہونے کے بجائے دوسری شادی کرلی تو تعلقات کی ناخوشگواری اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہوگی ۔

<u>دوسری شادی (۱۹۱۳-۱۲ء)</u>- اصغر کی دوسری شادی (جس کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے) کا قصہ بھی عجیب ہے ۔ دور سرشاری میں اصغر کے بعض دوستوں نے انھیں " ارباب نشاط " کے کوچہ کا راہ نورد و راہ شناس بنا دیا تھا ۔ لیکن اس راہ میں

۱۔ چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۷ ، شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۸۳-۱۲۸۳

بھی انھوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی یعنی صرف ایک ہی کی زلف گرہ گیر میں اسیر ہو کر رہ گئے ۔ ان مسماۃ کا نام چھٹن تھا[1] ۔ ابھی معاشقہ چل ہی رہا تھا کہ اصغر کی زندگی میں ایک انقلاب آیا ۔ انھوں نے رندی و ہوسناکی سے توبہ کرلی اور شرع کے مطابق چھٹن سے عقد کر لیا[2] ۔ جسم کی بھڑکتی ہوئی تشنگی کو سرد کرنے کے لئے انھوں نے مذھب اور تصوف میں پناہ لی اور قاضی عبدالغنی منگلوری رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے ـــــ اصغر کی زندگی میں اس انقلاب کا اثر صرف انھیں کی ذات تک محدود نہ رہا بلکہ یہ بھی ہوا کہ چھٹن مع پورے خاندان کے اس پیشہ سے تائب ہوگئیں ۔ اور ان کی دنیا یکسر بدل گئی[3] ۔

اصغر نے دوسری شادی کب کی ۔ کچھ نہیں معلوم ۔ ان کے کسی سوانح نگار نے اس پر روشنی نہیں ڈالی تاہم ان کی تحریروں میں بعض قرائن و شواہد ایسے ہیں جن کے تجزیہ سے اس کی تاریخ کا تعین کیا جا سکتا ہے ۔ قرائن اور ان کا تجزیہ درج ذیل ہے :

(۱) اصغر نے ۱۹۱۲ء کے اواخر یا زیادہ سے زیادہ اوائل ۱۹۱۳ء[4] (جنوری فروری) میں ریلوے کی ملازمت ترک کر دی (تفصیل آگے آئے گی) اور اپنی پر معصیت زندگی سے ھمیشہ کے لئے توبہ کرلی ۔ یہ ان کی ذھنی زندگی میں زبردست انقلاب تھا ۔ ان کی سیرت و کردار کی پختگی ، عزم و ارادہ کی مضبوطی اور بعد کے تاریخی حقائق کے پیش نظر قیاس یہی ہے کہ اس واقعہ کے بعد ہی انھوں نے اس معاشقہ کو جو ان کے اور چھٹن کے درمیان چل رہا تھا شرعی شکل دی ہوگی[5] ـــــ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ دوسری شادی کے وقت پہلی بیوی اور کم از کم ایک بچی ورنہ دو بچیاں موجود تھیں ۔ ان حالات میں دوسری شادی کا فیصلہ آسان نہیں تھا ۔ اس کشمکش و فیصلے میں کم از کم سال ڈیڑھ سال لگے ہوں گے ۔ اس طرح شادی اوائل ۱۹۱۳ء اور وسط ۱۹۱۴ء کے درمیان ہوئی ہوگی ۔

۱۔ مضمون جناب سید رشید احمد ۔ مطبوعہ چٹان لاھور شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ص ۱۷

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ مکتوب جناب سید رشید احمد بنام راقم الحروف مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء

۵۔ مضمون سید رشید احمد ۔ چٹان لاھور شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۷

(۲) اس خیال کو اس بات سے مزید تقویت پہنچتی ہے کہ دوسری[1] لڑکی (ننھی ولادت ۱۲-۱۹۱۳ء - تفصیل آگے گی) کی ولادت کے بعد اصغر کے یہاں کسی اور اولاد کا پتہ نہیں چلتا - یوں تو اولاد کا ہونا نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت و اختیار میں ہے تاہم ظاہری حالات کے پیش نظر (جب کہ اصغر کی عمر کسی طرح ۳۰ سال سے زیادہ نہیں تھی، بیوی میں بھی کوئی نقص نہیں تھا بچوں کی ولادت ہو چکی تھی) - یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہیں ایام میں (۱۲-۱۹۱۳ء) اصغر نے چھٹن سے شادی کر لی اور پہلی بیوی سے عملاً زنا شوئی کے تعلقات بالکل ختم ہو گئے اور اہلیہ اصغر خسر کے ہمراہ رہنے لگیں (جیسا کہ سطور گزشتہ میں مذکور ہوا) - اس امر کی تصدیق نسیم خاتون کے بیان سے بھی ہوتی ہے - میرے سوال کے جواب میں کہ :

" جگر سے آپ کی پہلی شادی کب ہوئی "

انہوں نے لکھا :

" جگر صاحب سے جب پہلی بار شادی ہوئی ہے اٹھارہ برس کے قریب عمر ہوگی[2] "

جگر کی شادی ۱۹۱۹ء میں ہوئی - اسطرح نسیم خاتون کا سال ولادت ۳-۱۹۰۱ء کے درمیان آتا ہے (۱۸ سال کے قریب میں دو تین سال کا اشتباہ موجود ہے) -

اصغر سے بڑی بہن کی شادی کے وقت اپنی عمر ۱۰، ۱۱ سال بتاتی ہیں[3] - گویا بڑی بہن کی شادی ۱۲-۱۹۱۳ء میں ہوئی -

ایک دوسرے سوال کے جواب میں کہ

" آپ کی بڑی بہن سے شادی کے بعد ننھی پیدا ہوئیں یا بعد میں "

انہوں نے لکھا :

" عقد کے بعد -"

ان تمام جوابات سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ۱۹۱۳ء کے اوائل میں اصغر نے توبہ کی ہے - ۱۹۱۲ء کے اواخر میں چھٹن سے شادی ہوئی اور اسکے کچھ دنوں بعد (زیادہ سے زیادہ دو تین ماہ) ننھی پیدا ہوئیں -

---

۱- یہ اصغر کی ساتویں بیٹی تھیں اور سب سے چھوٹی (بحوالہ جواب نسیم خاتون ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء، جگر منزل گونڈہ) -

۲،۳- انٹرویو از نسیم خاتون ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء بمقام گونڈہ

شادی کے وقت ننھی کی عمر کا اندازہ لطیف احمد صاحب عباسی نے ۲۲، ۲۳ سال بتایا[۱] - ننھی کا عقد مارچ ۱۹۳۶ء اور رخصت ستمبر ۱۹۳۷ء میں ہوئی - اس حساب سے بھی ننھی کا سال ولادت ۱۹۱۴-۱۵ء آتا ہے -

اصغر اور جگر دونوں کی بیویوں (چھٹن اور ان کی چھوٹی بہن نسیم خاتون - بقول سید رشید احمد نصیر[۲]) کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ دونوں بہنیں " ارباب نشاط" میں سے تھیں - چنانچہ میرے استفسار پر کہ

" بعض لوگوں نے نسیم جگر کے سلسلے میں بڑی افسانہ طرازیوں[*] سے کام لیا ہے -"

ان کا فرمانا ہے کہ

" اصغر نسیم کے زخم خوردہ تھے[۳] -"

آخر جگر سے طلاق دلا کر خود شادی کر لی - اس کی حقیقت پر آپ روشنی ڈال سکیں گے ؟

جناب قیصر مرادآبادی نے تحریر فرمایا :

" جو کچھ بھی ہوں - دونوں بہنیں طوائف تھیں - جگر کی بھی، اصغر کی بھی بیویاں بن گئیں[۴] -"

جناب صغیر احمد صدیقی نے کھل کر تو نہیں لکھا لیکن بات وہ بھی یہی لکھتے ہیں :

" گونڈہ واپس ہوئے (بیعت کرکے) تو پھر ان کا دامن پکڑا گیا - وہ ترغیبیں پھر اپنی پوری قوت سے ان کو کھینچنے کو تیار تھیں - کشاکش شروع ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ تائب ہو کر ان کی زندگی کے شریک بن گئے[۵] -"

۱- گفتگو جناب لطیف احمد عباسی - سٹلائیٹ ٹاؤن راولپنڈی ۲۷، مئی ۱۹۷۱ء

۲- مضمون جناب سید رشید احمد مطبوعہ چٹان لاہور شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ص ۱۷

*- تفصیل کے لیے دیکھئے انٹرویو جناب شورش کشمیری از جناب احسان دانش مطبوعہ چٹان لاہور شمارہ ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء ---- (۲) مضمون ڈاکٹر فرمان فتحپوری - " جگر کے شاعرانہ مرتبہ کا تعین " نگار پاکستان فروری ۱۹۶۶ء ---(۳) " تصویر شیخ " افسانہ عزیز احمد - مطبوعہ اردو ادب جلد اول مکتبۂ جدید - کراچی لاہور - ص ۱۲۶-۱۲۹

۳- مضمون " جگر کے شاعرانہ مرتبہ کا تعین " از ڈاکٹر فرمان فتحپوری مطبوعہ نگار پاکستان فروری ۱۹۶۶ء - ص ۳۳

۴- حاشیہ بر مکتوب مقالہ نگار از جناب قیصر مرادآبادی مرقومہ ۵ اپریل ۱۹۶۹ء -

۵- " اصغر گونڈوی " از صغیر احمد صدیقی - نقوش شخصیات نمبر جلد دوم - ص ۱۳۸۲

اس کی تصدیق بابو بندیشوری پرشاد صاحب تقدیر گرنڈوی میں بھی فرماتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا :

"اصغر خوب شراب پیتے تھے ۔ دونوں بہنیں طوائف تھیں ۔[۱]"

"یہ تائب ہو کر زندگی کا شریک بنتا " اعلان کر رہا ہے کہ "توبہ کرنے والا " غلط راہ کا سالک تھا بعد میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گیا ۔

اسی طرح جناب اثر لکھنوی نے ایک نجی گفتگو میں جو ان کے دولت کدے پر کشمیری محلہ لکھنئو میں مقالہ نگار سے ہوئی فرمایا :

"بھیا یہ دونوں بہنیں طوائف تھیں ۔ ایک سے اصغر نے شادی کر لی دوسری سے جگر نے ۔ پھر اصغر کے کہنے پر جگر نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ۔ اصغر نے اپنی کو ۔ بعد میں مطلقہ جگر سے اصغر نے شادی کر لی ۔[۲]"

قریب قریب یہی بات اثر صاحب نے ڈاکٹر محمد اسلام صاحب سے کہی[۳] (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "یاد اثر ") ۔

لیکن جناب بشیر احمد صدیقی نے اس رائے سے اختلاف کیا اور فرمایا :

"اصغر اور جگر کی بیویاں آپس میں بہنیں ضرور تھیں ۔ لیکن طوائف نہیں تھیں ۔ ماں شاید طوائف رہی ہوں ۔ ان سے ایک صاحب نے شادی کر لی جن سے یہ دونوں بہنیں پیدا ہوئیں ۔ ان میں بڑی بہن باپ پر گئی تھیں جن کا رنگ خاصا صاف تھا ۔ البتہ دوسری ماں پر گئی تھیں جو کالی تھیں ۔ میں نے خود ان صاحب کو دیکھا ہے ۔ خوبصورت نقش اچھا صاف رنگ تھا ۔[۴]"

۱۔ بحوالہ گفتگو مقالہ نگار از جناب ڈاکٹر محمد اسلام بتاریخ ۲۲ مئی ۱۹۶۹ء

۲۔ گفتگو جناب اثر ، ۲۷ دسمبر ۱۹۶۲ء

۳۔ "یاد اثر " مرتبہ جناب ڈاکٹر محمد اسلام مطبوعہ نامی پریس ۔ لکھنئو طبع اول ۱۹۶۷ء ص ۱۰

۴۔ گفتگو مقالہ نگار از جناب بشیر احمد صدیقی ۲۳ مئی ۱۹۶۹ ۔۔ جناب بشیر احمد صدیقی جناب رشید احمد صدیقی کے قریبی رشتہ دار اور حقیقی سالے ہیں ۔ ۱۹۱۹ء میں اصغر سے اعظم گڑھ میں متعارف ہوئے ۔ ان دنوں ان کے والد تھانہ اترولیا ضلع اعظم گڑھ میں پولیس سب انسپکٹر تھے ۔۔ بشیر صدیقی صاحب ۵۰-۱۹۳۲ء اعظم گڑھ میں رہے ، پہلے شبلی ہائی اسکول کے ہیڈماسٹر تھے بعد میں جب کالج ہو گیا تو پرنسپل ہوگئے ۔ ریٹائر ہونے کے بعد پاکستان چلے آئے اور پاکستان سنٹرل گورنمنٹ ہائی اسکول جہانگیر روڈ ۔ کراچی میں ہیڈماسٹر ہو گئے ۔ کچھ دنوں بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سکنڈری ایجوکیشن ۔ کراچی کے سکریٹری بھی رہے ۔ میں جب اصغر کے سلسلے میں ان سے ۲۰ مئی ۱۹۶۹ء کو ملا ہوں تو عائشہ بوانی کالج کے پرنسپل تھے ۔ ۷۴ ، ۷۵ سال کی عمر ہوگی مگر ماشاء اللہ بڑے چاق و چوبند اور باحواس ہیں ۔ حافظہ اب بھی بہت اچھا ہے ۔ اصغر سے ان کے تعلقات مرتے دم

میرے استفسار پر جناب نواب سید شمس الحسن نے بشیر احمد صدیقی صاحب کی رائے سے اتفاق فرمایا لیکن کسی قدر محتاط انداز میں فرمایا:

"قطعی طور پر تو کچھ نہیں کہہ سکتا - بشیراحمد صدیقی صاحب کی رائے زیادہ قرین قیاس ہے - نسیم جگر میرے یہاں آئی ہیں - میرے گھر کی عورتیں اس معاملے میں بڑی حساس ہیں لیکن انہوں نے ان میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جس سے ان پر طوائف ہونے کا شبہ ہو -[1]"

بعد میں اسی بات کی توثیق اپنے گرامی نامہ مرقومہ ۲۷ جنوری ۱۹۷۰ء کے ذریعہ بھی فرمائی تحریر فرماتے ہیں:

اور جگر صاحب

"آپ نے جو اصغر صاحب کی بیوی کے متعلق باتیں لکھی ہیں وہ میرے ذاتی علم میں نہیں - قرین قیاس یہ ہے کہ بشیر صدیقی صاحب کی اطلاع زیادہ صحیح ہے اور جو لوگ ایسی باتیں ان دونوں بہنوں کے متعلق منسوب کرتے ہیں اس کی نوعیت غالباً یہی ہو جو بشیر صاحب بیان کرتے ہیں - نسیم صاحبہ ایک بار جگر صاحب کے ساتھ میرے یہاں مقیم رہ چکی ہیں میرے گھرانے کی عورتوں نے ان میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جس سے یہ تاثر پیدا ہو سکا۔ اس نوعیت کی عورتوں میں تبدیلی آنے پر بھی کچھ ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جن سے ان کی پچھلی زندگی پر کچھ نہ کچھ عکس پڑتا ہے -"

میرے اس خیال کو مزید تقویت خود رشید صاحب کے اس جملے سے ہوتی ہے:

"اصغر کی بی بی کو خانہ داری کے کاموں میں گھر کی ترتیب و صفائی اور کھانے پکانے کا اچھا سلیقہ تھا .....[2]"

۱- گفتگو ۷ جنوری ۱۹۷۰ء - نواب سید شمس الحسن صاحب ابن جناب نواب علی حسن خان ابن جناب صدیق حسن خان صاحب -- صاحب علم خاندان کے چشم و چراغ ہیں - اس خاندان پر اللہ تعالیٰ کے خاص انعامات -- دولت، علم اور فقر و درویشی -- ارزانی ہوئے ہیں -- نواب صاحب کے اسلاف کے متعلق کتابوں میں پڑھا اور بزرگوں سے سنا تھا - نواب صاحب کو بچشم خود دیکھا - تینوں (دولت، علمیت اور درویشی) کے حسین امتزاج نے شخصیت کو بہت ہی دلکش بنا دیا ہے - ۳۰-۱۹۲۹ء میں جگر سے اور ۱۹۳۲ء میں اصغر سے متعارف ہوئے - ایک زمانے میں تو جگر کا مستقل قیام ہی بھوپال ہاؤس لکھنؤ رہا ہے- اصغر نواب صاحب کے والد بزرگوار جناب نواب علی حسن خاں صاحب کے نیازمندوں میں تھے - مسلمانوں کی کوئی علمی، معاشرتی اور سیاسی تحریک اس دور میں ایسی نہیں تھی جس سے نواب علی حسن خاں صاحب کا تعلق نہ رہا ہو -- نواب سید شمس الحسن صاحب کو جگر اور اصغر سے بہت قریبی اور خصوصی تعلق رہا ہے -

۲- چٹان لاہور شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۱۷

یہاں انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر یہ طوائفیں تھیں تو یہ گھر داری اور سلیقہ شعاری ان میں کہاں سے آ گئی ۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ گھر دار عورتیں تھیں ۔

اصل میں اصغر اور جگر کے خلاف اس وقت جو عمومی فضا تھی اگر اس کے پس منظر میں ، ان دونوں مختلف بیانات پر غور کیا جائے تو بشیر احمد صدیقی صاحب کی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے ـــ یعنی بیگم جگر اور اصغر کی والدہ کا تعلق ممکن ہے کسی مرحلہ میں اس " طبقۂ خاص " سے رہا ہو لیکن بعد میں انھوں نے شادی کر لی اور متاہلانہ زندگی بسر کرنے لگیں ۔ شوہر سے ان کے یہاں چار اولادیں ہوئیں ۔ دو بیٹے ، دو بیٹیاں ۔ یہی دونوں بیٹیاں چھٹن (اصل نام نہ معلوم ہو سکا) اور نسیم بعد میں اصغر اور جگر سے منسوب ہوئیں ۔ چونکہ ماں کی وجہ سے عام لوگوں کی رائے بیوی کنبہ کے متعلق اچھی نہیں تھی اس لیے ان دونوں بہنوں کے متعلق بھی ایسی باتیں کہی جانے لگیں ۔ بعد میں ایک ایسا گروہ جو ان لوگوں کے خلاف پیدا ہو گیا تھا اس نے اسے خوب اچھالا ہو ۔

بیگم اصغر اور جگر کے والد کا نام چودھری حامد حسین تھا[1] ۔ اس کا پتہ خود چودھری صاحب کے خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے الہ آباد سے سید مرتضیٰ علی صاحب کو لکھا تھا ۔ تحریر فرماتے ہیں :

محترمی و محتشمی نواب صاحب ۔ السلام علیکم

عرض مدعا سے پیشتر یہ گزارش کر دینے کی ضرورت ہے کہ ایک اجنبی ہونے کے باوجود خدمت عالی میں تصدیعہ دہی کی جسارت کیوں کر رہا ہوں ۔ اصغر صاحب مرحوم میرے خویش تھے اور یہ عریضہ مرحوم کی اہلیہ کی خواہش پر لکھ رہا ہوں ۔[2] "

۱۔ اصل نام چودھری حامد حسین ہے جیسا کہ انھوں نے التزاماً سید مرتضیٰ علی صاحب کو خطوط کے اختتام پر (مرقومہ ۲۰ اور ۲۸ جولائی ۱۹۳۷ء) لکھا ہے ۔ صرف حامد حسین جیسا کہ جناب احمر رفاعی نے " جگر آثار و افکار " ص ۳۷ پر ڈاکٹر عابد علی خان کی تصحیح فرماتے ہوئے تحریر فرمایا ہے درست نہیں ہے اور سید حامد علی ـــ (تحریر ڈاکٹر عابد علی خان ۔ ساقی مارچ ۱۹۶۵ء بحوالہ جگر آثار و افکار ۔ ص ۳۷) تو بالکل ہی غلط ہے ۔ میرا خیال ہے نام سے پہلے " سید " کا لفظ سہواً یا تسامحاً لکھا گیا ہے ۔ اسی قسم کا " سہو " نیرنگ خیال لاہور والوں سے بھی اصغر صاحب کے معاملے میں ہوا ہے انھوں نے ان کا نام التزاماً/سید اصغر حسین اصغر لکھا ہے (نیرنگ خیال اپریل مئی ۱۹۳۲ء عید نمبر ص ۱۵) * ۔ نام کا آخری جزو حسین یا علی دیکھ کر نہ جانے کیوں مسمی کے "سید" ہونے کی طرف خیال جاتا ہے ۔ غالباً اسی غلطی کے پیش نظر مولانا سراج الحق مچھلی شہری نے اصغر کو حضرت صدیق اکبر کی شان میں قصیدہ کہنے کا مشورہ دیا تھا تاکہ لوگ انھیں " سید " اور بعد میں " شیعہ " نہ سمجھنے لگیں (مکتوب مولانا بنام راقم مقالہ مرقومہ ۱۷/ فروری ۱۹۶۹ء) ۔

۲۔ مکتوب چودھری حامد حسین بنام سید مرتضیٰ علی مرقومہ ۲۰ اگست ۱۹۳۷ء ۔

* نیرنگ خیال سالنامہ ۱۹۳۲ء ۔ ص ۲۵

اس امر کی تصدیق و توثیق محترمہ نسیم خاتون (اہلیہ اصغر اور جگر) کی تحریر سے بھی ہوتی ہے ۔ وہ لکھتی ہیں :

" محترمی ۔ تسلیم ۔ نوازش نامہ قبلہ* والد صاحب کے نام صادر ہوا ۔ روپیہ کے بارے میں آپ نے بہت موقع سے یاد فرمایا ۔"[1]

اسی طرح نسیم صاحبہ کے اس بیان میں بھی جو جناب تسکین قریشی نے اپنے مکتوب میں جگر سے ان کے عقد ثانی کے سلسلے میں نقل فرمایا ہے ، صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ

" اصغر صاحب لاہور میں ملازم ہو گئے تھے .... جب میں وہاں اپنے والد کے ساتھ پہنچی تو میری بہن نے بہت اصرار کے ساتھ اور بہت ضد کے ساتھ میرا نکاح کر دیا[2] ۔"

اور ان کے والد کے متعلق جن کے ہمراہ نسیم لاہور گئی تھیں جناب سید رشید احمد صاحب رقمطراز ہیں :

" چھٹن (بیگم اصغر -- یعنی نسیم کی بڑی بہن) نے ۱۹۲۷ء میں قیام لاہور کے دوران اصغر کو باصرار تمام اپنی چھوٹی بہن نسیم (نسیم جگر) یعنی مطلقہ جگر کے ساتھ عقد پر آمادہ کر کے انھیں گونڈہ سے بلوایا ۔ گونڈہ سے چودھری حامد حسین نسیم کو ساتھ لے کر لاہور گئے اور وہاں ان کا عقد اصغر کے ساتھ ہوا[3] ۔"

اس بحث سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ چودھری حامد حسین بیگم اصغر و جگر کے والد تھے ۔

اب رہ گیا یہ مسئلہ کہ ان کے خاندان کے دوسرے افراد کون کون تھے تو اس سلسلے میں جناب جگر مرادآبادی کا ایک مکتوب ہماری بڑی رہنمائی کرتا ہے ۔ وہ تسکین قریشی صاحب کو لکھتے ہیں :

" .... آپ کو غالباً میری پریشانیوں کا علم ہو گیا ہوگا ۔ اور اس لیے شاید مجھ سے شکایت بھی نہ ہوگی ۔ واقعات کیا بتاؤں مسلسل دو سال تک علیل رہنے کے بعد میرے برادر نسبتی داغ مفارقت

---

*۔ یہ قبلہ والد صاحب وہی چودھری حامد حسین ہیں جن کے خطوط کا حوالہ اوپر گذر چکا ہے ۔

۱۔ خط نسیم خاتون (اہلیہ اصغر) بنام سید مرتضیٰ علی صاحب مرقومہ ۲۹ اگست ۱۹۳۷ء

۲۔ مکتوب جناب تسکین قریشی بنام جناب ڈاکٹر احمر رفاعی مرقومہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۳ء بحوالہ " جگر آثار و افکار " ۔ ص ۳۷

۳۔ مکتوب جناب سید رشید احمد بنام مقالہ نگار مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء

دے گئے ـ میری اہلیہ کا خاندان بہت ہی مختصر سا ہے ـ لے دے
کے دو بھائی* دو بہنیں ـ اب ایک ہی بھائی رہ گئے ہیں ـ[۱]،،

ان حقائق کی روشنی میں جناب بشیر احمد صدیقی کی رائے زیادہ قرین قیاس اور مرجح نظر آنے لگتی ہے ـ

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسئلہ کی نوعیت یہی ہے جیسا کہ تفصیلاً ثابت کیا گیا ہے تو " معاشقہ ،، (تحریر جناب سید رشید احمد) اور " ترغیبیں پھر اپنی پوری قوت سے ان کو کھینچنے کو تیار تھیں ،، کشاکش شروع ہوئی ،، (بحوالہ تحریر جناب صغیر احمد صدیقی) ، کی توجیہہ کیوں کر کی جائے گی ـ

میرے خیال میں مسئلہ کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہے ـ اس کی طرف تو بہرحال جناب بشیر احمد صدیقی نے بھی اشارہ فرمایا ہے " کہ ماں کا تعلق ممکن ہے ارباب نشاط سے رہا ہو ،، اگر ایسا ہے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ متاہلانہ زندگی کے باوجود ، مدتوں ایک خاص ڈھب کی زندگی گزارتے گزارتے ، اس کی آزادی پسندی اور آزاد مزاجی ایک دم سے ختم نہیں ہوئی ہوگی ـــ غیرمردوں سے ہنس بول لینا ان کی نظر میں معیوب نہیں ہوگا ـــ ممکن ہے ان کا گھر " رقص و سرود و موسیقی " کا مرکز اور " تہذیب مجلسی ،، کی تربیت گاہ ہو اور شوقین مزاج حضرات تفنن و تفریح کے لئے جمع ہوتے ہوں ـ اس طرح اصغر وہاں پہنچے ہوں اور چھٹن سے راہ و رسم پیدا ہو گئی ہو ـ جس نے واقعتاً " معاشقہ ،، کی شکل اختیار کر لی ہو یا جسے لوگوں نے " معاشقہ ،، کا نام دے دیا ہو ـــــ خواہ کچھ بھی ہو اس " تعلق خاطر ،، کا انکار ممکن نہیں رہا یہ کہ اس " تعلق خاطر ،، کی نوعیت کیا تھی ـ آیا یہ کہ یہ تعلق تمام شرعی و اخلاقی حدود سے گزر کر " ناجائز تعلقات " کے حدود میں داخل ہو گیا تھا / یا محض " معصوم تعلق ،، تھا ـ اس کے متعلق کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی ـ اگر یہ " معصوم تعلق ،، تھا جب بھی اس " پریشان نظری ،، کا کوئی جواز نہیں سوا اس کے کہ یہ تسلیم کر لیا کہ جوانی کی افتاد اور بری صحبت نے ان

---

*ـ دو بھائیوں کے نام باقر احمد (سلّی) اور عبدالخالق (حاجی گلّی) تھے ـ باقراحمد صاحب بڑے تھے اور گونڈے میں ضلعدار تھے ـ لاولد انتقال کیا ـ حاجی گلی کے دو بچے ہوئے ـ بڑا بیٹا تھا جس کا نام نیاز احمد ہے ، چھوٹی بیٹی ـ بیٹی کا نام کنیز فاطمہ ہے ـ کنیز فاطمہ کی شادی چودھری حامد حسین صاحب کے نواسے (یعنی بھانجے ثامن علی کے صاحبزادے) محسن علی کلرک ، کلکٹری کچہری گونڈہ سے ہوئی ـ نیازاحمد اور محسن علی دونوں مع اپنے اپنے کنبوں کے نسیم خاتون بیوہ جگر کے ساتھ ، جگر منزل گونڈہ میں اب بھی موجود ہیں ـ بحوالہ انٹرویو نسیم خاتون ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء بمقام گونڈہ)ـ اصغر کے خاندان میں صرف اللہ کا نام رہ گیا ہے جس کا کلمہ پڑھنے والا کوئی نہیں رہ گیا ـ

۱ـ مکتوب جگر مرحوم بنام جناب تسکین قریشی مرقومہ ۱۹۳۲ء بحوالہ " مکاتیب جگر ،، مطبوعہ ملک ایڈ سنز اردو بازار دہلی ـ اشاعت اول مارچ ۱۹۶۲ء ص ۲۰

کو غلط راہ پر ڈال دیا تھا ۔ لیکن یہاں بھی انھوں نے " ثواب کی راہ نکال لی " اور آخر میں اس کو شریک حیات کی حیثیت سے قبول کر لیا ۔ البتہ پہلی بیوی سے ان کی کشیدگی اور عملاً " قطع تعلق " بہت حیرتناک اور افسوسناک سانحہ ہے ۔[1]

ممکن ہے اصغر نے شروع ہی سے پہلی بیوی میں حسن صورت و حسن سیرت کی کوئی کشش نہ پائی ہو اور جب ان کا چھنی سے تعلق قائم ہوا ہو تو بیوی نے سختی و بیزاری دکھائی ہو ۔ چوں کہ ان کے دل میں پہلے ہی سے بیوی کے لئے کوئی محبت نہیں تھی ، اس سخت رویے نے رسمی تعلق کو بھی نفرت و بیزاری میں بدل دیا ہو ۔ اس کے برخلاف چھنی کی طرف ان کا میلان خود ہوا تھا ، ادھر سے بھرپور جواب ملا تھا ، ان میں اپنا بنا لینے کی بہت سی خوبیاں تھیں اس لیے اصغر ان کی طرف کھنچتے چلے گئے ہوں ۔

دوسری وجہ طبیعتوں کا اختلاف بھی ہو سکتا ہے یعنی میاں بیوی کا رشتہ مزاج کے جس باہمی " توافق اور ہم آہنگی " کا متقاضی ہے اس کا فقدان ہو ۔ ورنہ اصغر جن کی زندگی کے ہر شعبہ میں سنجیدگی ، احساس ذمہ داری ، دوسروں کے ساتھ نباہ دینے کا رویہ نظر آتا ہے ، بیوی کے معاملہ میں اتنا غیر سنجیدہ ، غیر ذمہ دارانہ " بلکہ نامنصفانہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ سوا اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی ۔

جس نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارا کیا گیا ہے اسکی تصدیق اصغر کے اس خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو ان کی تائید ، موافقت و مدافعت میں اسی قسم کے ایک واقعہ کے سلسلے میں لکھا تھا ۔ واقعہ یہ تھا کہ مولانا عبدالماجد نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی ۔ اس پر ان کے خلاف مولوی رفیع صاحب جو نیاز فتحپوری صاحب کے خویش تھے ، شانتی پریس الہ آباد سے ایک پمفلٹ ، عبدالماجد دریابادی بے نقاب "[2] کے نام سے شائع کرا دیا تھا ۔ اس کے علاوہ بھی اخباروں میں بہت کچھ لکھا گیا تھا جس میں

۱۔ " مستوں نے اور راہ نکالی ثواب کی " ۔ یعنی اپنی وضع داری کو قائم رکھی اور آخر میں اسی سے شادی کر لی ، پورے کنبہ کو راہ راست پر لگا دیا ۔

۲۔ حاشیہ نمبر ۵ نقل مکتوب جناب اصغر گونڈوی بنام مولانا عبدالماجد دریابادی ۔ اس خط کی تاریخ کا تعین مولانا نے بعض اندرونی شہادتوں کی بنیاد پر ۱۹۳۱ء کی پہلی ششماہی تحریر فرمایا ہے ۔ حاشیہ میں ایک جگہ " ہمت " لکھنؤ کے ذکر کے سلسلے میں تحریر فرمایا ہے " لکھنؤ کا یہ روزنامہ سید جالب دہلوی کی وفات کے بعد سید حسن ریاض کی ادارت میں نکل رہا تھا " جناب جالب دہلوی مرحوم کا انتقال ۱۰ جون ۱۹۳۰ء کو ہوا ۔ اس طرح یہ خط ۱۰ جون ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء کی پہلی ششماہی کے درمیان کی کسی تاریخ کا ہوگا ۔

خیال یہ تھا کہ خواجہ حسن نظامی اور علامہ نیاز فتح پوری جیسے بزرگ بھی شامل ہیں ــ اس واقعہ کا (مولانا کے خلاف پریس پروپیگنڈے کا) جو ردعمل اصغر پر ہوا ـ اس کے جو تاثرات بزبان قلم صفحۂ قرطاس پر بکھر گئے ہیں ، ان سے اصغر کی نفسیات کے بعض بہت ہی اہم اور پوشیدہ گوشے بے نقاب ہو گئے ہیں ـ خط بڑا طویل ہے اس کا صرف متعلقہ حصہ درج کیا جاتا ہے :

" مکرمی السلام علیکم ـ اس معاملے میں متعدد بار لوگوں سے تلخ اور سخت گفتگو کی نوبت آ چکی ہے .... ایک شخص ہے جس نے اپنی بیوی کو طلاق دیا ہے ـ طلاق کا مفہوم نارضامندی اور علیحدگی ہے ـ کیا غضب ہے کہ نارضامندی کا فیصلہ اہل ملک کرنے لگیں ـ اگر یہی دستور رہا تو کسی شخص کو نکاح و طلاق کے معاملے میں مطمئن نہیں رہنا چاہیے ـ ممکن ہے کہ جس طرح لوگ طلاق کو طلاق تسلیم نہیں کرتے اسی طرح نکاح کو نکاح تسلیم نہ کریں اگر طلاق کے لیے صرف نارضامندی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ بیوی کے معائب ایک ایک کر کے اہل ملک کو تسلیم کرائے جائیں تو یقیناً نکاح کے وقت ایک رسالہ جس میں بیوی کے محاسن درج ہوں شائع کرانا پڑے گا ـ اسکے بعد بھی ممکن ہے کہ اہل ملک اسے کافی سمجھیں یا نہ سمجھیں ـ[1] "

اس خط میں اصغر ، مولانا کے پردے میں در اصل اپنی صفائی پیش کر رہے ہیں ــ یعنی وہ طلاق اور علیحدگی کے لئے صرف نارضامندی کو کافی سمجھتے ہیں ــ اور یہی " نارضامندی " ان کو اپنی پہلی بیوی سے تھی ــ جنھیں شرع کے مطابق انھوں نے طلاق تو نہیں دی البتہ " معلق " چھوڑ دیا تھا ـ جو شرعاً ممنوع ہے ـ قرآن کا واضح حکم ہے :

فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ

(لہذا ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر میں لٹکتا چھوڑ دو) ـ[2]

۱ـ مکتوب اصغر بنام مولانا عبدالماجد دریابادی (مرقومہ ۱۰ جون ۱۹۳۰ء تا وسط ۱۹۳۱ء کے درمیان کی کوئی تاریخ) ـ

۲ـ النساء ـ آیت ۱۲۸ـ ترجمہ از تفہیم القرآن ـ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ـ جلد اول مطبوعہ تعمیر انسانیت ـ لاہور ۱۹۵۷ء ـ ص ۲۰۳

یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کے لئے اصغر کے پاس کوئی معقول عذر نہیں - یہ ان کے دامان عصمت پر ایک بدنما دھبہ ہے[1] ---- اگر بیوی پسند نہیں تھی یا خود ان کی اپنی زبان میں اس سے " نارضامند " تھے تو اس کو طلاق دے دیتے - مگر کون جانے کہ کیا اسباب مانع آئے - ہو سکتا ہے کہ معاشرہ کی ناپسندیدگی کا خیال ، خاندانی روایات کا دباؤ ، مطلقہ ہونے کے باوجود اہلیہ اصغر کابعض وجوہ کی بنا پر صابر و شاکر رہنا ، لڑکیوں کے مستقبل کے خیال سے دبے بیٹھے رہنا ، طلاق کی صورت میں معاشرہ میں قدر کھو دینا اور اسی قسم کے دوسرے عوامل نے اصغر کو طلاق دینے اور اہلیہ اصغر کو طلاق لینے سے روک دیا ہو -

قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چھٹن کے روپ میں اصغر کو ان کے " خیالوں کی رانی " مل گئی ، ان کو پا کر وہ بہت خوش تھے اور ان کے تعلقات بڑے خوش گوار اور اچھے تھے اور کیوں نہ ہوتے ایک طرف حسن تھا - حسن سیرت ، مزاجوں میں مناسبت و ہم آہنگی وفا پیشگی و سلیقہ شعاری --- دوسری طرف حسن نظر - یعنی اصغر کا اپنا انتخاب - لہذا دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے کے لئے معذور و مجبور - دونوں ایک دوسرے کے بال باندھے غلام - حسن اور حسن نظر سے اٹھے ہوئے فتنوں نے دونوں کو قریب تر کر دیا[2] -
اس کی تصدیق جناب سید رشید احمد کی تحریر سے بھی ہوتی ہے - وہ لکھتے ہیں :

> " اصغر کا یہ فیصلہ و انتخاب ظاہری حسن اور شکل کے برعکس محض کردار و عمل کے باطنی اوصاف پر کیا گیا تھا - جس کے نتیجے میں ان کو کبھی پچھتانا نہیں پڑا - ان کی متاہلانہ زندگی پر سکون و خوشگوار بسر ہوئی .... اصغر کی بی بی کو خانہ داری کے کاموں میں ، گھر کی ترتیب و صفائی اور کھانا پکانے کا اچھا سلیقہ تھا ...
> .... وہ معمولی دال روٹی کے پکانے میں بھی اپنی خوش ذوقی و ہنرمندی سے وہ لطف و ذائقہ پیدا کر دیتی جو دوسروں کے یہاں پلاؤ قورمہ میں بھی نصیب نہ ہوتا -"[3]

۱- " یہ تھا اک بدنما دھبہ مرے دامان عصیاں کا " جگر

۲- وہ شوخ بھی معذور ہے مجبور ہوں میں بھی کچھ فتنے اٹھے حسن سے کچھ حسن نظر سے
اصغر

۳- مضمون جناب سید رشید احمد مطبوعہ چٹان لاہور شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء -
ص ۱۷

تیسری شادی (۱۹۲۶ء) -

ان تمام باتوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اصغر نے نسیم (مطلقہ جگر) سے تیسری شادی کر لی - یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اصغر صاحب کی متاہلانہ زندگی خوشگوار تھی ، اور وہ چھٹی کو پا کر خوش تھے تو انھوں نے تیسری شادی چھوٹی بہن سے کیوں کی - وہ بھی اسطرح کی پہلے اس کو جگر سے طلاق دلوائی پھر خود بڑی بہن کو طلاق دے کر اس سے شادی کرلی - بادی النظر میں اس واقعہ سے بوئے ملامت آتی ہے - اور اس میں " زرخیز اذہان[1] " کی قیاس آرائیوں کے لئے کافی سامان موجود ہے - چنانچہ لوگوں نے " چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند " کے مصداق بڑی بڑی افسانہ طرازیوں سے کام لیا ہے - ذیل میں ان افسانہ طرازیوں و قیاس آرائیوں کا احاطہ کر کے ان کا تجزیہ کیا گیا ہے پھر حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے -

اس سلسلے میں جناب شہاد الاسلام صاحب کا ایک مضمون ۲ دسمبر ۱۹۶۸ء کے مشرق میں " جگر مرادآبادی کی غزل گوئی کے خارجی محرکات " کے عنوان سے شائع ہوا ہے - اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں :

" تذکرہ تو مجھے کرنا ہے جگر کی شاعری کا لیکن اس کے محرکات کا
جناب اصغر کی ذات سے کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر "

ان کے جذبات کسی نہ کسی " ذات سے برافروختہ رہے ہیں .... اصغر کا شعر ہے ؎

" بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دارو رسن برپا کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہر درخشاں کو "

میں جگر اور اصغر کی ذات کو اس شعر میں حل ہوتے دیکھتا ہوں - اگر ایسا نہیں تو پھر اس واقعہ کا کس طرح تجزیہ کیا جا سکتا ہے جو ان دو حساس طبع انسانوں اور شاعروں میں ظہور پذیر ہوا - دونوں میں بیوی میں بیوی میں یکجا تھے - اصغر کی نظر کسی طرح جگر کے رفیقۂ حیات پر پڑی اور وہ ان پر دل و جان سے فریفتہ ہو گئے ....
یہ جذب محبت جو یقیناً یک طرفہ تھا یہاں تک پہنچا کہ اصغر زبان حال سے چیخ چیخ کر

۱- ڈرامہ ماڈرن انار کلی - تحریر پروفیسر محمد اقبال مرزا -

صدا دینے لگے ؎

لباس زہد پھر ہوتا ہے نذر آتش صہبا کہاں کھوئی ہوئی ہے جرأت رندانہ برسوں سے[1]

جن کے وجود نے یہ شعر کہلوائے ہوں شاید ان تک تو یہ نہ پہنچے - لیکن "محبت کی خاموش چنگاریاں ہیں" یہ جگر پر قیامت ڈھا گئے اور کچھ ایسی حالت پیش آئی کہ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس ہستی کو جس کی جاذبیت نے یہ چنگاری اصغر کے خرمن حیات میں فروزاں کر دی تھی اس کو اصغر کی نذر کر دیا جائے -

کیا یہ فیصلہ خود جگر نے کیا؟ کیا اس سلسلے میں اصغر نے ان پر کوئی اثر نہیں ڈالا؟ کیا اس میں اس ہستی سے بھی مشورہ کیا گیا جو ان محرکات کا باعث ہوئی تھی؟ - یہ مسائل مزید تجسس کے محتاج اور ادیبوں کی کاوش و توجہ کے قابل ضرور ہیں -

مضمون میں جو بنیادی سوال اٹھائے گئے ہیں ان پر تفصیلی بحث سے پہلے بعض تسامحات کی وضاحت ضروری ہے -

(۱) اصغر کبھی میں بیوی نہیں گئے - جن اصغر کا نام مین پوری کے سلسلے میں آتا ہے وہ ایک دوسرے بزرگ تھے جو مختار اور آنریری مجسٹریٹ تھے، وہیں کے رہنے والے تھے- مین پوری میں جگر کے وہی کفیل تھے - ان کا جگر کا ساتھ دوران قیام مین پوری میں ۱۵، ۱۲ سال[2] (۲۳-۱۹۲۲ء تا ۱۹۳۸ء) رہا - ان کا انتقال ۲۱ نومبر ۱۹۴۲ء کو ہوا[2] -

(۲) جن بیوی پر کسی طرح نظر پڑنے کا انکشاف کیا گیا ہے وہ ۱۳-۱۹۱۲ء سے آخر دم تک مستقل طور پر اصغر کے ساتھ رہیں - اس سلسلے میں جناب سید رشید احمد صاحب رقمطراز ہیں :

> "ان کی چھوٹی سالی نسیم بھی ان کے (اصغر کے) گھر میں خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے شروع ہی سے رہتی تھیں - جگر سے جب ان کا عقد ہو گیا اس زمانہ میں بھی وہ بدستور جگر کے ساتھ اصغر ہی کے گھر میں رہیں اور جگر سے طلاق حاصل کرنے کے بعد بھی[3] -"

۱- فاضل مضمون نگار سے شعر نقل کرنے میں تسامح ہو گیا ہے - اصل شعر یوں ہے :
"لباس زہد ہوتا کاش نذر آتش صہبا کہاں کھوئی ہوئی جرأت رندانہ برسوں سے"

۲- بحوالۂ مکتوب جگر بنام سید مرتضیٰ علی (بلا تاریخ) - جس میں جگر صاحب نے شیر ان سے اپنے تعلق خاطر کی مدت ۱۵، ۱۲ سال تحریر فرمائی ہے - اس خط کا حوالہ اوپر گذر چکا ہے -

۳- جگر آثار و افکار - مقالہ پی ایچ ڈی - جناب احمر رفاعی - سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ص ۵۳

۴- چٹان شمارہ ۳۱ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۱۵

اس کی تصدیق خود جگر صاحب کے بیان سے بھی ہوتی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

"اصغر صاحب کے مجھ پر بہت احسانات ہیں ۔ ان کے گھر کا ماحول بہت مذہبی تھا ۔ میں نے بھی شادی کرلی ۔ اصغر صاحب کی بیگم اور میری بیگم سگی بہنیں ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔[1]"

(۳) جس وجود تک اصغر کے نہ پہنچنے کا ذکر کیا گیا وہ دس سال تک ان کے حبالہ عقد میں رہا ۔ یہ تو تھا جملہ معترضہ اور فروعی باتیں ان سے ہٹ کر مضمون میں بعض باتیں ایسی کہی گئی ہیں جو یقیناً تحقیق طلب ہیں اور جن کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔ مثلاً یہ کہ

(۱) جگر کی بیوی (نسیم) پر اصغر دل و جان سے فریفتہ ہو گئے
(۲) جگر نے بیوی کو اصغر کی نذر کر دیا
(۳) اس ہستی سے ، جو ان کی شعری محرکات کا باعث ہوتی تھی ، مشورہ نہیں کیا گیا ۔

قریب قریب اسی قسم کی باتیں جناب ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے لکھی ہیں ۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :

"اسی زمانہ میں جگر کی زندگی میں ایک اور انقلاب آیا ہوا یہ کہ اصغر کے اشارے پر جگر کی شادی اصغر کی چھوٹی سالی نسیم سے ہوگئی ۔ جگر کے لئے نسیم وحیدن کا بدل تھیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن نکہت و نشاط کا یہ زمانہ شعلۂ مستعجل ثابت ہوا ۔ اصغر اور جگر کے مزاج کے اختلاف نے نسیم و جگر کو باہمی زندگی کے لطف اٹھانے کا زیادہ موقع نہ دیا ۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ اصغر صاحب جن کے متعلق کہا جاتا ہے وہ خود نسیم کے شیدائیوں میں تھے جگر کی ناز برداری نہ کر سکے ۔ جگر صاحب نسیم کو طلاق دینے پر مجبور ہو گئے اور اصغر نے نسیم سے شادی کر لی ۔[2]"

عبارت بالا میں جو دعوے کئے گئے ہیں اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے خود نہیں کئے کسی اور سے نقل کئے ہیں لیکن اس سے دعووں کی معنویت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ اس لئے ان

۱۔ نسیم کے دور طلاق کی روداد ، جگر مرادآبادی کی زبانی از قیسی الفاروقی ۔ قومی آواز ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۲ ۔ بحوالہ جگر حیات اور شاعری ۔ ص ۷۷

۲۔ "جگر کے شاعرانہ مرتبہ کا تعین" از ڈاکٹر فرمان فتحپوری ۔ نگار پاکستان فروری ۱۹۶۲ء ص ۳۲-۳۳ ۔

کا تجزیہ کر کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

(۱) اصغر نسیم کے شیدائیوں میں تھے

(۲) (اسی لئے وہ) جگر کی ناز برداری نہ کر سکے اور جگر صاحب طلاق دینے پر مجبور ہو گئے -

اور (۳) اصغر نے خود نسیم سے شادی کرلی -

جناب احسان دانش نے بھی آغا شورش کشمیری ، مدیر چٹان سے ، ایک انٹرویو کے دوران میں کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا - ان کی عبارت بڑی طویل ہے لیکن اس کی طوالت کو صرف اس لیے گوارا کیا گیا ہے کہ اس میں بعض ایسی بے سروپا اور بے بنیاد باتیں کہی گئی ہیں ، جن سے اصغر ، جگر اور نسیم کے متعلق بڑی غلط رائے قائم ہوتی ہے - ان تمام باتوں سے تفصیلی بحث کی تو یہاں گنجائش نہیں ہے اس لیے بعض غیر اہم اور غیر ضروری باتوں کو حاشیے میں واضح کر دیا گیا ہے اور بحث کو صرف اصل موضوع تک محدود رکھا گیا ہے - اقتباس درج ذیل ہے :

" جگر گھوم پھر کے عینکوں کی ایجنسی کرتے (تھے) اصغر گونڈوی نے اپنے یہاں رکھ لیا اور جگر ان کے مرید* ہو گئے - اصغر اور تاجور کے باہم مراسم تھے - اصغر لاہور آئے تو اپنی سالی نسیم کے لئے کسی اچھے رشتہ کی خواہش کی - تاجور نے کہا رشتہ خود تمہارے یہاں موجود ہے .... پوچھا کون؟ کہا جگر - اصغر چپ سے ہو گئے اور عذر کیا لیکن تاجور نے راضی کر لیا اور شادی ہو گئی[۱] .. .. اصغر کی بیوی نے اچانک محسوس کیا کہ ان کے میاں ان کی بہن .... سے التفات کرتے ہیں .... بات جگر تک پہنچ گئی .... جگر کے لئے دو راستے تھے - بیوی یا مرشد - جگر نے بیوی کو چھوڑ دیا مرشد کے ہو گئے - اصغر

---

*- استعارۃً درست ہے - واقعتاً ایسا نہیں ہے - راقم الحروف نے جب احسان صاحب کی توجہ اس غلطی کی طرف دلائی تو انھوں نے فرمایا " یہ میں نے نہیں کہا - میں جانتا ہوں وہ قاضی عبدالغنی رح کے مرید تھے - گفتگو ۷ اپریل ۱۹۷۰ء

۱- یہ تمام باتیں غلط ہیں - نسیم و جگر کی شادی نہ تاجور کی تجویز و ایماء پر ہوئی نہ لاہور میں ہوئی - ان کی شادی ۱۹۱۹ء میں گونڈہ میں اصغر کی سعی و کوشش سے ہوئی - اصغر و جگر لاہور اوائل ۱۹۲۲ء میں آتے ہیں - اس وقت نسیم کی طلاق کو ۲، ڈھائی سال ہو چکے تھے -

کی بیوی نے دیکھا کہ جگر نے اپنے استاد[1] کے لئے اس کی بہن کو
طلاق دے دی تو اس نے بہن کے لئے شوہر سے طلاق حاصل کرلی
گویا اصغر کی بیوی مطلقہ ہوگئی اور جگر کی بیوی اصغر کی اہلیہ
بن گئیں[2]۔"

مندرجہ بالا عبارت میں تین باتیں کہی گئی ہیں :

(۱) اصغر کو نسیم سے عشق تھا ۔

(۲) جگر نے یہ بات محسوس کر لی اور مرشد کے حق میں بیوی سے دست بردار ہو گئے ۔

(۳) اصغر کی اہلیہ نے جو جگر کا ایثار دیکھا تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں چنانچہ انھوں نے بہن کی خاطر شوہر سے طلاق لے لی ۔

ان تمام مختلف حضرات نے (جس کے حوالے اوپر گذر چکے ہیں) نسیم و اصغر کی شادی کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

(۱) اصغر کو نسیم سے عشق تھا ۔ (جناب ضیاء الاسلام ۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری احسان دانش)

(۲) اسی لئے انھوں نے جگر سے طلاق دلوائی ۔ (ڈاکٹر فرمان فتحپوری)

(۳) جگر نے مرشد کے حق میں بیوی کو چھوڑ دیا ۔ (احسان دانش ۔ ضیاءالاسلام)

(۴) اہلیہ اصغر نے جگر کے ایثار و قربانی سے متاثر ہو کر بہن کے حق میں شوہر سے طلاق لے لی ۔ (احسان دانش)

(۵) اس معاملۂ خاص میں نسیم سے مشورہ نہیں کیا گیا ۔

انھیں باتوں کو بنیاد بنا کر جناب عزیز احمد نے " تصویر شیخ[3] " کے نام سے ایک افسانہ لکھ مارا ہے ۔ جس میں اگرچہ کرداروں کے نام بدلے ہوئے ہیں لیکن پس منظر سے جو

۱۔ اصغر استاد نہیں تھے ، ہاں معنوی طور پر جگر نے ان سے فیض پہنچا" اٹھایا ہے ۔
۲۔ انٹرویو جناب احسان دانش از آغا شورش کشمیری ۔ مطبوعہ چٹان لاہور ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء ص ۱۲
۵۔ یہی بات جناب ڈاکٹر منوہر سہائے انور نے بھی ظاہر کی ہے لیکن اپنی طرف سے نہیں دوسروں کے حوالے سے نقل کی ہے ۔ فرماتے ہیں " لوگ کہتے تھے کہ جگر نے اصغر کی سہولت کے لئے انھیں کے حکم سے اپنی اہلیہ کو طلاق دی تھی " ـــ نگارش جلد ۵-۶، جگر نمبر ص ۳۱۔ انھیں کی سہولت کے لئے طلاق دی تھی ۔ غلط ہے ۔ تفصیلی بحث آگے آئے گی ۔
۳۔ مطبوعہ " اردو ادب " لاہور ۔ جلد اول ۔ مکتبہ جدید ۔ کراچی لاہور ۔ ص ۱۳۹۱۲۶

تصویریں ابھرتی ہیں وہ اصغر جگر اور نسیم* ہی کی ہیں -

ان تمام مضامین و تحریرات میں اصغر کے عشق کو نسیم و جگر کی علیحدگی کا بنیادی سبب ٹھہرایا گیا ہے خواہ یہ علیحدگی اصغر کے زور دینے سے ہوئی یا جگر کے از خود کنارہ کشی کر لینے سے - اس لیے سب سے پہلے جگر اور نسیم کی طلاق کا اصل سبب معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی - اس سلسلے میں معتبر ترین روایت جگر ، نسیم اور اصغر کی ہوگی اس کے بعد ان کے قریب ترین احباب کی - اس بارے میں اصغر کا تو کوئی قول یا عبارت دستیاب نہیں ہوئی البتہ نسیم خاتون نے واضح طور پرلکھا ہے :

" طلاق لینے کی وجہ ہی یہی تھی کہ ان کی شراب نوشی ، یارباشی اور گھر سے یکسر غفلت سے طبیعت عاجز تھی[1] -"

جگر صاحب نے تفصیل سے دو جگہ روشنی ڈالی ہے - پہلی عبارت جناب تسکین قریشی کے خط سے نقل کی جاتی ہے جس کو انھوں نے جگر صاحب کے الفاظ میں اس طرح لکھا ہے :

" .... جب اصغر نے دیکھا کہ میری رندی و سرمستی بڑھتی جاتی ہے تو اس خیال سے کہ علایق کا بار پڑے گا تو کچھ ہوش آ جائے گا نسیم خاتون سے عقد کرا دیا - ان سے پہلے دریافت کر لیا تھا .... مگر میری شراب نوشی اور سیاحی کا وہی عالم رہا - نسیم خاتون کو شراب سے سخت اذیت ہوتی تھی - میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا خود اپنا ہوش نہیں تھا اپنی اہلیہ کی کیا خبرگیری کر سکتا تھا .... جب اصغر نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ میری حالت ناقابل اصلاح ہو چکی ہے تو پھر طلاق کے لئے کہا اور طلاق ہوگئی[2] -"

دوسری جگہ قیسی الفاروقی نے جگر صاحب کی زبانی یوں تحریر فرمایا ہے :

" اصغر صاحب کے مجھ پر بہت احسانات ہیں - ان کے گھر کا ماحول مذہبی تھا - میں نے یہیں شادی کر لی - وہ زمانہ میری شہرت کا

---

*- کرداروں کے نام - بسم اللہ شاہ معروف بجولوی - (اصغر گونڈوی) میاں واجد (جگر) اور سکینہ (نسیم) ہیں -

۱- بحوالہ جواب نسیم خاتون ، ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء بمقام گونڈہ -

۲- مکتوب جناب تسکین قریشی بنام جناب ڈاکٹر احمر رفاعی ۱۸ ستمبر ۱۹۵۹ء - بحوالہ - جگر آثار و افکار - ص ۲۴

وہ تھا عشرت میں بسر ہوتی تھی .... میں لاپرواہ تھا اور بہت کم گونڈہ میں رہتا تھا .... جدائی کی اصل وجہ شراب تھی اور ہر اعتبار پر مزاج کا اختلاف بھی تھا [۱]۔"

طلاق کے سلسلے میں جناب بشیر احمد صدیقی کا خیال بھی قریب قریب یہی ہے انھوں نے فرمایا :

" جگر صاحب بہت پیتے پلاتے تھے اور اسی حالت میں ان کو (نسیم) مارتے بھی تھے ۔ اس پر ان کی بڑی بہن نے اعتراض کیا ۔ جگر صاحب نے غصہ میں آ کر طلاق دے دی [۲]۔"

جناب بابو بندیشوری پرشاد صاحب تقدیر گونڈوی بیان فرماتے ہیں :

" جگر بکثرت شراب پیتے تھے .... وہ بے حد پریشان بھی رہتے تھے ان کی پریشانیوں کو دیکھ کر اصغر صاحب نے اپنی سالی سے جگر کی شادی کرا دی ۔ لیکن جگر کی بے راہ روی کم نہ ہوئی ۔ نسیم کو ان کی اس عادت سے بڑی الجھن ہوتی تھی ۔ جگر صاحب ان کے جان و عفت کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے ۔ اس لیے اصغر صاحب نے مجبوراً نسیم کو جگر سے طلاق دلوائی [۳]۔"

جناب سید رشید احمد صاحب نے تحریر فرمایا ہے :

" اصغر کی سالی .... نسیم کے ساتھ جگر کا عقد ہوگیا .... جب کبھی انھیں گونڈہ کی قید و بند سے آزادی نصیب ہوتی وہ جی بھر کر اس کا انتقام لینے میں نہ چوکتے اور ایسے گم و لاپتہ ہوتے کہ مدتوں گونڈہ والوں کو ان کا سراغ نہ ملتا ۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کی بیوی ان سے برگشتہ ہوگئیں ......

۱۔ حیات جگر کا ایک باب حضرت جگر کی زبانی از قیس الفاروقی قومی آواز ۔ ص ۲ بحوالہ جگر مرادآبادی ۔ حیات اور شاعری ۔ ص ۷۹

۲۔ گفتگو جناب بشیراحمد صدیقی از مقالہ نگار ۲۰ مئی ۱۹۶۸ء ۔ " پینے پلانے کو تو طلاق کا سبب ، سبھی نے لکھا ہے لیکن مارنے پیٹنے اور غصہ میں آ کر طلاق دینے کی شہادت کہیں اور سے نہیں ملتی "

۳۔ جگر معاصرین و مخلصین کی نظر میں ۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد اسلام مطبوعہ نظامی پریس لکھنو ۱۹۶۲ء ۔ ص ۳۶---- بابو بندیشوری پرشاد گونڈہ کے رہنے والے تھے ۔ جگر کو اس وقت سے جانتے تھے جب وہ گونڈہ میں نووارد تھے ۔ جب ۳۹-۱۹۳۸ء میں جگر مستقلاً گونڈہ آ گئے (*) وہ زندہ تھے ۔ یہ گفتگو انھیں سے تقدیر صاحب نے کی تھی ۔ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ××

(*) تو تقدیر صاحب بقید حیات تھے ۔ وہ گونڈہ میونسپل بورڈ کے چیئرمین تھے ۔ ڈاکٹر محمد اسلام جون ۱۹۶۲ء گونڈہ تشریف لے گئے تو ××

اس لیے وہی ہوا کہ انھوں نے مرض لا علاج سمجھ کر چار ہی سال
میں جگر سے طلاق حاصل کرلی ۔[۱]"

یہی بات جناب نواب سید شمس الحسن صاحب نے بھی تحریر فرمائی ہے ۔ ان
کی عبارت درج ذیل ہے :

" جگر صاحب زندگی کی ناکامیوں کے اثر سے رندانہ مسلک اختیار کر
چکے تھے اور خاندانی تباہی ، ترک وطن اور معاشقہ کی نامرادیوں
نے انھیں افراط میکشی کی طرف مائل کر دیا تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ وہ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے اہل نہیں رہے
اور نسیم صاحبہ کی زندگی دوبھر ہوگئی اور نوبت یہاں تک پہونچی
کہ جذباتی کشاکش میں نسیم صاحبہ نے خود ان کے رندانہ مسلک سے
عاجز ہو کر ، جگر صاحب سے ، اصغر صاحب پر دباؤ ڈلوا کر طلاق
لے لی ۔[۲]"

اسی کی تصدیق جناب محمود علی خان جامعی کی تحریر سے بھی ہوتی ہے ۔
وہ لکھتے ہیں :

" ان کی آزاد مزاجی اور شراب نوشی سے آپ کی بیوی اور دوسرے
اعزہ عاجز آ گئے تو اصغر صاحب نے انھیں طلاق دلوا دی[۳]۔"

ان تمام معتبرترین روایات سے جو بات منقح ہو کر سامنے آئی وہ صرف اتنی ہے
کہ مزاجوں کے اختلاف اور عدم مناسبت ، جگر کی شراب نوشی ، آوارہ گردی اور لاابالیانہ
طرز زندگی سے تنگ آ کر نسیم نے بڑی بہن سے کہا ۔ خود بڑی بہن نے بھی ، جو انھیں
کے ساتھ ایک گھر میں رہتی تھیں اپنی آنکھوں سے نسیم کی ویران زندگی دیکھتی تھیں اور بہن کی
حالت زار کا ان کے دل پر بڑا اثر تھا ۔ ادھر اصغر بھی تمام کیفیت دیکھتے ۔ اندر ہی
اندر گھٹتے اور کڑھتے تھے اور خود کو بڑی حد تک مجرم اور ذمہ دار[۴] سمجھتے تھے ۔ انھوں

۱۔ چٹان لاہور شمارہ ۱۷ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۹
۲۔ جگر مرادآبادی جلد اول (غیر مطبوعہ) از نواب سید شمس الحسن ۔ ص ۵۳
۳۔ تذکرہ جگر ۔ از محمود علی خان جامعی مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی بار اول
۱۹۶۱ء ۔ ص ۲۳
۴۔ نسیم کی شادی گھر والوں کی مرضی کے خلاف ، اصغر صاحب نے جگر سے کرائی تھی ۔
(جواب نسیم خاتون ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء)

انھوں نے اصلاح کی تمام ممکن تدابیر بھی کیں لیکن جب کوئی تدبیر کارگر ہوتی نظر نہ آئی اور بقول جگر " جب اصغر نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ حالت ناقابل اصلاح ہو چکی تو پھر (بڑی بہن کے مجبور کرنے پر) طلاق کے لئے کہا اور طلاق ہوگئی "

آگے بڑھنے سے پہلے جگر کے اقتباس کے اس چھوٹے سے ٹکڑے " تو پھر طلاق کے لئے کہا " کی بلاغت اور معنویت کی طرف اشارہ ضروری ہے ۔ اس معمولی سے جملے میں جہاں ایک طرف جگر کے اصلاح احوال سے ، بے بسی ، مجبوری اور مایوسی کی انتہا نظر آتی ہے، وہیں نسیم اور ان کی بڑی بہن کے زبردست دباؤ سے تنگ آ کرسپر ڈال دینے کی کیفیت دکھائی دیتی ہے تو تیسری طرف نسیم سے اصغر کے " مرعوبہ و مہینہ عشق " سے برأت کا بھی اعلان و اظہار ہو جاتا ہے ۔ اس بات کی تصدیق و توثیق کہ " اصغر نسیم پر عاشق نہیں تھے " جناب تسکین قریشی کے مکتوب سے بھی ہوتی ہے ۔ جو انھوں نے مقالہ نگار کو اس کے استفسار پر تحریر فرمایا تھا ۔ وہ لکھتے ہیں :

" یہ بات بھی غلط ہے کہ اصغر نسیم پر فریفتہ تھے ۔"[1]

ان شواہد سے جہاں یہ ثابت ہو گیا کہ اصغر نسیم پر عاشق نہیں تھے اورنہ عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر انھیں جگر سے طلاق دلوائی تھی ، وہیں یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ جگر نے بیوی اور مرشد[2] میں سے نہ خود مرشد کا انتخاب کیا تھا نہ مرشد کے حق میں بیوی سے دست بردار ہوئے تھے ۔ بلکہ اصغر کے احسانات ، ان سے حددرجہ عقیدت اور سب سے بڑھ کر اپنے غلط اور غیر ذمہ دارانہ روش کے تحت مجبور ہو گئے کہ اصغر کے اشارے پر بیوی کو طلاق دے دیں ۔

دراصل اس ساری افسانہ طرازی کو تقویت اس بات سے پہونچی کہ اصغر نے نسیم (مطلقہ جگر) سے شادی کر لی ۔ عام لوگوں کی نظریں ان حالات و اسباب تک تو پہونچیں نہیں جن کے تحت طلاق ہوئی تھی ۔ چنانچہ جب انھوں نے اصغر کو طلاق کا محرک پایا تو قدرتی طور پر یہ بھی تسلیم کر لیا کہ " اصغر کا نسیم کو طلاق دلانا اور پھر شادی کر لینا ، نسیم سے عشق کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے " ۔ ~~اسے تسلیم کر لیا گیا~~ ۔ یہ تو واضح ہو گیا کہ طلاق دلانے میں اصغر کا صرف اتنا ہاتھ ہے کہ انھوں نے نسیم اور ان کی بڑی بہن کی رائے پر عمل درآمد کرایا ۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ انھوں نے نسیم سے شادی کیوں کی

۱۔ مکتوب جناب تسکین قریشی بنام مقالہ نگار ۔ مرقومہ ۲۸ جنوری ۱۹۷۰ء ۔

۲۔ اصغر جگر کے پیر بھائی تھے مرشد نہیں تھے ۔

وہ کیا حالات اور وجوہات تھے جنھوں نے اصغر کو اتنا زبردست قدم اٹھانے پر مجبور کیا اور جسکی بنیاد پر لوگوں کو ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں بنانے اور پھیلانے کا موقع ملا ۔

بات دراصل یہ تھی کہ اہلیہ اصغر کسی مرض[1] کی وجہ سے بحیثیت بیوی کے فرائض کی انجام دہی سے معذور تھیں ، انھیں ایک طرف اصغر کا خیال تھا[2] ۔ دوسری طرف بہن کی بیکسی اور ویران زندگی کا احساس[3] تھا ۔ تیسری طرف اولاد کی شدید خواہش[4] (سکن ہے اس میں اصغر کی خواہش بھی شامل ہو) ، یہ احساسات انھیں گھن کی طرح کھائے جا رہے تھے ۔ ان تمام مسائل کا حل ان کے ذہن میں یہ آیا کہ خود اصغر سے طلاق لے لیں ۔ اور نسیم سے ان کی شادی کر دیں ۔ شروع شروع میں اصغر اس بات پر بالکل آمادہ نہیں ہوتے تھے اور اس کو برابر ٹالتے رہے ۔ یہاں تک کہ دوران قیام لاہور میں یہ مسئلہ ایک بار پھر بڑی شدو مد کے ساتھ اٹھا اس بار اصغر کو سپر ڈالنا پڑی اور ان کی نسیم سے شادی ہوگئی ۔

اس بات کی تصدیق جناب سید رشید احمد کی تحریر سے ہوتی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" بیگم اصغر سے کوئی اولاد نہیں تھی اور ان کو اولاد کی بڑی آرزو و تمنا تھی ۔ ان کے ذہن میں حصول اولاد کی یہ عجیب تدبیر آئی کہ وہ خود اصغر سے طلاق لے کر اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ ان کا عقد کرا دیں .... وہ ایک عرصہ سے اصغر کو مجبور کر رہی تھیں مگر اصغر کسی طرح اس بات پر رضامند نہ ہوتے تھے .... (بیگم اصغر) اپنی عرض و معروض کو بے نتیجہ دیکھ کر بالآخر دوران قیام لاہور میں اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ گئیں اور کھانا پینا ترک کر دیا ۔ اصغر بڑے رقیق القلب انسان تھے وہ اس جبر کی تاب نہ لا سکے ۔ مجبوراً انھوں نے

۱۔ بحوالہ مکتوب جناب تسکین قریشی بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲۸ جنوری ۱۹۷۰ء
۲۔ اصغر کی شرعی اور جسمانی ضرورت کا خیال جیساکہ ڈاکٹر منوہر سہائے انور کی تحریر سے واضح ہوتا ہے ۔ وہ رقمطراز ہیں " میں نے بطریق شائستہ نکاح کی مصلحت پوچھی تو انھوں نے فرمایا " میری اہلیہ میرا وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کے قابل نہیں رہی تھیں اور میں دوسرا نکاح کرنے پر مجبور تھا " (نگارش امرتسر جلد ۵-۶ ۔ جگر نمبر ص ۳۱)
۳۔ مکتوب جناب تسکین قریشی ۲۸ جنوری ۱۹۷۰ء
۴۔ چٹان لاہور شمارہ ۳۱ جولائی ۱۹۶۷ء نمبر ص ۱۵

بی بی کی ضد کے آگے سپر ڈال دی جس کے نتیجۃ میں انھیں شرعاً طلاق دے کر اپنی سالی نسیم یعنی مطلقۃ جگر کو عقد میں لینا پڑا[۱]۔"

میرے استفسار پر قریب قریب یہی باتیں جناب تسکین قریشی نے بھی اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمائیں ۔ انھوں نے لکھا " ان کی بیوی یعنی اصغر کی بیوی نے البتہ ان سے زبردستی طلاق حاصل کر کے ان کا عقد نسیم سے کرا دیا تھا کیوں کہ ان پر نسیم کی بیکسی کا بڑا اثر تھا اور وہ خود کسی عارضہ میں مبتلا ہو کر بیوی کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے سے معذور ہو چکی تھیں[۲]۔"

بیگم اصغر کی بیماری اور عارضہ کا پتہ نسیم جگر کے اس خط سے بھی چلتا ہے جو انھوں نے جناب تسکین قریشی کے استفسار پر ان کو اصغر سے اپنی شادی کے متعلق لکھا تھا اور جسے جناب تسکین قریشی نے اپنے مکتوب بنام جناب ڈاکٹر احمر رفاعی میں بجنسہ نقل فرمایا ہے ۔ خط کی عبارت درج ذیل ہے :

" اصغر صاحب لاہور میں ملازم ہو گئے تھے اور میری بہن وہاں چلی گئی تھیں ۔ میں اپنی ماں کے یہاں گونڈہ میں رہتی تھی ۔ لاہور میں اصغر صاحب سے طے کر کے کہ وہ میری بہن کو طلاق دے کر مجھ سے عقد کر لیں انھوں نے مجھے اور ہمارے والد کو لاہور سے خط لکھا کہ میں بیمار ہوں آپ آ جائیے اور میری بہن کو ضرور ساتھ لائیے کیونکہ کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے ۔ جب میں وہاں اپنے والد کے ساتھ پہونچی تو میری بہن نے بہت اصرار کے ساتھ اور بہت ضد کے ساتھ میرا نکاح کر دیا اور خود میرے والد کے ساتھ گونڈے چلی آئیں[۳]۔"

قریب قریب یہی جواب نسیم خاتون نے مقالہ نگار کے اس استفسار پر کہ

" انھوں نے (بڑی بہن نے) اصغر صاحب کو مجبور کر کے خود طلاق لے لی اور ان سے آپ کی شادی کر دی ۔ کیا یہ درست ہے؟ "

لکھ بھیجا :

" یہ صحیح ہے ۔ بڑی بہن کو اختلاج قلب کی شکایت برابر رہا کرتی تھی ۔" (انٹرویو نسیم خاتون ۔ ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء ۔ بمقام گونڈہ)

۱۔ چٹان لاہور شمارہ ۳۱ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۵
۲۔ مکتوب جناب تسکین قریشی [illegible] بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲۸ جنوری ۱۹۷۰ء
۳۔ مکتوب جناب تسکین قریشی بنام جناب ڈاکٹر احمر رفاعی مرقومہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۳ء بحوالہ جگر آثار و افکار ۔ مقالہ پی ایچ ڈی ۔ جناب احمر رفاعی ۔ سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۔ ص ۳۶

نسیم سے شادی کے سلسلے میں ڈاکٹر منوہر سہائے انور نے خود اصغر کا قول نقل فرمایا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" میں نے بطریق شائستہ اصغر سے نکاح کرنے کی مصلحت دریافت کی تو انھوں نے کہا میری اہلیہ میرا وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کے قابل نہیں رہی تھیں اور میں دوسرا نکاح کرنے پر مجبور ہو گیا تھا [۱] ۔"

جناب سید رشید احمد نے شادی کی وجہ بیگم اصغر کی اولاد کی شدید خواہش ٹھہرایا ہے (حوالہ اوپر گزر چکا ہے) اور مقالہ نگار نے اس میں اتنا اضافہ کر دیا تھا کہ" شاید اس خواہش میں اصغر کی خواہش بھی شامل تھی "۔۔۔ اس کا ثبوت اصغر کے اس مختصر سے جواب میں پنہاں ہے جو انھوں نے جناب رشید احمد صدیقی کو اس موقع پر دیا تھا جب وہ (اصغر) بیماری کی حالت میں ان کے چھوٹے بچے احمد کو باوجود ملازم کے منع کرنے اور اصرار کے کہ میں لے چلتا ہوں ، نہیں مانے اور خود لے کر گئے اور ویسے ہی واپس آئے اور جب ان سے پوچھا گیا کہ یہ آپ نے کیا کیا تو بڑی سادگی سے یہ کہا :

" میں نے احمد کو دیکھا آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اسے دیکھ کر میرے دل پر کیا اثر ہوا اوّل تو میں یہ بھول گیا کہ میں بیمار اور ضعیف ہوں دوسرے دل میں ایک عجیب فخر آمیز پندار پیدا ہوا کہ احمد بہو سے کہیں زیادہ دلکش اور پیارا ہے ذرا میری بدحواسی تو دیکھئے ۔ میں نے بہو کے والدین سے بھی کہہ دیا کہ احمد نے بہو کو زیر کر دیا ۔ چنانچہ جس فاتحانہ انداز کے ساتھ میں گیا اس سے کہیں زیادہ فاتحانہ فخر و مباہات سے آیا ۔ احمد نے میری ایک کمی پوری کر دی [۲] ۔"

" احمد نے میری ایک کمی کو پورا کر دیا "۔ میں اولاد کی کتنی شدید خواہش چھپی ہوئی ہے اس کا سمجھنا کچھ دشوار نہیں ہے جبکہ اس واقعہ کو اس پس منظر میں

۱۔ نگارش امرتسر جلد ۵-۶ ۔ جگر نمبر ص ۳۱ ۔۔۔ شادی کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے اصغر کی عمر کا بھی اندازہ لگایا ہے اور لکھا ہے کہ " مجھے ٹھیک معلوم نہیں کہ اس وقت اصغر کی کیا عمر تھی بہرحال وہ پچاس یا پچپن سال کے نظر آتے تھے "۔۔۔ عمر کے اس اندازے سے خواہ مخواہ یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ایک پچاس پچپن سالہ شخص کو ایسی کون سی ضرورت شادی کی لاحق ہو گئی ۔ یہ آدمی نفس پرست ہے ۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا اندازہ بالکل غلط ہے اس وقت ان کی عمر بمشکل ۳۰ ، ۳۱ سال کی تھی ۔

۲۔ گنج ہائے گراں مایہ از جناب رشید احمد صدیقی ۔ مطبوعہ نیو فرینڈز پبلشر ۔ اردو بازار راولپنڈی ۔ بار سوم ۱۹۳۹ء ۔ ص ۱۰۸

دیکھا جائے کہ اصغر کے سات لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوئیں - کوئی نرینہ اولاد نہیں ہوئی[1]
اس بحث سے یہ ثابت ہو گیا کہ اصغر کی نسیم سے شادی کے پیچھے عشق کا
ہاتھ نہیں تھا جیسا کہ بعض لوگوں نے لکھا ہے بلکہ حسب ذیل اسباب تھے :

(۱) اہلیہ اصغر "وظیفۂ زوجیت" کے ادا کرنے سے قاصر تھیں -

(۲) اصغر کو دوسرے نکاح کی سخت ضرورت تھی -

(۳) میاں اور بیوی دونوں کو بچے کی شدید تمنا و آرزو تھی -

(۴) نسیم کی ویران زندگی کو آباد کرنا مقصود تھا -

شادی کے اصل محرک اصغر نہیں ان کی بیگم تھیں -- ہاں اتنا ضرور تھا کہ
شروع میں اصغر راضی نہیں تھے لیکن جب جائز ضرورتوں نے (اولاد کی خواہش ، جنسی
جذبہ کی تسکین) مجبور کیا تو رضامند ہو گئے -

اصغر نے یہ شادی کب کی - صحیح تاریخ معلوم نہ ہو سکی - سید رشید احمد صاحب
نے صرف اتنا لکھا ہے :

" قیام لاہور کے دوران ۱۹۲۷ء میں .... انہیں (چھٹن
اپنی بیوی کو) شرعاً طلاق دے کر اپنی سالی نسیم یعنی مطلقہ بیگم
جگر کو عقد میں لینا پڑا[2] -"

لیکن کوئی حتمی تاریخ نہیں لکھی -

یہی بات وہ اپنے مکتوب مرقومہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۹ء بنام مقالہ نگار میں لکھتے ہیں :

" چھٹن (بیگم اصغر) نے ۱۹۲۷ء میں قیام لاہور کے دوران
اصغر کو باصرار تمام اپنی چھوٹی بہن ضمیر (نسیم جگر) یعنی
مطلقہ بیگم جگر کے ساتھ عقد پر آمادہ کر کے انہیں گونڈہ سے بلوایا
.... اور وہاں ان کا عقد اصغر کے ساتھ ہوا -"

ڈاکٹر منوہر سہائے انور کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ۱۹۲۷ء کے وسط
یا اواخر کا ہے - وہ تحریر فرماتے ہیں :

" ۱۹۲۷ء کے اواخر میں .... اردو مرکز کے مالی کفیل
(میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز) نے دست کشی کر لی - یہ

۱- جواب نسیم خاتون ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء بمقام گونڈہ

۲- چٹان لاہور - شمارہ ۳۱ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۱۵

حالت دیکھ کر پہلے جگر ، پھر یاس اور آخر میں اصغر لاہور سے
چلے گئے .... جگر کے چلے جانے کے بعد اصغر
نے سر عبدالقادر کی کوٹھی میں جگر کی اہلیہ (مطلقہ جگر) سے
نکاح کر لیا [1]۔"

لیکن جیسا کہ پچھلے صفحات میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ اصغر ۱۲ مارچ کو
لاہور سے جا چکے تھے اور ۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء کو گونڈہ پہونچ چکے تھے - لہذا یہ شادی
جنوری/فروری ۱۹۲۶ء اور ۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء کے درمیان کی کسی تاریخ میں ہوئی ہوگی-

یہاں اس مسئلہ کو چھوڑنا کہ جگر نے نسیم کو کب طلاق دی اور انکے کتنی مدت
کے بعد اصغر نے ان سے شادی کی اگرچہ بے موقع معلوم ہوتا ہے لیکن اس پر روشنی ڈالنے
کی یوں ضرورت محسوس ہوئی کہ بعض لوگوں نے اس التباس سے کہ " طلاق کے فوراً بعد اصغر
نے نسیم سے شادی کرلی " یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ " اصغر کو نسیم سے عشق تھا "
اس لئے اصغر اور نسیم کی شادی کی تاریخ کا تعین ضروری ہو جاتا ہے -

سطور بالا میں ذکر ہو چکا ہے کہ اصغر اور نسیم کی شادی کی حتمی تاریخ
کسی نے نہیں لکھی - البتہ سید رشید احمد صاحب اور ڈاکٹر منوہر سہائے انور کے بیان
سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ شادی لاہور میں ہوئی - اصغر کا قیام لاہور میں وسط جنوری
فروری ۱۹۲۶ء تا ۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء رہا (جیسا کہ مقالے میں ثابت کیا گیا ہے) لہذا
شادی اسی مدت میں کسی تاریخ کو ہوئی ہوگی - ذیل میں ڈاکٹر منوہر سہائے انور اور
جناب سید رشید احمد کے بیانات کی تنقیح و تعدیل ، اور بعض شواہد کی روشنی میں شادی
کی تاریخ کے تعین کی کوشش کی جاتی ہے -

رشید صاحب اور ڈاکٹر منوہر سہائے انور دونوں نے شادی کا واقعہ ۱۹۲۷ء لکھا
ہے (اقتباسات سطور بالا میں دیے جا چکے ہیں) - البتہ ڈاکٹر منوہر نے " واقعہ شادی
کو جگر کے لاہور سے چلے جانے کے بعد کا لکھا ہے [2]۔"

ڈاکٹر منوہر سہائے انور کی یہ بات تو درست معلوم ہوتی ہے کہ " شادی جگر کے
جانے کے بعد ہوئی " لیکن یہ کسی طرح صحیح نہیں کہ جگر ۱۹۲۷ء کے اواخر میں لاہور
سے واپس گئے ہیں ---- حقیقت یہ ہے کہ جگر بمشکل تمام تین چار ماہ رہنے کے بعد جون
۱۹۲۶ء تک واپس جا چکے تھے - میرے اس خیال کی تصدیق و تائید جناب قیصر مرادآبادی

۱- نگارش امرتسر جلد ۵، ۲ - جگر نمبر - ص ۳۱

۲- ایضاً

کی حسب ذیل تحریر سے ہوتی ہے - وہ لکھتے ہیں :

" .... امتحان سے فارغ ہو کر جون تک
مرادآباد آ گیا .... ایک روز میں اپنے عزیز دوست
مرزا عابد علی بیگ صاحب کے گھر بیٹھا ہوا جگر صاحب کی
باتیں کر رہا تھا .... جگر صاحب کے اشعار
جھوم جھوم کر پڑھتے ہوئے میں نے گھوم کر جو دیکھا تو جگر
صاحب میرے پیچھے کھڑے ہیں [1] -"

اقتباس بالا سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ جون/ ۱۹۲۶ کے حدود میں جگر مرادآباد پہنچ چکے تھے - اس خیال کی تائید جناب بشیر احمد صدیقی کے بیان سے بھی ہوتی ہے - میرے استفسار پر کہ

" آپ نے فرمایا کہ لاہور میں اصغر صاحب نے ان کو (جگر صاحب کو)
مارا - آپ کے علم میں کیسے آیا ؟"

صدیقی صاحب نے جواب دیا :

" اصغر صاحب نے خود فرمایا - جگر ایک آدھ ماہ (لاہور میں)
رہنے کے بعد بہت گھبرائے جانے پر مصر تھے جس پر اصغر صاحب نے
تادیبا" مارا - اس وقت تو رک گئے لیکن قیاس ہے کہ دو چار مہینے کے
بعد ہی چلے گئے [2] -"

سطور گذشتہ میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ اصغر لاہور وسط جنوری اور وسط فروری ۱۹۲۶ء کے درمیان کسی تاریخ کو آئے - جگر اس کے بعد پہنچے [3] (یعنی مارچ کے حدود میں) اس پر اگر دو چار مہینے بڑھا دیئے جائیں (جیسا کہ بشیر صدیقی نے فرمایا ہے) تو جگر صاحب کی لاہور سے واپسی ماہ جون ہی میں آتی ہے .... اب اگر ڈاکٹر منوہر سہائے انور کے اس قول کو درست تسلیم کر لیا جائے کہ شادی جگر کے جانے کے بعد ہوئی ،

۱- جگر اور اسکی شاعری - مرتبہ انور حارث - بار اول ۱۹۲۲ء - ص ۲۱۱-۲۰۵
۲- گفتگو جناب بشیر احمد صدیقی از مقالہ نگار بتاریخ ۲۳ مئی ۱۹۲۹ء بمقام عائشہ بوانی کالج - کراچی
۳- گفتگو جناب جلیل قدوائی از مقالہ نگار ۱۸ مئی ۱۹۲۹ء بمقام حسینی ڈسلوا ٹاؤن - ناظم آباد - کراچی

(حوالہ اوپر گزر چکا ہے) تو اسکے معنی یہ ہوئے کہ اصغر و نسیم کی شادی جون جولائی ۱۹۲۶ء کے حدود میں ہوئی -

اس قیاس کو نسیم خاتون کے بیان سے تقویت ملتی ہے -

میرے استفسار پر کہ

" اصغر صاحب سے آپ کا عقد لاہور میں ہوا - اندازاً عقد کے کتنی مدت بعد آپ لوگ لاہور سے ہمیشہ کے لیے آ گئے تھے؟ "

نسیم خاتون نے جواباً لکھا :

" اصغر صاحب سے عقد لاہور میں ہوا تھا - اسکے ٹھیک ایک سال کے بعد الہ آباد آ گئے تھے -[1] "

نسیم خاتون کے اس بیان کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو شادی کی تاریخ مارچ ۱۹۲۶ء ماننا پڑے گی (اصغر ۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء کو واپس گئے ہیں) ، جو کسی طرح درست نہیں- مارچ (وسط جنوری تا وسط فروری) کے حدود میں تو اصغر لاہور آئے ہیں ، اتنی جلدی شادی کیسے ہو سکتی ہے --- نیز اس میں جگر کی واپسی کی شرط بھی پوری نہیں ہوتی (جگر تو خود مارچ کے حدود میں پہنچے ہیں) --- لہذا یہ واقعہ مارچ کے بہت بعد .... (یعنی تین چار ماہ -- جون جولائی ۱۹۲۶ء) کا ہونا چاہیے -

اس تمام بحث سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ

(۱) اصغر جنوری و فروری کے حدود میں لاہور آئے -

(۲) جگر کہیں مارچ تک لاہور پہنچے --- اور جون کے حدود میں واپس چلے گئے

(۳) اصغر اور نسیم کی شادی جگر کے واپس جانے کے بعد جون جولائی ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ ہوئی -

"اس قیاس اور اندازے" سے ڈاکٹر منوہر سہائے انور کی یہ بات بھی کہ " جگر کے جانے کے بعد شادی ہوئی " --- پوری ہو جاتی ہے اور نسیم خاتون کا یہ اندازہ بھی کہ " ٹھیک ایک سال کے بعد الہ آباد آ گئے ، بھی غلط نہیں رہتا - اس لیے کہ شادی کے بعد

۱- انٹرویو از نسیم خاتون بمقام جگر منزل گونڈہ ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء بوقت ۳ بجے دن ----- یہ انٹرویو جناب سید رشید احمد ، ابو سرائے فیض آباد (جس کے دولت کدے پر میں مقیم تھا) اور میرے رفیق شفیق جناب افضل علی شیخ ، ریسرچ اسکالر پونا یونیورسٹی (بھارت) نے میرے مرتب کئے ہوئے سوالنامے کی روشنی میں لیا تھا - یہ سوالنامہ مع جواب نسیم بیگم مقالہ نگار کے پاس محفوظ ہے - اس پر نسیم خاتون اور ان کے بھتیجے نیاز گونڈوی کے دستخط موجود ہیں -

۸۰ ۹ ماہ کے قیام کو سرسری اندازے کے مطابق ایک سال کہا جا سکتا ھے -*

میری مذکورہ بالا خیال سے جناب سید رشید احمد نے بھی اتفاق فرمایا اور بعد میں اپنے خیال (کہ شادی ۱۹۲۷ء میں ھوئی) سے رجوع کر لیا - اور میری سوالنامے کے جواب میں جہاں بہت سی باتوں سے اتفاق فرمایا یہ بھی لکھ کر دیا :

" صبیر (نسیم جگر) سے اصغر کا نکاح لاھور میں وسط تا اواخر ۱۹۲۶ء میں ھوا تھا[1]"

اوپر ھم نسیم اور اصغر کی شادی کی تاریخ کا تعین کر چکے ھیں اب اگر یہ معلوم ھو جائے کہ جگر نے نسیم کو طلاق کب دی تو یہ مسئلہ حل ھو جاتا ھے -

اس سلسلے میں جناب سید رشید احمد کی تحریر سے بڑی مدد ملتی ھے - وہ تحریر فرماتے ھیں :

" نسیم کا عقد جگر کے ساتھ ۱۹۱۹ء میں گونڈہ میں ھوا -
۴/۵ سال بعد ۱۹۲۳ء میں طلاق ھوگئی -[2]"

نسیم جگر نے بھی شادی اور طلاق کی درمیانی مدت پانچ سال لکھی ھے - یہ خط انھوں نے تسکین قریشی صاحب کے استفسار پر کہ جگر سے آپ کی شادی کب ھوئی ، طلاق کتنے دنوں کے بعد ھوئی ، اصغر سے شادی کس سنہ میں ھوئی؟ کے جواب میں لکھا تھا - جس کا خلاصہ جناب تسکین قریشی نے ڈاکٹر احمر رفاعی کو حسب ذیل صورت میں لکھ کر بھیجا :

" (۱) شادی کے ۵ سال کے بعد جگر نے طلاق دی تھی -
(۲) ۸ سال تک مطلقہ رھیں -
(۳) دس سال تک اصغر کے عقد میں رھیں -[3] "

---

*- نسیم خاتون کو سال و ماہ کا کوئی اندازہ نہیں ھے - اپنے دوران تحقیق میں یہ احساس ھوا کہ ان کے بیشتر " اندازے " غلط ھیں - ان کے انھیں " اندازوں " کو تسلیم کیا گیا ھے جن کی تصدیق دوسری تاریخی شہادتوں سے ھوتی ھے - مقالہ نگار

۱- تحریر جناب سید رشید احمد ، بر استفسارات مقالہ نگار ، محررۃ مئی جون ۱۹۷۰ء ابو سرائے فیض آباد - یہ جوابات مقالہ نگار کے پاس موجود ھیں -

۲- مکتوب جناب سید رشید احمد بنام مقالہ نگار مرقومہ ۱۳ مارچ ۱۹۷۹ء

۳- مکتوب جناب تسکین قریشی بنام جناب ڈاکٹر احمر رفاعی مرقومہ ۲۰ جنوری ۱۹۶۳ء بحوالہ " جگر آثار و افکار " - ص ۶۲

لیکن ان حقائق سے نہ شادی کی تاریخ کا تعین ہوتا ہے نہ طلاق کی ۔ اس لئے ہمیں دوسرے شواہد کا سہارا لینا پڑے گا ۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے نسیم صاحبہ کے قول کا تجزیہ ضروری ہے ۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ۸ سال تک مطلقہ رہیں تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ طلاق ۱۹۱۸ء میں ہوئی (کیونکہ یہ دکھایا جا چکا ہے کہ اصغر سے ان کی شادی وسط ۱۹۲۶ء میں ہوئی) ---- جو صحیح نہیں ہے ۔ تفصیل آگے آئے گی ۔

(۲) اس سے ۵ سال قبل جگر سے شادی ... ہوئی تھی ، کے معنی ہوئے وسط ۱۹۱۳ء میں ۔ جو کسی طرح ممکن نہیں کیونکہ جگر اوائل ۱۹۱۷ء میں گونڈہ پہنچے ہیں گذشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے ---

اس تجزیہ سے مسئلہ سلجھنے کے بجائے الجھ گیا ۔ اس مسئلہ میں حسب ذیل شواہد سے بڑی مدد ملتی ہے :

(۱) مرزا احسان احمد صاحب نے " مقدمہ داغ جگر " میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے :

" وہ (جگر) بھی قاضی صاحب موصوف کی بزم روحانی میں داخل ہوگئے چنانچہ دو برس سے اس آستانہ مبارک کے روحانی فیض سے بہرہ یاب ہو رہے ہیں [1] ۔"

" داغ جگر " کا اشتہار اور اس پر معمولی سا تبصرہ معارف دسمبر ۱۹۲۱ء میں [2] شائع ہوا ہے اس لیے اسکی طباعت اسکے حدود میں (اکتوبر نومبر ۱۹۲۱ء) ہوئی ہوگی اس طرح اس سے دو سال قبل بیعت کی تاریخ اکتوبر نومبر ۱۹۱۹ء نکلتی ہے ۔

(۲) جگر نے بیعت کا واقعہ ماہ صیام جمعۃ الوداع کے روز کا لکھا ہے [3] --- ۱۹۱۹ء میں رمضان کی پہلی تاریخ ۳۱ مئی [4] کو بروز شنبہ پڑی تھی اور جمعۃ الوداع ۲۷ جون

۱۔ مقدمہ داغ جگر ۔ بحوالہ مقالات احسان مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء ۔ ص ۳۷۱
یہاں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ مقدمہ کے حالات مرزا احسان احمد صاحب نے جگر سے خود دریافت کرکے تحریر فرمائے تھے جیسا کہ انھوں نے مقالہ نگار کو وضاحتاً تحریر فرمایا ۔
" میں نے جو حالات اصغر یا جگر صاحب کے متعلق لکھے ہیں وہ سب انھیں لوگوں سے معلوم ہوئے تھے ۔ مکتوب جناب مرزا احسان احمد بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۹ء ۔

۲۔ معارف دسمبر ۱۹۲۱ء ۔ ص ۴۸۰

۳۔ جگر مرادآبادی " حیات اور شاعری " ۔ مقالہ پی ایچ ڈی ۔ جناب ڈاکٹر محمد اسلام ص ۶۰

۴۔ تقویم ہجری و عیسوی مطبوعہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی ۔ ۱۹۵۲ء

(۲۸ رمضان) کو ہوا تھا ۔ اس طرح جگر ۲۸ رمضان ، جمعۃ الوداع کے روز بمطابق ۲۷ جون ۱۹۱۹ء ، عصر کے بعد بیعت ہوئے[۱]۔

(۳) لیکن بیعت ہونے سے پہلے ایک بار ناکام لوٹے تھے ۔ اس وقت قاضی صاحب نے فرمایا تھا " بھائی اب رمضان کا مہینہ آ گیا ۔ جمعۃ الوداع پر آنا اس روز تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیں گے[۲]۔"

" اب رمضان آ گیا " کے دو معنی ہو سکتے ہیں :

(۱) قریب آ گیا ہے ۔ ماہ دو ماہ رہ گئے ہیں ۔

(۲) واقعی رمضان آ گیا ہے ۔ تھوڑا سا صبر کر لو ۔ جمعۃ الوداع کے موقع پر آنا ۔

اس کے معنی کے تعین سے پہلے اس واقعہ کی تفصیل جناب جگر کی زبانی سنیے :

> " بیعت ہونے کے لیے گیا سنہ یاد نہیں ہے مگر حضرت نے بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ رمضان میں آنا ۔ منگلور سے آ کر گونڈہ گیا اور اصغر صاحب سے سب حال بیان کیا ۔ اس کے بعد اصغر صاحب نے موجودہ بیوی نسیم خاتون سے عقد کرا دیا ..... پھر ماہ صیام میں دوبارہ منگلور شریف گیا[۳]۔"

جگر صاحب کا آخری جملہ " پھر ماہ صیام میں دوبارہ منگلور شریف گیا " غور طلب ہے اس سے دو باتیں واضح طور پر سمجھ میں آتی ہیں :

(۱) جگر صاحب بیعت کے لیے شادی کے بعد متصلاً جو رمضان پڑا ہے ، اس میں گئے ہیں ۔

(۲) دوسری یہ کہ اگر رمضان کے مہینے میں واپس آتے تو " ماہ صیام میں دوبارہ .... گیا " نہ کہتے ۔ بلکہ یہ کہتے پندرہ بیس روز بعد یا بیس پچیس روز کے بعد دوبارہ گیا ۔ ماہ صیام کی تکرار و خصوصیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ناکام واپس آنے اور دوبارہ ماہ صیام میں جانے میں وقفہ ہے اور یہ وقفہ ماہ ڈیڑھ ماہ سے زیادہ کا نہیں ہے ۔ ورنہ شاہ صاحب کا یہ جملہ " اب رمضان آ گیا " غلط ٹھہرتا ہے ۔

۱۔ " جگر آثار و افکار " مقالہ پی ایچ ڈی جناب ڈاکٹر احمر رفاعی سندھ یونیورسٹی ص ۲۰

۲۔ جگر مرادآبادی حیات اور شاعری ۔ ص ۲۰

۳۔ مکتوب جناب تسکین قریشی بنام جناب ڈاکٹر احمر رفاعی مرقومہ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۹ء بحوالہ جگر آثار و افکار ۔ ص ۲۰ ۔ یہ عبارت تسکین صاحب نے جگر کے الفاظ میں لکھی ہے ۔

اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ یہ واقعہ (ناکام واپسی کا) زیادہ سے زیادہ اوائل رجب یا آغاز شعبان کا ہوگا۔ اسکے بعد شادی ہوئی ۔ اس مدت کو اگر زیادہ سے زیادہ وسعت دی جائے تو یکم جنوری ۱۹۱۹ء اور ۳۰ مئی ۱۹۱۹ء سے آگے نہیں بڑھتی ۔ یعنی شادی اسی مدت کے درمیان ہوئی ۔ لیکن گمان غالب یہی ہے کہ ۲ اپریل ۱۹۱۹ء (یکم رجب) اور ۳۰ مئی ۱۹۱۹ء کے درمیان کی کسی تاریخ میں ہوئی ۔ اس طرح رشید صاحب کی بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ شادی ۱۹۱۹ء میں ہوئی[۱] ۔ (مکتوب بنام راقم مقالہ ۱۳ مارچ ۱۹۶۹ء) ۔

اس کی تصدیق ایک دوسری شہادت سے بھی ہوتی ہے ۔

جگر صاحب نے ایک خط میں جو سید مرتضیٰ علی صاحب کے نام لکھا ہے ، یہ تحریر فرمایا ہے :

" یہاں ایک خاص ہستی ایسی بھی ہے جس سے قریب قریب ۱۵ ، ۱۶ سال سے خاص قسم کا تعلق خاطر ہے "

یہ خط میں بھی سے لکھا گیا ہے ، جس خاص ہستی کا ذکر اس میں کیا گیا ہے اس سے مراد " شہرانی " ہیں ۔ اگرچہ خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن اس میں بعض واقعات کی طرف اشارات ہیں جن سے خط کی تاریخ کا تعین ہو جاتا ہے ۔ مثلاً انھوں نے لکھا ہے :

(۱) " اسٹیشمین کا وہ اعلان جو اس نے میری موت کی صورت میں شائع کیا ہے قانونی طور پر جرم ہے[۲] ۔ "

(۲) " کانپور میں ایک ذات شہرت سے مقدمہ ہو گیا تھا .... وہ تو کچھئے صلح ہوگئی ۔ موت کی یہ خبر اسی مقدمے کے سلسلہ میں اڑائی گئی تھی ۔ یہ صلح ۲۲ جون ۱۹۳۸ء سے پہلے کی کسی تاریخ میں ہوئی تھی[۳] ۔

۱۔ ڈاکٹر احمر رفاعی نے جگر اور نسیم کی شادی کا تعین ۱۹۱۶ء کیا ہے اور ۱۹۲۱ء سال طلاق لکھا ہے جو غلط ہے (جگر آثار و افکار ۔ ص ۲۵)

۲۔ یہ اعلان ۲ مئی ۱۹۳۸ء کو کیا گیا ۔ لیکن دوسرے روز تردید کر دی گئی ۔ زمانہ کانپور مئی ۱۹۳۸ء ۔ ص ۲۹۳ ۔ بحوالہ " جگر مرادآبادی حیات اور شاعری " ص ۱۱۲

۳۔ خط محمود علی خاں بنام سید مرتضیٰ علی مرقومہ ۲۲ جون ۱۹۳۸ء خط کی متعلقہ عبارت یہ ہے " ابھی مئی کے مہینے میں جگر صاحب دہلی تشریف لائے تھے ۔ اس وقت نواب سردار بیگم اختر کا مقدمہ ان کے خلاف درج تھا "

ان دونوں شہادتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط مئی جون ۱۹۳۸ء کے بعد لکھا گیا ہے -

(۳) " یہاں تک کہ میرا بھائی جو خود مفلسانہ زندگی بسر کرتا ہے جب خود اپنے دام خرچ کر کے مجھے تلاش کرتا ہوا ، خدا جانے کہاں کہاں پہنچا تو دو سو روپے دے گئے --- یہ دو سو روپے علی مظفر صاحب برادر خورد جناب جگر مرادآبادی کو ۲۵/ اکتوبر ۱۹۳۸ء[1] کو دیئے گئے --- لہذا یہ خط ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء کے بعد کی کسی تاریخ کا ہوگا -

جگر صاحب ۱۹۳۸ء کے اواخر میں شیرازن سے اپنے تعلقات کو ۱۵، ۱۲ سال سے خاص قسم کا تعلق خاطر تحریر فرمائے ہیں - اسکے معنی یہ ہوئے کہ اس تعلق کی ابتدا ۲۳-۱۹۲۲ء میں ہوئی -- اتنا بہرحال محقق ہے کہ جگر طلاق کے بعد میں بھی پہنچے ہیں - اس طرح طلاق کا واقعہ ۲۳-۱۹۲۲ء کا ہوا ---- گیا جگر کی شادی کی تاریخ اسطرح بھی ۱۹۱۹ء ہی آتی ہے -

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) جگر گونڈہ اوائل (جنوری فروری) ۱۹۱۷ء میں پہونچے -

(۲) شمیم سے ان کا عقد* یکم جنوری تا ۳۰ مئی ۱۹۱۹ء کے درمیان کسی تاریخ کو ہوا -

(۳) طلاق* ۱۹۲۳ء میں ہوئی --- اس طرح شمیم صاحبہ کا ۵ سال اور رشید صاحب کا ۵/۲ سال درست ہو جاتا ہے -

---

۱- بحوالہ حساب شملہ طور از از یکم جنوری ۱۹۳۸ء تا ۱۱ دسمبر ۱۹۴۰ء -------- مملوکہ جناب نواب سید شمس الحسن - یہ حساب ان کاغذات میں ہے جو سید مرتضیٰ علی صاحب کے یہاں سے نواب صاحب کو موصول ہوئے ہیں ------ اس کے اندراجات حسب ذیل ہیں

(۱)	مبلغ ایک سو اکیاون روپے آٹھ آنے	بذریعہ منی آرڈر	۱۹۳۸/۹/۳۰ء بنام علی مظفر صاحب
(۲)	مبلغ پچاس روپے آٹھ آنے	ایضاً	۱۹۳۸/۹/۱۵ء ایضاً
(۳)	مبلغ دو سو پانچ روپے	نقد	علی مظفر صاحب

*- جناب ڈاکٹر احمر رفاعی کی تحقیق کے مطابق شمیم سے جگر کی شادی کا سال ۱۹۱۶ء اور طلاق کا واقعہ ۱۹۲۱ء کا ہے - یہ دونوں تاریخیں محل نظر ہیں -

اوپر دکھایا جا چکا ہے کہ اصغر سے نسیم کی شادی جون جولائی ۱۹۲۶ء کے درمیان کسی تاریخ کو ہوئی ہوگی ۔ اس طرح نسیم کی جگر سے طلاق اور اصغر سے شادی کی درمیانی مدت کم از کم دو ڈھائی سال بنتی ہے ۔ یہ ایک اور قرینہ ہے اصغر اور نسیم کے درمیان عشق نہ ہونے کا ۔ ورنہ جس شخص کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس نے طلاق ہی اس لیے دلوائی تھی کہ وہ خود نسیم پر دل و جان سے فریفتہ تھا ، اسے دو ڈھائی سال تک انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی ۔ عدت گزر جانے کے بعد فوراً ہی شادی رچا لینا چاہیے تھی ۔[1]

اصغر اور نسیم کے سلسلے میں دو مزید روایتوں کی وضاحت کی ضرورت ہے :

(۱) پہلی یہ کہ بعض لوگوں نے[2] یہ لکھا ہے کہ بیوی کے انتقال کے بعد اصغر نے نسیم سے شادی کر لی ، یہ بالکل غلط ہے ۔ نسیم کی شادی ، بڑی بہن کی موجودگی ایماء اور اصرار پر ہوئی تھی ۔ اصغر سے نسیم کی شادی کے بعد سے ، اصغر کے انتقال تک وہ انھیں کے ساتھ رہیں[3] ۔ اور ان کے انتقال کے بعد اپنے گھر میں (جس گھر میں بعد میں جگر اور نسیم وغیرہ گونڈہ میں اقامت گزیں تھے وہ اصغر صاحب کا تھا) جگر اور نسیم کے ساتھ رہیں اور وہیں ماہ جون ۱۹۶۳ء میں ان کا انتقال ہوا ۔[4]

(۲) دوسری یہ کہ بعض لوگوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ شادی تو ضرور اصغر کی نسیم سے ہو گئی لیکن محبت نسیم کو جگر ہی سے تھی ۔

۱۔ " تصویر شیخ " عزیز احمد مطبوعہ اردو ادب ۔ جلد اول ۔ ص ۱۲۲ ۔۔ یہاں " تصویر شیخ " کا اقتباس شاید بے محل نہ ہو :
" تمھیں سکینہ کو طلاق دینا ہوگی .... طلاق کے بعد بھی کہیں اس میں تمھارا دل نہ اٹکا رہے اس لیے عدت کے زمانہ کے فوراً بعد اس کا نکاح ثانی ضروری ہے .... میں تیار ہوں عدت کے بعد سکینہ سے نکاح کر لوں ۔"

۲۔ تصویر شیخ ۔ اردو ادب ۔ جلد اول ۔ ص ۱۵۷ ۔ " اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے ۔ بشیر فاروق ۔ مطبوعہ جگر اور اسکی شاعری ۔ مرتبہ انور عارف ۔ ص ۲۳۶ ۔
" جگر صاحب " از شاہد احمد دہلوی ۔ کتاب ہذا ۔ ص ۱۲۳

۳۔ چٹان لاہور ۔ شمارہ ۳۱ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۵

۴۔ چٹان لاہور ۔ شمارہ ۷ اگست ۱۹۶۷ء ۔ ص ۹

اس سلسلے میں جناب احسان دانش فرماتے ہیں :

" زمانہ قدم اٹھاتا رہا ۔ اصغر گونڈوی ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں ایڈیٹر ہو کے چلے گئے ۔ وہاں ایک مشاعرہ تھا ۔ جگر بھی الہ آباد گئے اور وہاں اصغر کے پڑوس میں ٹھہرے ۔ دل پر چوٹ لگی ہو تو آواز اور شاعری شعلہ ہو جاتے ہیں ۔ جگر نے دیواروں کو گوش بر آواز کر دیا .... اصغر گھر آئے تو بیوی کو مغموم پایا ۔ سبب پوچھا ۔ بولی کہ جس کا تخیل ہیں وہ اس دیوار کے عقب میں زندگی تباہ کر رہا ہے ۔ اصغر یہ سنتے ہی الٹے پاؤں چلے گئے پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کیا [۱] ۔"

(الف) احسان صاحب نے نسیم اور جگر کی جس باہمی محبت کا ذکر کیا ہے اس سے بحث تو بعد میں آئے گی ۔ یہاں بعض ایسی باتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے جن سے واقعہ کی واقعیت خود مشتبہ ہو جاتی ہے ۔

(۱) جگر الہ آباد میں اصغر کے پڑوس میں ٹھہرے ----- یہ خلاف واقعہ ہے جگر کے نسیم کو طلاق دینے اور اصغر کے ان سے شادی کر لینے کا کوئی برا اثر ان کے (اصغر و جگر) تعلقات پر نہیں پڑا [۲] ۔ بلکہ اس میں روز بروز پختگی آتی گئی ۔ لہذا اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ جگر الہ آباد جائیں اور کہیں اور ٹھہریں --- جگر جب بھی الہ آباد جاتے اصغر ہی کے یہاں ٹھہرتے [۳] ۔

اس بات کی تصدیق جناب شاہد حسن صاحب سوز تاروی نے/جگر اپنی گفتگو ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء کے دوران مقالہ نگار سے کی ۔

(۲) "جگر نے دیواروں کو گوش بر آواز کر دیا " ---- جگر کی ہجو ملیح ہے تعریف و توصیف نہیں ۔ جن لوگوں نے اصغر و جگر کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور دونوں

۱۔ انٹرویو مدیر چٹان از جناب احسان دانش مطبوعہ چٹان لاہور ۔ شمارہ ۲۶ مئی ۱۹۶۹۔ ص ۱۲

۲۔ جگر مرادآبادی حیات اور شاعری ۔ ص ۷۹

۳۔ اصغر از عبدالشکور مطبوعہ سعید برادرز الہ آباد ۱۹۳۵ء ۔ ص ۱۵--- مکتوب اصغر ۱۹۳۵/۲/۱۵ء بنام جلیل قدوائی ، خطوط جگر بنام نواب سید شمس الحسن اور زبانی شہادتیں جناب بشیر احمد صدیقی ، مولانا سراج الحق ، جناب جلیل قدوائی اور دوسرے حضرات ۔

کے تعلقات کی نوعیت کو سمجھتے ھیں ۔ جگر کی مشرقیت ، شرافت نفس ، خوش نظری اور[1] خوش چلنی[2] ، مدھوشی کے عالم میں بھی حفظ مراتب کا لحاظ رکھنے ، تمام شب کی خلوت کے باوجود جوان ، حسین اور محبوب طوائف سے کسی قسم کے تعرض نہ کرنے کی[3] ------ عصمت اور پاکبازی کو جانتے ھیں وہ جگر سے منسوب کی جانے والی اس قسم کی باتوں کو کیسے تسلیم کر لیں ---- جن جگر صاحب کے متعلق ان کے قریب ترین دوستوں کی رائے یہ ھو کہ

" وہ اپنے احباب کے گھر کی خواتین کے معاملہ میں (حد درجة)
معتبر اور قابل اعتماد ھیں ۔[4] "

ان کے متعلق یہ کیسے مان لیا جائے کہ انھوں نے " اپنے پیر و مرشد کی بیوی کے دل میں (مانا کہ جو کبھی ان کی منکوحہ رہ چکی تھیں) آتش محبت بھڑکانے کے لئے اپنی آواز اور شاعری کے شعلے سے کام لیا ھوگا ---- اور اس اللہ کی نیک بندی نے جس کی پاکیزگی کردار و نفس کی گواھی خود جگر دیتے ھیں[5] ۔" عام بیسواؤں کی طرح اپنے شوھر سے جس کی وہ خود پروردہ ، پرداختہ اور تربیت یافتہ ھے یہ کہا ھوگا کہ " میں جس کا تخیل ھوں وہ اس دیوار کے پیچھے زندگی تباہ کر رھا ھے " ---- یہاں یہ اشارہ شاید بے محل نہ ھو کہ یہ شاعرانہ جملہ نسیم کے کردار و مزاج سے قطعاً میل نہیں کھاتا ۔ نسیم صاحبہ بقول جگر " قطعاً آرٹسٹ نہیں[6] " ۔ وہ پرانی وضع کی نیک مسلمان خاتون تھیں[7] ۔ ان کی زبان سے مذکورہ بالا جملے کا اعلان اشخاص متعلقہ کی سیرت و کردار سے ناواقفیت ھی کی بنا پر کرایا جا سکتا ھے ۔

۱۔ جگر اصغر صاحب کو صاحب حال و قال ، اھل دل صاحب کرامت بزرگ اور اپنا پیر و مرشد (استعارةً) ھی سمجھتے تھے -- جگر صاحب نے جناب قیسی الفاروقی سے خود اعتراف کیا ھے " روحانی اور معنوی بلندیوں کا جہاں تک تعلق ھے ان کے لئے تمام تر زندگی کے ساتھ اصغر گونڈوی کی تربیت کا صحیح معنوں میں شکر گزار ھوں " ۔ جگر حیات اور شاعری ۔ ص ۵۸

۲۔ تذکرۂ جگر ۔ محمود علی خان ۔ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ ۔ ص ۳۸

۳۔ جگر آثار و افکار ۔ حصہ اول ۔ ص ۳۰

۴۔ ایضاً ۔ ص ۳۹

۵۔ مکتوب جگر (بلا تاریخ) بنام سید مرتضیٰ علی ۔ عقد ثانی کے فوراً بعد رقمطراز ھیں اس عقد سے میں ھر طرح مطمئن ھوں ۔ قریب قریب یہ سب لوگ دیندار ھیں ۔ فرض شناس ھیں اور اپنے اندر بڑی سے بڑی حد تک خالص اسلامی اسپرٹ کے تحت صداقت رکھتے ھیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال صالحہ کے بدولت انھیں فراست ایمانی اور بصیرت اسلامی عطا فرمائی ھے ۔ "

۶۔ مکاتیب جگر ۔ مرتبۂ مسکین قریشی ۔ بار اول ۱۹۶۲ء ۔ ص ۲۶

۷۔ مکتوب جناب احمر رفاعی بنام راقم الحروف ۳ اپریل ۱۹۷۰ء

(۳) " اصغر یہ سنتے ہی الٹے پاؤں چلے گئے - پھر ادھر کا رخ نہ کیا " ---
گویا بیوی (نسیم) سے قطع تعلق کر لیا --- یہ بھی غلط ہے - نسیم و اصغر کا
قطع تعلق تو رہا ایک طرف ان کی معمولی کشیدگی کا بھی ذکر ان کے کسی جاننے والے نے
نہیں کیا - اس کے برعکس حالات ، قرائن اور تاریخی واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان
کے تعلقات آخر دم تک بہت اچھے رہے اور اسے صرف " اصغر کی موت " ہی نے منقطع کیا۔

تعلقات کی خوشگواری کی تصدیق بیوۂ اصغر یعنی نسیم جگر نے میرے استفسار کے
جواب میں کہ اصغر صاحب کا سلوک بحیثیت شوہر آپ کے ساتھ کیسا تھا؟ - یوں کہا :

" بہت اچھا سلوک رہا "

(استفسارات از بیوہ اصغر بر مکان جناب اصغر گونڈہ ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء)
۳ بجے دن

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں بڑے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے
کہ اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ہوا - احسان صاحب نے صرف سنی سنائی[1] باتوں کو افسانوی
رنگ دے دیا ہے -

(۴) اسی قسم کا واقعہ جناب ڈاکٹر احمر رفاعی صاحب نے بھی اس دعوے کے
ساتھ تحریر فرمایا ہے کہ اس کے راوی[2] خود جگر صاحب ہیں - وہ رقمطراز ہیں :

" ۱۹۲۸ء میں مین پوری کے قیام کے دوران انھیں ایک طویل علالت کا
شکار ہونا پڑا - اس کی ابتدا ایک میعادی بخار کی شکل میں ہوئی
جو رفتہ رفتہ مستقل ہو گیا - یہ کیفیت کئی ماہ جاری رہی .....
.... اسی علالت کے دوران ہی جگر حضرت اصغر کسی
خدمت میں الہ آباد بھی پہنچے جہاں اصغر ہندوستانی اکیڈمی سے
منسلک ہو گئے تھے - رات کو جگر کی طبیعت ذرا زیادہ خراب تھی -

۱- اس واقعہ کے متعلق جب احسان دانش صاحب سے استفسار کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ
" مجھ سے یہ واقعہ خود جگر صاحب نے ، فانی اور جوش کے سامنے بھوپال میں بتایا تھا "
اگر یہ درست ہے جب بھی جگر صاحب کی زبانی کہی ہوئی بات کے مقابلے میں ان کی تحریر
کو ترجیح دی جائے گی -

۲- اس واقعہ کو اگر محض اس بنیاد پر من و عن تسلیم کر لیا جائے کہ جگر صاحب کا خود کا
بیان کردہ ہے تو اس سے جو ان کے بیانات میں تضاد واقع ہوگا اس کی کس طور پر توجیہ کی
جائے گی مثلاً ایک طرف اصغر کے متعلق مرشدی و مولائی کے ذریعہ اظہار عقیدت دوسری طرف
ان کی ایک زبردست " بشری کمزوری " --- نسیم پر اس درجہ عاشق کہ اپنے عقیدت مند سے
طلاق دلوا کر اپنی ہوس پوری کی -- کو چھپانے کی پیہم کوشش - سمجھ میں نہیں آتا کہ
جگر جیسا کھرا انسان ایسے کمزور انسان کو " مرشد " کس منہ سے کہتا ہے - یا تو یہ ماننا

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مسلسل کراہ رہے تھے ۔ ساتھ کے کمرے میں اصغر اور نسیم خاتون
استراحت فرما تھے ۔ اصغر صاحب بیدار تھے ۔ کافی رات گزر چکی
تو انھوں نے محسوس کیا کہ نسیم خاتون کی بھی یہی کیفیت ہے ۔
وہ بھی اک کرب خفی کا شکار ہیں اور مسلسل پہلو بدل رہی ہیں۔
اصغر صاحب نے یہ دیکھ کر ان سے دریافت کیا " کیا نیند نہیں آ
رہی ؟ " نسیم بولیں " جگر جو بیمار ہیں " اس پر اصغر صاحب نے
کہا " ایک بات اور دریافت کروں بتاؤ گی ؟ " انھوں نے جواباً کہا
" فرمائیے " اصغر صاحب نے پوچھا " تمہیں مجھ سے زیادہ محبت ہے
کہ جگر سے ؟ " نسیم نے بغیر تامل کے جواب دیا " جگر سے " اصغر
صاحب اپنے پلنگ سے اٹھے ، نسیم کے قریب پہنچے ان کا ہاتھ تھاما
اور جگر کے کمرے میں آئے ۔ کافی دیر تک مزاج پرسی کرتے رہے اور
خاطر خواہ تسلی و تشفی کرنے کے بعد واپس ہوئے ۔ اس واقعہ سے
متاثر ہو کر جگر نے ایک مسلسل غزل کہی ؎

اف یہ تیغ آزمائیاں تیری ‏ ‏ ‏ ‏ تیری نازک کلائیاں تیری

اس غزل کے آخری اشعار سے اس تمام پس منظر کی صراحت ہوتی ہے ؎

موت سے ہر نفس وہ راز و نیاز ‏ ‏ ‏ ‏ موت کی ہم نوائیاں تیری
ناگہاں آمد آمد محبوب ‏ ‏ ‏ ‏ غم کی بے انتہائیاں تیری
یک بیک آنکھ چار ہو جانا ‏ ‏ ‏ ‏ دیر تک رونمائیاں تیری
نظروں نظروں میں سرگذشت فراق ‏ ‏ ‏ ‏ دونوں جانب دہائیاں تیری
حسن کی لہر پھر سے دوڑا کر ‏ ‏ ‏ ‏ اس کی معجز نمائیاں تیری
پھر وہی چشم مست و جام بدست ‏ ‏ ‏ ‏ پھر وہی نغمہ زائیاں تیری
پھر وہی لب وہی تبسم ناز ‏ ‏ ‏ ‏ پھر وہی کج ادائیاں تیری
پھر وہ اک بیخودی کے عالم میں ‏ ‏ ‏ ‏ مل کے باہم جدائیاں تیری

(حاشیہ از گذشتہ صفحہ)
پڑے گا کہ لفظ " مرشد " منافقانہ اور ریاکارانہ استعمال کیا گیا ہے یا دلی عقیدت کے ساتھ۔
جہاں تک ریا کاری و منافقت کا تعلق ہے تو یہ بڑے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان
میں خواہ اور کوئی کمزوری رہی ہو تو رہی ہو ۔ منافق و ریاکار ہرگز نہیں تھے ۔ اسکی
تصدیق ڈاکٹر منوہر سہائے انور کی تحریر سے ہوتی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں " ان کی زندگی
ایک کھلی کتاب تھی ۔ وہ ریا کے فن میں بالکل کورے تھے " (نگارش امرتسر جلد ۵ ، ۶ ص ۳۰)
حقیقت یہی ہے کہ جگر کو اصغر سے دلی عقیدت تھی ۔ اسکی شہادت ڈاکٹر محمد اسلام ان
الفاظ میں دیتے ہیں " جگر کو اصغر سے عقیدت و محبت دل سے تھی " جگر حیات اور شاعری ص ۱۹۸

اصغر صاحب بہت ہی ذہین آدمی تھے ۔ بیمارپرسی کے بعد جب
وہ اپنے کمرے میں واپس پہونچے تو نسیم سے کہا " میں تمھارے کرب و
اضطراب کی وجہ جان چکا تھا لیکن اگر تم کسی مصلحت کے سبب
میرے استفسار پر حقیقت حال کی پردہ پوشی روا رکھتیں تو ہمیشہ کے
لیے میری نظروں سے گر جاتیں [۱] ۔ "

ہرچندکہ جناب ڈاکٹر احمر رفاعی کا دعویٰ یہ ہے کہ " یہ واقعہ مع اپنی تفصیلات
کے جگر صاحب نے خود مجھ سے بیان کیا " ۔ اس ضمن میں بھی وہی تمام دلائل پیش کئے
جا سکتے ہیں جو اس سے قبل جناب احسان دانش کے بیان کردہ روایت کے سلسلے میں پیش
کئے جا چکے ہیں ۔ ان کے علاوہ غزل میں بعض ایسی اندرونی شہادتیں موجود ہیں جن سے
یہ واقعہ غلط ثابت ہو جاتا ۔

قبل اس کے کہ نظم کا تجزیہ پیش کر کے اصل واقعہ کو معلوم کیا جائے یہ ضروری
معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے مطالعہ میں جو نقائص رہ گئے ہیں ، جن کی وجہ سے نتیجہ
اخذ کرنے میں ان سے غلطی ہو گئی ہے ان کی نشاندہی کر دی جائے ۔

(۱) سب سے پہلی غلطی تو ڈاکٹر صاحب سے یہ ہوئی کہ انھوں نے اس حقیقت
کو نظرانداز کر دیا کہ شاعر نے غزل (نظم) کا عنوان قائم کیا ہے " مسلسل " اور زیر
عنوان لکھا ہے " ایک واقعہ سے متعلق " ۔ جسکے معنی یہ ہیں کہ یہ " پوری نظم " ایک
تاثراتی وحدت ہے ۔ اس لیے اس کا ہر شعر اسی تاثر کی کڑی ہوگا ۔

(۲) دوسری یہ کہ وہ یہ بالکل بھول گئے کہ نظم کے کسی کلیدی شعر ، یا حصہ
کو نظر انداز کر کے " واقعہ " کا جو خاکہ مرتب کیا جائے گا وہ نامکمل اور گمراہ کن ہوگا ۔

نظم کے سرسری مطالعہ سے اتنا تاثر تو قائم ہو جاتا ہے کہ یہ کسی خوش نصیب
عاشق کی داستان ہے جسے کبھی محبوب کی بارگاہ میں تقرب اور اسکی محبت حاصل تھی ۔
پھر نہ جانے کیسے ان میں دوری حائل ہوگئی ۔ لیکن ایک روز اچانک ، محبوب عاشق کی
تنہائیوں میں در آیا --- یہ نظم اسی ملاقات سے پیدا ہونے والے تاثرات کے تحت وجود میں
آئی ہے ۔ لیکن اس میں نظم کا تسلسل نہیں ہے ۔ یعنی اس میں واقعات کی کوئی منطقی
ترتیب یا مربوط ارتقائی سلسلہ نہیں ہے جس سے درجہ بدرجہ اور منزل بہ منزل گزرنے کے بعد
قاری کسی ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں ہر منظر روشن اور ہر واقعہ واضح و صاف ہو ---

---

۱۔ " جگر آثار و افکار " ۔ جناب ڈاکٹر احمر رفاعی ، مقالہ پی ایچ ڈی ۔ سندھ یونیورسٹی
حیدرآباد ۔ ص ۱۱۲-۱۱۰

یہاں تو نظم کی پوری فضا پر پریشان خیالی کا دھندلکا اور روشنی و سایے کی آمیزش و آویزش کا ابہام طاری ہے ایسے غیر واضح واقعاتی پس منظر سے " آنے والے[۱] " (محبوب) کی کوئی ایسی تصویر بنانا جس سے وہ بآسانی پہچان لیا جائے ممکن نہیں ہے تاہم انھیں کج مج اور ژولیدہ خطوط میں سے نسبتاً واضح تر (الفاظ و اشعار کے) خطوط سے کوئی تصویر ابھارنے کی کوشش کی جائے گی ۔ اگر یہ تصویر نسیم کی ہوئی (جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کا دعویٰ ہے) تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس واقعہ کا تعلق نسیم ہی سے ہے ۔ ورنہ یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ کس ذات سے متعلق ہے ۔

نظم کے پہلے چند اشعار میں ناز و نیاز کی جو تصویرکشی کی گئی ہے وہ اتنی عام ہے کہ اس کا مرجع نسیم بھی ہو سکتی ہوں ۔ کوئی ہستی اور بھی ۔

البتہ ساتواں شعر ؎

اف وہ احساس حسن پہلے پہل یک بیک کج ادائیاں توبہ

کا مرجع نسیم کسی طرح نہیں ٹھہرتیں ۔ اس لیے کہ جب نسیم اور جگر کا عقد ہوا ہے نہ جگر کو نسیم کا ہوش تھا نہ نسیم کو جگر کا ـــــ اگر بالفرض " احساس حسن " تسلیم بھی کر لیا جائے تو بیوی کیا کج ادائی دکھائے گی وہ بھی مشرقی جس کا سارا وجود شوہر کے لئے وقف ہوتا ہے ـــــ اس شعر میں اشارہ بیوی کے علاوہ کسی اور ہی ذات کی طرف ہے ۔ جہاں عشق کی گھاتیں اور حسن کی لگاوٹیں اور عشوہ و غمزہ کارفرما ہیں ۔

اسی طرح آٹھویں شعر ؎

الله الله عشق کی وہ جھجک حسن کی کج رہائیاں توبہ

میں " عشق کی جھجک " نسیم کے معاملے میں جب وہ ان کے عقد مناکحت میں تھیں ، سمجھ میں نہیں آتی اگر اس کو طلاق کے بعد کی زندگی سے منسوب کیا جائے تو یہ ماننا لازم آ جاتا ہے کہ اگرچہ نسیم و جگر شرعاً ایک دوسرے پر حرام ہو چکے تھے لیکن وہ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار رہے اور مسلسل آنکھ مچولی کھیلتے رہے یہاں تک کہ دوبارہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے ـــــ یہ بات خلاف واقعہ ہے اور کسی طرح قابل قبول نہیں ہے ۔ اس کے متعلق تو وہ لوگ بھی خاموش ہیں جنھوں نے واقعہ مذکورہ بالا (نسیم سے (ملاقات)) کے صحیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے ۔

۱ـ ناگہاں آمد آمد محبوب

دواں شعر عام ہے ۔ اس کو کسی ذات سے بھی منسوب کیا جا سکتا ہے ۔
گیارھویں تا بیسویں شعر میں جن کیفیات کا ذکر ہے اور ان سے عشق و محبت کی جو داستان ابھرتی ہے اس کے بنیادی خط و خال حسب ذیل ہیں :

(۱) محبوب بظاہر عاشق پر غصہ دکھاتا ہے لیکن بباطن اس کی طرف ملتفت ہے ۔

(۲) برملا رنجش کا اظہار کرتا ہے لیکن خلوت میں صفائی پیش کرتا ہے ۔

(۳) ظاہرا بے وفا و بے نیاز ہے لیکن حقیقتاً* عشق کی چھیڑ چھاڑ برابر کرتا رہتا ہے ۔

(۴) حسن خودستائی میں اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ اسے یہ بھی دھیان نہیں رہتا کہ عشق کی توہین ہو رہی ہے ۔ آخر غیرت عشق جوش میں آ جاتی ہے اور وہ (عشق) بیوفائی (کنارہ کشی) پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔

(۵) حسن اب تک بے نیاز تھا ، اب سراپا نیاز بن جاتا ہے ۔ آنکھیں نم آلود ہو جاتی ہیں ، چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں ۔ غم التفاتی شیوہ بن جاتی ہے اور اب عشق تھپکیے لگاتا ہے اور حسن کی طرف سے بے اعتنائی اور سردمہری اختیار کر لیتا ہے۔

(۶) حسن کی اس پیہم شورش و دیوانگی کا چاروں طرف چرچا ہونے لگتا ہے اور اس کی خوب جگ ہنسائی ہوتی ہے ۔

(۷) عشق ان تمام حالات و کیفیات سے بے نیاز ، گم صم ، بخود گزیدگی اختیار کر لیتا ہے ـــــ اور سب سے ناآشنا ہو جاتا ہے ۔

(۸) انھیں حالات میں اس کے راز و نیاز موت سے ہونے لگتے ہیں اور وہ موت کا ہمنوا بن جاتا ہے ـــــ (خواہ یہ موت نفسیاتی ہو یا جسمانی ۔ جس کا ذکر طویل علالت کی شکل میں جناب ڈاکٹراحمر رفاعی نے کیا ہے)

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے ان کیفیات و واردات کا تعلق کسی طرح نسیم سے ثابت نہیں کیا جا سکتا نہ واقعات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے ـــــ لہذا اس کا تعلق نسیم کے علاوہ کسی اور ہی ہستی سے ہوگا ۔ وہ ہستی کون ہے ۔ تفصیل آگے آئے گی ۔

نظم کے آخری سات اشعار میں ، جو اوپر نقل کئے جا چکے ہیں ، ڈاکٹر رفاعی صاحب کو نسیم جگر کے واقعہ کا پس منظر نظر آیا ہے حالانکہ اوپر کے چار اشعار سے جو چوکھٹا تیار کیا گیا ہے وہ اتنا عام ہے کہ اسکے اندر جس محبوب کی تصویر فٹ کرنا چاہیں فٹ ہو جائے گی ـــــــــــ لیکن آخری تین اشعار کا تعلق کسی طرح نسیم سے نہیں ہو سکتا

وہ اشعار یہ ہیں ؎

پھر وہی چشم مست و جام بدست　　پھر وہی نغمہ زائیاں تیرہ
پھر وہی لب وہی تبسم ساز　　پھر وہی کج ادائیاں تیرہ
پھر وہ اک بیخودی کے عالم میں　　مل کے باہم جدائیاں تیرہ

(۱) سب سے پہلی قابل غور بات یہ ہے کہ " پھر " کی تکرار غمازی کرتی ہے کہ یہ ایک ملاقات کا ذکر نہیں ہے (جیسا کہ ڈاکٹر رفاعی نے نسیم کی ملاقات کو بتایا ہے) بلکہ یہ چھوٹا سا لفظ ملاقاتوں کے ایک طویل سلسلے کی داستان اپنے اندر لئے ہوئے ہے - یہ ملاقات تو فقط " نقطہ آغاز " ہے - " آگے آگے کیا ہوا " اگرچہ اسکی کوئی تفصیل نہیں بیان کی گئی تاہم " وہی " میں تمام تفصیل سمٹ دی گئی ہے -

(۲) ڈاکٹر احمر رفاعی نے اس بات کو قطعاً نظرانداز کر دیا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق کسی ایسی ذات سے ہے جو ملاقات کے بعد پھر جگر کی زندگی میں نغمہ و سرود کی بارش کا سبب ، مسرت و شادمانی کی بہار اور جام بدست و مینا بدوش بن کے آئی تھی ---- اور یہ چیزیں جگر کو نسیم کی صحبت میں کبھی نہیں حاصل ہوئیں ---- بیوی کی حیثیت میں بھی نہیں - اگر وہ " جام بدست ، سرود برلب و مینا بدوش " ان کے خلوت کدہ میں آ سکتیں تو طلاق ہی کیوں ہوتی ------ دوران طلاق میں (جب وہ اصغر کے حبالۂ عقد میں تھیں) تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا -

(۳) ڈاکٹر صاحب نے اس بات پر بھی غور نہیں کیا کہ " جام بدست و نغمہ زائی " صرف روایتی شاعرانہ علامات نہیں ہیں بلکہ واقعات کا شاعرانہ اظہار ہیں - واقعات کی دنیا میں جگر جن تجربوں سے گزرے تھے انہیں کو انھوں نے نظم کر دیا ---- اور یہ کیفیتیں اور تجربے کہیں اور گزرے ہوں تو گزرے ہوں ، نسیم کی معیت صحبت یا ملاقات کے دوران میں ہرگز نہیں گزرے ، جس میں اصغر بہ نفس نفیس شریک تھے -

(۴) اسکے علاوہ اس نظم میں ایک شعر جو اب دیوان سے خارج کر دیا گیا ہے، یہ بھی تھا ؎[1]

آستینوں کا وہ چڑھا لینا　　گوری گوری کلائیاں تیرہ

۱- یادگار جگر - مرتبہ ڈاکٹر محمد اسلام مطبوعہ سرفراز قومی پریس - لکھنؤ - ص ۲۲
شعلہ طور - مطبوعہ مکتبہ جامعہ - دھلی - لکھنؤ - بمبئی ۱۹۳۲ء - ص ۹۱

اور یہاں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ " نسیم کی کلائیاں گوری گوری " نہیں تھیں ۔ نسیم کا رنگ کالا تھا وہ اپنی ماں پر گئی تھیں [۱]۔

نسیم کے کالے ہونے کی عینی شاہد جناب قیسی الفاروقی ہیں ۔ انھوں نے میرے استفسار کے جواب میں ، جو ان سے ۲۶ مئی ۱۹۷۰ء کیمپ فیض آباد ۔ ہوئی فرمایا :

" نسیم انتہائی کالی تھیں ۔ یہ شعر ان کے لئے ہرگز نہیں ہے پھر ایک واقعہ سنایا فرمایا کہ میری بچی جو اب ماشاء اللّٰہ بی اے کر چکی ہے ، میرے ساتھ جگر صاحب کے یہاں گئی ۔ میں جگر صاحب سے باتیں کرنے لگا ۔ اس سے کہا " جاؤ بیٹا دادی (نسیم جگر) سے مل آؤ " وہ گئی اور فوراً ہی آ گئی ۔ میں نے کہا " بیٹا کیوں آ گئیں ۔ بولی دادی وہاں نہیں ہیں ۔ وہاں ان کی (جگر کی) بہو ہیں ۔" یہ سنا کر فرمایا بچی کی ذہانت کی داد دینا چاہیے ۔ جگر صاحب انتہائی بدصورت انسان تھے نسیم ان سے کسی طرح کم نہیں تھیں "

اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ واقعہ نسیم سے متعلق نہیں ہے ۔

یہ اس بات کی ایک اور دلیل ہے کہ اس نظم کے "واقعاتی پس منظر " کا نسیم سے کسی طرح تعلق نہیں ہے ۔

(۵) اس غزل کا مطلع

اف یہ تیغ آزمائیاں تیری تیری نازک کلائیاں تیری

جو اب " شعلۂ طور " مطبوعہ فروغ اردو لاہور سے خارج کر دیا گیا ہے ، اس شعر میں جگر نے " اف " پر نمبرا کا نشان لگا کر " شعلۂ طور " مطبوعہ ۱۹۳۶ء صفحہ ۹۱ پر لکھا ہے :

" یہ مسلسل غزل یا نظم میری حیات معاشقہ کے ایک اہم اور بہت ہی دردانگیز واقعہ سے متعلق ہے [۲]"

جگر صاحب کی اس تصریح کے بعد کہ " میری حیات معاشقہ سے متعلق ہے " اب اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ اس کا تعلق کسی طرح نسیم سے ہے ، اگر ایسا

۱۔ گفتگو جناب بشیر احمد صدیقی ۔ ۲۳ مئی ۱۹۶۹ء ۔۔ میرے استفسار پر کہ آپ کیوں کو ان کی رنگت کا علم کیسے ہوا تو انھوں نے فرمایا "اپنی حقیقی بہن سے جو رشید احمد صدیقی کی اہلیہ ہیں ۔ نسیم ان کے یہاں اکثر آتی ہیں "

۲۔ یادگار جگر ۔ ص ۲۲ ۔ شعلۂ طور مطبوعہ ۱۹۳۶ء ۔ ص ۹۱

ھوتا تو لکھنا چاھیے تھا " میری ناکام ازدواجی زندگی " سے متعلق ھے ۔ نسیم سے شادی کو معاشقہ نہیں کہہ سکتے ۔ ڈاکٹر اسلام کا یہ خیال کہ " یہ نظم نسیم بیگم سے متعلق ھے اور ان سے جدائی (طلاق) کے غم سے متاثر ھو کر کہی گئی ھے٭ " غلط ھے ۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ھے کہ ڈاکٹر احمر رفاعی کا یہ خیال کہ اس نظم کی محرک " بیماری میں جگر سے نسیم کی ملاقات ھے " غلط ھے ۔ اب یہ دیکھنا ھوگا کہ اگر اس کا تعلق نسیم سے نہیں ھے تو پھر وہ دوسری " ھستی " کون سی ھے جسکے حضور میں جگر کو اس درجہ قرب حاصل تھا کہ وہ ان کی ناز برداریاں کرتی ، ان کے لیے روتی ، ظاھرا لڑتی لیکن خلوت میں خندہ روئی اور خوش دلی سے ملتی ۔ وہ ذرا سی خودستائی سے کام لیتی تو جگر کی غیرت کو ٹھیس لگتی اور وہ بلبلا اٹھتے ۔ پھر یہ سردمہری اختیار کر لیتے اب اسکی باری آتی ناز سراپا نیاز بن جاتا ۔ اس کا التفات غم کی طرف ھو جاتا ۔ آنکھیں آنسو ، ھونٹ آھیں برسانے لگتے ، اور چہرہ پر ھوائیاں اڑنے لگتیں ــــــ جب ان حالات و واقعات کو پیش نظر رکھ کر جگر کی زندگی میں کیسی ایسی ھستی کی تلاش کی جاتی ھے تو میں بڑی والی شہزادی کے علاوہ کوئی دوسری اور ھستی نظر نہیں آتی ۔

شہزادی سے جگر کو ۱۵ ، ۱۶ سال تک ایک خاص قسم کا تعلق[۱] خاطر رھا ھے ۔ اس طویل مدت میں شہزادی سے جگر کے تعلقات کی نوعیت یہ رھی ھے کہ وہ بظاھر عاشق تھے لیکن حقیقتاً٭ " محبوب " تھے ۔ اس بڑی مدت میں جگر " عاشقی اور محبوبی " کے ان تمام نشیب و فراز سے گزرے ھیں جن کا تذکرہ نظم میں کیا گیا ھے ۔ اس تعلق خاص کی ایک جھلک سطور ذیل میں دکھائی جاتی ھے ۔ جناب اثر احسنی رقمطراز ھیں :

" رنڈی شریف تھی جگر کے مقام کو پہچانتی تھی .... خادمہ کی طرح جگر کے گرد گھومتی تھی ۔ جگر کی ناز برداری کو مشغلۂ حیات بنا لیا تھا ۔ مگر شرابی جگر اس کے سامنے دو زانو ھاتھ باندھے ، سر جھکائے یوں بیٹھے رھتے جیسے کسی پیر کے سامنے عقیدت کیش مرید کیا مجال جو آنکھ اٹھا کر دیکھ لیں ۔ شاید

۱۔ جگر نے سید مرتضیٰ علی صاحب کے نام ایک خط میں لکھا ھے " یہاں ایک ھستی ایسی بھی ھے جس سے ۱۵ ، ۱۶ سال سے ایک خاص قسم کا تعلق خاطر ھے " ۔ ۔ یہ خط بعض اندرونی شہادتوں کی بنا پر ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء کے بعد کی کسی تاریخ کا قرار دیا گیا ھے

٭۔ یادگار جگر ۔ ص ۲۳

دیکھنے کی تاب ہی نہیں تھی - وہ منتیں کرتی ، خوشامد کرتی
روتی مگر جگر سے دو باتیں بھی نہ کی جاتیں ....
اگر نشہ گہرا ہو جاتا شیراز اٹھا کر انھیں مسہری پر دراز کرتی،
پاؤں دباتی ، پنکھا کرتی ، اگر قے ہو جاتی تو اپنے ہاتھ سے گندے
یا آلودہ چیزیں صاف کرتی - خود خادمہ کی طرح جاگتی - جگر
عشق اور شراب کے نشہ میں میٹھی نیند سوتے رہتے - اور جب نشہ
اترتا ، آنکھ کھلتی ، محبوبہ کو خادمہ کی پوزیشن میں دیکھتے تسو
سر دھنتے ، چیخیں مار مار کر روتے اپنی قسمت کو کوستے - ہاتھ
جوڑتے ، معافی مانگتے ، سر جھکا دیتے اور شیرازن کی آنکھیں آنسو
اور ہونٹ آہیں برسانے لگتے -[1]"

عاشقی کی یہ کیفیت نسیم کے لیے جگر کی زندگی میں کہیں نظر نہیں آتی صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کی یاد کو بھلانے کے لیے خود کو شراب میں غرق کر دیا رہا نسیم کی طرف سے جگر کی محبت کا اس انداز میں جواب (جیسا کہ نظم میں بیان کیا گیا ہے) تو اس کا کوئی نشان نہ تو ان کی پنج سالہ ازدواجی زندگی میں نظر آتا ہے نہ ۱۵، ۱۶ سالہ دوری و مہجوری میں (مطلقہ زندگی میں)[2] جس کی ایک شبینہ ملاقات کے تاثرات کا نتیجہ اس نظم کو قرار دیا گیا ہے -

اقتباس بالا سے یہ واضح اور ثابت ہو گیا کہ جس " محبوب کی آمد آمد " کا ذکر ، اور اس سے اپنے تعلقات کی نوعیت جگر نے نظم میں بیان کی ہے ، وہ نسیم نہیں شیرازن ہیں ------ اب اتنا اور تحقیق کرنا رہ جاتا ہے کہ کیا شیرازن کے ساتھ بھی اسی قسم کا کوئی واقعہ پیش آیا تھا؟ اگر آیا تھا تو کب اور کہاں؟ اس واقعہ پر جگر صاحب نے

۱- مکتوب جناب اثر احسنی بنام جناب ڈاکٹر احمر رفاعی مرقومہ ۱۱ جنوری ۱۹۶۱ء - بحوالہ " جگر آثار و افکار " ص ۳۹---- اس " تعلق خاص " کی کچھ جھلکیاں محمدعظیم فیروزآبادی صاحب کے انٹرویو میں بھی نظر آتی ہیں، جو ان کے شیرازن بیگم کے درمیان ہوا- جو بطور مضمون " جگر اور اسکرشاعری " مرتبہ انور عارف میں شامل کر دیا گیا ہے - صفحات ۵۷۸ - ۵۶۸ -

۲- بعض لوگوں نے طلاق اور تجدید ملاقات کی مدت بیس سال لکھی ہے (" جگر حیات اور شاعری " ص ۹۹ ، نگار پاکستان فروری ۱۹۶۲ء ص ۳۵، تصور شیخ اردو ادب جلداول ص ۱۶۵) جو صریحاً غلط ہے بس اس کی مدت وہی ہے جو شیرازن سے تعلقات کی ہے - جگر نسیم کی آغوش محبت سے نکلے تو شیرازن کے یہاں پناہ لی وہاں سے ڈیرا اٹھایا تو پھر نسیم کے سایۂ محبت میں جا بسے - یہ مدت ۱۵، ۱۶ سال سے کسی صورت میں زیادہ نہیں بنتی - طلاق ۱۹۲۳ء میں ہوئی اور عقدثانی ۲۲ اپریل ۱۹۳۹ء کو ہوا -

خود روشنی ڈالی ہے - وہ فرماتے ہیں :

" میں بمبئی میں اصغر حسین صاحب مختار میرے خاص الخاص دوست تھے - نسیم سے جدائی کی اصل وجہ شراب تھی اور مزاج کا اختلاف بھی تھا - مجھے مضمحل دیکھ کر اصغر حسین صاحب مجھے ایک جگہ لے گئے وہ ایک طوائف تھیں .... میں نے محسوس کیا کہ میں خطرہ میں ہوں حصول کا کوئی شعور نہیں تھا - میں نے جانا ترک کر دیا - اسی زمانے میں میرے مرنے کی خبر کسی نے اڑا دی کسی تقریب میں وہ مختار صاحب کے یہاں تشریف لائی تھیں - میری موت کی خبر سے ان پر بہت اثر تھا - چلتے وقت انھوں نے کہا آپ آیا کریں - میں نے پھر جانا شروع کر دیا - بغیر کسی وجہ کے یکایک انقباض ہوا اور میں یہ کہہ کر چلا آیا کہ " میں چلا " - انھوں نے شادی کا پیغام دیا میں نے انکار کر دیا .... ایک بار کا ذکر ہے کہ میں بمبئی میں علیل تھا - اصغر صاحب ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے میرے پاس لائے - انھوں نے کہا " سنا ہے آپ علیل ہیں " - میں " جی نہیں " - اب پہلے سے بہت بہتر ہوں " انھوں نے کہا " آپ شاعر نہیں معلوم ہوتے - کیا کوئی محبت کرنے والا یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا محبوب اپنی شکست کا اعلان کرے " - وہ ابھی زندہ ہیں - سچ بھی کہا ہے - " کلائیاں توبہ " انھیں کے لئے کہا تھا -[1] "

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگرچہ دونوں ملاقاتوں کا ذکر --- یعنی جگر اور نسیم کی ملاقات بہمراہی اصغر (گونڈوی) الہ آباد میں بقول ڈاکٹر احمر رفاعی اور شیرازن و جگر کی ملاقات بہمراہی اصغر مختار میں بمبئی میں ، جگر صاحب ہی کے حوالہ سے کیا گیا ہے لیکن ان دونوں میں سے قیسی الفاروقی صاحب کے بیان کو حسب ذیل دلائل کی بنیاد پر ترجیح دی گئی ہے -

(۱) پہلی تو یہی کہ نظم کی اندرونی شہادت سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ نظم کے بیانیہ اور واقعاتی پس منظر سے جس محبوب کی شخصیت ابھرتی ہے وہ نسیم نہیں شیرازن ہیں -

---

۱- حیات جگر کا ایک باب از قیسی الفاروقی قومی آواز لکھنئو ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۳ بحوالہ " جگر حیات اور شاعری " - ص ۷۸

(۲) دوسری یہ کہ قیسی الفاروقی صاحب ، ڈاکٹر احمر رفاعی صاحب کے مقابلے میں جگر صاحب کے زیادہ قریب رہے ہیں اور مدتوں قریب رہے ہیں ۔ کچہری کے اوقات کے علاوہ ان کا سارا وقت جگر صاحب کی خدمت اور ناز برداری میں گزرتا تھا ۔ جگر صاحب انھیں " فرزند روحانی اور دلبند معنوی[1] " سمجھتے تھے ۔ اس لئے ان کی شہادت کی وقعت اور اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے ۔

(۳) قیسی الفاروقی صاحب نے ایک واقعہ کو محض سن کر نقل نہیں کر دیا ۔ بلکہ لکھ کر جگر صاحب کو سنا بھی دیا اور اس امر کی سند بھی لے لی جو بجنسہ نقل کی جاتی ہے تاکہ اسکی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکے :

" حیات جگر کے مولف شمس الہدیٰ صاحب قیسی ایم اے کو میں روحانی فرزند سمجھتا ہوں میری خوش قسمتی سے وہ ایک سال سے گونڈہ میں منصب تحصیلداری پر فائز ہیں ۔ اوقات فرائض کو چھوڑ کر ان کی اکثر و بیشتر توجہات میری ہی ذات تک محدود رہتی ہیں ۔ ان کی تالیف کو جستہ جستہ میں نے سنا بھی ہے ۔ بہت سے علمی و ادبی مسائل پر گفتگو رہی اور بحثیں تک رہی ہیں .... وہ بہت ذہین اور صاحب کردار انسان ہیں .... اس تالیف کے تمام تر حقوق ملکیت کا انھیں کو جائز مستحق سمجھتا ہوں ۔

جگر مرادآبادی عفی عنہ[2] ۱۰ جون ۱۹۵۹ء

(۴) امکان ہے کہ اصغر کے نام سے جناب احمر رفاعی کو اشتباہ ہو گیا ہو ۔ اور آپ نے اصغر حسین اصغر (میں بھی) کے بجائے اصغر گونڈوی سمجھ لیا[3] ہو اور اس پورے واقعہ کو سہو سے منسوب کر دیا ہو ۔

۱۔ جگر کے خطوط ۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر محمد اسلام ۔ ص ۱۲۲-۱۲۱

۲۔ یہ کتاب ۱۹۵۸ء میں مکمل ہو چکی تھی یعنی انتقال سے قریب قریب ۲ سال پہلے ، ترقیم سند کی تاریخ ۱۰ جون ۱۹۵۹ء ہے ۔ حاشیہ " جگر معاصرین و مخلصین کی نظر میں " مرتبہ ڈاکٹر محمد اسلام ۔ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ۔ بار اول ۱۹۲۲ء ۔ ص ۳۱

۳۔ جگر پر لکھنے والوں کو بعض اوقات ایسا اشتباہ ہوا ہے ۔ اس کی ایک مثال ضیاء الاسلام صاحب کی تحریر ہے ۔ مضمون جگر مرادآبادی کی غزل گوئی کے خارجی محرکات ۔ مطبوعہ روزنامہ مشرق کراچی ۔ ۲ دسمبر ۱۹۶۸ء ۔ ص ۳ اور ۲

مختصر یہ کہ جگر اور نسیم اور نسیم اور اصغر کے عشق و آشنائی سے متعلق جتنی روایات تحریراً و نقلاً چلی آ رہی ھیں ، جن میں سے بعض پر جرح و تعدیل کی گئی ھے ، سب بے بنیاد اور غلط ھیں ۔ ان کے پیچھے سیدھے سادے واقعات ھیں جن کی حقیقت صرف اتنی ھے ۔

(۱) جگر ۱۹۱۷ء کے اوائل میں گونڈہ پہونچے اور اصغر سے متعارف ھوئے ۔ آھستہ آھستہ رسم و راہ بڑھی ۔ جگر کے مشورے سے اصغر نے چشمہ کا کارخانہ قائم کیا جس کے سفری ایجنٹ کی حیثیت سے جگر کام کرتے رھے ۔[1]

(۲) ۱۹۱۹ء کی پہلی ششماھی (۳۰ مئی سے پہلے) کی کسی تاریخ میں جگر اور نسیم کی شادی اصغر صاحب کے ایماء اور کوشش سے ھوئی ۔

(۳) جگر صاحب کی بے ہوشی ، آوارہ گردی اور مہینوں مہینوں گھر سے لاپتہ اور گم رھنے کی وجہ سے نسیم عاجز آ گئیں ۔ آخر انھوں نے اپنی بڑی بہن (اھلیہ اصغر) کے ذریعہ اصغر صاحب پر دباؤ ڈلوا کر طلاق لے لی ۔ طلاق کا واقعہ ۱۹۲۳ء میں ھوا۔

(۴) طلاق کے بعد نسیم دو ڈھائی سال تک مطلقہ رھیں ۔

(۵) اس اثناء میں ان کی بڑی بہن (اھلیہ اصغر) کسی عارضہ میں مبتلا ھو کر حق زوجیت ادا کرنے سے قاصر و معذور ھو گئیں ۔ بہن کی (نسیم) برباد زندگی بھی ان سے نہ دیکھی جاتی تھی ، ادھر اولاد کی شدید خواھش اور سب سے بڑھ کر اصغر صاحب کی شرعی اور جسمانی ضرورت کا احساس ۔ ان تمام باتوں نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اصغر صاحب سے طلاق لے کر نسیم کی ان سے شادی کر دیں ۔ چنانچہ جون جولائی ۱۹۲۶ء میں یہ شادی ھوگئی اور نسیم اصغر کے انتقال (۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء) تک ان کے عقد میں رھیں ۔

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات پوری طور پر ثابت ھو جاتی ھے کہ " نسیم کو جگر ھی سے محبت تھی " کی حقیقت افسانہ سے زیادہ نہیں ۔ اس کی تصدیق خود نسیم خاتون کے بیان سے بھی ھوتی ھے ۔ وہ رقمطراز ھیں :

" یہ واقعہ (الہ آباد میں اصغر کا نسیم کو جگر کے کمرے میں لے جانے کا) بالکل غلط ھے ۔ جگر صاحب سے جب شادی ھی زبردستی ھوئی تھی تو محبت کا سوال ھی نہیں پیدا ھوتا ۔[2] "

۱۔ چٹان لاھور شمارہ ۱۷ جولائی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۹

۲۔ انٹرویو از نسیم خاتون ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء بمقام گونڈہ

اولاد :

نسیم اور ان کی بڑی بہن چھٹن سے اصغر کے کوئی اولاد نہیں ہوئی [1] - البتہ پہلی بیوی سے سات لڑکیاں [2] ہوئیں - جن میں سے بیشتر کم عمری ہی میں انتقال کر گئیں صرف تین جوانی کی عمر کو پہونچیں - شدید خواہش کے باوجود اولاد نرینہ کوئی نہیں ہوئی - سب سے بڑی بیٹی (بڑی) بقول نسیم خاتون [3] :

" ۱۸ برس کی عمر میں فوت ہو گئیں [4] -"

لیکن نسیم خاتون کا یہ اندازہ حسب ذیل دلائل کی بنیاد پر درست نہیں معلوم ہوتا -

(۱) بڑی (اصل نام نہ معلوم ہو سکا) کا سال ولادت ۱۹۰۵ء سے پہلے کا نہیں ثابت ہوتا (اصغر کی شادی مئی جون ۱۹۰۳ء میں ثابت کی جا چکی ہے) -

(۲) منی کی شادی کی تاریخ جناب سید رشید احمد نے باصرار ۲۱-۱۹۲۰ء لکھا ہے -

اس کا مقصد یہ ہوا کہ بڑی کا انتقال شادی سے پہلے ہو چکا تھا - ورنہ منی کے بجائے پہلے بڑی کی شادی ہونا چاہیے تھی (بڑی کی شادی کا ذکر کسی سوانح نگار حتیٰ کہ نسیم خاتون نے بھی نہیں کیا) - اب اگر انتقال اور شادی کی درمیانی مدت کم از کم دو تین ماہ تسلیم کی جائے تو انتقال کے وقت بڑی کی عمر زیادہ سے زیادہ ۱۵ ، ۱۶ ہی سال بنتی ہے -

دوسری صاحبزادی سکینہ (عرف منی) تھیں [5] - جن کی شادی ۲۱-۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر خادم حسین صاحب (فیض آباد) کے صاحبزادے صدیق احمد [*] صاحب سے ہوئی تھی - صدیق صاحب ، جناب فیاض علی مرحوم ایڈوکیٹ جنرل پاکستان ، مصنف " انور " اور " شمیم " کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے - باپ کے انتقال کے بعد کچھ روز فیض آباد میں

۱- اصغر گونڈوی - از سید رشید احمد - چٹان لاہور - شمارہ ۳۱ جولائی ۱۹٦۷ء ص ١٦-١٥

۲، ۳، ۴- انٹرویو نسیم خاتون ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء بمقام گونڈہ

۵- جناب سید رشید احمد نے منی (سکینہ) کی شادی کا سال ۱۹۲۳ء لکھا ہے (جامعہ - دھلی مئی ۱۹٦۷ء ص) لیکن میرے استفسار پر ۲۱-۱۹۲۰ء تحریر فرمایا (مکتوب بنام مقالہ نگار مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹٦۹ء) -- دوران قیام فیض آباد میں جب ان کے دو اختلافی بیانات (۲۱-۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۳ء) کی طرف توجہ دلائی گئی تو کافی غور و فکر کے بعد ۲۱-۱۹۲۰ء ہی پر اصرار کیا اور کہا یہی درست ہے - سکینہ کی شادی کی تمام تفصیلات رشید صاحب کے محولہ بالا مکتوب سے لی گئی ہیں -

*- اصل نام صدیق احمد تھا (بحوالہ سرود زندگی طبع اوّل ۱۹۳۵ء - انڈین پریس الہ آباد) رشید صاحب سے نام کے معاملے میں سہو ہو گیا انھوں نے جا بجا " محمد صدیق " لکھا ہے جو غلط ہے -

(باپ کا) دواخانہ چلایا لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے - بعد میں انھوں نے انڈین پریس الہ آباد میں ملازمت کر لی - صدیق صاحب کا پتہ الہ آباد میں ننھی کی رخصت کے وقت (٧ ستمبر ١٩٣٧ء) [١] تک چلتا ہے - اس کے بعد کچھ سراغ نہیں ملتا کہ وہ کہاں گئے -

منی کے سات بچے پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گئے - آخر آٹھویں بچے کی ولادت کے وقت وہ خود ہی چل بسیں - اس طرح اصغر صاحب کی ان صاحبزادی سے کوئی اولاد زندہ نہیں بچی -

میرے اس استفسار پر کہ

" سنا ہے کہ اصغر صاحب کی کسی لڑکی کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی ، اسی میں ان کا انتقال ہو گیا اور لڑکی کا بھی انتقال ہوگیا - یہ کہاں تک درست ہے؟ "

اس واقعہ کی تفصیل نسیم خاتون نے یوں تحریر فرمائی :

" یہ صحیح ہے - صدیق کی بیوی منی کا انتقال ایسی ہی حالت میں ہوا - منی کے آٹھ* بچے پیدا ہونے سے پہلے ہی مر مر گئے اور پھر آٹھویں بچے کے ساتھ وہ خود ہی چل بسیں [٢] - "

منی کا انتقال الہ آباد میں غالباً [٣] ٣٢-١٩٣٣ء میں ہوا -- اتنا تو بہرحال یقینی ہے کہ ننھی کی شادی سے بہت پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا - ان کے سال ولادت کا تعین (مقالہ ھذا ص پر) ٦-١٩٠٥ء کیا گیا ہے - یہاں اس پر اتنا اضافہ کیا جاتا ہے کہ بڑی صاحبزادی بڑی ١٩٠٥ء میں متولد ہوئیں اور دوسری صاحبزادی منی ، جن کی شادی کی تاریخ سے سال ولادت متعین کیا گیا ہے ١٩٠٦ء میں پیدا ہوئیں - انھیں کی ولادت کے وقت اصغر نے تعلیم ترک کی تھی (جیسا کہ سطور گذشتہ میں تفصیلاً لکھا جا چکا ہے)

تیسری صاحبزادی (جو حقیقتاً ساتویں اور سب سے چھوٹی تھیں) عائشہ بانو

١- بحوالہ مکتوب نسیم خاتون بنام سید مرتضیٰ علی مرقومہ ٢٩ اگست(١٩٣٧ء)

*- لکھتے وقت نسیم خاتون سے تسامح ہو گیا - آٹھ کے بجائے سات چاہیے -- مقالہ نگار

٢- انٹرویو از نسیم خاتون ٢٩ مئی ١٩٧٠ء بمقام گونڈہ

٣- یہ اندازہ بعض روایات کے تجزیے پر قائم کیا گیا ہے - رئیس احمد عباسی (لکچرر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج ساہیوال) نے اپنی ممانی (ننھی) کی زبانی انتقال کے وقت سکینہ باجی(منی) کی عمر تیس سال بتائی .... ان کا جملہ یہ ہے " ممانی کہا کرتی تھیں کہ میری عمر تیس کے لگ بھگ ہوگی -- جس عمر میں سکینہ باجی کا انتقال ہوا ہے ، اسی عمر میں میرا بھی ہوگا- ان کا انتقال بچے کی پیدائش میں ہوا تھا " (گفتگو بتاریخ یکم مئی ١٩٧١ء - از مقالہ نگار بمقام گورنمنٹ کالج ساہیوال) ..... منی کا سال ولادت ١٩٠٦ء (اندازاً) ہے اسطرح ان کا انتقال ١٩٣٦ء کے حدود میں ہونا چاہیے - لیکن لطیف احمد صاحب عباسی

عرت منھی کی تاریخ ولادت کا تعین بہت مشکل ھے ۔ البتہ ان کی شادی (ستمبر ۱۹۳۷ء)
کی تاریخ کو سامنے رکھ کر ، عمر کا اندازہ قائم کرتے ہوئے میں نے تاریخ ولادت کا تعین
کرنا چاھا اور اس سلسلے میں جناب سید رشید احمد صاحب سے اسکی تصدیق چاھی جس
کا جواب انھوں نے اپنے ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء کے مکتوب میں بڑی تفصیل سے دیا ۔ میں نے
لکھا تھا ۔ " مسلمان شرفا میں ۱۲، ۱۵ سال .... زیادہ سے زیادہ ۱۷، ۱۸
سال کی لڑکیوں کی شادی ھو جاتی ھے ۔ اس حساب سے اگر شادی کے وقت منھی کی عمر
۱۸ .... یا زیادہ سے زیادہ ۲۰ سال مانی جائے تو ان کا سال ولادت ۱۷-۱۹۱۶ء
آتا ھے ۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ھے کہ پہلی بیوی سے اصغر کے زنا شوئی کے تعلقات
۱۹۱۵ء تک بہرحال رہے ۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہی زمانہ چھٹی سے شادی کا ہو ۔
شادی کے بعد تعلقات بالکل ختم ہو گئے ہوں [۱]۔"

اسکے جواب میں رشید صاحب نے (سید رشید احمد) تحریر فرمایا :

" مسلم شرفا کے خاندانوں میں لڑکیوں کی شادی کی عمر کا جو عموی
اندازہ آپ نے لگایا ھے وہ اپنی جگہ پر صحیح ھے مگر آپ جانتے ھیں
کہ ھر کلیہ اور دستور کی کچھ مستثنیات ہوتی ھیں ....
منھی کی عمر کی انتہا آپ خواہ مخواہ بیس سال کیوں فرض و تصور
کرتے ھیں ۔ اس سے دو چار سال زیادہ تصور کرنے میں آپ کو کیا
عذر و قباحت ھے ۔ آپ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی تمام تر پرورش
ماں کے ساتھ اپنے دادا کے سایۂ عاطفت میں ہوئی ۔ ماں مر گئی ۔
دادی دادا دنیا سے رخصت ہو گئے تب اسے باپ کی سرپرستی نصیب
ہوئی ۔ باپ ایک خوددار انسان ، شاعر و ادیب جس کی واقفیت اور
حلقۂ اثر محدود ۔ لڑکی کی تعلیم و تربیت قدیم مشرقی ماحول میں ہوئی
اس کے اکتسابات علمی ناقابل ذکر ۔ اصغر جیسا غیور اور خوددار انسان !
آخر کہے تو جا کر کس سے کہے !! ھمارے محترم رشید صدیقی کا خدا
بھلا کرے ، ان کی تحریک ، استعداد و اعانت سے بالآخر اس مرحلہ کے
سرانجام کی شکل پیدا ہوئی ۔ ورنہ اصغر کے بس کی یہ بات کہاں تھی"[۲]

(حاشیہ از گذشتہ صفحہ)
نے انتقال کا واقعہ منھی کی شادی سے ۲، ۳ سال قبل کا فرمایا ۔ اسطرح سال وفات
۳۲-۱۹۳۳ء آتا ھے (گفتگو از مقالہ نگار ۲۷ مئی ۱۹۷۰ء سٹلائٹ ٹاؤن ۔ راولپنڈی)

۱۔ مکتوب مقالہ نگار بنام جناب سید رشید احمد مرقومہ ۲۲ جنوری ۱۹۶۹ء

۲۔ مکتوب جناب سید رشید احمد بنام راقم الحروف مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء

ان حالات و واقعات کی روشنی میں اگر شادی کے وقت منشی کی عمر ۲۰ اور ۲۲ سال کے درمیان مانی جائے تو ان کی تاریخ ولادت ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیان آتی ہے - چونکہ رشید صاحب ۲۰ سال سے دو چار سال زیادہ پر مصر ہیں اس لیے گمان غالب یہی ہے کہ منشی کی ولادت ۱۴-۱۹۱۳ء میں ہوئی ہوگی -

اس قیاس کو جناب لطیف احمد عباسی کے بیان سے تقویت پہونچتی ہے - انھوں نے اپنی گفتگو کے دوران میں جو ۲۷ مئی ۱۹۷۰ء کو راولپنڈی میں ہوئی شادی کے وقت اپنی ممانی کی عمر کا اندازہ بتاتے ہوئے فرمایا :

" زیادہ سے زیادہ بائیس تئیس سال کی عمر میں (ممانی کی) شادی ہوئی -"

اس حساب سے منشی کا سال ولادت ۱۵-۱۹۱۴ء ٹھہرتا ہے - ان تمام مختلف بیانات کی جرح و تعدیل اور تنقیح و تجزیے سے منشی کی ولادت ۱۴-۱۹۱۳ء اور ۱۵-۱۹۱۴ء کے درمیان کی کسی تاریخ کو ٹھہرتی ہے - یہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ چھٹن سے شادی اواخر ۱۹۱۳ء میں ہوئی - اس کے زیادہ سے زیادہ دو تین ماہ بعد منشی پیدا ہوئیں - یعنی اواخر ۱۹۱۴ء یا اوائل ۱۹۱۵ء (فروری مارچ) میں -

منشی کا عقد جناب رشید احمد صدیقی کی وساطت سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک طالب علم عبدالحی عباسی سے ۲۲ مارچ ۱۹۳۶ء[1] کو ، اصغر صاحب کی زندگی میں ہوا - حئی صاحب اس وقت ایم اے ایل ایل بی سال اوّل کے طالب علم تھے - رخصت فائنل امتحان سے فراغت کے بعد[2] ۷ ستمبر ۱۹۳۷ء[3] کو اصغر صاحب کے انتقال کے بعد الہ آباد سے ہوئی -

رشید صاحب بھی منشی کا عقد مارچ[*] ۱۹۳۶ء میں اصغر کے حیات میں لکھتے ہیں - (جامعہ دہلی مئی ۱۹۶۷ء - ص ۲۳۰) -

---

۱- مکتوب جناب اصغر گونڈوی بنام نواب سید شمس الحسن مرقومہ ۲ مارچ ۱۹۳۶ء ----- خط کی اصل عبارت یہ ہے " .... میری لڑکی کے عقد کی تاریخ ۲۲ مارچ کو قرار پا گئی ہے - ...... آپ کو تکلیف کرنا ہوگی -"

*- جناب سید رشید احمد نے عقد کی تاریخ ۱۶ جولائی ۱۹۳۶ء تحریر فرمائی ہے - (مکتوب بنام مقالہ نگار ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء) جس میں یقیناً ان سے سہو ہوگیا -

۲- مکتوب چودھری حامد حسین بنام سید رشید احمد مرقومہ ۲۳ جولائی ۱۹۳۷ء بحوالہ جامعہ دہلی مئی ۱۹۶۷ء - ص ۲۲۹ -

۳- مکتوب اہلیہ اصغر بنام سید مرتضیٰ علی مرقومہ ۲۹ اگست (۱۹۳۷ء) - متعلقہ عبارت یہ ہے "وہ لوگ ۵ ستمبر کو صبح پہونچ جائیں گے اور رخصتی ۷ کو ہوگی - .... ۲۹ اگست -"

اسی طرح چودھری حامد حسین بھی اپنے مکتوب مرقومہ ۲۳ جولائی ۱۹۳۷ء میں رشید صاحب کو لکھتے ہیں :

" عقد نکاح سادہ طور پر مارچ میں ہو گیا تھا مرحوم کی حیات میں "[1]

لیکن لطیف احمد صاحب عباسی نے عقد کے متعلق بھی باصرار کہا کہ اصغر صاحب کے انتقال کے بعد ہوا ہے ۔ ان کا فرمانا ہے :

" بڑے ماموں پر قتل عمد کا مقدمہ چل رہا تھا ۔ اس لیے ممکن ہے کہ عقد ملتوی ہو گیا ہو ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عقد اصغر صاحب کے انتقال کے بعد ہوا ۔ عقد مارچ ۱۹۳۷ء میں ہوا تعزیت کرنے والوں میں بعض لوگ اس وقت موجود تھے مثلاً* رسول احمد صاحب مرزا پور سے آئے تھے[2] ۔"

لطیف احمد عباسی کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے نسیم خاتون نے تحریر فرمایا :

" سات لڑکیاں پیدا ہوئیں جن میں صرف دو زندہ رہیں ۔۔۔۔۔۔ دوسری منھی عبدالحی سے بیاہی گئی تھیں ۔ منھی کو خود میں نے پالا تھا اور اصغر صاحب کے انتقال کے بعد الہ آباد میں عقد اور رخصتی کی[3] ۔"

لیکن حقیقت یہی ہے کہ منھی کا عقد ۲۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو ہوا ۔ اس معاملے میں جناب لطیف احمد عباسی اور نسیم خاتون کو اشتباہ ہوا ۔

عبدالحی صاحب اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے کے فرد تھے ۔ موضع گھوری ضلع ساگر (سی ۔ پی) کے رہنے والے تھے[4] ۔ اپنے علاقے کے بڑے زمیندار تھے ۔ ان کے نام تین موضع زمینداری کے تھے[5] ۔

منھی کا انتقال جولائی ۱۹۳۹ء میں پہلے بچے کی ولادت کے وقت جبل پور میں ہوا اور وہیں مدفون[6] ہوئیں ۔

---

۱ ۔ بحوالہ جامع دھلی ۔ مئی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۳۰

۲ ۔ گفتگو جناب لطیف احمد عباسی ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء ۔ راولپنڈی

* ۔ مقالہ نگار کو رسول احمد صاحب کا سراغ نہیں مل سکا ۔ کہ اس امر کی تصدیق کی جاتی ۔

۳ ۔ انٹرویو از نسیم خاتون ۔ ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء بمقام گونڈہ

۴ ۔ ۵ ، مکتوب چودھری حامد حسین بنام سید رشید احمد مرقومہ ۲۳ جولائی ۱۹۳۷ء (چٹان لاہور شمارہ ۷ اگست ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۶)

۶ ۔ گفتگو از لطیف احمد عباسی اور مولانا عبدالغنی صاحب نرگس ۔ ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء ۔ راولپنڈی

مختصر یہ کہ اب اصغر صاحب کی کسی اولاد یا اولاد کی اولاد کا پتہ نہیں چلتا ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مشیت نے اس ورق کو ہمیشہ کے لئے الٹ دیا ۔

مرض الموت اور وفات :

" ہر آں کہ زاد بناچار بایدش نوشید   زجام دھر می کل من علیھا فان "

مرنا برحق اور موت اٹل ہے ۔ لیکن بعض اموات سے ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔ ایسی موت کو دل کسی طرح قبول نہیں کرتا ۔ جی چاہتا ہے کہ کاش نہ آتی ۔ مگر آتی کہاں ٹلی ہے ۔

اصغر کی موت بھی اسی قبیل کی تھی ۔ اس سے شعر و ادب ، شرافت و انسانیت کو شدید نقصان پہونچا ۔ اگر کچھ دن اور ٹل جاتی تو شاید کچھ تلافی ہو جاتی ---- مگر خود اصغر وہ تو اس کے لئے سراپا اشتیاق بنے ہوئے تھے ۔ موت سے دو روز قبل کس والہانہ انداز میں اس شوق کا اظہار کرتے ہیں ؎

عیاں ہے راز ہستی چشم حیرت باز ہے ساقی
کہ محو راز ہو جانا کشود راز ہے ساقی

وہ اٹھی موج مے وہ جام و مینا میں تلاطم ہے
جہاں " بے نشان " سے دعوت پرواز ہے ساقی

یہاں اس خاکدان عنصری میں کیا گزرتی ہے
تو ہی ہمراز ہے ساقی تو ہی دمساز ہے ساقی

سنا کرتا ہوں راتوں کو برابر نعرۂ مستی
تری آواز ہے یا خود مری آواز ہے ساقی

---- آخر "شوق" پورا ہو گیا اور ان کی آواز اور ساقی کی آواز ایک ہوگئی ---- اور پھر گہرا سکوت چھا گیا ۔

اصغر کا قد دراز اور بدن گداز تھا ۔ آخر آخر میں مائل بہ فربہی ہو گیا تھا ۔ فربہی بظاہر صحت کی علامت مگر حقیقتاً امراض کا سرچشمہ ہے ۔ اصغر بھی اس کے برے نتائج سے نہ بچ سکے ۔ پہلے بلڈ پریشر ہوا بعد میں فالج ۔

پہلا حملہ :
ان پر فالج کا پہلا حملہ ۱۹۳۱ء میں ہوا[1] لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ اثر نہیں تھا ۔ جلد افاقہ ہو گیا اور وہ معمولات میں مصروف ہو گئے ۔ البتہ بلڈ پریشر معمول پر نہیں آیا ۔ بڑھتا ہی رہا ۔ چنانچہ مئی ۱۹۳۲ء کے ایک خط میں جناب سید رشید احمد صاحب کو لکھتے ہیں :

"........... میرا بلڈ پریشر ابھی تک زیادہ بتایا جا رہا ہے ۔ علاج ہو رہا ہے لیکن بظاہر عام صحت خاصی معلوم ہوتی ہے ۔"

دوسرا حملہ :
لیکن یہ خاصی صحت دوسرے حملے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ۔ اواخر (اکتوبر نومبر) ۱۹۳۲ء[2] میں ان پر دوبارہ فالج گرا اور وہ صاحب فراش ہو گئے ۔ چنانچہ " سرود زندگی " کے دیباچہ میں جس کی تاریخ ترقیم یکم دسمبر ۱۹۳۲ء لکھتے ہیں :

" یہ چند سطور ایسی حالت میں لکھ رہا ہوں کہ فالج سے صاحب فراش ہوں ۔[3]"

اصغر کی بیماری کی اطلاع پا کر جگر بھی الہ آباد پہنچے ۔ ۱۶ فروری ۱۹۳۵ء کے خط میں جناب نواب سید شمس الحسن صاحب کو لکھتے ہیں :

" حضرت اقدس (اصغر) کا مزاج گرامی بدستور ہے "

لیکن ۲۱ فروری ۱۹۳۵ء کے خط میں نواب صاحب ہی کو " ترقی صحت " کی خوشخبری دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

" حضرت مدظلہ کی صحت بحمداللہ کہ ترقی کر رہی ہے "

دوسرا حملہ شدید تھا ، ساڑھے تین ، چار ماہ تو مسلسل بیمار رہے ، لیکن اس کے بعد بھی صحت بحال نہیں ہوئی ۔ مستقل خراب رہنے لگی ۔ بلڈ پریشر کا زور کم ہونے کے

۱۔ مکتوب جناب علی ظہیر بنام مقالہ نگار مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۷۰ء

۲۔ دوسرے حملہ پر جسے غلطی سے سید رشید احمد صاحب نے پہلے حملے سے تعبیر کیا ہے ، (جامعہ دھلی مئی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۳۳) ۔ رشید صاحب اصغر صاحب کی بیمارپرسی کے لیئے تشریف لے گئے تھے ، اس وقت " سرود زندگی " پریس جا رہی تھی ۔ سرود زندگی اکتوبر نومبر ۱۹۳۲ء میں طبع ہو چکی تھی (دیکھئے مقالہ ھذا ص) ۔۔ گویا ان پر فالج اکتوبر میں گرا ۔

۳۔ دیباچہ سرود زندگی طبع اول انڈین پریس لمیٹڈ ۔ الہ آباد ۔ ص ۲

بجائے بڑھتا گیا ۔ اس کی اطلاع دیتے ہوئے جناب رشید احمد صدیقی کو لکھتے ہیں :

" بلڈ پریشر اور احمد کی محبت دونوں بڑھ رہے ہیں ۔ دیکھئے
کیا انجام ہو [۱] "

بیماری کا یہ سلسلہ سال ڈیڑھ سال تک چلتا رہا ، کبھی حالت خراب کبھی قدرے بہتر ۔ مکمل افاقہ نہ ہوتا تھا ۔ " فالج کے حملے کے بعد سے ڈاکٹروں نے ان پر بہت سی پابندیاں عائد کر دی تھیں ۔[۲] خون کا دباؤ بے حد تھا لیکن وہ قریب قریب بھلے چنگوں کی طرح رہتے تھے [۳]۔" ـــ ستمبر اکتوبر ۱۹۳۶ء تعطیلات دسہرہ میں (وطن) گونڈہ گئے ۔ کچھ سفر کی تھکن کچھ بے احتیاطی بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ۔ الہ آباد آ کر طبیعت حد درجہ خراب ہو گئی اور چارپائی پر پڑ گئے ۔ انھیں دنوں جناب سید رشید احمد نے کسی تقریب میں مدعو کیا ۔ جواباً ان کو لکھا :

مکرم ۔ سلام مسنون

عنایت نامہ مع دعوتی رقعہ کے موصول ہوا جس کا شکر گزار ہوں ۔
آپ نے سنا ہوگا میں دسہرہ کی تعطیلوں میں گونڈہ چلا گیا تھا ۔
وہاں بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ۔ علاج ہو رہا ہے ......[۴]"

طبیعت معمول پر نہیں آ رہی تھی ۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ۔

تیسرا حملہ اور وفات :

یہ حالت تھی کہ ۲۹ نومبر ۱۹۳۶ء بروز اتوار شب کو کسی دوست کے یہاں دعوت میں گئے ۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب لوٹے ۔ سونے کے لئے لیٹے لیکن نیند غائب کچھ اضطرابی کیفیت تھی ۔ دل بہلانے کے لیے کوئی کتاب اٹھا لی ۔ کچھ دیر پڑھتے رہے بارہ بجے یا کچھ زیادہ کا عمل ہوگا استنجے کی غرض سے قدمچہ پر گئے وہیں قلب پر فالج کا تیسرا حملہ ہوا [۵] ۔ بیہوش ہو کر گر پڑے ۔ گھر والوں نے بمشکل تمام چارپائی پر لا کر لٹایا ۔

۱۔ بحوالہ گنج ہائے گرانمایہ ۔ ص ۱۰۸ ۔ ۲ ۔ ۳ ۔ ایضاً ۔ ص ۱۱۱

۴۔ مکتوب اصغر بنام سید رشید احمد مورخہ ۳ نومبر ۱۹۳۶ء ۔ بحوالہ جامعہ دہلی مئی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۲۸

۵۔ رشید احمد صدیقی صاحب کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ حملہ دعوت ہی میں ہوا ۔ گنج ہائے گرانمایہ ۔ ص ۱۱۱) ـــ جو یقیناً غلط ہے ۔ مولانا سراج الحق صاحب وہیں الہ آباد میں تھے ، تجہیز و تکفین میں بنفس نفیس شریک تھے ۔ رات کے واقعات صدیق میاں اور دوسروں سے سنے ہوں گے ـــ رشید صدیقی صاحب بعد میں پہنچے ہیں ـــ ان تک جو اطلاع پہنچی اس میں انھیں اشتباہ ہوا ۔

کوئی تین گھنٹے نیم بیہوشی کے عالم میں رہنے کے بعد --- تین بجے صبح --- ٹھیک تہجد کے وقت بارگاہ محبوب میں " مقام محمود[1] " پر سرفراز ہوئے ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

مولانا سراج الحق مچھلی شہری اور جناب صغیر احمد صدیقی دونوں حضرات نے تاریخ وفات ۲۹ نومبر ۱۹۳۶ء تحریر فرمائی ہے[2] ۔ البتہ مولانا نے وفات کی صبح ۱۵ رمضان المبارک لکھا ہے جو تسامح ہے[3] ۔ اصغر کا انتقال ۲۹ اور ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء (بمطابق ۱۵ اور ۱۶ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ) اتوار اور پیر کی درمیانی شب میں صبح تین بجے ہوا۔

اصغر نے عیسوی تقویم کے حساب سے ۵۲ سال ۹ ماہ ہجری تقویم کے مطابق ۵۴ سال ، ۳ ماہ اور ۱۳ دن کی عمر پائی ۔

مراسم تدفین اور مزار : انتقال کی صبح تدفین کا مسئلہ اٹھا کہ کہاں دفن کیا جائے۔ مختلف تجویزیں زیر بحث تھیں ۔ مولانا سراج الحق صاحب کی تجویز تھی کہ اکبر الہ آبادی کے پہلو میں دفن کیا جائے ۔ اور مشترک لوح مزار پر حسبِ ذیل عبارت کندہ کی جائے

" ہندوستان کے دو بڑے شاعر اصغر و اکبر "

ابھی کچھ طے نہیں ہوا تھا کہ اصغر صاحب کے داماد صدیق احمد صاحب اندر سے نکلے اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ اصغر صاحب نے وصیت کی تھی کہ

" میرے مرنے کے بعد تم خود حضرت حکیم شاہ نعمت اللہ صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جانا اور نہایت عاجزی سے میری آخری تمنا یہ ظاہر کرنا کہ حضرت شیخ کے احاطہ مزار میں دفن کرنے کی اجازت دے دیجئے ۔

۱۔ و من الیل فتہجد بہ نافلۃ لک ، عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محموداً ۔
اور رات کو تہجد پڑھو ۔ یہ تمہارے لئے نفل ہے ۔ بعید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں " مقام محمود " پر فائز کر دے ۔ (بنی اسرائیل ۷۹ ۔ تفہیم القرآن جلد دوم ص ۶۳۷)

۲۔ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۳۰

۳۔ ۱۹۳۶ء میں رمضان کی پہلی تاریخ اتوار کی تھی ، اس حساب سے ۲۹ نومبر کو اتوار رمضان کی ۱۵ تاریخ ہوئی ---" بحساب تقویم ہجری و عیسوی " شائع کردہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی ۱۹۵۲ء ۔ اور

اگر وہاں سے ناکامی ہو تو کہیں اور دفن کرنا ۔"

خواہش کے مطابق اجازت بآسانی مل گئی ۔ اور مزار شاہ محب اللہ الہ آبادی کے پائینتی مدفون ہوئے ۔[1]

غسل میت مولوی مرتضیٰ حسین خان صاحب (مرید مولانا تھانوی) نے دیا۔ جنازے کے ساتھ بے شمار لوگ (ہندو مسلمان) تھے ۔ عمائدین شہر ، عدالت عالیہ اور خفیفہ کے وکلا اور جج ، سرکاری اعلی عہدیداروں کے علاوہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور ہندستانی اکیڈمی کے عہدیدار اور کارکن بطور خاص شریک تھے ---- شرکت کرنے والوں میں حسب ذیل حضرات کے نام معلوم ہو سکے ہیں :

۱۔ مولانا سید محمد عیسیٰ صاحب خلیفہ ارشد مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح

۲۔ شاہ نعمت اللہ صاحب ۔ سجادہ نشین دائرہ شاہ محب اللہ رح[2]

ان دونوں حضرات کا شمار اپنے زمانہ کے اہل اللہ اور اہل باطن میں تھا ۔

ان کے علاوہ

"(۳) ڈاکٹر تارا چند ۔ پروفیسر شعبہ تاریخ الہ آباد یونیورسٹی ۔ جنرل سکریٹری ہندستانی اکیڈمی

(۴) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ۔ صدر شعبہ فارسی و عربی ۔ الہ آباد یونیورسٹی

(۵) ڈاکٹر حفیظ سید ۔ پروفیسر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی

(۶) مولانا سراج الحق مچھلی شہری

(۷) مولانا شاہ عبدالمعبود صاحب ۔ سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل ۔ الہ آباد

(۸) شاہ محمد حسین صاحب ۔ رفیق کار جناب اصغر ، ہندستانی اکیڈمی "[3]

اپنے دوران سفر ہندوستان[4] میں ، میں نے چاہا تھا کہ الہ آباد جا کر اصغر کے مزار کا فوٹو نیز دوسری تفصیلات حاصل کروں لیکن ویزا نہ ملنے کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔

۱۔ نقوش لاہور ۔ شخصیات نمبر جلد دوم ۔ اصغر گونڈوی از صغیر احمد صدیقی ۔ ص ۱۲۸۷

۲۔ آخری حملے اور مراسم تدفین کی بیشتر تفصیلات مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری کے مضمون " اصغر گونڈوی کے چند ادبی افادات " ۔ مطبوعہ اصغر مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۲۲-۲۰ سے حاصل کی گئی ہیں ۔

۳۔ بحوالہ مکتوب جناب شاہ محمد حسین صاحب بنام جناب سید رشید احمد مرقومہ ۱۸جون ۱۹۶۲ء

۴۔ مقالہ نگار نے مئی جون ۱۹۷۰ء میں ہندوستان کا سفر اختیار کیا ۔ مرکز فیض آباد ، جناب سید رشید احمد صاحب کا دولتکدہ تھا ۔ ارادہ گونڈہ ، لکھنئو دریاباد (ضلع بارہ بنکی) اور الہ آباد جانے کا تھا مگر ویزا نہ ملنے کی وجہ سے نہ جا سکا ۔

جناب سید رشید احمد صاحب ، ساکن ابو سرائے فیض آباد نے از راہ شفقت اور علم پروری میرے لئے الہ آباد کے سفر کی زحمت گوارا فرمائی اور مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری کی معیت میں ، اصغر صاحب کے مزار پر ، دائرہ شاہ محب اللہ ، واقع کنارے دریائے جمنا محلہ کھڈ گنج نئی بستی ، الہ آباد ، حاضر ہوئے ۔ ان کے تاثرات کا خلاصہ درج ذیل ہے :

" میں اصغر صاحب کے مزار پر ، مولانا سراج الحق صاحب کے ہمراہ فاتحہ خوانی کی غرض سے گیا ۔ دیکھ کر افسوس ہوا ۔ شاہ محب اللہ رح کے پائینتی دو کچی قبروں کے نشان ہیں ۔ جب تک بتایا نہ جائے پتہ لگانا مشکل ہے کہ اصغر کی قبر کون سی ہے ۔ نہ تعویذ ، نہ لوح مزار ، نہ کتبہ ۔"

راقم مقالہ کے ذہن میں ، اس منظر کے تصور سے فارسی کا حسب ذیل شعر تازہ ہو گیا ؎

بر مزار ما غریبان نے چراغ نے گلے　　نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اگر بغور دیکھا جائے تو یہ بھی اصغر کی فطرت اور خواہش کے عین مطابق ہے ۔ جو شخص زندگی میں نام و نمود سے گریزاں و بے نیاز رہا ۔۔ مرنے کے بعد تعویذ ، لوح مزار اور کتبہ ، کا بار کیوں کر اٹھاتا ۔ چنانچہ " جہاں بے نشاں " کی دعوت پر پرواز[1] کر جانے والے اصغر کے شوق فراواں اور آرزوے شدید کے احترام میں ، مشیت الہی نے زمانہ میں اس کا کوئی نشان نہ چھوڑا اور اس کو " بے نشاں " کر دیا ۔۔۔ " بے نشان " جو ہر صاحب نشان کا مقسوم و مقدر ہے ۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ

اصغر کے انتقال پر ملک کے بیشتر جرائد و رسائل نے اظہار تعزیت اور ان کی شاعرانہ عظمت اور ادبی خدمت کا اعتراف کیا ۔ رسالہ ہندستانی ، ہندستانی اکیڈمی الہ آباد نے جنوری ۱۹۳۷ء کے شمارے میں ، کالم چوکھٹے میں ، ڈاکٹر تارا چند ، جنرل سکریٹری کی طرف سے یہ خبر شائع کی جسے بجنسہ نقل کیا جاتا ہے :

مولوی اصغر حسین اصغر مرحوم

مولوی اصغر حسین اصغر گونڈوی اپنے ادبی ذوق اور شاعری کے امتیاز کے لحاظ سے دنیائے اردو میں محتاج تعارف نہیں ۔

١۔ جہاں بے نشاں سے دعوت پرواز ہے ساقی　　اصغر

اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شاعری معنوی خصوصیات اور جذبات تصوف و تغزل میں بلند مرتبہ رکھتی تھی ۔ شاعری کی طرح ان کا مذاق ادب بھی شستہ ، سنجیدہ اور بلند مرتبت تھا ۔

افسوس ہے کہ کم و بیش ایک سال[1] تک مرض فالج میں مبتلا رہ کر ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء روز دوشنبہ صبح کے وقت انتقال کر گئے ۔ ہم کو ان کے پسماندوں اور ماتم گسار وسیع حلقہ احباب کے ساتھ دلی ہمدردی ہے ۔

اصغر مرحوم کی وفات نہ صرف رسالہ ہندوستانی بلکہ دنیائے اردو کے لئے ناقابل تلافی حادثہ ہے ۔

جنرل سکریٹری

......

۱۔ ایک سال نہیں دو سال ، ان پر فالج کا دوسرا حملہ اکتوبر نومبر ۱۹۳۴ء میں ہوا تھا ۔

باب دوم

نقوش و آثار

صفحہ

۱- شعرگوئی :

(الف) آغاز ۱۷۳
(ب) اساتذہ ۱۷۶
(ج) تلامذہ ۱۷۹
(د) طریق اصلاح ۱۸۸

۲- آثار نظم :

(الف) ابتدائی کلام ۱۹۰
(ب) مدوّن کلام : ۱۹۱
۱) نشاط روح ، ۱۹۲۵ء ۱۹۱
۲) سرود زندگی ، ۱۹۳۵ء ۱۹۹
(ج) متروکات :
۱) ابتدائی کلام ۲۰۳
۲) نشاط روح ۲۰۳
۳) سرود زندگی ۲۱۳
(د) غیر مدوّن کلام ، ۳۶-۱۹۳۵ء ۲۱۶

۳- آثار نثر :

(الف) کتب :
۱) اردو شاعری کی نئی تاریخ ۲۲۰
۲) سلسلۂ تحاشت ۲۳۰
۳) یادگار نسیم (مقدمہ، ترتیب و تحشیہ مثنوی گلزار نسیم) ۲۳۲
۴) دیوان مظہر جان جاناں (مقدمہ و ترتیب) ۲۳۳
(ب) مضامین و مقالات ۲۳۹
(ج) متفرقات ۲۳۱
(د) تراجم ۲۳۲
(ہ) مکتوبات ۲۳۳

شعر گوئی

(الف) آغاز :

شاعری کی صلاحیت فطری ہوتی ہے البتہ فضا سازگار اور ماحول موافق مل جائے تو اس سے شعر گوئی کی تحریک و ترغیب اور صلاحیت شعری کا ارتقاع و تہذیب ہوتی ہے ۔

دہلی کے بعد جب مرکز شاعری فیض آباد سے لکھنئو منتقل ہوا تو اودھ میں شعر و شاعری کا عام چرچا ہوا اور دور افتادہ قصبات و دیہات بھی اس شریفانہ مشغلہ کا گہوارہ بن گئے ---- گونڈہ بھی جو فیض آباد کے جوار میں ہے (فیض آباد سے صرف ۳۲ میل شمال ، دریائے گھاگرہ کے اس پار) ۔ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا ۔ اصغر کی ولادت گونڈہ میں ہوئی ، مچھلی شہر اور فیض آباد کی شاعرانہ فضا میں ہوش سنبھالا[1] ۔ ۱۲، ۱۵ سال کی عمر میں جب دوبارہ گونڈہ پہنچے تو منشی خلیل احمد صاحب وجد بلگرامی اور پنڈت کیف جیسے نامور شعرا کی وجہ سے ، وہاں بھی شعر و شاعری کی فضا تیار پائی ۔ عجب نہیں کہ اصغر کی طبیعت میں شاعری کی تحریک وہیں ہوئی ہو ۔ لیکن جب وسط ۱۹۰۶ء میں حرول روڈ ان کی ملازمت کا مرکز و مستقر ہوا تو وہاں کے رئیس سید علی حیدر صاحب تعلقہ دار کی صحبتوں میں دبی ہوئی صلاحیت تیز تر ہوگئی ہو ۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سید علی حیدر صاحب کی ایک جھلک پیش کر دی جائے تاکہ اصغر کے محرکات شاعری کے پس منظر میں ان کی شعرگوئی کی ابتدا سمجھ میں آ سکے ۔

۱- اصغر ۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۸ء مچھلی شہر اور فیض آباد میں رہے ۔ مچھلی شہر میں ان کا قیام ۲ سال رہا (بحوالہ مولوی سراج الحق صاحب مچھلی شہری ۔ بحوالہ " ظفر بابا " ظفر بابا اصغر کے دیوار بیچ پڑوسی اور دوست تھے ۔ مکتوب ۲۲ فروری ۱۹۲۹ء ---- آخر چار سال فیض آباد میں رہے ۔ اس وقت اصغر کی عمر ۸ تا ۱۲ سال تھی ۔ مچھلی شہر جون پور کا ایک مردم خیز قصبہ ہے جہاں علما اور شرفائے جونپور کی خاصی آبادی ہے ۔ جنھوں نے اپنی شخصیت سے علم و فضل اور شعر و شاعری کا چراغ روشن کر رکھا تھا ۔ فی زمانہ بھی مچھلی شہر میں مشہور و معروف شاعر موجود ہیں ---- فیض آباد لکھنئو کا نقش اول ہے جہاں علماء فضلا اور شعرائے دہلی کے خاندان کے خاندان آباد ہو گئے ۔ انھوں نے وہاں علم و فضل و شعر و ادب کی فضا قائم کی اور اس کی روایت کو برقرار رکھا ۔

جناب سید علی حیدر صاحب کے سلسلے میں جناب سید رشید احمد صاحب رقمطراز ھیں :

" عہد قدیم میں جرول (ضلع بہرائچ) مسلم شرفا کا ایک مردم خیز قصبہ تھا .... جہاں شعر و سخن کا زیادہ چرچا تھا اور جہاں اکثر بڑے صاحبان علم و فن پیدا ھوئے ۔ انھیں کی باقیات میں سید علی حیدر صاحب دل تعلقدار جرول تھے ۔ ان سے اصغر کے مراسم پیدا ھوئے ۔ حضرت دل بڑے قادرالکلام اور زودگو شاعر تھے ۔ ان کی فکر سخن کا انداز یہ تھا کہ حقہ بھر کر سامنے رکھ دیا گیا اور مصرع طرح پیش ھوا ۔ وہ حقہ کا کش لے کر آنکھیں بند کر لیتے اور ھر کش پر شعر نازل ھوتے چلے آتے .... ان کی بزم سخن شاعری کا اکھاڑا بن جاتی .... جس میں یاران نکتہ دان کے لیے عرض ھنر کی صلاے عام ھوتی ...... مجھے کئی بار اس تماشے کو دیکھنے کا ...... اتفاق ھوا [1]۔"

اس ماحول کا اصغر صاحب کی طبیعت پر گہرا اثر ھوا اور ۱۹۰۶ء کے قریب وہ کچھ پیوند کاری کرنے لگے اور ۱۹۰۷ء میں انھوں نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی ۔

اصغر کی شعر گوئی کی ابتدا کے بارے میں جناب سید رشید احمد صاحب لکھتے ھیں :

" ان کی شاعری کی ابتدا ۱۹۰۶ء سے ھوئی [2]۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ھیں :

" شعر و سخن سے انھیں فطری مناسبت تھی ۔ وہ بچپن ھی سے اکثر اساتذہ کے شعر گنگنایا کرتے تھے ۔ رفتہ رفتہ انھوں نے کچھ پیوندکاری شروع کر دی اور ۱۹۰۷ء کے لگ بھگ وہ شعر کہنے لگے [3]۔"

اگرچہ مذکرہ بالا اقتباسات کے علاوہ اصغر کی " شعر گوئی کی ابتدا " سے متعلق کوئی اور معاصر شہادت دستیاب نہیں ھوئی لیکن بعض دوسرے قرائن و شواھد سے رشیدصاحب کے بیان کی تصدیق و توثیق ھوتی ھے ۔

(۱) مثلاً" جناب مرزا احسان احمد صاحب نے اصغر کے مشورۂ سخن کے بارے

۱۔ جامعہ دھلی اپریل ۱۹۶۷ء ۔ " اصغر صاحب " از سید رشید احمد ۔ ص ۲۰۲

۲۔ ایضاً ۔ ص ۲۰۱

۳۔ جامعہ دھلی اپریل ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۰۳

میں لکھا ہے کہ

" ابتدا میں کچھ دنوں منشی خلیل احمد وجد بلگرامی کو اپنا کلام دکھاتے رہے [۱] ۔"

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے بھی قریب قریب یہی بات تحریر فرمائی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" گونڈے کے قیام کے زمانے میں بہت سے لوگ وجد کے شاگرد ہوئے ...
... جناب اصغر گونڈوی نے بھی ابتدا میں ان سے اصلاح لی ہے [۲] "

جناب وجد کا انتقال ۱۹۰٦ء یا ۱۹۰۷ء میں ہوا [۳] گویا ۱۹۰٦-۱۹۰۷ء میں اصغر باقاعدہ طور پر شعر کہنے لگے تھے ۔

اس کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ اصغر کے ابتدائی زمانہ کے چار شعر (دیکھئے " مستردات " مقالہ ہذا ص) خم خانۂ جاوید جلد اول ص ۳۲۸ پر حسب ذیل نوٹ کے ساتھ شائع ہوئے ہیں ۔

" منشی اصغر حسین اصغر ۔ مقیم گونڈہ نوجوان خوشفکر شاعر ہیں ۔ رسالہ " فتنہ " میں کچھ کلام نظر سے گزرا ۔ چند اشعار منتخب ہو کر ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں [۴] ۔"

" خم خانۂ جاوید " جولائی اگست ۱۹۰۸ء تک شائع ہو چکا تھا ۔ اس پر " فتنہ و عطر فتنہ " ۹ ستمبر ۱۹۰۸ء کے شمارے میں تبصرہ ہوا ہے --- " خم خانۂ جاوید " کے دیباچہ کی تاریخ ترقیم ۱۵ مارچ ۱۹۰۸ء ہے ۔ لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ اصغر کی غزل ۱۵ مارچ ۱۹۰۸ء سے پہلے کے کسی شمارے میں شائع ہوئی ہوگی ۔

راقم مقالہ نے فتنہ و عطر فتنہ کے حسب ذیل فائل لیاقت نیشنل میوزیم لائبریری کراچی میں کھنگال ڈالے ۔

۱۸۸۲ء تا ۱۸۸٦ء ، ۱۸۹۱ء ، ۱۸۹۸ء ، --- ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۵ء ، ۱۹۰۸ء ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء ، لیکن ان میں اصغر کی غزل کے وہ متذکرہ بالا اشعار ملے نہ کوئی اور غزل نظر پڑی ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ " اشعار مذکور " ۷ - ۱۹۰٦ء کے کسی شمارے میں شائع ہوئے ہوں گے ۔

---

۱ ۔ مقدمہ نشاط روح طبع دوم صدیق بک ڈپو لکھنئو ۔ ص ۷
۲ ۔ " کچھ بکھرے ہوئے ورق " از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ۔ ہندستانی اکتوبر ۱۹۳۳ء ۔ ص ۲۸۳
۳ ۔ ایضاً
۴ ۔ خم خانۂ جاوید جلد اول ۔ ص ۳۲۸ ۔ مطبوعہ نول کشور پریس لاہور ۱۹۰۸ء

ان شواھد سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ھے کہ اصغر نے ۷-۱۹۰۶ء میں شاعری کر دی تھی یہاں تک کہ ان کا کلام " فتنہ " جیسے رسالہ میں شائع ھونے لگا تھا ۔

(۲) اصغر کے اساتذہ :

اصغر کے " مشورۂ سخن " کے بارے میں جناب عبدالشکور صاحب لکھتے ھیں :

" جہاں تک معلوم ھوا ھے اصغر نے کسی شاعر کو اپنا استاد نہیں بنایا ۔ نہ کسی سے اصلاح حاصل کی اور نہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ۔ خود اپنے ذوق پر بھروسہ کرتے رھے[۱] ۔"

اس بیان کی توثیق وہ دوسری جگہ یوں کرتے ھیں :

" کسی کہنہ مشق استاد سخن سے اصلاح لینے سے اس قدر فائدہ ضرور ھوتا ھے کہ اشعار کی خارجی تہذیب و ترتیب میں ضرور مدد مل جاتی ھے ۔ الفاظ کے صحیح استعمال زبان کے محاوروں سے واقفیت ضرور ھو جاتی ھے ۔ لیکن اصغر کو جن حضرات نے دیکھا ھے اور جن کو ان کے حالات کا علم ھے وہ جانتے ھیں کہ منگلور شریف کے آستانہ مبارک پر سر جھکا دینے کے بعد اصغر کے لیے محال تھا کہ وہ کسی اور بت کے سامنے سر جھکاتے ۔ چنانچہ شاعری میں خود اپنے ذوق کو رھبر بنایا اور وہ اسرار و معارف جو حسن و عشق کے مختلف منازل میں ان کو حاصل ھوتے رھے ان کے کلام کا سر چشمہ حیات بنے[۲] ۔"

شکور صاحب کے بیان کے تجزیے سے حسب ذیل باتیں مستنبط ھوتی ھیں :

(۱) اصغر نے شاعری میں کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا ۔

(۲) قاضی عبدالغنی صاحب منگلوری کے آستانے سے حسن و عشق کے جو اسرار و معارف انھیں حاصل ھوئے وھی اسرار و غوامض اصغر کی شاعری کا سرچشمہ ھیں ۔ ان کے حصول کے بعد کسی اور استاد کی ان کو ضرورت نہیں محسوس ھوئی ــــ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ قاضی صاحب نے اصغر کو سلوک و معرفت کے منازل ھی طے نہیں کرائے بلکہ راہ شاعری کا بھی سالک بنا دیا ۔

۱۔ " اصغر اور اس کی شاعری " ۔ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۱۶۶

۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۶۷

شکور صاحب کا مندرجہ بالا بیان دراصل جناب مظہر عزیز صاحب کے درج ذیل بیان کی صدائے بازگشت ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

" مجھے ایک قابل وثوق ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ اصغر کی شاعری کی بنیاد منگلور ہی میں پڑی تھی "* ۔ اصغر کے " پیر بھائی " کا بیان ہے .... اپنے حلقۂ مریدین میں جب قاضی صاحب جلوہ افروز ہوتے تو اصغر بھی ایک طرف خاموش اور مودب بیٹھے ہوتے اور اگر کبھی قاضی صاحب کی نظر توجہ اپنی طرف پاتے تو چند اشعار ایک پرچے پر لکھ کر خدمت میں پیش کر دیتے ۔ قاضی صاحب پڑھتے اور پڑھ کر صرف اتنا فرماتے واہ بھئی اصغر تو نے بہت خوب کہا ہے ۔[1] "

مظہر عزیز صاحب نے اگرچہ واضح الفاظ میں اظہار نہیں کیا کہ اصغر نے شاعری میں کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا ـــــ لیکن "شاعری کی بنیاد منگلور ہی میں پڑی " کے اعلان اور " قابل وثوق ذریعہ " کے ذکر اور اپنی عبارت کے بین السطور معنی سے شکور صاحب کی تخئیل کو حقایق کی دنیا سے بہت دور پہنچا دیا اور انھوں نے سرے سے اس واقعہ ہی کا انکار کر دیا کہ " اصغر شاعری میں کسی کے شاگرد تھے ۔ "

مذکرہ بالا دونوں بیانات (شکور صاحب اور مظہر عزیز صاحب کے) امر واقعہ کے خلاف ہیں ۔ ان میں حقیقت سے زیادہ عقیدت کارفرما ہے ۔ قاضی صاحب کے روحانی تصرف بجا ، اصغر کا اکتساب فیض باطنی درست ـــــ البتہ عام قاری یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اصغر کے غواص شاعری کے فہم ، بدیع و بیان کی نزاکتوں پر عبور اور اظہار و ابلاغ پر قدرت میں ، قاضی صاحب کا کونسا ہاتھ تھا ـــــــ مولانا سراج الحق مچھلی شہری[2] اور مرزا احسان احمد صاحب نے اصغر کے کلام کی سرمستی و سرخوشی کے پیش نظر انھیں حافظ کہا ہے ـــــــ لیکن[3]

۱ـ اصغر گونڈوی اور اس کا طرز نظر از مظہر عزیز بحوالہ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور ـ ص ۱۲-۱۳

*ـ مظہر عزیز صاحب نے " راوی " کا نام نہیں لکھا ـ اسکے قابل اعتماد ہونے میں شبہ نہیں مگر پیری و مریدی کی دنیا میں فضا اتنی "عقیدت آلود" ہوتی ہے کہ "مریدان می پرانند" عام بات ہوتی ہے ـــــ مظہر عزیز صاحب کا یہ بیان غلط ہے کہ " اصغر کی شاعری کی بنیاد منگلور میں پڑی " ـــــ اصغر ۷-۱۹۰۶ء میں شاعری شروع کر چکے تھے اور بیعت ۸ یا ۹ سال بعد وسط ۱۹۱۵ء کے قریب ہوئی (تفصیل دیکھئے مقالہ ھذا ص)

۲ـ اصغر ـ مرتبہ عبدالشکور ـ ص ۱۲

۳ـ مقدمہ نشاط روح طبع دوم ـ ص ۲۳

یہ حضرات " اصغر کی طلاقت لسان " کو کسی بابا کو ہی کے مزار کا فیضان ثابت کرنا چاہتے ہیں -

حیرت ہے کہ عبدالشکور صاحب نے اپنے مضمون " اصغر اور اس کی شاعری " میں مقدمہ نشاط روح (مرزا احسان احمد) پر تعریضاً تبصرہ[2] کیا ہے لیکن مرزا احسان احمد صاحب کی حسب ذیل تحریر ، ان کی نظر سے کیسے رہ گئی :

" ابتدا میں کچھ دنوں منشی خلیل احمد وجد بلگرامی کو اپنا کلام دکھاتے رہے - آخر میں کچھ غزلیں منشی امیر اللہ تسلیم کو دکھلائیں[3] "

معلوم ہوتا ہے کہ شکور صاحب نے مرزا احسان احمد صاحب کے بیان کو غلط سمجھ کر اسے کوئی اہمیت نہیں دی یا اصغر کی شاعری کو "کرامت مرشد " ثابت کرنے کے لیے اسے نظر انداز کر دیا ـــ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ امر واقعہ وہی ہے جس کی طرف مرزا احسان احمد صاحب نے اشارہ کیا ہے - مرزا احسان احمد صاحب کے بیان کی تصدیق جناب سید رشید احمد صاحب کی تحریر سے بھی ہوتی ہے - وہ فرماتے ہیں :

" انھوں نے چند ابتدائی غزلیں ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان امیر اللہ تسلیم کو خط و کتابت کے ذریعہ دکھائی تھیں[4] - "

اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا حوالہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے - ان تینوں بزرگوں کا قول شکور صاحب کے مقابلے میں معتبر اور مستند ہے - کیوں کہ ان کے بیانات کو اصغر صاحب کی تصدیق و تائید[5] حاصل تھی ـــ ان حضرات کے بیان کا خلاصہ حسب ذیل

۱- شعرالعجم حصہ دوم - مطبوعہ شیخ مبارک علی اندرون لوہاری دروازہ لاہور - ۱۹۳۶ء ص ۱۲۲ -

۲- اصغر - عبدالشکور - ص ۱۹۱

۳- مقدمہ نشاط روح طبع دوم - ص ۷

۴- جامعہ اپریل ۱۹۶۷ء " اصغر صاحب " از سید رشید احمد - ص ۲۰۳

۵- مرزا احسان احمد اور سید رشید صاحب نے بالتصریح راقم مقالہ کو لکھا (۱) میں نے نشاط روح میں جو حالات درج کیے ہیں ان کا علم خود اصغر صاحب سے ہوا - مکتوب جناب مرزا احسان احمد بنام راقم مقالہ ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء - (۲) رشید صاحب تحریر فرماتے ہیں " نشاط روح پر مقدمہ لکھوانے کے سلسلے میں ان امور پر بات ہوئی تھی ـــ خود اصغر کے بتانے پر ان امور کا علم ہوا " مکتوب جناب سید رشید احمد بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲۴ نومبر ۱۹۷۰ء - (۳) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تحریر ہندستانی اکتوبر ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی جو اصغر کے زیر ادارت شائع ہوتا تھا - اگر یہ غلط ہوتا تو اصغر ضرور تصحیح کرا دیتے -

ہے :

" اصغر نے ۷-۱۹۰۶ء میں باقاعدہ شاعری شروع کر دی تھی - سال دو سال وحید بلگرامی کو غزلیں دکھائیں جو گونڈے ہی میں مقیم تھے - ان کے انتقال کے بعد تقریباً ۲ ، ۳ سال ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۱ء منشی امیر اللہ تسلیم سے ، خط و کتابت کے ذریعہ اصلاح سخن لی - جب ان کا بھی انتقال ہو گیا تو کسی اور سے رجوع نہیں کیا - اپنے ذوق سلیم پر اعتماد کیا -"

(ج) اصغر کے تلامذہ :

اصغر نہ صرف یہ کہ شاگردی استادی کے قائل نہیں تھے بلکہ اس کو عار سمجھتے تھے - ان کا خیال تھا کہ اردو کے اکھاڑے اسی وجہ سے وجود میں آئے کہ فطرت نے جن کو شاعر نہیں بنایا وہ بھی اصلاح لے لے کر شعر گوئی کی دنیا میں کود پڑے - وہ فرماتے تھے " جس کی فطرت میں شاعری ودیعت ہوتی ہے وہ خود اپنا نقاد ہوتا ہے - وہاں استادی و شاگردی چہ معنی دارد [1] " اس خیال کے پیش نظر انہوں نے " رسمی استادی " کو نہ فن بنایا نہ پیشہ اور نہ " کاریگران شعر " اور " شاعران کاریگر " کی طرح شاگردوں کی فوج تیار کی ----- وہ " اصطلاحی معنوں " میں شاید کسی کے بھی استاد نہیں ہیں - البتہ جن لوگوں نے عقیدتاً خود کو ان کا شاگرد ظاہر کیا ہے یا ان کی صحبت و ہم نشینی کی وجہ سے لوگ ان کو اصغر کا شاگرد سمجھتے ہیں ان کے نام ذیل میں دیئے جاتے ہیں :

(۱) جگر مراد آبادی

(۲) کوشن سہائے ھتکاری - وحشی کانپوری

(۳) صغیر احمد جان - صغیر

(۴) سراج الحق صاحب سراج مچھلی شہری [2]

(۱) جگر مرادآبادی :

جگر کے متعلق شروع میں یہی خیال تھا اور بعض حلقوں میں اب بھی ہے کہ جگر صاحب اصغر کے شاگرد ہیں [3] لیکن اس میں ذرا بھی حقیقت نہیں - جگر اصغر

۱- بحوالہ مکتوب جناب علی ظہیر - سید سروان - الہ آباد بنام راقم مقالہ مرقومہ ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء

۲- بحوالہ تحریر جناب مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری بنام راقم مقالہ - مولانا کی عبارت یہ ہے " میں تلامذہ اصغر میں صرف اتنے حضرات کو جانتا ہوں : بابو ... وحشی کانپوری - جگر صاحب - سراج الحق - صغیر احمد جان " - یہ تحریر راقم مقالہ کے پاس محفوظ ہے -

۳- مضمون ڈاکٹر محمد طفیل - " فروغ اردو " فروری ۱۹۶۱ء - ص ۲۰۱ بحوالہ جگر آثار و افکار ص ۱۲ -

۴- تاریخ زبان و ادب اردو مرتبہ صغیر احمد جان مطبوعہ محمد اشرف لاھور - ص ۱۲

کے شاگرد نہیں تھے[1]۔ اس کی تصدیق جناب ڈاکٹر محمد اسلام صاحب کی تحریر سے بھی ہوتی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" جگر اصغر گونڈوی کے ۔۔۔۔۔ شاگرد نہیں تھے ۔ کیوں کہ انھوں نے جہاں داغ اور رسا وغیرہ کا نام اپنے استادوں میں گنایا ہے ؟ اصغر کا نام نہیں لیا ہے ۔ جگر نے کہیں بھی نہ تو کسی کو کھل کر بتایا نہ لکھا کہ اصغر بھی ان کے استاد ہیں[2]۔"

تاہم جگر پر ایک زمانہ ایسا ضرور گزرا ہے جب ہر وقت کی صحبت و ہم نشینی اور اصغر کی قدآور شخصیت کے زیر اثر ، اصغر کے خیالات و افکار کا پرتو اور اسلوب و انداز کا عکس ، جگر کے اشعار میں نمایاں ہوتا ۔ اسی کو اصغر صاحب نے میرے اشعار کتر لینے سے تعبیر کیا ہے[3]۔۔۔ اصغر کے اثر کا اعتراف جگر کے ہر نقاد نے کیا ہے ۔ طوالت کے خیال سے اشعار نہیں دیے جاتے ۔

(۲) وحشی کانپوری :

کرشن سہائے ہنکاری وحشی کانپور میں غالباً وکیل تھے ۔ حالات معلوم نہ ہو سکے ۔ ان کا ذکر جگر کے سلسلے میں جناب احمر رفاعی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے " جگر آثار و افکار " میں اس طرح کیا ہے :

" ۱۹۲۱ء میں جگر کانپور پہنچے اس زمانہ میں ان کے تعلقات کرشن سہائے ہنکاری سے ہوئے ۔ اس کے بعد وہ بالعموم انھیں کے مکان پر ٹھہرنے لگے ۔۔۔۔۔ ثاقب کانپوری کے بقول ۱۹۲۲ء میں ان کے مکان پر ایک مخصوص بزم شعر خوانی میں جگر کی سحر طراز آواز سے تمام حاضرین بے پناہ طور پر متاثر ہوئے اور وحشی آنجہانی کا یہ حال ہوا کہ وہ کرسی سے اتر کر باقاعدہ فرش پر لوٹ لوٹ کر نعرہ ہائے تحسین بلند کرنے لگے[4]۔"

۱۔ مقالہ ھذا ۔ ص ۹۷

۲۔ جگر مرادآبادی حیات اور شاعری ۔ ص ۱۱۸

۳۔ بحوالہ تحریر مولانا سراج الحق صاحب بنام راقم مقالہ ۔ مولانا کی عبارت بزبان اصغر یہ ہے " جی ہاں جگر صاحب اپنے کو میرا شاگرد کہا کرتے ہیں اور کبھی کبھی میرے شعر کتر بھی لیا کرتے ہیں ۔"

۴۔ جگر آثار و افکار ۔ ڈاکٹر احمر رفاعی ۔ ص ۲۷

اس واقعہ سے اتنا مترشح ہوتا ہے کہ وحشی شعر سے حد درجہ متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ اصغر سے ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی کچھ نہیں کہا جا سکتا ، البتہ "یوم اصغر" ، حلیم مسلم کالج کانپور کے موقع پر ان کے توجہ سے[۱] ، اصغر سے ان کی عقیدت کا واضح ثبوت ملتا ہے ۔ ذیل میں اس کے تین بند دیے جاتے ہیں :

رائیگاں آخر دعاؤں کا اثر ہو ہی گیا　　　کارواں سے رہنمائے کارواں کھو ہی گیا
صفحۂ ہستی سے نقش زندگی دھو ہی گیا　　　موت کی آغوش میں بیمار غم سو ہی گیا
آتے آتے آخرش وقت زبوں آ ہی گیا
رفتہ رفتہ چشم تر میں دل کا خوں آ ہی گیا

آہ اصغر آہ اے ملک سخن کے تاجدار　　　سو بہاریں تیرے انداز تکلم پر نثار
تیرے مرنے کا نہیں ہوتا ہے، دل کو اعتبار　　　کیا یہ سچ ہے چل دیا تو دھر سے بیگانہ وار
کیا قیامت بن کے مرگ ناگہاں آ ہی گئی
کیا دلوں پر ناامیدی کی گھٹا چھا ہی گئی

اب سمجھ میں آ گئی میری یہ وجہ اتصال　　　موت آئی تھی تجھے دینے کو پیغام وصال
ڈھونڈتی پھرتی ہے تجھ کو اب تری شام ملال　　　اور تو جنت میں ہے محو تماشائے جمال
ہجر کے پردے میں وصل جان و جاناں ہو گیا
درد دل اتنا بڑھا آخر کہ درماں ہو گیا

(۳)<u>صغیر احمد جان صغیر :</u>

صغیر احمد جان صاحب کے حقیقی ماموں ڈاکٹر زبید احمد صاحب پروفیسر شعبۂ فارسی و عربی ، اصغر کے شیدائیوں اور عزیز دوستوں میں تھے ۔ جن دنوں صغیر صاحب ایم اے اردو میں زیر تعلیم تھے ، ان کا اصغر صاحب کے یہاں بڑا آنا جانا تھا ۔ ان دونوں رشتوں نے صغیر صاحب کو اصغر کا گرویدہ اور عقیدت مند بنا دیا تھا ۔

صغیر صاحب تقسیم سے پہلے دھلی کمرشل کالج دھلی میں اردو کے استاد تھے ۔ تقسیم کے بعد پاکستان آ گئے تھے اور صوبۂ سرحد میں محکمۂ تعلیم سے منسلک ہو گئے تھے ۔ آخری دنوں میں جب ایبٹ آباد گورنمنٹ کالج میں اردو کی تدریس کا کام کر رہے تھے سرطان کے موذی

۱۔ مشمولہ " اصغر " ، مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۸۰ ۔ ۷۸

مرض کا شکار ہو گئے اور لاہور میں انتقال کیا ۔

صفیر صاحب اصغر کے شاگرد نہیں تھے لیکن ان کے خیالات و افکار سے حد درجہ متاثر تھے ۔ اس حقیقت کا اظہار انھوں نے اپنے مجموعہ کلام " جذباتِ صفیر " میں "تمہید " کے زیر عنوان یوں کیا ہے :

" میں ان خیالاتِ پریشان کو اردو کے مایۂ ناز شاعر حضرت اصغر گونڈوی کی خدمت میں بطور ہدیۂ ناچیز پیش کرتا ہوں ۔ اگرچہ مجھے آپ سے باقاعدہ اور رسمی تلمذ کا شرف حاصل نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ " نشاطِ روح " نے میری روح افسردہ میں شاعرانہ نشاط پیدا کی اور آپ کے سوز و گداز کی شرر باریوں نے میرے دل مردہ میں جذبات کا حشر بپا کیا ۔ اگر میری ہرزہ سرائیوں میں ایک بات بھی کام کی ہے تو درحقیقت وہ یا تو آپ کے کلام معجز نظام کے مطالعہ کی برکت سے ہے یا آپ کے فیضانِ صحبت سے ۔

معجز نما کلام ہے اصغر کا اے صفیر افسردہ دل کو محشر جذبات کردیا ۱

صفیر صاحب ان معدودے چند اصحاب میں تھے جنھوں نے اصغر کے کلام کے مطالعے اور فیضانِ صحبت سے ان کا گہرا رنگ قبول کیا تھا ۔ جذباتِ صفیر میں تقریباً ۲۰، ۵۰ فیصدی غزلیں اصغر کی غزلوں پر کہی گئی ہیں جن میں اصغر کے خیالات کا سایہ اور زبان و بیان کا عکس صاف نظر آتا ہے ۔ ذیل میں اصغر اور صفیر کی غزلیں بالمقابل دی جاتی ہیں تاکہ صفیر صاحب کی " اثر پذیری " کا اندازہ ہو سکے ۔

غزل صفیر		غزل اصغر
پہلو میں دل نہ کوئی تمنا لئے ہوئے	۱	آنکھوں میں تیری بزم تماشا لئے ہوئے
پھرتا ہوں ایک ذوقِ تماشا لئے ہوئے		جنت میں بھی ہوں جنت دنیا لئے ہوئے
بیمار غم میں حسن عقیدت نہیں رہا	۲	پاس ادب میں جوش تمنا لئے ہوئے
خود ورنہ درد چارۂ دم عیسا لئے ہوئے		میں بھی ہوں اک حباب میں دریا لئے ہوئے
دنیا میں کوئی مائل جور و جفا بھی ہے	۳	صدحا تو لطف مے سے بھی محروم رہ گئے
پہلو میں اپنے ہوں دل شیدا لئے ہوئے		یہ امتیاز ساغر و مینا لئے ہوئے

۱۔ " جذباتِ صفیر " ۔ مجموعہ کلام جناب صفیر احمد جان مطبوعہ نور بک ڈپو ۔ ٹاؤن ہال دہلی ۱۹۳۲ء

دنیا سے جا رہا ہوں بصد شوق اے صفیر	۲	اصغر ہجوم درد غریبی میں اس کی یاد	
سینے میں اپنے حاصل دنیا لئے ہوئے		آئی ہے اک طلسم تمنا لئے ہوئے	
(جذبات صفیر - ص ۳۹)		(نشاط روح طبع دوم - ص ۲۳)	

صفیر صاحب کا مقطع ہر اعتبار سے جناب اصغر کے مطلع کا چربہ ہے - اس کے علاوہ تیسرے شعر میں اصغر کے حسب ذیل شعر کی جھلک نمایاں ہے :-

جانبازوں کے سینہ میں ابھی اور بھی دل ہیں پھر دیکھئے اک بار محبت کی نظر سے[1]

ایک دوسری غزل ملاحظہ ہو -

غزل صفیر		غزل اصغر
ہو کے گم کوئی جستجو نہ کرے	۱	فتنہ سامانیوں کی خو نہ کرے
مختصر یہ کہ آرزو نہ کرے		مختصر یہ کہ آرزو نہ کرے
چاک ہونے نہ دے گریباں کو	۲	پہلے ہستی کی ہے تلاش ضرور
اور جو ہو جائے تو رفو نہ کرے		پھر جو گم ہو تو جستجو نہ کرے
ابتدا یہ کہ شوق ہو سب کچھ	۳	ماورائے سخن بھی ہے کچھ بات
انتہا یہ کہ آرزو نہ کرے		بات یہ ہے کہ گفتگو نہ کرے
عشق میں آہ یہ زباں بندی	۴	(نشاط روح طبع دوم - ص ۹)
کوئی دل سے بھی گفتگو نہ کرے		
چشم پر شوق بھی صفیر ان سے	۵	
کاش کچھ شرح آرزو نہ کرے		
(جذبات صفیر - ص ۵۵)		

....

رگ رگ ہے ایک موجۂ طوفان آرزو	۱	ہر جنبش نگاہ تری جان آرزو
اللہ رے یہ جوش فراوان آرزو		موج خرام ناز ہے ایمان آرزو
شوق و نیاز ہے مرا ایمان آرزو	۲	جلوے تمام حسن کے آ کر سما گئے
برق نگاہ شوخ تری ، جان آرزو		اللہ رے یہ وسعت داماں آرزو
میخانۂ ازل میں نہیں کوئی بدنصیب	۳	میں اک چراغ کشتہ ہوں شام فراق کا
ہر جام میں ہے بادۂ عرفان آرزو		تو نوبہار صبح گلستان آرزو

۱- سرود زندگی - مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور - ص ۸۱

اک ذرہ بیش ہستی عالم نہیں یہاں ۴	چاہا جہاں سے منظر فطرت بدل دیا
کیا پوچھتے ہو وسعت داماں آرزو	ہے کل جہاں تابع فرمان آرزو
یہ سختیاں ہیں منزل ہستی ہی تک صغیر ۵	کوثر کی موج تھی تری ہر جنبش خرام
منزل کے اس طرف ہے گلستان آرزو	سیراب ہو گیاں چمنستان آرزو
(جذبات صغیر - ص ۵۶-۵۵)	(نشاط روح طبع دوم - ص ۲۶)

صغیر صاحب کا دوسرا شعر اصغر کے مطلع کا مثنیٰ معلوم ہوتا ہے -

(۳) سراج الحق مچھلی شہری :

مچھلی شہر ضلع جون پور کے رہنے والے ہیں - جب اصغر وسط جون ۱۹۲۷ء کے لگ بھگ الہ آباد پہنچے تو آپ گورنمنٹ کالج الہ آباد میں برسر کار تھے اور فارسی و اردو کا درس دیتے تھے - جون ۱۹۲۸ء میں اصغر سے متعارف ہوئے اور ۱۹۳۶ء تک خلوص ، عقیدت اور محبت کے مراحل طے کرتے ہوئے ان کے مقربین میں شمار ہونے لگے - مولانا اصغر کے شیدائیوں میں ہیں - ابھی بقید حیات ہیں - آپ کا فرمانا ہے کہ " اصغر میرے ادبی استاد ، میرے ذہنی رہبر ، میرے اخلاقی شفیق رہنما تھے"[1]

مولانا کو شاعری بقول خود بیماری کی طرح لاحق تھی - شاعری کی دلچسپی اور انہماک میں کئی کئی دن گھر نہ جاتے[2] - آخر اصغر نے ایسا مجاہدہ کرایا کہ شاعری سے طرت ہو گئی اور ...... چھوٹ گئی[3] -

مولانا نے میری استفسار پر اپنے مختصر حالات زندگی اور منتخب اشعار لکھے ہیں جو بجسنہ نقل کئے جاتے ہیں :

" سراج الحق ابن حافظ فضل حق صاحب سررشتہ دار کلکٹری نسباً صدیقی والد صاحب بسلسلہ ملازمت فتحپور - فتحگڑھ - متھرا - ایٹہ - آگرہ رہے میں متھرا میں مارچ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوا - آگرہ جامع مسجد کے مدرسہ عربیہ میں ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم پائی - پھر سلسلہ چھوٹ گیا - وطن مچھلی شہر ضلع جون پور ہے - ۱۹۱۸ء میں اٹاوہ میں شادی

۱- اصغر مرتبہ عبدالشکور - ص ۳۰

۲- ایضاً - ص ۳۷

۳- ایضاً - ص ۳۸

ھوئی ، شادی کے بعد پھر مصباح العلوم الہ آباد میں تعلیم عربی کی تکمیل کی اور محکمۂ تعلیم کے امتحانات ملا فاضل ۱۹۲۰ء میں پاس کئے اور ۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ کالج الہ آباد میں مدرس عربی و فارسی مقرر ہوا ۔ برابر الہ آباد ھی میں رہا البتہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۰ء تک فتحپور فتحگڑھ کانپور کے اسکولوں میں تبدیل ہو کر ۱۹۴۷ء میں پھر الہ آباد واپس آ گیا ۔ ۱۹۲۸ء میں اصغر صاحب سے ملا جب وہ انڈین پریس (الہ آباد) میں صیغۂ تصحیح میں تھے وھیں جگر صاحب سے تعارف ہوا ۔ اکثر مشاعروں میں اصغر صاحب لے جا کر شرکت کرتے ۔ ۱۹۵۱ء میں پنشن لے کر خانہ نشین ہوا ۔ ۱۹۳۶ء میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوا اور اس سلسلہ کا خادم بن کر زندگی گزار رہا ہوں ۔ اشعار کا نمونہ یہ ھے :

تجلّی ، تبسّم ۔ نگاھیں ۔ ادائیں
ھم اس دل کو آخر کہاں تک بچائیں
ابھی میں تمھیں یاد ھی کر رہا تھا
ادھر آؤ لے لوں ، تمھاری بلائیں

.. ..:..

" عافیت دشمن " بھی ھے ، خوں ھو کے بہتا بھی نہیں
آہ بخشا ھے خدایا تو نے یہ کیسا دل مجھے
گو مری فطرت برابر ابا ہی کرتی رہی
مبتلائے رنگ و بو ، کر کے رہا یہ دل مجھے

وہ تو کہئے " حیرت جلوہ " نے لب ھی سی دیئے
ورنہ رسوا کر چکا تھا اضطراب دل مجھے
اٹھتی لہروں میں نہیں ھے کوئی راحت ، سراج
کیا صدا دیتے ہیں آخر یہ لب ساحل مجھے

... .

یہ طعن کم نگاہی دے کے کیوں بے پردہ ہوتے ہو
کہ میرے پاس بھی آنکھیں ہیں پہلو میں بھی دل ہے

......

امید زیست ہو بھی تو مسرت کو کیا کروں
ایذا ہو درد سے تو مداوا کی کوشش

......

سدا تھا مضطرب روز ازل سے شوق نے جو کچھ
وہی نغمہ بھرا ہے آج تک تار رگ جاں میں
ہوسناکی تھی جسکو عشق سمجھے تھے سراج ابتک
یہاں رنجش تو جائز ہی نہیں جمع رقیباں میں

......

رباعی تازہ

یہ ارض و سما ، فقر و غنا ، دشمن و دوست
یہ راحت و غم، آتش وشبنم ، مغزیہ پوست
ہے بات تو جب کہ سمجھو ان سب کو سراج
علماً " ہمہ زواست " اور حالاً " ہمہ او است

......

اصغر مرحوم وحدت الوجود کے قائل تھے - یہ رباعی کچھ انھیں کے رنگ کی ہو گئی ہے الحمدللہ - والسلام - سراج "[1]

اصغر کا اثر واضح کرنے کے لیے مولانا سراج الحق اور اصغر صاحب کی بعض ہم طرح غزلوں کے اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

سراج الحق	اصغر
جستجوئے گل سے یاروں کی غرض ہے بوئے گل	حسن بن کر خود کو عالم آشکارا کیجئے
"آپ" کو دیکھینگے ہم کو آپ پردا کیجئے	پھر مجھے پردہ بنا کر مجھ سے پردا کیجئے

۱- مکتوب مولانا سراج الحق بنام مقالہ نگار - مرقومہ ۱۵ اپریل ۱۹۷۱ء

ہر طرف انؐ کا جمال ان کا کمال ان کا پیام
خیرہ ذوقی ہے جو اب کوئی تمنا کیجئے
(مکتوب بنام مقالہ نگار ۱۵ اپریل ۷۱ء)

اک دل بیتاب پھر پہلو میں میں پیدا کروں
مسکرا کر پھر ذرا مجھ سے تقاضا کیجئے
رند ادھر بیخود ادھر دیر وحرم گرم طواف
عرش بھی اب جھوم کے آتا ہے دیکھا کیجئے
(سرود زندگی طبع اول - ص ۶۸)

......

تسلی بوالہوس کو دے ستم کو جو ستم سمجھے
کہ اہل دل ادائے حسن بے پروا سمجھتے ہیں
خزاں کے بعد گل، جوش نمو سے مضطرب کیوں ہو
فنا کو ہم تو راز روشنی دنیا سمجھتے ہیں
(مکتوب ۱۵ اپریل ۱۹۷۱ء)

نمود حسن کو حیرت میں ہم کیا کیا سمجھتے ہیں
کبھی جلوہ سمجھتے ہیں کبھی پردا سمجھتے ہیں
یکایک توڑ ڈالا ساغر مے ہاتھ میں لے کر
مگر ہم بھی مزاج نرگس رعنا سمجھتے ہیں
یہ جلوے کی فراوانی یہ ارزانی یہ عریانی
پھر اس شدت کی تابانی کہ ہم پردا سمجھتے ہیں
(سرود زندگی طبع اول - ص ۷۳)

......

ابھی خاص پر نہ انکے عہد و پیمان دیکھئے
پہلے انکے ہو، جئے پھر لطف و احسان دیکھئے
عقل کا اصرار، خال و خط یہ بھی رکھئے نظر
عشق کی خواہش، رخ جاناں کو حیران دیکھئے
دل فدا و جان فدا و دیں فدا ایمان فدا
پھر اسی پہلی نظر سے دیکھئے ہاں دیکھئے
(مکتوب ۱۵ اپریل ۱۹۷۱ء

تابہ کے آخر ملال شام ہجران دیکھئے
نالۂ نے کی طرح اڑ کر نیستاں دیکھئے
اک تبسم یا ترحم اک نظر یا نیشتر
کچھ نہ کچھ ہوگا پھڑکتی ہے رگ جاں دیکھئے
نالۂ رنگیں میں ہم مستوں کے ہے نکہت شراب
لڑکھڑائے پائے نازک دیکھئے ہاں دیکھئے
(سرود زندگی طبع اول - ص ۸۸)

......

مولانا[*] نے جا بجا اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ اصغر کے شاگرد ہیں اور انھوں نے ذہنی نقطہ نظر کے علاوہ شعر و ادب میں بھی اصغر سے بہت کچھ حاصل کیا ہے - اس ضمن میں انھوں نے اپنے بہت سے واقعات تحریر کئے ہیں جن میں سے دو ایک " طرز اصلاح " کے تحت درج کئے جائیں گے -

---

*- مولانا سراج الحق صاحب گورنمنٹ کالج الہ آباد میں فارسی کے استاد تھے - مقالہ نگار کو آپ سے مختلف کلاسوں میں فارسی کے درس حاصل کرنے کا شرف حاصل ہے - پڑھاتے وقت مولانا فارسی و اردو کے ہم مطلب اشعار سناتے جس سے سبق حد درجہ دلچسپ ہو جاتا - انھیں دنوں مولانا نے اصغر کے اشعار سنا کر ہمیں ان کا گرویدہ بنا دیا تھا -

اصغر کا طریق اصلاح :

اوپر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ اصغر رسمی استادی شاگردی کے قائل نہیں چنانچہ اول تو وہ کسی کی غزل دیکھتے نہیں تھے اور اگر کسی کی غزل پر اصلاح دیتے تو الفاظ و محاورات کی اصلاح کے بجائے " شاگرد کے خیالات کی رو " روح و وجدان کا رخ اور دل و دماغ کا قالب بدل دیتے تھے[1]

مولانا سراج الحق صاحب نے اصغر کی طرز اصلاح کے سلسلے میں بہت سے واقعات بیان کئے ہیں ۔ ان میں سے چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں ۔ مولانا فرماتے ہیں :

" ایک دن میں نے غزل کہی اور اصغر صاحب کے پاس انڈین پریس میں لے گیا .... فوراً رک گئے ...... دو گلوریاں منہ میں ڈالیں باتیں کرنے لگے ۔ میں نے کہا آج ایک غزل کہی ہے اصلاح کے لئے لایا ہوں ۔ یہ کہہ کر کاغذ میں نے نکالا اور اصغر صاحب کو دے دیا ۔ میں منتظر تھا کہ اساتذۂ فن کی طرح اصغر بھی اب قلم اٹھا کر بعض محاورات درست کریں گے ...... کسی مصرعہ کو کاٹ کر خود مصرع دیں گے .. .... لیکن یہ کچھ بھی نہ ہوا ۔ غزل پڑھ کر کاغذ مجھے واپس کر دیا ۔ خوب یاد ہے ۔ میرے ایک شعر پر ؎

اخذ و حصول کے لئے تسلیم شرط ہے

ذرے کی طرح مہر میں ذوق نظر کہاں

کے متعلق فرمایا ۔ ایک نازک سی بات کہتا ہوں اس میں ایک سوء ادب ہے ۔ مسلمات شعراء و عرفاء کے خلاف ہے یہ کہنا کہ " مہر " میں بہ مقابلہ ذرہ کے ایک نقص ہے ۔ اس شعر کے رکھنے میں کچھ حرج تو نہیں ہے ۔ لیکن نکال دیجئے تو اچھا ہے[2] ۔ "

دوسرا واقعہ =

ایک دن میں نے ایک اور غزل کہی ۔ سمجھانے گیا تو دیکھا کہ کپڑے پہن کر کہیں جانے کو تیار ہیں ۔ مجھے دیکھا تو کہا خوب آ گئے ۔ چلو چوک چلیں .... یکہ کیا اور چلے راستے میں میں نے کہا ایک غزل پر اصلاح لینی ہے ۔ کہنے لگے سنائیے ۔ میں نے سنائی ۔ کاغذ میرے ہاتھ

۱۔ ایک قدیم تحریر ۔ حضرت اصغر گونڈوی از مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری ۔ مخزونہ و مملوکہ مقالہ نگار ۔

۲۔ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۱۸

میں اور طریقہ اصلاح کی تمنا میرے دل ہی میں رہ گئی ۔ نہ انھوں نے کاغذ مانگا نہ میں نے دیا ـــــ فوراً ہی دوسری باتیں چھیڑ دیں اور غزل یا اصلاح کا کچھ ذکر نہیں کیا ۔ دوسرے دن فرمایا اچھا فلاں شعر تو سنایے ۔ میں نے سنایا ۔ کہنے لگے ۔ اس میں یہ خرابی ہے اس کو بدلنے کی خود ہی کوشش کیجئے [۱] ۔"

اسی قسم کا ایک اور واقعہ مولانا نے ۲ نومبر [۲] ۱۹۲۹ء کی نشست میں نقل فرمایا ۔ کہنے لگے " ایک روز اصغر صاحب کے سامنے میں نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

وہ کوئی اور ہوں گے جن کو ہو حاجت دلیلوں کی
یہاں تو قطرہ ہی کو دیکھ کے دریا سمجھتے ہیں

خیال تھا کہ اصغر صاحب پسند فرمائیں گے اور خوب داد دیں گے ۔ اصغر صاحب خاموش ذرا دیر کے بعد بولے " حضرت ! جب آپ قطرے کو دیکھ کے دریا کا یقین کر لیتے ہیں تو اور دلیل کیا ہوگی؟ آپ نے تو اپنے ہی پہلے مصرعہ کو غلط ثابت کر دیا [۳] ۔"

یہ تھی اصغر کی طرز اصلاح ۔ وہ شاگردوں کے ذہن پر زور ڈالتے تھے کہ پھر کوشش کر کے غلطی دور کریں ...... وہ دماغ کا سانچہ بدل دینے اور خیالات کے بہاؤ کا رخ پھیر دینے کی اصلاح کرتے تھے ۔ لفظ اور محاورہ ، شوشہ و مرکز کی اصلاح کا درجہ ان کے یہاں بہت پست تھا [۴] ۔ وہ لفظ و قوافی پر خیال کو ترجیح دیتے تھے [۵]

حاصل کلام یہ کہ جس طرح اصغر نے خود وجدان و ذوق سلیم کو اپنے کلام کا ناقد بنایا اور تمام زندگی اس پر اعتماد کیا اسی طرح اپنے شاگردوں میں بھی وہ " ذوق سلیم" پیدا کر کے انھیں رسمی استاد کی محتاجی سے نجات دلانے کے حامی اور اس پر عامل تھے ۔

---

۱ ۔ " اصغر " ۔ عبدالشکور ۔ ص ۱۹

۲ ۔ مولانا ہندوستان سے نومبر ۱۹۲۹ء میں پاکستان تشریف لائے اور اپنے حقیقی بھتیجے حیدر علی صاحب کے یہاں وحدت کالونی لاہور میں قیام پذیر ہوئے ۔ ۲ نومبر کو خود چل کر کالج تشریف لائے اور مجھے اپنے عیاز سے سرفراز فرمایا ۔ یہ نشست کئی گھنٹے رہی ۔

۳ ۔ غالباً اصغر نے مولانا کو اپنے اس شعر کی طرف متوجہ کرنا چاہا تھا ؎
اتنا ہوا دلیل تو دریا کی بن سکے ۔ مانا کہ اور کچھ نہیں موج و حباب میں

۴ ۔ " اصغر " ۔ عبدالشکور ۔ ص ۲۰

۵ ۔ حضرت اصغر گونڈوی ـــ ایک قدیم تحریر از مولانا سراج الحق ، مخزونہ و مملوکہ مقالہ نگار ۔

آثار نظم :

شاعری کے متعلق اصغر کا نظریہ عام لوگوں سے مختلف تھا ۔ ان کے نزدیک شاعری نہ " شغل بیکاراں " ہے ، نہ محض پیشہ نہ محض تفریحی مشغلہ ۔ وہ داعیات نفس میں سے ایک داعیہ ہے جس کا مخاطب حقیقی خود شاعر کی ذات ہوتی ہے ۔

اپنے تحقیقی مطالعے کے دوران میں ، ان کے تدوین و تنسیخ کلام سے متعلق جو حقایق معلوم ہوئے انھیں حسب ذیل چار عنوانات کے تحت ثبت و جمع کر دیا گیا ہے :

الف) ابتدائی کلام

ب) مدون کلام

ج) مستردات

د) غیر مدون کلام

تفصیلات درج ذیل ہیں :

ابتدائی کلام (از ۷-۱۹۰۶ء[1] تا ۱۹۱۶ء) :

اصغر کے ابتدائی ۹ - ۱۰ سال کا کلام انتہائی کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہو سکا ۔ صرف ایک غزل کے چار[2] اشعار ملے ہیں ۔ جنھیں مستردات کے تحت درج کر دیا گیا ہے ۔

ابتدائی کلام کے بارے میں مرزا احسان احمد صاحب نے " نشاط روح " کے مقدمے میں تحریر فرمایا ہے کہ

" ایک بیاض کہیں ضائع ہو گئی ۔ ابتدائی کلام بھی کہیں محفوظ نہیں ۔[3] "

جناب سید رشید احمد صاحب ابتدائی کلام کی نشاندہی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

" اصغر کی ابتدائی غزلیں اکثر و بیشتر قیصر[*] ہند و پیغام میں شائع ہوا کرتی تھیں ۔[4] "

اب یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کلام کتنا تھا ۔ اس میں خزف ریزے تھے یا جواہر ریزے اگر وہ دستیاب ہو جاتا تو اس سے اصغر کے ارتقائی ذہن کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ۔

۱۔ جناب سید رشید احمد نے اصغر کی شاعری کی ابتدا ۷-۱۹۰۶ء بتائی ہے ۔ تفصیل آگے آئے گی ۔

۲۔ خم خانۂ جاوید ۔ جلد اول ۔ مرتبہ لالہ سری رام ۔ مطبوعہ نولکشور پریس لاہور ۱۹۰۸ء ص ۳۲۸

۳۔ مقدمہ نشاط روح ۔ ص ۲ ۔ طبع اول مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۵ء

۴۔ " اصغر صاحب " از جناب سید رشید احمد ۔ جامعہ دہلی ۔ اپریل ۴۷ء ۔ ص ۲۰۳

*۔ قیصر ہند اور پیغام سے متعلق حوالہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے ۔

بعض شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اصغر اچھے خاصے پرگو شاعر[1] تھے لیکن انھیں احتساب و ضبط نفس کا بڑا ملکہ حاصل تھا اور اپنے کلام کے انتخاب میں بڑے سخت گیر تھے کہ اس کا معتدبہ حصہ مسترد کر کے دنیا کی نظروں سے چھپا دیا یا بقول مرزا احسان احمد صاحب " ان کی بے نیازی کے ہاتھوں ضائع ہو گیا[2] ۔" ان حقایق کو سامنے رکھتے ہوئے بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی ۱۰ سال کا کلام اگر ہزاروں نہیں تو سیکڑوں اشعار پر ضرور مشتمل ہوگا ۔

(ب) مدون کلام ۔ (از ۱۹۱۷ء تا ۱۹۳۳ء) :

ہم تک ان کا کلام دو مختصر مجموعوں " نشاط روح " اور " سرود زندگی " کی شکل میں پہنچا ہے جن میں اشعار کی مجموعی تعداد ایک ہزار باسٹھ (۱۰۶۲) ہے ۔ (نشاط روح ۵۵۹ + سرود زندگی ۵۰۳) اگر ان اشعار میں دو شعر (۲) علامہ اقبال کے شامل کر دیئے جائیں (جیسا کہ انھوں نے اصغر کو تلمیذ کر دیئے تھے[3]) تو کل اشعار ایک ہزار چونسٹھ ہو جاتے ہیں ۔

(۱) نشاط روح طبع اوّل ۔ (مجموعۂ کلام از ۱۹۱۷ء تا دسمبر ۱۹۲۵ء[4]) :

اصغر کا پہلا مجموعۂ کلام " نشاط روح " کے نام سے پہلی بار مرزا احسان احمد صاحب نے اوائل دسمبر ۱۹۲۵ء[۴الف] میں مرتب[5] کر کے مطبع معارف اعظم گڑھ سے شائع کیا[6] ، جسے علی گڑھ سلور جوبلی کے موقع پر دسمبر کی آخری تاریخوں میں پیش کیا گیا تھا ۔

نشاط روح $6\frac{1}{2}" \times 4\frac{1}{2}"$ کے تقطیع پر شائع کی گئی تھی ۔ اوسطاً ہر صفحہ پر ۱۵ سطریں تھیں ۔ صورت یہ ہے کہ ٹائیٹل کے بعد اصغر صاحب کی تصویر ہے جس کے نیچے حسب ذیل شعر درج ہے ؀

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا ۔ اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھئے " اصغر " مرتبہ جناب عبدالشکور ۔ مطبوعہ سعید برادرس الٰہ آباد ۱۹۳۵ء ۔ ص ۱۲

۲۔ مقدمہ " نشاط روح " طبع اول ۔ ۱۹۲۵ء مطبع معارف اعظم گڑھ ۔ ص ۲

۳۔ " سرود زندگی " مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ ۔ لاہور ۔ ص ۱۲۳

۴۔ " نشاط روح " کی پہلی غزل اوائل ۱۹۱۷ء کے ایک مشاعرے کی طرحی غزل ہے جو اصغر صاحب کے مکان پر منعقد ہوا تھا " (مسودۂ جگر صاحب از سید رشید احمد ص ۵) اور غزل نمبر ۶۱ " جان نشاط حسن کی دنیا کہیں جسے ... الخ جناب جلیل احمد قدوائی صاحب کی تحریر کے مطابق ۱۹۲۳ء میں یونین ہال علی گڑھ کے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی" (تنقیدیں اور خاکے ۔ از جناب جلیل قدوائی ۔ ص ۵۱-۳۹) ۔ یہ اواخر ۱۹۲۳ء کی بات ہے ۔ غزل ہذا علی گڑھ میگزین جنوری ۱۹۲۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے ۔ ص

۴الف ۔ اصغر صاحب از جناب رشید احمد ۔ جامعہ دہلی اپریل ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۱۰

(باقی حواشی اگلے صفحہ پر)

تصویر کے بعد مرزا احسان احمد صاحب کا تین صفحات (الف ، ب ، ج) کا دیباچہ ہے اس کے بعد انھیں کا مقدمہ ہے (۱ تا ۲۹ صفحات) پھر جناب اقبال احمد صاحب سہیل کا تبصرہ ہے (ص ۳۱ تا ص ۷۹) ۔ اس کے بعد اصل دیوان شروع ہوتا ہے۔

(گزشتہ سے پیوستہ)

۵۔ " نشاط روح " کی ترتیب و تالیف کے بارے میں مرزا احسان احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں
" حضرت جگر کی وساطت سے مجھ کو حضرت اصغر کا تھوڑا سا کلام شروع ہی میں مل گیا تھا پھر میں نے خود اخبارات و رسائل سے لے کر کچھ جمع کیا ------ میں نے ارادہ کر لیا کہ بلا کسی آئندہ تعمیق و انتظار کے جو کچھ سرمایہ مرتب ہو گیا ہے ، ارباب ذوق کی خدمت میں پیش کر دیا جائے ۔" (مقدمہ نشاط روح طبع دوم ۔ ص ۵) اس سے خیال ہوتا ہے کہ ترتیب و انتخاب دونوں مرزا صاحب نے کیا ہوگا ۔ لیکن کبیر احمد جائسی کی تحریر کے مطابق " نشاط روح " کا انتخاب اقبال احمد صاحب سہیل نے کیا تھا ۔ وہ لکھتے ہیں :
" ---- اصغر مرحوم کو اصغر سہیل صاحب نے بنایا ہے ۔ سہیل صاحب نے ان کے مجموعۂ کلام کو کاٹ چھانٹ کر دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا ۔ جو اچھے اشعار تھے رہنے دیئے باقی حذف کر دیے ۔ اس روایت کو میں نے بزرگوں سے سنا تھا مگر یقین نہ آتا تھا ۔ اتفاق سے مجھے نشاط روح کے مسودے کے چند اوراق دیکھنے کو مل گئے اس وقت معلوم ہوا کہ جو روایت مشہور تھی وہ مبنی بر حقیقت تھی ۔" (نشاط روح اور سہیل ۔۔ نگار ستمبر ۵۷ء ص ۳۲)

کبیر احمد صاحب جائسی نے اصغر اور نشاط روح کے سلسلے میں دو دعوے کئے ہیں ۔

(۱) سہیل صاحب نے اصغر کے کلام مجموعۂ کلام کو کاٹ چھانٹ کر دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا ۔

(۲) اصغر مرحوم کو اصغر سہیل صاحب نے بنایا ۔

مقالہ نگار نے استفساراً مرزا احسان احمد صاحب کو لکھا کہ

(۱) آپ کی تحریر سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ نشاط روح کا انتخاب آپ نے کیا تھا لیکن جائسی صاحب یہ کام سہیل صاحب سے منسوب کرتے ہیں ۔ اس میں کہاں تک حقیقت ہے ۔

(۲) کیا انتخاب اصغر صاحب کی نظر سے گزرا تھا؟

(۳) کیا کبیر احمد صاحب کا یہ دعویٰ کہ اصغر مرحوم کو اصغر سہیل صاحب نے بنایا کس طرح درست کہا جا سکتا ہے ۔

مرزا احسان احمد صاحب نے جواباً تحریر فرمایا :

" سوال نمبر ۱ کا جواب اثبات میں ہے ---------- سہیل کو تبصرے کے سوا " نشاط روح " کی اشاعت سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا ۔

سوال نمبر ۲ ۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے انتخاب کلام اصغر کی نظر سے ضرور گزرا تھا ۔

سوال نمبر ۳ ۔ معلوم نہیں کبیر صاحب نے کون سا مسودہ دیکھا تھا ۔ نشاط روح کی اشاعت کے وقت تو اعظم گڑھ میں ان کا کوئی وجود نہ تھا ۔ کبیر صاحب کا یہ ارشاد کہ اصغر کو اصغر سہیل صاحب نے بنایا نہایت تعجب انگیز ہے ۔ مجھ کو اس سے قطعاً اتفاق نہیں ہے"

(مکتوب جناب مرزا احسان احمد بنام راقم مقالہ مورخہ ۲ اپریل ۱۹۷۱ء) ۔

مرزا صاحب کی تحریر سے جناب سید رشید احمد صاحب کی تحریر کی تصدیق ہوتی ہے اور کبیر احمد صاحب جائسی کا دعویٰ بے بنیاد ہو جاتا ہے ۔

۶۔ اصغر صاحب از جناب رشید احمد ۔ جامعہ دہلی اپریل ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۱۰

متن دیوان ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ دیوان کے صفحات ایک سے شروع کئے گئے ہیں ۔

ابتدا میں تین نظمیں ہیں :

(۱) نعت سرور کائنات صلی اللّٰہ و علیہ وسلّم

(۲) بے خبری

(۳) سرفنا

نظموں کے اشعار کی مجموعی تعداد اکسٹھ (۶۱) ہے ۔ صفحہ ۷ سے غزلیات شروع ہوتی ہیں اور صفحہ ۴۲ پر ختم ہو جاتی ہیں ۔ صفحہ ۴۳ اور ۴۴ پر متفرقات کے تحت انیس انیس (۱۹) اشعار درج ہیں ۔

دیوان میں چھوٹی بڑی کل ۶۵ غزلیں ہیں جن کے کل اشعار کی تعداد ۴۷۷ ہے ۔ اس طرح طبع اوّل میں اشعار کی مجموعی تعداد ۵۵۷ ہے[۱] (نظم ۶۱ + غزل ۴۷۷ + متفرقات ۱۹) ۔

نشاط روح طبع دوم :

" نشاط روح " پر بعض ادبی حلقوں میں بڑی سخت تنقید ہوئی جن میں بعض اعتراضات درست تھے ۔ اس کے علاوہ طبع اول کے مقدمہ میں بعض فروگزاشتوں کا ذکر کرتے ہوئے مرزا احسان احمد صاحب نے تحریر فرمایا تھا :

" افسوس ہے کہ عجلت کی وجہ سے مجموعہ کی ترتیب و اشاعت میں کچھ فروگزاشتیں رہ گئیں مثلاً چھپنے کے وقت متعدد غزلوں میں اکثر اشعار درج ہونے سے رہ گئے تھے ...... اگرچہ غزل کے سلسلے میں ان اشعار کا کچھ اور ہی لطف ہوتا تاہم محض تلافی مافات کے خیال سے باقیماندہ اشعار کتاب کے آخر میں متفرقات کے تحت درج کر دیئے گئے ہیں[۲]۔"

چنانچہ ان نقائص کو دور کر کے " نشاط روح " کا دوسرا ایڈیشن بہتر شکل میں شائع کرنے کا خیال اصغر صاحب کے بعض مخلص دوستوں کو ہوا ...... رشید احمد صدیقی صاحب اور حامد سعید خاں صاحب کا تقاضا و اصرار ہوا کہ " نشاط روح " کا انتخاب شائع کیا جائے جس میں تازہ کلام بھی ہو ۔ اس بات کی اطلاع دیتے ہوئے اصغر صاحب نے اپنے

۱۔ یہ تمام تفصیلات نشاط روح طبع اول مملوکہ جناب خواجہ منظور حسین صاحب سے فراہم کی گئی ہیں ۔

۲۔ مقدمہ " نشاط روح " طبع اول ۔ ص ۳

مئی جون ۱۹۳۲ء کے مکتوب میں جگر صاحب کو لکھا :

" محبی ۔ سلام مسنون

.... آپ کا دیوان غالباً چھپ رہا ہے ۔ سید سلیمان صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ بھی میں نے رشید صاحب کے پاس بھیج دیا ۔ رشید صاحب کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ .... میرے مجموعے کا انتخاب بھی شاید شائع کیا جانے والا ہے ۔ اس میں نیا کلام بھی ہوگا"

اسی خط میں آگے چل کر ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں :

" .... ہاں رشید صاحب نے مجھے پرسوں لکھا ہے کہ " نشاط روح " اور تازہ کلام کل ایک انتخاب شائع کیا جائے ۔ انتخاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ یا تو میں انتخاب کروں یا خود رشید صاحب یا کوئی اور ۔ ان کو میں نے لکھا کہ اوّل تو میرا کلام ہی کتنا ہے لیکن اگر یہ تجویز آرڈیننس کے طور پر نافذ کی گئی ہے تو محرم میں صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے لیکن انتخاب کی اجازت ان صاحب کو ہرگز نہیں دی جا سکتی جنھوں نے کچھ سرقہ کچھ توارد کی مدد سے عمر بھر میں ڈیڑھ شعر کھڑے کئے ان میں سے ایک ناموزوں نکلا دوسرا مہمل ـــــ میرا مطلب تھا کہ رشید صاحب

۱۔ مقدمہ اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن میں نے حسب ذیل اندرونی شہادتوں کی بنا پر مئی جون ۱۹۳۲ء متعین کیا ہے ۔

(۱) اس میں جگر صاحب کے مجموعۂ کلام " شعلۂ طور " طبع اول کا ذکر ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے جناب سید سلیمان ندوی صاحب کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا تھا ـــ " شعلۂ طور " اگست ۱۹۳۲ء تک شائع نہیں ہوا تھا جیساکہ زمانہ کانپور اگست ۱۹۳۲ء ص ۱۱۹ پر بصراحت درج ہے " شعلۂ طور " بہت جلد شائع ہو کر نظر افروز ہوگا " ـــ شعلۂ طور ستمبر میں شائع ہو گیا تھا اس پر زمانہ کانپور اکتوبر ۱۹۳۲ء میں اشتہار دیا گیا ہے ص

(۲) اسی خط میں یہ جملہ بھی ہے " میں نے مکان تبدیل کر دیا ہے ۔ اب شہر میں مقیم ہوں ۔ گرمی سخت پڑ رہی ہے " ۔ الہ آباد میں گرمی مئی جون میں سخت پڑتی ہے ۔ ۱۵ جون سے عموماً بارشیں شروع ہو جاتی ہیں اور موسم کی شدت کم ہو جاتی ہے ۔

(۳) اسی میں رشید صاحب کی کتاب " طنزیات و مضحکات " کے ہندوستانی اکیڈمی میں آنے اور چھپنے کا ذکر بھی ـــ رشید صاحب کے طنزیات کی پہلی قسط ہندوستانی میں اپریل ۱۹۳۲ء اور دوسری جون ۱۹۳۲ء نکلی ۔ اس لیے یہ خط اسی زمانہ کا ہے ـــ یعنی اپریل تا جون ۱۹۳۲ء

انتخاب نہ کریں مجھے ان کے مذاق شعر پر اتنا اعتماد نہیں جتنا
ان کی فکر پر ـــــ بلکہ بدرجۂ مجبوری میں یہ گوارا کروں گا کہ
حامد سعید خاں صاحب (جو نشاط روح کے دوسرے ایڈیشن پسر
مصر ہیں) خود سست ، خراب ، معمولی اور ہلکے اشعار خارج
کر دیں [۱] ۔"

معلوم ہوتا ہے کہ کلام کی کم مقدار کے پیش نظر مطلوبہ انتخاب شائع نہ ہو سکا
البتہ دوسرے ایڈیشن کے لیے اصغر صاحب نے نشاط روح میں جو ترمیم و تنسیخ اور ردوبدل
کیا تھا اسکے مطابق دوسرا ایڈیشن ان کے انتقال کے بعد (غالباً ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۰ء)
کے درمیان محمد صدیق صاحب پروپرائٹر صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے ، جناب اقبال احمد صاحب
سہیل کی کوشش اور تصحیح کے بعد شائع کیا ۔ جیسا کہ " دیباچہ طبع دوم از ناشر "
کے (تحت درج ہے کہ

" نشاط روح کا پہلا ایڈیشن حضرت اصغر مرحوم کی زندگی میں طبع
ہو کر ختم ہو گیا تھا ۔ مرحوم نے اس کے بعد دوسرے ایڈیشن کےلئے
(۱) اپنے کلام میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کی (۲) بعض جگہ اشعار
نکال دیئے گئے ہیں (۳) اور بعض جگہ مصرعوں کو بدل دیا گیا ہے ۔
(۴) بہت سے نئے اشعار شامل بھی کئے ہیں .... اقبال احمد
صاحب سہیل نے .... اس ایڈیشن کی صحت میں کافی امداد کی"

مقدمہ طبع اوّل کے مندرجات (جس کا حوالہ پچھلے صفحات میں دیا گیا ہے)
اور " دیباچہ طبع دوم از ناشر " کے پڑھنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ دونوں ایڈیشنوں میں
بہت فرق ہوگا ۔ ذیل میں دونوں ایڈیشنوں کا فرق واضح کیا جاتا ہے :

(۱) دوسرے ایڈیشن میں دیباچہ مرزا احسان احمد (صفحات الف ، ب ، ج)
حذف کر دیا گیا ہے ۔

(۲) مقدمہ (مرزا احسان احمد) صفحہ ۳ سے شروع ہو کر صفحہ ۳۱ پر ختم
ہوتا ہے ، اسی طرح تبصرہ (اقبال احمد صاحب سہیل) صفحہ ۳۲ سے شروع ہو کر
صفحہ ۷۱ پر ختم ہوتا ہے ۔

۱ـ مکتوب جناب اصغر بنام جگر مرادآبادی مئی/جون ۱۹۳۲ء مخزونہ نواب سید شمس الحسن
صاحب مقیم حال کراچی ۔

(۳) دیوان کا متن صفحہ ۱ تا صفحہ ۴۴ ہے ۔ البتہ دوسرے ایڈیشن میں صفحہ ۴۴ پر متفرقات کے تحت صرف ۲ اشعار رہ گئے ہیں باقی بارہ اشعار (۲ نظم اور ۱۰ غزل) متن میں شامل کر دیئے گئے ہیں ۔ ایک شعر حذف کر دیا گیا ہے ۔

دیباچہ طبع دوم میں ناشر نے جن چار باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) بعض جگہ مصرعوں کو بدل دیا گیا ہے ۔ ایسی تبدیلی بھی دیوان میں صرف ایک شعر میں کی گئی ہے یعنی غزل نمبر ۱۰ کے دوسرے شعر[۱] میں ، مصرعہ اولیٰ کو مصرعہ ثانی اور مصرعہ ثانی کو مصرعہ اولیٰ کر دیا گیا ہے ۔ طبع اوّل میں شعر تھا ؎

نقاب اس نے الٹ کر یہ حقیقت ہم پہ عریاں کی

یہیں پر ختم ہو جاتی ہیں بحثیں کفر و ایماں کی

طبع دوم میں شعر یوں بنا دیا گیا ہے ؎

یہیں پر ختم ہو جاتی ہیں بحثیں کفر و ایماں کی

نقاب اس نے الٹ کر یہ حقیقت ہم پہ عریاں کی

(۲) بعض جگہ اشعار نکال دیئے گئے ہیں ۔ حسب ذیل دو اشعار حذف کئے گئے ہیں ؎

(۱) نہ ہوا دل کو اگر ذوق عبادت نہ سہی اب اسے صرف رہ لذت عصیاں کر دیں[۲]

(۲) اس کو بھی مثل زیست گوارا بنائیے تلخابۂ حیات کہ صہبا کہیں جسے[۳]

(۳) نئے اشعار جو شامل کئے گئے ۔ دوسرے ایڈیشن میں کل چار اشعار کا اضافہ ہوا ہے ؎

(۱) کون تھا اس کے ہوا خواہوں میں جو شامل نہ تھا

اب ہوا معلوم مجھ کو دل بھی میرا دل نہ تھا[۴]

(۲) پھاڑ ڈالوں گا گریباں پھوڑ لوں گا اپنا سر

ہے مری آفت کدے میں قیس بھی فرہاد بھی[۵]

۱۔ نشاط روح طبع دوم ۔ صدیق بک ڈپو لکھنؤ ۔ ص ۱۱
۲۔ نشاط روح اشاعت اول مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۳۵ء ۔ ص ۲۸
۳۔ نشاط روح اشاعت اول ۔ ص ۴۴
۴۔ نشاط روح طبع دوم ۔ صدیق بک ڈپو لکھنؤ ۔ ص ۱۴
۵۔ ایضاً ص ۲۴

(۳) ہوا ہے دل کو مگر ننگ آرزو لاحق
خروش گریۂ و بے تابی دعا معلوم [۱]

(۴) معاملہ نگہ ناز سے ہے اے اصغر
بہانۂ الم و حیلۂ شفا معلوم [۲]

(۳) متن میں ترمیم ۔ دوسرے ایڈیشن میں اٹھارہ (۱۸) اشعار ایسے ہیں جن میں ایک دو لفظ کی ترمیم و تبدیلی کی گئی ہے ۔ حق یہ ہے کہ ان سے اشعار پہلے کے بہ نسبت چست ، بامعنی اور جاندار ہو گئے ہیں ۔ مثال میں صرف ایک شعر پیش کیا جاتا ہے تاکہ ترمیم و تبدیلی کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے ۔ اشاعت اوّل میں صفحہ ۲۷ پر شعر ہے سہ

نہ ہوگا ہستی بے مدعا کا رازداں برسوں   وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

طبع دوم میں " ہستی بے مدعا " کے بجائے " کاوش بے مدعا " کر کے شعر یوں بنا دیا گیا ہے سہ

نہ ہوگا کاوش بے مدعا کا رازداں برسوں   وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

اشعار کے حذف و اضافہ سے طبع دوم میں اشعار کی مجموعی تعداد ۵۵۹ ہو گئی ۔ یہی مجموعہ بعد کے ایڈیشنوں کے لئے بطور نمونہ استعمال کیا گیا ۔

طبع سوم : اردو بک اسٹال لاہور نے طبع دوم کے نام سے نشاط روح کا ایک ایڈیشن وسط ۱۹۳۰ء میں شائع کو لیا تھا جس کا اشتہار نیرنگ خیال اگست ۱۹۳۰ء لاہور میں حسب ذیل الفاظ میں دیا گیا تھا :

" اصغر گونڈوی کے شاعرانہ کمالات کا مرقع

نشاط روح کا دوسرا ایڈیشن

شائع ہو گیا ۔ قیمت مجلد ~~عہ~~ ۱/۸ (دو روپے) سوا آٹھ آنے

ارباب ذوق اردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور سے طلب کریں " [۳]

اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا اس لیے اس پر کوئی رائے نہیں دی جا سکتی ۔

۱۔ نشاط روح ۔ طبع دوم ۔ ص ۳۲
۲۔ ایضاً
۳۔ نیرنگ خیال ۔ لاہور اگست ۱۹۳۰ء ۔ ص ۵۳

طبع چہارم :

یہ آخری ، مستند اور متداول ایڈیشن ہے ۔ اس کے ناشر ملک بک ڈپو لاہور ہیں ۔ کتاب انشا پریس لاہور کی چھپی ہے ۔ فاتحۃ الکتاب میں سرورق حسب ذیل عبارت درج ہے :

" پرمٹ نمبر ۹۰۲ مورخۃ ۲ اکتوبر ۱۹۵۳ء ۔"

معلوم ہوتا ہے کہ مینجر صدیق بک ڈپو کی بدمعاملگیوں سے تنگ آ کر جگر صاحب نے ملک ڈپو والوں سے معاملت کر لی اور انہیں " نشاط روح " شائع کرنے کا محولہ بالا اجازت نامہ دے دیا ۔ اس بات کی تصدیق جناب جگر کے مکتوب سے ہوتی ہے جو انہوں نے پروپرائٹر صدیق بک ڈپو لکھنئو کو ۷ ستمبر ۱۹۳۲ء کو بذریعہ رجسٹری نمبر ۱۳۵ ارسال کیا تھا :

" مکرمی ۔ تسلیم

میرے گھر میں آپ کی تجارتی معاملت سے نالاں ہیں ۔ وہ کہتی ہیں کہ آپ نے " نشاط روح " کے حقوق دائمی تو حاصل نہیں کئے ہیں ۔ پھر کیا سبب ہے کہ اب تک آپ پہلا ایڈیشن ختم نہیں کر سکے ...

جگر مرادآبادی علی عنہ [1]

۷ ستمبر ۱۹۳۲ء

یہ ایڈیشن صدیق بک ڈپو والے ایڈیشن کا مثنیٰ ہے البتہ (۱) ٹائیٹل پر سے یہ شعر ؎

" اصغر نشاط روح کا اک کھل گیا چمن جنبش ہوئی جو خامۂ رنگین نگار کو "

جس سے طبع اول و دوم میں محراب بنائی گئی تھی اڑا دیا گیا ہے ۔

(۲) اصغر کی تصویر بھی حذف کر دی گئی ہے ۔

(۳) صفحات شروع سے آخر تک سلسلہ وار کر دیئے گئے ہیں ۔ یعنی مقدمۃ صفحۃ ۳ سے شروع ہوتا ہے اور کتاب صفحۃ ۱۲۸ پر ختم ہوتی ہے ۔

طبع پنجم :

ان کے علاوہ ایک سستا ایڈیشن ہیو تاج آفس پوسٹ بکس نمبر ۱۷۳۹ دہلی نے غالبا* تقسیم کے بعد شائع کیا تھا ۔ یہ متداول نسخہ کی نقل ہے اس کا ایک نسخہ سنٹرل لائبریری

۱۔ بحوالہ جگر کے خطوط مرتبہ ڈاکٹر محمد اسلام ۔ ص ۱۷۲

۲۔ کتاب بہاول پور سنٹرل لائبریری میں ۸ جنوری ۱۹۶۲ء کو داخل ہوئی ۔

بہاول پور میں شمارہ نمبر Acc No 10091 / CL ا ص ن ١٥١ کے تحت موجود* ہے - کل صفحات ۹۲ ہیں -

۲- سرود زندگی - (مجموعہ کلام از ۱۹۲۵ تا ۱۹۳۲ء) :

جب جناب رشید احمد صدیقی اور حامد سعید خان صاحب کے اصرار کے باوجود " انتخاب نشاط روح بشمول تازہ کلام " شائع نہ ہو سکا تو اصغر صاحب کو خود اس کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا - وہ نئے مجموعے کو " روح نشاط " کے نام سے شائع کرنا چاہتے تھے چنانچہ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۲ء کے مکتوب میں ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب زور کو لکھتے ہیں :

" آج کل قصد ہو رہا ہے کہ " نشاط روح " کے بعد جو اشعار ہیں ان کو " روح نشاط " کے نام سے طبع کراؤں - اس پر مولوی ابوالکلام آزاد نے بھی لکھا ہے "[1]

اصغر صاحب کی محولہ بالا عبارت سے اگرچہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ " تازہ کلام " (یعنی نشاط روح کے بعد کے اشعار) کو " روح نشاط " کے نام سے طبع کرانا چاہتے تھے لیکن حقیقتاً ان کا خیال " نشاط روح " اور " سرود زندگی " دونوں کو یکجا " روح نشاط " کے نام سے شائع کرانے کا تھا -

میرے اس خیال کی تائید مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر سے بھی ہوتی ہے - وہ رقمطراز ہیں :

" .... انہی اصحاب ذوق میں سے مولوی اصغر حسین صاحب اصغر بھی ہیں جن کے کلام کا پہلا حصہ " نشاط روح " اور دوسرا سرود زندگی کے نام سے شائع ہو رہا ہے -[2] "

---

* - یہ کتاب میرے ہم زلف سید اشفاق علی زیدی صاحب کی وساطت سے دیکھنے کو ملی جن کا حد درجہ ممنون ہوں -

۱- مکتوب اصغر بنام ڈاکٹر زور - نقوش لاہور - مکاتیب نمبر جلد دوم - ص ۲۰۵-۲۰۴ - خط کے آخر میں ۱۵ ستمبر ۱۹۳۲ء درج ہے جو یقیناً کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ خط میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جس تحریر کا ذکر ہے وہ بطور تقریظ " سرود زندگی " میں شامل ہے اور ۲۸ جون ۱۹۳۳ء کی تحریر ہے - لہذا خط ۲۸ جون ۱۹۳۳ء کے بعد یعنی ۱۵ ستمبر ۱۹۳۳ء کا ہوگا - اس کے علاوہ اس خط میں " جواہر سخن " پر ڈاکٹر زور کے تبصرہ کا ذکر ہے - جواہر سخن جلد اول کا سال طباعت ۱۹۳۳ء ہے --- تعارف از ڈاکٹر تارا چند ۲۳ اگست ۱۹۳۳ء کی تحریر ہے - لہذا خط اگست ۱۹۳۳ء کے بعد کا ہے - " جواہر سخن " کا ذکر زمانہ دسمبر ۱۹۳۳ء میں اس طور پر کیا گیا ہے کہ " عنقریب چھپنے والی ہے " ص ۳۹۹ - علمی خبریں گویا خط ۱۹۳۳ء دسمبر کے بعد کا ہوا- یعنی ۱۵ ستمبر ۱۹۳۴ء کا -

۲- تقریظ سرود زندگی از مولانا ابوالکلام آزاد ، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ - لاہور - ص //

مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ اصغر اپنا پورا کلام یکجا " روح نشاط " کے نام سے ---- الگ الگ دو حصوں " نشاط روح " اور " سرود زندگی " میں ---- شائع کرنا چاہتے تھے - وہ اس خیال پر ۱۵ ستمبر ۱۹۳۳ء تک قائم رہے لیکن طباعت کے آخری مراحل میں بوجوہ ان کا ارادہ[۱] بدل گیا اور صرف " تازہ کلام " سرود زندگی " کے نام سے شائع کر دیا گیا -

سرود زندگی[۲] پہلی بار (۱۲۰۰ جلدیں) انڈین پریس الہ آباد سے اواخر ۱۹۳۳ء میں طبع ہوئی اور اوائل ۱۹۳۵ء[۳] میں صدیق احمد صاحب خویش جناب اصغر (۱۱۰ - مطہر گنج - الہ آباد) کی طرف سے شائع کی گئی - لیکن اندرونی صفحہ پر سال طباعت ۱۹۳۵ء ہی لکھوایا گیا - اس سے خواہ مخواہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ سال طباعت ۱۹۳۵ء ہے - حالانکہ سال طباعت ۱۹۳۳ء ہی درست ہے - وجوہ حسب ذیل ہیں :

جناب سید رشید احمد صاحب " سرود زندگی " کی طباعت کے بارے میں لکھتے ہیں :

> " اصغر عرصہ سے بلڈ پریشر کے مریض تھے - ان پر فالج کا پہلا حملہ ۱۹۳۳ء میں الہ آباد میں ہوا تھا - جس کی خبر پا کر میں ان کو دیکھنے کے لئے گیا تھا .... ان کے دوسرے مجموعہ کلام " سرود زندگی " کی کتابت ختم ہو چکی تھی اور وہ چھپنے کے لئے پریس بھیجا جا رہا تھا ..[۴]."

(۲) زمانہ کانپور نومبر ۱۹۳۳ء میں " علمی خبریں " کے تحت حسب ذیل اطلاع دی گئی ہے :

> " مولانا اصغر حسین اصغر گونڈوی کا تازہ ترین فارسی و اردو کلام " سرود زندگی " کے نام سے شائع ہو گیا ہے ......" (ص ۳۲۲)

۱- ممکن ہے " روح نشاط " اور " نشاط روح " میں اشتباہ و التباس کے پیش نظر اول ارادہ میں تزلزل پیدا ہوا ہو بعد میں اخراجات نے ارادہ بالکل ہی بدل دیا ہو -

۲- سرود زندگی میں اصغر صاحب کے دیباچہ کی تاریخ یکم دسمبر ۱۹۳۳ء درج ہے - اس کے علاوہ شواہد متن میں درج کئے گئے ہیں -

۳- اصغر صاحب اپنے مکتوب مرقومہ ۵ فروری ۱۹۳۵ء میں جلیل احمد قدوائی صاحب کو لکھتے ہیں " سرود زندگی " تو رشید صاحب نے آپ کو دے دی ہوگی --- اسکے علاوہ الناظر لکھنؤ مارچ ۱۹۳۵ء میں " سرود زندگی " کا اشتہار بھی شائع ہوا ہے - ص

۴- اصغر صاحب از جناب سید رشید احمد " جامعہ " دہلی مئی ۱۹۶۷ء - ص ۲۳۳

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات محقق ہو جاتی ہے کہ سرود زندگی اواخر ۱۹۳۴ء (اکتوبر نومبر) میں طبع ہو چکی تھی ۔ البتہ شائع اوائل ۱۹۳۵ء میں کی گئی لیکن اندرونی صفحہ پر

" ۱۹۳۵ء

بار اوّل ۱۲۰۰ جلدیں " درج کیا گیا ۔

" سرود زندگی " $6\frac{1}{2}" \times 4\frac{1}{2}"$ کی تقطیع پر شائع ہوئی تھی ۔ اشاعت اول کی کیفیت درج ذیل ہے :

(۱) سرود زندگی " قسم اول " اور قسم دوم " میں شائع کی گئی تھی ۔ قسم اوّل کا کاغذ چکنا ہلکے پیلے رنگ کا ، بہت ہی اعلیٰ تھا اور قسم دوم کا چکنا سفید مگر نسبتاً ہلکا تھا ۔

(۲) جلد کے بعد اسی رنگ کا ٹائیٹل پیج تھا جس پر جلی حروف میں " سرود زندگی " ـــــ اصغر حسین اصغر تحریر تھا ۔

(۳) اس کے بعد دو صفحات (الف ، ب) کی فہرست تھی ۔

(۴) پھر سادہ ورق ۔ پشت پر اصغر کی تصویر ۔ یہ تصویر " نشاط روح " کی مطبوعہ تصویر سے مختلف ہے ۔ تصویر کے نیچے اصغر صاحب کے دستخط ہیں " اصغر "

(۵) تصویر پر ایک عکسی کاغذ لگا ہوا ہے ۔

(۶) اس کے بعد دیباچہ اصغر صفحات ۱ ۔ ۲

(۷) پھر مقدمہ سر تیج بہادر سپرو صاحب صفحہ ۱ تا ۱۰

(۸) اس کے بعد تقریظ از مولانا ابوالکلام آزاد صفحہ ۱۱ تا ۲۰

(۹) اس کے بعد متن کلام اردو ص ۱ تا ص ۹۶

(۱۰) پھر فارسی غزلیات ص ۹۷ تا ۱۰۲

سرود زندگی کے اشعار کی مجموعی تعداد ۵۰۳ ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے :

(۱) نظم ۔ ۲	تعداد اشعار ۲۶
(۲) غزل اردو ۔ ۳۶	تعداد اشعار ۴۲۹
(۳) متفرقات	تعداد اشعار ۱۵
(۴) غزل فارسی ۔ ۵	تعداد اشعار ۳۳
	میزان اشعار ۵۰۳

اگر ان میں دو اشعار علامہ اقبال کے شامل کر لئے جائیں تو کل اشعار ۵۰۵ ہو جائیں گے -

اوپر ذکر گزر چکا ہے کہ " سرود زندگی " اصغر صاحب نے خود چھاپی تھی - لیکن ان کے لئے یہ خسارے کا سودا رہا - اس کی کیفیت جناب صغیر احمد صدیقی صاحب کی زبانی سنیئے :

" سرود زندگی کی ایک ہزار[*] جلدیں خود چھپوائی تھیں - معاملے کے تجارتی پہلو سے ناآشنائے محض ہونے کے سبب آٹھ سو جلدیں جو بچی ہوئی تھیں ایک مشہور فرم کے ایجنٹ کے حوالے کیں اور اس کو دوبارہ چھاپنے کی اجازت بھی دی یہ کہتے ہوئے کہ آپ جو مناسب سمجھیں کریں - میں ان معاملات میں کوئی دخل نہیں رکھتا - اس سادگی کا جو نتیجہ نکلا ہوگا ظاہر ہے[1] "

اس غلط بخشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال ڈیڑھ سال[2] کے بعد جب اصغر صاحب کا انتقال ہو گیا تو " سرود زندگی " ہمیشہ کے لئے فرم مذکور کی ہوگئی -

اگرچہ صغیر احمد صدیقی صاحب نے فرم کا نام نہیں لیا لیکن بدلائل یہ فرم تاج کمپنی لمٹیڈ لاہور ہے جس کی طرف حاشیہ میں اشارہ کیا گیا ہے -

دوران تحقیق میں راقم مقالہ کی نظر سے سرود زندگی طبع اول کے دو مختلف نسخے گزرے :

۱- پہلا نسخہ خواجہ منظور حسین صاحب (سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج - لاہور) کا مملوکہ ہے - یہ نسخہ ہر اعتبار سے اصل نسخہ ہے - یعنی انڈین پریس الہ آباد کا مطبوعہ ہے جسکے اندرونی صفحہ پر ۱۹۳۵ء بار اوّل ۱۲۰۰ جلدیں درج ہے - یہ قسم اوّل ہے -

دوسرا نسخہ بشیر حسین صاحب شہائی کا مملوکہ و مخزونہ ہے - اُن کے کتب خانہ میں کتاب کا نمبر ۱۵۱۵ ہے - یہ کتاب شہائی صاحب نے ۱۴ جنوری ۱۹۳۶ء[3] کو خریدی -

---

*- " سرود زندگی " کی بارہ سو جلدیں چھاپی گئی تھیں - حوالہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے -

۱- نقوش لاہور شخصیات نمبر جلد دوم - ص ۱۳۸۵

۲- یہ کتاب وسط ۱۹۳۵ء کے حدود میں تاج کمپنی کو دی گئی اور ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء میں اصغر صاحب کا انتقال ہو گیا -

۳- کتاب کے اندرونی صفحہ پر بشیر شہائی نے اپنے قلم سے یہ عبارت لکھی ہے :

Bashir Husain Zaidi, MA. (Alig) Khanewal. 14th Jan, 1936

*- سرود زندگی طبع اول مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۵ء ص ۹۸ پر اصغر صاحب کا یہ نوٹ درج ہے

" یہ غزل قیام لاہور کے زمانے میں لکھی گئی تھی - علامہ سر اقبال نے اسے سن کر بہت پسند فرمایا اور خود بھی دو شعر اسی وقت موزوں کرکے دیے اور ہدایت فرمائی کہ انھیں بھی اپنی غزل کے ساتھ رکھنا "

یہ بھی انڈین پریس الہ آباد کا مطبوعہ ہے اس کے اندرونی صفحہ پر بھی " ۱۹۳۵ء ـــ بار اوّل ۱۲۰۰ جلدیں " درج ہے ۔

البتہ یہ نسخہ خواجہ صاحب کے نسخہ سے یوں مختلف ہے کہ

(۱) اس کی جلد پر بائیں گوشہ میں تاج کمپنی لمٹیڈ ۔ لاہور چھپا ہے ۔

(۲) اسی طرح جلد کے بعد رنگین ٹائیٹل پیج پر جہاں " سرود زندگی ۔ اصغر گونڈوی لکھا ہے ۔ نیچے تاج کمپنی لمٹیڈ لاہور چھپا ہے ۔ لیکن یہ بعد کا اضافہ ہے کیوں کہ اس معمولی فرق کے علاوہ خواجہ صاحب اور ضیائی صاحب کے نسخوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے ۔ حتیٰکہ جلد کے اوپر سنہری حروف میں " سرود زندگی " اور اس کے نیچے اصغر ، دونوں نسخوں میں ایک ہی خط میں لکھا ہے ـــ حقیقت یہ ہے کہ ضیائی صاحب کا نسخہ انہیں ۸۰۰ جلدوں میں سے ہے جو اصغر صاحب نے تاج کمپنی والوں کو دے دیئے تھے ۔ جن پر بعد میں رنگین ٹائٹل پیج بڑھا دئیے گئے اور جلد پر سنہرے حروف میں تاج کمپنی لمٹیڈ لاہور چھپوا دیا گیا ۔

۲۔ اس کے علاوہ " سرود زندگی " کا کوئی نسخہ ، تاج کمپنی لاہور کے علاوہ کہیں اور سے نہیں چھپا ۔ یہ ایک اور ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ فرم تاج کمپنی لمٹیڈ لاہور ہی تھی۔

سرود زندگی کے بعد کے ایڈیشن ۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ اس کی واحد ناشر تاج کمپنی لمٹیڈ لاہور ہے ۔ اس نے اسکے بعد کتنے ایڈیشن شائع کئے کچھ نہیں معلوم ۔ گزشتہ چند سال پہلے تک جو نسخہ دستیاب ہوتا تھا اس پر نہ سال طباعت درج ہے نہ ایڈیشن نمبر ۔ اس کی ظاہری کیفیت یہ ہے کہ جلد پر " سرود زندگی " کو یوں مصور کیا گیا ہے کہ ایک حسین مغنیہ کشتی میں بیٹھی ستار بجا رہی ہے ۔ اس کا ساتھی آہستہ آہستہ کشتی چلا رہا ہے چودھویں کا چاند بھی تابانی کے ساتھ آسمان پر چمک رہا ہے ۔ ندی کے کنارے اگے ہوئے درخت کی شاخیں فرط ذوق سے حسینہ پر جھک آئی ہیں ۔

(۲) کتاب کے صفحات سلسلہ وار کر دیے گئے ہیں ۔ فہرست غزلیات صفحہ ۳ تا ۴ ۔ دیباچہ اصغر صفحہ ۵ ۔ ۶ ۔ مقدمہ صفحہ ۷ تا ۱۶ اور تقریظ صفحہ ۱۷ تا ۲۶ ۔ متن دیوان صفحہ ۲۷ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۲۸ پر ختم ہو جاتا ہے ـــ طبع اوّل اور اسکے متن میں کوئی فرق نہیں ہے ـــ اب یہی نسخہ مستند اور متداول ہے ۔

(ج) مستردات کلام :

اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اصغر صاحب اپنے کلام کے انتخاب میں بڑے سخت گیر واقع ہوئے تھے ۔ ابتدائی کلام کی طرح بعد کے کلام میں بھی بش دریا دلی سے کتر بیونت کرتے رہے ۔ اپنے تحقیقی مطالعہ کے دوران میں مجھے مختلف رسائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے بہت سے اشعار ملے جنھیں زمانی ترتیب کے ساتھ درج ذیل کیا جاتا ہے ۔ رسائل کے حوالے ذیلی حاشیہ میں دے دیے گئے ہیں ۔

(۱) ابتدائی کلام

۱۔ "ابر اٹھا ہے ترشح ہے ، گھٹا چھائی ہے　　ھجوسے کرتا ہے زاہد ، کوئی سودائی ہے

۲۔ آپ کے چاہنے والے تو مرے جاتے ہیں　　اس پہ پھر آپ کو دعوئے مسیحائی ہے

۳۔ باغ ہے، نہر ہے، حوریں ہیں ، مے کوثر ہے　　واعظو مان گئے کیا سخن آرائی ہے

۴۔ عہد توڑے دل عشاق بھی توڑے اس نے　　اس نزاکت پہ بھی اس درجہ توانائی ہے [1]"

......

۵۔ پھانسا ہے دل کو الفت چشم سیاہ میں　　کاجل کی کوٹھری میں نظر بند کر گئے [2]

۶۔ لیجئے بیٹھے بٹھائے پھرامنگیں جاگ اٹھیں　　آپ سے کس نے کہا تھا مسکرانے کے لئے [3]

......

(۲) نشاط روح

۷۔ قفس تک کس طرح صیاد لایا دیکھ لو جا کر　　پڑے ہوں گے ابھی کچھ بال و پر میرے نشیمن میں [4]

۸۔ جگر میں بیٹھ گئے درد بے دوا ہو کر　　دلوں کو کھینچ لیا بن کے شان عشوہ گری [5]

۹۔ ہزار جامہ دری صد ہزار بخیہ گری　　یہاں ہے خیر سے سب کچھ شار بے خبری [6]

۱۔ فتنہ ۔ گورکھپور بحوالہ خم خانۂ جاوید جلد اول مرتبہ لالہ سری رام مطبوعہ نولکشور پریس لاہور ص ۳۲۸

۲۔ جام جہاں نما ۔ لکھنؤ بحوالہ " چراں ہیں " اثر لکھنوی مطبوعہ دانش محل لکھنؤ طبع اول ۱۹۵۰ء ۔ ص ۸۹

۳۔ نگار پاکستان کراچی اکتوبر ۱۹۶۷ء ص ۵۵ ۔ " اصغر کا تصوف " از جناب سعادت نظیر۔ یہ شعر کوشش کے باوجود نہ مل سکا۔ سعادت نظیر صاحب کو کئی بار استفسارا" لکھا لیکن کوئی جواب نہ ملا ۔

۴۔ تبصرہ ۔ جناب اقبال سہیل ۔ نشاط روح طبع دوم ۔ صدیق بک ڈپو لکھنؤ ۔ ص ۵۷

۵۔ زمانہ کانپور ۔ فروری ۱۹۲۲ء ۔ ص ۱۲۳

۶۔ معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۲۱ء ص　　۔ اب اس شعر کا مصرعہ ثانی بدل کر ع " تمام شورش و تسکین شار بےخبری " کر دیا گیا ہے ۔

۱۰- وهی هے عشق وهی هے کشش وهی حرکت

یہ هے صحیفۂ قدرت میں میری دیدہ وری ۱

۱۱- یوں هی تقویٰ کو کیوں کرے غارت

حذر صہبائے مشکبو نہ کرے ۲

......

۱۲- جگر کو توڑ کے یوں صاف دل کے پار نہ هو

خدنگ ناز اگر آزمودہ کار نہ هو ۳

۱۳- جو چند قطرہ خوں بھی دل و جگر میں نہ هوں

خدنگ ناز پہ یہ عالم بہار نہ هو

......

۱۴- لے دے کے یہی مشغلۂ صبح و مسا هے

وہ چشم ، سیہ مست هے ، اور مشق فنا هے ۴

......

۱۵- بدتر هیں موت سے بھی ایام زندگی کے

اس کو بھی دیکھنا هے کچھ اور روز جی کے

۱۶- شب هائے غم میں مجھکو اب لطف آ رہا هے

بیکار چھوڑتے هیں آ آ کے دن خوشی کے ۵

......

۱۷- کیا مست کر دیا هے مجھے بوئے دوست نے

کچھ موج مے بھی موج نسیم سحر میں هے

۱۸- اپنا بنا لیا مجھے کس کس ادا کے ساتھ

نیرنگ دلبری تری هر هر نظر میں هے

۱۹- طرز خرام ناز پہ هونے کو میں نثار

فتنوں کا اژدحام تری رهگزر میں هے

۱- معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۲۱ء - ص - اب یہ شعر خارج کرکے اسکی جگہ یہ شعر بنا دیا گیا ہے

کہیں هے عشق کہیں هے کشش کہیں حرکت بھرا هے خانۂ فطرت میں رنگ فتنہ گری

۲- نگار ستمبر ۱۹۵۷ء - ص ۳۷

۳- ایضاً - ص ۳۶

۴- ایضاً - ص ۳۷

۵- ایضاً - ص ۳۷

۲۰- جائز جو کر لیا ہے اسے اک بزرگ نے
کوشی تو بات حسن سر رہگذر میں ہے ۱

......

۲۱- اس طرح ہنگامۂ ہستی معما ہو گیا
یک بیک خاموشی ، گور غریباں دیکھ کر ۲

......

۲۲- نگاہ لطف پر ہوش و خرد میں نے لٹا ڈالے
جہاں سودائے دل دیکھا وہیں ساری دکاں رکھ دی ۳

......

۲۳- "شمع ہو جائے ، اگر حسن ہو سرگرم فروغ
جان پر شوق جو مضطر ہو تو پروانہ بنے

۲۴- اس طرح دیکھ کے پھر ہوش کسی کو نہ رہے
گردش چشم تری ، گردش پیمانہ بنے

۲۵- آتش شوق جو ہے رقص کناں راتوں کو
صبح ہو جائے تو خاکستر پروانہ بنے

۲۶- عاشقی نام ہے تسلیم و وفاداری کا
یعنی ایسی سی کٹے جائے ، بنے یا نہ بنے

۲۷- ہم جو بگڑے شۂ اقلیم خرد کہلائے
ہم بنے ، جب کہ گدائے در میخانہ بنے

۲۸- کھینچے زاہد نے بہت حور و جناں کے نقشے
آہ ! یوں بیٹھ کے مسجد میں صنم خانہ بنے

۲۹- حشر میں نامۂ اعمال کھلا اسغر کا
پردۂ ہوش آج ترا لغزش کریمانہ بنے

۳۰- حشر میں نامۂ اعمال نہ دیں اسغر کو
وہ ہے دیوانہ کسی سمت کو چلتا نہ بنے " ۴

......

۱- نگار ستمبر ۱۹۵۷ء - ص ۳۳
۲- ایضاً - ص ۳۶
۳- ایضاً - ص ۳۷
۴- زمانہ - کانپور جون ۱۹۲۰ء - ص ۲۹۷

۳۱- دم کے دم میں یہ مقامات طریقت طے ہیں

هادی راہ اگر لغزش مستانہ بنے ۱

......

۳۲- ہم ہی پلا کے ختم بھی کر دیں گے زاہدو

بیٹھے رہو گے تم بے و کوثر لئے ہوئے ۲

......

۳۳- " رکھا ہوا ہے خرمن ہوش و خرد کہاں

اب ڈھونڈتی ہے کیوں تری برق نظر مجھے

۳۴- کیا کیا نگاہ مست سے فتنے بپا ہوئے

ساقی تری نثار ، نہیں کچھ خبر مجھے

۳۵- بکھری ہوئی ہے زلف سیہ روئے یار پر

اب صبح ہے کہ شام نہیں کچھ خبر مجھے

۳۶- آتی ہے صاف باد بہاری سے بوئے دوست

کیوں باندھ باندھ رکھتے ہیں بے بے خبر مجھے ۳

۳۷- وہ مست حسن اور میں سرشار آرزو

میری خبر انہیں ہے نہ ان کی خبر مجھے " ۳

......

۳۸- کیا چیز تھی کہ توڑ کے دل کو نکل گئی

لا کر ذرا دکھائیے اپنی نظر مجھے

۳۹- وہ بھی تو نذر خاطر صیاد ہو گئے

تھے جاں سے عزیز میرے بال و پر مجھے ۴

۱- نشاط روح اور سہیل - کبیر احمد جائسی - نگار ستمبر ۱۹۵۷ء - ص ۳۳

۲- زمانہ کانپور دسمبر ۱۹۲۰ء - ص ۳۲۱

۳- زمانہ کانپور اپریل ۱۹۲۲ء - ص ۲۳۵-۲۳۴ - نشاط روح طبع دوم میں یہ شعر یوں بدل دیا گیا ہے ؎

مست شباب وہ ہیں ، میں سرشار عشق ہوں   میری خبر انہیں ہے نہ ان کی خبر مجھے

۴- نشاط روح اور سہیل - کبیر احمد جائسی - نگار ستمبر ۱۹۵۷ء - ص ۳۳

۴۰- کیسے کہوں وہ حسن جنوں ساز دہان ہے
دیکھا ہے مجھے رقص میں ہر رہ گذر نے

۴۱- میں طائر سدرہ ہوں میں ہوں عرش نشیں
پرواز یہ بخشا مری بے بال و پری نے

۴۲- مستوں سے جو روکے نہ رکا جوش درود آج
لہرا کے لیا موج نسیم سحری نے ۱

......

۴۳- ° اک حشر اضطراب کی دنیا لئے ہوئے
بیٹھی ہوں دل میں جوش تمنا لئے ہوئے

۴۴- عشاق آج قتل سے محروم رہ گئے
بیٹھے ہیں زخم نازش بیجا لئے ہوئے

۴۵- میں اور خاکساری الفت بصد نیاز
تو غمزہ ہائے حسن خودآرا لئے ہوئے

۴۶- پھر دل چلا ہے دامن یوسف کی فکر میں
شوریدگی دست زلیخا لئے ہوئے

۴۷- ہے شوخ و دلفریب تری ہر ادائے حسن
کچھ کچھ ہے رنگ خون تمنا لئے ہوئے

۴۸- پھر آستان یار پہ پہونچے بصد نیاز
دل میں ہجوم عرض تمنا لئے ہوئے

۴۹- پھر آج جوش سر حقیقت ہے موجزن
صد پردہ ہائے ساغر و مینا لئے ہوئے

۵۰- پھر دل میں آج درد کی اٹھی ہے اک چمک
ان کی ضیائے حسن کا نقشہ لئے ہوئے " ۲

......

۱- نگار ستمبر ۱۹۵۷ء - ص ۳۲

۲- زمانہ جون ۱۹۲۱ء - صفحہ ۲۳۵-۲۳۲

۵۱- " جو جاں ہے بیخود ہے جو دل ہے وہ دیوانہ
کیا اور ارادہ ہے اے نرگس مستانہ

۵۲- یہ حسن کشش تیرا ہے نرگس مستانہ
جو گل ہے یہاں بلبل جو شمع ہے پروانہ " ۱

......

۵۳- " کب رندی و سرمستی شایاں ثقاہت تھی
کچھ بس بھی چلے لیکن اس نرگس رعنا سے

۵۴- دل نذر تو کرتے ہیں ، ہونٹھوں پہ تبسم کیوں
کیا جاں بھی لے لو گے اس حسن تقاضا سے

۵۵- اس زلف سے پایا ہے انداز پریشانی
مستی کے چلن سیکھے اس نرگس رسوا سے

۵۶- اے جان ستم کیشی ، بتلا دے خطا میری
کچھ اور نہ سمجھیں سب اس رنجش بیجا سے " ۲

۵۷- یا رب غم ہستی کا اب اذن مداوا دے
اک شاہد زیبا سے یا ساغر و صہبا سے ۳

......

۵۸- زباں خامشی کی قدر اب جا کر ہوئی مجھ کو
مگر جب رہ چکا شرمندۂ آہ و فغاں برسوں

۵۹- تمھاری نرگس مخمور شاید اس سے واقف ہو
رہی ہے مجھ پہ کیوں سرمستی خواب گراں برسوں

۶۰- صنم خانے میں آ کر آہ بھی اک کھنچ نہیں سکتی
حرم میں رہ کے گو زاہد نے کی مشق اذاں برسوں ۴

۱- نگار ستمبر ۱۹۵۷ء - ص ۳۶

۲- زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۳ء - ص ۱۷۰

۳- نشاط روح اور سہیل - کبیر احمد جائسی - نگار ستمبر ۱۹۵۷ء - ص ۳۴

۴- زمانہ کانپور دسمبر ۱۹۲۳ء - ص ۳۲۷

۶۱- "سنتے ہیں تو غائب ہے تو آنکھوں سے پنہاں ہے
رگ رگ میں کسک بن کر یہ کون خراماں ہے

۶۲- تو غم میں نمایاں ہے تو درد میں پنہاں ہے
تو غم کا مداوا ہے تو درد کا درماں ہے " ۱

......

۶۳- " اس کو کیا کہئے کہ دل دونوں کے زخمی ہو گئے
آپ نے اک تیر مارا میں نے اک فریاد کی

۶۴- پائمال رہ گزر اک برگ افسردہ ہے آج
اس ورق پر چند سطریں تھی مری روداد کی

۶۵- میری خاموشی سے ہے ، میری وفا کے دم سے ہے
داد ملنا چاہیے ، مجھکو تری بیداد کی

۶۶- کیا مزاآیا ہے ارباب وفاکے قتل میں
خون میں اب تک نہائی ہے چھری جلاد کی " ۲

......

۶۷- نگاہ مست کے صدقے ذرا خبر نہ ہوئی
کہ کب سرور ہوا مجھکو کب خمار ہوا

۶۸- ستم جو مجھ پہ ہوئے کیوں ستم وہ کہلائے
بڑا قلق مجھے اے چشم شرمسار ہوا

۶۹- کسے خبر تری ناوک کے فرط لذت سے
کہ دل کے پار ہوا یا جگر کے پار ہوا

۷۰- وہ دست ناز بڑھے ، جوش کہت مستی ہے
جھک آئی شاخ چمن عالم بہار ہوا ۳

۱- الناظر لکھنئو اکتوبر تا دسمبر ۱۹۲۵ء - ص

۲- علی گڑھ میگزین مارچ اپریل ۱۹۲۲ء - ص

۳- زمانہ نومبر ۱۹۲۰ء - ص ۲۸۰ --- یہ غزل نشاط روح طبع دوم ؁ صفحہ ۲۱-۲۰ پر شائع ہوئی ہے جس میں کل سات شعر ہیں -

۷۱- راز اپنا گو دل عاشق میں پنہاں کر دیا

خود کو لیکن لالہ و گل میں میں عیاں کر دیا

۷۲- جوش وحشت وہ کہ صحرا کو بنایا اپنا گھر

بے دلی ایسی کہ گھر کو بھی بیاباں کر دیا

۷۳- یوں اذیت کو گھٹایا تلخ کر دی زندگی

درد کو ایسا بڑھایا راحت جاں کر دیا ۱

......

۷۴- کشمکش ہے سوئے حسن اگر جان آرزو

خود حسن بھی ہے دست بداماں آرزو ۲

......

۷۵- جو شش رنگ چمن ، شعلہ طرازی بہار

اور بے پردہ ہو گیا جلوۂ عریاں کوشی ۳

......

۷۶- کچھ خطا بھی مری اے برق بلا شعلہ مزاج

یوں تو آزردگی غیر سبب را چہ علاج سبب

۷۷- غم وہی غم ہے ہوس جسکو مسرت کی نہیں

درد وہ درد کہ جس کو نہیں پروائے علاج

۷۸- نالہ اونچا ہو تو وہ نغمہ عشرت بن جائے

درد کچھ اور جو بڑھ جائے تو بن جائے علاج

۷۹- جان ہے چشم تماشا کی اگر جلوۂ حسن

حسن کا رنگ بھی ہے ذوق نظر کا محتاج ۴

....

۱- نگار ستمبر ۱۹۵۷ء - ص ۳۲

۲- علی گڑھ میگزین جوبلی نمبر دسمبر ۱۹۲۵ء - ص

۳- نگار ستمبر ۱۹۵۷ء - ص ۳۶

۴- ایضاً - ص ۳۲

۸۰- * محو مدام شعبدهٔ زلف و روئے یار
کیا جانوں فتنہ کاری شام و سحر کو میں

۸۱- اے پردہ دار بہ تری جلوے کی شوخیاں
پردہ کو دیکھتا ہوں کبھی پردہ در کو میں

۸۲- چرچے ہیں ہر طرف تری تیر نگاہ کے
لیکن چھپائے بیٹھا ہوں زخم جگر کو میں

۸۳- نیرنگی جمال کے قربان جائیے
حیران ہوں دیکھ دیکھ کے اپنی نظر کو میں " ۱

......

۸۴- شہرہ ہے ہر طرف تری تیر نگاہ کا
لیکن چھپائے بیٹھا ہوں زخم جگر کو میں

۸۵- موج نسیم ، آہ سحر ، اضطراب دل
بھیجوں حریم ناز میں کس نامہ بر کو میں ۲

......

۸۶- تری قربان رہائی سے بھی بڑھ کر ہے مجھے
مجھ کو صیاد تڑپنے دے نہ دام ابھی

۸۷- جلوہ طور کی مجھ کو بھی تمنا ہے مگر
سامنے ہے میرے اک حسن لب بام ابھی

۸۸- زہد و طاعت سے ہو انکار کسی کافر کو
عشوہ فرما ہے مگر نرگس بدنام ابھی ۳

......

۸۹- فضائے عشق ہے اک منزل طلسم آگیں
ہوا نہ خضر کو اب تک یہ راستہ معلوم ۴

......

۱- علی گڑھ میگزین تعطیلات نمبر مئی تا اگست ۱۹۲۲ء - ص
۲- نشاط روح اور سہیل - کبیر احمد جائسی - نگار ستمبر ۱۹۵۷ء - ص ۳۴
۳- نگار ستمبر ۱۹۵۷ء - ص ۳۵
۴- ایضاً - ص ۳۵

۹۰- بظاہر گو کہ خاموشی رہی اس شوخ کے آگے

مگر نظروں میں کل روداد تھی بیتابی غم کی

۹۱- نہ یوں مایوس ہو اے دل نظر رکھ فیض ساقی پر

اسی جام سفالیں میں ملے گی ساغر جم کی

۹۲- کہاں درد محبت اب جو رونا ہے تو اس کا ہے

کہ میں ناکام الفت کھو چکا ہوں لذتیں غم کی ۱

....

۹۳- عشوہ و غمزہ جاں ستاں تیر نظر جگر گداز

حسن کی کائنات ہے مظہر کارساز عشق ۲

....

۹۴- اک آہ پر تو ختم ہے سارا معاملہ

افتاد درد عشق بڑی داستاں نہیں ۳

....

۹۵- " نظروں سے سیر گاہ فنا سب گزر گئی

ایسا نہیں کوئی کہ شناسا کہیں جسے

۹۶- میری نگاہ شوق پہ اب تک ہے منعکس

حسن خیال شاہد رعنا کہیں جسے

۹۷- ہم بیخودوں نے سکر میں سب محو کر دیا

ذوق علوم کاوش بیجا کہیں جسے " ۴

۹۸- اس کو بھی مثل زیست گوارا بنائیے

تلخابۂ حیات کہ صہبا کہیں جسے ۵

....

۱- نگار ستمبر ۱۹۵۷ء - ص ۳۵

۲- ایضاً - ص ۳۷

۳- ایضاً - ص ۳۷

۴- علی گڑھ میگزین جنوری ۱۹۲۵ء - ص

۵- " نشاط روح " طبع اوّل - ص ۳۴

۹۹- لے گئے وہ ساتھ اپنے کل نشاط زندگی

میکشی بے کیف سی ہے چاندنی بے نور ہے ۱

......

۱۰۰- نہ ہوا دل کو اگر ذوق عبادت نہ سہی

اب اسے صرف رہ لذت عصیاں کر دیں ۲

......

۱۰۱- واللیل ہے محو شکن زلف مخمسر

والشمس فدائے رخ تاباں محمد ۳

......

(۳)سرود زندگی

۱۰۲- " دین بھی میرا بے اثر ، کفر بھی غیرمعتبر

خلوتی خفا بھی ہے جلوہ گہ ظہور میں

۱۰۳- ڈھونڈ کے لائے تھے اسے ہم دل ناصبور تک

گم اسے کر دیا مگر پھر دل ناصبور میں " ۴

......

۱۰۴- اس طرح کی جنوں میں یہاں زندگی بسر

خود زندگی کو میں نے پشیماں بنا دیا ۵

......

۱۰۵- اب ان رعنائیوں پر شکوۂ جور و ستم کیسا

کہ خواب آلود اس نے کر لیا چشم پشیماں کو ۶

......

۱- مرقع لکھنؤ جنوری ۱۹۲۶ء - ص ۳۷

۲- " نشاط روح " طبع اوّل - ص ۲۸

۳- الناظر لکھنؤ جنوری ۱۹۲۵ء - ص

۴- بہارستان لاہور ۱۹۲۶ء - ص ۳۳

۵- ہمایوں لاہور ستمبر ۱۹۲۹ء - ص ۶۸۹

۶- نیرنگ خیال لاہور عید نمبر ۱۹۲۷ء - ص ۲۲۷

۱۰۶- ہے کوئی کہ آنکھیں ہوں مگر کچھ بھی نہ دیکھے

ایک ایک کو اس بزم میں دعوائے نظر ہے ۱

۱۰۷- مجھکو تو دل کا ٹوٹنا اور بھی دے گیا مزا

نوحۂ سوز غم نہیں میری شکست ساز میں ۲

......

۱۰۸- " خستگی اک مصلحت ، افتادگی اک راز ہے

خاک کی جھولی سے بڑھ کر کہیں پرواز ہے

۱۰۹- ایک ذوق دید پیہم ، اک تماشائے دوام

عشق میں انجام ہے میرا نہ کچھ آغاز ہے " ۳

......

۱۱۰- " یہ جہاں بے نشاں سے حسن کا پیغام ہے

تو نے سمجھا ہے کہ کوئی چیز پیمانے میں ہے

۱۱۱- میرے ساقی نے عنایت کی ہے بے درد و صاف

رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے میں ہے" ۴

......

۱۱۲- ایک شعلہ کی لپک ہے اک لہو کی دھار ہے

کون جائے مطرب آفت نوا کے سامنے ۵

......

۱۱۳- " ابھی خلوت سے مجھے کیوں دور اتنا کیجئے

آپ رسوا ہو جئے مجھکو بھی رسوا کیجئے

۱۱۴- مجھکو رہنے دیجئے یوں ہی خراب چشم مست

بوالہوس کو مبتلائے جام و مینا کیجئے

۱- نیرنگ خیال لاہور اپریل مئی عید نمبر ۱۹۳۲ء - ص ۱۵

۲- ھمایوں لاہور - جنوری ۱۹۳۲ء - ص ۹۰

۵- جامعہ دھلی دسمبر ۱۹۳۱ء - ص ۴۷۲ پر دوسرا مصرعہ یوں ہے ع
" اب نہ کچھ انجام ہے میرا نہ کچھ آغاز ہے "

۳- اضطراب لکھنؤ مارچ اپریل ۱۹۳۱ء - ص ۶۷

۴- غزل مکتوبہ جناب اصغر مملوکہ جناب نواب سید شمس الحسن صاحب کراچی - غزل کا عکس راقم مقالہ کے پاس محفوظ ہے -

۵- سالنامہ نیرنگ خیال لاہور عید نمبر اپریل مئی ۱۹۳۲ء - ص ۱۲۵

۱۱۵- زندگی رندی و مستی میں گزرتی ہو تمام

جب کوئی پوچھے تو عذر زہد و تقوا کیجئے " ۱

......

(د) غیر مدوّن کلام - (۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء) :

اصغر " سرود زندگی " کی طباعت کے بعد قریب قریب دو سال زندہ رہے - ان دو سالوں کا کلام منظر عام پر نہیں آ سکا - یہ کلام کتنا تھا یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا - تاہم دس بیس غزلیں تو رہی ہوں گی - اب ایک کا بھی پتہ نہیں - اصغر صاحب کی چھوٹی صاحبزادی ننھی کی شادی عبدالحی عباسی صاحب موضع کھوری ، ساگر (سی پی) کیطرف ہوئی تھی - عباسی صاحب کے حقیقی بھانجے ، رئیس احمد صاحب عباسی نے ۲ مئی ۱۹۷۱ء کو ایک گفتگو کے دوران میں جو ان کے یہاں گورنمنٹ کالج ساہیوال کی لائبریری میں ہوئی فرمایا :

" ممانی کے پاس اصغر صاحب کی ایک بہت بڑی تصویر (بسٹ) ، اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا بکس تھا جس میں کچھ کاغذات تھے - وہ اکثر اسے کھول کر دیکھا کرتی تھیں - ایک بار میں نے پوچھا کہ ممانی اس میں کیا ہے تو انھوں نے فرمایا "اس میں بابو کا غیر مطبوعہ کلام اور خطوط ہیں " --- افسوس ہے کہ ممانی کے انتقال کے بعد ماموں نے جب دوسری شادی کی تو ہماری نئی ممانی نے ، ممانی مرحومہ کی تمام چیزیں جلا ڈالیں - اگر وہ بکس اس بیدردی کی نذر نہ ہو گیا ہوتا تو میں اصغر پر ضرور پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھتا -"

سامان جلانے کی تصدیق رئیس صاحب کے والد جناب مولانا عبدالغنی صاحب ترگس ، حسن میوز ، راولپنڈی اُن کے بڑے بھائی لطیف احمد صاحب عباسی نے بھی کی --- ممکن ہے بعد کی غزلیں جو ننھی کے پاس تھیں اس طرح ضائع ہو گئی ہوں -

پرانے رسائل کی ورق گردانی سے جو دس بیس اشعار مل سکے ہیں ان کو یہاں جمع کر دیا گیا ہے کہ مبادا یہ بھی ضائع ہو جائیں -

۱- " نہ اشک اختیار میں نہ دل ہے اختیار میں

یہ حسن ہے کہ عشق ہے لباس تار تار میں

۱- سالنامہ نیرنگ خیال لاہور ۱۹۳۳ء - ص ۱۶۵

۲- جو شاخ گل سے پھوٹ کر فریب رنگ و بو بنا

یہ کون حسن مضطرب ہے پردۂ بہار میں " ۱

......

۳- کیا جانوں میں حباب تھا یا عین بحر تھا

موجوں سے کھیلتا ہوا موجوں میں مل گیا ۲

......

۴- نظارے میں نگاہ بھی حاجب نہیں رہی

اب وصل میں خیال بھی حائل نہیں رہا

۵- تو نے نگاہ لطف سے زینت عدم کو دی

مجھکو بھی دیکھنے میں کسی قابل نہیں رہا ۳

......

۶- کچھ اس انداز سے موج نسیم مشکبار آئی

کہ اپنے پیرہن سے آج مجھکو بوئے یار آئی ۴

......

۷- حسن لیلیٰ تھا کہ ہو جاتا ہے سرگرم نمود

ورنہ دیوانے میں کچھ تھا اور نہ دیوانے میں ہے ۵

......

۸- " موت و حیات سب ہیں گم محو یہ کائنات ہے

مست قلندر آج کل مائل سیر ذات ہے *

۱- اضطراب لکھنؤ - مارچ اپریل ۱۹۳۱ء - ص ٦٧

۲- " روح نشاط " سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۳٦ء - ص ٦٨

۳- ایضاً

۴- ایضاً

۵- ایضاً

*- اضطراب لکھنؤ جنوری فروری ۱۹۳۱ء میں یہ مصرع یوں بنا دیا گیا ہے ع

مستی عشق آج کل مائل سیر ذات ہے -

۹- دن وہ کہیں تو دن سہی رات کہیں تو رات ہے

عقل کی سو حکایتیں ، عشق کی ایک بات ہے

۱۰- کوئی بلائے تازہ پھر جان حزیں پہ آئے گی

پھر نگاہ سحر فن مائل التفات ہے

۱۱- موت کو ڈھونڈتا ہوں میں موت کا کچھ پتہ نہیں

تو ہی سر حیات ہے تو ہی پس حیات ہے

۱۲- سود و زیاں کے راز کی تجھ کو ابھی خبر نہیں

ورنہ قصاص عاشقی حاصل صد حیات ہے

۱۳- باغ نعیم بھی بجا ، نار جحیم بھی درست

تو مجھے بھیج دے جہاں ، میری وہیں نجات ہے

۱۴- عشق کو حسن کے سوا اور نہ کچھ نظر پڑا

چشم خرد کے سامنے پردۂ کائنات ہے " ۱

......

۱۵- " ذکر وہ تیرا کیا کہ جو ہر بن مو جلا نہ دے

یاد وہ تیری کیا کہ جو گردش خوں بڑھا نہ دے

۱۶- میرے سر نیاز کی محنتیں مٹا نہ دے

موت ہو یا حیات ہو کوئی مجھے صدا نہ دے

۱۷- اس کے حریم وصل میں موج نفس بھی روک لے

ہوش کو بھی خبر نہ ہو ، نگہت کو بھی ہوا نہ دے

۱۸- دل میں وہ سوز دل کہاں ، آتش مشتعل کہاں

اس کی ادائے جاں ستاں خاک کو اب ہوا نہ دے

۱۹- اف* ری میری فتادگی اف ری کمال خستگی

آئے وہ فرش خاک پر ، عرش پہ جو بٹھا نہ دے " ۲

۱- سالنامہ سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۳۶ء - ص ۲۹۰

*- سالنامہ سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۳۶ء میں یہ مصرع یوں شائع ہوا ہے ع

" اف یہ مری فتادگی اف یہ کمال خستگی "

۲- سالنامہ نیرنگ خیال لاہور جنوری ۱۹۳۷ء - ص ۱۶

۲۰- "عیاں ہے راز ہستی ، چشم حیرت باز ہے ساقی

که محو راز ہو جانا کشود راز ہے ساقی

۲۱- وہ اٹھی موج مے وہ جام و مینا میں تلاطم ہے

جہان بے نشاں سے دعوت پرواز ہے ساقی

۲۲- یہاں اس خاکداں عنصری میں کیا گزرتی ہے

تو ہی ہمراز ہے ساقی تو ہی دمساز ہے ساقی

۲۳- سنا کرتا ہوں راتوں کو برابر دمدمۂ مستی

تری آواز ہے یا خود مری آواز ہے ساقی "۱

......

آثار نثر :

بیشتر لوگ اصغر کو صرف شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں - بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اصغر ایک بلند پایہ نثر نگار و ادیب بھی تھے - انھوں نے اپنی کم و بیش تیس (۳۰) سالہ زندگی میں " نشاط روح " اور " سرود زندگی " کے علاوہ نثر میں بعض بڑی پرمغز اور فکر انگیز تنقیدی و ادبی تحریریں چھوڑی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر عمر نے وفا کی ہوتی تو وہ بہت بڑے ادیب اور نقاد ہوتے -

اصغر رواروی میں گھسیٹ پھینکنے کے قائل نہیں تھے - وہ ہر موضوع پر بہت غور و خوض کے بعد قلم سنبھال کر لکھنا چاہتے تھے اور معیار کی بلندی کو ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتے تھے - یہ معیار پرستی ہے تو بڑی خوبی لیکن اس کا نقص یہ ہے کہ کتاب ہو یا مقالہ ، بیشتر صورتوں میں فی بطن شاعر ، ہی رہ جاتا ہے یہی نقص اصغر میں تھا- وہ اپنی تحریر سے کبھی مطمئن نہ ہوتے - مدتوں تسوید و تبییض کا سلسلہ جاری رہتا اور کتاب چھپنے کی نوبت نہ آتی - اصغر کی اسی کیفیت کی طرف مولانا سراج الحق صاحب نے ، سطور ذیل میں اشارہ فرمایا ہے - وہ لکھتے ہیں :

" ایک دن مجھ سے کہنے لگے ، مولوی صاحب ! میں مضمون جب لکھتا ہوں تو اس میں کئی کئی بار حذف و اضافہ ، ترمیم و تنسیخ (اور) حک و اصلاح خود کرتا ہوں .... انشاء مجھ پر اتنی گراں

۱- بحوالہ مکتوب گرامی استاذی جناب مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہر مدظلہ العالی مرقومہ ۹ مئی ۱۹۶۹ء

نہیں جنتی تمیوں - کوئی شخص آپ کی نظر میں ہو تو بتائیے
.... وہ میرے مسودات صاف صاف لکھ دیا کرے ......
میں نے کہا ، میں خود ہوں ، ہنسنے لگے اور مجھے وہ مسودہ
اور سادہ کاغذ دیا .... میں نقل کر کے دے آتا ....
کچھ دنوں بعد .... مبیضہ پر نظر ڈالنی شروع کی ..
.... میرا مبیضہ پھر مسودہ ہو گیا .... بعض مسودات
تو میں نے تین (۳) بار لکھے ہیں [۱]۔"

اپنے تحقیقی مطالعے کے دوران میں مجھے ان کی بعض بہت وقیع و گران پایہ تصنیفات کا سراغ ملا ہے - لیکن افسوس کہ وہ دستیاب نہ ہو سکیں - تاہم ان کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا ہے درج کیا جاتا ہے - ان تمام نثری آثار کو حسب ذیل پانچ مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کر دیا گیا ہے - تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) کتب (۲) مضامین و مقالات (۳) متفرقات (۴) تراجم
(۵) مکتوبات -

(۱) کتب

(الف) اردو شاعری کی ذہنی تاریخ (سال تصنیف ۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۲ء)-

یہ کتاب اصغر کے انتہائی غور و فکر کا نتیجہ اور مستقل حیثیت کی حامل تھی اور کئی سو صفحات پر پھیلی ہوئی تھی - جناب رشید احمد صدیقی نے اس کا مسودہ ۱۹۳۰ء کے قریب دیکھا تھا - وہ لکھتے ہیں :

" مرحوم نے ایک مستقل تصنیف " اردو کی ذہنی تاریخ شروع کی تھی -
کئی سو صفحات کا مسودہ ان کے کاغذات میں اب تک موجود* ہے - لیکن
اوراق اتنے بوسیدہ اور گڈمڈ ہو گئے ہیں اور حواشی اس کثرت سے لکھے
ہیں کہ ان کا مرتب کرنا تقریباً ناممکن ہے [۲]۔"

۱- اصغر مرتبہ عبدالشکور مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۳۵ء - ص ۲۷

۲- گنج ہائے گرانمایہ از رشید احمد صدیقی - مرحوم اصغر گونڈوی - ص ۱۰۲

*- یہ مضمون اول اول جامعہ دہلی اگست ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا - بعد میں گنج ہائے گرانمایہ میں شامل کر لیا گیا -

لیکن جیسا کہ تفصیل آگے دی جائے گی کہ یہ ناممکن کام ممکن ہو گیا ۔ مسودہ صاف و مرتب ہو کر کتابی صورت میں منتقل کر دیا گیا پھر بھی منظر عام پر نہ آسکا ۔ یہ قصہ طویل ہے اور تکلیف دہ حد تک عبرتناک ۔

سال تصنیف

اصغر کے ذہن میں کب سے اس کا نقشہ تھا ۔ اسکے متعلق کوئی شہادت دستیاب نہ ہو سکی البتہ اس کا اظہار پہلی بار ان کی تحریر " مقدمہ رباعیات رواں " میں ہوا[1] جس کی تاریخ نگارش ۹ نومبر ۱۹۲۶ء ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" اردو شاعری اور اس کے ارتقائی مدارج کی کوئی فلسفیانہ تاریخ اگر مدون کی گئی تو یہ موضوع اپنی بحث کے لحاظ سے نہایت ہی عجیب ہوگا۔ میری مراد یہاں " زبان اردو " کی ارتقائی تاریخ سے نہیں...

.... میری غرض یہاں شعرائے اردو کے ارتقائے دماغی کی تاریخ سے ہے ۔[2] "

نومبر ۱۹۲۶ء تک ان کے دماغ میں ایک خاکہ تھا ۔ اس خیال نے ابھی دل میں کھلبلی نہیں پیدا کی تھی اور زیب قرطاس نہیں ہوا تھا ۔ لیکن وسط ۱۹۲۸ء میں اصغر نے اس کو ضبط تحریر میں لانے کی طرف بھی قدم اٹھایا ۔ چاندھویں جون ۱۹۲۸ء[3] میں جب مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری ان سے پہلی بار ملے ہیں تو وہ اسی خیال کے پیش نظر " تاریخ اودھ نجم الغنی " مطالعہ کر رہے تھے ۔ مولانا کی تحریر سے مطلوبہ حصہ پیش کیا جاتا ہے :

" اصغر صاحب کے یہاں پہونچے .... میں نے پوچھا یہ کیا کتاب ملاحظہ فرما رہے ہیں ۔ کہنے لگے " تاریخ اودھ " ہے ...

... ان دنوں ایک مضمون لکھ رہا ہوں " اردو شاعری کی ذہنی تاریخ " ۔[4] "

تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا ۔ پروفیسر سید وقار عظیم صاحب نے ایک گفتگو کے دوران میں جو ان کے دولتکدہ پر ۷ فروری ۱۹۷۱ء کو ہوئی فرمایا :

۱۔ رباعیات رواں مطبوعہ عطر چند کپور اینڈ سنز ۔ انار کلی لاہور ۔ ص ۳۰

۲۔ رباعیات رواں ۔ ص ٦

۳۔ مولانا نے بالتصریح جون ۱۹۲۸ء لکھا ہے ۔ تحریر مکتوب بنام راقم مقالہ ۲۲ فروری ۱۹٦۹ء

۴۔ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۳۵ء ۔ ص ۱۰-۹

" ۱۹۳۳ء میں میں ایم ۔ اے اردو کا طالب علم تھا ۔ میرے ایک ہم جماعت صفیر احمد صدیقی کو اصغر صاحب کے یہاں بڑا تقرب حاصل تھا وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ آجکل اصغر صاحب " اردو شاعری کی ذھنی تاریخ " لکھ رھے ھیں ۔"

مولانا سراج الحق صاحب کی تحریر سے بھی وقار عظیم صاحب کے بیان کی تائید و تصدیق ھوتی ھے ۔ وہ لکھتے ھیں:

" اردو شاعری کی ذھنی تاریخ " اسے پہلے بشکل مقالہ رسالہ زمانہ* کانپور میں (سنہ و ماہ یاد نہیں) چھپوایا تھا ۔ اس میں صرف دھلی اسکول کا ذکر تھا اس کے بعد اس کی دوسری قسط لکھنئو اسکول لکھ رھے تھے متفرق کاغذوں پر نوٹ درج تھے ۔ عمر نے وفا نہ کی ۔ غیر مرتب چھوڑ کر انتقال کر گئے [1]۔"

اصغر کا انتقال نومبر ۱۹۳۶ء میں ھوا ھے ۔ اس سے قبل ۱۹۳۳ء میں ان پر دوبارہ فالج کا اثر ھوا اور وہ شاید اس قابل نہیں رھے تھے کہ اپنے کار منصبی کی بجاآوری کے علاوہ کوئی اور کام بھی لکھنے پڑھنے کا کر سکتے ـــــ گویا " اردو شاعری کی ذھنی تاریخ " کی تصنیف کا سلسلہ ۱۹۲۸ء تا ۳۲-۱۹۳۳ء جاری رھا ۔

جس کتاب پر ۵ ، ۶ سال صرف کئے گئے ھیں ، اگر وہ کئی سو صفحات پر مشتمل ھو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ۔

<u>کتاب کی اھمیت :</u>

اصغر کے تمام دوست جنھوں نے اصغر کے سوانح حیات پر قلم اٹھایا ھے اور جنھوں نے اردو شاعری کی ذھنی تاریخ دیکھی تھی اس کی افادیت و اھمیت کے قائل اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ھیں ۔

جناب رشید احمد (جن کا اصغر کا چوبیس (۲۴) سال کا ساتھ تھا) اس کو " ان کی ایک معرکۃ الآراء تصنیف [2] " قرار دیتے ھیں ۔

---

*۔ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ۔ یہ مقالہ " اردو شاعری کی ذھنی تاریخ " ۔ دھلی اور لکھنئو اسکول کے عنوان سے شائع ھوا تھا (صفحات ۱۲۵-۱۳۰) ۔ اسمیں دھلی اسکول سے تفصیلی بحث اور اسکے خصوصیات بتائے ھیں ۔ لکھنئو اسکول سے متعلق صرف تمھیدی باتیں ھیں ۔ مجھے یہ مقالہ لکھنے کے بہت بعد ملا ۔ اس لیے صرف حاشیہ میں یہ بات درج کر دی گئی ۔

۱۔ مکتوب جناب مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری بنام مقالہ نگار ۱۷ فروری ۱۹۶۹ء

۲۔ " اصغر صاحب " از جناب سید رشید احمد ۔ جامعہ دھلی مئی ۱۹۶۷ء ص ۲۳۰

جناب عبدالشکور سابق پرنسپل حلیم مسلم کالج ۔ کانپور رقمطراز ہیں :

" کتاب کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اصغر اردو ، فارسی اور ہندی کے ایک غور و فکر کرنے والے عالم تھے ۔ ان کی معلومات وسیع ان کا علم گہرا اور ان کی نگاہ دور رس تھی ۔ انداز بیان شگفتہ اور سنجیدہ ۔ دلائل مضبوط اور معقول ہیں ۔ اب تک اس موضوع پر یکجا مواد بہت کم ہے ۔ آج سے دس پندرہ سال پیشتر (یعنی ۱۹۳۰ء ۔ مقالہ نگار) اس موضوع پر قلم اٹھانا ان کی ذہانت اور فطانت کی دلیل ہے [1]۔"

مولانا سراج الحق صاحب جدہمیں نے شروع سے آخر تک مسودہ کو صاف کیا اور بعض صورتوں میں تین تین بار صاف کیا تھا اور ۱۹۲۵ء کے حدود میں از سر نو صاف و مرتب کر کے کتابی شکل دی تھی ۔ لکھتے ہیں :

" وہ عجیب و غریب کتاب ہے اور میرے علم و یقین میں وہ کتاب فن تنقید کی بہترین کتاب ثابت ہوگی ۔ مولانا حالی نے تنقید کا کام جس جگہ چھوڑا تھا ۔ اس کے بعد اصغر نے اس کو تمام کیا ہے ۔ وہ نظریہ ہی عجیب ہے [2]۔"

کتاب کے مندرجات کا خاکہ : ان تحریرات نے میرے ذوق تحقیق کو تیز تر کر دیا اور میں بڑے انہماک اور سرگرمی کے ساتھ اس کی تلاش میں مصروف ہو گیا ۔ توفیق و تائید ایزدی سے کتاب کا کچھ حصہ مجھے رسالہ اضطراب بنارس اپریل مئی ۱۹۲۱ء میں مل گیا ۔ اس کے علاوہ وہ مقالہ بھی جو " اردو شاعری کی ذہنی تاریخ " ۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول ، کے عنوان سے رسالہ زمانہ ستمبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا ، مل گیا ہے جو بطور ضمیمہ مقالہ میں شامل کر دیا گیا ہے ۔ اس مضمون ، مقدمہ رباعیات رواں اور اصغر کی بعض دوسری تحریروں کی مدد سے " اردو شاعری کی ذہنی تاریخ " کا خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے ۔

۱۔ اصغر ۔ مرتبہ عبدالشکور ۔ مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۳۵ء ۔ ص ۱۲۸

۲۔ ایضاً ۔ ص ۲۷

اجمالاً تو یہ کتاب " شعرائے اردو کے ارتقائے دماغی کی تاریخ[1] " ہے لیکن تفصیل اسکی یہ ہے کہ اصغر نے اردو شاعری کے تین واضح " مزاج[2] " یا " اجتماعی ذھنیت[3] " کی نشان دھی کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہر دور کی شاعری میں سوسائٹی کی " اصل روح اور اجتماعی ذھنیت[4] " کارفرما ہوتی ہے ۔

اصغر نے اس نظریے کے تحت اردو شاعری کے حسب ذیل تین دور قائم کئے ہیں :

دور اوّل (از ابتدا تا عہد دھلی) ۔

وہ کہتے ہیں کہ " اس دور کی " اردو شاعری کا مایۂ خمیر ہندو فقرا اور مسلمان صوفیا کی باہمی رواداری سے تیار ہوا تھا جس میں متحدہ ذھنیت اور مشترکہ زبان کی تخلیق فطری طور پر کارفرما تھی[5] ۔ ---- (اس) کا ہیولیٰ فارسی و ہندی شاعری کے متحدہ عناصر پر قائم ہوا ۔ ایک مدت خاص (یعنی دور دھلی کی شاعری) تک اسکی رفتار صحیح رہی ...... شاعر کا تخاطب جب تک خود اپنے نفس سے تھا ۔ جس وقت تک ذاتی احساسات و جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی اس وقت تک شاعری شاعری تھی[6] ۔"

یہ دور مابعد کے دور سے رفیع تر ہے[7] ۔

دور دوم :

لیکن اودھ کی شاہی نے اردو شاعری کی حالت میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ---- (اس) کے زیر اثر اردو شاعری صنائع و بدائع اور ضلع و جگت میں مبتلا ہو کر بے تاثیری و سطحیت کا مصرا بن کر رہ گئی ---- مگر جہاں تک زبان اور الفاظ کی درو بست کا تعلق ہے متاخرین شعرائے اردو نے فن کو معراج کمال پر پہنچا دیا ۔ ان تمام کارناموں میں انتہائی کاوشیں صرف کی گئی ہیں لیکن یہ رنگین کاغذ کا گلدستہ صرف ایک " شراب نکہت " ہے جسکے پیچھے پڑ کر وقت تو ضائع ہو سکتا ہے مگر [illegible] شلپان کی سیرابی معلوم ۔[8] "

۱۔ مقدمہ رباعیات رواں ۔ مطبوعہ میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز ۔ اردو مرکز لاھور ص ٦

۲۔ مقدمہ یادگار نسیم ۔ مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۰ء ۔ ص ۱

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ رسالہ اضطراب بنارس اپریل مئی ۱۹۳۱ء ۔ ص ۸

٦۔ مقدمہ رباعیات رواں مطبوعہ اردو مرکز لاھور ۔ ص ۷

۷۔ ایضاً ۔ ص ۷

۸۔ مقدمہ رباعیات رواں ۔ مطبوعہ اردو مرکز ۔ ص ۷-٦

دور سوم :

" اس کے بعد زمانے نے دوسرا ورق الٹا - انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ جسکے دماغ میں ممالک غیر کے ادب و شعر سے ایک نیا سرور پیدا ہو چلا تھا - جب اس نے اپنے ملک کی شاعری پر نظر ڈالی تو اس کی طبیعت سخت بے کیف ہوئی .... یکایک طبیعتیں اس فضائے جامدہ اور اس طلسم بے کیف سے نکلنے کے لیے بیقرار ہو گئیں اس ھنگامہ اختراع و ایجاد میں بھی غریب اردو شاعری کو بہت سے جانگسل چرکے لگ گئے - اردو شاعری میں بلینک ورس کا شور مچ گیا - مہذب طبقہ میں غزل سے نفرت ہونے لگی - انتہا یہ کہ شاعری کو شرمناک جرائم میں سمجھا جانے لگا- بلکہ آج بھی کہ اردو شاعری میں جان پڑنے لگی ہے ہمارا زیادہ سنجیدہ طبقہ اب بھی غزل کے نام سے چونکا ہو جاتا ہے [۱]"

" حقیقت یہ ہے کہ ماحول کے اثرات سے کس طرح قومی و اجتماعی مزاج کی تشکیل ہوتی ہے اور یہ اجتماعی ذہنیت یا روح عصر ، شاعری میں کس طرح در آتی ہے " - اس پر مولانا حالی کے بعد اور ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے اتنی شرح و بسط کے ساتھ کسی تنقید نگار نے قلم نہیں اٹھایا - وہ اتنے واضح خطوط پر اردو شاعری کی کسی نے دور بندی کی - افسوس ہے کہ پوری کتاب نظر کے سامنے نہ آ سکی ورنہ یقیناً اردو تنقید میں خاصے کی چیز ہوتی -

کتاب کا حشر :

" اردو شاعری کی ذہنی تاریخ کا ذکر سب سے پہلے رشید احمد صدیقی صاحب کے مضمون " مرحوم اصغر گونڈوی مطبوعہ جامعہ اگست ۱۹۳۰ء میں نظر آتا ہے -(جسے بعد میں گنج ہائے گرانمایہ میں شامل کر دیا گیا) --- وہ لکھتے ہیں :

" مرحوم نے ایک مستقل تصنیف " اردو کی ذہنی تاریخ " شروع کی تھی - کئی سو صفحات کا مقدمہ ان کے کاغذات میں اب تک موجود ہے [۲]"

اس کے بعد اس کتاب (ذہنی تاریخ) کا سراغ ہمیں " اضطراب [۳] " - بنارس مارچ اپریل مئی ۱۹۳۱ء جلد ۹ ، ۱۰ ، ۱۱ میں ملتا ہے ----- پھر طویل وقفہ کے بعد مولانا سراج الحق صاحب کی حسب ذیل تحریر نظر آتی ہے :

۱- مقدمہ رباعیات رواں - مطبوعہ اردو مرکز - ص ۸-۷

۲- گنج ہائے گرانمایہ - ص ۱۰۲

۳- " اضطراب " اولاً لکھنؤ سے نکلتا تھا - مارچ ۱۹۳۱ء کے بعد بنارس سے نکلنے لگا - اسکے مدیر اعلیٰ خواجہ مسعود ذوقی اور نگراں جگر مرادآبادی تھے - اس شمارے میں اصغر صاحب کا مضمون " اردو کی نشوونما " کے عنوان سے شائع ہوا ہے - (صفحہ ۲ تا ۱۰) -

" اب نہ جانے وہ کتاب (اردو شاعری کی ذہنی تاریخ) کہاں ہے
جگر صاحب سے بارہا کہا کہ اس کو تلاش کر کے مرتب کیجئے اور شائع
کرائیے ـــــ میں نے یہ بھی کہا کہ اگر مسودہ مل جائے تو میں اس
کو مرتب کر دوں گا اور سچ پوچھئے تو مجھ سے زیادہ مستحق اور
موزوں کوئی دوسرا ہو بھی نہیں سکتا ۔ میں نے اس کا سارا مسودہ
دو دو اور تین تین بار صاف کیا ہے [1]۔"

محولہ بالا عبارت سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ ۱۹۲۵ء تک " اردو شاعری کی
ذہنی تاریخ " کے متعلق مولانا سراج الحق صاحب کو کوئی علم نہیں تھا کہ کہاں ہے ـــ
لیکن یہ نتیجہ خلاف واقعہ ہے ۔ کیوں کہ اسی کتاب میں عبدالشکور صاحب مرتب کتاب کی یہ
عبارت بھی موجود ہے :

" پانچ چھ اصحاب سے زیادہ نہیں ہوں گے جو " اردو شاعری کی
ذہنی تاریخ " دیکھ چکے ہوں ۔ ہم نے یہ کتاب جستہ جستہ پڑھی
ہے ۔ اصغر مرحوم اسے بہت غیر مرتب حالت میں چھوڑ کر مرے تھے ۔
اب ان کے ایک دوست نے بڑی محنت اور کاوش سے مدوّن کیا ہے اور
امید ہے کہ یہ بیش بہا تصنیف زیور طبع سے آراستہ ہو کر جلد شائقین
کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی [2]۔"

عبدالشکور صاحب کے اقتباس سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ ۱۹۲۵ء میں (یعنی اصغر
مرتبہ عبدالشکور کی اشاعت کے وقت) کتاب مرتب ہو چکی تھی ۔ اس سے یہ بھی واضح ہو
گیا کہ ان ہی دنوں اسے اصغر کے کسی دوست نے مرتب کی تھی ۔

اب ان مرتب دوست کی کیفیت جگر صاحب سے سنیے :

" اصغر صاحب کی ایک تصنیف " نفسیاتی تاریخ اردو ادب* "
کا ذکر غالباً میں نے آپ سے کیا تھا ۔ اس کا مسودہ اس حد تک
خستہ اور شکستہ ہو چکا تھا کہ میں اور میرے اکثر احباب اس کے پڑھنے تک
تک سے عاجز آ چکے تھے ـــــ یکایک مولوی سراج الحق صاحب

۱۔ " اصغر کے چند ادبی افادات " از مولانا سراج الحق ۔ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور
مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۲۵ء ۔ ص ۳۸

۲۔ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور ص ۱۶۸ ۔ بحوالہ مقالہ اصغر اور اسکا کلام از عبدالشکور

* ۔ کتاب کا نام " اردو شاعری کی ذہنی تاریخ " ہے ۔ جگر صاحب کو تسامح ہوا ۔

...... گونڈہ پہونچ گئے ...... میں نے یہ مسودہ انھیں
دکھایا ...... مولانا نے ...... امید دلائی ......
چنانچہ کچھ زمانہ کی محنت شاقہ کے بعد ان کی سعی مشکور
ہوئی ۔ انھوں نے مجھے مطلع کیا مسودہ مرتب ہو چکا ہے ۔
لیکن الہ آباد میں کوئی صاحب ...... طبع کرانا چاہتے ہیں
میں اور وہ طالب اجازت ہیں ۔ میں نے انھیں لکھا کہ ایسا نہیں
ہونا چاہیے خود میں اسے شائع کر دوں گا .... ایک
مشاعرے کے سلسلے میں جب میں الہ آباد پہنچا تو مولوی سراج الحق
صاحب ...... نے فرمایا وہ مسودہ وہی صاحب لے گئے ہیں جو
طبع کرانا چاہتے تھے ۔ میرا ماتھا ٹھنکا میں نے مولوی صاحب سے
اندیشہ کا اظہار کر دیا .... زمانہ گزرتا گیا مسودہ کی
نقل نہ ملنی تھی نہ ملی ۔ یکایک کانپور سے پرنسپل اسلامیہ کالج*
کا ایک خط آیا ۔ صرف اجازت طلب فرمائی گئی [1]......"

اقتباس بالا سے جو اہم باتیں سامنے آتی ہیں وہ درج ذیل ہیں :

(۱) مسودہ مولانا سراج الحق صاحب نے مرتب فرمایا تھا ۔ اس کی تصدیق مولانا بھی فرماتے ہیں :

" میں نے اس کام کو جان دے کر ایک سال میں مرتب کر کے ایک رسالہ میں
صاف صاف لکھ کر جگر صاحب کو دیا [2]۔"

(۲) مبینہ مولانا سراج الحق صاحب سے الہ آباد کے کوئی صاحب (محمد سعید صاحب) ساکن محلہ دارا گنج الہ آباد [3]) چھاپنے کی غرض سے لے گئے ۔

(۳) (جناب عبدالشکور صاحب) پرنسپل اسلامیہ کالج (حلیم مسلم کالج) کانپور نے کتاب کے شائع کرنے کی اجازت طلب کی تھی ۔

---

*۔ کانپور میں اسلامیہ کالج نام کا کوئی کالج نہیں تھا ۔ یہاں بھی جگر صاحب کو نام کے بارے میں اشتباہ ہوا ہے ۔ کالج کا نام " حلیم مسلم کالج " تھا ۔ اور اس کے پرنسپل جناب عبدالشکور بریلوی صاحب تاشائی تھے ، یہ بزرگ ۱۹۳۹ء تک وہاں رہے ۔

۱۔ " مکاتیب جگر " مرتبہ جناب تسکین قریشی ۔ ناشر ملک اینڈ کو پبلشرز ۔ اردو بازار دہلی ۱۹۶۲ء ۔ ص ۳۲-۳۳ ۔ یہ مکتوب جگر صاحب کا بنام تسکین قریشی ہے مرقومہ ۱۱ جنوری ۱۹۳۶ء ۔

۲۔ مکتوب مولانا سراج الحق صاحب بنام راقم مقالہ مرقومہ ۱۷ فروری ۱۹۶۹ء

۳۔ مکتوب جناب سید رشید احمد صاحب بنام راقم مقالہ مرقومہ ۲۹ اگست ۱۹۷۰ء

(۴) جگر صاحب کو پرنسپل عبدالشکور صاحب کی نیت پر شبہ ہوا تھا چنانچہ اسی خط میں تسکین قریشی صاحب کو لکھتے ہیں :

" ...... پرنسپل اسلامیہ کالج کانپور کا ایک خط آیا - صرف اجازت طلب فرمائی گئی تھی - مجھ تک ان صاحب کی بہت سی شکایتیں پہنچ چکی ہیں وہ دوسروں کے تالیفات و تصنیفات سے خود فائدہ اٹھاتے رہے ہیں [1] - "

(۵) جگر صاحب پرنسپل عبدالشکور صاحب سے کتاب حاصل کرنے کے سلسلے میں جناب بشیر احمد خاں صاحب سے جو ان دنوں کانپور میں کوتوال تھے اور تسکین قریشی صاحب کے دوستوں میں تھے ، مدد چاہتے تھے - تسکین صاحب کو لکھتے ہیں :

" آپ کے دوست بشیر صاحب غالباً اس معاملے میں میری بہت کچھ مدد کر سکیں گے - آپ انھیں تفصیلاً ان حالات سے مطلع کر دیں [2] "

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم ناکام رہی - جیساکہ تسکین قریشی صاحب رقمطراز ہیں :

" جہاں تک مجھے یاد ہے معاملۂ معلومہ کے متعلق میں نے بشیر صاحب کو خط لکھ دیا تھا مگر جگر صاحب ان سے نہیں ملے اور یہ قصہ طے نہ ہو سکا [3] - "

" مکاتیب جگر " (جسکے حوالے اوپر گزرے ہیں) ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں مرتب ہو چکی تھی لیکن اس کو آخری شکل ۲۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو دی گئی اور ۱۹۶۲ء میں طبع ہوئی - گویا ۱۹۶۰ء تک (اقتباس مکاتیب جگر کی روشنی میں) کتاب جناب عبدالشکور صاحب کی تحویل میں رہی -

میں نے اس بات کی مزید تحقیق کے لئے جناب عبدالشکور صاحب کو بریلی میں لکھا جس کے جواب میں انھوں نے تحریر فرمایا :

" ان کی " نئی تاریخ اردو شاعری کی " کی اجازت جگر صاحب

۱-۲ ، مکتوب جگر بنام تسکین قریشی مرقومہ ۱۱ ، ۱۲ جنوری ۱۹۳۶ء بحوالہ مکاتیب جگر ص ۲۳-۲۴

۳- ذیلی حاشیہ مکاتیب جگر ص ۲۳ - یہی بات موصوف نے راقم مقالہ کو بھی اپنے مکتوب مرقومہ ۲ اپریل ۱۹۶۹ء میں تحریر فرمائی " میں نے اس کتاب کے سلسلے میں جگر صاحب کو لکھا تھا کہ وہ میرے ایک " بااختیار " دوست (جناب بشیر احمد خاں صاحب) سے جو اس زمانے میں کانپور میں تھے ، ملیں - غالباً وہ خاطر خواہ امداد کر سکیں گے - مگر جگر صاحب ان سے نہ مل سکے - پھر مجھے معلوم نہیں کہ کیا رہا "

نے نہ دی اس لیے وہ شائع نہ ہو سکی ۔ البتہ اس کو میں نے دیکھا
اور اس کا مسودہ کچھ دنوں میرے پاس رہا ۔ پھر میں نے جگر صاحب
کو واپس کر دیا ۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ اس کا کیا حشر ہوا۔[۱]"

راقم مقالہ کی درخواست پر جناب سید رشید احمد صاحب (ابوسرائے فیض آباد)
مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری سے ، الہ آباد جا کر ملے اور اپنی گفتگو کی تفصیل
میں رقم فرمائی :

" اصغر کی کتاب " اردو شاعری کی ذہنی تاریخ " کا مسودہ اصغر کے
انتقال کے بعد جگر کی تحویل میں آیا تھا اسے ...... مولانا نے
(سراج الحق صاحب) .... صاف کر کے جگر صاحب کو
دیا .... سال ڈیڑھ سال کا زمانہ گزر گیا اس دوران الہ آباد کے
دو ایک پبلشروں نے مولانا کو گھیرا .... کہ کتاب اشاعت کے لئے
دلا دیں .... سید محمد سعید پبلشر ساکن محلہ دارا گنج
کو ...... مولانا نے .... وہ مسودہ دلا دیا ....
سعید نے دو سال تک ڈالے رکھا .... بالآخر جگر نے اس کا
تقاضا کیا اور بمشکل تمام مولانا نے محمد سعید سے وہ مسودہ جگر کو
الہ آباد میں .... واپس دے دیا ۔[۲]"

ان مختلف بیانات کی روشنی اور محولہ بالا مواد کی جرح و تعدیل سے حسب ذیل
نتائج مستنبط ہوتے ہیں :

(۱) ۱۹۳۵ع کے حدود میں مولانا سراج الحق صاحب نے " اردو شاعری کی
ذہنی تاریخ " کا مسودہ مرتب کر لیا تھا ۔

(۲) محمد سعید برادرس پبلشرز ، الہ آباد نے کتاب چھاپنے کی غرض سے
حاصل کی ۔

(۳) کتاب عبدالشکور صاحب کے پاس بھی کچھ دن رہی ۔

(۴) ۱۱، ۱۲ جنوری ۱۹۳۶ع تک کتاب جگر صاحب کو نہیں ملی تھی ۔

۱۔ مکتوب جناب عبدالشکور صاحب بریلوی سابق پرنسپل حلیم مسلم کالج کانپور بنام راقم مقالہ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۶۹ء ۔

۲۔ مکتوب جناب سید رشید احمد بنام راقم مقالہ مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۷۰ء

(۵) آخر میں کتاب جگر صاحب کو واپس مل گئی ـــــ جیساکہ جناب عبدالشکور نے بصراحت اپنے مکتوب میں لکھا ہے جسکی تصدیق مولانا سراج الحق صاحب کے مکتوب سے بھی ہوتی ہے -

(٦) اس کے بعد اس کا کچھ سراغ نہیں ملتا -

راقم مقالہ نے اس کی تلاش میں مئی جون (۱۵ مئی تا ۱۲ جون) ۱۹۷۰ع میں ہندوستان کا سفر بھی اختیار کیا لیکن اصغر کے لواحقین[1] میں سے کسی نے اس کا کچھ پتہ نشان نہ بتایا - افسوس کہ جگر صاحب کی غفلت سے ایک اعلیٰ تصنیف منظرعام پر نہ آ سکی -

(ب) سلسلۂ تحائف :

اصغر نے انڈین پریس الہ آباد کے دوران ملازمت میں "بچوں کی تفریح و تفنن[2] " کے لئے تحفہ جات کا ایک سلسلہ پیش کیا تھا جن میں مختلف ممالک کے سماجی اور معاشرتی حالات ، تفریحی مشاغل و دیگر سرگرمیاں اور " قومی اور ملکی جانبازوں کی ولولہ انگیز باتیں[3] " کتابچوں کی صورت میں آسان و سادہ زبان میں لکھی تھیں - تاکہ بچے ممالک غیر کے لوگوں کے حالات سے متعارف ہوں - اس طرح ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت ہو اور ان کی بلند و شریفانہ صلاحیتیں غیر ارادی طور پر برانگیختہ و بیدار ہو سکیں[4] ـ" ساتھ ہی اس بات کا بھی التزام و اہتمام کیا گیا تھا کہ " آہستہ آہستہ بچوں کو شائستہ نثر اردو اور اعلیٰ ادبیات سے بھی لطف اندوز ہونے کے قابل بنایا جائے[5] ـ"

ان کتابچوں کا مواد مختلف مقامات سے صدہا اوراق کی چھان بین سے ذہن میں محفوظ کر لیا گیا ہے اور اسے ایک رشتہ بیان میں منسلک کر دیا گیا ہے[6] ـ" اس طرح اگرچہ یہ کتابچے تالیفات کا درجہ رکھتے ہیں لیکن اسلوب بیان نے ان میں تصنیفات کی شان پیدا کر دی ہے -

---

۱- اصغر کے لواحقین میں سے نسیم جگر (یعنی بیوہ اصغر و جگر) بیگم نسیم کے بھتیجے جناب نیاز گونڈوی اور بھتیجے داماد جناب محسن علی صدیقی ، آج بھی کاشانۂ جگر گونڈہ میں موجود ہیں - مقالہ نگار ویزا کی دشواری کی وجہ سے خود تو نہ جا سکا لیکن میرے محسن و بزرگ جناب سید رشید احمد صاحب ابو سرائے فیض آباد اور رفیق صمیم جناب افضل علی (ریسرچ اسکالر بہار یونیورسٹی) نے از راہ تلطف گونڈہ کا سفر اختیار کیا اور بعض بڑی اہم معلومات فراہم کیں جو میرے پاس محفوظ ہے -

۲- ٦، دیباچہ تحفۂ جرمنی مرتبہ اصغر حسین اصغر - مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد

کتابچوں کے مشتملات عموماً ۸۰ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں - اور ان کا سال تالیف ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان ہے - سلسلۂ تحائف کے جن کتابچوں کا سراغ مل سکا ہے ، انھیں زمانی ترتیب کے لحاظ سے درج ذیل کیا جاتا ہے :

(۱) تحفۂ لندن	۱۹۲۸ء ۱
(۲) تحفۂ جاپان	سال طباعت ۱۹۲۹ء ۲
(۳) تحفۂ مصر و حبش	ایضاً
(۴) تحفۂ اسٹریلیان	سال طباعت معلوم نہ ہو سکا- ۳
(۵) تحفۂ فرانس	ایضاً ۴
(۶) تحفۂ چین	ایضاً ۵
(۷) تحفۂ جرمنی	سال طباعت ۱۹۳۳ء ۶
(۸) تحفۂ امریکا	سال طباعت نامعلوم ۷

۱- بحوالۂ مکتوب جناب پروفیسر سید احتشام حسین بنام راقم مقالہ مرقومہ ۲۷ جنوری ۱۹۷۱ء احتشام صاحب کی اصل عبارت یہ ہے " تحفۂ لندن کے دیباچے میں ۱۹۲۸ء" ہے -

۲- ان دونوں کتابچوں کا اشتہار زمانہ کانپور دسمبر ۱۹۲۹ء کے شمارے میں " علمی خبریں " کے تحت درج ذیل ، عبارت میں دیا گیا ہے -
"(۱) تحفۂ جاپان - از حضرت اصغر گونڈوی - قصے کے پیرایے میں جاپان کے متعلق تمام ضروری باتیں اس میں درج کر دی گئی ہیں .....
(۲) تحفۂ مصروحبش - یہ بھی حضرت اصغر گونڈوی کی تالیف ہے --- وہاں کے باشندوں کے عادات و خصائل ، پیداوار وغیرہ کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں ..." ص ۳۵۹

۳- کتاب بشیر حسین صاحب ضیائی ماڈل ٹاؤن لاہور کے کتب خانہ میں موجود ہے لیکن اس پر سال طباعت درج نہیں ہے -

۴- بحوالۂ مکتوب جناب پروفیسر احتشام حسین مرقومہ ۲۷ جنوری ۱۹۷۱ء - کتاب میری نظر سے نہیں گزری -

۵- بحوالۂ گفتگو جناب شاہ الحق صدیقی صاحب ۱۵ مئی ۱۹۶۹ء

۶- بحوالۂ مکتوب جناب احتشام حسین ، آپ کی عبارت یہ ہے :
" تحفۂ جرمنی ۱۹۳۳ء میں چھپی غالباً آخری ہے - یہ کتاب میں نے ضیائی صاحب کے کتب خانے میں دیکھی تھی - لیکن بعد میں نہ مل سکی -

۷- بحوالۂ مکتوب جناب مولوی سراج الحق بنام راقم مقالہ مرقومہ ۱۷ فروری ۱۹۶۹ء - اس کتابچہ کے بارے میں کہیں اور سے تحقیق نہیں ہو سکی -

(ج) یادگار نسیم (مطبوعہ ۱۹۳۰ء) :

اصغر شعر و ادب کا ایک مخصوص نظریہ رکھتے تھے - ان کے نزدیک شعر و ادب کا مقصد قاری میں " بلندنظری ، صحیح بصیرت اور صالح ادبی ذہنیت[1]" پیدا کرنا ہے - اسی خیال کے پیش نظر انھوں نے یادگار نسیم کے نام سے[2] اواخر ۱۹۳۰ء میں ،

۱- " التماس " یادگار نسیم از اصغر مطبوعہ انڈین پریس لمیٹڈ - الہ آباد - ص اوّل

۲- " یادگار نسیم " پر سال طباعت ۱۹۳۰ء درج ہے مہینے کا کوئی ذکر نہیں - لیکن بعض قرائن و شواہد سے ، اس کی طباعت کی تاریخ (مہینے) کا تعین ہو جاتا ہے - مثلاً* " اردو " اکتوبر ۱۹۳۰ء کے شمارے میں صفحہ ۷۷۳-۷۷۷ پر ، کتاب پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ " یادگار نسیم " اکتوبر ۱۹۳۰ء سے پہلے شائع ہو چکی تھی - میرے اس خیال کو حسب ذیل باتوں سے مزید تقویت پہنچتی ہے -

(۱) جناب ڈاکٹر محی الدین قادری زور ، اصغر سے اپنی پہلی ملاقات کو ، اصغر کے اس مکتوب سے منسوب کرتے ہیں جو بقول ان کے " اوائل ۱۹۳۰ء " میں لکھا گیا تھا (چند شخصیتیں چند تاثرات - ص ۲۳) -

آگے لکھتے ہیں :

" اس اثناء میں ..... اپنا پہلا مجموعہ .... نشاط روح ..... اور اسکے بعد گلزار نسیم کے اس نسخہ کا پروف ارسال فرمائے جو وہ ایڈٹ کر چکے تھے اور انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہو رہا تھا " (ایضاً* - ص ۲۵) -

" نشاط روح " پر جو ستائشی جواب ڈاکٹر زور نے اصغر کو لکھا ، اسکے جواب میں اصغر نے انھیں اپنے مکتوب مرقومہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں ان کو لکھا :

" میرے اشعار سے یورپ میں بیٹھ کر " لطف اٹھانے " کا حال معلوم کر کے مجھے بھی لطف آ گیا " (بحوالہ نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم - ص ۲۰۲) -

اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ " نشاط روح " اور " پروف " ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۰ء سے کم از کم دو تین ماہ پہلے بھیجے گئے ہوں گے - کیوں کہ یورپ تک ڈاک کے آنے جانے ، کتاب پڑھنے ، اس پر اظہار خیال کرنے میں اتنی مدت ضرور لگی ہوگی -- اس مدت کو کم از کم دو ماہ رکھا جائے تو کتاب کی طباعت اگست کی آخری تاریخوں میں آتی ہے -

(۲) یادگار نسیم کے آخر میں جو آراء شامل کی گئی ہیں ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی " رائے " کے آخر میں ۲۵ اگست ۱۹۳۰ء کی تاریخ درج ہے - اسکے پیش نظر کتاب کی طباعت ۲۵ اگست کے بعد کی معلوم ہوتی ہے - لیکن یہ " آراء " بعد کا اضافہ ہے (جیسا کہ کتاب کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے) اس لیے کتاب ۲۵ اگست سے پہلے طبع ہو رہی تھی -

(۳) " یادگار نسیم " کا ذکر " جام جہاں نما " لکھنئو جولائی تا ستمبر ۱۹۳۰ء (جلد ۷-۹) میں اسطرح آیا ہے - " یہ مجموعہ " یادگار نسیم " کے نام سے انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا ہے " - تمام محولہ بالابیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ " یادگار نسیم " ستمبر ۱۹۳۰ء سے پہلے شائع ہو چکی تھی - اور جون تا اگست ۱۹۳۰ء طباعت کے مراحل میں تھی - جناب عابد رضا بیدار نے یادگار نسیم کا سال طباعت ۱۹۳۱ء لکھا ہے (آجکل جون ۱۹۵۷ء ص ۳۷) جو یقیناً* غلط ہے -

" مثنوی گلزار نسیم اور دیوان نسیم کا انتخاب مع تحشیہ اور طویل الذیل مقدمہ کے ، انڈین پریس الہ آباد سے شائع کیا ۔ چونکہ کتاب طلبہ کے لئے مرتب کی گئی تھی اس لیے متن سے عریاں و فحش اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں ۔

(۲) اشعار کے حذف کر دینے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کو مختصر نثر پارون سے پر کیا گیا ہے ۔

(۳) طلبہ کی سہولت کے پیش نظر اور ان میں صحیح مذاق شعری پیدا کرنے کے لیے جا بجا ، حاشیہ میں تشریح کی گئی ہے ، جس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے ۔

" یادگار نسیم " پر اصغر کا مقدمہ بڑا فاضلانہ ہے ۔ ایسے زمانہ میں جب کہ اردو میں تنقید کا کوئی واضح تصور و معیار قائم نہیں ہوا تھا اصغر نے بڑی دیدہ وری اور بصیرت سے " مقدمہ " میں " اجتماعی ذہنیت کے اثرات " اور " شاعر کی مخصوص انفرادی شخصیت کو برابر کی اہمیت دی ۔ اور یہ نظریہ پیش کیا کہ اچھا شاعر ، اجتماعی ذہنیت سے اثر پذیر ہونے کے باوجود اپنی امتیازی حیثیت اور مخصوص انفرادی شخصیت کو قائم و برقرار رکھتا ہے [1]

" مقدمہ " میں ، اصغر نے نسیم کی " انفرادیت " کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں خالصتہً " لکھنوی مزاج " کی پیداوار ثابت کیا ہے اور ان کی مثنوی " گلزار نسیم " کو لکھنؤ اسکول کی پہلی " مثنوی " کہا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کا موازنہ " مثنوی سحرالبیان " سے کسی طرح مناسب نہیں [2]

" یادگار نسیم " اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے ، اس کی تالیف میں اصغر کی " لطیف شاعرانہ طبیعت " اور " ناقدانہ بصیرت " جس طرح نمایاں ہوئی ہے اسے ان کے بیشتر معاصرین نے سراہا اور اس کا اعتراف کیا ہے ۔ ذیل میں ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کی تحریر کا اقتباس دیا جاتا ہے تاکہ اصغر کی اس تالیف کی افادیت اور اس کی گراں قدری کا اندازہ ہو سکے :

> " اردو زبان میں تنقید کا فن ابھی ابتدائی منازل میں ہے لیکن یادگار نسیم میں اصغر حسین صاحب اصغر نے جو مقدمہ " مثنوی گلزار نسیم " پر سپرد قلم فرمایا ہے وہ کسی زبان میں ہوتا ،

---

۱ ۔ مقدمہ یادگار نسیم ۔ ص ۱-۲

۲ ۔ مقدمہ یادگار نسیم ۔ ص ۹

کہ ناقدانہ تحریروں میں ایک بلند مرتبہ کا مستحق قرار دیا جا سکتا
تھا ۔ اس تنقید میں حسن شعر کا وہ لطیف ادراک بھی موجود
ہے جو کسی اچھے شاعر ہی میں آسانی سے ممکن ہے اور وہ
دقت نظر بھی جو فلسفی کی خصوصیت ہے ۔ شاعری پر " اجتماعی
ذہنیت " کے اثرات کو اور پھر اس " اجتماعی ذہنیت " کے
غلبہ و تسلط کے باوجود شاعر کے " مخصوص انفرادی شخصیت " کے
ظاہر ہو جانے کو جس خوبی سے دیا شنکر نسیم کی مثنوی کی
مثال سے واضح کیا گیا ہے ۔ وہ حضرت اصغر ہی کا حصہ ہے[1] ۔"

(د) دیوان مظہر جان جان (از اکتوبر ۱۹۳۰ء تا وسط ۱۹۳۲ء) :

" یادگار نسیم " کی ترتیب کے بعد اصغر کا خیال مرزا مظہر جانجاناں کا دیوان مرتب کرنے کا ہوا ۔ اس سلسلے میں اصغر کا پروگرام بہت وسیع اور جامع تھا ۔ ہندوستان میں دستیاب ہونے والی چیزوں کے علاوہ وہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کا مواد بھی سمیٹ لینا چاہتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے مواد کی فراہمی کے لیے سر تیج بہادر سپرو کو جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلینڈ تشریف لے گئے تھے ، لکھا ، ساتھ ہی ڈاکٹر محی الدین قادری زور کو جو ان دنوں جامعۂ سوربون ، پیرس میں تھے ، تحریر کیا :

" یورپ کے کتب خانوں کے اردو مخطوطات اور نادر کتابوں کی فہرست
بہت ضروری ہے ۔ اسی کے ساتھ آپ کا مشورہ بھی کہ ان میں کون
سی چیزیں کام کرنے کے قابل ہیں ۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں
کے دیوان کی ترتیب فی الحال میرے پیش نظر ہے کچھ اس کے بارے
میں بھی مشورہ دیجئے[2] ۔"

اس تحریر و تحریک پر جناب زور نے " اردو مخطوطات کی تفصیلات اور خاص طور پر حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے کلام کی نسبت چھان بین شروع کر دی[3] " ۔ غالباً انھوں نے خط کے ذریعہ اصغر کی امداد و اعانت کا وعدہ بھی فرمایا ۔ جس پر اصغر نے تندھی

۱۔ " مشاہیر کی رائیں " ۔ یادگار نسیم ۔ ص ۵

۲۔ مکتوب جناب اصغر بنام ڈاکٹر زور مرقومہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۰ء ۔ بحوالہ نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم ۔ ص ۲۰۲ ۔

۳۔ " چند شخصیتیں چند تاثرات " ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ۔ مطبوعہ سندھ اکیڈمی کراچی ۱۹۶۲ء ۔ ص ۲۸

سے کام شروع کر دیا ۔ وہ جلد از جلد اسے مکمل کر لینا چاہتے تھے لہذا بیماری کے عالم میں ڈاکٹر زور کو جو بیماری کے سبب اواخر ۱۹۳۰ء میں حیدرآباد پہنچ چکے تھے، لکھتے ہیں :

" حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے اردو کلام کے بارے میں میں نے سنا ہے کہ انڈیا آفس یا برٹش میوزیم میں کوئی نسخہ موجود ہے ...... اگر یہ خبر صحیح ہو تو میں وہاں سے اس کی فوٹو کے لئے کوشش کروں .... میں نے سرتیج بہادر سپرو کو بھی ولایت میں لکھا ہے لیکن شاید راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی مصروفیتوں سے انھیں فرصت نہیں ملی کہ وہ اس کی تحقیق کر کے مجھے جواب دیتے [۱] ۔"

اس پر جناب زور نے اپنے شام خوش اور حوالے اصغر کو بھیج دیئے اور پوچھا کہ اب تک آپ نے کیا کچھ جمع کر لیا ہے [۲]

جواب میں اصغر نے ان کو لکھا :

" حضرت مرزا مظہر جان جاناں کا وہی کلام جو مختلف تذکروں میں ہے مجھے اب تک مل سکا ہے ۔ فارسی کا دیوان بھی مل گیا ہے لیکن " منتخب اشعار مظہر " مجھے کہیں کر مل سکے گا ۔ اس امر میں آپ کی امداد کا منتظر ہوں اور منتظر رہوں گا [۳] ۔"

جناب اصغر کا شغف اس کام سے اتنا بڑھ چکا تھا کہ بطور " تقاضائے شدید " ڈاکٹر زور کو پھر لکھتے ہیں :

" حضرت مظہر کا اردو کلام میرے پاس وہی ہے جو عام طور پر تذکروں میں ملتا ہے ۔ آبحیات ۔ گل رعنا ۔ شعرالہند ۔ تذکرۂ میر ۔ چمنستان (شعرا) اور بس ۔ ان کا فارسی دیوان بھی ہے ۔ یہ ہے کل کائنات مواد اور مسالے کی ۔ اس کے علاوہ آپ جو کچھ دیں گے اس کا ممنون ہوں گا ۔ مگر جو کچھ دیجئے

۱۔ مکتوب جناب اصغر بنام ڈاکٹر محی الدین قادری زور مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۳۱ء بحوالہ نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم ۔ ص ۲۰۲

۲۔ چند شخصیتیں چند تاثرات ۔ ص ۳۰

۳۔ ایضاً

اب وہ بھیج ہی دیجئے ۔ انتظار کی حد ہو چکی [1] ۔"

اس خط کے دو ماہ بعد جب ڈاکٹر زور ہندستانی اکیڈمی کی سالانہ کانفرنس (منعقدہ ۵، ۶ مارچ ۱۹۳۲ء [2]) میں شرکت کی غرض سے الہ آباد تشریف لائے تو اصغر سے ملاقات ہوئی ۔ یہ ملاقاتیں تقریباً روزانہ رہیں [۲ (الف)] ۔ ان ملاقاتوں میں اصغر نے مرزا مظہر پر کیا ہوا سارا کام جناب زور کو دکھلایا ۔ چنانچہ اس ضمن میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے زور صاحب لکھتے ہیں :

" اس موضوع پر (مرزا مظہر جان جاناں) اصغر صاحب نے کافی معلومات جمع کی تھیں اور ان کو زیادہ تر قلم بند بھی کر دیا تھا [3] ۔"

لیکن ابھی اس کو پورا نہیں کر سکے تھے وہ جناب زور کے اس وعدے پر بھروسہ کئے بیٹھے رہے کہ

" حضرت مظہر کی نسبت جو جدید انکشافات ہوئے ہیں اس طرف خاص توجہ کرکے جو بھی مزید علم ہو (گا) لکھ بھیجوں گا [4] ۔"

لیکن جناب زور اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے ۔ اصغر نے ان کو یاددہانی اور تقاضے کے خطوط لکھے ۔ آخر میں مایوس ہو کر لکھا :

" حضرت مظہر جانجاناں کے متعلق آپ نے اب تک مدد نہیں کی ۔ جو کچھ مل سکتا ہو دیجئے اور جو نہ مل سکتا ہو اس کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے مجھے لکھئے تاکہ کچھ نہ ہو سکے تو کتاب میں آپ کی یہی تحریر لکھا دوں [5] ۔"

۱ـ مکتوب جناب اصغر بنام ڈاکٹر زور مرقومہ ۵ جنوری ۱۹۳۲ء ـ بحوالہ نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم ـ ص ۲۰۳ ـ

۲ـ ادارہ ہندوستانی اپریل ۱۹۳۲ء ـ ص ۲۹۸-۲۹۳

۲ـ(الف) چند شخصیتیں چند تاثرات ـ ص ۳۱

۳ـ ایضاً ـ ص ۳۲

۴ـ ایضاً ـ

۵ـ مکتوب اصغر بنام جناب زور (تاریخ کا تعین نہ ہو سکا) ـ بحوالہ نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم ـ ص ۲۰۶ ـ لیکن بعض اندرونی شہادت سے یہ خط نومبر ۱۹۳۱ء کے بعد کا متعین ہوتا ہے ـ (۱) مثلاً اسی خط میں ڈاکٹر حفیظ سید صاحب کے ولایت سے واپس آنے کا ذکر ہے ـ حفیظ سید صاحب نومبر ۱۹۳۱ء تک تو یقیناً ولایت میں تھے ـ ان کا مضمون " دیوان جہاں " کے عنوان سے زمانہ نومبر ۱۹۳۱ء میں چھپا تھا ـ جسکے نیچے واضح طور پر " از مسٹر محمد حفیظ سید ـ ایم اے ایل ٹی (مقیم لندن) درج ہے ـ ص ۲۸۳ ـ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مختصر یہ کہ " ترتیب دیوان مظہر " کی داستان نامکمل ہی رہ جاتی ہے ۔ اصغر نے اس کی ترتیب پر تقریباً " ۲½ ، ۳ سال[1] صرف کئے ۔ بہت کچھ قلم بند بھی کر لیا تھا ۔ لیکن اس کا تذکرہ صرف کتابوں میں رہ گیا ۔ کتاب کا کوئی سراغ نہ مل سکا ۔ جب ۱۹۲۳ء میں جناب زور کی جگر صاحب سے بنگلور میں ملاقات ہوئی تو انھوں نے بطور خاص ان کی توجہ اس کتاب کی طرف دلائی لیکن جو لوگ جناب جگر کی فطری کاہلی[2] اور لاابالیانہ انداز زندگی سے واقف ہیں وہ بخوبی جناب جگر کے ردّعمل کا اندازہ کر سکتے ہیں ۔ اس پوری داستان کو جناب ڈاکٹر زور کی زبانی سنیے :

> " اب سے چار* سال قبل ان کے (اصغر کے) ایک مخصوص دوست اور معتقد جگر مرادآبادی سے بنگلور کی اردو کانفرنس میں ملاقات ہوگئی .... میں نے جگر صاحب کو بطور خاص توجہ دلائی کہ اصغر مرحوم کے مسودات میں حضرت مرزا مظہر کے بارے میں جو کاغذات ہوں ان کو یا تو وہ خود اشاعت کے لئے مرتب اور مکمل کر دیں یا میرے یہاں ارسال فرمائیں تو میں ان کو مرتب کر کے چھپوا دوں گا ۔ جگر صاحب نے وعدہ بھی فرمایا تھا لیکن شاید وہ اس

(حاشیہ از گزشتہ صفحہ)

(۲) " ہندستانی " کے اپریل نمبر کے لئے مضمون کا تقاضا بھی ہے ۔ اس سے گمان گزر سکتا ہے کہ یہ اپریل ۱۹۳۲ء کے شمارے کے بارے میں ہوگا ۔ لیکن سطور بالا میں ڈاکٹر زور کی آمد الہ آباد ۵ ، ۶ مارچ ۱۹۳۲ء آ چکی ہے ۔ لہذا ملاقات کے چند دنوں کے بعد کے خط میں یہ جملہ " ہندوستانی کے لیے آپ نے بہت دنوں سے کچھ نہیں بھیجا ۔ حیدرآباد سے کچھ اچھے مضامین بھجوائیے اور خود بھی اپریل نمبر کے لئے بھیجئے " بے محل سا معلوم ہوتا ہے ۔ اگر اپریل ۱۹۳۲ء ہوتا تو "گزشتہ قریبی ملاقات " کے تاثرات کی گرمی " اس میں ضرور ہوتی ۔ یہ خشکی و برودت نہ ہوتی ، اس لیے قیاس ہے کہ یہ خط جنوری و فروری ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۴ء کا ہوگا ۔

۱۔ اصغر کا پہلا مکتوب دیوان مظہر کی ترتیب کے سلسلے میں ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۰ء کا ہے اور آخری خط کی تاریخ جنوری فروری ۱۹۳۳ء ورنہ ۱۹۳۲ء متعین ہوتی ہے ۔ اسطرح اس پر کم از کم ۲½ سال ورنہ ۳½ سال صرف ہوئے ۔

۲۔ جناب جگر " انجمن الکھلا " کے اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے یعنی صدر الکھلا تھے اور یہ اعزاز انھیں کاہلی کا اعلیٰ سے اعلیٰ ثبوت دینے کے بعد ملا تھا " ۔ تذکرہ جگر ۔ محمود علی خاں جامعی ۔ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۱ء ۔ ص ۸۳

* ۔ یہ مضمون " سب رس " حیدرآباد دکن جولائی ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا ۔ اس طرح ۱۹۲۷ء سے چار سال پہلے کے معنی ہوئے ۱۹۲۳ء ۔

طرف توجہ نہ کر سکے ۔[1]

جناب جگر تو خیر اس کو کیا مرتب و مکمل کرتے کہ ان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں تھی ۔ انھوں نے یہ زحمت بھی گوارا نہ فرمائی کہ جناب زور کی خدمت میں ارسال کر دیتے ــ اس طرح اصغر کی یہ تالیف بھی ، " اردو شاعری کی ذھنی تاریخ " کی طرح جگر صاحب کی غفلت اور کاھلی کی نذر ھوگئی ــ راقم مقالہ نے اس کی تلاش میں مئی جون (۱۲ مئی تا ۱۵ جون) ۱۹۷۰ء میں ھندوستان کا سفر بھی اختیار کیا لیکن افسوس کہ اصغر اور جگر کے متعلقین اس بارے میں کچھ نہ بتا سکے ۔

سبب ترتیب و تالیف دیوان مظہر : متقدمین شعرا میں اصغر کی نظر انتخاب کا مرزا مظہر جانجاناں پر پڑنا گہری معنویت کا حامل ہے ۔ مرزا مظہر صرف شاعر نہیں تھے ان کا شمار اپنے زمانہ کے صوفیا اور اہل باطن میں ہوتا تھا ۔ ان کی تمام زندگی " قرآن و سنت نبوی کی تبلیغ میں گزری[2] " ۔ انھوں نے اپنے دور کے صوفیا میں ایسا بلند مقام حاصل کر لیا تھا کہ امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دھلوی جیسے مجدد و مجتہدالعصر نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں:

" آنچہ قدر ایشاں (مرزا مظہر رحہ) ما مردم می دانیم شما چہ دانید .... عزیزی کہ بر جادۂ شریعت و طریقت و اتباع کتاب و سنت ہم چنیں استوار مستقیم باشد و در ارشاد طالباں ، شانے عظیم و نفسے قوی دارد ، دریں خیر زمان مثل ایشاں در بلاد عظیم دریافتہ نمی شود ....۔[3] "

حقیقت یہ ہے کہ " جن لوگوں نے ھندوستان میں اسلامی سماج کی کشتی کو طوفان سے بچایا اور بڑی زندگی کی قربانی دے کر مذھبی اور اخلاقی اقدار کی حفاظت کی ان میں مرزا مظہر کا نام سر فہرست ہے ۔[4] "

۱ـ چند شخصیتیں چند تاثرات ـ ص ۳۶

۲ـ مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط ـ مترجمہ و مرتبہ جناب خلیق انجم ـ مطبوعہ مکتبہ برہان اردو بازار دھلی ۱۹۶۲ء ـ ص ۳۳

۳ـ " کلمات طیبات " ص ۱۶۶ بحوالہ مرزا " مظہر جانجاناں کے خطوط " ـ ص ۳۶

۴ـ " مرزا صاحب اور تصوف " از جناب خلیق انجم بحوالہ " مظہر جانجاناں کے خطوط " ص ۳۷ ـ

ایسی برگزیدہ ذات و ستودہ صفات ہستی کی تصویر میں آزاد نے " گل افشانی گفتار " کی ترنگ میں ، آبحیات میں جو کچھ لکھا اور مرزا صاحب کی سیرت کو جس طرح داغدار کر کے دکھایا ہے ، اصغر کو اس کا حد درجہ قلق و افسوس تھا اس لیے وہ مرزا مظہر کے صحیح و مستند حالات لکھ کر ان کی حقیقی عظمت سے اردو داں طبقہ کو روشناس کرانا چاہتے تھے ۔ اس کا اظہار اصغر صاحب نے خود ، جناب ڈاکٹر زور سے الہ آباد کی ملاقاتوں میں کیا تھا ۔ ان یادداشتوں کو قلمبند کرتے ہوئے جناب زور رقمطراز ہیں :

" اصغر صاحب حضرت مظہر کو ایک بہت بڑے اہل اللہ مانتے تھے اور سلسلہ رشد و ہدایت میں منسلک ہونے کی بنا پر ان سے خاص قلبی تعلق رکھتے تھے ۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں مرزا مظہر کو جس رنگ میں پیش کیا تھا اس کا ذکر کر کے انھوں نے بڑے قلق کا اظہار کیا ۔ ان کو افسوس تھا کہ آزاد کے بعد سے اب تک اس موضوع کے ساتھ کسی ادیب نے انصاف نہیں کیا ۔ ان کی آرزو تھی کہ صحیح حالات اور مستند واقعات کے اظہار سے مظہر رح کی حقیقی عظمت کو بے نقاب کریں ۔[1] "

لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اصغر کی یہ آرزو بھی نہ ہو سکی اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ۔

۲۔ مضامین و مقالات (تنقیدی) :

اصغر نے حسب ذیل تنقیدی مقالات بطور یادگار چھوڑے ہیں :

(۱) انجمن اردوئے معلی (بسلسلہ استفسارات) ۔ مطبوعہ سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۲۶ء صفحات ۱۰۶ تا ۱۱۲ ۔

(۲) مقدمہ روح رواں[2] ۔ رباعیات رواں ۔ اردو مرکز لاہور ۲۷-۱۹۲۶ء مطبوعہ میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز ۔ انار کلی ۔ صفحات ۱ تا ۳۰ ۔

۱۔ چند شخصیتیں چند تاثرات ۔ ص ۳۲

۲۔ یہ مقالہ زمانہ کانپور نومبر ۱۹۲۸ء میں " رباعیات رواں پر ایک سرسری نظر " کے عنوان سے کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے ۔ صفحات ۲۹۸-۲۸۹

(۳) مقدمہ پیام زندگی[1] - پیام زندگی (جلد اوّل) اردو مرکز لاہور ۲۷-۱۹۲۶ء - مطبوعہ میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز انار کلی - لاہور - صفحات ۲۵-۷۲

(۴) مقدمہ یادگار نسیم - یادگار نسیم مطبوعہ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد - مطبوعہ ۱۹۳۰ء - صفحات ۱ تا ۳۶

(۵) دیباچہ مطلع انوار - " مطلع انوار " مجموعہ کلام منشی مہاراج بہادر برق دہلوی - مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی ۱۹۲۹ء - صفحات ۲۹ تا ۵۶

(۶) نوید زندگی[2] - " سہیل " علی گڑھ (سنہ نامعلوم)

(۷) نظم و نثر پر ایک نظر - رسالہ " ہندستانی " ہندستانی اکیڈمی الہ آباد - جولائی ۱۹۳۱ء - صفحات ۳۲۱ - ۳۵۳

(۸) اردو کی نشوونما[3] - " اضطراب " بنارس مارچ ، اپریل مئی ۱۹۳۱ء - جلد ۱ نمبر ۹ ، ۱۰ ، ۱۱ - صفحات ۷ تا ۱۰

(۹) اردو شاعری کی ذہنی تاریخ (دہلی اور لکھنؤ اسکول) - زمانہ ، کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء صفحات ۱۲۵ - ۱۳۰

مضامین و مقالات (بیانیہ) :

(۱) بابو چنتا منی گھوش (سوانح) - رسالہ زمانہ ، کانپور ستمبر ۱۹۲۸ء - صفحات ۱۶۳ - ۱۶۹

(۲) موہن جوداڑو - پانچ ہزار سال کا قدیم تمدن (قسط اوّل) رسالہ " ہندستانی " - ہندستانی اکیڈمی الہ آباد - اکتوبر ۱۹۳۲ء - صفحات ۵۳۱ - ۵۳۸

(۳) موہنجو داڑو[4] (قسط دوم) - ہندستانی الہ آباد اپریل ۱۹۳۳ء - صفحات ۱۷۷-۲۰۸

(۴) نکولس روِرک[5] - ہندستانی الہ آباد - اپریل ۱۹۳۲ء - صفحات ۱۸۳ - ۲۰۷

۱- مقالہ ہذا سہیل علی گڑھ (سنہ نامعلوم) میں " اردو مرثیہ کی تاریخ " کے عنوان سے شائع ہوا تھا (بحوالہ " آجکل " جون ۱۹۵۷ء - مضمون اصغر کا مطالعہ از جناب عابد رضا بیدار - ص ۳۷) تلاش کے باوجود دستیاب نہ ہو سکا - پیام زندگی (جلد اول) انجمن ترقی اردو لائبریری (شعبۂ تحقیق)کراچی میں الف ۵/۲۹ / ۱۰۲ کے تحت موجود ہے -

۲- بحوالہ مضمون رفیق عابدی " اصغر اور یادگار نسیم " - جام جہاں نما لکھنؤ ساقی کوثر نمبر - جلد ۲ - نمبر ۶-۷ جولائی تا ستمبر ۱۹۳۰ء - راقم مقالہ کے خیال میں یہ وہی مقدمہ " پیام زندگی " ہے ، جسے غلطی سے رفیق عابدی صاحب " نوید زندگی " لکھ گئے ہیں -

۳- یہ مضمون " اردو شاعری کی ذہنی تاریخ " کا ایک گم شدہ باب ہے - رسالہ " اضطراب " خواجہ مسعود علی ذوقی کی ادارت اور جناب جگر مرادآبادی کی نگرانی میں پہلے لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا - مارچ ۱۹۳۱ء کے بعد بنارس سے شائع ہونے لگا -

۴- اس مضمون کو سید رشید احمد انگریزی سے ترجمہ لکھتے ہیں - مکتوب بنام راقم مقالہ موصولہ ۱۱ اگست ۱۹۷۰ء - لیکن یہ ترجمہ نہیں ADAPTATION ہے -

۵- یہ مضمون رام چندر ٹنڈن صاحب نے لکھا تھا - اردو ترجمہ اصغر نے کیا - ہندستانی ،

(۳) مستشرقات :

(۱) صحافت ـ قیصر هند و پیغام فیض آباد[1] (۱۹۱۳ء تا ۱۹۲۶ء) ـ اس کا کوئی پرچہ نظر سے نہیں گزرا ـ

(۲) رسالہ هندستانی (هندستانی اکیڈمی الہ آباد) ـ

۱ـ اداریہ جنوری ۱۹۳۱ء صفحات ۱۵۲-۱۵۹

۲ـ اداریہ اپریل ۱۹۳۱ء صفحات ۳۲۴-۳۲۸

۳ـ اداریہ جولائی ۱۹۳۱ء صفحات ۴۹۷-۵۰۲

۴ـ تبصرہ[2] جولائی ۱۹۳۱ء صفحات

(الف) منتخبات هندی کلام مرتبہ ڈاکٹر جعفر حسین

(ب) اردو شہ پارے (جلد اول) ڈاکٹر محی الدین قادری زور

(ج) روح جذبات مجموعہ کلام جناب اکبر حیدری ۳۹۰ - ۳۹۲

(د) مصباح التعرف لارباب التصوف

۵ـ اداریہ اکتوبر ۱۹۳۱ء صفحات ۶۲۱-۶۲۵

۶ـ اداریہ اپریل ۱۹۳۲ء صفحات ۲۸۹-۲۹۳

۷ـ تبصرہ[3] جنوری ۱۹۳۳ء

(الف) جدید اردو شاعری ـ عبدالقادر سروری ـ صفحات ۱۲۵-۱۲۸

(ب) غالب ـ ڈاکٹر سید عبداللطیف ـ صفحات ۱۲۹-۱۳۰

۸ـ تبصرہ[4] اپریل ۱۹۳۴ء

(الف) خیام ـ مولفہ سید سلیمان ندوی ـ صفحات ۲۲۳-۲۲۸

۹ـ تبصرہ[5] جولائی ۱۹۳۴ء

(الف) مراۃ الشعر ـ قاضی تلمذ حسین ـ صفحات ۳۶۳-۳۶۷

۱۰ـ رگ وید[6] کا زمانہ از ڈاکٹر بینی پرشاد ـ جولائی ۱۹۳۵ء ـ صفحات ۲۶۱-۳۰۸

۱ـ بحوالہ "اصغر صاحب" از سید رشید احمد ـ جامعہ اپریل ۱۹۶۷ء ـ ص ۲۰۳

۲ـ تبصرہ کے آخر میں "ا ؎" لکھا ہے جو اصغر کا پہلا حرف ہے ـ

۳ـ ان تبصروں کے آخر میں "ا ؎" لکھا ہے جو اصغر کا پہلا حرف ہے ـ اسکے علاوہ تبصرہ میں بعض الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہیں جنھیں تنقیدی تحریروں میں اصغر نے جا بجا استعمال کیا ہے مثلاً "مزاج ذهنی" ص ۱۲۸ ـ اس لیے اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ تبصرہ اصغر کا ہے ـ

۴ـ اس تبصرہ کے آخر میں بھی اصغر کا مخفف "ا ؎" ہے ـ

۵ـ تبصرہ کے آخر میں بصراحت "مدیر" لکھا ہے ـ

۶ـ یہ ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب الہ آباد یونیورسٹی کی کتاب "هندستان کی پرانی سبھیتا" (کے دو باب جنھیں ... اردو میں اصغر نے کیا تھا) [illegible]

۱۱- ہندوستان کا قدیم تمدن[1] از ڈاکٹر بینی پرشاد - اکتوبر ۱۹۳۵ء - صفحات ۳۹۹-۴۲۲

۱۲- روئداد - ہندستانی اکیڈمی کی چوتھی ادبی کانفرنس منعقدہ ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۴ جنوری ۱۹۳۶ء - ہندستانی اکتوبر ۱۹۳۶ء - صفحات ۱-۸

(۲) تراجم :

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا آسان کام نہیں ہے - اس میں دونوں زبانوں پر عبور کے ساتھ ساتھ ، دونوں زبانوں کے محاسن پر گہری نظر ہونا ضروری ہے - ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ اصل معلوم ہونے لگے - ہندی تو خیر اردو ہی کی ایک " سنسکرت زدہ " شکل ہے ، اس پر عبور ہونا کوئی اتنا مشکل نہیں - حیرت تو یہ ہے کہ اصغر کو انگریزی زبان پر اتنی قدرت تھی کہ وہ انگریزی سے اردو میں بے تکان ترجمہ کرتے چلے جاتے تھے اور اردو زبان و بیان کی خوبیوں کو اس حد تک ملحوظ رکھتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ترجمہ شدہ عبارت اصلاً اردو میں لکھی گئی ہے - اصغر کی اس خوبی کی تصدیق جناب صغیر احمد جان ان الفاظ میں کرتے ہیں :

" .... اب تو یہ حال ہے کہ " ہندستانی " کی ایڈیٹری کے سلسلے میں اگر کبھی کسی انگریزی کتاب یا مضمون کے ترجمے کا اتفاق ہو تو اس بے تکلفی سے بے تکان ترجمہ کرتے چلے جاتے ہیں کہ اچھے اچھے ڈگری یافتہ منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں -"

(تاریخ زبان و ادب اردو مطبوعہ شیخ محمد اشرف لاہور) ص ۳۰۳

اصغر نے بہت سی کتابیں اور مضامین انگریزی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ کئے ، مضامین ، مضامین و مقالات کے تحت درج کر دیئے گئے ہیں - البتہ کتابوں کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے :

(الف) ترجمہ کتاب انگریزی برائے سر شاہ محمد سلیمان -[2] کتاب کا نام نہیں معلوم ہو سکا -

(ب) ہندوستان کا قدیم تمدن - از ڈاکٹر بینی پرشاد ایم اے پی ایچ ڈی ، ڈی ایس سی استاد شعبۂ سیاسیات الہ آباد یونیورسٹی -

---

۱- یہ ڈاکٹر بینی پرشاد صاحب الہ آباد یونیورسٹی کی کتاب " ہندستان کی پرانی سبھیتا " کا ایک باب ہے جس کا ترجمہ اردو میں اصغر نے کیا تھا -

۲- نقوش شخصیات نمبر جلد دوم " اصغر گونڈوی " از صغیر احمد صدیقی - ص ۱۲۸۵ - صدیقی صاحب کی عبارت یہ ہے " بعد میں احباب نے اصرار کرکے سر تیج بہادر سپرو صدر انتخابیہ کمیٹی کے پاس سر شاہ محمد سلیمان مرحوم کا وہ خط بھیجا جس میں انھوں نے انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ کرنے پر اصغر مرحوم کو یوں داد دی تھی " اگر میں بھی ترجمہ کرتا تو اس سے بہتر نہ ...

یہ کتابچہ جناب ڈاکٹر بینی پرشاد کی کتاب " ہندوستان کی پرانی سبھیتا[*] " مطبوعہ " ہندستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۳۱ء " کے ابتدائی دو ابواب پر مشتمل ہے - جن کا ترجمہ بہ عنوان " آغاز "[۱] (ص ۱-۲۲) اور " رگ وید کا زمانہ " (ص ۲۵-۷۲)[۲] اصغر صاحب نے کیا تھا - بعد میں ہندستانی اکیڈمی نے ۱۹۵۰ء میں انھیں دونوں ابواب کو یکجا کرکے کتابچہ کی شکل میں شکل کر دیا -

اس کا ایک نسخہ دیال سنگھ لائبریری لاہور میں نمبر ب ۹۹ ۹۳۴ کے تحت موجود ہے -

(۵) مکتوبات :

اصغر نے اپنی زندگی میں سیکڑوں خطوط لکھے ہوں گے جو مختلف نوعیت کے ہوں گے - اپنے تحقیقی مطالعے کے دوران میں مجھے ان کے جتنے خطوط دستیاب ہو سکے ہیں ان کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے :

نمبرشمار	مکتوب الیہ	ماخوذ	مقام و تاریخ	تعداد	صفحات	میزان
۱-	حکیم یوسف حسین - مدیر نیرنگ خیال لاہور	نیرنگ خیال جون ۱۹۲۷ء	گونڈہ - ۱۲ مارچ ۱۹۲۷	۱	۶۸-۷۰	۱
۲-	مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق	نقل از مسودہ خطوط مشاہیر حصہ دوم[۳]	(۱) الہ آباد	۱	×	
		ایضاً[۴]	(۲) الہ آباد (جون ۱۹۳۰ء اور جون ۱۹۳۱ء) کے درمیان کی کوئی تاریخ -	۱	×	

---

*- " ہندستان کی پرانی سبھیتا پر زمانہ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں " تنقید کتب " کے تحت جناب اقبال ورما سحر ہنگامی نے تبصرہ کیا ہے - ص ۲۲۶-

۱- یہ باب " ہندستان کا قدیم تمدن " کے عنوان سے ہندستانی الہ آباد اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا - صفحات ۳۹۹-۴۲۲

۲- " رگ وید کا زمانہ " کے عنوان سے ہندستانی الہ آباد جولائی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا- صفحات ۲۶۱-۳۰۸

۳،۴- ان خطوط کی نقل مولانا عبدالماجد دریابادی نے خود کرا کے بھیجی -

		اصل خط[1]	(۳) اردو مرکز لاہور ۱۱ اگست ۱۹۲۶ء	۱		
		ایضاً	(۴) ھندستانی اکیڈمی الہ آباد (وسط جون ۱۹۳۰ء اور وسط جون ۱۹۳۱ء) کے درمیان کی کوئی تاریخ ـ	۱		
		ایضاً	(۵) ھندستانی اکیڈمی الہ آباد ۲۱ نومبر ۱۹۳۰ء	۱		کل ۵ خط
۳ـ	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	نقوش لاہور	ھندستانی اکیڈمی الہ آباد (۱) مئی جون ۱۹۳۰ء ۲	۱	۲۰۵	
			(۲) ایضاً ـ ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۰ء	۱	۲۰۱	
			(۳) ایضاً ـ ۲۰ جنوری ۱۹۳۱ء	۱	۲۰۲	
			(۴) ایضاً ـ یکم ستمبر ۱۹۳۱ء	۱	۲۰۳	
			(۵) ایضاً ـ ۵ جنوری ۱۹۳۲ء	۱	۲۰۳	
			(۶) ایضاً ـ جنوری فروری[3] ۱۹۳۳-۳۴ء	۱	۲۰۵	
			(۷) ایضاً ـ ۱۵ ستمبر[4]	۱	۲۰۳	کل ۷ خط

۱ـ اصل خطوط مقالہ نگار کے پاس محفوظ ھیں ـ مولانا عبدالماجد دریابادی نے از راہ تلطف ارسال فرمایا ـ ان میں خط نمبر۳ اور خط نمبر۵ ، نقوش خطوط نمبر لاہور جلد اول میں ص ۲۸۳ اور ص ۲۸۴-۲۸۵ پر شائع ہوئے ھیں ـ

۲ـ اس خط پر تاریخ مرقوم نہیں ھے ـ جناب زور نے اس کو اصغر کا پہلا خط، اوائل ۱۹۳۰ء کا لکھا ھے (چند شخصیتیں چند تاثرات ـ ص ۲۳) ـ اس خط کے بعد اصغر نے اپنا مجموعۂ کلام " نشاط روح " اور " یادگار تبسم " کا پروف ڈاکٹر زور کو بھیجا تھا ـ " نشاط روح " پر ڈاکٹر زور کی ستائشی تحریر کا ذکر اصغر کے ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۰ء کے خط میں آیا ھے ـ لہذا یہ خط یقیناً ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۰ء سے پہلے کا ھوا ـ (۲) "یادگار تبسم " جولائی اگست ۱۹۳۰ء میں شائع ھو رھی تھی ـ ص مقالہ ھذا ـ لہذا یہ خط اس سے پہلے یعنی مئی جون ۱۹۳۰ء کا ھوا ـ

۳ـ اس خط کی تاریخ کے تعین کے لکھ لئے دیکھئے ـ ص مقالہ ھذا

۴ـ اس خط کی تاریخ کی تعین کے لئے دیکھئے ص مقالہ ھذا

۴- مولانا محمد میں کیفی چریاکوٹی	نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم	۲ اپریل ۱۹۳۳ء	۱	۵۹۹	۱خط
۵- مولوی شہاد احمد بدایونی	نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم	ہندستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۳ جون ۱۹۳۰ء	۱	۶۰۳	۱خط
۶- سید رشید احمد ابوسرائے فیض آباد	[1] جامعہ دہلی مئی ۱۹۶۷ء	(۱) گونڈہ ۲ جولائی ۱۹۲۳ء	۱	۲۳۳	
		(۲) گونڈہ ۱۲ جولائی ۱۹۲۳ء	۱	۲۳۵-۲۳۳	
		(۳) الہ آباد ۱۱ جولائی ۱۹۲۹ء	۱	۲۳۶-۲۳۵	
		(۴) ہندستانی اکیڈمی الہ آباد ۲۱ اپریل ۱۹۳۱ء	۱	۲۳۷-۲۳۶	
		(۵) ایضاً- مئی ۱۹۳۳ء	۱	۲۳۷	
		(۶) ایضاً- ۱۱مئی ۱۹۳۶ء	۱	۲۳۸	
		(۷) ایضاً- ۳نومبر ۱۹۳۶ء	۱	۲۳۷	کل ۷ خط
۷- جگر مرادآبادی	نقل از مسودہ / جناب سید شمس الحسن	ناظم آباد کراچی / تاریخ نامعلوم ۲	۱	×	
۸- نواب سید شمس الحسن	ایضاً	(۱) ناظم آباد کراچی ۶ مارچ ۱۹۳۲ء	۱		
		(۲) تاریخ نامعلوم ۳	۱		۲ خط

۱- ان تمام خطوط کی نقل مقالہ نگار کے پاس محفوظ ہے - مقالہ نگار نے ان کی نقول اپنے سفر ہندوستان کے زمانہ میں جناب سید رشید احمد صاحب سے حاصل کی تھیں - جامعہ میں ان کے اقتباسات شائع ہوئے ہیں -

۲- اس خط پر کوئی تاریخ نہیں ہے لیکن بعض اندرونی شہادتوں کی بنیاد پر یہ خط مئی جون ۱۹۳۱ء کا معلوم ہوتا ہے - تفصیلی بحث دیکھئے ص مقالہ ہذا - اصل خط جناب نواب سید شمس الحسن صاحب کے پاس محفوظ ہے -

۳- یہ خط " سرود زندگی " کی اشاعت کے بعد کا ہے - سرود زندگی اوائل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی - اصل خط نواب صاحب کے پاس محفوظ ہے -

۹- جناب جلیل احمد قدوائی	نقل از مسودات جناب جلیل قدوائی کراچی	(۱) ہندستانی اکیڈمی الہ آباد یکم اپریل ۱۹۳۲ء	۱
		(۲) ایضاً - ۱۲ جولائی ۱۹۳۲ء	۱
		(۳) ایضاً- ۳ اگست ۱۹۳۲ء	۱
		(۴) ایضاً- ۱۳ ستمبر ۱۹۳۲ء	۱
		(۵) تاریخ نامعلوم ۱	۱
		(۶) ایضاً- ۱۵ فروری ۱۹۳۵ء	۱ کل ۶ خط
۱۰- مولانا سراج الحق مچھلی شہری	"دو شقے" اصغر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مولانا کے پاس محفوظ ہیں - مولانا نے ان کی نقل اپنے دست خاص سے کرکے ، الہ آباد سے بھیجی ہے -		۲

یہ کل ۳۳ خط ہیں -

---

* - ان تمام خطوط کی اصل جلیل قدوائی صاحب کے پاس محفوظ ہے - ان میں سے پہلا ، دوسرا اور چوتھا خط اصغر کا مکتوبہ ہے لیکن چونکہ کاروباری نوعیت کے خط ہیں اس لئے دستخط تارا چند جنرل سیکرٹری ہندستانی اکیڈمی کے ہیں -

۱- قرائن سے ۱۹۳۲ء کا معلوم ہوتا ہے -

باب سوم

شخصیت ــــ عہد بہ عہد

صفحہ

۱- عقائد و افکار :

(الف) اسلام ۲۳۹

(ب) اسلامی تصوف ۲۵۵

۱) نظریۂ حسن و عشق ۲۵۹

۲) نظریۂ وحدت الوجود ۲۶۷

۲- دور رندی و سرشاری ۲۷۳

۳- توبہ ۲۷۶

۴- بیعت ۲۸۲

۵- حلیہ و وضع و قطع ۲۹۷

۶- اصغر و جگر ۳۰۳

کسی شاعر کی شخصیت و شاعری کو سمجھنے کے لیے اس کے عقائد و افکار کا سمجھنا بڑا ضروری ہے ۔ شاعر دراصل اپنے عقائد و نظریات ہی کو اپنی شاعری میں ظاہر کرتا ہے ---- بالفاظ دیگر انسان کے عقائد و نظریات ہی وہ بنیاد ہوتے ہیں جس پر کسی فرد کے اقوال و اعمال (کہ شخصیت انہیں دونوں کا مجموعہ ہے) استوار ہو تے ہیں ۔ عقائد و افکار روح کی طرح شاعر و ادیب کے اقوال و اعمال میں رواں دواں ہوتے ہیں ۔ کبھی ظاہر و واضح اور کبھی مخفی و پوشیدہ ---- کسی شاعر یا ادیب کو سمجھنے سمجھانے کی کوئی ہمدردانہ کوشش درست نہیں کہی جا سکتی جب تک اس کے ظاہر و نمایاں اور مخفی و پوشیدہ نظریوں کا کھوج نہ لگایا جائے ۔

عقائد و افکار :

اس نقطۂ نظر سے جب اصغر کے عقائد و نظریات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ علاقہ* اودھ (گونڈہ) کے ایک حنفی المذہب سنی گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ روایتی طور پر وہ ایک ایسے مسلمان تھے جس کے چاروں طرف شیعی عقائد و رسومات کا جال پھیلا ہوا تھا ۔ ممکن ہے بچپن میں انھوں نے بعض عقائد و نظریات قبول بھی کئے ہوں ، لیکن واقعہ بیعت کے بعد ان میں روایتی مسلمانوں کے شعائر سے اجتناب و احتراز پیدا ہوا ---- اودھ کے متوسط گھرانوں میں پھیلے ہوئے شیعی رسوم و عقائد کو نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کیا بلکہ ان کو غلط قرار دے کر ترک کر دیا ۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں :

> " شیعہ سنیوں میں چوں کہ بہت سے عقائد مشترک ہیں اس لیے اس قسم کی اکثر باتیں ان میں بھی بآسانی سرایت کر گئیں ـــ مثلاً* مشکل کشا کا کونڈا ، تعزیہ ، مرثیہ ، مجلس ، ماتم ، بچوں کو محرم میں بھک اور فقیر بنانا وغیرہ وغیرہ وہ رسمیں ہیں جن میں سے اکثر از روئے عقائد اہل سنت جائز نہیں سمجھی جاتیں ......[1]"

۱ـ بحوالہ یادگار نسیم مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۰ء ـ ص ۲

انتاهی ذهین ادهوں نے " رد رفض " میں " تحفۂ اثنائے عشریہ " مولفہ و مصنفہ شاہ عبدالعزیز رحمہ دهلوی کا مطالعہ کیا اس سے حصول فیض کے تشکر و امتنان میں ، اپنے کتابچوں کے نام " تحفہ " پر رکھے[1] - وہ عقائد میں اس درجہ راسخ[2] و پختہ تھے کہ قریبی احباب سے شیعہ سنی نزاعی مسائل پر شرح صدر کے ساتھ بحث کرتے تھے اور چوں کہ عقائد میں پختگی اور جذبہ میں خلوص ہوتا تھا اس لیے سننے والوں پر خاطر خواہ اثر ہوتا ۔ اسی قسم کا ایک واقعہ جگر نے اپنی ابتدائی ملاقاتوں کا ناطق جے پوری سے یوں بیان کیا :

" ایک روز میں حضرت اصغر گونڈوی کے پاس ، ان سے ملنے کے لئے گیا جو ایک صاحب سے بحث کر رہے تھے - میں دلچسپی نے دور ہی سے مجھے اس بحث کو سننے کے لیے روک لیا .... عجیب بات یہ تھی کہ حضرت اصغر سمجھا رہے تھے اسے اور میں دل میں کانوں کے ذریعے ہر ایک بات اترتی جا رہی تھی ۔ ایسا بھی وقت آیا کہ جو شبہات میرے دل میں تھے میں نے سوچے ، اور تھوڑی دیر کے بعد ہی وہاں سے جواب ملا - وہ وقت مجھے یاد ہے جب تھوڑی دیر میں میں راسخ العقیدہ حنفی ہو گیا ....[3] "

یہ لے آخر میں اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ ان کے یہاں اہل تشیع سے کبیدگی خاطر ، بیزاری بلکہ تعصب کا اظہار ہوتا ہے[4] - ممکن ہے یہ اہل تشیع سے اصغر کا یہ رویہ اس ہنگامہ کا ردعمل ہو جو ان حضرات نے ان کے خلاف الہ آباد میں کھڑا کر دیا تھا - تاہم یہ رویہ ان کی فطری رواداری کے خلاف نظر آتا ہے اور بادی النظر میں اسے ان کی کمزوری سے تعبیر کیا جائے گا -

شیعی عقائد سے اجتناب بلکہ بیزاری ان کے یہاں اسلام کے گہرے مطالعہ اور تصوف پر ایمان و عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئی - عالم صوفیا کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا گزرا ہے[5]

۱- بحوالہ مکتوب مولانا سراج الحق مچھلی شہری بنام مقالہ نگار مرقومہ ۱۷ فروری ۱۹۷۱ء

۲- گفتگو جناب بشیر صدیقی ۲۰ مئی ۱۹۶۹ء

۳- " قومی آواز " ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۳ بحوالہ جگر مرادآبادی حیات اور شاعری از ڈاکٹر محمد اسلام - ۱۹۶۶ء - ص ۵۹

۴- مکتوب اصغر بنام نواب سید شمس الحسن مرقومہ ۶ مارچ ۱۹۳۶ء -- اصغر کی متعلقہ عبارت یہ ہے " .... لکھنؤ سے کچھ ضروری باتیں ہیں - میں نے متین صاحب کو لکھا ہے - آپ ان سے ذرا مل لیں - ایک باورچی کی ضرورت ہوگی اس کے لیے شرط یہ ہے کہ شیعہ نہ ہو "

۵- دیکھیے " تاریخ مشائخ چشت " - خلیق احمد نظامی - آشوکا پریس دہلی طبع اول ۱۹۵۳ء - ص ۳۶۵-۳۶۳

جس نے اس مسئلہ کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس پر رسائل و کتب لکھی ہیں ۔ اصغر کا تصوف کا مطالعہ بڑا وسیع تھا ۔ جیسا کہ ذوقی صاحب کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" تصوف اسلام سے متعلق اصغر صاحب کی معلومات بہت زیادہ وسیع ہیں بلکہ ایک حد تک یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ان کا موضوع خصوصی ہے ۔ تصوف پر انہوں نے لاتعداد کتابیں مطالعہ کی ہیں کچھ تو کثرت مطالعہ کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ انہوں نے فطرۃً بہت وجدانی طبیعت پائی ہے خود ان کی شخصیت میں بھی ہمیں بعض اوقات ایک اہل ذوق کی جھلک نظر آنے لگتی ہے ۔ ایک مرتبہ مولانا عبدالماجد صاحب بی اے جو خود بھی تصوف کے متعلق ایک مستقل تصنیف کے مالک ہیں علی گڑھ آئے ہوئے تھے ۔ اتفاق سے اس زمانے میں اصغر صاحب یہیں مقیم تھے ۔ ایک روز اصغرصاحب شام کے وقت عبدالماجد صاحب سے ملنے کے لئے جامعہ گئے (جامعہ اس زمانے میں علی گڑھ میں تھا [1]) ۔ وہاں مدرسے کے قابل استاذہ اور ہونہار طلبہ کا اچھا خاصا مجمع تھا اور اس پرلطف صحبت میں مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات ہو رہا تھا ۔ اتنے میں کسی طالب علم نے ماجد صاحب سے تصوف اسلام کے متعلق کوئی سوال کیا ماجد صاحب نے خود جواب دینے کے بجائے اصغر صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس موضوع پر ان سے زیادہ بہتر میں خود بھی نہیں بتا سکوں گا ۔ ان سے پوچھو [2] ۔"

ہو سکتا ہے کہ اصغر میں تشیع کے خلاف یہ " رویہ " وہیں سے آیا ہو ۔

---

۱ ۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء جمعہ کے دن باضابطہ طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان ہوا ۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمودالحسن صاحب کے ہاتھوں رسم تاسیس ادا ہوئی ۔ ان کا مشہور خطبہ تاسیس مولانا شبیر احمد عثمانی رح نے پڑھ کر سنایا ---- ۵ سال جامعہ علی گڑھ میں رہا ۔ جون ۱۹۲۵ء میں دہلی منتقل ہوا (بحوالۂ جامعہ کی کہانی از عبدالغفار مدھولی طبع اول ۱۹۶۵ء ۔ ص ۲۷-۲۶) ------ اس طرح یہ واقعہ جون ۱۹۲۵ء سے پہلے کا ہے ۔

۲ ۔ " بعض مشاہیر ادبیان کی حیثیت سے " از خواجہ مسعود علی ذوقی ۔ مرقع ۔ لکھنؤ جون ۱۹۲۸ء ۔ ص ۳۰

بیعت کے بعد ان کا رجحان " دیوبندی عقائد "[1] کی طرف بڑھ گیا تھا ۔ دیوبند تحریک کو ، بعض لوگوں نے " وھابی تحریک " کہہ کر ، اس کی خوبی اور اھمیت کو گھٹانے کی کوشش کی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کے مؤسسوں اور بانیوں نے تحریک ولی اللّٰہی سے اپنا چراغ روشن کیا اور " تمسک بالکتاب والسنۃ " کو اپنا شعار بنایا ۔ انھوں نے تدبر فی القرآن اور تحقیق سنت رسول کے بعد اپنے لیے ایک لائحۂ عمل متعین و مرتب کیا ۔ اگرچہ اھل دیوبند حنفی المذھب ھیں لیکن مقلد نہیں ھیں ۔ جرح و تعدیل کے بعد کوئی بات قبول کرتے ھیں بالفاظ دیگر مذھب میں اجتہاد کے قائل ھیں لیکن " حدیث ثابتہ " کو مقدم سمجھتے ھیں ۔ اصغر کا سلسلۂ رشد و ھدایت بھی اسی سرچشمہ سے نکلا تھا اس لیے یہ عقائد و نظریات اصغر کو ان کے اپنے سلسلے سے پہونچے ...... عقائد و اعمال کے اعتبار سے وہ متشرع اور صوم و صلوٰۃ کے پابند بزرگ تھے ۔ نماز بڑے اہتمام اور مراسم عبادت بڑے خشوع و خضوع سے ادا کرتے[2] ۔

اصغر نے اپنے عقائد ونظریات مذھب (اسلام) اور تصوف سے اخذ کیے تھے ۔ انھوں نے اسلام کے نظام فکر و عمل پر فلسفیانہ اور عارفانہ نظر ڈال کر ، اس کا خلاصہ اور لب لباب یوں پیش کیا ھے :

" روح انسانی ایک جوھر لطیف ھے ۔ خدا کے ساتھ اتحاد و محبت اس کا خاصۂ ازلی ھے ۔ اس جسد عنصری میں پہونچ کر اپنی دیرینہ عظمت کی تلاش ایک تقاضائے فطری ھے .... مذھب حقیقی معنوں میں اسی طلب و جستجو کا نام ھے[3] ۔"

گویا " روح انسانی " کی خالق کائنات ـــــ یعنی محبوب حقیقی کی تلاش و جستجو کا نام مذھب ھے ۔ اکبر کی زبان میں اس کو یوں کہہ سکتے ھیں :

" مذھب کی اصل اللّٰہ سے لگاوٹ ھے[*] "

دوسری جگہ مذھب اور مذھبیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے یوں رقمطراز ھیں :

" (مذھب کی غایت تہذیب و تکمیل انسانیت ھے) ....

۱۔ گفتگو جناب بشیر احمد صدیقی ۲۰ مئی ۱۹۶۹ء

۲۔ گفتگو لطیف احمد عباسی از مقالہ نگار ۲۷ مئی ۱۹۷۰ء

۳۔ مقدمہ رباعیات رواں ، مطبوعہ اردو مرکز لاھور ۔ ص ۲۲

*۔ اصل اللّٰہ سے لگاوٹ ھے ورنہ مذھب میں سب بناوٹ ھے

اکبر الہ آبادی

جوش و خروش و تپش و گداز (عشق کی شور انگیزی و جذبۂ عبودیت) .... انسانیت کی جان اور اس کا اصلی غازۂ جمال ہیں .... مشرق نے اس کی حصول یابی کے لیے اعلیٰ اور مقدس ہستیوں کو آئیڈیل قرار دیا اور " روح انسانی" کو اسی آئیڈیل کی جانب گرم عناں کر کے .... جوش تپش سے لبریز کر دیا ۔ اس " جوش تپش " کا نام اس کی زبان میں " مذہبیت " ہے ۔[1]"

چنانچہ کہتے ہیں ؎

جلوۂ حسن پرستش ، گرمی حسن گداز ورنہ کچھ کعبہ میں رکھا ہے، نہ بتخانے میں ہے
اصغر

اصغر کے محولہ بالا دونوں اقتباسات کے تنقیدی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تفسیر و تشریح ہیں ۔

پہلا اقتباس " تعلق باللہ " کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ دوسرے سے " نفس انسانی میں عبودیت و محبت کی تخلیق و تولید کے لیے اسوۂ رسول و سنت صحابہ ، صلحاو اتقائے امت ائمہ دین و مرشدان کامل کے اقتدا و پیروی کی ضرورت واضح ہوتی ہے کہ اسی طریق سے تہذیب و تکمیل انسانیت ممکن ہے ۔

اصغر کے نزدیک مذہب کی غایت " نفس انسانی " میں احساس فرائض اور جذبۂ عبودیت و للہیت پیدا کر کے ، اس کو خبائث و رذائل سے پاک و مطہر بنانا ہے جو تہذیب و تکمیل انسانیت کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں ۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس کی شہادت میں اصغر کے کلام سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں ۔ یہ تمام باتیں مربوط انداز میں ان کی نظم " خطاب بہ مسلم " میں ملیں گی ، جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں ۔ البتہ فطری انقیاد و طاعت ، عبودیت ، للہیت سے متعلق اشعار ان کے کلام میں جا بجا بکھرے ہیں جن میں سے کچھ انہیں عنوانات کے تحت ذیل میں دیئے جاتے ہیں :

اقتباس منظم ۔ " خطاب بہ مسلم "

کہاں اے مسلم سرگشتہ تو محو تماشا ہے جب اس آئینہ ہستی میں تیرا ہی سراپا ہے
جہاں آب و گل میں ہے شرار زندگی تجھ سے تری ذات گرامی[2] ارتقا کا اک ہیولا ہے

۱۔ دیباچہ مطلع انوار پہلا ایڈیشن ۱۹۲۹ء ۔ محبوب المطابع برقی پریس دہلی ۔ ص ۵۵
۲۔ کنتم خیر امۃ .... العمران : ۱۱۱

تجھی سے اس جہان میں ہے بنا آئین و حکمت کی

کہ سب ہی کی بدولت اصطلاح جام و مینا ہے

ضوابط دین[1] کامل کے دیئے ہیں ہاتھ میں تیرے

تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام لینا ہے

جو ہو للہیت تو دین بن جاتی ہے یہ دنیا

اگر اغراض ہوں تو دین بھی بدتر ز دنیا ہے

فرائض کا رہے احساس عالم کے مذاہب میں

یہی عارف کا مقصد ہے یہی شارع کا ایما ہے

اسقیاد و طاعت روح انسانی کا خاصۂ ازلی ہے :
--------------------- کائنات کا ذرہ ذرہ نوامیس الٰہی اور قوانین فطرت سے ایسا بندھا اور جکڑا ہوا ہے کہ مجال سرتابی نہیں رکھتا -------- و لہ اسلم من فی السموات والارض طوعاً و کرھاً[2] ---- جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے ، خوشی سے اور لاچاری سے ، اسی کے حکم میں ہے ۔ اسغر اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

مرا وجود ہی خود انقیاد و طاعت ہے ۔ کہ ریشے ریشے میں ساری ہے اک جنون سجود

مرنا بھی آ گیا مجھے جینا بھی آ گیا ۔ پہچاننے لگا ہوں تمہاری نظر کو میں

عبودیت و للہیت :
------------ اقرار خالق اور انکار ذات (نفس) ۔ یعنی حق کے قیام میں ان لوگوں سے اور خود اپنے نفس سے قتال ، جو راہ مستقیم پر چلنے والوں کے لیے فتنہ و فساد کا موجب بنے ہوئے ہیں تاکہ انسانی زندگی خالصۃً اللہ کے لیے ہو جائے -- وَ قٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ[3] ---- بالفاظ دیگر خدا کے علاوہ تمام خودساختہ خداؤں اور سب سے بڑے سرکش و مدعی خدائی خود اپنے نفس (--- اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَهٗ ھَوٰہُ[4]) کے خلاف جہاد اور اس کا انکار ، اور اپنی مرضی کا ترک عبودیت ، اور ہر کام اللہ کی رضاجوئی کے لیے کرنا للہیت ہے ----- وَ مِنَ النَّاسِ

۱- اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ .... الخ -- المائدہ : ۳

۲- آل عمران : ۸۳

۳- سورۂ بقرہ : ۱۹۲ --- اور ان سے اس حد تک لڑو کہ فتنہ و فساد نہ رہے اور دین خالص اللہ کا ہو جائے ۔

مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ـــ اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے جو اپنی جان اللہ کی رضاجوئی میں بیچتا ہے ۔

اصغر نے ان خیالات کو اپنی زبان میں یوں ادا کیا ہے ؎

یہ اقرار خودی ہے دعویٰ ایمان و دیں کیسا — ترا اقرار جب ہے خود سے بھی انکار ہو جائے

اصغر حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہے — رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لئے ہوئے

پھر عبودیت کے ثمرات سے آگاہ کرتے ہوئے انسان کو اس کی دعوت دیتے ہیں ؎

ترک مدعا کر دے عین مدعا ہو جا — شان عبد پیدا کر ، مظہر خدا ہو جا

اس کی راہ میں مٹ کر بے نیاز خلقت بن — حسن پر فدا ہو کر حسن کی ادا ہو جا

تو ہے جب پیام اس کا پھر پیام کیا تیرا — تو ہی جب صدا اس کی آپ بے صدا ہو جا

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو — پیکر عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

مختصر یہ کہ مذہب نے کائنات میں انسان کی حیثیت کو متعین کرنے کے لئے یہ بنیادی عقائد دیئے :

(۱) اللہ خالق کائنات ہے ..... اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (پ ۱۳ ع ۸)

(۲) انسان زمین پر اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے ..... اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً

(۳) کائنات انسان کے لئے بنائی اور مسخر کی گئی ہے ..... وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ـــ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۔

(۴) انسانی زندگی ازلی و ابدی ہے ..... خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۔

اصغر کا خیال ہے کہ مذہب کے انہیں حقائق علمی کو عقلاً سمجھنا اور وجداناً تجربہ کر کے ان پر ایمان و ایقان پیدا کرنا تصوف کا مقصود و منتہا ہے اور جب انسان میں تصدیق و یقین کی شان پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے جذبات کی شدت و لطافت بڑھ جاتی ہے ـــ اور جذبات کی شدت و لطافت ہی "انسانیت کی جان اور اس کا اصل غازۂ جمال ہے"[1]

(حاشیہ از گذشتہ صفحہ)

۲۔ الفرقان ۴۳:۲۵ ۔ تو نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی رح)

۱۔ دیباچہ مطلع انوار طبع اول از اصغر ۔ محبوب المطابع برقی پریس دہلی ۱۹۲۹ء ص ۵۲

اس کی تفصیل اسعٰر کی زبانی سنیے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" ہم فقر و تصوف کے مسلک اور اس کے حقیقی مقصود پر جب نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہی معمولی معتقدات جو تمام مذاہب میں .... مشترک ہیں ، ان پر خود اپنے نفس میں تصدیق و یقین کی شان پیدا کریں ۔ ارباب تصوف کے نزدیک عام طور سے جو مذہب رائج ہے وہ صرف اس لیے ظاہری ، سطحی اور بے اثر ہے کہ اس کی حیثیت رسمی یا زیادہ سے زیادہ علمی ہے ۔ " یقینی اور علمی " یا " ظاہری اور وجدانی " کے باہمی فرق کا اندازہ اس مثال سے بخوبی ہو سکتا ہے ۔ فرض کرو تم شیر کے وجود کو تسلیم کرتے ہو ، تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مہیب بھی ہے اور ...... انسان کو مار بھی ڈالتا ہے ۔ اب .... یکایک ایک شیر تمہارے سامنے نمودار ہو جاتا ہے .... صرف یقین کی زیادتی کے باعث خوف کے جذبے میں اس درجہ ترقی ہوتی گئی ہے کہ تمہارا وہ ابتدائی " علمی شیر " موجودہ شیر سے جو تمہارے یقین و مشاہدہ کا نتیجہ ہے بالکل مختلف معلوم ہوتا ہے " " تمام مذاہب کے نزدیک خدا موجود ہے ۔ وہ حاضر و ناظر ہے ۔ وہ تمام اشیا کا خالق ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس " حقیقت علمی " پر جب " تصدیق و یقین " کی روشنی پڑتی ہوگی تو اس وقت انسان کی کیا حالت ہوتی ہوگی؟ "[1]

لوگوں نے مسلک فقر و تصوف پر شدید نکتہ چینی کی اور بڑے اعتراضات کئے ہیں لیکن ان کی نظروں سے یہ حقیقت اوجھل ہو گئی ہے کہ تصوف تہذیب نفس ، اور تکمیل انسانیت کا ایک نفسیاتی طریق کار ، اور لائحہ عمل ہے ۔ اس طریق میں مرشد اپنی اخلاقی عظمت اور روحانی بلندی سے اپنے مریدوں کے سامنے ، ایک جیتا جاگتا نمونہ پیش کرتا ہے ۔ اور اپنے سامنے رسول کی زندگی اور سنت کو رکھتا ہے ---- اس طرح اپنے مریدوں میں اپنا اعتماد پیدا کرتا ہے ۔ اپنی ہمت اور توجہ سے ان کے کمزور ارادوں میں مضبوطی ، اور اوراد و وظائف سے جفاکشی

۱۔ " اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول " از اسعٰر ۔ رسالہ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ۔ ص ۱۳۶-۱۳۵

کی عادت ، خانقاہ اور عبادت خانہ کی روحانی فضا سے مسترشدین کے لیے ایک سازگار ماحول تیار کرتا ہے --- مرید پاکیزہ فضا اور ماحول میں پہونچ کر اپنے پرمعصیت ماحول سے کٹ کر ، اپنے اندر نیکی و تقویٰ کی روح پیدا کرتے ہیں ۔ اس میں نیک اعمال کی مشق و ممارست اور مواظبت و مداومت سے شروع شروع میں ، عادت سی پڑ جاتی ہے پھر مرشد اور دوسرے ہمراہیوں کی روحانی باتوں کی تکرار و اعادے سے ، لذت حاصل ہونے لگتی ہے --- --- اب وہی انسان جو چاروں طرف سے تمام انسانوں کے درمیان گھرا ہوا ، گناہ و معصیت کی طرف لپکتا تھا ---- اس فضا میں پڑ کر گناہوں سے مجتنب ہو جاتا ہے ----- یا کم از کم ، نیکیوں کا خیال گناہوں کے صدور کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے کہ کسی فعل کے صدور میں ذہنی روکاوٹ بہت بڑے روک کا کام کرتی ہے ۔ مرشد جب مرید کو کھلی دنیا میں بھیجتا ہے ، تو اس کو برابر تاکید کرتا رہتا ہے کہ اس سے رابطہ قائم رکھے یا اگر کسی اور شہر ، دیہات یا گاؤں ، میں ہو تو دوسرے مریدوں سے اس کا رابطہ قائم کرا دیتا ہے -- اس طرح نیکی و شرافت کے گھیرے میں لے کر ، مرید کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، سے رغبت پیدا کرتا ہے اور تقوی و طہارت کی زندگی پرآمادہ مجبور کرتا ہے کہ یہی تصوف کی غایت و منتہا ہے ---- تصوف ایک جامع نظام فکر و عمل ہے جس میں درج ذیل نفسیاتی نکتے پنہاں ہیں :

(۱) تصوف --- مرشد کی شکل میں ایک آئیڈیل --- یعنی نبی کا اُسوہ دیتا ہے ۔

(۲) مرشد کی اعلیٰ اخلاقی بلندی ، ہمدردی اور روحانی عظمتکا تجربہ کرنے کے بعد ، مرید میں اس پر کامل اعتماد پیدا ہو جاتا ہے کہ اصلاح نفسکے لئے آئیڈیل پر اعتماد ضروری ہے ۔

(۳) انسان جب اپنی پرمعصیت زندگی پر نظر ڈالتا ہے تو اس میں احساس ندامت اور اپنے طریق زندگی سے بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے ۔ انھیں دونوں احساسات ----- احساس ندامت اور احساس اصلاح باطن -- کے ساتھ وہ کسی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوتا ہے ۔

(۴) مرشد اس کی پذیرائی کرتا ہے اور توبہ و انابت کے ذریعے ، مایوسی کو دور کر کے اس میں زندہ رہنے کا عزم و حوصلہ پیدا کرتا ہے ۔

(۵) مرید کی تحت الشعوری گتھیوں کا کھوج لگاتا ہے ، یا مرید خود مرشد کے حضور میں بلا کم و کاست کھول کر رکھ دیتا ہے ۔

(۶) مرشد اوراد وظائف کے ذریعے یا کسی اور نیک کام میں لگا کر مرید کے دھیان کو اس " الجھن " (COMPLEX) سے ہٹا دیتا ہے ۔

(۷) مرشد مرید کو اس کے پرمعصیت ماحول سے نکال کر ، ایک ایسے پاکیزہ ماحول میں پہونچا دیتا ہے جہاں گناہ کا خیال مردہ و افسردہ ہو جاتا ہے اور صرف نیکی پروان چڑھتی ہے ۔

(۸) گناہ کرتے کرتے انسان کا ارادہ کمزور ہو جاتا ہے، مرشد اپنی نیک مثال، اخلاقی سہارے اور تحریک ذھنی (SUGGESTIONS) کے ذریعہ اس کے ارادے کو قوی بناتا اور اس میں نیک اعمال کے لیے خود اعتمادی پیدا کرتا ہے ۔

(۹) حقیقت یہ ہے کہ نظام تصوف میں، مرشد مرید کے احساس و ادراک کی اصلاح کرتا ہے کہ یہی اعمال کا سرچشمہ ہیں ۔[1]

اصغر نے تصوف کے خیالات و افکار بطور روایت کر قبول نہیں کیے بلکہ تصوف کو اپنا مسلک و معمول بھی بنایا ۔ وہ سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں ایک صاحب حال بزرگ سے بیعت تھے[2] ۔ تصوف نے ان کے افکار و عقائد پر بڑا گہرا اثر ڈالا ۔ اس سے ان کے جذبات میں شدت و لطافت اور سیرت و کردار میں نظافت و پاکیزگی پیدا ہوئی ہے ۔ جذبات کی شدت و لطافت سے بحث ان کی شاعری میں کی گئی ہے ۔ سیرت و کردار کی پاکیزگی، شخصیت کے تحت واضح کی گئی ہے یہاں صرف ان کی متصوفانہ عقائد و افکار کا جائزہ لیا جاتا ہے ۔

۱۔ تصوف سے متعلق یہ خیالات و افکار " تاریخ مشائخ چشت " مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی بار اول ۱۹۵۳ء ۔ اشوکا پریس دھلی (۲) خواجہ بندہ نواز کا تصوف اور سلوک طبع اول ۱۹۶۶ء ۔ ڈاکٹر میر ولی الدین (۳) رموز عشق ۔ ڈاکٹر میر ولی الدین ۔ طبع اول ۱۹۶۶ء (۴) عبدالقدوس گنگوھی اور ان کی تعلیمات ۔ اعجاز الحق قدوسی ۔ (۵) عمدۃ السلوک (۶) الشریعت اور طریقت (۷) تاریخ مشائخ دیوبند .... سے ماخوذ ہیں ۔ ان میں بعض باتیں اپنی طرف سے اضافہ کی گئی ہیں ۔

۲۔ اصغر کا شجرۂ سلسلہ طریقت یہ ہے ۔ اصغر گونڈوی مرید قاضی عبدالغنی رح مرید قاضی محمد اسمعیل رح مرید شیخ محمد تھانوی رح مرید حضرت میانجیو نور محمد رح مرید سید عبدالرحیم فاطمی رح مرید شاہ عبدالباری رح مرید شاہ عبدالہادی رح مرید شاہ عضدالدین رح مرید سید شاہ محمد مکی رح مرید سید شاہ محمدی اله آبادی رح مرید شیخ محب الله اله آبادی رح مرید شیخ ابو سعید گنگوھی رح مرید شاہ نظام الدین بلخی رح مرید شیخ جلال الدین تھانیسری رح مرید شیخ عبدالقدوس گنگوھی رح مرید شیخ محمد ردولوی رح مرید شیخ عارف رح مرید شیخ احمد عبدالحق ردولوی رح مرید جلال الدین پانی پتی رح مرید شیخ شمس الدین ترک رح مرید شیخ علاء الدین صابر کلیری رح .... تا حضرت علی کرم الله وجہ (یہ شجرہ شریعت اور طریقت ص ۵۵۲ اور عبدالقدوس گنگوھی اور انکی تعلیمات، وحدۃ والوجود والشہود سے تیار کیا گیا ہے)

تصوف نظام عمل کے ساتھ ایک نظام فکر بھی دیتا ہے اس کے فکری نظام کی اساس (۱) نظریۂ حسن و عشق (۲) نظریۂ وحدۃ الوجود ۔ پر ہے جس سے اس کے تمام افکار ستخیر اور تمام اعمال و وظائف متاثر ہوتے ہیں ۔

آئندہ سطور میں انہیں دونوں نظریوں سے الگ الگ بحث کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ اصغر نے ان نظریات کو کس حد تک قبول کیا نیز یہ کہ ان کے قبول کرنے سے ان کے عقائد و افکار کے ساتھ ان کی سیرت و شخصیت پر کیا اثر پڑا ۔

نظریۂ حسن و عشق :

سلسلۂ چشتیہ کے بزرگ عشق کو آفرینش خلق کا سبب اور انسانی ہستی کا مقصود و منتہا قرار دیتے ہیں ۔ چنانچہ حضرت شیخ نظام الدین اولیا رح حضرت فخر الدین مروزی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

" اتفاق اصحاب طریقت ، ارباب حقیقت است کہ اہم مطلوب و اعظم مقصود از خلقت بشر محبت رب العالمین است ۔"[1]

اسی سلسلے کے ایک دوسرے بزرگ خواجہ بندہ نواز وجود العاشقین میں لکھتے ہیں :

" .... اول ہم عشق بود آخر ہم عشق باشد زیرا کہ ہر وجودیکہ ہست بیرون از عشق نہ شدہ است ۔ بغیر از عشق نتواند ماندن ۔ پس اول و آخر ظاہر و باطن ہمین عشق است ۔"[2]

یہ حضرت اپنے دعوے کی دلیل میں حدیث قدسی :

كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِياً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِاُعْرَفَ[3]

--- پیش کر کے تخلیق کائنات کا محرک و منتہا عشق کو ٹھہراتے اور درج ذیل آیات سے اللہ اور بندے کے درمیان رشتۂ محبت ثابت کرتے ہیں :

۱۔ سیر الاولیا ۔ ص ۲۵۵-۲۵۴ بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ۔ خلیق احمد نظامی ۔ اشوکا پریس دھلی طبع اول ۱۹۵۳ء ۔ ص ۳۲

۲۔ وجود العاشقین ۔ ص ۲-۳ ۔ بحوالہ خواجہ بندہ نواز کا تصوف اور سلوک ۔ ڈاکٹر میر ولی الدین ۔ یونین پرنٹنگ پریس دھلی ۔ طبع اول ۱۹۶۲ء ۔ ص ۵۷

۳۔ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں سو میں نے اپنی معرفت کے لیے دنیا بنا دی ۔

وَالَّذِينَ اٰمَنُوا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ [۱] (بقرہ : ۲۰)

يَا اَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا مَن يَّرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ [۲] (۵ : ۵۹)

چنانچہ صوفیائے چشتیہ نے اپنے نظام تعلیم و تربیت میں اولین اہمیت عشق و محبت ہی کو دی ہے [۳]۔ جیسا کہ خواجہ بندہ نواز نے اسماء الاسرار میں عشق کی اہمیت جتاتے ہوئے تحریر فرمایا :

" حاصل کلام ، اصل خلقت ، راس حکمت ہمیں محبت و معرفت آمدہ ۔ دشنیدہ ۔ گر عشق نبودے فلک نہ گردیدے ، گر عشق نبودے سبزہ نہ روئیدے ، گر عشق نبودے حیوان نہ زائیدے ، گر عشق نبودے انسان بعہد بلاغت نہ رسیدے ، گر عشق نبودے خدا را کسے نپرستیدے گر عشق نبودے جمال اللّٰہ کسے ندیدے [۴]۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ کو " حسن مطلق " تسلیم کرتے اور اَللّٰهُ جَمِيلٌ وَ يُحِبُّ الْجَمَالَ کو اپنے عقیدے کی سند میں پیش کرتے ہیں ۔

اصغر سلسلہ چشتیہ سے منسلک تھے [۵] لہذا انھوں نے بھی ان کے نظریہ حسن و عشق کو قبول کیا ۔ انھوں نے اگرچہ حسن و عشق کے متعلق مختلف نظریات پیش کیے ہیں (تفصیل آگے دی گئی ہے) لیکن بنیادی طور پر وہ " حسن مطلق " کے قائل ہیں ۔ حسن مطلق سے وہ کیا مراد لیتے ہیں اور اس نظریے سے ان کے اصال کس طرح متاثر ہوئے ہیں اس سے ذیل میں بحث کی جاتی ہے ۔ اصغر نے اپنے عہد کے " معترضین عشق حقیقی "

۱۔ مومن سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں ۔

۲۔ اے ایمان والو اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا .... تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم پیدا کرے گا جنھیں اللہ کی محبت حاصل ہوگی اور وہ اللہ کو محبوب رکھنے والے ہونگے ۔

۳۔ اردو شاعری میں اصغر کی انفرادیت مقالہ ایم اے از فضل القدیر ۔ ڈھاکا یونیورسٹی ص ۶۰

۴۔ اسماء الاسرار ۔ ص ۱۶۱ بحوالہ خواجہ بندہ نواز کا تصوف اور سلوک ۔ ص ۲۹

۵۔ اصغر کے مرشد قاضی عبدالغنی صاحب اپنے والد قاضی محمد اسمعیل کے خلیفہ مجاز تھے اور ان سے سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے لیکن قاضی محمد اسمعیل رح کے مرشد شیخ محمد تھانوی رح جامع السلاسل تھے ۔ یعنی وہ اپنے مرشد حضرت میانجیو نور محمد سے چشتیہ صابریہ ، نقشبندیہ اور قادریہ میں بیعت تھے ۔ (تحقیق وحدۃ الوجود والشہود ص ۲۷) -- شیخ محمد رح کو نقشبندیہ سے فطری لگاؤ تھا ۔ لیکن ان سے اوپر کا پورا پورا سلسلہ چشتیہ صابریہ کا ہے ۔

کا اعتراض دھراتے ہوئے ایک طویل جواب دیا ہے جسے یہاں بجنسہ نقل کیا جاتا ہے ۔ اس سے " حسن مطلق " کے متعلق اصغر کا نظریہ واضح ہو جائے گا :

اعتراض

" .... عشق حقیقی سرے ہی سے غیر فطری اور غلط معلوم ہوتا ہے .... حسن نسوانی کی ادائیں تو بین طور پر ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں ۔ ان کی تاثیر میں فطرت کی اعلیٰ ترین مصلحت توالد و تناسل بھی مضمر ہے ۔ لیکن " حسن مطلق " اور " حسن حقیقی " سے شیفتگی ایک کورانہ تقلید ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی بیسویں صدی میں کہیں سے ضرورت ہو۔[۱]"

اعتراض میں تین باتیں کہی گئی ہیں :

(۱) حسن نسوانی مدرک بالحواس ہے ۔ اس سے محبت سمجھ میں آتی ہے

(۲) اس کی محبت میں توالد و تناسل کی اعلیٰ ترین/ مصلحت مضمر ہے ۔

(۳) حسن حقیقی غیر مدرک و غیر مرئی ہے (اس کا کوئی فائدہ نہیں) یہ محض کورانہ تقلید ہے ۔

اس کا جواب اصغر نے یوں دیا :

" نسوانیت کی کشش اور اس کی قوتیں مسلم اور یہ بھی تسلیم کہ اس سے ہمارے بعض قویٰ و جذبات کی سیرابی بھی ہوتی ہے ...... مگر کیا ہماری انسانیت چند خاص قویٰ و جذبات تک محدود ہے؟ اور کیا ان کے علاوہ ہماری دوسری احتیاجات زندگی نہیں؟

اگر آبشار کی آواز اور مغنی کا نغمہ ہمیں بیخود بنا دیتا ہے اور مرغزار کی سبزی اور شفق کی سرخی ہم میں کوئی کیفیت نہیں پیدا کرتی تو اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ ہمارا سامعہ تو صحیح ہے مگر ہماری بصارت و بینائی میں یقیناً نقص ہے ۔ انسان کے احساسات و ادراکات کا استقصاء و شمار آسان نہیں کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری ہستی کے کون کون سے اجزاء کو کن کن چیزوں کی احتیاج ہے انسان خود کو جس قدر وسیع کرتا جاتا ہے اتنا ہی حسن بھی اس کے سامنے وسیع ہوتا جاتا ہے جو لوگ حسن کو کسی مخصوص چیز میں مقید دیکھنا

۱۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول از اصغر ۔ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ۔ ص ۱۳۲

چاہتے ہیں وہ اپنے بعض جذبات میں کتنی ہی قوت و ہیجان پائیں لیکن بہرحال یہ ایک قسم کی تنگی و تقید ہے جو انسان کے وسیع نقطۂ نظر سے کسی طرح محمود و مستحسن نہیں ۔ ہمارے حواس خمسہ ظاہری رنگ و بو ، آواز ، نرمی و سختی اور ذائقے کے علاوہ کسی دوسرے حسن سے قطعی بے خبر ہیں ۔ ہمارے باطنی حواس ، حسن معنی ، حسن تخیل اور حسن اخلاق وغیرہ پسر شیفتہ ہیں مگر ان میں سے کسی ایک چیز پر اپنے ذوق کسو محدود و منحصر کر دینا انسانی ہستی اور اس کی جامعیت کے لیے سم قاتل ہے ۔

سچ حسن تمیں سے ظاہر ہو کہ باطن ہو
یہ قید نظر کی ہے ، وہ فکر کا زندان ہے [1] "

اپنے قول کی شہادت اور اس کی صداقت کے ثبوت میں وہ ایک مغربی مفکر کا قول نقل کرتے ہیں ۔ وہ کہتا ہے :

" (۱) جو لوگ چیزوں کا صرف ظاہر دیکھتے ہیں ان کی حالت واجب الرحم ہے ۔

(۲) جو لوگ چیزوں میں حسن دیکھتے ہیں ان کی حالت بہتر ہے اور ان سے کچھ امید کی جا سکتی ہے ۔

(۳) اور وہ لوگ جو بلند ترین و مکمل ہیں وہ حسن کے سوا کچھ اور نہیں دیکھتے [2] ۔"

یہ واضح کرنے کے بعد کہ کائنات میں صرف " حسن " ہے وہ حسن کے متعلق اپنا نظریہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :

" انسانی ہستی کا اگر ہر ریشہ بیدار و ہشیار ہو تو کائنات عالم میں کیا ہے جس کا اس سے تعلق نہ ہو ۔ کون سی چیز ہے جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کیف و لذت کا ادراک نہ ہوتا ہو ....

۱۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ۔۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول از اصغر ۔ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ۔ ص ۱۳۶

۲۔ ایضاً ۔

عالم میں " حسن " اور " محض حسن " کے سوا اور موجود ہی کیا ہے " حسن صورت " اگر تفریح بخش ہے تو کیا " حسن معنی " نے صدہا اور ہزارہا انسانوں کو دیوانہ نہیں بنا دیا؟ ....
یہی وجہ ہے کہ ارباب حقیقت کے کلام میں " حسن مجاز " کی دلآویزیوں کا بھی ذکر ہے اور " حسن اخلاق " کا بھی ....

حسن مطلق سے کیا مراد ہے؟

" حسن مطلق " کی پرستش کے معنی یہ ہیں کہ " حسن " کہیں ہو کسی صورت میں ہو، کسی مرتبے اور کسی شعبہ حیات میں ہو اس کو ہر جگہ پہچانا جائے اور ہر جگہ پر اس کا صحیح حق ادا کر دیا جائے " حسن کامل " یا " حسن مطلق " سے لطف اندوز ہونے کے لیے صلاحیت درکار ہے - دیکھنے میں تمام انسان انسان ہیں مگر ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو صرف " دل " ہیں یا صرف " دماغ " ہیں - کچھ ایسے ہیں کہ " شکم و بہیمیت " کے سوا ان کی کوئی ہستی نہیں - " کمال حسن " کی شناخت کے لئے انسانیت کی تکمیل ضروری ہے -[1] "

اصغر کے اس طویل جواب کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) کائنات میں " حسن " اور محض " حسن " ہے -

(۲) " حسن کامل " --- حسن ظاہر اور " حسن باطن " کا مجموعہ ہے -- اس کی تحسین وقدرشناسی اسی وقت ممکن ہے جب انسان کی ہستی کا ہر ریشہ (ظاہر و باطن دونوں کا) ہشیار و بیدار ہو ---- یعنی جب انسان نے اپنے کو ظاہر و باطن کا کامل نمونہ بنا لیا ہو -

(۳) " حسن مطلق " ---- (جو کسی خاص چیز میں مقید نہیں ہے) کی تقدیر و تحسین یہ ہے کہ حسن کو حیات و کائنات کے ہر شعبہ میں دیکھا جائے اور اس کی قدر شناسی " حق قدرہ " کے مطابق کی جائے - جیسا کہ اصغر کہتے ہیں ؎

میری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے جہاں جہاں سے تقاضائے حسن یار ہوا

۱- اردو شاعری کی ذہنی تاریخ --- دہلی اور لکھنؤ اسکول از اصغر - زمانہ ستمبر ۱۹۲۹ء - ص ۱۳۸-۱۳۷

(۲) حسن کی قدرشناسی کے لیے استعداد کی ضرورت ہے (اور خداوند تعالیٰ کسی کو اس نعمت سے محروم نہیں کرتا کوتاہی ہماری طرف سے ہوتی ہے کہ ہم اپنی صلاحیت کی ترقی اور اس کی توسیع نہیں کرتے) ۔

حسن کے اس "وسیع تصور" اور اس پر عمل نے اصغر کی طبیعت میں رنگینی اور "تمتع بالدنیا" کی کیفیت پیدا کر دی تھی ۔ رنگینی ان کی فطرت کا خاصہ تھی[1] اور "تمتع بالدنیا" کا نظریہ انہیں اسلام[*] اور اسلامی تصوف کی تعلیمات سے ملا تھا ---

قرآن آیات اللہ کی حیثیت سے انفس و آفاق کے مطالعہ[2] (محبت) کی دعوت دیتا ہے اور صوفیاء کا معمول اور قول تھا کہ

"انسان اللہ کی دی ہوئی سب نعمتوں سے فائدہ اٹھائے ۔ اس کائنات کی ایک ایک چیز سے مستفید ہو لیکن اس طرح کہ دنیا کی محبت اس کے دل کو آلودہ نہ کرے[3] ۔"

اصغر نے اس نظریے کو بطور عقیدہ اور اصول زندگی قبول کیا تھا ---------

بعض لوگوں نے اس بات پر اظہار تعجب کیا ہے کہ اصغر صوفی ہونے کے باوجود رنگین مزاج ہیں ۔ حقیقتاً اصغر کیا ہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا[4] ۔

وہ اس چیز کو نظر انداز کر گئے کہ اصغر نہ متقشف مسلمان تھے ، نہ زاہد خشک نہ تارک الدنیا صوفی ۔ ان کے اندر مومن کی نظر اور صوفی کا دل تھا جس کے پیش نظر صحیفۂ کائنات ہوتا ہے اور جو اس صحیفے کے ایک ایک گوشے ، حرف اور لفظ کو بغور دیکھتا جانچتا ، تولتا ، پرکھتا اور اس کی حیثیت متعین کرتا ہے ۔ اس تدبر باطنی اور تماس دائمی سے اس میں اشیائے عالم کے ساتھ ایک بصیرت آمیز محبت پیدا ہو جاتی ہے ۔ وہ ان سے محبت کرتا ہے اس طرح کہ انہیں بذاتہ محبوب نہیں سمجھتا بلکہ محبوب کے چشم و ابرو

---

*۔ اسلام "ترک مادہ" کے بجائے (حدود میں رہتے ہوئے) اقرار و "انتفاع مادہ" کی تعلیم دیتا ہے ۔

۱۔ مسلمان صوفیہ کا ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہا ہے (جن میں اصغر اور ان کے مرشد بھی تھے) جس نے لذائذ دنیوی سے تمتع حاصل کیا ہے ۔ دیکھیے تذکرہ شاہ فخرالدین ۔ مشمولہ تاریخ مشائخ چشت ص ۴۸۲

۲۔ البقرہ : ۱۶۵

۳۔ تاریخ مشائخ چشت ۔ ص ۷

۴۔ ریڈیائی تقریر ۔ جناب حسن نعیم از ریڈیو دہلی ۹ مئی ۱۹۷۱ء

کے اشارے اور اس کے حسن کے مظاہر خیال کرتا ہے ---- اور صوفی (عاشق خدا) کے دھڑکتے ہوئے دل سے کائنات عالم کو " پیغام محبت " اور " التجائے جانبازی " سمجھنے لگتا ہے ؎[1]

یہ حسن دوست ہے اور التجائے جانبازی   تجھے یہ وہم کہ یہ کائنات عالم ہے

اس کی نظر میں کائنات عالم ، محبوب حقیقی کے عشق کا وسیلہ بن جاتی ہے ؎

دھر ہی نے مجھ پہ کھولی راہ بے پایان عشق   راہبر کو اک فریب رہ گزر سمجھا تھا میں

اس نقطہ نظر کو اگر سمجھ لیا جائے تو " المجاز قنطرۃ الحقیقۃ " قابل فہم اور معقول نظر آنے لگتا ہے ۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اصغر کی نظر میں کائنات میں حسن ہی حسن ہے ۔ یہاں کوئی چیز بری نہیں ۔ برائی انسان کی اپنی غفلت ، کم وسعتی ظرف و نظر اور عدم تکمیل انسانیت کا نتیجہ ہوتی ہے چنانچہ ان کا عقیدہ ہے کہ جو لوگ چشم بینا اور نگاہ جمال پرست پیدا کر لیتے ہیں انہیں " دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوس حسن[*] " نظر آنے لگتا ہے ۔

" حسن مطلق " کے متعلق اسی نقطہ نظر سے اصغر میں رنگینی ، زندہ دلی اور رجائیت پیدا ہوئی ، لیکن جن لوگوں کی نظر ان حقایق تک نہیں پہنچی ، اصغر ان کے لیے معمہ بن گئے ۔

" حسن " کے اس بنیادی نظریے کے علاوہ اصغر نے حسن و عشق کے ربط و تعلق باہمی کی نسبت مختلف نظریات پیش کیے ہیں جنھیں یہاں مختصراً درج کیا جاتا ہے ۔[2]

<u>پہلا نظریہ :</u> یہ ہے کہ " حسن فی نفسہ کوئی چیز نہیں ۔ خود ہمارا ذوق نظر اور ہماری بے تابی شوق ایک چیز کو ہماری نگاہ میں محبوب بنا دیتی ہے ۔ بالفاظ دیگر عشق

۱۔ اصغر کہتے ہیں " اگر نگاہ تدبر میسر ہو .... تو پھر یہی مرایا و مناظر (فطرت) شاعر کی نکتہ رس اور حسن پسند نظروں میں خود شاہد حقیقی کے خدوخال بن جاتے ہیں " ۔۔ مقدمہ رباعیات رواں ۔ ص ۱۲

*۔ دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوس حسن ہے   جو اس سے بیخبر ہیں وہی ہیں عذاب میں
اصغر

۲۔ یہ بحث تبصرہ مولانا اقبال احمد سہیل مشمولہ " نشاط روح " طبع اول ۔ ص ۶۰-۵۹ سے ماخوذ ہے ۔

خالق حسن ہے ۔" سے

تھیں نگاہ شوق کی رنگینیاں چھائی ہوئیں　　پردۂ محمل اٹھا تو صاحب محمل نہ تھا

اس میں وہی ہیں یا میرا حسن خیال ہے　　دیکھوں اٹھا کے پردۂ ایوان آرزو

میری مذاق شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ　　میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویر یار کو

جنوں شوق کی شوریدگی کو کیا کہئے　　وگرنہ عشوہ طرازی نقش پا معلوم

ستم جو چاہے کرے مجھ پہ عکس ذوق نظر　　بساط آئینہ حسن خودنما معلوم

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں　　سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے

دوسرا نظریہ : یہ ہے کہ " اصل حقیقت محض حسن ہے اور حسن کا تقاضا ہے ظہور و خود نمائی اور یہ تقاضا عشق کا محرک اور خالق ہے ۔ مذہب کی اصطلاح میں اسی کو توفیق کہتے ہیں ۔" سے

پھر گرم نوازش ہے ضو مہر درخشاں کی　　پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامہ طوفاں ہے

اک غنچۂ افسردہ یہ دل کی حقیقت تھی　　یہ موجزنی خون کی رنگینی پیکاں ہے

شعاع مہر خود بیتاب ہے جذب محبت سے　　حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پرواز شبنم کی

اس کی شعاع مہر خود مجھ کو اڑا کے لے چلی　　شبنم خستہ حال کو حاجت بال و پر نہیں

تیسرا نظریہ : یہ ہے کہ " حسن و عشق دونوں اپنی اپنی جگہ پر مستقل ہستیاں ہیں مگر ہر شخص کا معیار حسن فطری طور پر مختلف ہوتا ہے اور فطرت اپنے معیار پسند کی جستجو میں رہتی ہے اور جب اتفاق سے وہی چیز سامنے آ جاتی ہے تو دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھتی ہیں اور اسی تطابق حسن و عشق سے دونوں کا رنگ نکھر اٹھتا ہے ۔" سے

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا　　اس رخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں

مستی سے تیرا جلوہ خود عرض تماشا ہے　　آشفتہ نگاہوں کا یہ کیف نظر دیکھا

مجنوں کی نظر میں بھی شاید کوئی لیلیٰ ہے　　ہر ایک بگولے کو دیوانہ بنا آئی

وہ شوخ بھی مجبور ہے معذور ہوں میں بھی　　کچھ فتنے اٹھے حسن سے کچھ حسن نظر سے

چوتھا نظریہ : یہ ہے کہ " تمام عالم چوں کہ محض ایک حسن ازل کا پرتو ہے لہذا حسن و عشق کی حقیقت ایک ہے شانیں مختلف ہیں ۔" یہ نظریہ وہی ہے جسے اصطلاح سلوک و تصوف میں وحدۃ الوجود کہتے ہیں ۔ اس پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی

ضرورت ہے ۔

ہر دین صحیح نے اپنے ماننے والوں کو لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ کی تعلیم دی تھی جس کا مقصد ان میں وحدت فکر و عمل پیدا کرنا اور " وحدت آدم "، اور احترام ادمیت کا درس دینا تھا ۔ مقصود یہ تھا کہ یہ تصور عقیدے سے گزر کا اعمال میں جاری و ساری ہو جائے ۔ لیکن فلاسفہ اور صوفیہ کی ایک جماعت نے دین کے اس بنیادی عقیدے کی کچھ اسطرح تعبیر و تفسیر کی کہ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ ۔ لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰـہُ سے گزرتا ہوا لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰـہُ پر جا کر ختم ہوا ۔ نظریہ" وحدت الوجود اسی لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰـہُ کی تفسیر ہے۔

نظریہ وحدۃ الوجود :

اس نظریے کے مطابق کائنات میں صرف ذات بحث موجود ہے ۔ اس نے چاہا کہ اپنے کمال و جمال کو دیکھے تو آئینہ کائنات میں خود کو منعکس کیا ۔ اس انعکاس سے کثرت و تعدد پیدا ہوا ۔ لیکن حقیقتاً" وہی " وحدۃ " ۔۔ یعنی ذات بحث ہے ۔ کائنات کی حقیقت سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ " وجود مطلق " کا عکس (ظل ، سایہ) یا عین ہے ۔

اس کی توضیح سنیے :

ذات حق سبحانہ ، تعالیٰ گنج مخفی ہے[1] (یعنی باعتبار عدم معرفت وہ غیب الغیب ہے) اس کی کنہ سے سوائے اس کے کوئی واقف نہیں ۔ اسی ذات نے اپنے جمال و کمال کو خارج میں ملاحظہ فرمانے کے لئے باطن سے ظاہر میں اپنے صور علمیہ (یا باصطلاح صوفیہ اعیان ثابتہ) کے آئینوں کو آراستہ کیا جو صورتیں کہ باطن میں (یعنی باصطلاح صوفیہ واحدیت میں) ثابت تھیں جن کی وہ ذات علماً" شاھد تھی ، خارج میں یا مرتبہ" عین میں ان کو خود اپنے ظہور سے نمودار کیا اور عیناً" یا خارجاً" بھی خود اپنی شاھد ہوئی ۔ ھوالشاھد و ھوالشھود ۔[2]

"۔۔۔۔۔ یعنی ذات حق ہی کا صرف وجود ہے ۔ وہی عاشق ہے اور وہی معشوق ۔ ماسوائے حق غیر موجود یا معدوم ہے یا محض اعتباری ۔۔۔۔ اعیان ثابتہ پر جب نور وجود کا فیضان ہوا تو یہ عالم وجود میں آیا اور اس عالم کا جو بمنزلہ سایہ ہے آفتاب وجود سے عشق کا جذبہ مستحکم ہوا ۔ اسطرح عشق و عاشقی کا فتنہ پیدا ہوا ۔[3]"

۱۔ کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِاُعْرَفَ ۔۔ حدیث قدسی

۱۔ رموز عشق ۔ ڈاکٹر میر ولی الدین ۔ اشوکا پریس دھلی طبع اول ۱۹٦٦ء ۔ ص ۱۳۱

۲۔ ایضاً" ۔ ص ۱۳۲

اس تصور نے آگے چل کر عقیدے کی شکل اختیار کرلی اور اسلامی معاشرے میں اس کے نتائج و اثرات بعض صورتوں میں بڑے خطرناک اور دور رس ثابت ہوئے ۔ مثلاً

(۱) کائنات کو خدا کا عین (لغوی معنوں میں) سمجھ لیا گیا اس سے اسلام کے عقیدۂ توحید پر کاری ضرب لگی اور عوام کے یہاں " مجاز قنطرۃ ،، حقیقت کے بجائے خود " حقیقت ،، بن گیا اس طرح بہت سے افعال قبیح کی اباحت و جواز کا حربہ ہاتھ آ گیا ۔

(۲) کائنات کو ظل یا سایہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کائنات سے صرف نظر کر لی گئی اور کائنات بیزاری کا تصور عام ہوا ۔ اور اب ترک و تجرد کے معنی جوگ ، بیراگ اور تیاگ کے لیے جانے لگے ۔

(۳) روحانیت اعمال و اخلاق کی بلندی و پاکیزگی کے بجائے ذہنی اور خیالی چیز بن کر رہ گئی ۔

(۴) فعالیت (جو اسلام کی تعلیم کا خاصہ ہے) مجہولیت میں بدل گئی اور ربودگی ، محویت و استغراق کو کمال روحانی سمجھ لیا گیا ۔

لیکن علمائے ربانی اور صوفیائے حقانی میں ایک گروہ ایسا ہمیشہ موجود رہا جو ان عقائد باطلہ اور تصورات مبالغہ آمیز کی اصلاح کرتا رہا ۔ بعض اہل حق نے نظریہ وحدۃ الوجود کے خلاف " وحدۃ الشہود ،، کا نظریہ پیش کیا[1] (تفصیل آگے آئے گی) بعض نے درمیانی راستہ اختیار کیا اور دونوں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی[2] ۔ بعض نے اسکے مضر اثرات کے ازالے کے لیے اس کی اسلامی تعبیر و تفسیر پیش کی ۔ ذیل میں اس کا اقتباس دیا جاتا ہے :

> " " ہمہ اوست " کے معنی یہ نہیں ہیں کہ " ہمہ" اور " او " ایک ہیں ۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ " ہمہ " کی ہستی قابل اعتبار نہیں صرف " او " کی ہستی لائق شمار ہے ۔ اور باقی جتنے موجودات ہیں ہستی تو ان کی بھی واقعی ہے ۔ مگر ان کی ہستی " ہستی کامل ،، کے سامنے محض ایک ظاہری ہستی ہے ۔ حقیقی یعنی کامل نہیں .... یعنی گو ممکنات موجود ہیں مگر " وجود حق ،، کے روبرو ان کا وجود نہایت ناقص و ضعیف و حقیر ہے ....

۱۔ حضرت مجدد الف ثانی رح

۲۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

" وجود ممکن ؟ کو وجود حق کے روبرو گو "عدم" نہ کہیں گے
مگر" کالعدم " ضرور کہیں گے - جب یہ کالعدم ہوا تو
" وجود معتدبہ " ایک ہی رہ گیا - یہی معنی "وحدۃ الوجود"
کے ہیں .... " وحدۃ الشہود " ...... کا ترجمہ
ہے ایک ہونا شہود کا - یعنی واقع میں تو ہستی متعدد ہے
مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے [۱]۔"

اس نظریے کے مطابق کائنات خدا کا عین نہیں اس کا غیر اور مخلوق ہے -

" .... اگر سالک کو حالت جذب میں خدا اور کائنات کے
درمیان عینیت کا تعلق نظر آتا ہے تو وہ حقیقی نہیں بلکہ نفسیاتی
ہوتا ہے - جب سالک راہ از دیاد محبت سے سرشار ہو کر "ماسوا"
سے نظریں ہٹا لیتا ہے اور صرف خدا کے تصور ہی کو اپنے ذہن
میں قائم رکھتا ہے تو اس کو " ذات خداوندی " کے سامنے اپنی
ذات اور کل کائنات معدوم نظر آنے لگتی ہے ...... یہ کیفیت اس
کے اپنے " جذبہ اور شہود " کی کارفرمائی ہے واقعیت و اصلیت سے
اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا [۲]۔"

وحدۃ الوجود کی متذکرہ بالا تعبیر کو ، جس کے تحت کائنات کو خدا کا عین قرار دیا جاتا ہے صوفیاء اور شعراء نے دریا اور اس کے متعلقات و تلازمات (قطرہ ، موج و حباب) کی تمثیل سے سمجھانے کی کوشش کی ہے - مثلاً "غالب کہتے ہیں ؎

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

اور اصغر کہتے ہیں ؎

اتنا ہوا دلیل تو دریا کی بن سکے مانا کہ اور کچھ نہیں موج و حباب میں

وحدۃ الوجود کی ایک دوسری تعبیر وہ ہے جو امام غزالی رح نے کیمیائے سعادت میں مدارج چہارگانہ" توحید سے بحث کرتے ہوئے پیش کی ہے - وہ لکھتے ہیں :

" توحید چہارم در عبارت آوردن و شرح کردن کسی را ....
دشخوار بود - اما در جملہ ایں مقدار بدان کہ روا باشد چیزھا

۱- شریعت اور طریقت از افادات مولانا اشرف علی تھانوی رح - کتب خانہ اشرفیہ جامع مسجد راولپنڈی - ص ۳۶۸-۳۷۰

۲- تحقیق وحدۃ الوجود والشہود - مولانا شیخ محمد تھانوی محدث رح - مرتبہ ثناء الحق صدیقی ایجوکیشنل پریس کراچی - بار اول ۱۹۶۳ء - ص ۱۱۰-۱۰۹

بسیار باشد ، لیکن آن چیزها را نوعی از ارتباط بود که بدان
ارتباط چون یک چیز شود - و چون در دیدار عارف آن وجه آید
یکی دیده باشد .... مقامی است در معرفت که
کسی که بدان رسد بحقیقت ببیند که هرچه در وجود است
به یک دیگر مرتبط است و جمله چون یک حیوان است - و نسبت
اجزائے عالم چون آسمان و زمین و ستارگان بایک دیگر،چون نسبت
اندام هائے یک حیوان است بایک دیگر - و نسبت عالم با مدبّر
آن از وجهی نه از همه وجوه چو نسبت مملکت تن حیوان است
با روح وی - که مدبر آن است - و تا کسی این نه شناسد که
اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ ، این در فہم وی نیاید -[1]"

تذکرہ غوثیہ میں " وحدۃ الوجود " کی یہی تعبیر ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے :

" وجود یعنی ہستی حقیقی واحد ہے - لیکن ایک ظاہر وجود ہے
اور ایک باطن - باطن وجود ایک نور ہے جو جملہ عالم کے لئےبمنزلہ
ایکجان کے ہے اسی نور باطن کا پرتو ظاہر وجود ہے - جو ممکنات
کی صورت میں نظر آتا ہے - ہر اسم و صفت و فعل کہ عالم ظاہر
میں ہے ان سب کی اصل وہی وحدت باطن ہے اور حقیقت اس کثرت کی
وہی " وحدت صرف " ہے جیسے امواج کی حقیقت میں ذات دریا ہے۔[2]"

اصغر نے وحدۃ الوجود کی یہ تعبیر بھی قبول کی ہے - ان کے کلام میں جابجا
صورت و معنی ، گل و نکہت اور اسی قسم کی دوسری تمثیلات آتی ہیں - گزشتہ سطور میں
وحدۃ الوجود کی جو دو مختلف تعبیریں و تشریحیں بیان ہوئی ہیں اب ان کی مثالیں کلام
اصغر سے پیش کی جاتی ہیں :

تعبیر اوّل

جب تو نظر آیا مجھے تنہا نظر آیا	پھر میں نظر آیا نہ تماشا نظر آیا
پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے	جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے

۱- بحوالہ گنجینہ ادب حصہ نثر - پنجاب یونیورسٹی پریس لاہور - ص ۷۱-۷۰
۲- تذکرہ غوثیہ منقولہ رود کوثر - ص ۲۶۱ بحوالہ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات --
از اعجاز الحق قدوسی - ایجوکیشنل پریس کراچی - طبع اول - ص ۲۳۵-۲۳۴

لوشمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے　　فانوس کی گردش سے کیاکیا نظر آتا ہے

کس طرح حسن دوست ہے بے پردہ آشکار　　صدہا حجاب صورت و معنی لئے ہوئے

لیکن اصغر کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۲۵ء کے بعد ان کا میلان تعبیر دوم کی طرف ہو گیا اور روز بروز اس پر ان کا یقین بڑھتا گیا ۔ اور اصغر کا ایک شعر درج ہوا تھا ؎

اتنا ہوا دلیل تو دریا کی بن سکے　　مانا کہ اور کچھ نہیں موج و حباب میں

میں " وحدۃ الوجود " کے نظریے کے خلاف " ماسوا " کی " تقدیر " (قدرشناسی) ہے اور اسکی حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے ۔ یہ شعر جس غزل کا ہے وہ سرود زندگی طبع اول ، ص ۱۹ پر ہے ۔ اور اس کے آخر میں مئی ۱۹۲۶ء درج ہے ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس وقت تک اصغر کے خیالات ~~لیلیٰ وجود~~ (کہ یہ دنیا اور اس کا وجود دھوکا ہے) میں تبدیلی آ چکی تھی ۔ سرود زندگی میں وحدۃ الوجود کی " پہلی تعبیر " سے متعلق کوئی شعر نظر نہیں آتا ۔ البتہ تعبیر دوم کی مثالیں جا بجا بکھری پڑی ہیں ان میں سے چند درج ذیل کی جاتی ہیں :

تعبیر دوم

وہ گل سے بھی سوا عریاں ، وہ نکہت سے سوا پنہاں

یہ ہم ہیں جو کبھی جلوہ کبھی پردا سمجھتے ہیں

دکھائی صورت گل پر بہار شوخی خنداں

چھپایا معنی گل میں کبھی حسن نمایاں کو

حسن ساقی کا تو مستوں کو ذرا ہوش نہیں

کچھ جھلک اس کی سر پردۂ مینا دیکھیں ۔

اس کے سوا تو معنی مجنوں بھی کچھ نہیں

ایسا بھی ربط صورت لیلیٰ نہ چاہیے

غرضیکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تصوف کے عقائد و افکار نے اصغر کی فکر و نظر کو حد درجہ متاثر کیا ہے چنانچہ قاری ان کے مجموعات شعری میں قدم قدم پر صوفیانہ اصطلاحات ـــ دید ، فنا ، بقاء حیرت بیخبری وغیرہ سے دو چار ہوتا ہے ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں صوفیانہ الفاظ و اصطلاحات سے زیادہ صوفی کی روح ہے ۔ وہی طہارت نفس ، وہی لطافت خیال اور وہی خلوص جذبات ـــ جو صوفی کا حاصل زیست ہوتا ہے ۔

گزشتہ سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ وحدۃ الوجود کے نظریے سے صوفیاء کی ایک جماعت نے ترک و تجرد کو تیاگ اور بیراگ سمجھ کر مادے کا انکار کر دیا تھا ۔ جو اسلام کی تعلیمات کے منافی ہے ۔ اسلام " لذات مادی " کا انکار نہیں کرتا ان کو تسلیم کرتا ہے اور اپنے پیروں کو حکم دیتا ہے :

فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ [1]

(زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا رزق تلاش کرو)

اصغر نے قرآنی تعلیمات کے زیر اثر ترک کے معنی " ترک کل " اور " ترک محض " کے نہیں لیے بلکہ " انتفاع حرام " اور " انتفاع غیر معتدل " سے اجتناب و پرہیز کے لیے کہ یہی تعلیم ان کو اپنے سلسلے کے بزرگوں سے بھی ملی تھی ۔ خواجہ نظام الدین اولیاء رحہ کا ارشاد ہے :

" ترک دنیا آن نیست کہ کسی خود را برہنہ کند مثلاً لنگوتہ (لنگوٹا) بہ بندد و بہ نشیند ترک دنیا آن است کہ لباس بپوشد و طعام بخورد و آنچہ می رسد روا بدارد ۔ و بجمع او میل نہ کند و خاطر را متعلق چیزی ندارد ۔ ترک دنیا است [2] "

اصغر کے صوفیانہ افکار میں (۱۹۲۶ء کے بعد) کہیں دنیا کے " سایۂ بے مایہ " ہونے کا تصور نہیں ملتا ۔ اسی طرح ان کے یہاں صوفیائے وجودیہ کی مجہولیت ، زندگی اور بھک بھی نہیں نظر آتی ۔ ان کا تصوف فعال ، جاندار اور الوالعزمانہ ہے ۔ یہ سب دراصل صدقہ اور نتیجہ تھا ۔ ایک مرد مومن حق پرست اور خود آگاہ کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا ۔

بقول اسد اللہ کاظمی :

" اصغر کا تصوف فعال ہے معطل نہیں ، اکتسابی ہے کتابی نہیں ، یہ زندگی کا ایک جامع دستور العمل ہے اس سے گریز کی راہ نہیں ۔ عمل کا اثبات ہے اس کی نفی نہیں ۔ یہ حقیقت کی خیالی نہیں ترجمانی کرتا ہے .... اس میں سوز و گداز ہے ، درد و اضطراب ہے لیکن کسی مایوس پرواز کا نہیں مائل پرواز کا [3] "

۱۔ الجمعۃ : ۱۱
۲۔ فوائد الفواد ص ۹ بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ۔ ص ۷
۳۔ اصغر کی شاعری میں روایات حال و قال ۔ از اسداللہ کاظمی ۔ مشمولہ اصغر مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۵۹

اصغر کے مذکورہ بالا عقائد و افکار ، اور ارتقائے ذہنی کے پس منظر

میں شاید ان کی " شخصیت عہد بہ عہد " کا سمجھنا آسان ہو جائے ۔ ذیل میں ان کی

عہد بہ عہد ترقی کرتی ہوئی شخصیت پیش کی جاتی ہے ۔

اصغر کی ابتدائی زندگی کی کمزوریوں کی کوئی شہادت ہمارے پاس نہیں ہے ،
البتہ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۳ء کے درمیان کی بعض کمزوریوں کی طرف ان کے سوانح نگاروں نے
اشارے کئے ہیں جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :

(۱) رندی و سرشاری : (۸-۱۹۰۷ء تا اوائل ۱۹۱۳ء)۔

جن لوگوں نے اصغر کو قریب سے دیکھا تھا ان کا کہنا ہے کہ
" وہ جوانی میں بے راہ ہو گئے ، منہیات میں بالکل ڈوب گئے ۔
اور انھوں نے کچھ نہیں چھوڑا ۔[۱] "

اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر محمد اسلام صاحب نے بابو بندیشوری
پرشاد صاحب تقدیر گونڈوی کا یہ قول نقل کیا کہ
" اصغر شراب پیتے تھے ۔[۲] "

اس کی تصدیق جناب نواب سید شمس الحسن صاحب کی تحریر سے بھی ہوتی ہے
وہ لکھتے ہیں :
" یہ صحیح ہے بہت ابتدائی عمر میں اصغر صاحب منہیات میں غرق
تھے ۔ شراب اور افیون بھی منہ کو لگی ہوئی تھی ۔ بعد کو یکایک
ہر چیز سے توبہ کرلی اور ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا ۔[۳] "

اصغر کے شراب پینے اور افیون کھانے کے متعلق جناب افتخار اعظمی نے جگر صاحب
کا حسب ذیل قول نقل کیا ہے :
" اصغر صاحب نے کمال کر دیا کہ وہ شراب بھی پیتے تھے اور افیون
بھی کھاتے تھے اور یہ دونوں چیزیں یک لخت اس طرح ترک کر دیں
کہ پھر ان کو ہاتھ نہیں لگایا ۔[۴] "

۱۔ اصغر گونڈوی شخصیات نمبر جلد دوم " نقوش " ۔ ص ۱۳۸۲
۲۔ گفتگو راقم الحروف از جناب ڈاکٹر محمد اسلام ۲۲ مئی ۱۹۶۹ء
۳۔ مکتوب جناب نواب سید شمس الحسن بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲۷ جنوری ۱۹۷۰ء
۴۔ رسالہ جامعہ (دھلی) مئی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۲۱۔ بحوالہ جامعہ جون ۱۹۶۷ء
ص ۳۳۴

قول بالا پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی نے اپنے تاثرات کا یوں اظہار فرمایا ہے :

" خدا جانے اصغر صاحب افیون کھاتے تھے یا نہیں مگر ان مرحوم کی جو تصویر میرے ذہن میں محفوظ ہے وہ یہ ہے کہ وہ بڑے پاکیزہ صورت و وضع کے انسان تھے لیکن ان کے چہرے کی ترماهٹ اور نگاہوں کی کیفیت اس طرف خفیف سا اشارہ ضرور کرتی تھی کہ اگر اس حسن تریاکیت کی آمیزش بھی ہو تو کچھ عجب نہیں ۔[1] "

حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی جوانی میں اصغر منہیات میں مبتلا ہو گئے تھے ان کی شراب نوشی کی ابتدا یوں ہوئی کہ جن دنوں اصغر خانگی حالات سے تنگ اور روزگار کی تلاش میں سرگرداں تھے ان کی ملاقات بابو راج بہادر (تفصیل گذشتہ صفحات میں آ چکی ہے) سے ہو گئی ۔ جنھوں نے ریلوے میں انھیں ملازم رکھوا دیا ۔ اصغر ان کے اس رویے اور احسان سے ایسے متاثر اور زیر بار ہوئے کہ ان کے یہاں آنے جانے لگے ۔ بابو راج بہادر ذات کے کاستھ ، اودھ (سلطان پور*) کے رہنے والے ، اودھ کی تہذیبی میراث کے وارث تھے ۔ شعر و شاعری ، رقص و موسیقی ، شیشے کی لال پری اور "ارباب نشاط" سے دل لگی اور دلبستگی تفریحی مشغلہ تھا ۔ ان کا دولت کدہ اس عہد کے شرفا کے دولت کدوں کی طرح اس تہذیبی ورثہ کی حفاظت و اشاعت اور افادہ و استفادہ کا مرکز اور درس گاہ تھا ۔ اصغر بھی ان حلقوں میں شامل ہونے لگے ۔ نئی جوانی ، کفر خیز و ایمان شکن ماحول ، عیش سامانیوں کی سہولتیں اور آسانیاں ، اور بابو راج بہادر جیسے محسن پیر مغاں کی رہنمائی ۔ پھر کیا تھا ۔ اصغر بہک گئے اور بہکے تو ایسے بہکے کہ ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ گئے ۔ اس کی جھلک جناب سید رشید احمد کی تحریر میں ملاحظہ ہو ۔ وہ رقمطراز ہیں :

" مختصر یہ کہ راج بہادر نے رفتہ رفتہ اصغر کو رام کر کے اپنے رنگ میں رنگ لیا ۔ نوبت یہ پہونچی کہ اصغر بادۂ شبینہ کی سرمستیوں میں ایسے کھوئے گئے ، ایسے ہمہ تن غرق و شرابور ہوئے کہ حلقۂ شبینہ کے مے آشاموں پر سبقت لے جانے میں ان کا نام ہو گیا ۔[2] "

۱۔ رسالہ جامعہ (دھلی) مئی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۲۱

*۔ لکھنؤ کے قریب ایک شہر ہے ۔

۲۔ اصغر گونڈوی ۔ از جناب سید رشید احمد بحوالہ چٹان لاہور شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ص ۸

بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی رنگین مزاجوں کی صحبت نے انھیں " ارباب نشاط " کے کوچہ کا راہ نورد و راہ شناس بھی بنا دیا ۔ لیکن یہاں وہ "شہد کی مکھی" ثابت ہوئے ۔ ان کی وضع داری نے ان کو دربدری سے روکا اور " یک در گیر و محکم گیر" پر سختی سے عامل ۔ یہاں تک کہ جب ان تمام خرافات سے توبہ کی تو بی چھٹن (تفصیلی بحث پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے) جن سے معاشقہ چل رہا تھا اور جو گلے کا ہار بنی ہوئی تھیں پاؤں کی بیڑی بن گئیں ![1]

اصغر نے کسی زمانے میں خوب شراب پی ۔ دل کھول کر پی ۔ لیکن نہ پی کر بہکے ، نہ اول فول بکا نہ نالی اور سڑک پر گرے ہوئے پائے گئے ۔ کہتے ہیں شراب سے زیادہ ننگا کرنے والی کوئی چیز نہیں لیکن شراب نے اصغر کو کبھی ننگا نہیں کیا ----- شراب کی بھی یہ عجیب طرفہ کاری ہے کہ کسی کو ننگا کر دیتی ہے اور کسی پر تقدس اور ثقاہت طاری کر دیتی ہے ۔ شعرا نے شراب کو جو مہتاب سے تشبیہہ دی ہے تو یہ کچھ غلط نہیں ۔ مہتاب ہی کی طرح اس کی تیز شعاعیں خانہ ٔ دل کو منور کر دیتی ہیں ---- اگر اندر کوڑا کرکٹ ، غلاظت و خباثت کا ڈھیر ہو تو اسکی روشنی میں تمام چیز سامنے آ جاتی ہے ۔ اس کے برخلاف اگر اندر شرافت و نجابت ، ثقاہت و متانت کے جوہر ہوں گے تو اس کے نور میں نہا کر جگمگا اٹھتے ہیں ۔ شراب نے ہمیشہ ان کے اندر چھپے ہوئے شرہت ، متین ، فلسفی اور شستہ اصغر کو سامنے پیش کیا ۔ شراب پیتے ہی جیسے شمع شعور کی لو تیز ہو جاتی ، قوتیں بیدار ہو جاتیں ، ذہانت مجلیٰ اور ضمیر روشن ہو جاتا اور وہ دقیق سے دقیق اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل پر بڑی مربوط ، مدلل اور پرمغز گفتگو کرنے لگتے ۔ اس وقت یوں معلوم ہوتا گویا ان پر علوم باطنی کے دروازے کھل گئے ہیں اور ان کے اسرار و غوامض دل پر القا ہو رہے ہیں ۔

اس کی تصدیق جناب سید رشید احمد کی تحریر سے بھی ہوتی ہے ۔ وہ کنور وشوناتھ پرشاد[2] کی زبانی ناقل ہیں :

" دیگر رفتنا کبھی زیادہ پی کر اور کبھی شراب کی تلخی سے

۱۔ چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ص ۱۷

۲۔ کنور وشوناتھ پرشاد گونڈہ میں وکیل تھے ۱۹۰۹ء میں بلرام پور سے پریکٹس کے سلسلے میں گونڈہ منتقل ہوئے ۔ بابو راج بہادر کے رشتہ کے سالے تھے ۔ اصغر کے پڑوسی ۔ ان کے ہم مشرب ہم کاسہ و ہم پیالہ تھے ۔ اصغر کا ان کا دن رات کا ساتھ تھا ۔ محفل شبینہ کبھی بابو راج بہادر کے یہاں جمتی کبھی کنور صاحب کے یہاں --- کنور صاحب نے ۸۲ سال کی عمر میں ۱۹۶۸ء میں گونڈے میں وفات پائی ۔

بدحال ہو کر اکثر غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کرنے لگتے اور اول فول
بکنا شروع کر دیتے ۔ مگر اصغر کی یہ عجیب خصوصیت تھی کہ وہ
کتنی ہی شراب پی لیں، کبھی آپے سے باہر نہ ہوتے اور ہمیشہ اپنے
ہوش و حواس پر قابو رکھتے ۔ یہی نہیں بلکہ اس عالم میں بھی وہ
مختلف علمی موضوعات پر بڑی سنجیدگی، شائستگی اور دیدہ وری سے
معقول و مدلل گفتگو کر سکتے تھے ...... اور اپنی فطری ذہانت و
فطانت سے اکثر خفیف اشارات کی مدد سے دقیق مسائل کو حل کرتے
اور انہیں ضبط و نظم کے ساتھ پیش کرنے کی مہارت رکھتے تھے [۱]۔"

توبہ :

باطن کی یہی صفائی تھی جس نے اصغر پر ایک روز ماورائیت طاری کر دی
اور عین اس وقت جب کہ پوری محفل کیف و سرور میں ڈوبی ہوئی تھی اور جام شراب ان
کے ہاتھ میں تھا ان کی آنکھیں چھلک پڑیں ۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آخری جام
چڑھایا، لوگوں کو گواہ ٹھہرا کر، خدا کے حضور میں قلب صمیم کے ساتھ توبہ کرلی ۔ اس
کے بعد کسی نے انھیں شراب اور اس کے متعلقات کو منہ لگاتے نہیں دیکھا ۔

اس کی تفصیل سید رشید احمد صاحب کی زبانی سنیے :

" ۱۹۱۲ء کے موسم سرما کی ایک شب میں کنور صاحب کے یہاں محفل
جمی ہوئی تھی، دور ساغر چل رہا تھا۔ خیام کے فلسفہ شراب اور
اقبال کے اسرار خودی اور رموز بے خودی پر اصغر سے گفتگو چھڑی
ہوئی تھی اور وہ حسب معمول اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں اس
فلسفہ کے نکات و غوامض بیان کر رہے تھے اور اس پر عبور حاصل کرنے
کے لیے طہارت نفس کو شرط اولین قرار دے رہے تھے ۔ بیان کرتے کرتے
ان پر کچھ عجیب ماورائیت کا عالم طاری ہو گیا ایسا معلوم ہوتا تھا
جیسے خواب گراں سے کوئی یکایک جگا دے اور نگاہ کے سامنے سے کوئی
پردہ ہٹ جائے اسی اثناء میں ان کے سامنے دور جام آ گیا۔ اصغر نے
آبدیدہ ہو کر جام اٹھا لیا اور لوگوں کو مخاطب کر کے رقت آمیز لہجہ
میں کہا " دوستو ! گواہ رہنا۔ اصغر کا یہ آخری جام شراب ہے ۔ آج
سے وہ بے خوشی سے توبہ کرتا ہے ۔ خدا اسے معاف کرے اور اپنے عہد
پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے [۲]۔"

---

۱ ۔ ۲۔ چٹان لاہور شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء ، ص ۱۷ --- واقعہ توبہ کے راوی
کنور وشنو پرشاد ہیں ۔ یہ واقعہ انھیں کے گھر پر وقوع پذیر ہوا تھا۔ وہ چشم دید گواہ ہیں۔

جناب سید رشید احمد نے توبہ کا واقعہ موسم سرما ۱۹۱۲ء کی ایک شب کا لکھا ہے ۔ لیکن جس موضوع پر گفتگو کے دوران میں ماورائیت طاری ہونے کا ذکر کیا ہے ----- یعنی اقبال کے فلسفۂ اسرار خودی و رموز بے خودی وہ محل نظر ہے ---- اقبال کی مثنوی اسرار خودی پہلی بار ۱۹۱۵ء میں اور رموز بے خودی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تھی ۔ اس لیے " توبہ " کے وقت یا تو یہ موضوع زیر بحث نہیں تھے یا یہ واقعہ ۱۹۱۸ء کے بعد کا ہوگا ---- لیکن یہ واقعہ ۱۹۱۸ء کے بعد کا نہیں ہے ۔ کیوں کہ اصغر کی زندگی کے دوسرے واقعات[1] اور شواہد سے ۱۳-۱۹۱۲ء ہی کی تصدیق ہوتی ہے ۔

موضوع گفتگو پر اظہار شک کرتے ہوئے جب رشید صاحب سے رجوع کیا گیا تو انہوں نے تحریر فرمایا :

" جہاں تک زمان و مکان کے تعین کا سوال ہے ، اس حقیقت کو فراموش نہ کیجئے کہ یہ باتیں نصف صدی سے قبل کی ہیں اور ایک ایسے شخص کی ذات سے متعلق ہیں جس کی حیثیت اس وقت ایک خوش فکر و خوش باش انسان سے زیادہ نہ تھی اس لیے اس کی زندگی کے خاکے میں ماہ و سال کی قطعیت بڑی وثوق سے ممکن نہیں اور واقعات کے تھوڑے بہت آگے پیچھے ہو جانے کا امکان ہے تاہم میں نے ان کے تعین میں کافی احتیاط ملحوظ رکھی ہے[2] ۔"

لیکن سال کے تعین کے سلسلے میں انہوں نے اسی پر اصرار فرمایا اور لکھا :

" توبہ اور ترک ملازمت کا واقعہ ۱۳-۱۹۱۲ء کا ہے[3] ۔"

بالکل یہی بات انہوں نے جامعہ (دہلی) مئی ۱۹۶۷ء میں لکھی ہے :

" اصغر صاحب کا دور مے نوشی میرے ورود گونڈہ سے قبل ۱۹۱۲۱۳ء میں حسب بیان بابو کشور وشو ناتھ صاحب ختم ہو چکا تھا اور وہ اس سے تائب ہو کر ایک زاہد پاکباز کی زندگی بسر کر رہے تھے[4] ۔"

۱- (۱) مثلاً کنور صاحب نے اصغر کی مے نوشی کی ابتدا گونڈہ میں اپنی آمد (۱۹۰۹ء) سے سال ڈیڑھ سال پہلے کی بیان فرمائی ہے ۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ ۸-۱۹۰۷ء میں ابتدا ہوئی (۲) دوسری جگہ بصراحت فرماتے ہیں " قریب پانچ سال تک اصغر کا شغل مے نوشی جاری رہا ۔ اسطرح توبہ اور ترک شراب کا سال ۱۳-۱۹۱۲ء ہی درست ہے ۔ اسی کی توثیق رشید صاحب نے بعد میں بھی فرمائی (تفصیل آگے آئے گی) ۔

۲- مکتوب جناب سید رشید احمد بنام راقم مقالہ مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء ۔ ص ۲

۳- ایضاً

۴- جامعہ دہلی مئی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۲۰ بحوالہ جامعہ جون ۱۹۶۷ء ۔ ص ۳۳۲

رشید صاحب کا گونڈے میں ورود آغاز ۱۹۱۲ء میں ہوا - اس سے بھی یہ ثابت ہوتا[1] ہے کہ ۱۳-۱۹۱۲ء میں اصغر تائب ہو چکے تھے -

اس پر ایک دوسرے پہلو سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے - رشید صاحب نے کنور صاحب کے حوالہ سے ایک اور حلقہ شیشہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

" ۱۹۱۰ء کی ایک محفل شیشہ کا ذکر .... ہے اصغر جام پر جام لنڈھا رہے تھے - کنور صاحب نے اصغر کو مخاطب کر کے کہا ٹیگور کو گیتا نجلی لکھنے پر نوبل پرائز مل گیا - اقبال نے بانگ درا لکھی ہے لیکن اس کی ایسی قدر نہ ہوئی ....[2] "

کنور صاحب کے بیان بالا کا تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل واقعاتی تسامحات سامنے آتے ہیں :

(۱) وہ ٹیگور کو نوبل پرائز ملنے کا ذکر ۱۹۱۰ء میں کرتے ہیں جو غلط ہے --- ٹیگور کے نوبل پرائز کا اعلان ۱۳ نومبر ۱۹۱۳ء کو ہوا تھا -[3]

(۲) گیتا نجلی کے ساتھ بانگ درا کا ذکر کرتے ہیں --- بانگ درا پہلی بار ستمبر[4] ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی -

میرا خیال یہ ہے کہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۳ء کو جب ٹیگور کے نوبل پرائز کا اعلان ہوا[5] ہوگا تو چونکہ ہندوستانیوں کے لیے بہت بڑا اعزاز اور بہت بڑی رقم[6] تھی ، اس کا چرچا ہر محفل اور ہر مجلس میں ہوا ہوگا - چنانچہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۳ء کے بعد کی کسی تاریخ میں کنور صاحب سے کسی محفل میں ذکر آیا ہوگا ----- اس وقت اگرچہ بانگ درا نہیں شائع ہوئی تھی ، لیکن ان کی بعض بڑی معرکۃ الارا نظمیں منظر عام پر آ چکی تھیں اور اقبال ابھی

۱- جامعہ دہلی اپریل ۱۹۶۷ء - ص ۱۹۱

۲- چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۱۷

۳- خط جناب ایم اہرن (M. EHREN) سکریٹری نوبل فاؤنڈیشن مرقومہ ۸ فروری ۱۹۷۱ء بنام مقالہ نگار -- یہ انعام سویڈن میں متعینہ ، حکومت برطانیہ کے سفیر ایم کلاغیو نے وصول کیا تھا -- معارف نمبر ۱ جلد ۹ ۱۹۲۲ء - " نوبل پرائز " کے عنوان سے ایک طویل مضمون ہے جس کا متعلقہ حصہ نقل کیا جاتا ہے - " ایک مرتبہ ۱۹۱۲ء میں یہ وظیفہ ایک فرزند ہند (ٹیگور) کی قسمت میں اسکے ادبی کمالات کے اعتراف میں آ چکا ہے " ص ۶۵ - لیکن یہ خبر غلط ہے -

۴- اس کا اشتہار علی گڑھ میگزین اکتوبر نومبر ۱۹۲۴ء میں ان الفاظ میں دیا گیا تھا " علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹر ایٹ لا کے اردو کلام کا مجموعہ موسومہ " بانگ درا " چھپ کر تیار ہو گیا ہے ..... المشتہر شیخ طاہر الدین بازار انار کلی - لاہور "

۵- نوبل پرائز کا اعلان اکتوبر میں ہوتا ہے لیکن ۱۵ نومبر سے پہلے پہلے ---

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسلام دوستی اور ملی شاعری کی وجہ سے مسلمانوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے ------ ممکن ہے اس زمانہ میں اقبال اور ٹیگور کا موازنہ بھی نجی صحبتوں میں ہو چلا ہو (جیسا کہ بعد میں بہت ہوا) یا کم از کم اس صحبت خاص میں ان دونوں کی شاعری پر بحث چلی ہو ، جس میں نوبل پرائز کا ذکر بطور خاص آیا ہو --------- اسی کے قریب قریب کی کسی دوسری محفل میں ترجمہ کا واقعہ ظہور پذیر ہو چکا ہوگا ۔ کنور صاحب نے سہو و نسیان کی وجہ سے جو بڑھاپے کا خاصہ ہے ، خلط مبحث کر دیا ہوگا اور نادانستہ واقعات کے بیان کرنے میں ان سے تقدیم و تاخیر ہو گئی ہوگی --- واقعات کا دھندلا سا خاکہ -- اقبال ، ٹیگور ، نوبل پرائز یاد رہ گیا ہوگا باقی جزئیات و تفصیلات ذہن سے اتر گئی ہوں گی ۔ میرے اس خیال کو جناب سید رشید احمد کی تحریر سے بھی تقویت پہونچتی ہے جو انھوں نے مولانا مہر محمد خاں صاحب شہاب مالیر کوٹلوی کے جواب میں مراسلہ کی صورت میں جامعہ دہلی کو بھیجی تھی ۔ رشید صاحب تحریر فرماتے ہیں :

> " ان کے (کنور وشوداتھ پرشاد) خلوص نیت اور صداقت پر مجھے پورا اعتماد ہے ۔ وہ زندگی کے جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں سہو و نسیان کا وجود قدرتی امر ہے ۔ ان کے اور اصغر کے مخلصانہ تعلقات کا میں چشم دید شاہد ہوں .... ان کا دن رات کا ساتھ ۔ ان کے مابین اس قسم کے صدہا موضوع و مباحث معرض گفتگو میں رہے ہوں گے .... انھوں نے ان کی کوئی ڈائری مرتب نہیں کی تھی ہو سکتا ہے کنور صاحب کے ذہن میں گیتا نجلی اور بانگ درا سے مراد ٹیگور اور اقبال کی منظومات رہی ہوں .....![1] "

ان دلائل و شواہد کی روشنی میں یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ اصغر نے اکتوبر ۱۹۱۲ء تا فروری ۱۹۱۳ء (کہ سردیوں کا یہی زمانہ ہے --- بقول رشید صاحب سردیوں

(حاشیہ از گذشتہ صفحہ)

اور ۱۰ دسمبر کو رسمی طور پر تقسیم کئے جاتے ہیں ۔ بحوالہ مکتوب سکریٹری نوبل فاؤنڈیشن ۸ جنوری ۱۹۷۱ء

۲- ٹیگور کو سوا لاکھ روپے کی رقم ملی تھی --- بحوالہ زمانہ مارچ ۱۹۳۲ء ص ۱۳۲-۱۳۱ .... یہ رقم سویڈن کے سکہ رائج الوقت کے مطابق ۱۰ . ۵ ۱۴۳ تھی ، بحوالہ خط مسٹر ایم اھرن سکریٹری نوبل فاؤنڈیشن ۔ ۸ فروری ۱۹۷۱ء ۔

۱- مراسلہ سید رشید احمد ۔ عنوان " اصغر صاحب " جامعہ (دہلی) ستمبر ۱۹۶۷ ص ۱۲۷

کی ایک رات) کے درمیان کسی تاریخ میں توبہ کی ہوگی ۔ اس کی توثیق اس امر سے بھی ہو جاتی ہے کہ اصغر نے شراب سے توبہ اور ترک ملازمت ساتھ ساتھ کی ۔ ترک ملازمت کا سال رشید صاحب ۱۳-۱۹۱۲ء لکھتے ہیں ۔ اس سلسلے میں رقمطراز ہیں :

" ترک ملازمت کا سال ۱۳-۱۹۱۲ء ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔[۱] "

دوسری جگہ ترک ملازمت اور توبہ دونوں کی تاریخ کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" ترک ملازمت اور توبہ کا سال ۱۳-۱۹۱۲ء ہے۔[۲] "

اس طرح اصغر کا دور رندی و سرشاری جو اواخر ۱۹۰۷ء یا اوائل ۱۹۰۸ء میں شروع ہوا تھا ، ۱۳-۱۹۱۲ء میں ۵ سال بعد توبہ پر ختم ہوا ۔

(۲) غصہ اور تندمزاجی :

اصغر کی قلمی تصویر ادھوری اور نامکمل رہ جائے گی اگر ان کی طبیعت کی رندی و تندی اور غضبناکی کا ذکر نہ کیا جائے جو بعض صورتوں میں جذباتیت اور غضباتیت پر منتج ہو جاتی تھی ۔ انتہائے شباب میں تو اصغر کی غصہ ور طبیعت نے بعض انتہائی مکروہ اور غیر شائستہ صورتیں اختیار کر لی تھیں ، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب ان کے جذبات کا ارتفاع ہوا اور انھوں نے اپنی پر معصیت زندگی سے توبہ کرلی ، تو طبیعت کی اس تندی نے ، ہر غلط رویے اور بے اصولی کے خلاف احتجاج کیا ۔ اب غصہ ان کو اصول اور حق کی پامالی پر آتا تھا کہ یہ مومن کا خاصہ ہے ـــ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا / مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ۔[۳] .... انھوں نے غصہ کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا ۔

جو کچھ اوپر مذکور ہوا اس کی شہادت میں سید رشید احمد صاحب کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

"اصغر باوجود اپنی متانت و سنجیدگی اور زہد و تقویٰ کے اپنے شباب کے زمانے میں ایک غصہ ور اور تند مزاج انسان تھے[۴] ....

۱۔ مکتوب جناب سید رشید احمد بنام مقالہ نگار مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء

۲۔ مکتوب جناب سید رشید احمد بنام مقالہ نگار مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۷ء

۳۔ محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے صحبت یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں تیز (سخت) ہیں اور آپس میں مہربان ہیں ـــ الفتح ۔ آیت نمبر ۳۰ ــــ ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی ۔ قرآن شریف مترجم ۔ مطبوعہ حاجی ملک دین محمد اینڈ سنز پل روڈ کشمیری بازار ۔ لاہور ۱۹۳۹ء ۔ ص ۴۲۲

۴۔ مسودہ جگر صاحب از سید رشید احمد ۔ ص ۸

"........ جن ایام میں وہ .... جرول روڈ اسٹیشن پر بطور ٹائم کیپر کام کرتے تھے .... کام ختم کر کے سہ پہر یا شام کی ٹرین سے گونڈہ اپنے گھر چلے آتے تھے - ریلوے کے تقریباً سارے ملازمان ان سے واقف تھے .... کبھی منٹ دو منٹ کی دیر ہو جاتی تو گارڈ و اسٹیشن ماسٹر وغیرہ انتظار کر لیتے تھے .... ایک بار ٹرین پر کوئی ایسا گارڈ چل رہا تھا جو اصغر سے واقف نہ تھا - ٹرین چھوٹنے کا وقت ہو گیا تھا - اصغر .... دوڑے ...... اور ٹرین روکنے کے لئے اشارہ کرتے ہوئے .... پلیٹ فارم پر آئے - گارڈ نے جھنڈی ہلا دی اور ٹرین چل کھڑی ہوئی - اصغر دوڑ کر .... اگلے ڈبے (سامنے والے ڈبے) میں سوار ہوئے تو گارڈ نے .... روک لیا .... اصغر ڈبے میں سوار نہ ہو سکے - ٹرین رواں رہی جب گارڈ کا بریک وین (BRAKE VAN) آیا تو گارڈ لپک کر اس میں سوار ہونے لگا- اب .... اصغر نے جھپٹ کر اسے .... روک لیا اور .... سوار نہ ہونے دیا -.............. اصغر اور گارڈ میں آویزش ہونے لگی - گارڈ نے جھنڈی کو اپنا حربہ بنایا - اصغر نے لپک کر پلیٹ فارم پر پڑے گنے کے ایک بوجھ سے* ایک موٹا سا گنا گھسیٹ کر وہیں گارڈ کی تواضع شروع کر دی - اصغر .... اس محاربے میں گارڈ پر بھاری پڑ رہے تھے - میدان اصغر کے ہاتھ رہا .... ٹرین بغیر گارڈ کے مال گودام کے آگے نکل کر کھڑی ہوگئی - انجام کار اسٹیشن ماسٹر وغیرہ نے کسی طرح گارڈ کو بمشکل تمام سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کیا اور دونوں کو ملا دیا - اصغر اسی ٹرین سے اپنے گھر گونڈہ واپس ہوئے"[1]

---

*- یوپی کے مشرقی اضلاع (گونڈہ ، بہرائچ وغیرہ) میں گنے کی بہت کاشت ہوتی ہے اور مال گاڑیوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ برابر منتقل ہوتے رہتے ہیں -

۱- مسودہ جگر صاحب از جناب سید رشید احمد - ص ۱۰-۹

رشید صاحب نے اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ لکھا ہے جو درج ذیل ہے :

" اصغر کے محلے میں ایک بندر[1] بہت لاگو تھا ۔ ان کے گھر پر
اکثر چھاپہ مار کر چیزیں اٹھا لے جاتا تھا ....
ایک دن اصغر آنگن میں چارپائی پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے ۔
یکایک وہ بندر چھت سے کودا ۔ کھانے کے دسترخوان سے کچھ اڑا
کر لے جانا ہی چاہتا تھا کہ اصغر نے جھپٹ کر بڑی حکمت سے
اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور ٹانگ سے اس کے پنجوں کو دبا کر،
دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ کر ، اس کا کلہ پھاڑ ڈالا "[2]

لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے ، جب اصغر نے توبہ کی تو انھوں نے اپنے نفس سرکش کو بھی طرح ضبط و قابو میں رکھا ۔ توبہ کے بعد ان کی زندگی میں اس طرح کی "بے لگامی " نظر نہیں آتی ۔

بیعت :

واقعہ توبہ ان کی شاہ راہ زندگی میں ایک ایسا مقام ہے جسے " برزخ " سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ---- جس کے ایک طرف گزشتہ زندگی کی عیش و کامرانی کی جنت نشانی ، دوسری طرف ترک و تقویٰ کی پرصعوبت دوزخ بداماں نظر آتی ہے ---- اس مسافر کی طرح جو چلتے چلتے ایک ایسے نقطہ پر ٹھٹک جائے جہاں اسے اپنی سمت اور منزل کا یقین نہ ہو اور عالم حیرانی میں کبھی پیچھے نظر دوڑائے ، کبھی آگے لیکن یہ نہ طے کر پائے کہ کس طرف جانا ہے ---- آخر غم غلط کرنے اور تھکن اتارنے کے لئے فضا کی معصوم رنگینیوں سے دل بہلانے لگے ---- اصغر اسی مقام توبہ پر آ کر ٹھٹک گئے تھے ۔ ڈھائی تین سال کا دور (اوائل ۱۹۱۳ھ تا وسط ۱۹۱۵ھ یعنی واقعہ بیعت تک) ان کی زندگی کا برزخی دور تھا ۔ جہاں ان کی بساط خانہ کی دوکان پر یار دوستوں کے قہقہے اور چہچہے گونجتے ، شعر و شاعری کی محفلیں جمتیں اور ادبی مناظرے اور مباحثے ہوتے ---- ابھی ان کی زندگی کو نیا موڑ نہیں ملا تھا ، سمت متعین اور واضح نہیں ہوئی تھی ، نصب العین کا تعین نہیں ہوا تھا اور اسکے حصول کے لیے عزم و یقین پیدا نہیں ہوا تھا ---- اصغر کی

۱- یوپی کے اضلاع فیض آباد ، بارہ بنکی ، گونڈہ وغیرہ میں بندر بہت ہیں ۔ ریلوے اسٹیشنوں پر مارے مارے پھرتے ہیں ۔ ذرا سی غفلت ہو جائے تو مسافر کے ہاتھ سے مٹھائی کا دونا وغیرہ لے کر بھاگ جاتے ہیں ۔

۲- سودۂ جگر صاحب از سید رشید احمد ۔ ص ۱۰

زندگی کو یہ نیا رخ ، یہ روشن سمت ، یہ اعلیٰ نصب العین اور بلند نظریۂ حیات اور اس کے حصول کے لئے عزم و یقین ، ان کے مرشد ، قاضی عبدالغنی منگلوری رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ سے ملا ۔

قاضی صاحب تک جناب اصغر کی رسائی کیسے ہوئی؟ ان کی پہلی ڈرامائی ملاقات کی تفصیل جناب صغیر احمد صدیقی نے یوں بیان فرمائی ہے :

" ایک دن جب اصغر نے محسوس کیا کہ جسمانی آسودگی روح کی تشنگی کو ناقابل برداشت حد تک تیز کر چکی ہے تو وہ سب کو چھوڑ چھاڑ بلا اطلاع شیخ کی تلاش میں روانہ ہو گئے ۔ یہ سراغ میں تھے ۔ شیخ محمد عمر صاحب کے جو قاضی عبدالغنی صاحب کے پیر بھائی تھے اور تھانہ بھون میں رہتے تھے ۔ مرادآباد پہنچ کر جو انھوں نے لوگوں سے پتہ پوچھا تو انھوں نے قاضی صاحب کی طرف اشارہ کیا کہ یہ شیخ محمد عمر رح کا صحیح پتہ بتا سکیں گے ۔ قاضی صاحب پلیٹ فارم کے ایک گوشے میں نماز پڑھ رہے تھے یہ ان سے پتہ پوچھ کر اپنی گاڑی کے ڈبہ میں آ کر بیٹھ گئے ۔ کوئی چیز خرید کر پیسے گن رہے تھے جو کچھ ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ فارم پر گر پڑے ٹھیک اسی وقت قاضی صاحب ادھر سے گذرے ۔ انھوں نے نہایت بے تکلفی سے کہا ذرا میرے پیسے اٹھا دیجئے ۔ قاضی صاحب رح نے نہایت فراخ دلی سے یہ خدمت انجام دی ... . اور خود بھی اسی ڈبہ میں آ کر بیٹھ گئے ۔ گاڑی جب رڑکی پہونچی تو قاضی صاحب اتر پڑے اور ساتھ ہی اصغر صاحب بھی ۔ قاضی رح صاحب نے کہا بھی کہ آپ کو تو آگے جانا ہے مگر اصغر نے کہا کہ میں نے ارادہ بدل دیا ہے آپ کے ساتھ چلوں گا۔ قاضی صاحب رح نے اسی وقت اپنے ایک مرید تہور علی صاحب[*] تحصیلدار گونڈہ کو تار دیا کہ تفضل حسین صاحب کو مطلع کر دیں کہ ان کا

---

*۔ تہور علی صاحب گونڈہ میں تحصیل دار نہیں تھے ۔ ان کے متعلق رشید صاحب نے اپنے مکتوب مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ھ میں تحریر فرمایا " گونڈہ میں تہور علی نام کے کوئی تحصیلدار نہیں تھے البتہ تہور علی صاحب (طلوگ) ایک وکیل ضرور تھے ...... جو مذہبی رحجانات کے آدمی تھے ۔ غالباً قاضی عبدالغنی صاحب رح سے بیعت بھی تھے ـــ تقسیم ملک کے سلسلے میں وہ کراچی چلے گئے کچھ عرصہ ہوا میں نے سنا کہ وہ پاکستان میں انتقال کر گئے "

لڑکا میرے پاس آ گیا ہے .... اصغر مرحوم نے
قاضی عبدالغنی صاحب رحہ کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ یہی وہ
واقعہ اور نقطہ ہے جہاں سے اصغر کی زندگی مڑتی ہے قطعی
طور پر اور ہمیشہ کے لیے .... اصغر کی زندگی
بدل گئی ان کی شخصیت نے ایک نیا جامہ پہنا اور اپنی عمر
کے آخری لمحہ تک وہ ہر حیثیت سے اور ہر معاملہ میں ایک
صاحب ذوق و حال رہے[1] ۔"

اس واقعہ کی تصدیق کسی اور ذریعہ سے نہیں ہو سکی تاہم اس کو جھٹلانے کا کوئی جواز نہیں ۔ خصوصاً جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جناب صغیر صدیقی[2] اصغر کی زندگی کے آخری تین سال (۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۶ء) ان کے قریب رہے ہیں ۔ ممکن ہے کہ یہ واقعہ انھوں نے اصغر ہی کی زبانی سنا ہو ـــ لیکن اس کے باوجود جب اس بیان کا تنقیدی تجزیہ کیا جاتا ہے تو اس میں بعض واقعاتی اغلاط اور تسامحات نظر آتے ہیں ۔

(۱) مثلاً یہ فرمانا کہ اصغر شیخ محمد عمر رحہ صاحب کی تلاش میں نکلے تھے ، درست نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ شیخ محمد عمر رحہ صاحب کا انتقال[3] ۱۹۰۱ء میں ہو چکا تھا اور اصغر بیعت کے لیے کم از کم ۱۲، ۱۳ سال بعد گئے ہیں ۔

(۲) بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ اصغر کو شیخ محمد عمر صاحب رحہ کے انتقال کا علم نہیں تھا تو یہ کیسے کر تسلیم کر لیا جائے کہ قاضی صاحب کو بھی جو ان کے پیر بھائی اور قریب ہی کے رہنے والے تھے ، اس بات کا علم نہیں تھا وہ بھی ۱۲، ۱۳ سال

۱۔ نقوش شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۸۳-۱۳۸۳

۲۔ صغیر احمد صدیقی نے ۱۹۳۲ء میں الہ آباد سے ایم اے اردو میں کیا ۔ ۱۹۳۶ء تک اصغر سے راہ و رسم رہی ۔ صدیقی صاحب یوپی گورنمنٹ میں محکمۂ تعلیم سے منسلک ہوگئے تھے ۔ مقالہ نگار کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے دسمبر ۱۹۶۸ء میں ریٹائر ہوگئے اور اب مسلم یونیورسٹی کالجیٹ اسکول علی گڑھ میں پرنسپل ہیں بڑے منکسر المزاج بزرگ ہیں ، اصغر کے شیدائیوں میں ہیں ، ان پر بہت سے مضامین لکھے ۔ لیکن افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ باوجود اس عقیدت و محبت کے جو موصوف کو اصغر سے ہے ، انھوں نے میرے کسی خط کا جواب نہیں دیا ۔ نہ اس واقعہ کے متعلق کچھ روشنی ڈالی کہ انھوں نے کہاں سے سنا ۔

۳۔ رسالہ تحقیق وحدۃ الوجود والشہود ۔ مرتبہ و مطبوعہ شاہ الحق صدیقی ۔ ص ۸۶ ۔
یہ رسالہ حضرت شیخ محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے ۔ شیخ محمد رحہ کے صاحبزادے شیخ محمد عمر رحہ کے صاحب تھے جو جناب شاہ الحق صدیقی صاحب کے حقیقی نانا تھے ۔ شیخ محمد کے خلیفہ حضرت قاضی محمد اسمعیل رحہ تھے ، انھیں کے صاحبزادے اور مرید حضرت قاضی عبدالغنی صاحب منگلوری تھے اور حضرت شیخ محمد عمر صاحب کو انھیں سے بیعت تھی ۔ اسطرح شیخ محمد عمر اور قاضی عبدالغنی منگلوری پیر بھائی اور خواجہ تاش تھے ۔

گزر جانے کے بعد ، اور جب اصغر نے ان سے شیخ محمد عمر صاحب کے متعلق پوچھا تو
انھوں نے بتا دیا اور اصغر اطمینان سے آ کے گاڑی میں بیٹھ گئے -

میرے خیال میں اصغر نے قاضی صاحب سے تھانہ بھون کا پوچھا ہوگا چنانچہ
قاضی صاحب نے کہہ دیا ہوگا کہ یہ جو گاڑی کھڑی ہے یا آ رہی ہے وہی جائے گی ، اس
پر وہ آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے ہوں گے (اس خیال کو یوں بھی تقویت پہونچتی ہے کہ ایک
نماز پڑھتے ہوئے شخص سے طول طویل گفتگو کا نہ موقع ہوتا ہے نہ کی جاتی ہے) اسکے بعد
جب قاضی صاحب گاڑی میں آ کے بیٹھ گئے ہوں گے اور تفصیلی گفتگو ہوئی ہوگی ، اصغر نے
تھانہ بھون جانے کی غایت بتائی ہوگی تو یقیناً قاضی صاحب نے شیخ محمد عمر صاحب کے
انتقال کے متعلق بتایا ہوگا - دوران گفتگو میں ممکن ہے اصغر کو قاضی صاحب کا بھی علم
ہو گیا ہو ، ان کے اخلاق سے پہلے ہی متاثر ہو چکے تھے (قاضی صاحب نے بڑی خندہ
پیشانی سے روز گاری اٹھا کر اصغر کو دے دی - ممکن ہے اس واقعہ سے بعد میں ان پر
احساس ندامت بھی طاری ہوا ہو) ، نام سن کر چونکے ہوں اور وہ باتیں جو قاضی صاحب
کے متعلق انھوں نے حکیم عبدالباری[۱] انصاری صاحب یا تہور علی صاحب سے سنی ہوں ، ایک
ایک کر کے یاد آ گئی ہوں ، قاضی صاحب کے اخلاق ، طرز گفتگو اور سب سے بڑھ کر ان کی
ظاہری حسین اور دلکش شخصیت نے ان کو متاثر کیا ہو ، ادھر شیخ محمد عمر صاحب کے
انتقال کا علم ہو ہی چکا تھا .... اثنائے سفر ہی میں یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ قاضی
صاحب ہی وہ ہستی ہیں جن کی انھیں تلاش تھی - چنانچہ جب قاضی صاحب اترنے لگے
ہوں تو یہ بھی اتر پڑے ہوں اور ساتھ ہو لئے ہوں اور گھر پہنچ کر ان سے بیعت کرلی ہو-

اور اصغر کی گرویدگی کا ایک سبب قاضی صاحب کی پرکشش ، حسین اور دلکش
شخصیت کو بھی ٹھہرایا گیا ہے اس خیال کو اس بات سے تقویت پہونچتی ہے کہ اصغر کی
فطری نفاست پسندی اور رنگینی جو انھیں باپ کی وضع قطع میں ڈھلی ہوئی نظر آئی تھی
جسے آگے چل کر انھوں نے اپنا لیا تھا[۲] ، اس کی شبیہہ قاضی صاحب کی ظاہری شخصیت کے
آئینے میں نظر آئی ، اس میں انھوں نے اپنے لئے سامان نظر ، تسکین ذوق اور معیار حسن

۱- حکیم عبدالباری انصاری اصغر کی دوکان پر آ کر بیٹھتے تھے اور ان مباحث میں حصہ
لیتے تھے جو وہاں ہوتے تھے اور بقول رشید صاحب اپنے کتابی علم کے ذریعہ تھوڑی دور
اصغر کے ساتھ چلتے تھے بعد میں ان کی راہ ترکستان کو نکل جاتی تھی (چٹان شمارہ
۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۲۰)

۲- چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۷

پایا ہوگا ۔ چنانچہ وہ اس سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ بقول جناب صغیر احمد صدیقی ان کی اس صفت کا اکثر ذکر کرتے[1] ۔۔۔۔ بعد میں اصغر کے اس وصف کا وہاں ارتفاع اور جلا ہوئی جس کی طرف جناب صغیر احمد صدیقی نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے :

" میرا خیال ہے کہ جو نفاست اصغر کی شخصیت میں تھی وہ بھی قاضی صاحب کا طفیل تھا[2] "۔

اس دعوے کی وضاحت کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب کی ظاہری شخصیت اور باطنی اوصاف یہاں بیان کئے جائیں ۔

اس سلسلے میں جناب جلیل احمد قدوائی رقمطراز ہیں :

" ان کی شخصیت میں بڑی کشش تھی اور خوش رو تھے ۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ ان کی آنکھوں میں موہنی تھی اور یہ سورۂ مزمل کے ورد کا اثر تھا ۔ بڑا گول سر ، گھونگھریالے بال ، سر پر پٹے اور فراخ چہرہ ، کشادہ مشین پیشانی اور اسی کے متوازن مضبوط جبڑا بھری ہوئی بلکہ گھنی خوش قطع داڑھی ، میانہ قد ، گٹھا ہوا بدن ، ململ کا لانبا کرتا ، دوپلی ٹوپی مثلثی پاجامہ ۔

بڑے اولوالعزم اور دنیاوی معاملات میں بے حد ہوش مند تھے ۔ کسی معاملے میں کسی سے پیچھے رہنا گوارا نہ تھا ۔ ذاتی انضباط کے ساتھ دوسروں کو ضبط میں رکھنے کا ملکہ تھا ۔ جھگڑوں میں جھگڑ جیت تھے حریفوں سے للکار اور دھڑلے کا رویہ ہوتا مگر ان میں جمالی شان بھی تھی عزیزوں اور چھوٹوں سے ملاطفت سے پیش آتے[3] "۔

بہت سے اصغر کی سیرت و کردار کا کیوں کر ارتفاع ہوا ، قاضی صاحب رح کی صحبت میں انھوں نے کیا پایا ، ان سے اصغر کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی ، اس سے ان کی عام زندگی پر کیا اثر پڑا ؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کو اگر حل نہ کیا جائے تو اصغر کے سوانح حیات تشنہ رہ جاتے اور ان کی شخصیت کی تصویر ادھوری اور نامکمل رہ جاتی ۔

۱۔ نقوش شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۲۸۵
۲۔ ایضاً
۳۔ العلم کراچی ، اپریل تا جون ۱۹۶۳ء ۔ ص ۸۶-۸۵

اس لیے سطور آئندہ میں انھیں سوالات کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

استادی و شاگردی یا پیری و مریدی کا رشتہ بھی عجیب رشتہ ہوتا ہے کہ نسل ، قوم ، قبیلہ اور خاندان کا دخل نہ ہونے کے باوجود ، خون کے رشتہ پر بھاری ، اور اس سے زیادہ محکم اور مضبوط ہوتا ہے ۔ اصل میں اس رشتہ کی تمام تر بنیاد اخلاق و روحانیت پر ہوتی ہے ۔ جتنا کسی استاد یا مرشد کے باطنی صفات و اوصاف ، اخلاق و اعمال میں جلوہ گر ہو کر اسکی شخصیت کو پرکشش بناتے ہیں اتنا ہی شاگرد اور مرید کا میلان استاد اور مرشد کی طرف بڑھتا جاتا ہے ۔ یہی میلان رفتہ رفتہ گرویدگی ، عقیدت و محبت اور والہانہ شیفتگی سے گزر کا عشق کے درجہ تک پہونچ جاتا ہے ۔ پھر مرشد میں جتنی زیادہ قوت جذب اور مرید میں جتنی زیادہ صلاحیت و استعداد اثر پذیری ہوتی ہے اسی کے بقدر وہ اس کو اپنی طرف کھینچتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرید ہر اعتبار سے مرشد کے رنگ میں رنگتا چلا جاتا ہے یا بقول اصغر ع

حسن پر فدا ہو کر حسن کی ادا بن جاتا ہے

اس نقطہ نظر سے اگر اصغر کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب رح سے ان کی شیفتگی اور فریفتگی روز بروز بڑھتی ہی رہی یہاں تک کہ وہ بالکل قاضی صاحب کے رنگ میں رنگ گئے ۔ صفیر احمد صدیقی صاحب کا قول اس سلسلے میں نقل کیا جا چکا ہے اب مجاہد کاظمی[1] صاحب کی تحریر ملاحظہ فرمائیے ۔ وہ لکھتے ہیں

" عجیب بات یہ تھی کہ ان کے قریبی مرید جو ان کی خدمت میں رہتے تھے کچھ عرصہ بعد ان کے ہم شکل ہو جاتے تھے ۔ اصغر گونڈوی میں ان کی کافی مشابہت تھی ۔ اور ان کی عزت بھی کرتے تھے ۔ فارسی کے اشعار اصغر کی زبانی سنتے اور سبحان اللہ کہتے تھے ۔ اصغر سے ایک دفعہ کہا تھا " ہمارے رنگ میں شعر کہو گے تو ہماری سمجھ میں آئیں گے اور واقعی شاعر کہلاؤ گے " یہ پیر و مرشد ہی کی صحبت کا اثر تھا کہ اصغر معرفت کی طرف آئے[2] ۔"

---

۱ ۔ مجاہد کاظمی صاحب قاضی صاحب کے قریبی رشتہ داروں میں ہیں ۔ حکومت پاکستان میں ڈپٹی پرسنل اطارمیشن آفیسر تھے (۱۹۶۲ء) ۔ بحوالہ العلم کراچی ، اپریل تا جون ۱۹۶۲ء ۔ حاشیہ ص ۸۳

۲ ۔ ایضاً حاشیہ ص ۸۵ ۔ ایک ذاتی تحریر جناب مجاہد کاظمی ۔

ظاہری مشابہت کی شہادت مل گئی اب ذرا باطنی اصلاح کی کیفیت جناب سید اسداللہ کاظمی[1] کی زبانی سنیے ۔ وہ رقمطراز ہیں :

" اصغر کو اپنے مرشد سے گہرا تعلق تھا ۔ اتنا گہرا کہ ان کی تمام کائنات کو اس نے بدل ڈالا تھا .... یہ تعلق روز افزوں ہوتا رہا ۔ راقم الحروف نے اکثر اصغر کو دیوانہ وار اپنے مرشد کے حضور میں اس انداز سے آتے دیکھا ہے کہ چہرے پر یاس کا گہرا رنگ ، دل و دماغ پر ایک ثقل و بے کیفی طاری ، تخیل سست و پاشکستہ ، اور کچھ دن کی حضوری کے بعد چہرے پر زندگی کی حرارت کا غازہ ، دل و دماغ پر ایک کیفِ سرمدی ۔ تخیل میں بلند پروازی و رعنائی ۔ غرض اصغر کی ساری دنیا جاگ اٹھتی تھی اور ان کی معمولی سی حرکت میں ایک انداز صد دلربائی ان کی ادنیٰ سے اشارے میں ایک پر بہار رنگینی معلوم ہوتی تھی ۔ "

" اس تعلق نے اصغر کو ایک طرف تو اپنی صلاحیتوں سے باخبر بنا کر ان کو خوددار ، باوقار اور صاحب تمکین بنا دیا دوسری طرف ان کی ذات کو روشن کر کے اس میں ایک ایسا ذوق ، ایسا جوش و خروش ایسا سوز و گداز بھر دیا جس نے ان کی روح کو بیدار کر دیا ۔ اس کے علاوہ ان کے مزاج کی وہ رنگینی بھی جو مذاق سلیم پر کبھی گراں نہیں گزرتی جسکی ہر ادا ، ہر انداز پر ہزار تمکین و وقار قربان کئے جا سکتے ہیں ، اسی تعلق کا ایک کرشمہ تھی[2] ۔ "

اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ قاضی صاحب کی طبیعت میں جلال و جمال دونوں ممزوج تھے ۔ اگر اس میں ایک طرف آفتاب نصف النہار کی حرارت و تمازت تھی تو دوسری طرف طباشیر صبح کی خنکی و لطافت ۔ ایک طرف طوفانوں کا جوش و خروش تھا تو دوسری طرف جوئے سبک رفتار کی نغمہ خوانی ، ایک طرف فولاد کی سختی و صلابت تھی تو دوسری

۱۔ جناب سید اسداللہ کاظمی ۔ قاضی صاحب کے بہت قریبی رشتہ داروں میں ہیں ۔ (غالباً بھتیجے) یوپی گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیمات میں ڈائرکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ۔

۲۔ العلم کراچی ، اپریل تا جون ۱۹۶۲ء ۔ حاشیہ ص ۸۲ ۔ اصغر کی شاعری میں روایات حال و قال از سید اسداللہ کاظمی ۔ اصغر مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۶۳-۶۲

طرف حریر و پرنیاں کی نرمی و ملائمت ۔ جلال و جمال کی اس دھوپ چھاؤں نے ان کی شخصیت کو بڑا حسین و دلکش بنا دیا تھا ۔ مگر بحیثیت مجموعی ان کے یہاں جلال غالب تھا ۔ دھوپ ہی دھوپ تھی ، کہیں کہیں سایہ نمودار ہو جاتا تو اس متضاد فضا میں اسکی ٹھنڈک ایسی ہوتی جیسے جیٹھ بیساکھ کی چلچلاتی دھوپ میں بڑ کی گھنیری چھاؤں جسکی خنکی دور تک کلیجہ میں اترتی چلی جائے ۔ اسکے برعکس اصغر کے مزاج میں ، رندی و سرشاری کے ابتدائی دور کے بعد "، جمال غالب آ گیا تھا ۔ چھاؤں ہی چھاؤں اگر کہیں دھوپ چمک جاتی تو ایسی ہی دلکش ہوتی جیسے ساون کے گھنے بادلوں میں قوس قزح یا کاتک کی پوزماشتی میں مولسری کے چھتنار درخت سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی ـــ بھیگی بھیگی لطیف و فرحت بخش طبائع کے فرق و اختلاف نے اصغر کو قاضی صاحب کی کیفیت جمال کی طرف متوجہ کیا اور انھوں نے ان سے صرف شان جمال لی ۔ وہی چھوٹوں کے ساتھ شفقت و ملاطفت کا برتاؤ ، وہی دل داری و دل نوازی کا رویہ اور وہی اغماض و چشم پوشی کا سلوک ـــ اگر جلال کی کوئی ادا اپنائی ۔ مثلاً الوالعزمی اور ذاتی انضباط کے ساتھ دوسروں کو ضبط میں رکھنے کا سلیقہ تو وہاں بھی جلال کی تیزی و جارحیت کو جمال کی نرمی ورافت میں بدل کر ـــــــ غرض یہ کہ اصغر نے قاضی صاحب سے قدم قدم پر اکتساب فیض کیا لیکن اپنی مزاجی انفرادیت کو قائم و برقرار رکھا ـــــ وہی چیزیں اخذ و قبول کیں جو ان سے طبعی مناسبت رکھتی تھیں ۔

اگر روحانیت نام ہے شخصیت کی مقناطیسیت کا یعنی اپنی رفتار و گفتار سے دوسروں کو گرویدہ بنا لینے کا اور اپنے اقوال و اعمال سے دوسروں میں نیکی ، تقویٰ ، اعلیٰ اخلاق ، جذبۂ عبودیت و عبادت اور رجوع الی اللہ کی تشویق و تحریص کا ـــ تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اصغر بہت بڑے روحانی انسان تھے ۔ وہ اپنے اخلاق و عمل سے دوسروں پر ایسا خاموش اثر ڈالتے کہ دوسرے کی تربیت اور تہذیب نفس ، غیر محسوس طریقہ پر ہوتی جاتی۔ انھوں نے نہ معلوم کتنے گم کردہ راہ لوگوں کو صحیح راستہ پر لگایا (یہاں صرف ان کی سسرال والوں کی مثال کافی ہوگی) کتنے دہریوں کو خدا کا قائل ، کتنے بے نمازیوں کو نمازی، بدعقیدہ لوگوں کو راسخ العقیدہ اور حیواں نما انسانوں میں اعلیٰ انسانی اخلاق پیدا کر کے انسان بنا دیا ۔ اس کی تصدیق جناب سراج الحق صاحب مچھلی شہری کی عبارت ذیل سے ہوتی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

" رسم پیری مریدی اُن کی سلیم الفطرتی اور خوش مذاقی کے خلاف تھی
اس لیے انھوں نے دوکان داری پیری مریدی کا ڈھونگ تو نہیں رچایا

مگر حالات یہ تھے کہ دو چار ملحد و بدعقیدہ حضرات ان کے
یہاں آ کر شائق بن گئے ، کتنوں کو دین سے زیادہ لگاؤ پیدا
ہوا ۔ ان کے ملنے والے ہندو اور عیسائی بھی تھے اور بڑے
علم و یقین میں وہ لوگ بہت ستھرے اور سدھرے ہوئے انسان
تھے ۔[۲]"

جناب جگر تو خیر اپنی تربیت و اصلاح کو اصغر کی روحانی تصرف کا نتیجہ کہتے ہی تھے اور یہ اتنی کھلی ہوئی بات ہے کہ اسکے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں ۔ البتہ مولانا سراج الحق صاحب کا تاثر بھی یہی ہے ۔ وہ رقمطراز ہیں :

" احسان یہ ہے کہ انھوں نے میری اصلاح میں واقعی شیخ کا سا
کام کیا ۔ واقعی وہ غیر محسوس شیخ تھے اور میں ان کا غیر ارادی
مرید ۔ اعمال دین کی طرف رغبت ، معلومات دین میں وسعت ،
نظر و حوصلہ میں رفعت مجھے اصغر ہی کے طفیل ملی ۔ میں
بے راہ روی اور موجود احساس دینداری کے برزخ اصغر ہی تھے ۔
میں اصغر سے نہ ملتا تو یہ تو معلوم نہیں کہ کیا بنتا اور کیا ہوتا
مگر اتنا یقینی ہے کہ یہ نہ ہوتا جو ہوں ۔ پھر تو شاید میں
عالمان ربانی کی طرف بھی نہ جھک سکتا ۔ جس کی اب بحمداللہ
توفیق ہوگئی ہے ۔[۳]"

اصغر صاحب ذوق و حال ، اہل دل اور صاحب کشف و کرامات تھے یا نہیں ۔ یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے ۔ اسکے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے تاہم معاصرین کی تحریروں میں بعض واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے ان کے صاحب باطن ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً" جگر صاحب نے اصغر صاحب سے اپنی ایک ملاقات کا تاثر ، جناب ناطق جے پوری سے ان

۱۔ ان میں سے ایک علی ظہیر صاحب برادر خورد جناب علی امیر ، ممبر پبلک سروس کمیشن یوپی الہ آباد کے چھوٹے بھائی کو میں جانتا ہوں ، جو بڑے آزاد مزاج ، کھلنڈرے اور دین کی طرف سے بے پرواہ تھے ۔ مگر جب اصغر کی صحبت سے فیض یاب ہوئے تو طبیعت پر دین کا ایسا غلبہ ہوا کہ عبادت و ریاضت میں غرق رہنے لگے ۔ یہاں تک گھر کی نامحرم مستورات سے پردہ کرنے لگے ۔ بروایت سید حسن امیر ولد جناب سید علی امیر ـــ حسن امیر صاحب بیسک ٹریننگ سنٹر الہ آباد میں راقم الحروف کے رفیق کار تھے ۔ علی ظہیرصاحب سے بہت متاثر تھے ، صوم و صلواۃ کے بڑے پابند تھے حالانکہ پہلے ان چیزوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا)

۲۔ اصغر ۔ مرتبہ عبدالشکور ۔ مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۳۵ء ۔ ص ۲۷

۳۔ ایضاً ۔ ص ۲۹

الفاظ میں بیان کیا ہے :

" ایک روز میں حضرت اصغر گونڈوی کے پاس ان سے ملنے کے لئے گیا جو ایک صاحب سے بحث کر رہے تھے ۔ میں دلچسپی نے دور ہی سے مجھے اس بحث کو سننے کے لئے روک لیا ۔ میں قریب کھڑا ہوا اس طرح کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکیں ۔ تمام بحث سنتا رہا ۔ عجیب بات یہ تھی کہ حضرت اصغر سمجھا رہے تھے اسے اور میرے دل میں کانوں کے ذریعہ ہر ایک بات اترتی جاتی تھی ۔ ایسا وقت بھی آیا کہ جو شبہات میرے دل میں تھے ، میں نے سوچے اور تھوڑی دیر کے بعد ہی وہاں سے جواب ملا ۔ وہ وقت مجھے یاد ہے جب میں تھوڑی دیر میں راسخ العقیدہ حنفی ہو گیا ۔ حضرت اصغر کے پاس سے وہ صاحب چلے گئے تو میں حاضر ہوا اور ماجرا بیان کرکے رونے لگا ۔ جب میری کچھ بھڑاس نکلی تو میں نے چاہا کہ ان سے بیعت ہونے کی خواہش کروں ۔ میرے دل میں یہ خیال آنا تھا کہ انھوں نے باتوں باتوں میں مجھے اپنے پیر طریقت کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا کہ جو تم چاہتے ہو وہ وہاں سے دستیاب ہوگا ۔"[1]

بغیر بیان کئے ہوئے جگر کی خواہش بیعت کے معلوم کر لینے اور اس کا حل پیش کر دینے کو سوا اصغر کی روشن ضمیری کے اور کس چیز سے تعبیر کیا جائے گا ۔

اسی قسم کا ایک واقعہ جناب نواب سید شمس الحسن صاحب نے[2] ، ایک صحبت میں سنایا پھر اس کی توثیق خط کے ذریعہ کی ۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :

" مجھے ایک بار کسی دفتری کام کے سلسلے میں الہ آباد جانا پڑا ۔ میری ٹرین ٹھیک اس وقت پہونچی[3] جب اسٹیشن کے قریب مسجد میں اذان ہو رہی تھی چنانچہ میں نے سواری روک کر صبح کی نماز ادا کی اور اس کے بعد اصغر صاحب کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا ۔ محض اتفاقی طور پر درود شریف کا ورد کرتا ہوا ان کے مکان پر

۱۔ جگر مرادآبادی حیات اور شاعری ۔ ص ۵۹

۲۔ زبانی گفتگو بتاریخ ۷ جنوری ۱۹۷۰ء

۳۔ لکھنؤ سے الہ آباد کے لئے رات کو ساڑھے دو ، دس بجے ٹرین چلا کرتی تھی جو سحر میں پانچ ساڑھے پانچ بجے الہ آباد پہونچاتی تھی ۔

پہونچا اور دستک دی ۔ جب اصغر صاحب باہر تشریف لائے تو
اصغر صاحب پر ایک غیر معمولی کیفیت طاری پائی ۔ ان کے بال
منتشر اور چہرے پر ایک عجیب قسم کی چمک تھی جس کو بیان
کرنا میرے لیے بڑا دشوار ہے ۔ جلوے برس رہے تھے ۔ یہ کیفیت
پھر کبھی نہیں دیکھی ۔ میں اس کیفیت خاص کو نہ سمجھ سکا
.... انہیں دیکھ کر جو تاثرات پیدا ہوئے تھے وہ
دل پر نقش ہو کر رہ گئے ۔ بات گئی گزری ہوئی ۔ بہت عرصہ
کے بعد میں اپنے چچا (جو میرے والد مرحوم سے بڑے تھے)
نواب نورالحسن صاحب مرحوم کے جو مولانا فضل الرحمن صاحب رح
گنج مرادآبادی کے مرید خاص اور خلیفہ مجاز تھے ، تصوف پر رسائل
پڑھ رہا تھا تو ایک جگہ میں نے یہ پڑھا کہ اگر کوئی شخص صاحب
دل ہے اور اس سے ملنے کے لیے کوئی شخص درود پڑھتا ہوا آئے تو
ناممکن ہے کہ اس کے چہرے سے اس کے اثرات نمایاں نہ ہوں ۔ میرا
دماغ فوراً اس واقعہ کی طرف گیا جو میں نے درج بالا کیا ہے اور
وہ خیال اپنے پس منظر کے ساتھ مجسم میرے سامنے آ گیا [1]۔"

اگر ان واقعات اور ان سے اخذ کردہ نتائج سے صرف نظر بھی کر لیا جائے جب
بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیاجا سکتا کہ

" اصغر کی زندگی پاکیزگی ، تقویٰ اور اعلیٰ اخلاق کا بہترین نمونہ
تھی ، ان کی زندگی کو یہ تمام شور بارہان منگلور ہی کی خاک حسن
افروز سے عطا ہوئی تھیں ، ان کی صلاحیتوں کا نشوو نما اسی محفل
ناز و نیاز کی گرمی میں ہوا تھا اور ان میں اسی درگاہ کے حال وقال
نے رنگ بھرا تھا [2]۔"

--- یہی روحانیت تھی ، یہی ان کی سیرت و شخصیت کا ارتفاع تھا ۔ اور پاکیزگی کی
یہی روح ان کے اقوال و اعمال اور شعر و ادب میں نظر آتی ہے ۔

اصغر نے بیعت کب کی ۔ اس کی کوئی قطعی اور صحیح تاریخ نہ معلوم ہو سکی
تاہم حسب ذیل قرائن و شواہد سے اس کا ایک سرسری سا اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے ۔

۱۔ مکتوب جناب نواب سید شمس الحسن بنام راقم الحروف مرقومہ ۲۷ جنوری ۱۹۷۰ء

۲۔ اصغر مرتبہ جناب عبدالشکور ۔ ص ۲۳

(۱) جناب صغیر احمد صدیقی نے اس ضمن میں تحریر فرمایا ہے :

" گونڈہ واپس ہوئے (بیعت کے بعد) تو پھر ان کا دامن پکڑا گیا .... کشاکش شروع ہوئی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ تائب ہو کر ان کی زندگی کے شریک ہو گئے [1]۔"

عبارت بالا میں جن لوگوں کے تائب ہو کر شریک زندگی ہونے کی طرف اشارہ ہے وہ " چھٹن " اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصغر نے چھٹن سے شادی کے قبل ہی بیعت کرلی (۱۲-۱۹۱۳ء) ۔

میں نے استفساراً جناب سید رشید احمد صاحب کو لکھا کہ صغیر احمد صدیقی صاحب اصغر کی بیعت کا واقعہ چھٹن سے شادی کے قبل کا لکھتے ہیں آپ کا کیا خیال ہے ۔ انھوں نے جواباً تحریر فرمایا :

" اصغر نے چھٹن سے عقد کرنے کے بہت بعد میں بیعت کی ہے ۔ صغیر صدیقی کا اس وقت کہاں گونڈہ میں وجود تھا ۔ انھوں نے سنی سنائی باتوں پر بھروسہ کر کے ایسا لکھ دیا ہوگا [2]۔"

رشید [3] صاحب کی بات سے اتنا واضح ہو گیا کہ اصغر نے ۱۲-۱۹۱۳ء کے بہت بعد بیعت کی۔

(۲) جگر صاحب نے اپنی ۱۹۱۹ء کی ایک ملاقات کا جو تاثر جناب ناطق جے پوری سے فرمایا تھا جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے اس میں یہ جملہ بھی تھا :

" میں نے چاہا کہ ان سے بیعت ہونے کی خواہش کروں ۔ میرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ انھوں نے باتوں باتوں میں مجھے اپنے پیر طریقت کی طرف متوجہ کیا [4]۔"

۱۔ نقوش لاہور شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۳۸۳

۲۔ مکتوب جناب سید رشید احمد بنام راقم الحروف مرقومہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۹ء

۳۔ رشید صاحب کے قول کو صغیر صدیقی صاحب کے بیان پر اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ رشید صاحب اور اصغر صاحب کا بہت قریبی تعلق ۱۹۱۳ء کے اوائل سے ۱۹۳۶ء تک ، کوئی ۲۲ ، ۲۳ سال رہا ہے ـــــ صغیر صدیقی صاحب کا صرف آخری ۳ سال ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۶ء قرب رہا ہے ۔ وہ بھی عمروں کے تفاوت کی وجہ سے شاید وہ قرب حاصل نہیں ہو سکا ہوگا جو رشید صاحب کو تھا ۔

۴۔ جگر مرادآبادی حیات اور شاعری ۔ ص ۵۹

اس سے اتنا ثابت ہو گیا کہ جگر کے بیعت ہونے سے پہلے اصغر بیعت ہو چکے تھے جگر کی بیعت کی تاریخ ۲۷ جون ۱۹۱۹ء ثابت کی جا چکی ہے - اس طرح اتنا تو یقینی ہو گیا کہ اصغر نے ۱۲-۱۹۱۳ء اور وسط ۱۹۱۹ء کے درمیان کی کسی تاریخ کو بیعت کی ہوگی -

(۳) جناب عبدالشکور صاحب برہلوی[1] تماشائی نے میرے خط کے جواب میں جو مکتوب تحریر فرمایا تھا اس میں ایک جملہ یہ بھی تھا :

" مگر میں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ سیاسی قیدیوں سے مختلف مقامات پر ملتے جلتے رہتے تھے اور ان کے خطوط جا بجا پہونچاتے تھے -[2] "

جب میں نے اس امر کی تصدیق جناب نواب سید شمس الحسن سے چاہی تو انھوں نے تحریر فرمایا :

" جی ہاں اصغر صاحب کے متعلق میں نے کہیں سنا ہے یا پڑھا ہے کہ جب مولانا ابوالکلام آزاد رانچی میں نظربند تھے تو وہ نامہ و پیام کا بھی کام انجام دیتے تھے - افسوس ہے کہ تفصیل میرے ذہن میں نہیں ہے -[3] "

میرے اس سوال کے جواب میں کہ آپ کے نزدیک شکور صاحب کی یہ بات کہ " وہ (اصغر) سیاسی قیدیوں کے مابین نامہ و پیام کا کام سرانجام دیتے تھے " کہاں تک درست ہے؟ ، جناب بشیر احمد صدیقی نے فرمایا :

" جی ہاں مجھ سے بہت خفیہ طور پر اصغر صاحب نے فرمایا تھا کہ میں بعض حضرات کے پیغامات بعض حضرات تک پہنچاتا تھا جن کا تعلق تحریک ریشمی رومال سے تھا -[4] "

ان دونوں مختلف بیانات میں جناب بشیر احمد صدیقی صاحب کے بیان کو حسب ذیل بنیادوں پر ترجیح دی جائے گی :

(۱) بشیر صدیقی صاحب نے بڑے وثوق کے ساتھ ایک بات کہی ہے اور خود اصغر کی زبانی بتائی ہے -

---

۱- جناب عبدالشکور صاحب حلیم مسلم کالج کانپور کے مدتوں پرنسپل تھے - اصغر پر سب سے پہلی کتاب " اصغر " کے نام سے ۱۹۳۵ء میں سعید برادرس الہ آباد سے انھوں نے ہی شائع کی تھی - اب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں اور برہلی ہی میں مقیم ہیں -

۲- مکتوب بنام مقالہ نگار مرقومہ ۱۷ جون ۱۹۶۹ء

۳- ایضاً - مرقومہ ۲۷ جنوری ۱۹۷۰ء

۴- گفتگو جناب بشیر احمد صدیقی از مقالہ نگار بتاریخ ۱۲ جنوری ۱۹۷۰ء

(۲) نواب صاحب کو خود اپنی بات پر اعتماد نہیں ہے ۔ نہ پورا واقعہ ذہن میں ہے ممکن ہے نواب صاحب نے مولانا سید سلیمان ندوی رح کے مقدمہ* شعلہ طور میں یہ جملہ پڑھا ہو :

" ایک صاحب عینکوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے اکثر سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں سے ملنے جایا کرتے تھے اور ان میں سے ایک کی خبریں دوسروں کو پہنچایا کرتے تھے اسی سلسلے میں وہ ایک طرف ایک قیدی کے پاس رانچی اور دوسری طرف ایک آزاد** کے پاس اعظم گڑھ آیا کرتے تھے ۔ اور ایک کو دوسرے کی نسبت معلومات دیا کرتے تھے ۔۔۔۔۔ وہ اکثر آمد و رفت کی نوازش فرمایا کرتے تھے ۔ ایک دفعہ جب وہ آئے تو اپنے ساتھ ایک نیا تحفہ لائے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ نیا تحفہ ایک نوجوان شاعر تھا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ کلیم سخن کون تھا؟ جگر مرادآبادی [1]۔"

اور " عینکوں کے ایجنٹ " اور جگر کا نام پڑھ کر نواب صاحب کا خیال اصغر کی طرف گیا ہو ۔ حالاں کہ عینکوں کے جو ایجنٹ پہلے پہل جگر کو اعظم گڑھ لے کر گئے تھے وہ غلام محمد آغا صاحب عینک فروش تھے [2] ، اصغر نہیں تھے ۔ اصغر تو خود جگر صاحب کی وساطت سے پہلی بار اعظم گڑھ پہونچے ہیں [3] ۔

(۲) مولانا ابوالکلام کی مدت نظربندی (رانچی) اپریل ۱۹۱۶ء تا ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء تھی [4] ۔ اس مدت میں اصغر کا مولانا ابوالکلام آزاد سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا ۔

---

*۔ شعلہ طور کا دوسرا ایڈیشن جو عام طور پر پہلے ایڈیشن کے نام سے مشہور ہے ، ناس پریس لکھنئو سے ۱۹۳۵ءمیں جناب نواب سید شمس الحسن صاحب کے اہتمام سے چھپا تھا ۔ جسکی تمام کاپیاں مکتبہ جامعہ دھلی نے لے لیں اور اپنا گرد پوش چڑھا کر اپنے نام سے شائع کیا ۔۔ قیاس یہ ہے کہ اسی وقت نواب صاحب نے یہ عبارت پڑھی ہوگی جو بعد میں ذہن سے اتر گئی ۔

**۔ لفظ آزاد قابل غور ہے اسمیں " قیدی " کی رعایت کے ساتھ " آزاد " (مولانا ابوالکلام) بھی مقصود و مراد ہے ۔

۱۔ " نووارد شاعر " مقدمہ شعلہ طور طبع اول ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس مطبوعہ ۱۹۳۲ء بحوالہ " جگر اور اسکی شاعری " ۔ مرتبہ انور عارف ، مکتبہ* بہادر شاہ مارکیٹ ۔ بندر روڈ کراچی ۔ ص ۶۵-۶۶

۲۔ جگر آثار و افکار ۔ ص ۲۵

۳۔ مکتوب جناب مرزا احسان احمد بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲۳ اگست ۱۹۶۹ء

۴۔ مکتوب مولانا غلام رسول مہر بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲۱ اپریل ۱۹۷۰ء

اعظم گڑھ کے حلقہ میں بھی وہ ۱۹۱۹ء میں نئے نئے متعارف ہوئے تھے اس لیے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اصغر نے آتے ہی یہ کام شروع کر دیا ہوگا۔ اس کے علاوہ " اکثر آمد و رفت کی نوازش فرمایا کرتے تھے " خود اس بات کی دلیل ہے کہ اصغر جو خود ۱۹۱۹ء میں متعارف ہوئے ہیں ، اسکے مرجع نہیں ہو سکتے ۔

ان دلائل کی بنیاد پر نواب صاحب کی بات صحیح نہیں معلوم ہوتی ۔ بشیر صدیقی صاحب کی بات درست ہے اسکےصحیح ہونے کے دلائل حسب ذیل ہیں :

(۱) تحریک ریشمی رومال[1] کے بانی شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ شیخ الجامعہ دیوبند تھے جو قاضی عبدالغنی صاحب رح کے وطن منگلور شریف سے بہت قریب تھے ۔

(۲) دیوبند ، منگلور ، سہارنپور کے سجادے ، علمی مراکز اور مذہبی مدارس کا مشترک سرچشمہ خاندان ولی اللہی تھا اس لیے اس وقت کے علماء اور مشائخ کی بہت بڑی جماعت ان کے ہمراہ تھی ۔

(۳) عین ممکن ہے کہ قاضی صاحب کا تعلق بھی اس تحریک سے رہا ہو یا وہاں آنے جانے سے اصغر کا تعلق کسی طرح اس تحریک کے کارکنوں سے ہو گیا ہو اور وہ اس سے متعلق ہو گئے ہوں ۔

اگر یہ قیاس صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ پیغام رسانی کا کام اصغر نے دوران تحریک ہی میں کیا ہوگا ۔ تحریک اپنے شباب پر ۱۹۱۲ء اور ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء کے درمیان تھی (آخر اپنوں کی غداری کی وجہ سے ناکام ہوگئی) ـــــ اس لیے اصغر کے بیعت کا زمانہ بھی ۱۹۱۲ء اور فروری ۱۹۱۷ء کے درمیان تو یقینی ہوا ۔ (اس سے پہلے ۱۲-۱۹۱۳ء اور وسط ۱۹۱۹ء کے درمیان ثابت کیا جا چکا ہے) ۔

۱۔ اس تحریک کے بانی شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رح تھے ، اسمیں ہندو مسلمان سب شریک تھے ، گاندھی ، مولانا ابوالکلام آزاد ، مولانا شوکت علی ، مولانا محمد علی ، ڈاکٹر انصاری اور اسی قسم کے دوسرے بزرگ بھی شامل تھے ۔ پیش نظر یہ تھا کہ ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء کو ایک طرف ملک میں مختلف علاقوں میں بغاوت کی جائے ، دوسری طرف ترکی کی فوجیں کراچی ، کوئٹہ ، پشاور اور اوگی کے محاذ سے حملہ آور ہوں ـــــ یہ معاہدہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن ، ترکی کے انور پاشا ، اور حبیب اللہ خان والی افغانستان کے درمیان ہوتا تھا ـــ سب کچھ طے ہو گیا تھا ۔ آخری معاہدہ ایک ریشمی رومال میں (بیرونی حملہ کی تاریخ ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء) بنا گیا تھا جس پر حبیب اللہ خان اور اسکے تینوں بیٹوں عنایت اللہ خان ، نصراللہ خان اور امان اللہ خان کے دستخط تھے ـــ یہ رومال بعد میں شیخ عبدالرحیم ،

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۳) ایک بات اور غور طلب ھے کہ تحریک ریشمی رومال والوں کا پروگرام بڑا وسیع، نظام پیغام رسانی بہت پھیلا ہوا مگر بہت خفیہ تھا ـــــ وہ عام آدمیوں سے یہ کام نہیں لیتے تھے تاوقتیکہ ان پر کامل اعتماد اور پورا بھروسہ نہ ہو جائے ۔ اس اعتماد پر پورے اترنے کے لئے اصغر کو بیعت کے بعد سال ڈیڑھ سال ضرور لگے ہوں گے اس طرح اصغر کی بیعت اوائل ۱۹۱۵ء تا اوائل ۱۹۱۶ء (فروری) کے درمیان کی کوئی تاریخ آتی ھے ۔ اس طرح رشید صاحب کی یہ بات کہ " اصغر نے چھٹی سے شادی کے بہت بعد بیعت کی " بھی درست ہو جاتی ھے ۔

حلیہ ، وضع و قطع اور طرز معاشرت :

بظاہر حلیہ اور وضع و قطع محض رسمی اور میکانکی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جسے انسان خارج سے اپنے اوپر بطور غلاف یا خول کے چڑھا لیتا ھے یا ان کا تعلق صرف رسم و عادت اور فیشن کے مروجہ نمونوں (FASHION PATTERN) سے ھے یا یہ " چہرے " ہیں جو بازاروں میں بکتے ہیں ، جن میں سے کوئی کردار حسب پسند و خواہش کوئی خاص " چہرہ " یا کوئی خاص " وضع " یا " دھج " ، اپنے لیے خرید لیتا یا اختیار کر لیتا ھے ۔ اس کا " اندر کے کردار " سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خیال نہ صرف یہ کہ غلط ھے بلکہ خلاف حقیقت بھی ھے ـــــ یہاں یہ بات سوچنے کی ھے کہ آخر فیشن کے اتنے مختلف اور کثیر التعداد نمونوں میں سے کوئی کردار کوئی خاص " فیشن " یا " وضع " کیوں اختیار کرتا ھے وہ کون سی چیز ھے جو اسے رسم و عادت کی پیروی میں بھی اپنی انفرادی شان قائم و برقرار رکھنے کے لئے بیتاب رکھتی ھے؟ ـــــ حقیقت یہ ھے کہ کسی فرد کے " اندر کا کردار " ، اپنی مرضی ، پسند اور ارادہ سے ، فیشن کے مروجہ نمونوں میں سے ، کوئی خاص نمونہ پسند کرتا ھے پھر رد و قبول ، حذف و اضافہ اور ترمیم و تنسیخ سے اس میں انفرادیت پیدا کر کے حلیہ اور وضع و قطع کی اسی انفرادیت میں

(حاشیہ از گذشتہ صفحہ)

مسٹر کریلاس کے حقیقی بھائی کے پاس سے برآمد ہوگیا اور یہ تحریک ناکام ہوگئی ۔ خیال یہ ھے کہ عنایت اللہ خان اور حبیب اللہ خان نے انگریزوں سے مخبری کر دی ۔ شیخ الہند اور مولانا حسین احمد مدنی مالٹا میں قید کر دیئے گئے اور مارچ ۱۹۲۰ء میں رہائی کا حکم ہوا ۔ (شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی سیاسی خدمات از ابو سلمان شاہجہان پوری ۔ چٹان لاہور شمارہ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۰ء ۔ ص ۲۱) ـــــ ملخص از تحریک ریشمی رومال ۔ مطبوعہ کلاسیک ۔ لاہور اشاعت اول ۱۹۶۰ء ۔

اپنے کو جلوہ گر کرتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ " اس کا باطن " یا " اندرونی کردار " اس کے حلیے ، ظاہری لباس ، آرائش سرورو اور وضع قطع کے وسیلہ سے اظہار چاہتا اور منظر عام پر آتا ہے یعنی حلیہ اور وضع و قطع ظاہری خول نہیں ہے بلکہ حقیقتاً باطن کا مظہر ہے ۔ قرآن نے بڑے بلیغ انداز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے :

" وہ (اصحاب رسول) نمازیں کثرت سے پڑھتے ہیں ۔ جب دیکھو رکوع و سجود میں پڑے ہوئے اللہ کے سامنے نہایت اخلاص کے ساتھ وظیفۂ عبودیت ادا کر رہے ہیں ۔ ریا و نمود کا شائبہ نہیں ۔ بس اللہ کے فضل اور اسکی خوشنودی کی تلاش ہے ----- نماز کی پابندی سے ان کے چہروں پر خاص قسم کا نور اور رونق ہے ۔ گویا خشیت و خشوع اور حسن نیت و اخلاص کی شعاعیں باطن سے پھوٹ پھوٹ کر ظاہر کو روشن کر رہی ہیں ۔ وہ اپنے چہروں کے نور اور متقیانہ چال ڈھال سے پہچانے جاتے ہیں [1]۔"

اس لیے کسی شخص کی سیرت و شخصیت کو سمجھنے کے لئے ، اس کی طرز معاشرت، شکل و شمائل ، حلیہ اور وضع قطع کا مطالعہ ضروری و ناگزیر ہے کہ اس سے انسان انسان میں فرق و امتیاز قائم ہوتا ہے ۔ اس نقطۂ نظر سے اگر اصغر کے طرز بود و ماند اور وضع و قطع کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی شخصیت کے بعض بڑے اہم اور بنیادی خدو خال سامنے آتے ہیں ۔ ذیل میں مختلف ادوار سے ان کا حلیہ ، وضع قطع اور طرز معاشرت پیش کئے جاتے ہیں تاکہ اصغر کی مزاجی کیفیت کو سمجھنے میں مدد ملے ۔

جناب سید رشید احمد صاحب نے اپنی پہلی ملاقات کے وقت کا حلیہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے (میرے جواب میں کہ جب آپ پہلی بار ملے تھے تو ان کا حلیہ کیا تھا) ۔

" شیروانی اور چھالٹین کا علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ ۔ سر پر بالوں کے پٹے نہ تھے ۔ شیو نہیں کرتے تھے [2]۔"

۱۔ سورۂ الفتح ۔ آیت ۲۹ ۔ ترجمہ و تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی رح ۔ قرآن مجید مترجم (محشی) از حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح و حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رح ۔ مکتبہ نورانی ۔ اچھرہ ۔ لاہور ۔ ص ۶۶۸ ۔ متن قرآنی یہ ہے تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۔

۲۔ مکتوب بنام راقم مقالہ مکتوبہ ۲۲ نومبر ۱۹۷۰ء

جناب جلیل احمد قدوائی نے اصغر کی ۱۹۲۳ء کی ایک قلمی تصویر اس طرح پیش کی ھے :

" جیسے آپ ان کا اس وقت کا حلیہ معلوم کرنا چاھیں تو وہ سن لیجئے جو تقریباً" ان کا عام حلیہ تھا ۔ وہ لانبے قد کے چوڑے چکلے وجیہہ انسان تھے ۔ رنگ سیاھی مائل ۔ ناک پتلی اور لمبوتری ۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن مگر قدرے مائل بہ سستی ، ان پر سنہری کمانی کی عینک ، پیشانی چوڑی ، داڑھی اور پٹے ۔ سر پر بالوں والی گول ٹوپی ۔ سرمئی شیروانی جو اعلیٰ درجہ کی سلی ھوتی تھی ، زیب تن ۔ شیروانی کے نیچے سفید ململ کا کرتہ نظر آتا تھا سفید لٹھے کا پتلی مہری کا پاجامہ ، پیروں میں سیاہ چمکدار پمپ ۔ ریشمیں موزے ۔ بحیثیت مجموعی دیکھنے والے پر یہ اثر ھوتا تھا کہ نئے یا تازہ دھلے ھوئے کپڑے پہنے ھیں شیروانی پر ابھی استری ھوئی ھے اور جوتا خاص طور پر چمکایا گیا ھے[۱] ۔"

جناب رشید احمد صدیقی نے ۱۹۲۵ء کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ھے :

" سامنے سے ایک صاحب نظر آئے ۔ کمرہ چھوٹا تھا ۔ دروازے بند اور روشنی مدھم ۔ کچھ ایسا معلوم ھوا جیسے اجنبی کے قد و قامت کے مقابلے میں کمرہ کی وسعتیں لحظہ بہ لحظہ سمٹتی جا رھی ھیں ۔ دراز قد ، متوسط جسم ، ستھری اور خوش قطع پوشاک سر پر پٹے ، سڈول بھری بھری فرنچ کٹ ڈاڑھی سر پر بالوں کی اونچی ٹوپی ۔ چہرہ پر اجالا ، آنکھوں میں خلوص کی گہرائی اور ذھانت کی شگفتگی تیور میں شرافت ، متوسط عمر ۔ انداز میں خود اعتمادی و دل آسائی یہ یک نظر دل نے گواھی دی کہ اچھے آدمی سے ملاقات ھوئی ، یہ اصغر صاحب (مرحوم) تھے[۲] ۔"

جناب صغیر احمد صدیقی نے ۱۹۳۳ء میں ان کی وضع و قطع اور شکل و شمائل

---

۱ ۔ انتخاب اصغر بار اول مطبوعہ اردو مرکز ۔ لاھور ۱۹۵۲ء ۔ ص ۲۲-۲۳

۲ ۔ گنج ھائے گراں مایہ از رشید احمد صدیقی ۔ ص ۹۲

کے بارے میں اسطرح اظہار خیال فرمایا ہے :

" تھوڑی دیر میں اصغر صاحب تشریف لائے ، ادھیڑ عمر کے بزرگ صورت انسان ۔ لانبا قد قدرے کھلتا ہوا سانولا رنگ ، پٹے سر پر، چہرے پر خوبصورت فرنچ کٹ داڑھی ، آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک ۔ لانبا کرتہ اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے ، روشن روشن، صاف صاف ، نکھری نکھری ، گردن اور شانہ میں ایک خفیف سا خم جو بقول رشید احمد صدیقی معلوم ہوتا تھا کہ نیکی اور شرافت کے بوجھ سے پیدا ہو گیا ہے ۔ متانت اور وقار کے ساتھ چہرے پر ایک تبسم ذوق پذیرائی لئے ہوئے ۔ مختصر یہ کہ شخصیت میں وہ جذب و کشش کہ اجنبیت وبیگانگی کے احساس کو مٹا دے ۔[1] "

جناب عابد علی عابد نے ۲۷-۱۹۲۶ء میں اصغر کو بہت قریب سے دیکھا تھا ۔ وہ ان کی تصویر حسب ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہیں :

"........ آخر وہ تصوف کی طرف جھک پڑے تھے اور جس وقت میں نے انھیں دیکھا ہے وہ اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے ۔ سر پر لمبے لمبے بال جو گردن تک آتے تھے ، داڑھی اچھی خاصی مجھے تو یاد پڑتا ہے کہ چوڑی دار پاجامہ اور اچکن پہنتے تھے ۔ سر پر کالے رنگ کی ٹوپی .... اصغر مجھ سے اس طرح ملتے تھے کہ میں ان کے سامنے کوئی ناشائستہ بات کرنے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا ۔ وہ مسکراتے تھے لیکن ان کی مسکراہٹ میں بزرگوں کی سی شفقت تھی اور اسکے متعلق یہ گمان ہوتا تھا کہ یہ مسکراہٹ کسی وقت تیوری کی شکل اختیار کر سکتی ہے ۔ جب تک وہ لاہور میں رہے میں نے انھیں نہ کبھی جھنجھلائے ہوئے دیکھا ، نہ خستگی کے عالم میں دیکھا نہ انھیں قہقہے لگاتے سنا ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ تصوف سے جو ان کا رابطہ تھا اس کی کیا کیفیت تھی ۔ حال تھا کہ قال اور واقعی ان پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی تھی یا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ بد دیانت ہرگز نہ تھے اگر انھوں نے اشعار میں کسی

۱۔ نقوش لاہور ۔ شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۳۸۲

متصوفانہ کیفیت کا ذکر کیا ہے تو اسے محسوس بھی ضرور کیا ہوگا۔[1]"

قریب قریب یہی باتیں ان کے دوسرے جاننے والوں[2] اور سوانح نگاروں[3] نے بھی بیان کی ہیں -

ان تصویروں سے قدرے مختلف تصویر مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری نے پیش کی ہے ، جنھوں نے اصغر کو ان کی زندگی کے آخری ۸ ، ۹ سال میں بہت قریب سے دیکھا اور نیازمندوں شاگردوں اور مریدوں کی طرح اس مدت کا بیشتر حصہ ان کی خدمت اور صحبت میں گزارا ہے - وہ تحریر فرماتے ہیں :

" ان کا طرز صحیح تھا یا غلط مگر تھا یونہی کہ وہ ہیٹ بھی لگاتے تھے اور اس کے ساتھ سر پر پٹھے اور چہرے پر ڈاڑھی بھی رکھتے تھے - وہ لانبا کرتہ اور شیروانی بھی پہنتے تھے اور اس کے ساتھ سفید فلالین کا پتلون نما پاجامہ بھی جسے سب پتلون جانتے[4]۔"

ان تمام قلمی تصاویر میں اصغر کی بنیادی وضع مشترک ہے لیکن ان کے تجزیے سے، اصغر کے حسب ذیل فطری اوصاف اور مزاجی خصوصیات سامنے آتے ہیں :

(۱) طبیعت میں وضع داری اور مشرقی رکھ رکھاؤ تھا -

(۲) مذہب ، تصوف اور دین کی طرف میلان شدید تھا جس نے انھیں پرانی وضع کے صوفیا اور مسلمان شرفا کا انداز اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا -

(۳) رسم و عادت کی پیروی میں بھی روشن خیال اور ترقی پسند واقع ہوئے تھے- پتلون نما فلالین کا پاجامہ ، ہیٹ ، فرنچ کٹ ڈاڑھی سے ان کی " لکیر کی فقیر " طبیعت کے برخلاف روشن خیالی اور ترقی پسندی کی شہادت و ثبوت ملتا ہے -- یہی روشن خیالی

۱- نقوش لاہور - ۳۸-۴۷ - ۱۹۵۵ء " اصغر گونڈوی از عابد علی عابد - ص ۵۰۸

۲- جناب بشیر احمد صدیقی - زبانی گفتگو ۲۰ مئی ۱۹۶۹ء -- جناب صدیقی صاحب نے فرمایا ، شکل و صورت نہایت سنجیدہ - بڑے بھاری بھرکم ، انکسار حد سے زیادہ اپنے کو نمایاں کرنا زیادہ پسند نہیں کرتے تھے - وضع و قطع پرانے وضع کے صوفیا جیسی - لباس کے معاملہ میں بڑا اہتمام - بڑے صاف ستھرے - تکلف کا کوئی شائبہ نہ تھا -"

۳- مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری نے لکھا ہے " کمرہ کا جائزہ لیا ہر چیز سے نفاست اور سلیقہ ٹپک رہا تھا - اصغر صاحب پر نظر ڈالی کوئی ۳۵ برس کا سن ، کشیدہ قامت ، سانولا رنگ ، سر پر پٹھے ، چہرے پر فرنچ کٹ ڈاڑھی - آنکھوں میں غیر معمولی چمک کے ساتھ کشش - بشرے سے متانت و وقار نمایاں ، پان کھائے ، صنت داڑھی والی عینک لگائے - لانبا کرتہ اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے (اصغر - عبدالشکور - سعید برادرس الہ آباد - ۱۹۳۵ء ص ۹)

۴- اصغر از عبدالشکور مطبوعہ سعید برادرس الہ آباد ۱۹۳۵ء - ص ۲۶

اور ترقی پسندی اجتہادی شان کے ساتھ زندگی کے دوسرے شعبوں ، حتیٰ کہ ان کے شعر و ادب میں بھی جلوہ گر نظر آتی ہے ۔

(۴) طبیعت میں رنگینی تھی ۔

(۵) شائستگی و نفاست اور صفائی پسندی مزاج کا خاصّہ تھی ۔

اصغر کی یہ تصویر نامکمل رہ جائے گی اگر ایک اقتباس جناب رشید احمد صدیقی کا اور نہ پیش کیا جائے ۔ جس سے اصغر کی سیرت کے ایک اور اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے ۔ تصور درج ذیل ہے :

" میرا الہ آباد پہونچنے کا وقت متعین تھا ۔ میں ہمیشہ انتظار میں انھیں ٹہلتے ہوئے پاتا .... پہلے چست آڑا پاجامہ پہنتے تھے بیماری کے بعد سے غرارہ دار پہننے لگے تھے ، لمبا پھنسی آستینوں کا کرتہ سر پر سفید ٹوپی ۔ ایک ہاتھ میں پانوں کی ڈبیہ دوسرے میں مختلف اقسام کے سگار اور سگرٹوں کے ڈبے .... باتیں کرتے کرتے گھر پہونچتے نوکر کو آواز دیتے ناشتہ لاؤ ۔ فرماتے لیجئے میں نے ھارلکس مالٹڈ ملک شروع کر دیا ہے ، یہ اوولٹین کا گلاس ہے ، یہ فورس ہے ۔ ھاں آپ نے کیونڈشر کے مکھن کھائے ہیں ذرا یہ پولسن بھی ملاحظہ فرمائیے .... ھاں یہ پان لکھنؤ کا ہے ۔ آپ علی گڑھ کے پانوں کا پروپگنڈا کرتے رہتے ہیں آج لکھنؤ اور بنارس کا مقابلہ کرنا ہوگا ۔ یہ برقی قوام ہے ، وہ زعفرانی پتی ہے اور ھاں (نوکر کو آواز دے کر) ذرا وہ گولیاں تو لانا حکیم صاحب نے دی ہیں ، کہتے تھے ان کے مورث اعلیٰ نے شاہان اودھ کے لئے بڑے اہتمام سے اس کا نسخہ تیار کرایا تھا ۔ اس کا نام " آبروئے اودھ " ہے اسے ضرور چکھئے [۱] "

اقتباس بالا سے اصغر کی سیرت کے جس خاص پہلو کی طرف اشارہ مقصود ہے وہ ان کا

(۶) دنیاوی نعمتوں اور لذائذ سے متمتع ہونے کا ظرف و حوصلہ ہے ------

---

۱ - گنج ہائے گرانمایہ ۔ از رشید احمد صدیقی ۔ آئینہ ادب چوک مینار انار کلی لاہور ص ۱۳۵-۱۳۲

یعنی ترک لذات کے بجائے ان کا ایمان و عمل امتناع لذات پر تھا -- کُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِیْٓئًا کے عالم باعمل تھے -

مختصر یہ کہ اصغر نے اپنے والد اور مرشد (جیسا کہ گذشتہ صفحات میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے) کی شکل و شمائل اور وضع قطع کو اپنے لئے نمونہ بنایا اور زندگی میں آگے چل کر اسی کو اپنایا - عاجزی و مسکنت ، خشیت و عبودیت کی صفت نے شانوں اور گردن میں خم پیدا کر کے نیکی و شرافت کا مجسمہ بنا دیا تھا - حسن نیت و اخلاص کی شعاعیں باطن سے منعکس ہو کر چہرے پر اجالا برسا رہی تھیں - وہ اپنے پرنور چہرے اور متقیانہ چال ڈھال سے معاصر شعراء و ادباء میں سب سے ممتاز اور الگ پہچانے جاتے تھے -

اصغر و جگر :

اردو شاعری میں اصغر و جگر کچھ ایسا ساتھ ساتھ چلتے ہیں کہ ایک کا ذکر دوسرے کے بغیر نامکمل اور ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ناممکن سا معلوم ہوتا ہے - دونوں کی زندگیاں ایک دوسرے کے متوازی ، مگر ایک دوسرے سے اس طرح ملی ہوئی چلتی ہیں کہ اگر کوئی صرف جگر کی زندگی پر اظہار خیال کرنا چاہے اس طرح کہ اصغر کا ذکر نہ آنے پائے یا اصغر پر کچھ لکھنا چاہے اس طور پر کہ جگر کا تذکرہ کسی طرح نہ آنے پائے تو یہ ممکن نہیں ہے ---- ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ جس طرح اصغر جگر کی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں اور ان کے ہر شعبہ حیات پر سایہ انداز ہیں - جگر ویسے نہیں ہیں -

جگر ، اصغر سے ان کے ایک سسرالی عزیز قاضی محمد حامد[*][2] حسرت کے ایماء اور سفارش پر اوائل (جنوری فروری) ۱۹۱۷ء میں گونڈہ میں ملے تھے - اس کے بعد دونوں نے مل کر چشمہ کا کارخانہ قائم کیا (وسط ۱۹۱۷ء تا اوائل ۱۹۱۸ء) جس میں اول اول جگر سفری ایجنٹ[3] کی حیثیت سے کام کرتے تھے - اس کے بعد ۱۹۱۸ء سے مستقل طور[4] پر گونڈے میں

۱- کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ - ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی -- قرآن شریف مترجم - مطبوعہ حاجی ملک دین محمد اینڈ سنز - بل روڈ کشمیری بازار لاہور - ص ۷۳۸

۲- مکتوب جناب سید رشید احمد بنام راقم الحروف مرقومہ ۲۱ دسمبر ۱۹۶۹ء

*- اصل نام قاضی محمد حامد حسرت تھا (چٹان ۱۷ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۱۹) - ڈاکٹر احمر رفاعی نے قاضی حامد حسن تحریر فرمایا ہے (جگر آثار و افکار - ص ۲۰) جو غلط ہے

۳- چٹان لاہور شمارہ ۱۷ جولائی ۱۹۶۷ء - ص ۱۹

۴- مقالات احسان مطبوعہ معارف اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء - ص ۳۶۰

رہ پڑی - جون ۱۹۱۹ء[1] سے پہلے پہلے ان کی شادی اصغر کی سالی نسیم خاتون سے ہوگئی اور اب جگر اصغر کے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے ، انھیں کے ساتھ رہنے لگے - لیکن جگر اصغر کے ہم زلف برائے نام ہی تھے وہ پہلی ہی نظر میں ان کے اخلاق اور روحانیت کے ایسے گھایل ہوئے کہ آخر دم تک ان کو اپنا مرشد اور پیر طریقت ہی تسلیم کیا (اگرچہ اصغر ان کے مرشد نہیں تھے) - اصغر کے ساتھ جگر کایہ روحانی تعلق ۱۹۱۹ء میں شادی اور بہت سے پہلے ہی قائم ہو چکا تھا - اور وہ اقتباس گزر چکا ہے جسمیں جگر ایک موقع پر اصغر سے بیعت ہونے کی خواہش کرنا چاہتے تھے کہ اصغر نے باتوں میں ان کی توجہ اپنے پیرطریقت کی طرف منعطف کرا[2] دی تھی - نسیم سے شادی کے بعد بھی جگر نے اس روحانی رشتہ میں نقص یا شکست نہیں پیدا ہونے دی - ۵ سال بعد جب اصغر کے اشارے اور ایماء پر نسیم کو طلاق دینا پڑی جب بھی اس سے جگر کی طبیعت میں ان کے خلاف کسی قسم کا تکدر و انقباض نہ پیدا ہوا ---- اس کا سبب وہی روحانی تعلق تھا جو دونوں کے درمیان روز اوّل سے قائم ہو گیا تھا - طلاق کے بعد جگر گونڈہ سے گم اور لاپتہ ہوگئے اور جہاںتہاں جہاں گشت بنے پھرتے رہے - اس زمانہ میں وہ " غرق جام شراب "[3] رہتے لیکن جب بھی ہوش آتا کھنچ کر اصغر کی خدمت میں پہونچتے - جب تک رہتے شراب سے قطع تعلق ہو جاتا اور پنج وقتہ نماز کی پابندی کی کوشش کرتے[4] لیکن جب دیکھتی نظر نہ آتی تو بھاگنے کی ٹھانتے - اس کی تفصیل جناب رشید احمد صدیقی سے سنیے :

> " اصغر صاحب کے سامنے جگر صاحب اس طرح خاموش ، مؤدب اور آنکھیں نیچی کئے ہوئے بیٹھتے کہ ان سے گفتگو بھی کی جاتی تو صرف ہاں نہیں میں مشکل سے جواب دیتے اور پھر سر جھکا لیتے .... ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود

۱- مقالہ ہذا - ص

۲- جگر حیات اور شاعری - ص ۵۹

۳- " مست جام شراب خاک ہوئے غرق جام شراب ہونا تھا "

۴- " تاریخ زبان و ادب اردو " - صغیر احمد جان - مطبوعہ شیخ محمد اشرف - کشمیری بازار لاہور - ص ۳۱۶

نہ آئے ہوں بلکہ کسی نے پہونچا دیا ہو اور اس کے منتظر ہوں کہ موقع ملے تو پھر اپنی مہم پر چلے جائیں [۱] ۔"

اصغر کے سامنے چپ رہنے اور خاموش بیٹھنے کی تصدیق مولانا سید فرزند علی صاحب کے بیان سے بھی ہوتی ہے ۔ انھوں نے ایک گفتگو کے دوران میں فرمایا :

" جگر اور اصغر کے بڑے خصوصی تعلقات تھے ۔ مجال نہیں کہ جگرصاحب اصغر صاحب کے سامنے ایک لفظ بھی بولیں ۔ ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ " سانپ سونگھ گیا [۲] "

جگر اور اصغر کے تعلقات کے متعلق رشید احمد صدیقی صاحب نے ایک دوسری جگہ حسب ذیل الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے :

" اصغر صاحب سے تو ان کی عقیدت بندگی کی حد تک پہونچی ہوئی تھی ۔ شاید ہی وہ کسی اور کے یہاں اس محبت و سکنت کے عالم میں پائے گئے ہوں جتنا اصغر صاحب کے " حضور " میں [۳] ۔"

رشید صدیقی صاحب نے ایک اور جگہ جگر اور اصغر کے تعلقات کی نوعیت پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔ وہ رقمطراز ہیں :

" .... میں نے ان کو (جگر کو) انتہائی از خود رفتگی کے عالم میں دیکھا ہے اور بڑے بڑے شاعر اور شخصیت کو سخت سست کہتے سنا ہے لیکن اصغر صاحب کا نام آتے ہی یا تو ان کو سناٹے میں آتے دیکھا یا اشکبار پایا ۔ اور جگر صاحب کا اب تو یہ عالم ہے کہ وہ اصغر صاحب کے مخصوص انداز و اطوار میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی بعض بعض باتوں کو اصغر صاحب کے باطنی تصرف کا صدقہ سمجھتے ہیں ، اس پر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں [۴] ۔"

۱۔ نگارش امرتسر ۔ جلد ۵-۶ جگر نمبر " جگر کی شخصیت " از رشید احمدصدیقی ص ۲۲-۲۱

۲۔ گفتگو مولانا سید فرزند علی بتاریخ ۲۰ مارچ ۱۹۶۹ء ۔ مولانا سید فرزند علی ۔ ریاست رامپور کے رہنے والے ۱۹۱۸ء کے اواخر میں مہاراجہ بلرام کے یہاں اتالیق ہو کر گئے ، ۱۹۳۳ء میں وہیں سے ایف سی کالج لاہور تشریف لائے ، اب تک (اپریل ۱۹۷۰ء) صدر شعبۂ السنہ ہیں ۔ جگر اور اصغر سے ان کی ملاقاتیں وہیں بلرام پور اور گونڈہ میں رہیں ۔

۳۔ ہم نفسان رفتہ ۔ رشید احمدصدیقی ۔ مطبوعہ آئینہ ادب لاہور ۔ اشاعت اول ۱۹۶۵ء ص ۲۱۹-۲۱۸

۴۔ گنج ہائے گراں مایہ از پروفیسر رشید احمد صدیقی مطبوعہ نیو فرینڈز پبلشر ۔ اردو بازار راولپنڈی ۱۹۶۳ء ۔ ص ۱۱۲-۱۱۳

اصغر سے جگر کے تعلقات کی جس نوعیت کی طرف جناب رشید احمد صدیقی کے اقتباسات میں اشارے ملتے ھیں اسکے متعلق خود جگر صاحب کے تاثرات ملاحظہ ھوں ۔ فرماتے ھیں :

" روحانی اور معنی بلندیوں کا جہاں تک تعلق ھے ، ان کے لئے تمام تر زندگی کے ساتھ اصغر گونڈوی کی تربیت کا صحیح معنوں میں شکرگزار ھوں [1] ۔"

ایک دوسری جگہ فرماتے ھیں :

" اصغر صاحب کی صحبت نے مجھے بہت فائدہ پہونچایا ۔ میرے عقائد بھی بدل گئے اور میری زندگی کو نیا رخ بھی مل گیا ۔ اصغر صاحب نہیں رہے مگر مجھ پر اب تک ان کا اثر ھے اور ان کا فیض جاری ھے ۔ میرا رنگ ان کی وجہ سے بالکل بدل گیا ..
.... اصغر صاحب اور موجودہ بیوی کے وقت سے روحانی انقلاب شروع ھوا .... میں اصغر صاحب کی کرامت کا قائل ھوں ۔
.... ایک دن مجھ سے کہا میاں تم چاھے جہاں چلے جاؤ آنا تمھیں اسی دروازے پر پڑے گا [2] ۔"

بڑے بڑے لوگوں کو خاطر میں نہ لانے ، ان کو سخت سست کہنے لیکن اصغر صاحب کے سامنے سناٹے میں آ جانے " (جس کا ذکر رشید صدیقی صاحب کے اقتباس میں گزر چکا ھے) کے متعلق ، جگر صاحب خود تحریر فرماتے ھیں :

" میں ایک سخت آزاد اور رندلا ابالی ھوں اور دور حاضر کی بڑی سی بڑی ھستی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اپنے لئے ننگ سمجھتا ھوں لیکن حضرت موصوف ھی کی ایک ذات گرامی ھے جسکے سامنے اپنے آپ کو ایک صید زبوں سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکتا [3] ۔"

۱۔ " حیات جگر کا ایک باب " حضرت جگر کی زبانی از قیسی الفاروقی قومی آواز ۔ لکھنئو ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء ۔ ص ۳ ۔ بحوالہ " جگر مرادآبادی حیات اور شاعری ۔ ص ۷۸-۶۱

۲۔ ایضاً ۔ ص ۳ ... بحوالہ " جگر مرادآبادی حیات اور شاعری " ۔ ص ۶۱

۳۔ شعلۂ طور (ایڈیشن غالباً ۱۹۳۲ء نامی پریس لکھنئو) بحوالہ " جگر مرادآبادی حیات اور شاعری " ص ۱۹۸ ـــــ ڈاکٹر اسلام صاحب سے اس معاملہ میں تسامح ھو گیا ھے ۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں شائع ھوا (مکتوب جگر مرادآبادی بنام نواب سید شمس الحسن صاحب مرقومہ ۲۱ فروری ۱۹۳۵ء از الہ آباد) ۔ جگر صاحب کی اصل عبارت درج کی جاتی ھے ۔
" نثر کے مضامین اگر پریس میں نہ گئے ھوں تو یہاں فوراً بھیج دیجئے ۔ چاھتا ھوں کہ حضرت مولانا اصغر حسین صاحب کی نظر فیض اثر سے گزر جائیں ۔ دیوان کا نام بھی موصوف تجویز کریں گے " ۔ خط ایک ھرے رنگ کے کارڈ پر ھے ، مہر صاف نہیں پڑھی جاتی صرف
(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسی قسم کے عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار جگر نے اصغر کے متعلق " شعلۂ طور " میں بھی کیا ہے ۔ چند اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں ؎

نگاہ حضرت اصغر کی ہر ودیعت خاص ‌ ‌ ‌ قرار بن کے جگر کے دل حزیں میں رہی [1]

یوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہل کمال ‌ ‌ خاص ہے حضرت اصغر سے عقیدت مجھکو [2]

حریم حسن معنیٰ ہے جگر کا شانۂ اصغر ‌ ‌ ‌ جو بیٹھو با ادب ہو کر تو اٹھو باخبر ہوکر [3]

اپنا ہی سا اے نرگس مستانہ بنا دے ‌ ‌ ‌ میں جب تجھے جانوں مجھے دیوانہ بنا دے [4]

جگر کے اشعار ، بیانات اور تحریرات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اصغر کے متعلق ان کے جذبات مبنی بر عقیدت و ارادت تھے ۔ وہ ان کو اپنا پیر طریقت ، مرشد روحانی اور استاد معنوی مانتے تھے ۔ یہ ہے بھی حقیقت کہ جگر کی قلب ماہیت میں اور بزرگوں کی نظر کا فیض بھی ہے [5] ، لیکن سب سے زیادہ اصغر کا فیضان نظر ہے ۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے صرف اصغر کے متعلق جگر کی عقیدت و ارادت کا اظہار ہوتا ہے ۔ لیکن اصغر کے تعلق خاطر کی نوعیت جگر سے کیا تھی یا ان سے ، ان کا رویہ کیا تھا اس کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا اس لیے آئندہ سطور میں اسی پر روشنی ڈالی جائے گی ۔

جگر اوائل ۱۹۱۷ء میں جس وقت گونڈہ پہونچے بڑے پریشان حال تھے ۔ ماں کا انتقال ہو چکا تھا ۔ وحیدن کے حادثے اور انتقال نے وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا ۔ در بدر خاک بسر ، شہر شہر مارے مارے پھر رہے تھے ، اسی حالت میں اصغر سے ملے ۔ انھوں نے ان کے اندر ، خلوص ، محبت اور جوہر انسانیت دیکھا ، اس بیکس و بے بس انسان کو سینے سے لگا لیا ۔ ان کو در بدری سے روکنے ، پریشان خاطری سے نجات دلانے ، اور تسکین قلب بہم پہونچانے کے لئے اپنی سالی سے شادی کر دی ، اپنے گھر میں بہ حیثیت فرد خاندان کے اس وقت رکھا جب جگر اپنی کفالت کر سکتے تھے نہ بیوی کی [6] ۔ دہریت کے دلدل سے نکالا

(حاشیہ از گذشتہ صفحہ)
سنہ کا آخری ہندسہ پڑھا جاتا ہے ۔ اس خط پر الہ آبادی کی ۲۱ فروری ۱۹۳۵ء کی مہر ہے اور لکھنؤ کی ۲۴ فروری ۱۹۳۵ء کی ۔ اس کی تصدیق زمانہ کانپور اکتوبر ۱۹۳۵ء کے اشتہار سے بھی ہوتی ہے جو درج ذیل ہے : " حضرت جگر مرادآبادی کا مکمل دیوان " شعلۂ طور " کے نام سے ...... نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے " (زمانہ اکتوبر ۱۹۳۵ء علمی خبریں ۔ ص ۲۶۴) ۔

۱تا۴ ۔ شعلۂ طور مطبوعہ ادارۂ فروغ اردو ۔ لاہور بار دوم ۔ ص ۱۰۵ ، ص ۱۳۶ ، ص ۱۳۱ ، ص ۳۰۲

۵ ۔ " حیات جگر کا ایک باب " حضرت جگر کی زبانی از قیسی الفاروقی ۔ قومی آواز ۔ لکھنؤ ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء ۔ ص ۲ ۔ بحوالہ جگر مرادآبادی حیات اور شاعری ۔ ص ۲۱

۶ ۔ بیان بابو بدیشوری پرشاد صاحب تقدیر گونڈوی " جگر معاصرین و مخلصین کی نظر میں " مرتبہ ڈاکٹر محمد اسلام ۔ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ بار اول ۔ سن ۱۹۶۶ء ۔ ص ۳۶

جگر صاحب پہ تشیع تھے حنفی المذہب بنایا ۔ اپنے مرشد کی خدمت میں بھیجا اور ان کے حلقۂ ارادت میں داخل کرایا ـــــ ان تمام التزامات و اہتمامات کے باوجود جب ان کی آوارہ گردی اور شراب نوشی ختم نہیں ہوئی تو گو ان سے سالی کو طلاق دلوا دی لیکن ان سے تنگ آ کر ان کو ٹھکرایا نہیں ۔ برابر ان کی خبرگیری کرتے رہے ، ان کی اصلاح احوال میں لگے رہے ۔ جگر جب عالم ہوش میں ہوتے اور ان کی خدمت میں پہنچتے تو اپنوں کی طرح ان کی پذیرائی کرتے اور ہر طرح کا خیال رکھتے ـــــ ہاں صرف شعر و شاعری میں شرکت سے باز رکھنے کی کوشش کرتے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ان کا اصلی مرض شراب نہیں شاعری ہے [۱] ۔ لیکن اس انتباہ و احتیاط کے باوجود بہلاے پھسلاے میں آ کر جگر نکل جاتے اور لوگ شعر سننے کے لالچ میں اسپرٹ پلا پلا کر ادھ موا کر کے ، یکے پر لاد پھاند کر اصغر صاحب کے یہاں ڈال جاتے تو اصغر ان پر گھر کا دروازہ نہیں بند کر لیتے تھے بلکہ اسکے برعکس گھر میں جگہ دیتے ۔ دلداری کرتے ، جگر ہوش میں ہوتے تو دلسوزی سے جھڑکتے ۔ برہمی دکھاتے ۔ اس کیفیت کا حال جناب رشید احمد صدیقی صاحب کی زبانی سنیے :

" ایک دفعہ الہ آباد پہونچا تو اصغر صاحب کے یہاں جگر صاحب پھر اسی حال میں ملے کھانے کا وقت آیا میں اور اصغر صاحب کھانے کے کمرے کی طرف چلے جگر صاحب نے شرکت سے معذوری کا اظہار کیا ۔ اصغر صاحب اس دن کچھ بدحظ سے معلوم ہوتے تھے چلتے چلتے کھڑے ہوگئے اور جگر صاحب کو مخاطب کرکے بولے " یہ سب تمھارا شعر نہیں سنتے تمھارا گوشت کھاتے ہیں " اصغر صاحب کی آزردگی پرکسی قدر برہمی کا رنگ چھانے لگا تھا ۔

.... میں نے کہا " اصغر صاحب آپ تو لکھنوی شاعری کی تشبیہہ و استعارے کے کبھی شیدائی نہ تھے یہ گوشت کا کیا قصہ ہے ۔ کھانے سے ہاتھ روک لیا کچھ خشمگیں لیکن زیادہ حزیں لہجہ

۱۔ " اصغر " از عبدالشکور ۔ مطبوعہ سعید برادرس الہ آباد ۱۹۳۵ء ۔ ص ۱۲ ...... مولانا سراج الحق مچھلی شہری نے ایک دفعہ کا واقعہ تحریر فرمایا ہے کہ کسطرح الہ آباد یونیورسٹی کے طالب علم جگر صاحب کی آمد کا سن کر حاضر ہوئے اور انھیں اپنے ہمراہ لے جانے پر مصر تھے اور جگر صاحب نہ جانے پر بضد ۔ لڑکے انھیں کمرے سے ہٹا کر دالان میں لے گئے تو اصغر صاحب نے پوچھا " اچھا بتائیے جگر صاحب کا اصلی مرض کیا ہے؟ " میں نے (مولانا سراج الحق صاحب) کہا " شراب " فرمایا " نہیں ۔ ان کا اصلی مرض شاعری ہے شاعری کے معاملے میں یہ شراب سے زیادہ بے قابو رہتے ہیں " ۔

میں بولے " رشید صاحب آپ کو کیا معلوم یہاں ایسے بے رحم لوگ
بھی ہیں جو ان کو جہاں چاہتے ہیں پکڑ لیتے ہیں اور یہ جو
اسپرٹ ہوتی ہے نا وہ پلا کر ان سے شعر سنتے ہیں اور جب یہ
ادھ موئے ہو جاتے ہیں تو یکے پر لاد پھاند کر یہاں پہونچا
دیتے ہیں ۔ میں نے دیکھا کہ اصغر صاحب بے کہت ہوگئے ہیں
اور کھانے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا ہے ....
ہم دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے ۔ کھانا کھلانے پر جو ملازم
مامور تھا اس سے پوچھتے جاتے تھے یہ کھانا یا وہ کھانا جگر صاحب
کے لیے رکھ دیا ہے یانہیں اس سے اطمینان نہیں ہوتا تھا تو ڈونگے
اور پلیٹ سے نکال کر علیحدہ پلیٹوں میں رکھتے جاتے اور کہتے ---
" یہ سب جگر صاحب کے لیے ہے ۔ بغیر کھانا کھلائے ان کو باہر نہ
جانے دینا [1] ۔"

بوجھی اور دلسوزی کی یہ دھوپ چھاؤں ، یہ آنکھ مچولی ، یہ ناز و نیاز ، ایک
رند لاابالی کی یہ خاطر داری اور ناز برداری ----- آخر یہ سب کچھ کیوں تھا؟ -----
یہ اسی محبت کی کارفرمائی تھی جسکی چوٹ اصغر پہلے ہی روز کھا چکے تھے ، یہ وہی
مرشدانہ توجہ و نظر تھی جسکی طرف ان کے مرشد نے یہ کہہ کر اشارہ فرمایا تھا :

" تم نے اس پر توجہ دی تو ایک دن اردو شاعری پر حکومت
کرے گا [2] ۔"

اصغر و جگر کے تعلق کو سمجھنے کے لیے یہاں مولانا سراج الحق صاحب کا ایک اقتباس شاید
بے محل نہ ہوگا :

" خدا جانے کیا بات تھی کہ جب جگر صاحب وہاں (قاضی صاحب
رحمۃ اللہ علیہ) حاضر ہوتے اور اکثر تو مدہوشی کے عالم ہی میں
جاتے تو قاضی صاحب زیادہ ملتفت نہ ہوتے خادم سے کہتے ان کنو

۱۔ " جگر کی شخصیت " از پروفیسر رشید احمد صدیقی ۔ نگارش امرتسر جلد ۵ -۶
جگر نمبر ۔ ص ۲۳-۲۲

۲۔ العلم کراچی ، اپریل تا جون ۱۹۶۲ء حاشیہ ص ۸۵ ۔ ایک ذاتی تحریر جناب
مجاہد کاظمی صاحب ۔

بابو اصغر کے پاس پہونچا دو فرض اکثر ان کو میرے پاس بھجوایا
جگر اس کا کچھ مطلب سمجھے ہوں گے مجھے تو اور کچھ نہیں
معلوم [1]"

" مجھے اور تو کچھ نہیں معلوم " تو دراصل تجاہل عارفانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اصغر نے مرشد کے اس اشارے کو حکم جانا اور اس پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھا ——— اصغر خود ان تجربوں سے گزر چکے تھے ۔ معصیت کی دلفریبوں کے لذت چشیدہ تھے ۔ اسکی دامن گیری اور دامن کشی کو خوب سمجھتے تھے ۔ اس سے دامن چھڑا کر نکل جانے کے لئے جس عزم ، قوت ارادی اور ضبط نفس کی ضرورت ہوتی ہے اس کا بھی انھیں احساس تھا ۔ ——— اس احساس نے جہاں ایک طرف ان کے اندر گناہ سے نفرت پیدا کر دی تھی وہیں گناہ گار کے لیے ان کے دل میں رحمت و شفقت ، اس کی کمزوریوں کی پذیرائی میں فراخ دلی اور اس کے گناہوں سے اغماض و درگزر کی کیفیت پیدا کر دی تھی ۔ وہ جانتے تھے کہ جگر بنیادی طور پر بڑے اعلیٰ انسان ہیں بس ذرا ارادہ کے کمزور ہیں ، جہاں ارادہ میں پختگی آئی ان کی انسانیت چمک اٹھے گی ——— اور وہ جگر سے عفو و درگزر سے کام لیتے ۔ ان پر اپنی نوازشوں اور شفقتوں کی بارش کرتے نہ تھکتے ۔ اصغر کے اس رویہ نے اور بھی جگر کو ان کا بندۂ بے دام بنا دیا تھا ۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے جگر جب قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتے وہ انھیں اصغر ہی کے پاس بھیج دیتے ۔ قاضی صاحب رح کے اس فعل نے دونوں مریدوں پر گویا دو مختلف فرائض عائد کر دیئے تھے ۔ اصغر کو جگر کے رشد و ہدایت اور تہذیب و اصلاح نفس کا مختار و مجاز بنا دیا تھا اور جگر کو بطور مرید کے اصغر کے حکم کا پابند بنا دیا تھا ——— دونوں خواجہ تاش (اصغر و جگر) اس نکتہ کے رمز شناس تھے ۔ دونوں مرتے دم تک اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں لگے رہے اور اس میں سرمو قصور و کوتاہی نہ کی ۔

جگر کے متعلق بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اصغر کے شاگرد ہیں ۔ اس میں ذرہ بھر حقیقت نہیں ۔ رسمی اور روایتی معنوں میں تو اصغر کا کوئی بھی شاگرد نہیں ۔ جگر بھی نہیں ۔ البتہ اکتساب معنی سے جگر نے خوب جھولیاں بھری ہیں ۔

سطور بالا میں اصغر و جگر کے تعلق کی نوعیت کے سلسلے میں جو کچھ مذکور ہوا ہے ، اس کا صحیح تصور و ادراک نہیں ہو سکتا جب تک جناب سید رشید احمد صدیقی صاحب

۱۔ اصغر کے چند ادبی افادات ۔ ص ۲۸ ۔ بحوالہ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور ۔

کا ایک طویل اقتباس پیش نہ کیا جائے ۔ رشید صاحب رقمطراز ہیں :

" جہاں تک جگر اور اصغر کے باہمی رشتۂ محبت کی نوعیت کا تعلق ہے وہ اخلاق و محبت کی منزلوں سے گزرتا ہوا ، خوردی و بزرگی اور پھر کچھ " مرشدی و مولائی " قسم کے روحانی مدارج پر جا کر منتج ہو گیا تھا ۔ شعر و شاعری کی دنیا میں اصغر کبھی ایک مخلص دوست اور مشورہ کار کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھے مگر اپنی دوسری حیثیتوں میں ، حق تو یہ ہے کہ انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک شفیق بزرگ ، ایک محبت کرنے والا باپ اپنے خورد یا اولاد کی صلاح و فلاح کے لیے کرتا ہے ۔ حتیٰ کہ اس میں تنبیہہ و تادیب کی وہ عملی صورت بھی شامل ہے جس میں ایک شفیق بزرگ تنگ آ کر ، بعض ناگفتہ بہ حالات میں ، اضطراری طور پر کبھی دست و بازو سے بھی کام لے بیٹھتا ہے*۔ میرا یہ بیان شاعری و مبالغہ نہیں حقیقت پر مبنی ہے .... اصغر باوجود اپنی متانت ، سنجیدگی اور زہد و تقویٰ کے اپنے شباب کے زمانے میں ایک غصہ ور اور تند مزاج انسان تھے ۔ نفسیات کے ماہر ہوتے ہوئے ان کا یہ عقیدہ اور مقولہ تھا کہ بعض حالات میں زبانی زجر و توبیخ کارگر نہیں ہوتی اور دماغی تعطل کو دور کرنے اور اسکی اصلاح کے لیے ....

ایک شدید جھٹکے کی ضرورت ہوا کرتی ہے .... جگر کی ایسی تادیب کے بعد میں نے دیکھا کہ ردّعمل کے طور پر اصغر بہت متاسف اور چپ چاپ ہو جاتے تھے ....[1] "

......

۱۔ " جگر صاحب " از جناب سید رشید احمد ۔ مسودہ ص ۹ ---- راقم مقالہ نے یہ مسودہ اپنے دوران سفر ، ہندوستان میں دیکھا تھا ۔

۔ تادیباً مارنے کی شہادت بشیر صدیقی صاحب نے بھی اپنی ۲۳ مئی ۱۹۶۹ء کی گفتگو کے دوران میں دی ۔

باب چہارم

مطالعۂ فن (۱) نثر

صفحہ

۱- اردو زبان کے متعلق اصغر کے نظریات ۳۱۷

۲- اصغر کا نظریہ نثر :

(الف) نظم و نثر کا فرق ۳۲۱

(ب) نثر کی ماہیت اور اس کا دائرہ کار ۳۲۲

(ج) نثر کی خوبی ۳۲۳

(د) نثر نگار کا مقام و منصب ۳۲۳

(ہ) نثر میں انفرادیت ۳۲۳

۳- اصغر کی نثر نگاری :

(الف) خصوصیات :

۱) فلسفیانہ انداز تحریر ۳۲۶

۲) طنز و مزاح ۳۲۷

۳) متوازن ۳۳۰

۴) ربط و تسلسل ۳۳۱

۵) پروقار عربی فارسی الفاظ ۳۳۱

۶) تقلیل الفاظ (ایجاز) ۳۳۲

(ب) اسالیب :

۱) بیانیہ ۳۳۳

۲) سادہ و آسان ۳۳۴

۳) ادبی ۳۳۵

۴) عالمانہ — اصل رنگ ۳۳۶

۴- اصغر کا نظریہ تنقید ۳۳۲

۵- اصغر — بحیثیت نقاد

(الف) اصغر تک اردو تنقید کا ارتقاء ۳۵۹

(ب) اصغر کے امتیازات :

۱) اجتماعی ذہنیت ۳۶۸

۲) انفرادی ذہنیت ۳۷۰

۳) شعری دبستانوں کی طبقہ بندی ۳۷۲

۴) سائنٹیفک تجزیہ و تنقید ۳۷۲

(ج) اصغر کی تنقید اور ترقی پسند تنقید کا فرق ۳۷۳

۶- خلاصۃ البحث ۳۷۸

اصغر کا سال ولادت ۱۸۸۴ء اور تاریخ وفات ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء ہے ۔ یہ دور اردو شعر و ادب کی تاریخ میں تجدید و ترقی کا دور ہے ۔ اس دور میں مغربی ادب کے اثر سے اردو نثر و نظم میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ انھوں نے قدیم اسلوب کو بدل کے رکھ دیا ۔ ہمارا موضوع چونکہ اصغر کی اردو نثر ہے اس لیے ہم اپنے مطالعہ کو اس دور کی نثر کی ترقی و رفتار تک محدود رکھیں گے ۔ (تفصیلی بحث آگے آئے گی)

اصغر کی قدیم ترین معلوم نثری تحریر کے متعلق سید رشید احمد صاحب کی شہادت یہ ہے کہ انھوں نے اوّل اوّل ہفتہ وار " قیصر ہند " فیض آباد میں دوران جنگ بلقان (وسط ۱۹۱۳ء) میں جو اداریے لکھے وہ اپنے متین و متوازن اسلوب کی بنا پر بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے ۔ اصغر ۷-۱۹۰۶ء میں شاعری کا آغاز کر چکے تھے ، بلکہ ۸-۱۹۰۷ء میں ان کی غزل " فتنہ " جیسے معاصر اخبار میں شائع ہو چکی تھی ۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص اس قدر ذی استعداد اور حساس دل و دماغ کا مالک ہو کہ شاعری میں ۲۲ ، ۲۳ سال کی عمر میں اپنے لیے جگہ پیدا کر لے وہ اردو نثر کی طرف سے غافل رہا ہو ۔ قیاس کہتا ہے کہ انھوں نے ضرور نثر لکھی ہوگی ۔ کیا عجب کہ آئندہ اصغر کی یہ تحریریں ، جو بحد تحقیقات موجودہ ، پردۂ خفا میں ہیں کبھی منظر عام پر آ جائیں ۔ جناب سید رشید احمد صاحب لکھتے ہیں :

" راقم سطور کو اصغر سے پہلے پہل ملنے کا اتفاق فیض آباد میں ۱۹۱۳ء میں اپنے عزیز دوست قاضی محمد حامد حسرت کے یہاں ہوا تھا ۔ حسرت نے اسی سال فیض آباد سے " قیصر ہند " نام کا ایک اردو ہفتہ وار اخبار جاری کیا تھا اور اس کی ابتدائی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں اپنے دوست اصغر کو گونڈہ سے بلایا تھا [2] ۔ "

۱۔ رشید صاحب نے راقم مقالہ سے اتنی سردیاں فرمایا تھا ۔ اس کے معنی ہوئے فروری مارچ ۱۹۱۳ء (زبانی گفتگو ۲۲ مئی ۱۹۷۰ء)

۲۔ اصغر صاحب از سید رشید احمد ۔ جامعہ دہلی اپریل ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۹۱

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک نئے اخبار کے اجرا و قیام کے سلسلے میں کسی ناتجربہ کار شخص کو محض دوستی کی بنا پر بلایا جا سکتا ہے؟ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصغر نہ صرف یہ کہ ۱۹۱۳ء سے بہت پہلے نثر نویسی کی ابتدا کر چکے تھے بلکہ یہ کہ انھوں نے نثر میں ایک ایسا مقام بھی پیدا کر لیا تھا کہ جب قاضی محمد حامد حسرت کو جو رشید صاحب کے بقول خود ایک اچھے ادیب اور صحافی تھے ، ایک نئے اخبار کے اجراء کے سلسلے میں کسی اہل اور مخلص معاون کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کی نظر اصغر پر پڑی ۔ اس موقع پر یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اصغر ، قاضی صاحب کسی توقعات پر پورے ہی نہیں اترے بلکہ بجائے خود قاضی صاحب سے زیادہ مفید و کامیاب ثابت ہوئے اور اخبار کے قیام و استقرار میں ان کی تحریروں سے بڑی مدد ملی ۔۔۔۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا کہ اخبار " قیصر ہند " سے اصغر کا تعلق محض ایک عام یا ادنیٰ کارکن کا سا نہ تھا بلکہ ادارئیہ نویسی کی اہم خدمت ان کے سپرد کی گئی تھی ۔ رشید احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں :

" اخبار قیصر ہند .... کے اکثر اداریے اصغر نے تحریر کیے تھے ۔ وہ جنگ بلقان کا زمانہ تھا ۔ لوگ جنگ کی خبروں کے مشتاق و منتظر رہتے ۔ اس کے بعد ہی پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی تھی ۔ حامد حسرت ایڈیٹر " قیصر ہند " خود بھی اچھے ادیب اور صحافی تھے ۔ مگر اصغر کے اداریے جو نہایت متوازن اور حقیقت پسندانہ انداز میں تحریر کیے جاتے بہت بصیرت افروز ہوتے اور جو اخبار کی شہرت و مقبولیت میں بہت معاون ہوئے ۔ چند ہی دنوں میں اخبار خاصا چل نکلا [1]۔"

اصغر کو تحریر و اسلوب کی یہ قوت ، جو اخبار کی شہرت و مقبولیت اور اسکے قیام و استحکام کا باعث ہوئی بلا کسی سابقہ مشق و مزاولت کے ، کیونکر حاصل ہو سکتی تھی ۔ غور کرنے کا محل یہ بھی ہے کہ کسی نو آموز کو اخبار میں ادارئیہ نویسی کی سی ذمہ دارانہ خدمت تفویض بھی نہیں کی جا سکتی تھی اس سے مقالہ نگار کے اس موقف کو تقویت ملتی ہے کہ اصغر اخبار " قیصر ہند " میں کام کرنے سے بہت پہلے ، نثر میں اچھی خاصی مشق و دستگاہ بہم پہونچا چکے تھے لیکن چوں کہ اس دور کی نثری تحریریں آج پردۂ خفا میں ہیں ،

۱۔ اصغر صاحب از سید رشید احمد ۔ جامعہ دھلی اپریل ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۰۳

اس لیے اس سے زیادہ اسکے متعلق کچھ اور نہیں کہا جا سکتا ۔

یہ بہرحال طے ہے کہ ۱۹۱۳ء سے قطعی طور پر ان کا شمار اچھے لکھنے والوں میں ہونے لگا تھا (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) گو ان کے اس عہد کی نثر کا کوئی نمونہ نظر کے سامنے نہیں ہے ۔

اصغر کی جو قدیم ترین تحریر اس وقت تک دستیاب ہو سکی ہے وہ اردوئے معلیٰ کے سلسلہ استفسارات کا جواب نامہ ہے جو سہیل علی گڑھ کے جنوری ۱۹۲۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا ۔ ان کی آخری تحریریں رسالہ ہندستانی ، الہ آباد کے مختلف شماروں کے اداریوں اور اسی دور کی دوسری نگارشات پر مشتمل ہیں ۔ یہ سرمایۂ نثر ان کی زندگی کے آخری گیارہ سال (جنوری ۱۹۲۶ء تا نومبر ۱۹۳۶ء) کا ہے ۔ اسی کے اسلوب و انداز کا تعین اس باب کا موضوع ہے لیکن چونکہ یہ دور اصغر کی حیات کی پختگی ، ترقی و عروج کا دور ہے ۔ اس میں اصغر نے پوری طرح اپنے کو پا لیا تھا ۔ یعنی اسی دور میں وہ وقتاً فوقتاً ایک فہمیدہ ، سنجیدہ اور غور و فکر کرنے والے فلسفی کی طرح ، زندگی ، شعر و ادب اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے رہتے تھے اس لیے اس دور کی نثر پر تبصرے سے پہلے ، نثر سے متعلق ان کے نظریات و افکار کا کھوج لگانا ضروری ہے کہ ان کی روشنی ہی میں کوئی صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے ۔

گذشتہ باب میں اصغر کے نظریہ شاعری سے بحث کرتے ہوئے اشارہ کیا گیا ہے کہ نثر و نظم کی تخلیق کا منبع مختلف ہے (یعنی شاعری کا سرچشمہ جذبہ ہے اور نثر کا عقل) اس لیے ان کی ماہیت اور خصوصیات ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہئیں ۔ اس باب میں نثر کی ماہیت و خصوصیات کے اسی اختلاف کی نشاندہی کی گئی ہے ۔ لیکن چوں کہ " نثر سوسائٹی کی باہمی گفتگو (ہوتی) ہے "[1] اس لیے نثر پر تفصیلی بحث سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوا کہ " سوسائٹی کے وسیلۂ گفتگو —— یعنی زبان (اردو) کے متعلق ان کے خیالات و افکار کا بھی جائزہ لے لیا جائے ۔ اس جائزہ کے بعد ان کے نظریہ نثر پر (انہی کے الفاظ میں) روشنی ڈالی گئی ہے ۔ بعد میں ان کی نثر پر محاکمہ کیا گیا ہے ۔ تنقید بھی چونکہ نثر ہی کی ایک صنف ہے اس لئے تنقید سے متعلق ان کے خطوط فکر کا تعین کیا گیا ہے ۔ ساتھ ہی ان کے تنقیدی مقالات کی حیثیت بھی متعین کی گئی ہے ۔ اس طرح یہ باب اصغر

۱۔ نظم و نثر پر ایک نظر از اصغر ۔ رسالہ ہندستانی ، الہ آباد ۔ جولائی ۱۹۳۱ء ص ۳۳۹

کی شعر پر مختصر مگر جامع تبصرہ ہے ۔ بحث حسب ذیل چار حصوں پر مشتمل ہے :

(الف) اردو زبان کے متعلق اصغر کے افکار

(ب) اصغر کا نظریۂ شعر

۱۔ شعر کی ماہیت اور اس کا دائرہ کار، شعر کی خوبی، شعر میں انفرادیت، شعر نگار کا منصب و مقام

۲۔ شعر پر محاکمہ

(ج) اصغر کا نظریۂ تنقید --- تنقید کے بنیادی خطوط

۱۔ اجتماعی ذہنیت اور اس کے اثرات ، انفرادی ذہنیت اور اس کے اجزائے ترکیبی ۔ حاسۂ قومی ، حاسۂ اخلاقی، حاسۂ مذہبی

۲۔ تنقیدی مقالات کی حیثیت کا تعین

(د) خلاصۂ بحث

ذیل میں ترتیب وار الگ الگ حصوں سے بحث کی جاتی ہے :

(الف) اردو کے متعلق اصغر کے افکار :

اصغر کے عہد میں اردو کے مسئلہ نے نزاعی صورت اختیار کرلی تھی ۔ لیکن ان کا رویہ روادارانہ اور خالصتاً علمی تھا ۔ وہ کہتے تھے کہ " اردو " ہند ایرانی تہذیب " کی نمائندہ زبان ہے ۔ اس کا وجود اور ہئیت خود اس بات کے شاہد ہیں کہ اس کی تشکیل و تہذیب میں دونوں قوموں (ہند و مسلم) نے اپنا خون جگر صرف کیا ہے ۔ اس لیے اس مسئلہ کو جذباتی اور سیاسی سطح پر حل کرنے کے بجائے علمی سطح پر حل کرنا چاہیے ۔ علمی طریقہ یہ ہے کہ زبان کی فطری رفتار میں رکاوٹ بننے کے بجائے ، اس میں ہمواری اور آسانی پیدا کی جائے وہ یوں کہ

(۱) ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک متحدہ و مشترکہ طرز فکر کو فروغ دیا جائے اور منافرت اور عدم اعتمادی کی فضا کو ختم کیا جائے ۔

(۲) مسلمان شعرا و ادبا کو یہ مشورہ دیا ہے کہ عربی و فارسی کے نامانوس اور ثقیل الفاظ کے بہ تکلف اور بلا ضرورت استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے ۔ اس کے برعکس ہندی شعر و ادب سے استفادہ کرنا چاہیے اور مقامی زبان کے عام فہم الفاظ اپنی تحریروں اور تقریروں میں صرف کرنا چاہییں ۔

اسی طرح (۳) ہندو احباب پر یہ واضح کیا ہے کہ سنجیدہ و باوقار علمی خدمت کے لیے عربی و فارسی کے الفاظ ناگزیر ہیں ---------- ہاں جو لوگ قدم قدم پر " حلق سے

زہر[1] مہرہ اگلتے ہیں ،، ان کا یہ فعل نامستحسن ہے ۔ اس سے وہ زبان و قوم کی خدمت نہیں کر رہے ہیں ۔

پھر بڑی دردمندی سے دونوں کو متنبہ کیا ہے کہ باہمی نزاع سے ایک ہونہار زبان (اردو) برباد ہو جائے گی ۔

ذیل میں ان افکار کی شہادت اصغر کی تحریروں سے پیش کی جاتی ہے :

(۱) اردو ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کی یادگار ہے ۔

(۱) " اردو زبان دراصل ہندو مسلمان کے باہمی اتفاق و اتحاد کی ایک خوشگوار یادگار ہے ۔[2] "

(۲) " اس زبان (اردو) کے عالم وجود میں آنے کے لیے ہندو مسلمانوں کی متحدہ سعی اتنی واضح و نمایاں ہے کہ اس پر بحث و ثبوت کی ضرورت نہیں ۔[3] "

(۲) اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے ۔

(۱) " ہندوستان میں اگر کوئی زبان مقبول و مشترک بننے کی صلاحیت رکھتی ہے تو وہ اردو ہے ۔[4] "

(۲) " اردو کو کامیاب بنانے کے لیے .... قول و عمل سے یہ دکھلایا جائے کہ اردو زبان مخصوص کسی ایک مذہب و فرقہ کی زبان نہیں ہے بلکہ وہ ہندوستان کی ایک متفقہ زبان ہے ۔[5] "

(۳) اردو کی نزاع فرقہ وارانہ منافرت اور سیاست کا نتیجہ ہے ۔

(۱) " مشترک زبان (اردو بحیثیت مشترک زبان) کا مسئلہ محض علمی و ادبی نہیں ہے بلکہ یہ ایک حیثیت سے خالص سیاسی مسئلہ ہے جسے صرف علم و ادب کی بحثوں اور استفسارات و جوابات سے .... حل نہیں کیا جا سکتا ۔[6] "

۱۔ انجمن اردوئے معلیٰ بسلسلہ استفسارات مطبوعہ ۔ جواب اصغر ۔ سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۲۶ء ۔ ص ۱۰۶

۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۱۳

۳۔ اردو کی نشوونما ۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ۔ ایک گم شدہ باب ۔ مطبوعہ رسالہ اضطراب بنارس اپریل مئی ۱۹۲۱ء ۔ ص ۷

۴۔ اردوئے معلیٰ بسلسلہ استفسارات ۔ ص ۱۰۶

۵۔ ایضاً ۔ ص ۱۱۲

۶۔ ایضاً ۔ ص ۱۰۶

(۲) " بعض هندو احباب نے اکثر یہ اعتراض کیا ہے کہ اصطلاحات علمی کے ترجمے کے وقت عربی و فارسی کی طرف کیوں رجوع کیا جاتا ہے ......(ایسے معترض) حضرات .... مسئلہ کو ادبی نقطۂ نظر سے نہیں صرف فرقہ وارانہ اور مذہبی اسپرٹ کے ماتحت حل کرنا چاہتے ہیں .... خاص محل و موقع کے لئے کچھ خاص ہی الفاظ مناسب و موزوں ہو سکتے ہیں ۔ اس کے لیے ہندی یا عربی و فارسی کی کوئی تخصیص نہیں کبھی اس ضرورت کو بجائے فارسی الفاظ کے ہندی الفاظ اور کبھی بجائے ہندی کے عربی و فارسی الفاظ پورا کر سکتے ہیں ۔"[1]

(۳) " انتقاماً اردو میں غیر مانوس ہندی اور سنسکرت الفاظ کی آمیزش شروع ہوگئی یہ پیوندکاری ایک طرح سے " ہاتھی دانت میں آبنوس کا پچر ہے " جس سے اردو زبان کی شگفتگی سخت معرض خطر میں آ گئی ہے ۔ اس قسم کی فرقہ وارانہ منافرت نے جس طرح اکثر شعبہ ہائے امن و حیات کو غارت کر رکھا ہے ۔ اس طرح ہماری زبان بھی کشاکش باہمی کا شکار ہو رہی ہے ع

دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا "[2]

(۴) اردو زبان کا مسئلہ اگر تعصبات مذہبی سے ٹکرا گیا تو تنگ نظری و جہالت کی ایک نہایت تاریک و افسوسناک مثال ہوگی .... اگر طرفین کی طرف سے بربنائے تعصب اردو میں نامانوس ہندی الفاظ یا ثقیل عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش کی گئی اور فریقین نے اپنی اپنی جانب اسے گھسیٹنا چاہا تو اس سے یہ کبھی نہ ہوگا کہ ہندوستان میں عربی و فارسی زبان یا ٹھیٹ ہندی اور سنسکرت زبان رائج ہو جائے ...... البتہ ان بیجا کاوشوں سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ ایک شگفتہ اور ہونہار زبان (اردو) .... ہمارے ہاتھوں سے برباد ہو جائے ۔"[3]

(۳) اردو کی بقا کے لئے اتفاق و اتحاد ضروری ہے ۔

(۱) " اردو کو ہندوستان کی مقبول و مشترک زبان بننے کے لیے ہندو مسلم تعلقات کا خوش گوار ہونا از بس ضروری ہے ۔"[4]

۱۔ اردوئے معلیٰ بسلسلہ استفسارات ۔ ص ۱۱۳
۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۰۷
۳۔ ایضاً ۔ ص ۱۱۳
۴۔ ایضاً ۔ ص ۱۰۲

(۲) " حقیقت یہ کہ ھندی اور اردو میں شاید اتنا اختلاف نہیں ہے جتنا ھندی اور اردو کے پرستاروں میں ہے اس لیے اس مسئلہ کا حل اردو اور ھندی کی کثر بیوحت سے اتنا ممکن نہیں ہے جتنا اردو اور ھندی کے علم برداروں کی ذھنیت کی اصلاح سے -[۱] "

(۵) اردو کے معاملے میں بے اعتدالی مستحسن نہیں -

(۱) " معمولی گفتگو جس کا اصلی حسن سادگی ، بے تکلفی و روانی ہے طرح طرح کے لطائف و صنع آمیز استعارات و تراکیب نحوی سے گرانبار ہونے لگی (ہے) بعض حضرات کو مخارج کی ادائیگی کا بھی شدت سے لحاظ رہتا ہے - اس جدو جہد میں حلق سے لے کر شکم و سینہ تک وہ فشار و تشنج کا عالم ہوتا ہے کہ مجھے تو یہ شبہ ہوا امعاء مستقیم اپنے مرکز ثقل سے نہ ہٹ گئی ہو -[۲] "

(۲) " ایک مشہور ھندو جرنلسٹ نے ایک صحبت میں بعض (اس) قسم کے عنوانات " ملاحظات " ، " جرعات " ، " الہامات " ، " اسئلہ و اجوبتہ " وغیرہ دکھلا کر کہا غالباً جناب بھی ھندوستان میں ایک مشترک زبان کے خواہش مند ہوں گے - یہ فرمائیے کہ ان بے اعتدالیوں سے کیا آثار پائے جاتے ہیں - کم از کم مجھے تو مسکرا کر خاموش ہو جانا پڑا میری غرض یہ نہیں ہے کہ اردو میں ترکیب و اضافت نہ ہو یا عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش نہ ہو اور نہ یہ غرض اس ھندو جرنلسٹ کی تھی اصل سوال موقع و محل کا ہے[۳] "

(۶) اردو کی صحیح خدمت راہ اعتدال اختیار کرنے میں ہے -

(۱) " ہر لکھنےوالے کی یہ آرزو ہوتی ہے اور ہونی چاہیے کہ اس کے گردو پیش انسانوں کی بڑی سے بڑی تعداد اس کے خیالات سے مستفید ہو سکے .... اس لحاظ سے ہمارے صوبے کے اہل قلم ، زبان کی سنجیدگی و شگفتگی کو نقصان پہونچائے بغیر اگر کسی قدر صفائی و سادگی کو گوارا کر لیں تو کیا جو افادہ اس سے متصور ہے وہ اس خفیف سے ادبی جرم کی تلافی نہ کر سکے گا -[۴] "

۱- اداریہ رسالہ ھندستانی - الہ آباد جولائی ۱۹۳۱ء - ص ۱۵۷

۲- اردوئے معلیٰ بسلسلہ استفسارات - ص ۱۰۶

۳- ایضاً - ص ۱۰۶

۴- اداریہ - ھندستانی جولائی ۱۹۳۱ء - ص ۱۵۵

(۲) " ممالک متحدہ میں مذاہب کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ کوئی بیچ بیچ کا راستہ اختیار کیا جائے [۱]۔"

(۷) علمی و ادبی وقار کے لئے عربی و فارسی الفاظ ناگزیر ہیں ۔

(۱) " علمی مضامین یا دیگر تحقیقی و مذہبی مسائل کے لیے عبارت میں سنجیدگی درکار ہے اسکے لئے فارسی تراکیب و عربیت ناگزیر ہے [۲]۔"

(۲) " علمی و ادبی مضامین میں خیالات کی بلندی و سنجیدگی مجبور کرتی ہے کہ عربی و فارسی کے پرشکوہ الفاظ بھی استعمال کئے جائیں ۔ تعلیم یافتہ دماغ جب سے نئے نئے خیالات سے روشناس ہو رہے ہیں تو طرز ادا میں جدت و ندرت بھی لازمی ہے [۳]۔"

(۸) زبان کی حقیقی عظمت ۔

(۱) " ایک ترقی یافتہ زبان کی حقیقی عظمت سنجیدہ غور و مطالعہ اور پرفکر شائستہ خیالی پر منحصر ہے [۴]۔"

(۹) اردو والوں کو ہندی شعر و ادب سے استفادہ کرنا چاہیے ۔

(۱) " میں یہ سمجھتا ہوں شباب انگیز رنگینیوں (رس) میں بہاری اور پدماکر اور اخلاق و تصوف میں تلسی داس اور کبیر کا کلام بہت خوب ہے اور اردو شاعری میں سلیقہ کے ساتھ اس سے بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے [۵]۔"

(ب) اصغر کا نظریۂ نثر :

اصغر کا نظریہ نثر سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ پہلے ان کے نقطہ نظر سے نظم و نثر کے فرق کو سمجھ لیا جائے ۔ اس سلسلے میں وہ رقمطراز ہیں :

(۱) نظم و نثر کا فرق ۔

" نظم و نثر یا بالفاظ دیگر شاعرانہ و علمی بیان کو باہم اتنا ہی مختلف ہونا

۱۔ اداریہ ۔ ہندستانی جولائی ۱۹۳۱ء ۔ ص ۱۵۵
۲۔ اردوئے معلیٰ بسلسلہ استفسارات ۔ سہیل علی گڑھ ۔ جنوری ۱۹۲۶ء ۔ ص ۱۰۶
۳۔ ایضاً ۔ ص ۱۰۷
۴۔ اداریہ ہندستانی جولائی ۱۹۳۱ء ۔ ص ۱۵۸
۵۔ مقدمہ رباعیات رواں مرتبہ اردو مرکز لاہور ۔ ص ۹

چاہیے جتنا ان دونوں کے اصل سرچشمے (یعنی جذبہ و عقل) مختلف ہیں ۔ یہ ذہن کی مستقل دو جداگانہ حالتیں ہیں اور دونوں کے حسن بھی مختلف (ہیں) جو حسن عقلیات کے نقطۂ نظر سے حسن ہے یہ ضروری نہیں کہ جذبات کے نقطۂ نظر سے بھی حسن ہو ۔ ایک کی کمی کو دوسرے سے پورا کرنا کمی پورا کرنا نہیں بلکہ اس میں ابتذال اور بھدا پن پیدا کرنا ہے [1]۔"

نظم و نثر کے اس واضح بنیادی فرق نے ، نثر سے متعلق ان کا تصور بڑا روشن و متعین کر دیا ہے ۔ ذیل میں نثر سے متعلق ان کا وہی تصور پیش کیا جاتا ہے :

(۱) نثر کی ماہیت اور اس کا دائرۂ کار ۔

(الف) علمی نثر

(۱) " عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ منطقی استدلال اور علمی تجربات کے ذریعہ حقیقتوں کو متعین کرے ، تعین اور صحیح تعین کے لیے ہمیشہ ایسے الفاظ اور ایسے طرز بیان کی ضرورت ہوتی ہے جو صاف و سادہ ہوں ، جن میں کسی قسم کا ابہام نہ ہو اور سننے والے یا پڑھنے والے کا ذہن اس سے ہٹ کر کسی دوسری طرف منتقل نہ ہو سکے ۔ اس لحاظ سے عام طور پر .... عقلیات کے لیے نثر موزوں سمجھی جاتی ہے [2]۔"

(۲) " علمی و عقلی نثر جس میں کیفیت نفس کم یا بالکل کارفرما نہ ہو وہ بیان محض اور نفس الامری تخیل کی زبان ہے [3]۔"

(۳) " نثر یعنی علمی و عقلی تحریر از سر تا پا سوسائٹی کی باہمی گفتگو اور ایک معمولی تبادلہ خیال ہے [4]۔"

(ب) ادبی نثر

کیفیت نفس کی آمیزش سے نثر شعریت میں ڈھلتی جاتی ہے ۔

(۱) " جو بات مع تاثیر یا اپنی کیفیت نفسی کے ...... پیش کی (جائے) .... اگر اوزان و قوافی کے حدود میں ہو تو اسے "شعر منظوم " کہیں گے اور

۱۔ نظم و نثر پر ایک نظر ۔ از اصغر رسالہ ہندستانی الہ آباد جولائی ۱۹۳۱ء ۔ ص ۳۲۳

۲۔ ایضاً ۔ ص ۳۲۵-۳۲۳

۳۔ ایضاً ۔ ص ۳۲۶

۴۔ ایضاً ۔ ص ۳۲۹

اگر ان پابندیوں کا لحاظ نہ کیا جائے تو اس بیان پر " شعر منثور " ، " خطابت " اور " ادبی نثر " کا اطلاق ہوگا [1]۔"

(۲) " شاعرانہ کیفیات و جذبات کی نثر جس قدر کیفیات و جذبات سے قریب تر ہوتی جائے گی اسی قدر شعریت میں تبدیل ہوتی جائے گی [2]۔"

(ج) مزاحیہ نثر ۔

" ادب کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ سوسائٹی کو اس سے مسرت حاصل ہو ۔ جس نثر میں علم و فن کے اعتبار سے کوئی بڑا افادی پہلو نہ ہو لیکن اسے پڑھ کر .... ایک لمحہ کے لیے غم غلط کر سکیں تو .... ایک بہترین غرض بھی ہوگی اس طرح کی نثر کے لیے .... لکھنے والے کے ذہن میں عقل کے ساتھ ایک خاص قسم کی شگفتگی اور لطافت بھی ہو (نا چاہیے) [3]۔"

۲۔ نثر کی خوبی :

(۱) " ایک عمدہ علمی نثر کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے دوران میں ہم لکھنے والے کی تحسین و ستائش میں مبتلا نہیں ہوتے .... بیان کی اہمیت ، اسکی سنجیدگی اور اس کی خوبی ترتیب ہماری توجہ کو اس درجہ مصروف رکھتی ہے کہ ہمیں ان امور کی فرصت ہی نہیں ملتی [4]۔"

(۲) " علمی و عقلی نثر کی عمدگی اس کے " اصابت " پر منحصر ہے .... اصابت کا تقاضا احتیاط اور صبر و استقلال ہے ۔ اصابت کسی خاص شخص یا کسی خاص واقعہ کے متعلق نہیں بلکہ اس سے مراد عام " عادت اصابت " سے ہے جو ہر تخیل اور ہر بیان سے متعلق ہو [5]۔"

۱۔ نظم و نثر پر ایک نظر ۔ از اصغر ۔ رسالہ ہندستانی الہ آباد جولائی ۱۹۳۱ء ص ۲۲۷

۲۔ ایضاً ۔ ص ۲۳۶

۳۔ ایضاً ۔ ص ۲۳۵

۴۔ ایضاً ۔ ص ۲۵۰-۲۴۹

۵۔ ایضاً ۔ ص ۲۴۹

(۳) " نثر میں بعضوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ مشکل الفاظ ، پیچیدہ تراکیب اور شاعرانہ طرز بیان سے ان کی عبارتوں میں وزن پیدا ہو جائے گا - عوام اور ناواقف لوگوں کا ذکر نہیں ، لیکن جو لوگ صحیح ذوق اور صحیح نظر رکھتے ہیں وہ اس طرح کی نثر کو .... اتنا ہی ناپسند کرتے ہیں جتنا .... مصنوعی نظم و شعر کو -[1]"

(۴) " کسی خبر یا واقعہ کی علمی توضیح و تشریح (عمدہ علمی نثر) کے معنی یہ ہیں کہ بغیر کسی جذبہ کی آمیزش کے اسے پیش کیا جائے - لیکن اگر اس کے بیان میں کسی قسم کا شاعرانہ رنگ و روغن استعمال کیا جاتا ہے تو یہ ایک قسم کی ادبی فریب کاری ہے جس سے ہر شائستہ وسنجیدہ شخص کو اجتناب کرنا چاہیے -[2]"

۳- نثر نگار کا مقام و منصب :

(۱) " ایک نثر نگار ہماری ہی معمولی سطح پر ، ہماری ہی گلی کا ایک آدمی ہوتا ہے - اس کی گفتگو آپس کی گفتگو ہوتی ہے .... گفتگو کو خواہ وہ کتنے ہی اعلیٰ درجہ کی کیوں نہ ہو گفتگو ہی رہنا چاہیے یہ نہیں کہ وہ چیخ بن جائے یا موسیقی کا رنگ اختیار کر لے -[3]"

(۲) " علمی و تحقیقی بیان کے لئے نثر نگار کا ذہن غیر مطمئن مگر اسی کے ساتھ غیر عاجل بھی ہوتا ہے - وہ اپنے تخیل اور طرز بیان میں ان تمام محاسن اور خوشنمائیوں سے بچتا ہوا چلتا ہے جو اصل موضوع سے متعلق نہیں ہوتے - اس طرح اسکے تکملہ کے بعد اپنی خود ایک خوشنمائی اور خوبصورتی اختیار کر لیتا ہے -[4]"

۴- نثر میں انفرادیت :

" ایک بات کے کہنے کے بے شمار طریقے ہیں - یہی مختلف طریقے جن سے بیان کی حیثیت و نوعیت تبدیل ہوتی ہے لکھنے والے کی .... نثر نگاری کا درجہ متعین

۱- اردو نثر و نظم پر ایک نظر از اصغر رسالہ ہندستانی الہ آباد جولائی ۱۹۳۱ء ص ۲۳۲
۲- ایضاً
۳- ایضاً - ص ۲۳۹
۴- ایضاً - ص ۲۳۹

کرتے ھیں ۔ جب کوئی شخص کچھ لکھنا یا بیان کرنا چاھتا ھے تو اپنی ذھنی اور نفسی کیفیتوں کے ساتھ اسے پیش کرتا ھے ۔ اسطرح اس بات یا واقعہ کی حالت میں اپنے بیان سے کچھ اضافہ کر دیتا ھے ۔ اس کی یہ ذھنی و نفسی کیفیت ، اس کی انفرادیت و شخصیت ھے اور اس اضافہ کا عام طریق عمل اس کا " طرز " کہلاتا ھے [1] ۔"

نثر سے متعلق اصغر کے مذکورہ بالا افکار کا تجزیہ و خلاصہ یہ ھے :

(۱) نثر عقل کی تخلیق ھے ۔ اس کی عظمت سنجیدہ غور و مطالعہ اور پرفکر شائستہ خیالی میں ھے اور اس کا حسن بیان کی اھمیت ، اس کی سنجیدگی اور خوبی ترتیب میں ۔

(۲) نثر کی دو قسمیں ھیں :

(الف) علمی و تحقیقی (ب) ادبی و خطیبانہ یا شگفتہ و مزاحیہ

(الف) علمی و تحقیقی نثر کی خصوصیات :

۱۔ ابہام سے پاک ـــــ واضح و صاف ھو

۲۔ مدلل ھو

۳۔ حقائق کا تعین احتیاط و اصابت سے کیا گیا ھو

۴۔ تبادلۂ خیال ـــــ افہام و تفہیم کا انداز ھو

۵۔ آرائش و محاسن کلام سے پاک ھو ـــــ سادہ ھو

۶۔ سنجیدہ ، مربوط و مرتب ھو

(ب) ادبی و خطیبانہ اور مزاحیہ نثر کی خصوصیت :

(۱) کیفیات و جذبات نفس میں ذہنی ھوشی / یا لطافت و شگفتگی کی حامل ھو

اس تجزیے سے اندازہ ھوتا ھے کہ اصغر کی نظر مغربی ادب اور اس کے جدید ترین تصورات پر گہری تھی (جیسا کہ آگے تفصیل سے ذکر آئے گا) ۔ چنانچہ رشید احمد صدیقی صاحب کایہ فرمانا کہ

" انگریزی کی خواندگی کچھ زیادہ نہ تھی [2] ۔"

پایۂ اعتبار سے ساقط ھو جاتا ھے ۔

۱۔ نظم و نثر پر ایک نظر ۔ از اصغر رسالہ ھندستانی الہ آباد ۔ جولائی ۱۹۳۱ء ص ۳۳۶

۲۔ گنج ھائے گرانمایہ ۔ ص ۱۰۳

مذکورہ بالا افکار اور اردو کی "نثر جدید" کی ترقی و رفتار کی روشنی میں جب اصغر کی نثر کا جائزہ لیا جاتا ہے اور بحیثیت نثر نگار ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا جاتا ہے تو ان کی نثر کی درج ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں :

(۱) فلسفیانہ انداز تحریر :

اصغر کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی فلسفیانہ افتاد طبیعت ہے وہ کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے ، اس کی "بنیادی فکر" تلاش کرتے ہیں پھر اسی بنیاد پر بحث کی پوری عمارت اس طرح تعمیر کرتے ہیں کہ ہر فروعی بحث اصل بحث سے پھوٹتی ہوئی اپنی اپنی جگہ پر ختم ہوتی چلی جاتی ہے - پوری بحث میں ایک منطقیانہ ربط و فلسفیانہ ترتیب ہوتی ہے - مضمون کے مجموعی تاثر سے قاری پر بڑا خوشگوار ہوتا ہے جب وہ مضمون شروع کرتا ہے تو مصنف کے بڑھتے ہوئے خیالات کے ساتھ اور اس کے استدلال کے سہارے آگے بڑھتا رہتا ہے - جب مضمون کو ختم کر لیتا ہے تو لکھنے والے کی تحریر سے مرعوب و متاثر ہونے کے بجائے اس کے دلائل سے مطمئن اس کے خیال سے متفق اور اس کا ہم نوا ہو جاتا ہے - اس بات کی وضاحت کے لیے ان کے ایک مکتوب کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے - یہ خط مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام (۳۱-۱۹۳۰ء) لکھا گیا ہے - مولانا نے اپنی منکوحہ کو طلاق دی تو نیاز فتحپوری ، ان کے خویش مولوی محمد رفیع اور خواجہ حسن نظامی نے ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا اور ادبی و اشتہاری پروپیگنڈے کا محاذ قائم کر لیا -- اصغر اس بات پر حد درجہ متاسف تھے - وہ طلاق کو ہر شخص کا شرعی حق اور نارضامندی کو وجہ کافی سمجھتے تھے - چنانچہ لکھتے ہیں :

"میرا پر درد تجربہ یہ ہے کہ مسلمان دین سے تو محروم ہو ہی گیا مگر اسے وہ فہم دین بھی نہیں جو ایک غیر مسلم کو حاصل ہے .... ایک مشہور ہندو بزرگ نے یہ کہا کہ اعتراض کرنے والوں کو اسلامی قانون پر اعتراض کرنا چاہیے جس نے طلاق کو جائز کیا - عبدالماجد صاحب پر اعتراض زبردستی ہے .... عوام کو کیا کہا جائے اپنی عقل سے سمجھنے کی طاقت ہی ان سے سلب ہوگئی - ایک شخص ہے جس نے اپنی بیوی کو طلاق دیا ہے - طلاق کا مفہوم نارضامندی اور علیحدگی ہے کیا غضب ہے کہ نارضامندی کا فیصلہ اہل ملک کرنے لگیں - اگر یہی دستور رہا تو کسی شخص کو نکاح و طلاق کے معاملے میں مطمئن نہ رہنا چاہیے - ممکن ہے کہ جس طرح طلاق کو لوگ طلاق نہیں تسلیم کرتے اسی طرح نکاح کو نکاح

تسلیم نہ کریں ۔ اگر طلاق کے لئے صرف نارضامندی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضرورت ہے کہ بیوی کے معائب ایک ایک کر کے اہل ملک کو تسلیم کرا جائیں تو یقیناً نکاح کے وقت ایک رسالہ جس میں بیوی کے محاسن درج ہوں شائع کرانا پڑے گا ۔ اس کے بعد بھی ممکن ہے کہ اہل ملک اسے کافی سمجھیں یا نہ سمجھیں ۔[1]"

(۲) طنز و مزاح :

اس عبارت سے نہ صرف یہ کہ مذکورہ بالا دعوی کی تصدیق ہوتی ہے بلکہ اصغر کی افتاد طبیعت کے بعض اور پہلو بھی سامنے آتے ہیں ۔ مثلاً خط کشیدہ عبارت میں طنز و مزاح کی ہلکی ہلکی چاشنی بھی شامل ہے ــــــ اصغر کی طبیعت میں شگفتگی و لطافت تھی اور ذہن میں ایک واضح اخلاقی معیار تھا ۔ زندہ دلی سے ان کی تحریروں میں شگفتگی و مزاح پیدا ہوا اور اخلاقی معیار کی پامالی کے احساس سے طنز و برہمی آئی ۔ ان دونوں کیفیتوں سے کہیں کہیں ان کی عبارت گنگا جمنی ہو گئی ہے اور وہ رشید احمد صدیقی کے قریب پہنچ گئے ہیں ۔ یہ رنگ اگرچہ بڑا دلکش ہے لیکن یہ ان کا اصلی رنگ نہیں ہے شاید جن موضوعات پر انھوں نے قلم اٹھایا ہے ان کی سنجیدگی نے ، ان کھلنے کے اظہار کا موقع نہیں دیا ۔ لیکن جہاں جہاں بے اختیاری میں یہ رنگ جھلک گیا ہے تحریر دلکش ہوگئی ۔ ذیل میں ان کی تحریروں سے کچھ نمونے پیش کئے جاتے ہیں ۔ ان میں خط کشیدہ الفاظ سے میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے :

" الہلال مرحوم نے جب سے مذہبی و سیاسی مسائل کی تحقیق میں ادب عالیہ کے .... نمونے پیش کر دیئے تو ناشناسانہ تقلید کی بدولت ذرا ذرا سی بات پر حلق سے زہر مہرہ اگلنے کا ایک عام دستور ہو گیا ــ .... روزمرہ کا ایک خفیف سا واقعہ ہے مگر شدت جوش کا یہ عالم ہے کہ ذرات عالم سے خون نچوڑ نچوڑ

۱ـ مکتوب اصغر بنام مولانا عبدالماجد دریابادی ــــ سرنامہ پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن بعض قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مکتوب ۱۰ جون ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء کی پہلی ششماہی کے درمیان کی کسی تاریخ کا ہے ۔ تفصیل مقالہ ہذا ص پر دی جا چکی ہے ۔

کر تبدیل فلک بنا دیتے ہیں ۔ ایک چھوٹا سا مچھر مارنا ہوا تو
ہزارہا رجز و تکبیر کے ساتھ جھک جانسن نامی توپ کا گولہ سر ہونے
لگا ۔ معمولی گفتگو جس کا اصلی حسن سادگی ، بے تکلفی و روانی
ہے طرح طرح کے لطائف و تصنع آمیز استعارات و تراکیب نحوی سے
گرانبار ہونے لگی ۔ بعض حضرات کو مخارج کی ادائیگی کا بھی شدت
سے لحاظ رہتا ہے ۔ اس جدو جہد میں حلق سے لے کر شکم و سینہ
تک وہ فشار و تشنج کا عالم ہوتا ہے کہ جیسے تو یہ شبہ ہوا" امعاء
مستقیم " اپنے مرکز ثقل سے نہ ہٹ گئی ہو ۔[1]"

اقتباس کا آخری ٹکڑا " امعاء مستقیم و مرکز ثقل " میں صوتی اعتبار سے وہی حلق سے شکم و سینہ تک فشار و تشنج کی کیفیت پیدا کی گئی ہے ۔

ایک دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو :

" بعض حضرات نے تو یہاں تک سمجھ لیا کہ شاید نظم و نثر کو
سرے سے رسالے میں جگہ نہ مل سکے گی حالانکہ اصولاً ایسا نہ تھا
البتہ نظم و شعر کے نام کے ساتھ ہی ذہن کے سامنے غزل یکت
حملہ آوریں بلکہ بلوائیوں کا ایک ہجوم نظر آیا جس سے سہم جانا
قدرتی امر تھا ۔[2]"

طنز کا شوخ رنگ :

لیکن جیسا کہ مذکور ہوا طنز و مزاح کا " دوسرا " رنگ جسے لطیف و خوشگوار انداز تحریر سے تعبیر کر سکتے ہیں ان کا مستقل اور اصلی رنگ نہیں تھا بیشتر مقامات پر ان کی تحریروں میں لطیف مزاج غائب ہو گیا ہے اور لہجہ کی تندی و تلخی نے شوخ و تیز ہو کر کہیں کہیں " شائستہ دشنام طرازی " کی شکل اختیار کر لی ہے ۔ انھیں کی زبان میں اگر اسے کہنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ ان کی "گفتگو گفتگو سے گزر کر چیخ " بن گئی ہے ۔ ایسے موقعوں پر اصغر نے اپنے خیالات کے لیے نئے نئے الفاظ و تراکیب

۱۔ اردوئے معلیٰ بسلسلہ استفسارات ۔ جواب اصغر ۔ سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۲۶ء ۔ ص ۱۰۶

۲۔ اداریہ رسالہ ہندستانی الہ آباد ۔ اپریل ۱۹۳۱ء ۔ ص ۳۲۶

ایجاد کی ہیں ان میں تندی و تیزی کے ساتھ بھرپور " ابلاغ " ہے ۔ اس طرز میں ان کے یہاں سجاد انصاری اور مہدی افادی کی جھلک خاص طور پر نمایاں ہوگئی ہے ۔ وہی برہمی وہی بت شکنی وہی وضع الفاظ کی کوشش ---- اپنی بات کی وضاحت و تائید میں دو مختصر اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں :

" تہذیب انسانیت کے نزدیک عورت بلکہ اس کے کل تعلقات و متعلقات خلوت کدوں کا فطری راز ہیں لیکن جب اسے قلم کی نوک سے کرید کرید کر گزرگاہ عوام پر رکھا جائے اور فرط ذوق سے سیری نہ ہو ۔ علمی حلقوں میں ابھی اس " معصیت ادبیہ " کو " رعنائی خیال " ، " رنگینی فکر " کہہ کہہ کر اظہار تفاخر بھی کیا جائے تو فرمائیے اسے فسق و بزدلی (بلکہ اگر اجازت دیجئے تو اسے بے حسی و بے غیرتی) کے سوا اور کیا کہیں [۱] ۔"

دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو :

" اگر زبان و محاورہ ایسی چیزیں ہیں جن کی حیثیت عرض و سطح سے زیادہ اور لوگوں کو بیجا نکتہ چینیوں کا حق حاصل ہے تو پھر جو کچھ محاورہ اور زبان کی حدوں میں فرمایا جاتا ہے اس کی معصیت و لطافت کا بھی اسی سختی کے ساتھ کیوں نہ جائزہ لیا جائے ؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے جاننے کی مطلق ضرورت نہیں زمانہ خود بہت بڑا نقاد ہے ۔ اس نے لوگوں کو ان کا اٹھتا ہوا جنازہ ، ان کی آنکھوں سے دکھا دیا ہے اس سے زیادہ " نقد " اور کون سی تنقید ہوگی [۲] ۔"

اقتباسات بالا میں " معصیت ادبیہ " ، " رعنائی خیال " اور " رنگینی فکر " میں اور " اٹھتا ہوا جنازہ " وضع تراکیب کی کوشش اور " فسق و بزدلی " ، " بے حسی و بے غیرتی " میں " دشنام طرازی " کا پہلو صاف نمایاں ہے ۔

۱۔ اردوئے معلی؛ بسلسلہ استفسارات ۔ جواب اصغر ۔ مطبوعہ سہیل علی گڑھ ۔ جنوری ۱۹۲۶ء ص ۱۱۰-۱۰۹

۲۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ از اصغر ۔ رسالہ زمانہ کانپور ۔ ستمبر ۱۹۲۹ء ۔ ص ۱۲۸

متوازن انداز تحریر -- جذبہ و استدلال کا حسین امتزاج :

اصغر کی انداز تحریر کی ایک بڑی خصوصیت اس کا استدلال ہے - لیکن ان کے استدلال میں مولانا حالی کی خشکی و بے کیفی نہیں ہے - اسمیں تخیل کی رنگینی اور جذبہ کی تپش بھی ہے - جس بات کا انداز افہام و تفہیم کا ہوگا اس میں دلیل کی قوت کے ساتھ " زور بیان " بھی ضروری ہے - اصغر اس گر سے واقف تھے - وہ " علمی تحریروں " کو چوں کہ باھمی گفتگو اور " تبادلہ خیال " کہتے ہیں اس لیے کوئی بات پیش کرتے وقت وہ انہیں دونوں (استدلال و زور بیان) چیزوں کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی بات میں وزن و وقار پیدا کرنے کے لیے ان کو مضبوط و محکم بناتے ہیں - دلیل عقل کی کارفرمائی ہے جسو آھستہ آھستہ آگے بڑھتی اور قاری یا سامع کے ذھن میں آھستہ آھستہ اترتی جاتی ہے - زور بیان جذبہ کی گرمی سے پیدا ہوتا ہے جذبہ الفاظ کے انتخاب میں بڑی چابکدستی اور ہوشیاری کا مظاہرہ کرتا اور ان میں اپنی حدت بھر دیتا ہے ---- ان دونوں کیفیتوں کے امتزاج سے جو اسلوب تیار ہوتا ہے وہ بڑا متوازن و معتدل ہوتا ہے - اس میں جذبہ و عقل دوش بدوش چلتے ہیں - دونوں دو مختلف سمتوں سے قاری یا سامع پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اس کو بھی طرح اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں - قاری نہ عبارت کی رنگینی و جذبہ کی شدت سے مسحور و متاثر ہوتا ہے اور نہ عقل کی دراکی اور دلیل کی محکمی سے مبہوت و مرعوب ، بلکہ غیر محسوس طریقہ پر ، عقل و دل کی پوری بیداری کے ساتھ وہ بات کے وزن و وقار کو دیکھتا اور اسے قبول کرتا جاتا ہے ---- اصغر کے اسلوب کی یہی خصوصیت ہے - جو کچھ کہا گیا ہے اس کی تائید ذیل کے اقتباس سے بخوبی ہوتی ہے :

" اگر آبشار کی آواز اور مغنی کا نغمہ ہمیں بیخود بنا دیتا اور شفق کی سرخی اور مرغزار کی سبزی ہم میں کوئی کیفیت پیدا نہیں کرتی تو اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ ہمارا سامعہ تو صحیح ہے مگر ہماری بصارت و بینائی میں نقص ہے - انسان کے احساسات و ادراکات کا استقصاء و شمار آسان نہیں - کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری ہستی کے کن کن اجزاء کو کن کن چیزوں کی کشش و احتیاج ہے - انسان خود کو جس قدر وسیع کرتا جاتا ہے اتنا ہی حسن بھی اس کے سامنے وسیع ہوتا جاتا ہے [1] "

۱- اردو شاعری کی ذھنی تاریخ از اصغر - رسالہ زمانہ کانپور - ستمبر ۱۹۲۹ء - ص ۱۲۷

ربط و تسلسل :

اصغر کے اسلوب کی ایک خوبی ، ربط و تسلسل ہے ۔ یعنی ان کی بات قدم بقدم آگے بڑھتی ہے ۔ اور ہر قدم دوسرے سے اتنے متوازن و معتدل فاصلے پر پڑتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ، ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑی ہیں ۔ اس بات کو زیادہ صاف و واضح کرنے کے لیے ایک پیش پا افتادہ مثال " مشین کا بخیہ " کی دی جا سکتی ہے ------- مسجل و متوازن ٹانکوں کا ایک سلسلہ --- ہر ٹانکا دوسرے کا مثنیٰ --- برابر ، مسجل اور مربوط --- درمیان میں نہ کوئی فاصلہ نہ کھانچا --- اصغر کے اسلوب کی یہی " زنجیریت " یا بخئیت " ۔ اس کا عام حسن ہے ۔ مثال سے بات واضح ہو جائے گی ۔ " رندی و مستی " کے سلسلے میں رقمطراز ہیں :

" ہم حسن سے صرف حسن اور " بادہ و ساغر " سے مطلق محبت و مستی سمجھتے ہیں اور اس " حسن و مستی " کو کسی خاص شے سے مختص کر کے اسے محدود و مقید کرنا نہیں چاہتے لیکن اسی کے ساتھ اصلی استعداد کی سطح کو بھی ایک نہیں سمجھتے ۔ شعراء کی جماعت میں یہ لازم نہیں کہ سب حقائق آشنا ہوں اور نہ یہ ضرور ہے کہ تمام شعراء بد وضع اور بدچلن ہوں لیکن یہ لازمی ہے کہ شاعر کی فطرت حسن و مستی کی رمز شناس ہو اور اس سے متاثر ہوتی ہو ۔ تاثر و قدر شناسی خود شاعر کے فکر و عمل کی استعداد پر منحصر ہے لیکن " مطلق حسن و مستی " ہر شاعر کا اصلی مطمع نظر ہے ایک حسین انسان کو صہبائے تند و تیز کا چھلکتا ہوا جام صرف اس لیے محبوب و مرغوب ہے کہ وہاں " حسن و مستی " کے جلوے نظر آتے ہیں حالاں کہ فلسفیانہ حیثیت سے " حسن و مستی " کسی جسمانی پیکر اور مادی شے میں مقید نہیں لیکن جو اسے جہاں دیکھتا ہے اس کی استعداد فکر کو کون بدل سکتا ہے "[1]

پروقار عربی فارسی الفاظ کا استعمال :

" اصغر علمی و تحقیقی مضامین کی سنجیدگی کے پیش نظر فارسی تراکیب اور عربیت کو ناگزیر[2] " خیال کرتے ہیں ۔ یہ ان کا عقیدہ ہی نہیں ۔

۱۔ مقدمہ رباعیات رواں ۔ ص ۱۲

۲۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ۔ ص ۱۳۶

اس پر ان کا عمل بھی تھا ۔ گذشتہ سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ وہ اپنی بات میں وزن و وقار پیدا کرنے کے لئے دلیل کے ساتھ ، بیان کو بھی " پر زور " بناتے ہیں ۔ بیان میں زور و قوت وہ عربی الفاظ اور فارسی تراکیب سے پیدا کرتے ہیں ۔ لیکن ان کی تراکیب و الفاظ خوشگوار ، رنگین ، بامزہ اور پرزور ہوتے ہیں ۔ عربی و فارسی الفاظ کی کثرت کے باوجود ان کے یہاں " ابو الکلامیت " نہیں پیدا ہونے پاتی ۔ ان کا اسلوب گوارا ، باوقار اور سنجیدہ ہے ۔ اپنی بات کی توضیح و تائید میں ذیل کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے :

" اس زمانہ کی ہوس پرستانہ بیچارگیوں نے کمال سنجیدگی سے یہ سوال پیدا کیا ہے کہ " عشق حقیقی " جو اکثر قائلین فقر و تصوف کا ادعا ہے وہ سرے سے غیر فطری اور غلط معلوم ہوتا ہے ۔

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے

ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

"حسن صوری " کی ادائیں تو بین طور پر ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں ۔ ان کی تاثیر میں فطرت کی اعلیٰ ترین مصلحت توالد و تناسل بھی مضمر ہے ۔ لیکن " حسن مطلق " سے شیفتگی لوگوں کی ایک کورانہ تقلید ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اسکی اس بیسویں صدی میں کہیں سے ضرورت ہو ۔ اس لیے جس شاعری میں کھلے کھلے حسن صوری کے علاوہ ، متصوفانہ حسن حقیقی و حسن مطلق ، کا ذکر ہو تو اسے غیر فطری و غیر متغزلانہ کہنا بیجا نہ ہوگا [۱] ۔"

تقلیلِ الفاظ : (تقلیل)

اس کا مطلب ہے کم سے کم الفاظ میں کوئی بات بھرپور انداز میں پیش کر دینا ۔ ایسے اسلوب کے لیے حشو و زوائد ، مترادفات اور توصیفی اور تشبیہی ترکیبوں سے اجتناب ضروری ہے ۔ یہ انداز سائنٹفک تحریروں میں عام ہے ۔ مغرب کا جدید مزاج و اسلوب یہی ہے ۔ مشرق میں بھی ایجاز و اختصار کبھی حسن تھا ۔ خیر الکلام ماقلّ و ما دل میں اسی طرف اشارہ ہے لیکن ہندوستان میں " سبک ہندی " کے تتبع میں ، اردو میں جو اسلوب اختیار کیا گیا اس میں " تو طیہ بندی " اور " طومار نویسی " کا رواج

۱۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ۔ از اصغر ۔ ص ۱۳۶

عام ہوا ۔ سرسید تحریک نے جملوں کی استخوانی بندی اور عبارت کی آرائش کے مقابلے میں خیال کو تقدم و ترجیح دی ۔ لیکن تقلیل الفاظ پر زور وہاں بھی نہیں تھا ۔ مغربی ادب کے اثرات سے جہاں شعر و ادب سے متعلق ، نظریات ، تصورات ، اسالیب اور دوسری ادائیں آئیں وہیں " تقلیل الفاظ " یا " ایجاز " کا تصور بھی ، اردو نثر میں پہلی بار آیا ۔

اصغر اس تصور سے آشنا ، اس کے اثر کے قائل اور اس پر عامل تھے ۔ " قلت الفاظ " اور " ایجاز " ان کی تحریر کی بڑی نمایاں خوبی ہے ۔ اقتباس ذیل سے ان کے اسلوب کا یہ وصف ظاہر ہوتا ہے :

" جناب برق کی نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ جس طرح ان کے عنوانات بظاہر مشرقی اور ہندوستانی نظر آتے ہیں اسی طرح ان کی روح بھی خالصتاً مشرقی و ہندوستانی ہے ۔ مغربی شعر و ادب کی واقفیت سے صرف اس میں وسعت مذاق کا اضافہ ہوا ہے یہ نہیں کہ ان کی اصلیت و ماہیت تبدیل ہو کر ، مغرب کی بسیط فضا میں گم ہو گئی ہو اور شاید یہی وہ کامیابی ہے جو کسی بڑے سے بڑے جدید تعلیم یافتہ شاعر کو نصیب ہو سکتی ہے [1] "

مختلف اسالیب بیان پر قدرت :

(الف) بیانیہ اسلوب : اصغر کو ہر طرح کی نثر لکھنے پر قدرت حاصل تھی ۔ موضوع اور موقع و محل جس طرح کے اسلوب کے متقاضی ہوتے وہ اسی طرح کی نثر لکھتے ۔ لیکن زور بیان و روانی میں کہیں فرق نہ آتا ۔ رسالہ ہندستانی کے اداریے ، اکیڈمی کی رودادیں ، موہنجودارو ، بابو چنتامنی گھوش اور اسی قسم کے دوسرے مضامین ، بیانیہ انداز تحریر کے متقاضی تھے ، ان میں اس کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے ۔ اسی طرح ترجمے بھی ان کے بڑے رواں اور شگفتہ ہیں ، ہندوستان کی قدیم تہذیب اور دوسرے ترجموں میں بڑی روانی اور سادگی ہے ۔ اس قسم کی تحریروں میں عربیت و فارسیت کا وہ غلبہ کہیں نظر نہیں آتا جو ان کی عام ادبی اور علمی تحریروں میں ہے ۔ ذیل میں اس قسم کی تحریر کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے اس سے

۱۔ دیباچہ مطلع انوار ۔ از اصغر ۔ ص ۵۳

ان کی عام تحریروں کا فرق ، جن کے اقتباسات جا بجا مقالے میں دیے جا چکے ہیں ، واضح ہو جائے گا :

" اچھا سامان اچھے کاریگر اور اچھا برتاؤ ان کے کاموں کا اصل اصول تھا ۔ اگر کام ٹھیک نہ ہوتا یا وقت پر تیار نہ ہو سکتا تو وہ روپیہ خرچ کرنے کے علاوہ خود بھی انتہائی محنت کرکے ، بہر صورت اسے خاطر خواہ اور وقت پر تیار کر کے دم لیتے ۔ وہ ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے علم میں انڈین پریس سے کوئی خبر غلط یا خراب نکلے ۔ وہ ان خرابیوں کو رفع کرنے کے لیے بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر لیا کرتے تھے ان کی اسی خصوصیت کو ملحوظ رکھ کر اخبار لیڈر نے یہ اشارہ کیا تھا کہ " بابو چنتامنی کے کاموں میں درجہ دوم کی مطلق کوئی گنجائش نہیں تھی۔[1] "

(ب) بچوں کے لئے سادہ اور آسان اسلوب :

انڈین پریس الہ آباد کے دوران ملازمت میں[2] انھوں نے چھوٹی جماعتوں کے بچوں کے لیے مختلف ممالک کے حالات تحائف کے نام سے لکھا ۔ ان کتابچوں کا اسلوب بچوں کے مزاج و معیار کے مطابق عام فہم ، سادہ ، رواں اور دلچسپ ہے ، مشکل سے کہیں کوئی لفظ عربی و فارسی کا ایسا آیا ہے جسے بچے نہ سمجھ سکیں ۔ لیکن کوشش یہ کی گئی ہے کہ آہستہ آہستہ انھیں شائستہ نثر اردو اور اعلیٰ ادبیات سے بھی لطف اندوز ہونے کے قابل بنایا جائے[3] ۔ ان تحائف کا مواد انگریزی سے ماخوذ ہے لیکن ان کی زبان پر ترجمے یا آزاد ترجمے کا کہیں اثر نظر نہیں آتا ۔ اصغر کے اسلوب نے انھیں تصنیف کا درجہ دے دیا ہے ۔ ان کتابچوں میں اصغر کی فطری زندہ دلی نے ظرافت آمیز نوک جھونک بھی شامل کر دی ہے ۔ اس سے تحریر اور دلچسپ ہوگئی ہے ۔ ذیل میں ایک اقتباس درج

۱۔ بابو چنتامنی گھوش از اصغر رسالہ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۸ء ص

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے نقوش و آثار ۔

۳۔ دیباچہ تحفہ جرمنی از اصغر مطبوعہ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد ۔

کہا جاتا ہے اس سے ان کتابچوں کے اسلوب کا اندازہ ہوگا :

" متین ۔ تو کیا وہ آدمی کی بھی آنکھیں نکال لیتا ہے؟
صابر صاحب ۔ ہاں ہاں ۔ آدمی کی بھی آنکھیں نکال لیتا ہے ۔ ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے ۔ بہت سے آدمی ایسے پائے گئے جو اگرچہ زندہ تھے مگر ان کی آنکھیں غائب تھیں ۔ ان کی آنکھیں بھی کوّا نکال لے گیا ۔
حیدر صاحب ۔ صابر صاحب ، اب تو آنکھیں کھولنے اور بند کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے ۔ یہ میں آپ کے فائدے کی بات عرض کر رہا ہوں [1]"

(ج) ادبی اسلوب :

اسغر نے ایسی تحریر کو جس میں تاثیر یا کیفیت عشق کی آمیزش ہو ادبی اور خطیبانہ نثر سے تعبیر کیا ہے اور اسے علمی اور تحقیقی کام کے لیے ناموزوں قرار دیا ہے ۔ خود سختی سے اس پر کاربند رہے ہیں لیکن کہیں کہیں شدت جذبات میں ایسی نثر بھی قلم سے تراوش کر گئی ہے ۔ ایسے نثر پاروں میں بھی ان کے یہاں رعنائی و دلکشی کے ساتھ ان کا مرصع و مرتب مزاج نمایاں ہو گیا ہے جس میں تکلف و تصنع کا ذرا بھی شائبہ نہیں ۔ اس قسم کی نثر کا نمونہ درج ذیل ہے :

" مطلب یہ ہے کہ مسی سرمے اور پائنچہ دار پاجاموں کے ساتھ اختلاط مذموم و ممنوع ہے لیکن جب وہی برق بلا پارسی ساری میں ملبوس ہو کر خالص لٹریچر میں "عشوہ فرمائے تکلم" ہو تو اسے شوق سے آغوش میں لے لیجئے لیکن اس آغوش پر " ادب لطیف " کا ایک نازک سا پوش لگا کر " آغوش نظر " کہہ دیجئے ۔ بس اب یہی غارت گری لفظوں کے چند الٹ پھیر سے " مذاق لطیف " کہلائے گی .... بعض ذہین نوجوان اس " خوبصورت گناہ " کو " حسن خیال " کہتے ہیں یہ الفاظ کی سحر کاریاں ہیں کہ " جب چاہا جہاں سے چاہا حقیقتوں کا منظر تبدیل کر دیا ٭" شرط یہ ہے کہ یہ آرٹ ہے اس کے لئے " خوش مذاقی " شرط ہے ۔ مگر کوئی چپکے سے کہتا ہے کہ جی نہیں ۔
" فسق و بزدلی " بھی اس کے ضروری عناصر ہیں ۔ الغرض یہ "حسن مذاق"

۱۔ تحفۂ اسٹریلیان ۔ مصنفہ اسغر ۔ مطبوعہ انڈین پریس لمیٹڈ الٰہ آباد ۔ ص ۳۰
٭۔ چاہا جہاں سے منظر فطرت بدل دیا ہے کل جہان تابع فرمان آرزو
اسغر

یہ " ارتعاش رنگین " یہ " آشوب خیال " مع اپنے گاڑھے گاڑھے
لغت سامانیوں کے ادبی و معاشرتی زندگی میں اس قدر رچ بس
گیا ہے کہ اب اس سے عہدہ برآ ہونا محال نظر آ رہا ہے [1]"

عالمانہ اسلوب (اصغر کا اصلی اسلوب) :

اصغر کا اسلوب سائنٹفک ہے یعنی اس میں کسی موضوع پر افہام و تفہیم کے انداز میں ، منطقی استدلال اور علمی تجربات کی روشنی میں ، حقائق کے تعین کی کوشش کی گئی ہے ۔ ان کا انداز تحریر واضح و صاف اور ہر قسم کے ابہام و پیچیدگی سے پاک ہے ۔ اس کا حسن موضوع کی اہمیت ، سنجیدگی اور خوبی ترتیب میں ہے ۔ بالفاظ دیگر اس میں علمی و تحقیقی نثر کی تمام خوبیاں (منطقیت ، صفائی ، ایجاز و اختصار ، سنجیدگی و متانت اور خوبی ترتیب) جمع ہوگئی ہیں ۔ اور عربی و فارسی الفاظ کے استعمال نے اس میں عالمانہ شان و وقار پیدا کر دیا ہے ۔ یہی سائنٹفک اور عالمانہ انداز ان کا اصلی انداز ہے ۔ اس پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے ۔

اصغر نے جب قلم سنبھالا (تخمیناً و قیاساً ۷-۱۹۰۶ء تا ۱۹۳۶ء) تو اردو میں مختلف رنگ و آہنگ اور لب و لہجہ کی نثر کا رواج تھا ۔ ایک طرف سرسید اور حالی کا بے تکلفانہ ، خشک مگر منطقیانہ لب و لہجہ تھا ۔ دوسری طرف جامع مسجد کی سیڑھیوں کی بولی ٹھولی میں اس کے محراب و منبر کی گونج اور دھمک شامل ہو کر ، نذیر احمد کی آواز تھی ، تیسری طرف تشبیہات و استعارات اور دیگر محاسن شعری سے مزین محمد حسین آزاد کا شاعرانہ آہنگ تھا ۔ چوتھی طرف لطیف احساس شعریت لئے ہوئے شبلی کا عالمانہ انداز تھا ۔ ادبی کے ساتھ کچھ خورد وبزرگ معاصرین ۔ مثلاً

مولوی عبدالحق	۱۸۷۰ - ۱۹۶۱
مہدی حسن افادی	۱۸۶۵ - ۱۹۲۱
سجاد حیدر یلدرم	۱۸۸۰ - ۱۹۴۳
نیاز فتحپوری	۱۸۸۶ - ۱۹۶۶
ابوالکلام آزاد	۱۸۸۸ - ۱۹۵۸
سجاد انصاری	۱۸۹۲ - ۱۹۲۴ [2]

۱- اردوئے معلیٰ بسلسلہ استفسارات ۔ مطبوعہ سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۲۶ء ۔ ص ۸۹

۲- مطالعہ یلدرم مرتبہ سید معین الرحمن مطبوعہ نذر سنز لاہور طبع اول ۱۹۷۱ء ص ۸۲-۷۶

کی ملی جلی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں ۔ جن میں سے ہر ایک اپنی آواز کی کھنک، لہک ، لچک اور کڑک کی وجہ سے الگ پہچانا جاتا تھا ۔ ان سب آوازوں میں باستثنائے مولوی عبدالحق شاعرانہ لے غالب تھی ۔

اصغر کے مزاج کو پیش نظر رکھ کر اگر ان تمام اسالیب کا جائزہ لیا جائے تو اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ سرسید اور حالی کے لہجہ کی بے کیفی ، بے تکلفی اور " عوامیت ،، اصغر کے مذاق سے ہم آہنگ نہ ہو سکتی تھی ، لیکن اس کی منطقیت اور استدلالیت پر دلکش اور جاذب نظر چیز تھی ۔ اصغر کا اس سے متاثر ہونا فطری تھا چنانچہ انھوں نے اپنے انفرادی اسلوب کی تعمیر میں اسے بنیادی عنصر کی حیثیت سے قبول کیا (تفصیل آگے آئے گی) ۔

ڈپٹی نذیر احمد کا اسلوب قصہ کہانی اور ناول کے لئے موزوں ہو سکتا تھا لیکن علمی و سنجیدہ مضامین میں ، روزمرہ و محاورہ کی چاشنی میں ڈوبا ہوا ان کا لب و لہجہ مع اپنی بے جوڑ " ادقیت ،، کے ناخوشگوار بلکہ ناگوار معلوم ہوتا تھا ۔ اس لیے اصغر کو اس اسلوب میں کوئی کشش نظر نہ آئی ۔ اور وہ اس سے بچ کر نکل گئے ۔

مولانا محمد حسین آزاد کی شاعرانہ نثر نہ ہر شخص کے بس کی بات ہے ، نہ علمی و تحقیقی مضامین کے لیے وہ اسلوب پسندیدہ ہو سکتا ہے ۔ اصغر نے اس کی طرف بھی التفات نہ کیا ۔

شبلی کے اسلوب کا شعریت سے لبریز پروقار آہنگ ، ان کی لطیف شاعرانہ طبیعت کے عین موافق تھا لیکن وہ نثر میں سنجیدگی کے قائل تھے اس لیے وہ شبلی کے اسلوب کی ادبیت اور پروقار لہجہ سے تو ضرور متاثر ہوئے لیکن ان کے احساس شعریت کو پسندیدہ نہ سمجھتے ہوئے مسترد کر دیا (تفصیل آگے آئے گی) ـــــ وہ کاملاً شبلی کے بھی مقلد نہ ہو سکتے تھے ۔

ابوالکلام کے تہدید و وعید سے لبریز خطیبانہ[1] انداز کو وہ علمی مضامین کے لئے مناسب نہ سمجھتے تھے لہذا اسکی طرف بھی مائل نہ ہوئے ۔ مہدی افادی نے آزاد اور ڈپٹی نذیراحمد دونوں کے اسلوب کو سمو کر ایک اسلوب ضرور پیدا[2] کر لیا تھا ۔ جس میں بقول اصغر عقل و جذبہ[3] کا معتدل امتزاج تھا جس میں حسن پیدا ہو گیا تھا ۔ لیکن ان کی طبعی شوخی

۱۔ نظم و نثر پر ایک نظر ۔ از اصغر ۔ رسالہ ہندستانی الہ آباد ۔ جولائی ۱۹۳۱ء ص ۳۳۹

۲۔ مکاتیب شبلی جلد دوم ۔ ص ۲۲۸ بحوالہ افادات مہدی طبع چہارم ۱۹۳۹ء ۔ مطبوعہ شیخ مبارک علی ۔ لاہور ۔ ص ۳۲۷

۳۔ نظم و نثر پر ایک نظر ۔ ص ۳۴۳

" برهنه رقاصی " اور " اشائے عریاں[1] " سے بھی گریز نہیں کرتی تھی ---- اور یہ چیز اصغر کے مسلک میں حرام تھی اس لیے دونوں کی راہیں الگ الگ اور مسلک جدا جدا رہے ---- مہدی کا اسلوب اصغر کے پسند خاطر نہیں ہو سکتا تھا اس لیے دامن بچائے نکل گئے -

اصغر اور سجاد انصاری کی افتاد ذہنی میں بڑی حد تک مماثلت تھی - دونوں کا مزاج فلسفیانہ اور نگاہ جمال پرست تھی ، لیکن مطمح نظر دونوں کا جداگانہ تھا - سجاد انصاری " حسن " کی رنگینیوں اور فلسفیانہ پرواز خیال میں اس درجہ غرق و گم ہو جاتے ہیں اور اظہار و بیان میں ان کی شاعرانہ لے اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ مذہب کے معاملہ میں کبھی کبھی ان کا لب و لہجہ "گستاخانہ " بلکہ کھلا کھلا "کافرانہ" ہو جاتا ہے - ان کی فلسفہ طرازی خلاؤں میں ایسے ایسے " طائران سدرہ نشین " کا شکار کرتی نظر آتی ہے کہ دور دور تک حسین لفظوں کے جال پھیلے نظر آتے ہیں مگر " مدعائے تقریر " " عنقا " ہی رہتا ہے -

سجاد کا لب و لہجہ خاصا تند و تیز ہے - وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے بت شکن تھے ---- لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انھوں نے بت گری بھی کی ---- شبلی اقبال اور آزاد (ابوالکلام) سے ان کی عقیدت پرستش کی حد تک بڑھی ہوئی ہے اور یہ پرستش ان بزرگوں کی نگارشات کی اسلامی روح کی بدولت ہے ---- سجاد کے مزاج کا یہ تضاد ---- ایک طرف مذہب کے معاملے میں گستاخانہ لب و لہجہ ، دوسری طرف " موحدانہ " جوش عقیدت ---- عام قاری کو بادی النظر میں کھٹکتا ہے - اس کے برعکس اصغر کے یہاں مذہبیت (روح مذہب ---- وہ مذہب کا ذکر ادبیات میں نہیں لائے) شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے - وہ خود ایسی باتوں کے کہنے اور لکھنے سے گریز کرتے ہیں جن سے مذہب کی توہین و تحقیر ہوتی ہو - بلکہ اگر کسی دوسرے کی تحریر و تقریر سے عمومی اخلاق اور شعائر اسلامی پر ضرب پڑ رہی ہو تو اس کے خلاف ان کے لہجہ میں بڑی خشونت اور تندی آ جاتی ہے - یہاں ان کا لہجہ سجاد انصاری سے مل جاتا ہے -

سجاد انصاری کی طرح ، اصغر بھی بت شکن ہیں - مگر اس فرق کے ساتھ ، کہ سجاد انصاری نے شخصیات کے بت توڑے ، اصغر نے " ادارات " اور رجحانات پر حملہ جراحی کیا ہے ---- " لکھنو اسکول " (کی شاعری) اور " ادب لطیف " (اس عہد کا سب سے زبردست ادبی رجحان) ان کی طنز و تعریض ، تحقیر و تنقیص بلکہ " دشنام طرازی " کا نشانہ رہے ہیں -

---

۱- دیباچہ از عبدالماجد دریابادی - افادات مہدی طبع چہارم - ص ۲

اصغر کی فلسفیانہ افتاد طبع ، سجاد انصاری کے برخلاف ، خلاؤں میں پرواز کرنے کے بجائے ٹھوس اور مجرد حقائق کو منطق کے دام میں اسیر کرنے کی کوشش کرتی اور کامیاب ہوتی ہے ۔ ان کی تحریروں میں سجاد انصاری کی طرح کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ " مدعائے تقریر عنقا " ہے ۔

اصغر کی " حسن پرستی " بھی سجاد انصاری سے مختلف ہے ۔ ان کا تصور حسن بڑا وسیع ، بسیط اور ہمہ جہت ہے ۔ وہ ہر چیز میں " حسن " دیکھنے کے قائل ہیں ان کے یہاں سجاد انصاری کی طرح سارا حسن " عورت " اور اس کے " شباب " میں نہیں سمٹ آیا ہے ۔ کبھی انھوں نے کبھی سجاد انصاری کی طرح " عورت " کو اپنی شاعری یا نثر کا موضوع نہیں بنایا ۔ ان کے نزدیک ادبیات میں " عورت اور اس کے متعلقات کا ذکر فسق و بزدلی ہے "[1] ــــ مزاج اور نقطہ نظر کا یہی اختلاف دونوں کے اسلوب میں بھی نمایاں ہے ۔ سجاد انصاری ادب برائے ادب کے قائل[2] اور اس پر عامل ہیں اور اصغر ادب برائے زندگی بلکہ " برائے اصلاح " کے حامی اور اس پر سختی سے کاربند ہیں ــــ لہذا ظاہری طبعی مماثلت کے باوجود ، سجاد انصاری کے اسلوب میں اصغر کے لئے کوئی دلکشی نہیں تھی ۔

یلدرم " ادب لطیف " کی تحریک کے بانیوں میں اور اسکے سب سے بڑے علم بردار تھے ۔ ان کے اعصاب سے زیادہ ان کے قلم پر عورت سوار تھی ۔ وہ عورت اور اسکے متعلقات کے سلسلے میں گفتنی و ناگفتنی میں فرق و امتیاز نہیں کرتے ۔ یہ الگ بات ہے کہ اس پر " رنگینی بیان " اور " حسن تخیل " کا دبیز و باریک پردہ ڈال دیتے ہیں جس سے عریانی چھپ جاتی ہے ۔ نیاز فتحپوری ، یلدرم کے پیرو ، ہم مسلک اور ہم نوا تھے ۔ دونوں " رومانیت " کے دل دادہ ۔ دونوں " شعلۂ مضطر " اور " ارتعاش رنگین " کے قبیل کی شاعرانہ تراکیب کے شیدائی ، نثر میں شاعری کے قائل ــــ دونوں کی نثر شاعری سے قریب تر اور اصغر نثر میں شاعری کے خلاف ۔ وہ نثر کو " باہمی گفتگو " اور " تبادلۂ خیال " اور اس کی خوبی منطق و استدلال کو سمجھتے تھے ۔ لہذا اس اسلوب کو بھی " ادبی فریب کاری "[3] کہتے ہوئے گزر گئے ۔

۱ـ اردوئے معلیٰ بسلسلہ استفسارات ۔ مطبوعہ سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۲۶ء ۔ ص ۱۰۹

۲ـ " شعلۂ مستعجل " ۔ مقدمہ آل احمد سرور ، محشر خیال مطبوعہ آئینہ ادب انار کلی لاھور طبع سوم ۱۹۵۷ء ۔ ص ۱۲

۳ـ نظم و نثر پر ایک نظر از اصغر ۔ هندستانی الہ آباد جولائی ۱۹۳۱ء ۔ ص ۳۲۲

اصغر کو جس اسلوب کی تلاش تھی وہ انھیں مولوی عبدالحق کے یہاں نظر آیا ـ ---- مولوی عبدالحق دراصل سرسید اسکول (سرسید ، حالی ـ عبدالحق) کی آخری ارتقائی کڑی تھے ـ یوں معلوم دیتا ہے کہ سرسید ہی نکھر سنور کر ، عبدالحق کے روپ میں آ گئے ہیں ---- وہی سرسید و حالی کا منطقی سادہ انداز ، وہی علمی طریقہ پر کسی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش وہی تعین حقائق کے سلسلے میں باہمی افہام و تفہیم ---- اصغر مولوی صاحب کے اسلوب سے حد درجہ متاثر تھے اور اس قسم کی نثر کو علمی و تحقیقی کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں و مناسب خیال کرتے تھے[1] ـ لیکن اصغر کی طبیعت مولوی صاحب کی طرح " عام پسند " نہ تھی ـ وہ روزمرہ کے معمولی الفاظ کو شاید اس قابل ہی نہیں سمجھتے تھے کہ علمی و سنجیدہ تحریروں میں ان سے کام لیا جائے ـ اصغر کے مزاج کی " خواص پسندی " اور " پر وقار " نے انھیں مولوی صاحب کا مقلد محض نہ بننے دیا ـ انھوں نے مولوی صاحب کے محققانہ علمی انداز اور شبلی کی ادیبانہ اور عالمانہ اردوئے معلیٰ[2] (عربی و فارسی الفاظ کی کثرت) کی آمیزش و امتزاج سے ایک خوشگوار معتدل اور متوازن اسلوب نکالا ـ جو بہت بعد میں مولانا مودودی کے یہاں زیادہ رواں اور شگفتہ انداز میں نظر آتا ہے ـ یہی صرف ان کا انفرادی رنگ ہے ـ

اصل میں الفاظ کا انتخاب افتاد ذہنی کا نتیجہ ہوتا ہے شاعر یا ادیب کے ہر لفظ پر اس کی شخصیت کی گہری چھاپ ہوتی ہے ـ الفاظ ہی کے فرق سے دو افراد کی شخصیت و مزاج کا فرق واضح ، اور انفرادیت متمائز ہوتی ہے ـ مثلاً جذباتی انسان اظہار خیال کے وقت ایسے الفاظ منتخب کرے گا جن میں تندی ، تیزی اور گرمی ہو ـ ٹھنڈے مزاج کا آدمی اپنی کیفیت نفس کے اظہار کے لیے لفظوں کے ایسے سانچے تلاش کرے گا ، جو اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں ـ بالفاظ دیگر شاعر یا ادیب الفاظ کے کوزوں میں اپنی نفسی کیفیت ڈھال کر اپنے اسلوب میں جلوہ گر ہوتا ہے اسی حقیقت کی طرف بوفاں (Buffon) نے " اسلوب خود انسان ہے[3] " اور ایمرسن نے " اسلوب ذہن کی آواز ہے[4] " کہہ کر اشارہ کیا ہے ـ

۱ـ نظم و نثر پر ایک نظر از اصغر ـ ہندستانی الہ آباد جولائی ۱۹۳۱ء ـ ص ۳۵۰

۲ـ غالب سے مولوی عبدالحق تک (نثری اسلوب کا ارتقا) از سید قدرت نقوی بحوالہ " نقد عبدالحق " مرتبہ سید معین الرحمن ـ مطبوعہ نذر سنز لاہور ۱۹۷۸ء ـ ص ۳۰۲

۳و۴ـ مولوی عبدالحق کا اسلوب از نثار احمد فاروقی بحوالہ " نقد عبدالحق " مرتبہ سید معین الرحمن ـ مطبوعہ نذر سنز لاہور ۱۹۷۸ء ـ ص ۲۷۳

اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے جب اصغر کے اسلوب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے اصغر کے اندر کا " پروقار و سنجیدہ انسان " بالکل " باہر کے اصغر " کے رنگ میں ظاہر ہوا ہے ---- وہی ترشی ہوئی لبیں ، آراستہ پٹے ، مقروض ریش ، دلکش و روشن چہرہ ، مرتب و مزین لیکن تکلف و تصنع سے پاک ، مذہبی وضع لیکن نہ معمم نہ مجعد ، درویش منش لیکن نہ کلاہ ترکی بر سر ، نہ خرقۂ درویشی در بر ، ----- مختلف العناصر اشیاء کا حسن سمیٹے ہوئے ، حسن و دلکشی کا منفرد نمونہ ---- اصغر کی نثر بھی اسی منفرد اصغر کا پرتو ہے -

اصغر کی تحریر تصنیفی ہے ---- نظر حکیمانہ ، انداز فلسفیانہ ، آہنگ عالمانہ - اسے عالمانہ اسلوب کہہ سکتے ہیں - اس اسلوب کے بنیادی خصوصیات F.C. LUCAS کے الفاظ میں " صفائی ، ایجاز ، متانت و شائستگی"[1] (CLARITY, BREVITY + URBANITY) ہیں البتہ " سادگی " (Simplicity) کے بجائے ان کا لب و لہجہ عالمانہ ہے -- یہی خصوصیات ایک اچھے اسلوب کے بنیادی خصوصیات ہوتے ہیں -

اصغر کے اسلوب کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں موضوع و الفاظ میں کامل ہم آہنگی ہوتی ہے - خیال و الفاظ دوش بدوش چلتے ہیں نہ کوئی دوسرے کو دبا دیتا ہے نہ دوسرے سے آگے بڑھ جاتا ہے - یہی اعتدال اصغر کے مزاج کی خصوصیت خاصہ ہے - اس حیثیت سے اصغر کا اسلوب جدید اسالیب سے قریب تر ہے اور اردو کے اسالیب بیان میں ایک گران قدر اضافہ ، لیکن افسوس کہ اصغر کی قبل از وقت موت اور اہل علم کی عدم توجہی سے ان کا یہ علمی و ادبی عطیہ نظروں کے سامنے نہ آ سکا ---- اپنے بیان کی تائید ، توضیح و تصدیق میں ذیل کا اقتباس اس اظہار حقیقت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ نثر نگار ہو یا شاعر اس کے اسلوب کے خصوصیات کی طبقہ بندی ممکن نہیں - وہ ایک دوسرے میں ایسے پیوست اور آمیز ہوتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا - اصغر کے اسلوب کے خصوصیات ایک دوسرے میں ایسے رچے ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے متمائز کرنا بہت مشکل ہے تاہم ہر جگہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جس عنوان کے تحت جو مثال پیش کی جائے اس سے وہ خصوصیت کاملاً عیاں ہو - اس طویل تمہید کے بعد اقتباس درج کیا جاتا ہے :

" انسانی ہستی کا ہر ریشہ اگر بیدار و ہوشیار ہو تو کائنات عالم میں کیا ہے جس کا اس سے تعلق نہیں - کون سی چیز ہے جس سے بالواسطہ یا بلا واسطہ کیف و لذت کا ادراک نہ ہوتا ہو اس لئے

۱- مولوی عبدالحق کا اسلوب از نثار احمد فاروقی بحوالہ نقد عبدالحق مرتبہ سید معین الرحمن ص ۲۸۱

بتائیے کہ عالم میں " حسن " اور " محض حسن " کے سوا اور
موجود ہی کیا ہے - " حسن صورت " اگر طرب بخش ہے تو
کیا " حسن معنی " نے صدہا اور ہزارہا انسانوں کو دیوانہ
نہیں بنا دیا؟ " حسن انسانی " بے شک کشش انگیز ہے لیکن اگر
باطنی حس مردہ و افسردہ نہ ہو تو اسی کے ساتھ " حسن اخلاق"
و " پاکیزگی خیال " میں بھی کافی دلآویزی موجود ہے - ارباب
رسم و تقلید کا ذکر نہیں بلکہ حقیقی " صاحبان ذوق " نے
" حسن مطلق " کو اپنی شیفتگی و وارفتگی کا موضوع قرار دیا اور
تم اپنے تنگ و محدود مذاق کی بنا پر اس کا لطف نہ اٹھا سکے
تو ع

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ [۱] "

حاصل گفتگو یہ کہ اصغر اچھے نثر نگار تھے - ان کا اسلوب سائنٹفک تھا - وہ
مزاحیہ اور ادبی نثر کے بھی مداح تھے لیکن ان اسالیب کو علمی و تحقیقی مضامین کے لئے
موزوں نہ سمجھتے تھے - ان کے اسلوب میں سرسید اسکول اور شبلی کے اسالیب کا خوشگوار
امتزاج ہے مگر وہ کسی کے مقلد نہیں - انھوں نے اپنی مجتہدانہ مزاجی کیفیت سے اپنے لئے
ایک منفرد و اسلوب پیدا کیا - جو جدید مغربی اسلوب سے قریب تر ، اور فی زمانہ مقبول و
پسندیدہ اسلوب ہے - اگر اصغر کے اسلوب کو دنیائے ادب نے فراموش نہ کر دیا ہوتا تو آئندہ
نسلیں یقیناً ان سے کسب فیض کرتیں -

(ج) اصغر کا نظریۂ تنقید:

حیات ایک متحرک و تغیر پذیر قوت ہے - اس کے تمام
مظاہر اصول ارتقا کے تابع ہیں - ادب بھی چوں کہ معاشرے کے مظاہروں سے ایک مظہر
ہے اس لیے معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات سے ادب کا اثر پذیر ہونا ناگزیر ہے - اسی لئے
اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو کسی قوم کے سیاسی تغیرات ، فکری روایات اور تہذیبی اقدار کا
عکس متعلقہ عہد کے شعر و ادب میں صاف نظر آئے گا - بالفاظ دیگر شعر و ادب حیات قومی
کا آئینہ ہوتا ہے - اصغر نے درج ذیل اقتباس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے -

---

۱- اردو شاعری کی ذہنی تاریخ (دہلی اور لکھنؤ اسکول) از اصغر - زمانہ ستمبر ۱۹۲۹ء
ص ۱۳۸

وہ لکھتے ہیں :

" لٹریچر اور شاعری قوموں کے اخلاق و جذبات کا آئینہ ہے
ہماری کامیابی و فیروزمندی جہاں ہمارے انبساط و مسرت
کو اس پر منعکس (کرتی ہیں) وہیں ہمارے سوز و الم کی
تصویر بھی اس آئینے میں نظر آتی ہے [1] - "

اصغر نے اپنے تنقیدی مضامین کی اساس اسی بنیادی فکر پر قائم کی ہے اور اپنے تمام تنقیدی مقالات و مضامین اسی نقطہ نظر کے تحت مرتب کیے ہیں - چنانچہ کسی شاعر کے کلام پر محاکمہ کرتے وقت پہلے تاریخی حیثیت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے (شاعر) عہد میں " فکری روایت " یا انہیں کے الفاظ میں " اجتماعی ذہنیت " کیا تھی کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ شاعر یا ادیب کے لئے اپنے زمانہ کی " فکری روایت " کو غیر شعوری طور پر قبول کر لینا ناگزیر ہوتا ہے - یہ " اجتماعی ذہنیت [2] " یا " سوسائٹی کی اصل روح [3] " یہ حیثیت " مستقل دماغ [4] " کے ہوتی ہے اور افراد بہ حیثیت " اعضاء و جوارح [5] " کے ، چنانچہ افراد کے تخلیقی کارناموں کے ہر گوشے ، نقطے اور لفظ میں " اجتماعی ذہن " در آتا ہے - بیشتر افراد معاشرے کی صدائے باز گشت ہوتے ہیں ان کی اپنی کوئی آواز نہیں ہوتی - لیکن بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو معاشرے کی زبردست قوت کے زیر اثر ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہیں -

ان کا اپنا ایک " تشخص " اور ایک " علیحدہ آواز " ہوتی ہے ---- یہ علیحدہ آواز " حاسہ قومی [6] " ، " حاسہ اخلاقی [7] " اور " حاسہ مذہبی [8] " کا نتیجہ ہوتی ہے بالفاظ دیگر فرد (شاعر یا ادیب) اپنی انفرادی خصوصیات بطور " ورثہ " کسی قوم (حیاتیاتی اور معاشرتی) سے حاصل کرتا ہے ---- یعنی کسی قوم کے فرد ہونے کی حیثیت سے اسے اپنی قوم سے بطور میراث کون کون سے فکری و تہذیبی روایات پہونچے اور

۱- مقدمہ پیام زندگی - از اصغر - ص ۲۷

۲ ، ۳- مقدمہ یادگار نسیم - از اصغر - ص ۱

۴- مقدمہ پیام زندگی - ص ۷۰

۵-

۶ ، ۷ ، ۸- مقدمہ یادگار نسیم - ص ۵-۳

اس نے ان مختلف النوع اور منتشر خیالات و افکار میں سے ، اپنی " اخلاقی و مذہبی حس " کے زیر اثر کن افکار و خیالات کو " انتخاب و قبول اور کن کو رد و مسترد کیا ---- یہی اسکی مخصوص " انفرادی ذہنیت " ہوتی ہے - کسی فن پارے پر محاکمہ کرتے وقت تنقید نگار کا فرض انہیں دونوں " ذہنیات " ---- " اجتماعی " اور انفرادی " کا سراغ لگانا ہے - یعنی کسی

" شاعر کے کلام پر تنقید و تبصرہ کا مفہوم یہ ہے کہ اسکے کارناموں کی سائنٹفک تحلیل کرکے یہ بتایا جائے کہ اس کی استعداد و ذہنیت اور اسکے افکار و تخیل کی ترکیب طبعی کیا ہے -[۱] "

سطور بالا میں جو کچھ اجمالاً بیان کیا گیا ہے ، اس کی تفصیل اصغر کے الفاظ میں درج ذیل کی جاتی ہے - اس سے ان کے " نظریہ تنقید " کی بھی وضاحت ہوتی ہے اور اسکی روشنی میں " تنقید نگاری " میں اصغر کے مرتبہ کے تعین میں بھی مدد ملتی ہے -

فی زمانہ تنقید کیا ہے؟

۱- " اردو شاعری کی یہ عجیب بدقسمتی ہے کہ تنقید و تبصرہ کے نام سے عام طور پر جو مضامین لکھے جاتے ہیں ان میں زبان و محاورہ یا علم معانی و بیان کے چند فرسودہ اصولوں کو معیار قرار دے کر داد سخن فہمی دی جاتی ہے -[۲] "

۲- " تنقید شعر کا یہ ایک عام نقص ہے کہ یا تو " واہ وا " " سبحان اللہ سے آگے بات نہیں بڑھتی یا پھر یہ کہ زبان غلط ہے محاورہ صحیح نہیں - اپنا ہے اللہ اللہ خیر صلاح -[۳] "

۳- " کسی کتاب پر دیباچہ ، مقدمہ یا تبصرہ کے نام سے کچھ بھدے ثقیل الفاظ کو چند اوراق میں پھیلا کر شعر و شاعر کی خوش آئند

۱- دیباچہ مطلع انوار - ص ۳۹

۲-۳- اردو شاعری کی ذہنی تاریخ - دہلی اور لکھنؤ اسکول - زمانہ کانپور ، ستمبر ۱۹۲۹ء - ص ۲۵

طور پر توانسع کر دیا مشاعروں کی روایتی واہ واسے کم نہیں - لیکن خیر سے اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ ان بے کیف رسمیات کا کوئی درجہ ہو اور " ہم پایہ عصری و خاقانی " یا " رشک طالب و کلیم " ایسے فضولیات کے کچھ معنی سمجھے جائیں -[1] "

(۲) تنقید کیا ہونا چاہیے :

۱- " شاعر ہو یا متشاعر اس کے کلام پر تنقید و تبصرہ کا مفہوم یہ ہے کہ اسکے کارناموں کی سائنٹفک تحلیل کر کے یہ بتایا جائے کہ اس کی استعداد و ذہنیت اور اسکے افکار و تخیل کی ترکیب نفسی کیا ہے[2] "

اصغر کے محولہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کسی شاعر پر تنقید و تبصرہ کے لئیے (۱) " شاعر کے دماغ کی نفسیاتی تحلیل " یا (۲) " نفس خیال کی تشریح و تجزیہ " ضروری سمجھتے ہیں - اور شاعر کے " نفس خیال " کے اجزائے ترکیبی معلوم کرنے کے لیے شاعر کے عہد کی " اجتماعی ذہنیت " (بالفاظ اصغر سوسائٹی کی اصل روح) اور خود شاعر کی " انفرادی ذہنیت " کی نشاندہی اور اس کا تعین ناگزیر خیال کرتے ہیں - چنانچہ رقمطراز ہیں :

۱- " اجتماعی ذہنیت کے اس عام تسلط و فرمانروائی میں دیکھنے کی صرف یہ چیز رہ جاتی ہے کہ کتنے اشخاص ایسے تھے جو عام اجتماعی ذہنیت میں گم ہوگئے اور کتنے تھے جن کی انفرادیت باوجود اجتماعی ذہنیت کے اثرات کے ، پھر بھی اپنی مخصوص امتیازی حیثیت کو قائم رکھ سکی -[3] "

۲- " ہر ایک اردو شاعر کے حقیقی قدر و اندازہ کے لیے سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ اردو شاعری نے اپنی .... مدت حیات میں دہلی اور لکھنؤ اسکول کے نام سے جو دو مختلف حیثیتیں پیدا کیں ، ان کے اجزاء و عناصر کیا تھے اور ان دونوں (اسکولوں)[*]

۱- دیباچہ مطلع انوار - ص ۲۹

۲- ایضاً

۳- مقدمہ یادگار نسیم - ص ۲

* - تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمہ نمبر ۱ مقالہ ھذا

کی بجائیں کون سی مخفی اسپرٹ کارفرما تھی[1] ۔"

۲۔ " ضرورت یہ ہے کہ باقاعدہ منضبط حیثیت سے ، اردو شاعری کی ایک " ذہنی تاریخ " مرتب و مدون ہو جس میں ہر دور کے سیاسی مذہبی ، اخلاقی و معاشرتی حالات کے ساتھ شعر و ادب کے اجتماعی و انفرادی ذہنیت کے نفسیاتی اسباب و علل سامنے لائے جائیں ۔ اس صورت میں شعر و شاعر کے پہچاننے میں عموماً جو غلط فہمیاں ہوتی رہتی ہیں اس کا ایک بڑی حد تک سدباب ہو سکتا ہے[2] ۔"

(۳) اجتماعی ذہنیت سے کیا مراد ہے؟

۱۔ " جس طرح مختلف اخلاط کے باہمی امتزاج سے " مزاج " ترتیب پاتا ہے ، اسی طرح افراد کی ذہنی جدوجہد کی متحدہ کیفیتوں سے " سوسائٹی کا مذاق " بنتا اور تیار ہوتا ہے جس کے ماتحت اسکے شعری و ادبی کارنامے بھی انجام پاتے ہیں ۔ اسی " متحدہ و مشترکہ مذاق " کے پردے میں " سوسائٹی کی اصل روح " یعنی اس کی " اجتماعی ذہنیت " متشکل ہوتی ہے[3] ۔"

(۴) اجتماعی ذہنیت کی کارفرمائی اور افراد پر اس کا اثر

۱۔ " افراد کا مذاق ، ان کا میلان طبع ، ان کی شاعری ، بلکہ اس شاعری کا ایک ایک لفظ اسی " اجتماعی ذہنیت " کی کارفرمائی اور اسی کا مخفی پرتوہ کمال (ہوتا) ہے[4] ۔"

۲۔ " لکھنؤ نے اپنی شاعری کے عہدزریں میں میر انیس اور خواجہ آتش سے بلند تر کوئی ہستی پیدا نہیں کی لیکن .... اجتماعی ذہنیت

۱، ۲۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول ۔ زمانہ کانپور ، ستمبر ۱۹۲۹ء ۔ ص ۱۲۹

۳، ۴۔ مقدمہ یادگار ضیغم ۔ ص ۱

کی قوت دیکھیے کہ ان کا کلام بھی " لکھنؤ اسکول " یا اس دور کی عام " اجتماعی ذھنیت " کی مخصوص آلودگیوں سے بالکلیہ پاک نہیں ۔[1] "

۳- " اپنے عہد کی زبان اور اپنے وقت کے طرز شاعری کو اختیار کرنے کے لیے قدرتاً ہر شاعر مجبور ہوتا ہے ۔ " اجتماعی ذھنیت " .... اس دور میں جو زمین تیار کر دیتی ہے اس سے یک لخت بے نیازی ایک حد تک ناممکنات سے ہے[2] ۔ "

۴- " زمانے اور حالات کے تقاضے سے جو " اجتماعی مذاق " تیار ہو جاتا ہے وہ بحیثیت ایک "مستقل دماغ " کے ہوتا ہے اور افراد و اشخاص کی حیثیت مثل اعضاء و جوارح کے ہو جاتی ہے ۔ ایسی حالت میں ایک اعلیٰ سے اعلیٰ فرد بھی بالعموم اس " جماعتی ذھنیت " کے حلقۂ اثر سے باہر نہیں نکل سکتا ۔[3] "

۵- " ہندو اور مسلمان فقرا و مشائخ کے مخلص جو اعلیٰ اخلاقی محاسن سے مزین تھے اور اردو شاعری کی تربیت و پرداخت چونکہ انھیں کے بابرکت ہاتھوں عمل میں آئی اس لیے قدرتی طور سے اس میں بلند اخلاق کی اسپرٹ موجود تھی یہی " مہذب مذاق " دھلی اور نواح دھلی میں پھیل گیا اور شعر و شاعری کے باب میں یہی ذھنیت عام ہوگئی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ بھی جو پاکیزگی نفس ، اعلیٰ اخلاق اور روحانی خوبیوں سے عملاً بہرہ ور نہ تھے ۔ جب شاعری کی جانب مائل ہوئے تو تقلیداً ان کو بھی یہی رنگ اختیار کرنا پڑا جو عادت و خاصہ ہے عام اجتماعی ذھنیت کا[4] ۔ "

۱- مقدمہ یادگار نسیم - ص ۲-۱

۲- ایضاً - ص ۳

۳- ایضاً - مقدمہ پیام زندگی - ص ۷۰

۴- اردو شاعری کی ذھنی تاریخ - لکھنؤ دھلی اور لکھنؤ اسکول - زمانہ کانپور ، ستمبر ۱۹۲۹ء - ص ۱۳۹

(۵) انفرادیت بیشتر اجتماعیت میں گم ہو جاتی ہے :

۱- " انفرادیت جب بالکیہ " اجتماعی ذہنیت " کے حلقۂ اثر میں آ جاتی ہے تو اپنی انفرادیت کو گم کر کے " اجتماعی ذہنیت " میں محو و مدغم ہو کر رہ جاتی ہے۔[1]"

۲- " عام طور پر " انفرادی ذہنیت " .... " اجتماعی ذہنیت " میں مل کر فنا ہو جاتی ہے۔[2]"

۳- " عام آدمی زیادہ تر دوسری شخصیتوں کی آواز بازگشت ہوتے ہیں۔[3]"

(۶) انفرادیت (انفرادی ذہنیت) کسے کہتے ہیں؟

۱- " اعلیٰ قسم کی شاعری کے لیے ایک مخصوص زندگی ، ایک مخصوص طرز تخیل اور ایک مخصوص افتاد نظر کی ضرورت ہے جس سے شاعر کی انفرادیت و شخصیت تیار ہوتی ہے۔[4]"

۲- " ایک بات کے کہنے کے بے شمار طریقے ہیں - یہی مختلف طریقے جن سے بیان کی حیثیت و نوعیت تبدیل ہوتی ہے ، لکھنے والے کی شاعری یا نثر نگاری کا درجہ متعین کرتے ہیں - جب کوئی شخص کچھ لکھنا یا بیان کرنا چاہتا ہے تو اپنی ذہنی اور نفسی کیفیتوں کے ساتھ اس کو پیش کرتا ہے - اس طرح اس بات یا واقعہ کی حالت میں اپنے بیان سے کچھ اضافہ کر دیتا ہے - اس کی یہی " ذہنی و نفسی کیفیت " اسکی انفرادیت و شخصیت ہے۔[5]"

۳- " اینٹ چونے گارے سے عمارتیں تیار ہوتی ہیں لیکن معمار کی متعدد کیفیات ذہنی و استعداد ارادی کو کیوں کر دکھایا جا سکتا ہے جو

۱- مقدمہ یادگار نسیم - ص ۱
۲- ایضاً - ص ۳
۳- نظم و نثر پر ایک نظر - " ہندستانی " - الہ آباد جولائی ۱۹۳۱ء - ص ۲۲۷
۴- ایضاً - ص ۲۳۲
۵- ایضاً - ص ۲۳۶

اسی اینٹ ، چونے اور گارے کو کبھی عالی شان محل ، کبھی مسجد اور کبھی امام باڑے سے موسوم کرنے کے قابل بنا دیتی ہے ۔[1]"

۴- " انفرادیت و شخصیت یا کیفیت نفسی کا شدید ہونا ہر انسان کا حصہ نہیں .... اس لیے نظم و نثر کا مخصوص طرز ایک زبردست انفرادیت و شخصیت کی علامت ہے ۔[2]"

۵- " عام تقلید اور عام مذاق سے اجتناب ایک زبردست انفرادیت اور ایک بلند پایہ استعداد شاعری کے آثار ہیں ۔[3]"

۶- " ایسی شخصیتیں جنھوں نے اپنی زبردست انفرادیت کا ثبوت دے کر کوئی مخصوص کار نمایاں کیا ہے وہ اکثر سوسائٹی کے ہنگامے اور اجتماعی ذہنیت کے اثرات سے دور دور رہی ہیں ۔[4]"

۷- " اجتماعی ذہنیت کی عام زمین پر شاعر کے انفرادی افکار جو گل بوٹے تیار کر دیتے ہیں انھیں کے رنگ و بو سے اس کی فطرت کی آزادی اور اس کی مخصوص شاعرانہ عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔[5]"

ان تمام محولہ بالا اقتباسات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اصغر کے نزدیک " انفرادیت کسی شاعر یا ادیب کے انفرادی افکار و نفسی کیفیات کا نام ہے جس میں اسکے اظہار و بیان کا مخصوص اسلوب و انداز بھی شامل ہے ۔"

(۷) انفرادیت کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟

اس مسئلے سے بحث کرتے ہوئے اصغر نے " یادگار نسیم " (مثنوی گلزار نسیم) کے مقدمے میں تفصیل سے لکھا ہے جو بظاہر ایک خاص شاعر کے بارے میں ہے لیکن حقیقتاً ، اس سے " انفرادیت کے اجزاء و عناصر " کے متعلق اصغر کا نقطہ نظر واضح ہو جاتا ہے ۔

۱- مقدمہ پیام زندگی ۔ ص ۷۱ ۔ ۷۰

۲- نظم و نثر پر ایک نظر ۔ ص ۲۲۷

۳- مقدمہ یادگار نسیم ۔ ص ۹

۴- ایضاً ۔ ص ۱

۵- ایضاً ۔ ص ۲

ذیل میں اس کا متعلقہ حصہ درج کیا جاتا ہے :

" عام طور پر انفرادی ذہنیت یا تو اجتماعی ذہنیت میں مل کر فنا ہو جاتی ہے یا اگر وہ زندہ رہتی ہے تو اجتماعی ذہنیت سے علیحدگی کے کچھ نہ کچھ اسباب و وجوہ کا موجود ہونا حد درجہ لازمی و ضروری ہوتا ہے ۔ حسیم کی انفرادی و شخصی آزادی کے اسباب حسب ذیل معلوم ہوتے ہیں :

(۱) حاسہ' قومی (۲) حاسہ' مذہبی (۳) حاسہ' اخلاقی "[1]

انفرادیت کے ان مختلف عناصر پر اصغر نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، جس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں دیا جاتا ہے البتہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کی تصدیق و شہادت میں ان کے اقتباسات بھی پیش کیے گئے ہیں ۔

(۱) حاسہ' قومی :

اصغر نے حاسۂ قومی کے تحت یہ نفسیاتی نکتہ واضح کیا ہے کہ ہر فرد (شاعر یا ادیب) کسی خاص قوم ، قبیلہ یا نسل سے تعلق رکھتا ہے ۔ اسکے کچھ فطری رجحانات و میلانات ہوتے ہیں اور کچھ قوم کے فکری و تہذیبی روایات ---- فرد کی شخصیت کی تشکیل و تخلیق میں یہی عوامل بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ جب ان عوامل پر استوار ، جب وہ شخصیت کا بنیادی خاکہ لے کر ، ایک وسیع معاشرے میں داخل ہوتا ہے تو معاشرے کے فکری و تہذیبی روایات اور افکار و خیالات سے اثر پذیر ہونے کے باوجود ۔ اسکے " قومی خصوصیات " اسے یک لخت معاشرے میں محو و مدغم ہونے سے بچائے رکھتے ہیں ---- یہی قومی خصوصیات ، جن میں اسکے اپنے انفرادی رجحانات میلانات اور داعیات بھی شامل ہوتے ہیں ---- اس کی " انفرادیت و تشخص " کا موجب بنتے ہیں ۔ اس حقیقت کی طرف انھوں نے درج ذیل اقتباس میں اشارہ کیا ہے :

" حسیم کشمیری تھے ۔ کشمیریوں کا عام خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کے علوم و فنون اور سوسائٹی کی عام تہذیب کو بہت جلد حاصل کر لیتے ہیں .... مگر ...... اس کی خانگی زندگی اپنے ایک مخصوص قومی انداز کی حامل (ہوتی) ہے ۔ وہ زمانے کے ہر رنگ کو اختیار کر لیتا ہے ۔ مگر اس کی

۱۔ مقدمہ یادگار حسیم ۔ ص ۵

اصل زندگی کشمیری زندگی (ہوتی) ہے جو بڑی سے
بڑی قیمت پر بھی کسی دوسری تہذیب و تمدن کے ہاتھوں
فروخت نہیں ہو سکتی[۱] ۔"

(۲) حاسۂ مذہبی :

اس عنوان کے تحت اصغر نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ ہر فرد کسی خاص " مذہب " کا پیرو ہوتا ہے ۔ اس کی " ذہنی و فکری " نشوونما میں اسی مذہب کے بنیادی عقائد کا ہاتھ ہوتا ہے جن سے تمام زندگی وہ دست بردار نہیں ہو سکتا ۔ جب فرد (شاعر یا ادیب) ان " بنیادی عقائد " کے ساتھ ، ایک ایسے وسیع معاشرے میں داخل ہوتا ہے جسکے عمومی عقائد اور شعر و ادب میں ان کے مظاہر ، اس کے عقائد سے مختلف ہوں تو " روایت " کی پیروی کے باوجود ، اسکی " مخصوص مذہبی حس " اپنی راہ الگ نکال لیتی ہے ۔ یہی الگ راہ اس کی " انفرادیت " ہے جو اسے دوسروں سے ممیز و ممتاز کرتی ہے ۔ چنانچہ نسیم کے سلسلے میں انھوں نے یہی ثابت کیا ہے کہ لکھنؤ کے دور شاہی میں شیعی عقائد و مراسم ، معاشرے میں اور اسکے توسط سے شعر و ادب میں جاری و ساری ہوگئے تھے ۔ لیکن نسیم ہندو تھے ۔ ان کا ان عقائد سے کوئی تعلق و واسطہ نہیں تھا لہذا روایتاً تو وہ ضرور قلم کو " مطلع بخشتی " دکھاتے ہیں ، " استخارے " کا ذکر بھی کرتے ہیں مگر حمد کے اشعار کا آغاز وہ لفظ " ہر " (ہندوؤں کی مذہبی اصطلاح میں خدا کا نام)[۲] سے کرتے ہیں ۔

(۳) حاسۂ اخلاقی :

اصغر کا خیال ہے کہ ہر فرد اپنے قومی و مذہبی معتقدات و روایات کے زیر اثر اخلاق کا ایک واضح معیار رکھتا ہے ---- اخلاق معاشرے کو پاکیزہ و طاہر بنانے کے لیے ضروری ہے ۔ بعض افراد اس معاملے میں حد درجہ حساس اور محتاط ہوتے ہیں ۔ بعض اپنے قول و عمل کی بے احتیاطی سے معاشرے میں پستی مذاق ، سوقیت و ابتذال اور عریانی کی ترویج میں بڑے فعال ہوتے ہیں ۔ شاعر چوں کہ نسبتاً زیادہ

۱۔ مقدمہ یادگار نسیم ۔ ص ۲-۳ ۔ بادنیٰ لفظی تصرف ۔

۲۔ مقدمہ یادگار نسیم ۔ ص ۵

" رنگین مزاج " اور " زندہ دل " ہوتا ہے اس لیے اگر وہ " ضبط و سنجیدگی " سے اپنی " رنگین مزاجی " پر بند باندھے رہے تو شعر و ادب پاک و پاکیزہ رہتا ہے ۔ ورنہ مکدر و متعفن ہو جاتا ہے ۔

درج ذیل عبارت میں وہ اسی حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں :

" شعرا کی رنگین مزاجی و زندہ دلی کوئی عجیب واقعہ نہیں لیکن مہذب و شائستہ جماعت میں اس کی آخری حد ایک ضیافت نظر و لذت نگاہ سے زیادہ نہیں ۔ مگر لکھنؤ کا مذاق اس باب میں حد سے زیادہ ترقی کر گیا تھا اور شاعری و تعیش پرستی تقریباً مترادف الفاظ ہو گئے تھے .... (مگر) تسنیم کا مجموعہ " غزلیات اس قسم کے مضامین سے بالکلیہ پاک ہے ۔ البتہ مثنوی میں کچھ تو واقعہ کے باعث اور کچھ عام مذاق کی تقلید میں عریانی خیال کے موقعے پیدا ہو گئے ہیں لیکن وہاں بھی انھوں نے شاعرانہ حسن بیان کے بہت ہی لطیف اور خوب صورت پردے ڈال دیئے ہیں ۔"[۱]

(۸) شعرا کے ذہن کی تشکیل اپنے عہد کے نصاب اور مروجہ کتب کے مطالعہ اور شعر و ادب سے ہوتی ہے

اصغر نے شاعر کے ذہن کی تخلیق و تشکیل میں حصہ لینے والے عناصر میں سب سے اہم عنصر اس عہد کے لٹریچر اور عام مطالعہ کی کتابوں کو گردانا ہے ۔ ان کے خیال میں کسی عہد کے معاشرتی ، تہذیبی ، اخلاقی اور مذہبی روایات ، افراد کے ذہن کی تربیت و تشکیل میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ اس لیے کسی شاعر کے مقام و منصب کے قدر و اندازہ کے لیے ضروری ہے کہ اس عہد کے مروجہ نصاب اور درسی زیر مطالعہ رہنے والی کتابوں کو پیش نظر رکھا جائے ۔ اپنے خیال کی تصدیق و تائید میں وہ مغلوں کے عہد سے بحث کرتے ہوئے ، اسی بات پر زور دیتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

" عہد مغلیہ کے مشہور فارسی شاعر چندر بھان برہمن نے

۱۔ مقدمہ یادگار تسنیم ۔ ص ۵

~~۱۔ فرد شاعری کی ذہنی تاریخ ۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول ۔ زیادہ کانپور ، ستمبر ۱۹۴۴ء ۔ ص ۱۳۱~~

اپنی کتاب " چہار چمنی "* میں اس زمانے کے نصاب تعلیم
کا ذکر کیا ہے اسی سلسلے میں اس نے ان کتابوں کا بھی
ذکر کیا ہے جو اس زمانے میں عام طور پر مطالعہ میں رائج
تھیں ۔ ان میں مثنوی مولانا روم ، دیوان شمس تبریز ،
حدیقۂ حکیم سنائی ، پندنامہ فرید الدین عطار ، کلیات امیر
خسرو ، مولانا جامی وغیرہ داخل ہیں ۔ جس سے یہ اندازہ
ہو سکتا ہے کہ اس دور کے تعلیم یافتہ دماغ کس قسم کے
خیالات و مضامین سے تربیت پا رہے تھے۔[1] "

(۹) تنقید کا مطمح نظر :

اصغر کے نزدیک تنقید کا مقصد شاعر کے " محاسن
کلام " سے عوام کو روشناس کرانا ہے ۔ وہ الفاظ و محاورات سے زیادہ شاعر کے افکار و
جذبات کی نشاندہی اور ان کی طرف رہنمائی اور اشارہ ضرور سمجھتے ہیں ۔ اور اس
سلسلے میں ان کی نظر صرف خوبیوں پر ہوتی ہے وہ " تسامحات و اغلاط " کو قابل
اعتناء نہیں سمجھتے ۔ اپنے اس رویے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" جناب برق کی شاعری اسطرح کے حریفانہ اور بازاری جذبہ
کا نتیجہ نہیں ہے جس سے بعض حلقوں میں زبان و محاورے
کی کج بحثیوں اور فن و استادانہ فن کی بلند آہنگیوں کے
ساتھ ایک مردہ و بے کار سرمایہ پندار و تبختر تیار ہو گیا
ہے اور جو ہماری شاعری کے لیے یکسر ادبار و مصیبت کی
چیز ہے ۔ بلکہ ان کی فطرت کی رسائی حقیقی شعریت کی
اس فضائے لطیف تک معلوم ہوتی ہے جو کیف و سرور اور جوش و
انبساط کی معنوی لذتوں سے معمور و لبریز ہے ۔[2] "

---

*۔ کتاب کا اصل نام " چہار چمن " ہے یا تو سہو کتابت ہے یا اصغر سے تسامح ہوگیا۔

۱۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول ۔ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء
ص ۱۲۱۔

۲۔ دیباچہ مطلع انوار ۔ ص ۵۵

دوسری جگہ " معائب جوئی " اور خردہ گیری " پر بڑے لطیف فلسفیانہ انداز میں طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" ہم نے ابھی دامنت میں جناب روان کی رباعیوں کے حقیقی محاسن ارباب نظر کی خدمت میں پیش کئے ہیں ...... ہم نے یہ ضرور کوشش کی ہے کہ اپنے " رستم داستان " کے زور بازو میں فردوسی کا زور قلم نہ شریک ہونے دیں اسی کے ساتھ ہمیں اس کا بھی دعویٰ نہیں کہ ہم کسی فوق البشر ہستی کے کلام کا ذکر کر رہے ہیں جس میں اغلاط و اسقام کا امکان ہی محال ہے ۔ اگر کلام سے لطف اٹھانے اور اس سے روشناس کرانے کے لیے اس کی بھی ضرورت ہے کہ معائب بیان کئے جائیں تو ہم مایوس نہیں کہ ایسے منصف مزاج اساتذہ کی بھی ملک میں کمی نہیں ۔ وہ ہماری اس کمی کو بہ طور احسن پورا کر سکتے ہیں ۔"[1]

عیب چیں و معائب جو خود برا ہوتا ہے :

" جب ہم اچھائیوں کا ذکر کرتے ہیں تو گو وہ غلط کیوں نہ ہوں ہم اس وقت خود اچھے ہوتے ہیں لیکن جب ہم برائیوں کا ذکر کرتے ہیں تو گو وہ کتنی ہی صحیح ہوں ہمارا جی برا ہونے لگتا ہے اور ہم خود اس وقت برے ہوتے ہیں ۔ ایک سراغ رسان جب چوری کی تحقیقات اور چور کی گرفتاری کے لیے نکلتا ہے تو سب سے پہلے ایک چور اپنے دل و دماغ میں بٹھا لیتا ہے پھر وہ پتے پتے اور تنکے تنکے سے بھڑکنے لگتا ہے اور ہر چیز اسے اسی عالم میں نظر آنے لگتی ہے ۔ اسی طرح خدا نہ کرے کہ انسانی طبیعت میں جذبات کی کوئی ایسی کیفیت رونما ہو کہ وہ معائب کی تلاش میں نکلے ۔ اس وقت پھر اسکی کمی کیا ہے ۔ رہی " حق تنقید " کی مرعوب کن اور مردم فریب بلند آہنگی، اس کے بارے

---

۱ - مقدمہ روح روان - ص ۳۰

میں مسکرا کر اتنا کہنا کافی ہے ۔ ع

" اس سے کہو جو نہ جانتا ہو" ۔"[1]

(۱۰) تبدیلی مذاق کے ساتھ طرز تنقید کا بدلنا فطری و ناگزیر ہے :

" اگر شعر و ادب کا مذاق کسی وجہ سے نکھر رہا ہے تو " مذاق تنقید " بھی اسکے ساتھ غیر ارادی طور پر ترقی کرتا جائے گا ۔ شعر کا مفہوم جس وقت تک صرف الفاظ کی ترتیب و تنظیم ہو اس وقت کا " مذاق تنقید " بھی " لفظ و محاورہ " سے آگے نہیں بڑھتا ۔"

" لیکن جس زمانے میں لوگوں کی نظر خیالات کی تازگی ، جذبات کی صحت اور مطالب کی ارواح مخفیہ کی جانب بھی مائل ہو چکی ہو ۔ اس وقت یہ سمجھ لینا چاہیے کہ صرف " بولی ٹھولی " اور " زبان و محاورہ " کی سطحی فرمانروائی ختم ہو چکی اور خود ساختہ فن کی ژولیدہ بیانیوں اور کج بحثیوں کی عمریں تمام ہو گئیں ۔"[2]

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اصغر کے یہاں " تنقید " کا نظریہ بڑا واضح اور اس کا فلسفہ بہت مربوط و منظم ہے ۔ ذیل میں ان کے تنقیدی نظریات کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے :

(۱) " تنقید " کوئی جامد فن نہیں ہے ۔ بلکہ زندگی کے بدلتے ہوئے اقدار اور مذاق شعر کے ساتھ ، " مذاق و طرز تنقید " کا بدلنا فطری اور لابدی ہے ۔

(۲) تنقید صرف الفاظ و محاورات اور علم بدیع و بیان و معانی کے معیار پر کلام کے پرکھنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد خیالات و افکار کے سرچشمے کا کھوج لگانا اور تحلیل و تجزیے کے ذریعہ شاعر کی صحیح

۱۔ مقدمہ روح رواں ۔ ص ۳۰

۲۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول ۔ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ۔ ص ۱۲۷

کیفیات نفسی کی تعیین و تشخیص ہے -

(۳) کسی شاعر کے خیالات و افکار کے صحیح فہم و ادراک کے لئے اس عہد کی " روح " یا " اجتماعی ذہنیت " کا سمجھنا ضروری ہے -

(۴) شاعر کے حقیقی منصب و مقام کے تعین کے لیے اس کی " انفرادی ذہنیت " کا قدر و اندازہ لازمی ہے - یعنی یہ دیکھنا ضروری ہے کہ

(الف) اس کے قومی ، نسلی اور خاندانی روایات کیا ہیں ،

(ب) اس کے مذہبی عقائد و نظریات کیا ہیں ،

(ج) اور اس کی " اخلاقی حس " کیسی ہے -

کہ انھیں عناصر کی شمولیت سے شاعر کی آواز اپنے عہد کے دوسرے شعرا کی آواز سے علیحدہ پہچانی جا سکتی ہے -

(۵) نقاد کا کام شاعر (یا ادیب) کے کارناموں کے حقیقی محاسن کی نشاندھی کرکے ، شاعر کو عوام سے روشناس کرانے اور ارباب نظر کو اس کے کلام سے " لطف اٹھانے " کے قابل بنانا ہے ---- بالفاظ دیگر تنقید کا مقصد شاعر (یا ادیب) کے کلام میں اسقام و اغلاط تلاش کرنے کے بجائے اس کی " تحسین و تقدیر یا قدرشناسی " ہے -

...

اصغر کے تنقیدی مقالات کی حیثیت کا تعین یا اصغر بحیثیت نقاد : اصغر کے تنقیدی مقالات جو اب تک دستیاب ہو سکے ہیں کل سات ہیں جن کے صفحات کی مجموعی تعداد ڈیڑھ پونے دو سو صفحات ہے - تفصیل درج ذیل ہے :

(۱) مقدمہ پیام زندگی	مطبوعہ اردو مرکز لاہور ۲۷-۱۹۲۶ء (اندازاً)	۴۱-۲۵	۳۶ صفحات
(۲) اردوئے معلیٰ بسلسلہ استفسارات	سہیل علی گڑھ جنوری۱۹۲۶ء	۱۱۲-۱۰۶	۳۶ "
(۳) مقدمہ رباعیات رواں	اردو مرکز لاہور ۲۷-۱۹۲۶ء (اندازاً)	۳۰-۱	۳۰ "
(۴) دیباچہ مطلع انوار	محبوب المطابع ترقی پریس دھلی مئی ۱۹۲۹ء	۵۶-۴۹	۸ "

(۵) اردو شاعری کی ذہنی تاریخ — زمانہ ستمبر ۱۹۲۹ء — ۱۲۵-۱۳۰ — ۱۶ صفحات

(۶) مقدمہ یادگار نسیم — انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد ۱۹۳۰ء — ۱-۳۶ — ۳۶ "

(۷) نظم و نثر پر ایک نظر — ہندستانی - الہ آباد جولائی ۱۹۳۱ء — ۲۳۱-۲۵۲ — ۲۲ "

کل صفحات ۱۷۶ صفحات

ان کے علاوہ بعض کتابوں پر مختصر تبصرے رسالہ ہندستانی ، الہ آباد میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے -

ان تمام مضامین کے مطالعہ ، نیز تنقید کے متعلق اصغر کے نظریات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصغر کا رجحان تاثراتی ، کلاسیکی اور حقیقی تنقید کے برخلاف (جس کا عہد اصغر میں عام رجحان تھا) مغربی اصول تنقید کی طرف تھا - وہ مغرب کے تنقیدی و ادبی افکار سے نہ صرف یہ کہ متاثر تھے بلکہ اسے اردو شعر و ادب میں ایک خوشگوار اضافہ تصور کرتے تھے - وہ ایک فلسفی کی طرح مغلوب قوم کے لئے غالب قوم کی پیروی و تقلید کو قانون فطرت سمجھتے تھے - اس لیے " قدامت پرست " اور " رجعت پسند " اصحاب کی طرح اردو میں مغربی افکار و تصورات کی آمیزش پر سرکہ جبیں ہونے کے بجائے اسے " وسعت مذاق ، تازگی خیال ، شان ہمہ گیری اور فتوحات کے اعتبار سے اردو کے دامن کو وسیع ، خیال کرتے تھے - چنانچہ رقمطراز ہیں :

" ایک طرف فطرت کا یہ زبردست قانون ہے کہ ہر شعبہ حیات میں متمدن و ترقی یافتہ اقوام کے آثار و پرتو کو قبول کیا جائے .... دوسری طرف کپلنگ کا یہ مقولہ بھی مقتضائے فطرت ہے کہ " مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق اور دونوں کے سرشتے اہم نہیں مل سکتے " - ان متضاد حالات کا قدرتی تقاضا یہ ہے کہ مشرق ، مغرب کا مزاج آشنا ہو کر اپنی خصوصیات کو قائم رکھے - تعلق و ہم رنگی کے معنی ایک دوسرے میں محو و مدغم ہونے کے نہیں ہیں بلکہ اس کا مفہوم فراخ دلی و رواداری ہے تہذیب و تمدن کی طرح شعر و ادب بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں - مشرقی و مغربی شعر و ادب کی مخالطت باہمی کا مطلب بھی وسعت مذاق ، تازگی خیال اور شان ہمہ گیری ہے"[۱]

۱- دیباچہ مطلع انوار - ص ۵۲

اصغر کے اسی " ترقی پسندانہ " رجحان ، وسعت نظر اور رواداران و معتدل رویے کی بدولت ان کو اپنے معاصرین میں ممتاز درجہ حاصل ہونا چاہیے تھا لیکن چوں کہ انھوں نے اپنے تنقیدی مساعی کو محدود رکھا اور بہت کم تنقیدی سرمایہ چھوڑا ، نیز ان کی شاعرانہ حیثیت نے ان کی ناقدانہ حیثیت کو دبا دیا اس لیے ان کے تنقیدی مقالات گوشۂ گمنامی میں جا پڑے اور " اردو تنقید کا ارتقا " پر لکھتے وقت کسی نے اصغر کو درخور اعتنا نہ سمجھا ۔ حالانکہ اگر ان کے تنقیدی مقالات کا بہ امعان نظر مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے منفرد نقاد تھے (تفصیل آگے آئی گی) ۔ اور انھوں نے " اردو تنقید " میں مشرق و مغرب کے افکار کے خوشگوار امتزاج سے جو متوازن و معتدل راہ قائم کی تھی وہ بڑی صحت بخش ، مفید اور فطری تھی ۔

اصغر کے تنقیدی مقالات کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۱ء کے درمیان تنقیدی مقالات سپرد قلم کیے (اس سے پہلے کی کوئی تحریر دستیاب نہیں ہوئی) ۔ یہ دور " اردو تنقید " میں بڑا ہنگامی اور افراتفری کا دور تھا ۔ حالی کی آواز نے بہتوں کو چونکا دیا تھا ۔ لیکن " کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے " کے بمصداق ، اردو تنقید دو انتہاؤں ------- مشرقی انداز تنقید (مشاعرین کی راہ روا یا الفاظ و محاورات کے اغلاط و اسقام کی نشاندھی) اور مغربی طرز تنقید کا چربہ اتارنے ---- کے درمیان حیران و گم گشتہ راہ ہو کر رہ گئی تھی ۔

(۱) اب بھی ایک گروہ ایسا تھا جو الفاظ و محاورات ، اور علم بدیع ، بیان و معانی کی میزان میں شعر کو تولتا تھا ------- یہ قدیم مکتب خیال سے تعلق رکھنے والے حضرات پر مشتمل تھا ۔

(۲) دوسرا گروہ مغربی شعر و ادب کے معیار پر اردو شعر و ادب کو پرکھتا تھا ۔ وہ مغرب سے اس درجہ مرعوب و متاثر تھا کہ جب تک مشرقی ادب کا دامن ، مغربی ادب سے نہ باندھ دے ، اس کے محاسن اس کی نظروں میں نہ جچتے تھے ۔ وہ کسی مشرقی شاعر کی عظمت کا اس وقت تک قائل نہ ہوتا تھا جب تک اس کا مقابلہ و موازنہ ، کسی بڑے مغربی شاعر سے کرکے ، اسکو اس کا ہم پلہ نہ قرار دے دے ۔ یہ انداز تنقید بھی دراصل " ہم پایۂ عنصری " و خاقانی اور رشک طالب و کلیم " کا جدید ایڈیشن تھا ۔ اس گروہ کے نقاد مغربی خیالات و افکار کو ھضم کیے اور گوارا

بنائے بغیر ، اور بلا یہ سوچے سمجھے کہ یہ خیالات و افکار اردو کے
مزاج سے ہم آہنگ بھی ہو سکیں گے یا نہیں ، اردو میں اگل دینا
چاہتے تھے ۔ ان لکھنے والوں میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ، عظمت اللہ
خاں ، ڈاکٹر محی الدین زور اور عبدالقادر سروری ، خصوصیت سے قابل ذکر
ہیں ۔

(۳) ان کے علاوہ ایک تیسرا قابل ذکر گروہ بھی تھا ۔ یہ اگرچہ میانہ روی
کا قائل تھا لیکن اسکے یہاں بھی معیار مشرقی و کلاسیکی ہی تھا ۔
اسکی تنقید میں مغربی افکار کی جھلک بڑی واضح اور نمایاں ہے ۔
اس گروہ سے تعلق رکھنے والوں میں مولوی عبدالحق ، پنڈت برج موہن
دتاتریہ ، کیفی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام لئے جا سکتے ہیں ۔

ناقدین کے ان مختلف گروہوں کے درمیان اگر اصغر کی حیثیت و مقام متعین
کیا جائے تو ان کا تعلق تیسرے گروہ سے ہوگا لیکن اگر ان کی تحریروں کا تجزیہ کیا جائے
تو وہ ان لکھنے والوں میں سب سے علحدہ اور منفرد نظر آتے ہیں ۔ اس پر کسی قدر
تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے ۔ سہولت کے لیے ان لکھنے والوں کی درج ذیل
طبقہ بندی کی جا سکتی ہے :

طبقہ اول — آزاد ۔ حالی ۔ امداد امام اثر اور شبلی

طبقہ دوم — (الف) چکبست ۔ شرر ۔ مہدی افادی ۔۔ حالی اور آزاد کی صدائے
باز گشت ۔
(ب) ڈاکٹر بجنوری ۔ عظمت اللہ خاں ۔ عبدالقادر سروری اور زور ۔ مغرب
مرعوبیت ۔
(ج) مولوی عبدالحق اور اصغر گونڈوی ۔

اصغر تک اردو تنقید کا ارتقا :

اردو کے قدیم سرمایے میں "تنقید" بحیثیت
فن یا صنف ادب کے مدون و مرتب انداز میں موجود نہ تھی ۔ اس کا کل سرمایہ تذکروں
کے ہلکے ہلکے تنقیدی اشاروں ، شعرا کے کلام کے انتخاب یا تقریظات پر مشتمل تھا ۔ یا
(۲) مشاعروں کی واہ واہ ، اور الفاظ و محاورات ، اوزان و بحور ، بدیع و بیان و معانی کے

تسامحات اور اسقام و اغلاط کی نشاندہی کو محیط تھا ۔

انگریزوں کی آمد کے بعد جب ہندوستانیوں کو مغربی علوم و فنون سے آگاہی ہوئی تو ان کا زاویۂ فکر و نظر بدلا ۔ نقطۂ نگاہ کی اس تبدیلی سے شعر و ادب کا ہر شعبہ متاثر ہوا ۔ چنانچہ تنقید کے انداز میں بھی تبدیلی کا احساس پیدا ہوا ۔ سب سے پہلے آزاد و حالی نے اپنی تحریروں میں اس احساس کو ظاہر کیا ۔ اگرچہ آزاد نے اپنے خطبوں اور لکچروں میں اس تبدیلی کی ضرورت کا احساس[1] دلایا ہے ۔

" مگر ان کی تصنیف " آب حیات " قدیم طرز کے تذکروں کی ترقی یافتہ شکل ہے[2] ۔"

تنقید سے متعلق بنیادی افکار پہلی بار مقدمہ شعر و شاعری میں مدون ہو کر سامنے آئے ۔ حالی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مغربی افکار کے زیر اثر اردو میں تنقیدی اصول و مبادیات قائم کیے اور شعر کی ماہیت ، اس کے عناصر ترکیبی ، شعر میں وزن و قافیہ کی ضرورت ، شاعری اور سوسائٹی کا باہمی تعلق ، شاعری اور اخلاق کا رشتہ شاعری میں مقصدیت اور اسی قسم کے دوسرے مباحث پر روشنی ڈالی ۔ عملی تنقید میں انھوں نے پہلے مختلف اصناف کا ایک معیار قائم کیا پھر اپنے دور کی شاعری پر صنف وار محاکمہ کیا اور ان کی اصلاح کی (خصوصاً غزل کی اصلاح کی کہ یہی صنف سب سے زیادہ مقبول تھی) تجاویز پیش کیں ۔ اس تنقید و تبصرہ میں ان کا رویہ بڑا ہی متوازن و معتدل و سنجیدہ اور ان کا انداز بیان سائنٹفک ، تجزیاتی اور تحلیلی رہا ہے ۔ اردو تنقید میں حالی کی اس ختی " آواز " اور " رحجان " کی صداقت و قیادت کو سبھی نے تسلیم کیا ہے ـــــ " حالی کی تنقید ہئیتی کے ساتھ ساتھ تاریخی بھی ہے[3] ۔"

حالی کے ساتھ ہی شبلی بھی تنقید کے میدان میں آئے ۔ انھوں نے بھی بعض بنیادی مباحث پر اظہار خیال کیا اور شعر کے اصلی عناصر و محاکات و تخیل کو

۱۔ " نظم اور کلام موزوں " از محمد حسین آزاد ۱۹۶۷ء اور خطبہ افتتاحیہ بزم مشاعرہ نظم اردو ۔ انجمن پنجاب ۔ ۱۹ اپریل ۱۸۷۳ء بحوالہ محمد حسین آزاد جلد اول ۔ ڈاکٹر اسلم فرخی ۔ طبع اول ۱۹۶۵ء ۔ ص ۲۳۲-۲۳۳ ۔ نیز نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۵ء ۔ ص ۵۱

۲۔ فن اور تنقیدی مضامین ۔ نجم الہدیٰ ۔ کتاب منزل سبزی باغ پٹنہ ۔ ص ۶۸

۳۔ فن تنقید اور تنقیدی مضامین ۔ نجم الہدیٰ ۔ مگدھ پریس ۔ پٹنہ ۔ ص ۶۷

ٹھہرایا ۔ انھوں نے بھی الفاظ و خیال کے رشتہ کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن حالی کی طرح وہ بھی " الفاظ کو اصل شاعری سمجھتے تھے[1] " ۔ شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں تقابلی مطالعہ کی رسم ڈالی اور تشریح و تجزیہ کے ذریعہ تنقید و محاکمہ کی پہلی کوشش کی ۔ ان کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ وہ شاعر پر سیاسی و معاشرتی حالات کے دباؤ اور اثر کو تسلیم کرتے ہیں[2] لیکن یہ تمام باتیں بکھرے ہوئے انداز میں ضمناً قلم سے نکل گئی ہیں کسی مربوط فلسفۂ فکر کا نتیجہ نہیں معلوم ہوتیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ حالی و شبلی دونوں بزرگ مغربی طرز فکر سے متاثر ضرور تھے لیکن چونکہ انگریزی ادب کا مطالعہ براہ راست نہیں تھا اس لیے کماحقہ استفادہ نہ کر سکے اور باوجود " فنی تنقید " کے بانی ہونے کے ان کے یہاں انگریزی انداز کی تنقید ۔۔۔ "سائنٹفک تحلیل[3] " ۔۔۔ " اجتماعی ذہنیت اور انفرادی ذہنیت[4] " کا وہ واضح شعور نہیں ملتا جو ہمیں بعد میں اصغر کے یہاں نظر آتا ہے ۔ ان دونوں بزرگوں کا انداز تنقید قدیم و جدید کے درمیان " برزخ " یا " جسر " ہے ۔ یعنی ایک طرف ان کے یہاں ہیئتی و تاثراتی (خصوصاً شبلی کے یہاں) تنقید نظر آتی ہے جس میں خیال کے مقابلے میں الفاظ کو اہمیت دی جاتی ہے ۔ دوسری طرف تاریخی و تجزیاتی ہے جس میں شاعر اور اسکی شاعری کو تاریخی و سیاسی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔

انھیں کے ساتھ سید امداد امام اثر منظر عام پر آئے[5] ۔ یہ حالی اور شبلی سے زیادہ مغربی شعر و ادب سے واقف ہیں ۔ انھوں نے " کاشف الحقائق " میں ، شاعری ، موسیقی اور مصوری کی مجانست شاعری کی تعریف[6] ، داخلی و خارجی شاعری[7] کا

۱۔ اردو تنقید پر ایک نظر ۔ کلیم الدین احمد ۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور طبع اول ۱۹۶۵ء ۔ ص ۱۱۶

۲۔ شعرالعجم ۔ از مولانا شبلی جلد چہارم و پنجم

۳۔ دیباچہ مطلع انوار از اصغر ۔ ص ۳۹

۴۔ مقدمہ یادگار ضیغم از اصغر ۔ ص ۱

۵۔ سید امداد امام اثر کی تالیف کاشف الحقائق ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۷ء طبع ہوئی ۔ قطعہ تاریخ کا آخری شعر جس سے تاریخ نکلتی ہے درج ذیل ہے ؎

فکر تاریخ جوکی ہے سر اعدا محسن ۔۔۔ دل پکارا کہ لکھو گلشن بستان اثر
۱۳۱۷

۶۔ کاشف الحقائق جلد اول از امداد اثر ۔ مکتبہ معین الادب لاہور ۔ ۱۹۵۶ء ص ۱۷

۷۔ ایضاً ۔ ص ۶۷

فرق ، شاعری کا تمدن، اخلاق اور مذہب سے ربط بڑی بالغ نظری سے واضح کیا ہے ۔ اسکے علاوہ ہندوستان ، مصر ، یونان ، روما ، عرب اور ایران کی شاعری پر ان کے جغرافیائی اور تاریخی حالات کے پس منظر میں تبصرہ کیا ہے ، ساتھ ہی اردو شاعری کو فارسی شاعری کا خوشہ چیں قرار دیتے ہوئے ، فارسی شاعری اور اسی ضمن میں اردو شاعری پر صنف وار محاکمہ کیا ہے ۔ کتاب بڑی معلومات افزا اور فکر انگیز ہے ۔ لیکن ان کے تنقیدی خیالات اس ضخیم کتاب میں اتنے منتشر اور غیر مربوط ہیں کہ ان سے تنقید کے متعلق کوئی واضح ... تصور قائم نہیں ہوتا ۔ تاہم اسکے مطالعہ سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ انگریزی اور دوسرے مغربی ممالک کے شعر و ادب کی خواندگی براہ راست تھی ۔ انھوں نے آزاد ، حالی اور شبلی کی طرح ، مغرب کی سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کر لیا تھا ۔ سید امداد امام اثر پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو تنقید میں داخلی شاعری (Subjective Poetry) اور خارجی شاعری (Objective Poetry) کے اصطلاحات اور تصور داخل کئے ۔

دوسری چیز جو انھیں حالی اور ان کے متبعین سے ممیز و ممتاز کرتی ہے وہ ان کا " نقطۂ نظر " ہے ۔ وہ حالی کی طرح یورپ کی شاعری اور تنقید و نظر سے مرعوب و متاثر ہو کر ، مشرق و ایشیا خصوصاً اردو شاعری کے محاسن کے منکر اور اس سے بیزار نظر نہیں آتے بلکہ جسطرح ایشیائی شاعری کے معایب کو تسلیم کرتے اور اس کے محاسن کے معترف ہیں اسی طرح مغربی شعر و ادب کے معائب پر مطلع ہیں اور ساتھ ہی اسکے محاسن کی بھی داد دیتے ہیں ۔ وہ سرسید اسکول کی اس " مرعوبانہ ذہنیت" (مغرب سے مرعوبیت کے زیر اثر اپنی ہر چیز سے بیزاری) کو " بدمذاقی جدید [1] " کہتے ہوئے تبصرہ کرتے ہیں :

> " اس زمانے میں ایک نئی بیماری پیدا ہوئی ہے اور وہ یہ کہ اکثر ادھورے انگریزی خوانوں کے دماغ میں اس فاسد خیال نے جگہ کر لی ہے کہ ساری خوبیاں یورپ پر ختم ہوگئی ہیں ایشیا کو خوبی کا کوئی حصہ نہیں ملا .... وہ ایشیائی خیالات ، اوضاع و معاملات کو یک قلم قابل نفرت سمجھتے ہیں ۔ یورپ کے ہر امر پر عام اس سے کہ معقول ہو

۱۔ کاشف الحقایق جلد اول ۔ ص ۸۰

یا غیر معقول جان دیتے ہیں .... حال آں کہ
خود اہل یورپ اس کے مقر ہیں کہ ابھی تک انھیں
ایشیائی خیالات شاعرانہ سے آشنائی نہیں پیدا ہوئی ..
.... اس پر بھی جس قدر وہ مطلع ہو چکے ہیں اس
حساب سے ایشیائی شاعری کی وقعت ان کے دلوں میں پیدا
ہو چکی ہے ۔[1]"

چنانچہ وہ اردو والوں کے لیے صحیح راہ متعین کرتے ہوئے مشورہ دیتے ہیں :

" ہم لوگوں کو ترقی فن شاعری کے لیے دو امر درکار ہیں
ایک یہ کہ جو معائب ایشیائی شاعری کے ہیں ان سے متنبہ
ہو کر ان کے ازالے کی فکر کریں ۔ دوم یہ کہ جو جو
خوبیاں یورپین شاعری میں ہیں ان کو حسب ضرورت اپنی
شاعری میں داخل کرنے کی صورتیں نکالیں ۔[2]"

مختصر یہ کہ " کاشف الحقایق " مغرب سے براہ راست استفادے کے بعد لکھی گئی ہے ۔ اس میں بعض بنیادی مباحث زیر بحث آئے ہیں اور حالی کے اثر سے ہٹ کر اپنی آزادانہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے لیکن " مقدمہ شعر و شاعری " کا صور اس شدت اور زور سے پھونکا گیا کہ " کاشف الحقایق اور اسکے مولف " کی آواز دب کر رہ گئی ۔ حیرت تو یہ ہے کہ کلیم الدین احمد نے بھی " اردو تنقید پر ایک نظر " میں " کاشف الحقایق " کو نظرانداز کر دیا اسطرح اسکے تنقیدی خیالات اردو میں عام نہ ہو سکے۔

حالی کے معاصرین میں چکبست ، شرر اور مہدی افادی نے بھی تنقیدی مضامین لکھے لیکن بقول جناب نجم الہدیٰ :

" ان کی ناقدانہ حیثیت کچھ زیادہ اہم نہیں ۔ البتہ
چکبست نے شاعری کی ماہیت ، اردو شاعری کی ہئیت اور
اسی طرح کے دوسرے موضوعات پر اپنے مقالوں میں کہیں کہیں
روشنی ڈالی ہے ۔ ہم اس نظریاتی تنقید کو تقلیدی کاوش
کہہ سکتے ہیں ۔ عملی تنقید میں چکبست ہئیت پر زیادہ
توجہ دیتے ہیں لیکن وہ اخلاقی قدروں کے بھی قائل ہیں ۔[3]"

۱،۲۔ کاشف الحقایق جلد اول ۔ ص ۸۰ .... ص ۸۱

۳۔ فن تنقید اور تنقیدی مضامین ۔ نجم الہدیٰ ۔ مگدھ پریس ۔ پٹنہ ۔ ص ۲۹

اسی دور کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے " اردو تنقید کا ارتقا " میں تحقیقی تنقید کے زیر عنوان حافظ محمود خان شیرانی ، وحید الدین سلیم اور نصیر الدین ہاشمی کے نام گنوائے ہیں لیکن ان بزرگوں کے کارنامے خالص فنی تنقید سے جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں ۔ انھیں محقق کے زمرے میں شمار کیا جانا چاہیے ۔[1]

انھیں کے معاصرین میں ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ، عظمت اللہ خاں ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور عبدالقادر سروری ہیں ۔ یہ حضرات مغربی تنقید سے حد درجہ متاثر ہیں ۔ ڈاکٹر بجنوری اگرچہ کہتے بھی ہیں کہ :

" تنازع للبقامیں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہر فعل و خیال کا موازنہ مغربی اقوال و آراء سے کرنے لگے ہیں یہ وہ خرابی ہے جسکی زنجیر کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی ۔ پس کیا تعجب ہے اگر اس یورپ زدگی کے زمانے میں طالب علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب کا شکسپیر ، ورڈس ورتھ ، ٹینی سن سے مقابلہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں ۔ افسوس یہ کوتاہ نظر یہ نہیں جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیا نادانستہ ظلم ہوتا ہے ۔"[2]

لیکن ان کا پورا " مقدمہ " مغربی شعراء ، مفکرین اور فلاسفہ کے اقوال و بیانات سے بھرا پڑا ہے اسکے مطالعہ سے واضح طور پر احساس ہوتا ہے کہ مقدمہ نگار اپنی بات میں وزن و وقار پیدا کرنے کے لیے ان مفکرین کا سہارا لے رہا ہے ۔ جناب آل احمد سرور کو بجنوری کے اس کارنامے میں " تخلیقی شان " اور " ذہنی رفاقت کا سامان " نظر آتا ہے ۔ چنانچہ رقمطراز ہیں :

" بجنوری نے غالب کی تنقید میں تحسین پر زور دیا مگر تحسین میں تخلیقی شان ضرور پیدا کی ۔ ان کے ہاتھوں تنقید خشک بے جان فارمولا یا بے حس پیمانہ نہ رہی ۔ ایک دلچسپ ذہنی رفیق بن گئی ۔"[3]

۱۔ فن تنقید اور تنقیدی مضامین ۔ نجم الہدیٰ ۔ مگدھ پریس ۔ پٹنہ ۔ ص ۷۱

۲۔ محاسن کلام غالب ۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری ۔ الکتاب آرام باغ ۔ کراچی ۔ ص ۵-۳

۳۔ تنقیدی اشارے ۔ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۔ پہلا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۶۳ء ، ص ۲۰۵

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بجنوری کا " مقدمہ دیوان غالب " ، غلو ، والہانہ جوش ، تخیل کی رنگ آمیزی ، اور شاعرانہ حسن کاری کا نمونہ تو ضرور ہے لیکن جامعیت، عمق اور متوازن و معتدل ناقدانہ بصیرت سے عاری ہے ۔

بجنوری کی تنقید میں دوسری بات جو قاری کو کھٹکتی ہے وہ وہی " مغرب سے مرعوبیت " ہے جو سرسید اسکول کے متبعین میں نظر آتی ہے ، لیکن تنقیدی بصیرت اور اسلوب میں ، وہ سرسید اسکول کے سب سے بڑے پیمبر اور مبلغ حالی کی گرد کو بھی نہیں پہونچتے ۔ حالی کی تنقید اور اسلوب بجنوری کے مقابلے میں کہیں زیادہ علمی اور سائنٹفک ہے ۔ اسکے باوجود " اردو تنقید " کے ارتقا میں بجنوری کے خدمات کو فراموش و نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔

بجنوری کے ساتھ ہی عظمت اللہ خاں تنقید کے میدان میں آئے ۔ عظمت اللہ خاں خاصی سوجھ بوجھ ، تنقیدی بصیرت اور ترقی پسندانہ رجحانات کے حامل تھے ۔ انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ اردو شعر و ادب کے خصائص و معائب کا جائزہ لیا اور سنجیدگی کے ساتھ شعرا اور ادبا کو ھندوستانی اور مغربی شعر و ادب سے استفادے کی دعوت دی ۔ لیکن ان کے مضامین میں " اردو شاعری " اور خاص طور پر " اردو شاعری کی آبرو ـــ غزل " پر اتنی شدید نکتہ چینی کی گئی اور اسکو گردن زدنی قرار دیا گیا ، کہ ان کی فکر کی متانت و سنجیدگی ، لہجہ کی درشتی اور " عام جذباتیت " کے دھارے میں بہہ گئی اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دنیائے تنقید میں ان کا نام " تخریب کار " ہی کی حیثیت سے محفوظ رہ سکا ۔ چنانچہ آل احمد سرور رقمطراز ہیں :

> " عظمت اللہ خاں ایک تخریبی حربہ لے کر ادبی محفل میں وارد ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے اپنے اکھڑے اکھڑے نیم مغربی انداز میں غزل پر ایک کاری ضرب لگائی ـــ عظمت اللہ خاں نے بات نئی نہیں کہی تھی ۔ حالی نے بھی غزل کو مقبولیت کی نظر سے نہیں دیکھا تھا ۔ مگر حالی مصلح تھے باغی نہیں تھے ۔ عظمت اللہ خاں باغی تھے ـــ انھوں نے اعلان کیا کہ غزل کی گردن بے تکلف مار دینی چاہیے "[۱]

۱۔ تنقیدی اشارے ۔ آل احمد سرور ۔ ص ۲۰۶

یہاں عظمت اللہ خاں پر نہ تفصیلی بحث کی گنجائش ہے ، نہ ضرورت ۔ لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ عظمت اللہ خاں نے " مغربی اور ہندوستانی " کے امتزاج سے ایک نئے تنقیدی اسلوب کی رسم ڈالنا چاہی تھی لیکن اردو والوں کی "جذباتیت اور تنگ مزاجی " کے ہاتھوں وہ پھل پھول نہ سکی اور ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی ۔

اسی عہد کے لکھنے والوں میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور عبدالقادر سروری بھی ہیں ۔ یہ حضرات صحیح معنوں میں مغربی خیالات و افکار کو گراموفون ریکارڈ کی طرح دہراتے ہیں اسی لیے ان کی تنقید کو " قاموسی "[1] کہا گیا ہے ۔

ان دونوں حضرات کے مولفات " روح تنقید " اور " دنیائے افسانہ " کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے کہ ان دونوں نقادوں نے " تنقید کی روح سے نہیں اسکے جسم سے بحث کی ہے[2] " اور مغربی خیالات و افکار کو ہضم کیے بغیر اگل دیا ہے ۔ یہ کوشش کچھ زیادہ مستحسن نہیں ۔ اس سے مغربی طرز تنقید میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ۔

اسی دور کے لکھنے والوں میں دو اور نقاد قابل ذکر ہیں ۔ ایک جناب اثر لکھنوی دوسرے جناب نیاز فتحپوری ۔ جناب اثر لکھنوی نے بہت سے تنقیدی مضامین و مقالات لکھے لیکن انھوں نے نہ کوئی تنقیدی اصول و مبادیات قائم کیے نہ ان سے بحث کی لیکن ان کی تحریروں میں مغربی تنقید کی روشنی صاف نظر آتی ہے گو ان کا اصل مزاج مشرقی ہے اور ان کی تنقید ہئیتی اور کلاسیکی ہے ۔

نیاز فتحپوری جامع الصفات ادیب ہیں ۔ " مشرقی قدیم سرمایۂ ادب پر ان کی نظر گہری اور جدید ادب سے ان کی واقفیت خاصی ہے ۔ وہ قدیم بھی ہیں اور جدید بھی ۔ لکیر کے فقیر نہیں[3] ۔" وہ اپنی آزادانہ رائے رکھتے ہیں اور اکثر و بیشتر عام رائے کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی رائے کے اعلان میں اس شدت اور زور سے آواز اٹھاتے ہیں کہ اوروں کی آواز ان کی آواز میں دب جاتی ہے ۔ ان کی اسی

۱۔ آل احمد سرور (مقالہ ایم اے اردو) از مسرت جبیں مرزا ۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور ، ۱۹۶۷ء ۔ ص ۷۱

۲۔ " ریویو روح تنقید " از مولوی عبدالحق بحوالہ اردو تنقید پر ایک نظر ۔ کلیم الدین احمد ۔ ص ۱۳۶

۳۔ تنقیدی اشارے ۔ آل احمد سرور ۔ ص ۲۰۸

" انانیت " نے جہاں مذہب کے معاملے میں انہیں " باغی اور سرپھرا " کا خطاب دلوایا ادب و تنقید میں بھی " ڈیڑھ اینٹ کی مسجد " الگ بنانے پر مجبور کیا ۔ کبھی کبھی تو ان کی انانیت حد درجہ ضد اور ہٹیلے پن پر آ جاتی ہے اور " محاسن " کی طرف سے انہیں بالکل اندھا کر دیتی ہے ---- لیکن اس نقص کے باوجود ان کی تنقید میں بڑا وزن ہوتا ہے اصلاً ان کا مزاج مشرقی ہے اور ان کی تنقید ہنگامی و تاثراتی ۔ ان کے زور قلم اور نازک جمالیاتی احساس سے ان کی تحریروں میں تخلیقی شان پیدا ہوگئی ہے ۔ ان کے " یہاں تعمیری اور تخریبی دونوں صلاحیتیں ہیں " اور بقول آل احمد سرور :

" وہ تاج اتارنے اور شہرتیں عطا کرنے میں خاصے ماہر ہیں ۔"[1]

دور مذکور کے نقادوں میں مولوی عبدالحق بعض حیثیات سے سب سے زیادہ منفرد اور ممتاز ہیں ۔ اگرچہ ان کا اصل کارنامہ قدیم ادبی سرمایہ کو زندہ و محفوظ کرنا ہے اور وہ ناقد سے زیادہ محقق ہیں لیکن ان میں ناقدانہ بصیرت و صلاحیت بھی اعلیٰ درجہ کی تھی ۔ انھوں نے بالعموم تنقید کے اصول و مبادیات سے زیادہ بحث نہیں کی ۔ تاہم وہ مغرب کے اصول تنقید سے واقف ہیں ۔ وہ تمام عمر حالی کی قائم کردہ راہ پر بڑی سنجیدگی و خلوص سے گامزن رہے ان کی تنقید متوازن اور سلجھی ہوئی اور ان کے خیالات میں متانت اور بیان میں سنجیدگی ہوتی ہے ۔ وہ بیجا نکتہ چینی نہیں کرتے البتہ غلطیوں کی نشاندہی بڑے سنجیدہ انداز میں کر دیتے ہیں اور طنز و تعریض سے گریز کرتے ہیں ---- انھیں تمدن و شاعری کے باہمی ربط کا بھی احساس ہے انھوں نے مقدمہ کلام میر میں ، لکھنو کے تمدن کا اسکی شاعری پر جو اثر پڑا ہے اس کا اظہار بڑے حقیقت پسندانہ اور علمی انداز میں کیا ہے ۔ جس کا طویل اقتباس پیش کرتے ہوئے کلیم الدین احمد نے یوں اعتراف کیا ہے :

" یہاں شعرائے لکھنو کی کمی کا صاف صاف بیان ہے اور غالباً
پہلی مرتبہ تمدن کا جو اثر شاعری اور ادب پر ہوتا ہے اس کا
اظہار کیا گیا ہے ۔"[2]

۱۔ تنقیدی اشارے ۔ آل احمد سرور ۔ ص ۲۰۸

۲۔ اردو تنقید پر ایک نظر ۔ کلیم الدین احمد ۔ ص ۱۳۱

۳۔ مقدمات عبدالحق حصہ دوم جسمیں یہ مضمون شائع ہوا ہے ، پہلی بار ۱۹۳۱ء حیدرآباد سے شائع ہوا ۔ بحوالہ " قومی زبان " بابائے اردو نمبر اگست ۱۹۶۳ء ۔ ص ۲۲۵-۲۲۳---- اصغر اس سے بہت پہلے بڑی شرح و بسط کے ساتھ لکھ چکے تھے ۔ مقدمہ رباعیات رواں ۱۹۲۶ء ۔ مقدمہ پیام زندگی ۲۷- ۱۹۲۶ء ۔ دیباچہ مطلع انوار ۱۹۲۹ء اور شاعری کی ذہنی تاریخ ستمبر ۱۹۲۹ء اور مقدمہ یادگار نسیم ۱۹۳۰ء ۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ ان کے " مقدمات " اردو کے تنقیدی ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں ۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تنقید " مشرقی و مغربی تنقید کا سنگم " ہے[1] ۔ ان کا انداز تنقید اور انداز بیان دونوں سائنٹفک ہیں ۔

یہ تھی تنقید کے میدان میں نقادوں کی تگ و تاز جب اصغر نے اپنے اشہب قلم کو جولاں کار کیا ۔ لیکن جیسا کہ سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اصغر کا تعلق نقادوں کے اس گروہ سے ہے جسکے سرخیل مولوی عبدالحق ہیں ۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا تھا کہ اپنے بعض خصوصیات کی وجہ سے وہ اپنے گروہ میں الگ پہچانے جاتے ہیں ۔ ذیل میں اصغر کی اسی انفرادیت اور امتیاز کی وضاحت کی جاتی ہے ۔

اردو تنقید میں اصغر کی اوّلیات :

اصغر کے تنقیدی نظریات بڑی شرح و بسط کے ساتھ گزشتہ سطور میں پیش کیے جا چکے ہیں ۔ انھیں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو عہد اصغر تک کے تنقیدی سرمائے میں ان کے اولیات خود بخود واضح ہو جاتے ہیں تاہم یہاں انھیں سلسلہ وار درج کیا جاتا ہے :

(۱) اجتماعی ذہنیت :

اصغر پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اردو میں " اجتماعی ذہنیت " کی اصطلاح استعمال کی اور اس کا ایک واضح تصور پیش کیا ۔ (تفصیل گزشتہ سطور میں دی جا چکی ہے) ۔ انھوں نے اسے مختلف ناموں سے تعبیر کیا ۔ مثلاً " اجتماعی مذاق " ، " متحدہ و مشترکہ مذاق " یا " سوسائٹی کی اصل روح " ۔ یہ قریب قریب وہی تصور بلکہ وہی اصطلاح ہے جسے ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ، بہت بعد میں ترقی پسند ادیبوں نے " روح عصر " کا نام دیا ۔

اصغر نے اپنے بیشتر مقالات اسی نظریے کے تحت مرتب کیے ہیں ۔ چنانچہ مقدمہ پیام زندگی میں جسے مرثیہ کے تدریجی ارتقاء کی تاریخ کہنا چاہیے انھوں نے لکھنؤ کے شاہی دور کے تہذیب و تمدن اور مذہبی و فکری رجحانات کا عمومی اثر اور اسکے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ذہن و مزاج کا تعین و تجزیہ بڑی بالغ نظری سے کیا ہے اور انھیں

---

۱ ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ۔ بحوالہ فن اور تنقید فن ۔ نجم الہدیٰ ۔ ص ۱۲۹

خصوصیات کا عکس اس دور کے مرثیوں میں دکھایا ہے ۔ لکھنؤ کے تمدن کا اثر اسکی شاعری پر مولوی عبدالحق نے بھی دکھایا ہے جس پر پروفیسر کلیم الدین احمد نے ان کی یوں ستائش کی ہے :

" ...... غالباً پہلی مرتبہ تمدن کا جو اثر شاعری اور ادب پر ہوتا ہے اس کا اظہار کیا گیا ہے ۔[1] "

لیکن پروفیسر صاحب کا یہ قیاس درست نہیں ہے ۔ کیوں کہ مولوی عبدالحق نے یہ بحث مقدمہ کلام میر میں اٹھائی ہے اور یہ مقدمہ ۱۹۳۱ء میں " مقدمات عبدالحق " حصہ دوم[2] میں شائع ہوا ۔ جب کہ اصغر اس سے بہت پہلے " مقدمہ پیام زندگی " میں جس کا سال تحریر ۱۹۲۷ء ہے ، اس پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈال چکے تھے ۔ ذیل میں اصغر کی تحریر کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے تاکہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اسکی تصدیق و وضاحت ہو سکے ۔ وہ لکھتے ہیں :

لکھنؤ کی فضا پر ایک نظر ڈالو ۔ سلطنت کا مذہب شیعہ تھا ۔ امرا و اعیان ریاست .... اسی مشرب کے حلقہ بگوش تھے ۔ رونا رلانا داخل حسنات تھا اور یہی چیز حصول عظمت کا ذریعہ بھی بن ہوتی تھی ۔ دولت و ثروت نے عام طبائع میں ہنگامہ عیش و نشاط برپا کر رکھا تھا خصوصاً جان عالم پیا کی رنگ رلیوں اور عیش پرستیوں کی داستان کسے نہیں معلوم ۔ آئے دن کے مشاعرے روز روز کی مجلسیں فارغ البالی کے ضمن میں مجملہ سامان عشرت تھیں ۔ امرا و روسا ہمت افزائیاں کرتے تھے ۔ شعرا جان توڑ کر زور لگاتے تھے ۔ ایک ایک مضمون کو ہزار انداز سے باندھتے مختلف صنعتیں دکھائی جاتیں ۔ بڑے بڑے مجمعوں میں یہ بھی ضرورت ہوتی کہ عوام کی واہ واہ سے حوصلوں میں بلندی و بالیدگی پیدا کی جائے ۔ عوام کے سطحی مذاق کی رسائی ضلع جگت اور لفظی رعایتوں سے آگے کہا ہو سکتی

۱۔ اردو تنقید پر ایک نظر ۔ کلیم الدین احمد ۔ ص ۱۳۱

۲۔ بحوالہ قومی زبان ۔ کراچی ۔ بابائے اردو نمبر اگست ۱۹۶۳ء ۔ ص ۲۲۵-۲۲۲

ہے ۔ چنانچہ انھیں چیزوں پر واہ واہ سبحان سبحان اللہ
کا شور مچ جایا کرتا تھا .... اس چہل پہل اور گرمی
محفل میں سوز و درد کا کیا ذکر ۔ تحسین و آفرین کے لئے
دہ رویا جاتا ہے اور دہ فیس پر آھیں کی جا سکتی ھیں ..
.... یہی وجہ ہے کہ مرثیہ کا بڑا حصہ تکلف و تصنع سے
گرانبار ہے .... مرثیے اور مجالس کی کثرت رواج سے طبیعتوں
پر اسکا غلبہ اتنا قوی ہو گیا کہ .... تمام اصناف سخن
میں ھمیں اسکی جھلک نظر آئے گی .... غرضیکہ اسطرح
نہ جوش نشاط کی حقیقی ترجمانی ہو سکتی تھی اور نہ
سوز و درد کی ۔ اب لے دے کے جو چیز باقی رہ جاتی ہے
وہ کاوش عشق اور بے جا صناعی ہے ۔"[1]

(۲) انفرادی ذہنیت یا شخصیت و انفرادیت :

عہد اصغر تک کا تمام تنقیدی
سرمایہ کھنگال ڈالئے جہاں تک میرے علم میں ہے ، اسمیں شخصیت و انفرادیت کا کوئی
واضح تصور موجود نہیں ہے ۔ زیادہ سے زیادہ نقادوں نے شاعر کے خصوصیات شاعری پر
اکتفا کر کے ، اسے دوسرے شعرا سے علحدہ و ممتاز دکھانے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن
اگر ان خصوصیات کا بھی بہ نظر غائر مطالعہ و تجزیہ کیا جائے تو وہ بیشتر شعرا کے
یہاں مشترک نظر آئیں گے ۔ پھر وہ اتنے مبہم اور غیر واضح ہوتے ھیں کہ ان سے شاعر
کی انفرادیت کے خدو خال کا کوئی تصور ذہن میں قائم نہیں ہوتا ۔ اصغر نے پہلی
بار اردو تنقید میں " انفرادی ذہنیت " ، " انفرادیت " اور " شخصیت " کا واضح
تصور داخل کیا اور اسکے اجزائے ترکیبی کی نشاندھی کی ۔ آج چالیس پچاس سال بعد
گو" شخصیت و انفرادیت " کے خطوط واضح ہوگئے ھیں اور ان کے تصور میں وسعت و
ہمہ گیری پیدا ہوگئی ہے اور ان کے اجزا و عناصر میں اصغر کے بتائے ہوئے اجزا و عناصر سے
اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے ۔ تاہم جس زمانے میں اصغر نے یہ تصور پیش کیا تھا
اس وقت واقعی یہ تصور نیا تھا ۔

۱۔ مقدمہ پیام زندگی ۔ اصغر ۔ ص ۶۲ ۔ ۵۸

اصغر نے علی تنقید میں اس سے کام لیا اور بدلائل نسیم (لکھنوی) کی انفرادیت ثابت و واضح کی ۔ وہ رقمطراز ہیں :

۱۔" نسیم کی انفرادی و شخصی آزادی کے اسباب حسب ذیل معلوم ہوتے ہیں : (الف) حاسۂ قومی (ب) حاسۂ مذہبی (ج) حاسۂ اخلاقی " (ان پر تفصیلی بحث گزشتہ سطور میں گزر چکی ہے) ۔

۲۔ " لکھنؤ اسکول کا ابتدائی دور ناسخ اور آتش کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے ۔ اس دور کا تمام تر کارنامہ غزل ہے ... . غزل سے زیادہ لفظی گرہ بازیں اور سطحی هرزہ سرائیوں کا موقع کسی اور صنف شاعری میں نہیں ہے ۔ غرضیکہ اس دور میں کسی کو مثنوی لکھنے کا خیال نہیں پیدا ہوا .... نسیم نے جس ماحول میں آنکھ کھولی ، جس سوسائٹی میں انکی تربیت ہوئی وہاں زبان و شاعری پر اس درجہ تکلف ، تصنع اور آورد کا رنگ غالب ہو گیا تھا کہ اس سے مسلسل خیالات کے اظہار کی صلاحیت ہی مفقود ہوتی جا رہی تھی ۔ نسیم نے اسی مذاق اور اسی طرز بیان کے ماتحت واقعہ نگاری کے فرائض ادا کرنا چاہے ۔ اس اجتہاد فکر سے زیادہ کوئی اور تعجب انگیز جسارت نہیں ہو سکتی تھی ۔[1] "

۳۔ " نسیم کی قوی شخصیت اور زبردست انفرادیت کا .... آخری ثبوت ان کا بے نیاز طرز زندگی ہے ۔ ان کی آزادہ روی اور شان استغنا کا یہ عالم تھا کہ ان کے بعض اہل قوم نے جو .... عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز تھے .... یہ خواہش کی کہ ان کو دربار شاہی تک پہونچائیں اور ان کے منصب و جاگیر کی فکر کریں مگر انھوں نے ان باتوں کی طرف مطلقاً رخ نہیں کیا ۔[2] ان کی شاعری ان کی ذاتی تفریح و دلچسپی کا

۱۔ مقدمہ یادگار نسیم ۔ ص ۱۰ ۔ ۸

۲۔ مقدمہ گلزار نسیم از چکبست ص ۳۰ ۔ بحوالہ مقدمہ یادگار نسیم ۔ ص ۱۲

نتیجہ تھی ۔ اس زمانے کے عام دستور کے موافق نہ وہ خلقی
شاعر پیشہ تھے اور نہ اس چیز کو انھوں نے حصول منفعت کا
ذریعہ بنایا ۔[1] "

(۳) دبستان ہائے شاعری کی طبقہ بندی :

اصغر پہلے شخص ہیں جنھوں نے
" اجتماعی ذہنیت و مزاج " یا " اجتماعی مذاق " کی بنیاد پر اردو شاعری کے تین
واضح دبستانوں کی طبقہ بندی کی ہے اور ہر دبستان کے " مذاق و مزاج " کی
شناندہی کی ہے ۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے :

۱- دبستان دھلی

اجتماعی مذاق ۔ صوفیانہ و متصوفانہ ۔ روح عصر تصوف ۔ تفصیلی
بحث کے بعد اس دور کا " مزاج شعر و ادب " اور اسکے اصلی خصوصیات گنائے ھیں ۔[2]

۲- دبستان لکھنؤ

اجتماعی ذہنیت ۔ مسرت و نشاط ، تعیش و ھوس پرستی اور
تصنع و تکلف ۔۔ شاعری انھیں خصوصیات کا مظہر ۔[3]

۳- دبستان جدید

مغرب کا اثر ۔۔۔ اجتماعی ذہنیت ۔ مشرق و مغرب کا خوشگوار
امتزاج ۔۔۔ " وسعت مذاق ، تازگی خیال اور شان ھمہ گیری[4] " ۔۔۔ شاعری میں اسی
مذاق کی جلوہ باریاں ۔

(۴) سائنٹفک تجزیہ و تنقید

حالی کے بعد سے اصغر کے دور تک (جیسا کہ سطور
بالا میں بصراحت مذکور ھوا) زور ھئیتی و کلاسیکی تنقید پر تھا ۔ یعنی " الفاظ کو

۱- مقدمہ یادگار نسیم ۔ ص ۱۲-۱۱
۲- اردو شاعری کی ذھنی تاریخ ۔۔ دھلی اور لکھنؤ اسکول ۔ زمانہ کانپور ستمبر۱۹۲۹ء ۔
ص ۱۳۸
۳- مقدمہ پیام زندگی از اصغر ۔ ص ۶۳-۵۹
۴- دیباچہ مطلع انوار ۔ ص ۵۳-۵۰ ۔ یہ تمام مقالات پڑھنے سے تعلق رکھتے ھیں ۔

اصل شاعری " سمجھا جاتا تھا ۔ لیکن اصغر نے عام روش سے ھٹ کر الفاظ کے مقابلے میں " مضمون و خیال " کو اھمیت دی ـــ (یہی لے آگے چل کر ترقی پسند ادیبوں کے یہاں اس درجہ بڑھ گئی کہ الفاظ کے صحیح استعمال سے بے اعتنائی برتی جانے لگی) ـــ یہ اپنے دور کے طرز تنقید کے خلاف ردعمل تھا ۔ ان کا یہ نظریہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جا چکا ھے ۔ مگر وضاحت کے لیے ایک مختصر سا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ھے ۔ وہ لکھتے ھیں :

" اگر زبان و محاورہ ایسی چیزیں ھیں جسکی حیثیت سطح و عرض سے زیادہ نہیں اور اسکی بنیاد پر) لوگوں کو بیجا نکتہ چینیوں کا حق حاصل ھے تو پھر جو کچھ محاورہ اور زبان کی حدوں میں فرمایا جاتا ھے اسکی " محویت و لطافت " کا بھی اسی سختی کے ساتھ کیوں نہ جائزہ لیا جائے [1] ۔"

اصغر کا یہ نظریہ ھی نہیں معمول بھی تھا ۔ انھوں نے جتنے مقالات لکھے ھیں ان میں ان کی بیشتر توجہ خیالات و افکار کی تحلیل و تجزیہ کی طرف رھی ھے ۔ ذیل میں اسکی صرف ایک مثال پیش کی جاتی ھے (تفصیل کے لیے ان کے مقالات دیکھیں)

منشی مہاراج بہادر برق دھلوی کے مجموعۂ کلام مطلع انوار کے دیباچہ میں رقمطراز ھیں :

" جناب برق کی تصویر کے نیچے یہ شعر درج ھے ؎

" کھل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی
میں چمن زار جہاں میں گل صحرائی تھا"

اس شعر میں بظاھر کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو مشرقی نہ ھو اور جو ھمارے یہاں کے شعرا کی دسترس سے باھر ھو ۔ پھر بھی اسکی دلآویزی و جدت نہایت حیرت انگیز ھے ۔ اب گرے کے :

'Full many a flower is born to blush unseen
And wastes it's sweetness on the desert air'

۱۔ اردو شاعری کی ذھنی تاریخ ـــ دھلی اور لکھنؤ اسکول ۔ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ص ۱۲۸ ـــ تفصیلی بحث دیکھیے صفحات ۱۲۷ - ۱۲۸

کو بھی ملاحظہ فرمائیے ۔ یہ معلوم ہوگا کہ جناب برق کا دماغ
اس سے ناآشنائے محض نہیں ہے ۔ مگر ان کا شعر اسکی پوری
پوری آواز باز گشت بھی نہیں ۔ جسطرح آفتاب کی ہلکی اور
تیز شعاعیں باغ و چمن کو طرح طرح سے رنگین کرتی رہتی ہیں
اسی طرح " وسعت مذاق " شاعر کے دماغی تخیل کو ہم شعوری
حالت میں گوناگوں کیفیتوں سے لبریز کرتی رہتی ہے ۔ مغربی تخیل
کا انعکاس اس مذکورہ شعر پر اس درجہ ہلکا اور لطیف ہے کہ
تبصرہ نگار تو ایک طرف شاید خود شاعر کو اسکا احساس دشوار
ہو گیا ہو ۔[1]"

اردو تنقید میں اصغر کے مندرجہ بالا " اولیات " کے پیش نظر ان کو اپنے دور کا سب سے پہلا بڑا " ترقی پسند " (غیر اصطلاحی معنوں میں) اور " انگریزی تنقید کا مزاج دان " نقاد کہا جا سکتا ہے ۔

اس موقع پر اصغر کے تنقیدی نظریات کا مقابلہ و موازنہ ترقی پسند تحریک کے بنیادی تنقیدی نظریات سے کرنا بظاہر بے محل سا نظر آتا ہے ۔ کیوں کہ " ترقی پسند مصنفین " کی پہلی کانفرنس ، ان مقالات کے وجود میں آنے کے بہت بعد ، ۱۹۳۶ء میں ، اصغر کے انتقال کے آٹھ برس پیچھے ہوئی تھی اور اسکے افکار کی ترویج و اشاعت اسکے بھی بعد ہوئی ، لیکن اسکے باوجود اس تقابل کو ضروری سمجھا گیا ۔ اس لیے کہ اس سے اصغر کی ناقدانہ حیثیت زیادہ واضح اور نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ ذیل میں دونوں کے بنیادی افکار کا فرق واضح کیا جاتا ہے :

اصغر کے تنقیدی نظریات اور ترقی پسند تنقید کے بنیادی افکار کا فرق :

(۱) سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اصغر اور " ترقی پسند " نقاد دونوں " روح عصر " کے قائل ہیں ۔ لیکن " روح عصر " کی تشریح و تفسیر میں دونوں میں اختلاف ہے ۔ ترقی پسند نقاد جب کسی شاعر یا ادیب کے ادب پارے پر تنقید و تبصرہ کرتے ہیں تو اسکے عہد کے تاریخی ، سیاسی ، معاشرتی اور سب سے زیادہ " معاشی " حالات پر زور دیتے ہیں ـــ یا دوسرے لفظوں میں " جدلی مادیت " کی

۱۔ دیباچہ مطلع انوار ۔ ص ۵۳-۵۲

روشنی میں شاعر کے " مزاج " کو سمجھنے اور اسکی " آواز " کو پہچاننے کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ اصغر کی تنقید کی بنیاد " اجتماعی ذہنیت اور فکری رجحانات " پر ہے ۔ ترقی پسند نقاد کے نزدیک " معاشی حالات " شاعر و فن کار کے فکر و نظر کو زاویہ عطا کرتے اور اس کی " مجہول " شخصیت کے خالق ہوتے ہیں ۔ لیکن اصغر " فکری روایت یا اجتماعی مذاق " کو شاعر کی شخصیت کی تشکیل اور تعمیر و تہذیب میں ایک اہم عنصر خیال کرتے ہیں ۔

(۲) " ترقی پسند نقاد ادب و فن کی تخلیق میں فن کار کی انفرادیت کو کم سے کم اہمیت دیتے ہیں[۱] " ــــ اسکے برعکس اصغر شاعر و فن کار کی شخصیت کو فعال تسلیم کرتے اور اسکو " اجتماعی ذہنیت " کے مقابلے میں برابر کی اہمیت دیتے ہیں۔ ترقی پسند نقادوں کے یہاں " تاریخی جبریت " کا تصور ہے جسمیں افراد کی حیثیت فیکٹریوں میں ڈھلنے والے مشینی پرزوں سے زیادہ نہیں ۔ اصغر کے نزدیک افراد زندہ شخصیتیں ہیں جو شعور ، ارادہ اور فکر و عمل کی قوت رکھتے ہیں اور جو فکر و عمل کی کسی روایت کے قبول یا رد کرنے میں بڑی حد تک مختار ہوتے ہیں ۔

ان دونوں بنیادی افکار کی صحیح معرفت و تفہیم کے لیے ان کے سرچشموں کی تفہیم و معرفت ضروری ہے ۔ اصل میں ان دونوں کے سرچشمے دو مختلف نظریہ ہائے حیات ہیں :

۱۔ پہلا نظریہ مارکسیت کا ہے جسکی بنیادی فکر یہ ہے کہ " خیالات و افکار اسی مادی دنیا کی پیداوار ہوتے ہیں انھیں بدلنے اور موڑنے میں معاشرے کا زبردست ہاتھ ہوتا ہے[۲] ۔ اس تصور سے دو اور منطقی تصور پیدا ہوتے ہیں :

۱۔ " خیال " کا دنیا سے خارج کوئی غیر مادی سرچشمہ یا منبع نہیں ہے ــــ یعنی فکر و خیال کا الٰہی نظام ــــ وحی و کتاب کا تصور سرے سے غلط ہے ۔

۲۔ ایک " تاریخی جبر " ہے جسکے ہاتھ میں افراد " گیلی مٹی " یا " سیال موم " کی طرح ہیں ، جن پر وہ ٹھپے لگا لگا کر ، یا جنھیں سانچے میں ڈھال ڈھال کر " زندہ مشینیں " یا چلتی پھرتی " مورتیاں " تیار کرتا رہتا ہے ۔

۱۔ اردو تنقید پر ایک نظر ۔ کلیم الدین احمد ۔ ص ۱۹۲

۲۔ ترقی پسند ادب کی ایک جھلک از سید محمد متین رضوی ۔ رسالہ نگار ، جنوری فروری ۱۹۵۰ء

۲- دوسرا نظریہ اسلام کا ہے جو انسانی زندگی کی ترتیب و تنظیم میں "فکر و خیال" کو بنیادی عامل تصور کرتا ہے اور جو انسان اور کائنات کے وجود سے خارج ---- فکر و خیال ---- کا اصل منبع و سرچشمہ ذات خداوندی کو تسلیم کرتا ہے - "خدا جو اپنی حکمت سے انسان پر وحی کے ذریعہ ، یا پردے کے پیچھے سے یا فرشتہ کے ذریعہ کوئی خیال پیغام کی صورت میں ، انسان کی بھلائی کے لیے نازل کرتا ہے"[۱] ---- یہی خیال انسانی معاشرہ کی تنظیم کی بنیاد ہوتے ہیں اور تمام افراد کے لیے یکساں طور پر واجب الاطاعت اور واجب العمل ہوتے ہیں - لیکن انسانی ذہن کے تراشیدہ فاسد خیالات بھی ان میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں اور بیک وقت خیالات کے دو متوازی دھارے (جسکو قرآن نے بڑے بلیغ انداز میں (وَ هَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ سے تعبیر کیا ہے) جاری ہو جاتے ہیں - افراد انہیں کے رد و قبول اور اکتساب و انکار سے اپنی انفرادیت و شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں - اس رد و قبول میں وہ مختار ہوتے ہیں لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَ عَلَيۡهَا مَا اكۡتَسَبَتۡ ---- اسلام شخصی و انفرادی آزادی کو تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ اس پر زور دیتا ہے -

ان حقائق کی روشنی میں جب ترقی پسند تنقیدی افکار اور اصغر کے تنقیدی افکار کا علمی و منطقی حیثیت سے موازنہ کیا جائے تو اصغر کا نظریہ زیادہ معقول اور مبنی بر حقیقت نظر آتا ہے - دلائل حسب ذیل ہیں :

(۱) فرد کسی روایت فکر و عمل کے قبول یا رد کرنے میں آزاد ہے - یعنی اسکی اپنی "شخصیت انفرادیت یا انفرادی ذہنیت" ہوتی ہے - اسکی حیثیت "مردہ بدست زندہ" کی نہیں ہوتی -

(۲) "فکر و خیال" وہ بنیاد ہوتا ہے جس پر انسانی زندگی کی ترتیب و تشکیل ہوتی ہے اور یہی زندگی کے تمام مظاہر میں روح بن کر جاری و ساری ہوتا ہے ---- اسی لیے اصغر نے "فکر و ذہنیت" کو بنیادی اہمیت دی ہے - اور افراد کی "فکر و نظر" کی تعمیر و تہذیب یا تخریب میں "اجتماعی ذہنیت یا مشترکہ مذاق" کو ----

---

۱- مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحۡيًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوۡ يُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَيُوۡحِىَ بِاِذۡنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِىٌّ حَكِيۡمٌ - کسی بشر کا یہ مقام نہیں کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے - اسکی بات یا تو وحی کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے یا پھر کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اسکے حکم سے جو وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے - وہ برتر اور حکیم ہے - سورہ شوریٰ : آیت ۵۱ - ترجمہ تفہیم القرآن ، جلد چہارم -- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی - مطبوعہ تعمیر انسانیت لاہور- ص ۵۱۶

کہ وہ خود فکر و نظر کی متحدہ شکل ہوتی ہے ، ایک موثر قوت تسلیم کیا ہے ترقی پسند حضرات کی طرح واحد قوت نہیں تسلیم کیا ۔

(۳) اصغر نے ایک جامع لفظ " ذہنیت " استعمال کیا ہے -- جو مادی انقلاب اور روحانی انقلاب دونوں کا اثر و نتیجہ ہو سکتی ہے ۔ اور دونوں کو محیط ہے ۔ اسی طرح اجتماعی اور انفرادی دونوں کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے ---- جبکہ "ترقی پسندی " یا " مارکسیت " صرف " معاشی حالت " کو ذہنی و فکری انقلاب کا موجب اور افراد کی شخصیت کا خالق ٹھہراتی ہے ۔ یہ خیال جزوی طور پر تو درست ہو سکتا ہے لیکن کلی طور پر صحیح نہیں ہے کیوں کہ ضروری نہیں کہ " معاشی حالت کی خرابی " سے فکر و نظر کے سانچے بھی بدل جائیں ---- پھر اگر اسکو بطور کلیہ تسلیم کر لیا جائے تو اسکا نتیجہ یہ بھی ہونا چاہیے کہ " مرفہ حالی " کی صورت میں کسی قسم کی ذہنی و فکری کشمکش و انتشار یا انقلاب نہیں ہونا چاہیے --- لیکن تاریخی حقائق اسکے خلاف ہیں ۔ اسطرح ترقی پسند حضرات کی دونوں توجیہات و تفسیرات غیر معقول ہیں ۔ ان تصریحات کی روشنی میں بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اصغر کے تنقیدی افکار زیادہ جامع ، وسیع ، ہمہ گیر اور منطقی و معقول ہیں ۔

مختصر یہ کہ اصغر کا تنقیدی شعور اور ناقدانہ بصیرت بڑی روشن اور بلند تھی ۔ انھوں نے اس زمانہ میں جبکہ اردو تنقید نگاروں کے سامنے حالی کی متعین کی ہوئی راہ کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں تھی ، اور جب کہ مغربی اقوال و بیانات کو بلا جرح و تعدیل کے اردو میں ٹھونس دینے کے سوا ان کی کوئی اور جولان کار نہ تھی ، تنقید کا ایک ایسا مربوط و منظم فلسفہ فکر دیا جسکی اساس اسلامی نظام فکر اور مغرب کے جدید ترین علمی اصولوں پر تھی ۔

جناب سید عابد علی عابد مرحوم جن کی ادبی و تنقیدی بصیرت مسلم ہے اور جنھوں نے اصغر سے ادبی استفادہ کیا تھا ، اصغر کی ادبی نظر اور ناقدانہ بصیرت کے اعتراف میں رقمطراز ہیں :

" فارسی خوب جانتے تھے اور کلاسیکی شاعری کی تمام تلمیحات ، علامات اور اصطلاحات انھیں گویا نوک بر زبان تھیں ۔ اردو ادبیات کی تاریخ سے آگاہ تھے اور اردو شاعری پر جو کچھ بیتی ہے اس پر بھی مطلع تھے .... میں نے ......

ان سے بہت استفادہ کیا .... فارسی شاعری کی
علامات کے رموز بالخصوص مجھ پر انھیں کے ذریعہ روشن ہوئے
ھیں ۔ ان میں سے کون کون سے رموز اردو میں منتقل ہوئے
یہ بھی انھیں نے مجھے بتایا ....[1]"

مولانا سراج الحق مچھلی شہری ان کی تنقیدی کاوش ....
" اردو شاعری کی ذھنی تاریخ " کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ھیں :

" اب نہ جانے وہ مسودہ کہاں ھے .... وہ
عجیب و غریب کتاب ھے ۔ اور میرے علم و یقین میں وہ کتاب
فن تنقید کی بہترین کتاب ثابت ہوگی ۔ مولانا حالی نے
تنقید کا کام جس جگہ پر چھوڑا ھے اسکے بعد اصغر نے اس
کو تمام کیا ھے[2] ۔"

اس پر اگر اتنا اضافہ کیا جائے تو شاید بیجا نہ ہو کہ اصغر نے اپنے تنقیدی مقالات کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ حالی کی تنقید اور ترقی پسند تنقید کے درمیان جو خلا تھا اسکو پر کیا بلکہ یہ کہ ترقی پسند تنقید کے مقابلے میں زیادہ جامع ، وسیع اور معقول نظریہ دیا ۔ لیکن چوں کہ انھیں اسکی تبلیغ و اشاعت کا زیادہ موقع نہ مل سکا اس لیے ان کی آواز نسیان و فراموش کاری کے لق و دق صحرا میں گم ہو گئی ۔

(د) خلاصتہ البحث :

اس پورے باب کا خلاصہ یہ ھے کہ

(۱) اصغر اردو کے بہترین نثر نگاروں میں تھے ۔ انھیں ہر طرح کی نثر لکھنے پر عبور حاصل تھا ۔ وہ بچوں کے لیے سادہ ، آسان اور عام فہم زبان لکھنے پر بھی قادر تھے ، اور رنگین و مرصع اور " ادب لطیف " کے انداز میں بھی لکھ سکتے تھے ۔ لیکن ان کا عام اسلوب عالمانہ اور سائنٹفک اور موجودہ دور کے نثر سے قریب تر تھا ۔

۱۔ اصغر گونڈوی از عابد علی عابد ۔ نقوش ۳۸-۴۷ ۱۹۵۵ء ۔ ص ۵۰۹-۵۰۸

۲۔ اصغر کے چند ادبی افادات ۔۔ از مولانا سراج الحق مچھلی شہری ۔ مشمولہ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۴۷

(۲) اصغر کی تنقیدی بصیرت بڑی اعلیٰ تھی ۔ انھوں نے مغرب کے تنقیدی افکار سے اپنے ذہن و دماغ کی اسطرح تزئین کی تھی کہ اسکی " روح " کو پا گئے تھے ۔ انھوں نے اسلام کے بنیادی افکار اور مغربی تنقیدی افکار کے ہم آہنگ و موافق اجزا و عناصر کے خوشگوار امتزاج سے ایک ایسا " نظریۂ تنقید " پیش کیا جو ترقی پسند نظریۂ تنقید سے زیادہ جامع ، ہمہ گیر اور معقول تھا ۔ اور انھوں نے جب انھیں نظریات کے تحت اپنے تنقیدی مقالات مرتب کیے تو مغرب کے جدید ترین اصول کے مطابق اسکی تکنیک بھی سائنٹفک تھی اور انداز و اسلوب بیان بھی ۔ اصغر میں ایک بہترین نقاد کی صلاحیتیں تھیں ۔ انھوں نے اگر اپنے تنقیدی مساعی کو محدود نہ رکھا ہوتا تو مبادیات تنقید اور عملی تنقید کے باب میں وہ فکر انگیز اضافوں کا باعث ہوتے اور ان کا شمار اپنے دور کے بہترین نقادوں میں ہوتا ۔

......

باب پنجم

نظریۂ فن (۲) شعر و غزل

صفحہ

۱- تاثیر و اثر انگیزی ۳۸۳

۲- ادب میں صالحیت ۳۸۶

۳- نظم و نثر کا بنیادی فرق ۳۹۰

۴- اصغر کا نظریۂ غزل ۴۰۰

۵- موضوعات شعری :

(الف) تصوّر محب و محبوب ۴۰۵

(ب) عشق مجازی کی آخری حد ۴۰۷

(ج) عشق رسول ۴۰۹

(د) عشق مرشد ۴۱۲

(ہ) مقام محبوب اور طریق عاشقی ۴۱۳

(و) رنگ مجاز ۴۱۴

اصغر ان معدودے چند ادیبوں میں تھے جنھوں نے شعر و ادب کے متعلق اپنے نظریات سال ھا سال کے غور و فکر کے بعد قائم کئے اور انھیں ایک ایسے مخصوص فلسفۂ فکر کا بنایا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے واضح بھی تھا اور مربوط و منظم بھی ۔ ان کے نزدیک فنون لطیفہ نہ آپ اپنی غایت ھیں اور نہ ان کا مقصد وہ لذت اندوزی اور لذت بخشی ھے جسے ایک خاص قسم کی ذھنی عیاشی کہا جاتا ھے بلکہ حقیقت میں وہ ایک عظیم مقصد کے تابع اور اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ھیں ۔ انسان کائنات کا جمیل ترین موضوع ھے ۔ فنون لطیفہ کا مقصد وحید اسی " موضوع جمیل "[1] کی " تشکیل و تخلیق "[2] اور تہذیب و تکمیل ھے ۔ انسان کی تہذیب و تکمیل کا واحد لائحۂ عمل وہ ھے جو اسلام نے پیش کیا ھے اس لیے فنون لطیفہ کی وہ تمام " مشتہیات " ــــــــ وہ اجزا و عناصر جو انسان کے جذبات عمل میں جمود و خمود اور برودت و اضمحلال کا موجب بن کر انھیں خوابیدہ کر دیتے ھیں ـــ اسلامی معاشرے میں نامحمود و نامستحسن ھیں ۔ البتہ ان کے ایسے اجزا و عناصر جن سے جذبات میں علو و ترفع، پاکیزگی و لطافت اور اضطراب و بے تابی کی تولید ھوتی ھے ، وہ محمود و مستحسن ھیں ۔

اصغر کے نظریۂ شعر و ادب کی عمارت اسی عقیدے کی بنیادوں پر استوار ھوتی ھے اور یہی مخصوص فلسفہ ان کے تمام شعبہ ھائے ادب میں جاری و ساری اور کارفرما ھے ۔ اس باب میں اسی فلسفے کی وضاحت ان کے کلام کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی گئی ھے پھر اس فلسفے کا تجزیہ کر کے اس کے اجزائے ترکیبی کی نشاندھی کی گئی ۔ بعد میں شعر و ادب سے متعلق ان کے عام نظریات کو مختلف عنوانات کے تحت انھیں کے الفاظ میں بلا کسی تنقید و تبصرے کے منظم و مرتب انداز میں پیش کیا گیا ھے ۔ اس لیے کہ اصغر کے نظریۂ فن کی وضاحت کی یہی صورت سب سے زیادہ موزوں اور منطقی معلوم ھوئی ۔ میری ناچیز رائے یہ ھے کہ اس نظریۂ فن کو سمجھے بغیر اصغر کی ادبی تخلیقات پر محاکمہ ممکن نہیں ۔ اصغر نے " پیام زندگی " کے مقدمے میں

۱۔ مقدمہ " پیام زندگی " جلد اول ۔ اردو مرکز لاھور ۲۷-۱۹۲۶ء ۔ ص ۳۴

۲۔ ایضاً

اسلام اور فنون لطیفہ کے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

" ایام جاہلیت میں اگرچہ عربوں کی رگ رگ میں شاعری رچی ہوئی تھی اور وہ بات بات پر فی البدیہہ قصائد و مراثی پڑھ دیا کرتے تھے مگر ظہور اسلام کے بعد ان کا یہ مذاق روز بروز مضمحل و افسردہ ہوتا گیا اس لیے کہ اسلام " ایک سرتا پا عمل " ہے ۔ اس نے ایسے تمام افکار و مشاغل کو جو اکثر " قوائے عمل " کے برباد کن ثابت ہوئے ہیں ۔ اپنے جدو جہد کے عملی ہنگاموں میں گم کر دیا۔ فنون لطیفہ کی اعلیٰ ترین غرض ایک " موضوع جمیل " کی تخلیق و تشکیل ہے ، مگر ایک مسلم کی زندگی ع

دل گرمے ، نگاہ پاک بینے ، جان بے تابے

کی سراپا مصداق تھی اور یہی (مسلم) وہ " موضوع جمیل " ہے جس کی تخلیق و تصویر کے لیے " فن لطیف کا ہر ہر شعبہ تشنہ و بیقرار رہتا ہے ظاہر ہے کہ اصل (مسلم) کے ہوتے رنگ ، شیڈ اور اس کی کاغذی نوک پلک (خالی خولی فن) کی بحث فضول و بیکیف ہو کر فنا ہو جاتی ہے ۔" [1]

اصغر کے محولہ بالا اقتباس کا تجزیہ کیا جائے تو فن کے دو بنیادی مقاصد و لوازم ٹھہرتے ہیں :

(۱) تاثیر و اثر انگیزی :

یعنی " دل گرم و جان بے تاب " پیدا کر کے انسان کی تہذیب و تکمیل کرنا دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ فن کے لیئے ضروری ہے کہ وہ انسان کے حسیات میں لطافت اور جذبات میں خلوص و صداقت ، کیف و اثر ، رقت و گداز اور علو و ترفع پیدا کرے۔

(۲) صالحیت :

یعنی فن انسان میں " پاک بینی " کی صلاحیت کو بیدار اور اس کی تہذیب و تربیت کر کے ــــــــ اسے معصوم و طاہر بنا دے ۔

اس قسم کا اعلیٰ فن اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک فن کار خود صفات اعلیٰ کا حامل نہ ہو ان کا عقیدہ ہے کہ

۱۔ مقدمہ پیام زندگی جلد اول ۔ اردو مرکز لاہور ۲۷-۱۹۲۶ء ۔ ص ۳۲-۳۳

اعلیٰ قسم کی تخلیق کے لیے اعلیٰ احساس ہونا ضروری ہے

" اعلیٰ قسم کی شاعری (فن) کے لیے ایک مخصوص زندگی ایک مخصوص طرزِ تخیل اور ایک مخصوص افتادِ طبع کی ضرورت ہے ، جس سے شاعر (فن کار) کی انفرادیت و شخصیت نمایاں ہوتی ہے [۱]۔"

اور یہی "شخصیت" اس کی تخلیق میں ڈھل کر نکلتی ہے - جیسا کہ وہ لکھتے ہیں :

" جب کوئی شخص کچھ لکھنا یا بیان کرنا چاہتا ہے تو اپنی ذہنی اور نفسی کیفیتوں کے ساتھ اسے پیش کرتا ہے ------ اس کی یہی ذہنی و نفسی کیفیت اس کی انفرادیت و شخصیت ہے [۲]۔"

صوفیاء کا کلام پردرد و پرتاثیر تھا :

منفرد و اعلیٰ احساس ، جو مخصوص طرز و فکر کے حامل اور اعلیٰ فن کے خالق ہوتے ہیں - ہر زمانے میں راہ تصوف و معرفت کے سالک رہے ہیں اور اسی راستے پر چل کر انھوں نے ہر دور میں اپنے وجدانی نغموں سے فضا کو معمور رکھنے کی خدمت انجام دی ہے - اس خیال کا اظہار اصغر نے جا بجا کیا ہے - وہ کہتے ہیں :

" شاعری کا تصوف سے نہایت قریبی تعلق ہے [۳]۔"

اس لیے کہ

" شاعری کی تمام تر بنیاد جذبات پر ہے - تصوف (" معمولی معتقدات پر خود اپنے نفس میں تصدیق و یقین پیدا کرنے " [۴]) سے جذبات کی لطافت و شدت بڑھ جاتی ہے [۵]۔"

دبستانِ دہلی کی شاعری کا تہذیبی و ثقافتی پس منظر بیان کرتے ہوئے انھوں نے اس بات پر بڑا زور دیا ہے - ان کا کہنا ہے کہ

" دلی چوں کہ اکثر صوفیائے عظام کا آستانہ تھی اس لیے یہاں ایسے فارسی شعرا کی کثیر تعداد موجود تھی جو خود صاحبِ ذوق تھے

۱- نظم و نثر پر ایک نظر از اصغر - رسالہ ہندستانی - الہ آباد جولائی ۱۹۳۱ء ص ۲۲۱

۲- ایضاً - ص ۲۲۶

۳- اردو شاعری کی ذہنی تاریخ --- دہلی اور لکھنؤ اسکول - - زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ص ۱۳۵

۴- ایضاً - ص ۱۳۵

۵- ایضاً - ص ۱۳۶

.... ان بزرگوں کے روحانی فیض سے دلی کا ذرہ ذرہ گرم تواجد اور کیف و شعریت سے لبریز تھا ...... انھیں میں امیر خسرو بھی تھے ۔ (جن) کی تمام زندگی جوش و خروش اور درد و گداز کا زندہ نمونہ تھی ۔ وہ اپنے مرشد .... کے وصال کی خبر پا کر ، تمام اثاثہ لٹا کر ان کے مزار پر معتکف ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ شاہد حقیقی کو نقد جان سپرد کر کے دم لیتے ہیں ۔ ان کے کلام میں درد و تاثیر کا یہ عالم ہے کہ ان کی زندگی شاعری اور ان کی شاعری میں زندگی معلوم ہوتی ہے[1] ۔"

ان کا (اصغر) [2] اس پر اصرار ہے کہ " اعلیٰ اخلاقی محاسن سے مزین انسان" کی شاعری بھی " بلند اخلاقی اسپرٹ " [3] کی حامل ہوگی ۔ اور چوں کہ فقرا اور مشائخ کی زندگیاں خود پاکیزہ تھیں ۔ اس لیے " انھوں نے اپنی برکات و وجدانی ترنم ریزیوں سے اس میں (شاعری میں) پاکیزگی و روحانیت کی استعداد پیدا کر دی تھی[3] ۔"

اصغر نے فارسی شاعری کی تاثیر و کیفیت اور اردو کی بے کیفی کا موازنہ کرتے ہوئے مولانا سراج الحق کے سامنے ، اپنے اسی عقیدہ کا اظہار کیا ۔ مولانا رقمطراز ہیں :

" ایک دن کہنے لگے ، فارسی کو بڑے بڑے لوگ نصیب ہوئے ۔ حضرت نظامی ، حضرت سعدی ، حضرت حافظ .... سلطان ابو سعید ابوالخیر... .... حضرت عراقی ۔ ان میں سے ایک ایک درد وسوز کی تصویر و مجسمہ تھا ۔ عرفان و وجدان کا پیکر تھا ۔ حقایق و معارف کا گنجینہ تھا ۔ علم و عمل ، زہد و تقویٰ کا جامع تھا ۔ یہ وجہ تھی کہ فارسی شاعری میں بلکہ فارسی زبان میں آج تک لذت ، چاشنی درد وغیرہ موجود ہے بخلاف اردو کے ۔ اس کو شروع میں تو کچھ اہل دل بزرگوں کی آغوش نصیب ہوئی اور انھوں نے بھی اپنے اندر درد و سوز ، صدق وصفا وغیرہ کا ایسا زبردست پاور ہاؤس گرم کر رکھا تھا کہ اسکے اثرات آج بھی اردو میں باقی رہ گئے ہیں اور اردو ادب اب بھی اس لایق باقی ہے کہ اسے منہ لگایا جائے ۔ ورنہ اس پر تو ایسے گندے گندے دور گزرے ہیں

۱۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ــ دہلی اور لکھنئو اسکول ۔ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ص ۱۳۱

۲،۳۔ ایضاً ۔ ص ۱۳۹

۴۔ ایضاً ۔ ص ۱۳۹

کہ اگر ان ابتدائی بزرگوں کی سرپرستی کی برکتیں نہ ہوتیں تو یہ
آج اس قابل نہ رہتی کہ لوگ اس میں بات چیت بھی کر سکیں [1]۔"

اقتباسات بالا سے اصغر کے اس نظریے کی وضاحت ہوتی ہے جس کی طرف میں نے اس بحث کے آغاز میں اشارہ کیا تھا ، یعنی :

" اعلیٰ شاعری ، اعلیٰ انسان ہی تخلیق کر سکتا ہے ۔ اعلیٰ انسان
صوفیا اور عرفا ہوتے ہیں جو اپنے جذبہ کے خلوص اور شدت سے ،
شاعری کو کیف و سوز ، درد و اثر اور رقت و گداز کا مرقع بنا
دیتے ہیں [2]۔"

۲۔ ادب میں صالحیت :

اصغر نے فن کی دوسری لازمی شرط " صالحیت " اور پاکیزگی " قرار دی ہے ۔ اقتباس بالا میں " گندے گندے دور " پر ان کا اظہار بیزاری " صالحیت " اور " پاکیزگی " کے اس احساس کا عکس ہے ۔۔۔۔ اس" گندے گندے دور " سے ان کی مراد " دبستان لکھنو " کی شاعری ہے ۔ جس میں شاعری کا موضوع " عورت اور اس کے متعلقات " رہے ہیں ۔ جن کے بیان میں شعرا نے بڑی دیدہ دلیری بے شرمی اور بے حیائی سے کام لیا ہے ۔ اس لیے اصغر کی تحریروں میں جا بجا لکھنو کی شاعری اور اس کے " ذہنی مزاج " پر سخت تنقید ملتی ہے ایک جگہ غزل پر مرثیے کا اثر دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں :

" غزل کے معنی " از معشوق سخن گفتن " کے کہے جاتے ہیں ۔
آزاد و بے قید طبائع کے نزدیک اس کا مفہوم ، ہوس پرستانہ مشاغل
کا اعتراف و اعلان ہے ۔ اس قسم کے کسی عام لکھنوی شاعر کی وہ
غزل اٹھا کر دیکھو جس میں وہ اشتیاق و محبت کے اظہار پر اتر
آیا ہو ۔ لیکن اس کا یہ اشتیاق مرثیت کے تلازموں سے اس قدر مسجل
ہوگا کہ تم اس کی حقیقی کیفیت دلی کا کسی طرح اندازہ نہ کر سکو گے۔
وہ اپنے اشتہات شباب کو " مرنے" سے تعبیر کرے گا پھر اس کے اندر
تمام لوازم نعش کا چھوٹنا ، مکا ڈھلنا ، نزع کی ہچکیاں ، میت ،
جنازہ ، اٹھنا ، یہ کہ شمع لحد ، اور سوم کے پھول ، وغیرہ جمع کر
دے گا ۔ حالاں کہ شاعر کے پاس جا کر ان ہنگاموں کی کیفیت معلوم

۱۔ اصغر کے چند ادبی افادات از مولانا سراج الحق ۔ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور ۔ اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۲۵ء ۔ ص ۵۳

۲ ۔ یہ اقتباس نہیں ہے ۔ مقالہ نگار کے الفاظ میں بحث کا خلاصہ ہے ۔ زور دینے کے لئے واوین میں لکھ دیا گیا ہے

کرو تو نہ کسی بالاخانے پر خفیف سی د ل لگی ، نکلے گی [1]۔"

عورت اور اس کے متعلقات کا ذکر فسق و بے حیائی ہے ۔ چنانچہ اس قسم کی شاعری سے متنبہ کرتے ہوئے مولانا سراج الحق صاحب کو نصیحت کی اور کہا :

" دیکھئے کنگھی چوٹی ، وصل ، بوسہ وغیرہ کے کہنے والوں نے ادب جیسے علم کو گندہ اور بدنام کر دیا ہے آپ اس قسم کے شعر نہ کہا کیجئے ۔ ورنہ ذہن ہمیشہ کے لیے اسی پست سطح پر آ جائے گا ۔ اشخاص و اجسام کا تصور مادیات کا عشق اور ان کا ذکر چھوڑیئے ۔۔ ۔۔۔۔ فسقیہ جذبات و فسقیہ زبان ترک کیجئے [2]۔"

اصغر اس معاملے میں اس قدر حساس تھے کہ جب بیسویں صدی کے ربع اول میں " ادب لطیف " کے نام سے ایک تحریک شروع ہوئی جس میں رنگینی و چاشنی پیدا کرنے کے لیے " عورت " کو موضوع بنایاگیا تھا اور اس کے " تعلقات و متعلقات " کو لذت لے لے کر بیان کیا جاتا تھا تو اصغر نے اس کو " معصیت ادبیہ " کہا اور اس کے خلاف سخت احتجاج کیا ۔ ان کا خیال تھا کہ اس " فتنہ " کوروکنے کے لیے " درۂ احتساب " سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اسی لیے وہ ایک ایسی مرکزی انجمن کے قیام پر زور دیتے ہیں جو اس " فسق و بزدلی " پر قدغن لگا سکے چنانچہ اس خیال کا اظہار ایک جگہ ان الفاظ میں ہوا ہے :

" ادب لطیف ، کے نام سے چونکہ ہر قسم کی بے راہ روی و مطلق العنانی کا بھرم قائم رکھا جا سکتا ہے ۔ اس لیے اکثر نوجوانوں کا میلان طبع اسی طرف ہوتا ہے ۔۔۔۔ ادب لطیف کا اہم ترین موضوع فکر عورت ، ہے ۔۔۔۔۔۔ بعض ادبی حلقے جن کی پراشوب زندگی ، ہوس پرستیوں اور حیا سوز مشاغل کی نذر ہے ان کی تو کل کائنات ۔۔۔۔۔۔ ہی عورت اور اسکے متعلقات ہیں ۔۔۔۔۔۔ خوب صورت الفاظ و مکروہ اصال کے اس دور آمیزش میں کسی فرسودہ خیال انسان کو کیا حق کہ اس حکیمانہ اوباشی کو ہدف ملامت بنا سکے ۔۔۔۔ اس (ادب لطیف)

۱- ~~اصغر کے چند ادبی خطوط از مولانا سراج الحق~~ مقدمہ پیام زندگی ۔ ص ۶۲

۲- اصغر مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۱۷

کی جامع و مانع تعریف " فسق و بزدلی " ہے (اس لیے کہ)
تہذیب انسانیت کے نزدیک تو عورت بلکہ اس کے کل تعلقات و متعلقات
خلوت کدوں کا فطری راز ہیں ، لیکن جب اسے قلم کی نوک سے
کرید کرید کر "گزرگاہ عوام " پر رکھا جائے اور " فرط ذوق " سے
سیری نہ ہو ، علمی حلقوں میں اپنی اس " معصیت ادبیہ " کو
" رعنائی خیال " اور " رنگینی فکر " کہہ کر اظہار تفاخر بھی کیا
جائے تو فرمائیے اسے " فسق و بزدلی " (بلکہ اگر اجازت دیجئے
تو اسے " بے حسی و بے غیرتی ") کے سوا اور کیا کہیں [1]۔"

ان کا دل اس " طوفان بدتمیزی " کو روکنے کے لیے کس طرح بے قرار ہے اس کا اظہار ان کی کہی ہوئی اس بات سے ہوتا ہے :

" مذکورہ طوفان بدتمیزی کے انسداد کے لیے نہ آج ہمارے پاس کوئی
" قوت " ہے اور نہ ہمارے ہاتھوں میں " درۂ احتساب " ۔ یہ جو
کچھ ہو رہا ہے وہ بدقسمتی سے " خدمت علمی سے متہم" ہے ...
.... اشرار و مفسدین کا .... (یہ) قلعہ
آسانی سے فتح نہیں کیا جا سکتا اس کے لیے ایک زبردست قوت ....
..... ایک " مرکزی انجمن " کے اجرا و قیام ...... کی ضرورت
ہے .... جس کے فرائض میں .... ہو کہ وہ ایسے
تمام لٹریچر کے خلاف ووٹ پاس کرے جس سے اردو کی سنجیدگی اور اسکے
علمی وقار کو نقصان پہونچنے کا احتمال ہو [2]۔"

ان کا خیال ہے کہ عورت اس بنا پر " موضوع عشق " نہیں ہو سکتی کہ اس کے " متعلقات کے ذکر " سے ادب کی" فضائے صافی مسموم و زہر آگیں " ہو جاتی ہے اور اسی لئے وہ بعض استفسارات کے جواب میں کہتے ہیں کہ

" آپ ایک " عورت " سے اپنی " حیات معاشقہ " کا پینگ بڑھا رہے
ہیں .... اپنے اس " ملتہب قلب و جگر " پر رحم فرما
کر ، اس " پیکر آتشیں " .... اس " شعلۂ مضطر " ......
کو "شرف زوجیت " عطا فرما دیجئے ۔ پھر میں آپ سے پوچھوں کہ یہ
نظم و نثر کی " موج آتشیں " بلکہ یہ کل " شعلۂ آواز " فرو ہو جاتا

۱۔ انجمن اردوئے معلیٰ بسلسلہ استفسارات ۔ سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۲۶ء ۔ ص ۱۰۶

۲۔ ایضاً ۔

ہے یا نہیں .... اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو اپنی
اس کمزوری کی تشہیر نہ فرمائیے جو مضامین کی صورت میں انشا و
ادب کے فضائے صافی کو مسموم کر رہی ہے .... یہ آپ کی
" ہوس پرستی و بزدلی " کا اعلان ہی نہیں ہے بلکہ اس سے ایک
ایسے زہر آگین لٹریچر کی اشاعت بھی ہو رہی ہے جس سے اندیشہ
ہے کہ اس کا مرض خدا نخواستہ متعدی ہو جائے [1] "

مجردات کی شاعری اصل شاعری ہے

اقتباسات بالا سے ، نہ صرف یہ کہ اصغر کے نظریۂ شعر و ادب کا بنیادی فلسفہ سامنے آجاتا ہے بلکہ ان کے عملی پروگرام ---- " فسق و بزدلی " ، " بے حسی و بے غیرتی " ---- یعنی معصیت ادبیہ کے مسمّیٰ [1] " ادب لطیف " کی تحریک کو کچل دینے کے مسلمانہ پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے - اصغر کے سامنے ، اس کا ایک مثبت و تعمیری پہلو بھی تھا ---- پاکیزہ ادب کی تخلیق کے ذریعہ ، شعر و ادب کی فضا کو پاکیزہ بنانے کا - اس پر انھوں نے خود تمام زندگی عمل کیا اور اپنے معتقدین و مسترشدین کو ہمیشہ اس کی تلقین کرتے رہے - چنانچہ مولانا سراج الحق صاحب کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" مجردات* کی طرف ذہن کو لے جائیے .... اس کے بعد تخیل
میں واقعیت ، جذبات میں صداقت ، اسلوب بیان میں ندرت جتنی
زیادہ ہوگی اتنا ہی شعر بلند ہوگا [2] "

اصغر نے شعر و ادب کے مختلف اجزا و عناصر کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ براہ راست ان کے اپنے ادبی پس منظر ، شخصیت ، شاعری کے تجزیے اور ذاتی تجربات سے ماخوذ ہیں اس لیے ان کی حیثیت بھی بنیادی ہے - ان کے شعر و ادب کا مدرلانہ مطالعہ کرتے وقت ، ان معیارات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے - مثلاً نظم و شرکے بنیادی فرق کے سلسلے میں ان کے خیالات بڑے واضح ہیں -

---

۱- انجمن اردوئے معلیٰ بسلسلہ استفسارات - سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۲۶ء
۲- اصغر مرتبہ عبدالشکور - ص ۱۷
*- بعض مخلوق مادہ و مقدار سے مجود (خالی) پیدا کی گئی ہیں ان کو مجردات کہتے ہیں- ارواح انسانی اور دیگر لطائف قلبی و سر و خفی و اخفی ایسے ہی ہیں - مجردات کو " عالم امر " بھی کہتے ہیں (از شریعت و طریقت - مولانا اشرف علی تھانوی رح - ص ۲۲۲-۲۲۳

نظم و نثر کا بنیادی فرق :

اس سلسلے میں اصغر کہتے ہیں کہ " ذہن انسانی" کی دو حالتیں ہیں ، " عقلی اور جذباتی " ۔ ہر واقعہ کو انسان ، انہیں میں سے کسی ایک کے ذریعہ محسوس کرتا ہے ۔ چوں کہ یہ دونوں حالتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ اس لیے ان کے احساس و اظہار میں بھی فرق ہے ۔ عقل میں برودت ، احتیاط اور منطق ہوتی ہے ، جذبے میں گرمی ، شدت اور لطافت ۔ جذبے کے ذریعہ محسوس و ظاہر کی جانے والی بات پر " ذوقیات " اور عقل کے زیر اثر کی جانے والی گفتگو پر " عقلیات یا علمیات " کا اطلاق ہوگا ۔ " ذوقیات " کی بنیاد " محبت " ---- یعنی جذبہ کی شدت پر ہوتی ہے جو والہانہ اظہار چاہتی ہے ---- شاعری " ذوقیات " کے تحت آتی ہےجو جذبہ کی شدت ، حدت اور لطافت کے زیر اثر تخلیق پاتی ہے ۔ اس کے لیے بحور و اوزان ، ردیف و قوافی اور دوسرے محاسن کی ضرورت نہیں ۔ اگر ان پابندیوں کا التزام و لحاظ کیا جائے تو اس تخلیق کو " شعر منظوم " کہیں گے ۔ اگر ان پابندیوں سے آزاد ہو تو " شعر منثور " ۔ شعر کا خالق کسی دوسری (جوش و وجدان کی) دنیا سے بولتا ہے جس کے اقوال سے سننے والا متاثر تو ہوتا ہے ، لیکن چوں کہ اسے ، اس کے جذبات کا صحیح ادراک نہیں ہوتا اس لیے اس پر تنقید کا حق نہیں رکھتا ۔

" علمیات " ---- خالصتاً نفس الامری حقیقت کا روزمرہ کی گفتگو میں اظہار ہے اس کا بنیادی وصف " اصابت " ہے ---- یعنی حزم و احتیاط ، منطقی استدلال اور علمی تجربات کے ذریعہ ، غیر عاجلانہ انداز میں ، حقیقتوں کا تعین[1] ---- " نثر نگار ہماری ہی معمولی سطح پر ، ہماری ہی نوع کا ایک آدمی ہوتا ہے اس کی تخلیق (نثر) از سر تا پا سوسائٹی کی باہمی گفتگو اور ایک معمولی تبادلۂ خیال (ہوتی) ہے[2] ۔"

نظم و نثر کا یہ واضح فرق بیان کرنے کے بعد اصغر نے جا بجا ان دونوں کی ماہیت، موضوع ، مقصد اور طریق اظہار اور اظہار کے فنی وسائل کی طرف ایسے اشارے کئے ہیں کہ دونوں کے حدود بڑے واضح انداز میں متعین ہو کر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں ۔ یہاں ہم ان خیالات کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اصغر نے نظم و شعر کے متعلق ظاہر کئے ہیں :

شاعری کی ماہیت :

(۱) " جذبات جن مجرد حقائق تک لے جاتے ہیں ، ان کو لفظ و بیان میں متمثل و متشکل کرنا شاعری ہے[3] ۔"

۱- نظم و نثر پر ایک نظر - ص ۲۳۵

۲-۳- ایضاً - ص ۲۲۹ ---- ص ۲۳۲

(۲) " تاثیر کے ساتھ جذبات کو متشکل و متشکل کرنا شاعری ہے ۔ جس نظم میں جذبات کہ وہی جذبات کی پراگندگی کا ذریعہ و سامان بھی ہوتے ہیں ، شامل نہ ہوں اسے شعر کہنا درست نہ ہوگا ۔[۱] "

(۳) " شعر و شاعری کی کل کائنات جذبات اور احساس کے دم سے وابستہ ہے ۔[۲] "

(۴) " شعر وہ ہے جس سے ہمارے جذبات و حسیات میں تموج و تلاطم (پیدا) ہو ۔[۳] "

(۵) " شعر کا تخاطب جذبات سے ہوتا ہے ۔[۴] "

(۶) " تاثیر یا کیفیت نفسی میں ڈوبا ہوا بیان اگر اوزان و قوافی کے حدود میں ہو تو اسے " شعر منظوم " کہیں گے ، اگر ان پابندیوں کا لحاظ نہ کیا جائے تو اس بیان پر " شعر منثور " کا اطلاق ہوگا ۔[۵] "

(۷) " شعرکی مخصوص بنیادی خوبی " محبت (جذبہ کی شدت) ہے — محبت والہانہ اور بے اختیار اظہار چاہتی ہے ۔[۶] "

(۸) " شاعری کی تمام تر بنیاد اخلاص و محبت پر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پرکیف اخلاص صحت ذوق کی دلیل اور خود شاعری کی اصل روح حیات ہے ۔[۷] "

(۹) " نظم میں قدرتی طور پر ترنم و موسیقیت ہوتی ہے ۔[۸] "

(۱۰) " شاعری سے ظرافت کا ڈانڈا ملا ہوا ہے —— بہت کم سنا گیا ہے کہ عمدہ شاعر ظریف نہ ہوا ہو ۔[۹] "

(۱۱) " نظم جس قدر نفس الامری تخیل اور بیان محض بنتی جائے گی اسی قدر شعریت سے محروم ہوتی جائے گی ۔[۱۰] "

(۱۲) " شاعری ردیف و قافیہ کی بازی گری یا مشق و مزاولت کا کرتب نہیں ہے ۔[۱۱] "

۱۔ نظم و نثر پر ایک نظر ۔ ص ۲۳۵
۲۔ ایضاً ۔ ص ۲۳۲
۳۔ ایضاً ۔ ص ۲۳۵
۴۔ ایضاً ۔ ص ۲۳۸
۵۔ ایضاً ۔ ص ۲۴۷
۶۔ ایضاً ۔ ص ۲۴۹
۷۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ —— دہلی اور لکھنو اسکول ۔ زمانہ کانپور ستمبر۱۹۲۹ء ص ۱۳۱
۸۔ نظم و نثر پر ایک نظر ۔ ص ۲۳۶
۹۔ اسغر مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۲۳
۱۰۔ نظم و نثر پر ایک نظر ۔ ص ۲۴۷
۱۱۔ ایضاً ۔ ص ۲۳۹

(۱۳) "جس دن شاعری زبان کے لیے ، قوت نظم کے لیے ، محاورے کے لیے ، استادی اور ضلع جگت کے لیے کی جانے لگی ، وہی دن اس کے انحطاط اور ترقی معکوس کا ہے [۱]۔"

(۱۴) "نظم و شعر کے بارے میں ہمارا آئیڈیل یہ ہے کہ نہ وہ کھتونی کی طرح بے کیف و بے روح ہو ، نہ اس درجہ پر الم و رقیق کہ قدم قدم پر حرکت قلب بند ہونے کا احتمال ہونے لگے [۲]۔"

شاعر ، اس کا مقام و منصب :

(۱) "شاعر کیفیت محض اور جذبہ بے اختیار ہوتا ہے [۳]۔"

(۲) "شاعر کا تخاطب خود اپنے نفس سے ہوتا ہے [۴]۔"

(۳) "شاعر کا تخاطب جب تک خود اپنے نفس سے تھا ، جس وقت تک ذاتی احساسات و جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی اس وقت تک شاعری شاعری تھی [۵]۔"

(۴) "شاعر شرافت و شہامت کا اعلان کرتا ہے ، مسجد ، میخانہ یا میدان مصاف کا انتخاب تو ہر شخص اپنے اپنے ظرف سے کرتا ہے [۶]۔"

(۵) "شاعر اس مقام پر ہوتا ہے جہاں فکر و ہوش اور علم و عقل کی رسائی نہیں اس بلندی سے اس کی آواز میں یقین ، جوش اور وجدان کی وہ کیفیتیں (پیدا ہو جاتی ہیں) جن سے ہم متاثر تو ہوتے ہیں مگر مجال دم زدن نہیں رکھتے ۔ اس کی بات سن کر ہمارے جذبات میں ہیجان و تلاطم پیدا ہو جاتا ہے .... مگر ایک برابر والے انسان کی طرح اس سے ردو قدح نہیں کر سکتے [۷]۔"

(۶) "شاعر مستعار کائنات کا قائل نہیں وہ رسمیات کے پردے کو چاک کر کے زمین و آسمان کا نظارہ کرنا چاہتا ہے [۸]۔"

(۷) "شاعر اگر اپنے مذاق میں شائستگی و پاکیزگی رکھتا ہے تو وہ اپنا طریق کار

۱۔ مقدمہ رباعیات رواں ۔ ص ۷
۲۔ اداریہ رسالہ ہندستانی الہ آباد جنوری ۱۹۳۱ء ۔ ص ۱۵۸
۳۔ نظم و نثر پر ایک نظر ۔ ص ۲۲۸
۴۔ ایضاً ۔ ص ۲۳۹
۵۔ مقدمہ رباعیات رواں ۔ ص ۷
۶۔ گنج ہائے گرانمایہ ۔ آئینہ ادب ۔ ص ۱۲۵
۷۔۸ ، نظم و نثر پر ایک نظر ۔ ص ۲۲۸
۹۔

(انداز بیان) بھی خود ہی بہتر جانتا ہے[1]۔"

(۸) " اگرشاعر کی غرض یہ ہو کہ جو چیز وہ محسوس کرتا ہے وہ دوسروں سے بھی محسوس کرائے اور جن جذبات سے وہ خود متاثر ہے ان سے دوسروں کو بھی متاثر بنائے تو اس میں قوت بیان سے زیادہ اس کے یقین و مشاہدہ اور احساس و جذبات کی شدت مطلوب ہے --- لفظ و بیان سے کہیں زیادہ شاعر کا یقین و مشاہدہ اور اس کی کیفیت نفس کی شدت لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہے[2]۔"

(۹) " شاعر کا دماغ اشعار کی صورت گری کرتا ہے --- مگر اس پیکر میں روح پھونکنا اس کے بے لوث اور پرخلوص جذبات کا کام ہے[3]۔"

(۱۰) " شاعر صرف مصور اور تصویرکش نہیں بلکہ وہ صورت گر اور خالق بھی ہے - اس کے یہاں بظاہر تصویریں نظر آتی ہیں مگر وہ تصویریں نہیں ہیں جاندار مخلوق ہیں - وہ جسد و پیکر کا بیجان مجسمہ نہیں بلکہ وہ زندہ ہستیاں ہیں جو لفظ و بیان کے لباس میں صدہا اعیان و مظاہر اور ہزارہا صورت و معنی کے نقشے ذہن کے سامنے پیش کرتی رہتی ہیں-[4]

<u>شاعری شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے</u> :

(۱) " اعلیٰ قسم کی شاعری کے لیے ایک مخصوص زندگی ، ایک مخصوص طرز تخیل اور ایک مخصوص افتاد نظر کی ضرورت ہے جس سے شاعر کی انفرادیت و شخصیت تیار ہوتی ہے[5]"

(۲) " انفرادیت و شخصیت یا کیفیت نفسی کا شدید ہونا ہر انسان کا حصہ نہیں- عام آدمی زیادہ تر دوسری شخصیتوں کی آواز باز گشت ہوتے ہیں اس لیے نظم و نثر کا مخصوص طرز ایک زبردست شخصیت و انفرادیت کی علامت ہے - صاحبان طرز کے بیان سے معلوم ہوگا کہ جو بات مع تاثیر یا اپنی کیفیت نفسی کے انھوں نے پیش کی ہے وہ طریقۂ بیان قطعی ناگزیر تھا[6]۔"

(۳) " ایک بات کہنے کے بے شمار طریقے ہیں ، یہی مختلف طریقے جن سے بیان کی حیثیت و نوعیت تبدیل ہوتی ہے ، لکھنے والی کی شاعری ...... کا درجہ متعین کرتے ہیں -

---

۱- نظم و نثر پر ایک نظر - ص ۲۲۸

۲- اردو شاعری کی ذہنی تاریخ --- دہلی اور لکھنؤ اسکول - زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ص ۱۳۶

۳- مقدمہ پیام زندگی - ص ۵۹

۴- دیباچہ مطلع انوار - محبوب المطابع برقی پریس - دہلی ۱۹۲۹ء - ص ۵۳

۵- نظم و نثر پر ایک نظر - ص ۲۲۲

۶- ایضاً - ص ۲۲۷

جب کوئی شخص کچھ لکھنا یا بات کرنا چاہتا ھے تو اپنی ذھنی و نفسی کیفیتوں کے ساتھ اسے پیش کرتا ھے اس طرح اس بات یا واقعہ کی حالت میں اپنے بیان سے کچھ اضافہ کر دیتا ھے ۔ اس کی یہ ذھنی و نفسی کیفیت اس کی انفرادیت و شخصیت ھے اور اس اضافہ کا عام طریق عمل اس کا طرز کہلاتا ھے[1] ۔"

(۴) " ان (خسرو) کی تمام زندگی جوش و خروش اور درد و نیاز کا زندہ نمونہ تھی ..... ان کے کلام میں بھی درد و تاثیر کا یہ عالم ھے کہ ان کی زندگی شاعری اور ان کی شاعری میں زندگی معلوم ھوتی ھے[2] ۔"

(۵) " فقرا و مشائخ کے نفوس .... اعلیٰ اخلاقی محاسن سے مزین تھے .... اس لیے قدرتی طور پر اس میں (ان کی شاعری میں) بلند اخلاقی کی اسپرٹ موجود تھی[3] ۔"

تصوف اور مذھبیت شاعری کی جان ھے :
---

(۱) " شاعری کا تصوف سے نہایت قریبی تعلق ھے ...... شاعری کی تمام تر بنیاد جذبات پر ھے ۔ تصوف (معمولی معتقدات پر خود اپنے نفس میں تصدیق و یقین .... پیدا کرنا) سے جذبات کی لطافت و شدت بڑھ جاتی ھے.......[4]"

(۲) " جوش و خروش ، تپش و نیاز صرف شعر و ادب ھی کی جان نہیں بلکہ خود انسانیت کی جان اور اس کا اصلی غازۂ جمال ھیں ...... مشرق ھے اس کے حصول یابی کے لیے اعلیٰ اور مقدس ھستیوں کو آئیڈیل قرار دیا اور روح انسانی کو اسی جانب گرم عناں کرکے، اسے جوش و تپش سے لبریز کر دیا ۔ اسی جوش و تپش کا نام اس کی زبان میں " مذھبیت " ھے[5] ۔"

کلام میں تاثیر صداقت جذبات سے پیدا ھوتی ھے :
---

(۱) " کلام کی تاثیر کا اصلی راز صداقت جذبات ھے .... شاعری کے مذھب میں کوئی چیز جس میں دل کا اصلی جوش اور حقیقی تقاضا شامل نہ ھو کفر جلی سے کم نہیں[6] "

۱۔ نظم و نثر پر ایک نظر از اصغر رسالہ ھندستانی الہ آباد جولائی ۱۹۳۱ء ۔ ص ۳۳۶
۲۔ اردو شاعری کی ذھنی تاریخ ۔۔ دھلی اور لکھنؤ اسکول ۔ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ص ۱۳۱
۳۔ ایضاً ۔ ص ۱۳۹
۴۔ ایضاً ۔ ص ۱۳۵-۱۳۲
۵۔ دیباچہ مطلع انوار ۔ ص ۵۵
۶۔ مقدمہ پیام زندگی ۔ ص ۵۹

(۲) "شاعر کی دردمندی عظمت دنیاوی تو ایک طرف ، امید ثواب کی بھی محتاج نہیں اس کے یہاں مقصد شناسی خود فوت مقصد کا باعث ہوتی ہے ۔

یہائے دردو الم، درد و غم کی لذت ہے وہ دنگ عشق ہےجو آہ ہو اثر کے لئے [1] "

(۳) "حسرت و بیکسی ، دردو الم کے الفاظ مشاقی سے نظم کر دینے سے کلام میں درد نہیں پیدا ہوتا .... اس کے لیے شاعر کی کیفیت نفس ضروری ہے .... اگر ہو تو تاثیر و گداز کے لیے چند ٹوٹے پھوٹے جملے کافی ہیں .... نہ ہو تو باوجود ہزارہا مضامین کے کلام اثر سے خالی ہوتا ہے [2] ۔"

(۴) "ایک شخص (شیرکو دیکھ کر) .... ممکن ہے کوئی تفصیلی و مکمل بیان نہ پیش کر سکے ۔ ممکن ہے وہ " ارے شیر " کہہ دے یا صرف ایک چیخ مار دے ۔ بہرصورت اپنی حالت کے اظہار کا بہترین طریقہ وہی خوب جانتا ہے .... خوف و ہراس کا جو جذبہ (اظہار) وہ اپنے اس نامکمل بیان سے کر دے گا وہ کسی بڑے سے بڑے اہل زبان و خطیب سے ، باوجود اپنے تمام مصطلحہ فن خطابت و زباندانی کے بھی ممکن نہیں [3] ۔"

مشاعرہ اور مجلسی شاعری سے، شاعر کا مذاق پست ہو جاتا ہے :

(۱) "مشاعرہ میں ذوق سخن عموماً پست ہوا کرتا ہے ۔ وہاں وہی شعر اٹھتا ہے جو سب کی سمجھ میں آ جائے اور جلد سمجھ میں آ جائے .... اس کو لازمی طور پر سب کی سطح کا ہونا بھی چاہیے اور سب کی سطح برابر بلند نہیں ہواکرتی [4] ۔"

(۲) "مشاعرہ میں جانا اپنا ذوق برباد کرنا ہے [5] ۔"

(۳) "مجلسی اور دنگلی شاعری کو مذاق عوام کا .... ساتھ دینا پڑتا ہے [6] ۔"

درباردار ی سے روح شاعری مردہ ہو جاتی ہے :

(۱) "ملازمت کی مجبوریوں اور امراء و روساء کو خوش کرنے کے لیے جو اشعار کہے جاتے ہیں ان سے نہ صرف عزت نفس کو صدمہ پہونچتا ہے بلکہ شاعر کے جذبات کی قدرتی رو بھی مدھم

۱۔ مقدمہ پیام زندگی ۔ ص ۵۹
۲۔ ایضاً ۔ ص ۶۱
۳۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ـــ دہلی اور لکھنؤ اسکول ۔ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ص ۱۳۶
۴۔ اصغر مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۱۷
۵۔ ایضاً ۔ ص ۱۶
۶۔ مقدمہ پیام زندگی ۔ ص ۲۰

ہو جاتی ہے ۔[1]"

(۲) " لکھنؤ میں شعرائے دلی کے درباری تعلق ...... (سے) .... شعر و شاعری کے حقیقی جذبات اور اس کی روحانی خلیتوں میں نقص و انحطاط بھی شروع ہوگیا"[2]

(۳) " امرا کی فرمائش سے (شاعری میں) تکلف، تصنع اور آورد پیدا ہو جاتی ہے"[3]

ہر دور کی شاعری میں اس عہد کی " مخصوص روح " نمایاں ہوتی ہے :

(۱) " افراد کی ذہنی جدوجہد اور ...... (اس) کی متحدہ کیفیتوں سے سوسائٹی کا مذاق بنتا اور تیار ہوتا ہے .... اسی متحدہ و مشترکہ مذاق کے پردے میں سوسائٹی کی " اصل روح " یعنی اس کی " اجتماعی ذہنیت " متشکل ہوتی ہے ۔ افراد کا مذاق ، ان کا میلان طبع ان کی شاعری بلکہ اس شاعری کا ایک ایک لفظ اسی " اجتماعی ذہنیت " (اصل روح) کی کارفرمائی اور اسی کا ایک مخفی پرتوہ کمال (ہوتا) ہے ۔[4]"

(۲) " دلی کا مذاق .... اس کا مزاج شعر و ادب بلکہ اسکی تمام تر " اجتماعی ذہنیت " کی تربیت[5] " صوفیا کے ہاتھوں ہوتی تھی .... ہندو اور مسلمان فقرا و مشائخ کے طبوں جو اعلیٰ اخلاقی محاسن سے مزین تھے اور اردو شاعری کی تربیت و پرداخت چوں کہ انھیں کے بابرکت ہاتھوں عمل میں آئی اس لیے قدرتی طور سے اس میں بلند اخلاقی کی اسپرٹ موجود تھی ۔ یہی مہذب مذاق دلی اور نواح دہلی میں پھیل گیا اور شعر و شاعری کے باب میں یہی ذہنیت عام ہوگئی ۔[6]"

(۳) " لکھنؤ .... سلطنت کا مذہب شیعہ تھا .... رونا رلانا داخل حسنات سمجھا جاتا تھا اور یہی چیز حصول مغفرت کا بھی ذریعہ بھی ہوتی تھی ۔ دولت و ثروت نے عام طبائع میں ہنگامۂ نشاط برپا کر رکھا تھا .... جان عالم پیا کی رنگ رلیوں اور عیش پرستیوں کی داستان کسے نہیں معلوم ۔ آئے دن کے مشاعرے ، روز روز کی مجلسیں ، فارغ البالی کے ضمن میں مجملۂ سامان عیش تھیں .... ایک ایک مضمون کو ہزارہا انداز سے باندھتے ۔ مختلف صنعتیں دکھائی جاتیں ۔[7]"

۱۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ۔۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول ۔ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ص ۱۲۰

۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۲۰

۳۔ ایضاً ۔ ص ۱۳۹

۴۔ مقدمہ یادگار ضیغم ۔ ص ۱

۵۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ۔ از اصغر ۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول ۔ ص ۱۳۸

۶۔ ایضاً ۔ ص ۱۳۹

۷۔ مقدمہ پیام زندگی ۔ ص ۶۰

" لکھنؤ کا عیش پرستانہ دور انحطاط اس لیے ایک پست و محدود زندگی کے سوا کچھ نہ حاصل کر سکا [۱]۔" ---------- (اور جب اس مذاق کے ساتھ لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا فروغ ہوا) تو " مرثیہ سوز و درد و بین و بکا کا ایک " تماشائے عبرت " بن گیا ۔ جس کی مثال اس آتش بازی ، کی ہے جو فضائے ہوائی میں " ایک بسیط آتشیں چادر " تو تیار کر سکتی ہے جس سے دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہو سکتی ہیں ۔ مگر اس میں شمع کا سا وہ مسلسل و حقیقی گداز کہاں؟ جس کی بدولت علم و اخلاق کا درس لے کر جائیں منور کی جا سکتی ہیں [۲]۔"

<u>شعر و ادب قوموں کے اخلاق و جذبات کا آئینہ (ہوتا) ہے :</u>

(۱) " لٹریچر اور شاعری قوموں کے اخلاق و جذبات کا آئینہ ہے ۔ ہماری کامیابی و فیروزمندی نے جہاں ہمارے انبساط و مسرت کو اس پر منعکس کیا ہے وہیں ہمارے سوز و الم کی تصویر بھی اسی آئینے میں نظر آتی ہے [۳]۔"

(۲) " ایک قوم جو فنون لطیفہ و صنائع جمیلہ کے آثار چھوڑ جاتی ہے ۔ ان میں اس کے اخلاق و روحانیت کا ایک ایک خط و خال موجود ہوتا ہے [۴]۔"

<u>ندرت ادا :</u>

(۱) " نئی باتیں شاذ ہی ہوتی ہیں ------ پرانی باتیں جدت بیان اور ندرت ادا کے باعث صرف یہی نہیں کہ نئی معلوم ہونے لگتی ہیں بلکہ نفس مضمون کے اس رخ اور پہلو کو بھی پیش نظر کر دیتی ہیں جن کا نمایاں ہونا اسی طرز بیان اور اسی طرز ادا پر منحصر تھا [۵]۔"

(۲) " ندرت ادا اور بداعت اسلوب نام ہے اس مسخ و تشُر کا جس کی خفیف سی جنبش خیالات و حقائق کی ایک نئی دنیا ہماری نگاہوں کے سامنے لے آتی ہے [۶]۔"

۱۔ مقدمہ پیام زندگی ۔ ص ۶۵
۲۔ ایضاً ۔ ص ۷۱
۳۔ ایضاً ۔ ص ۲۷
۴۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ --- دہلی اور لکھنؤ اسکول ۔ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ص ۱۲۸
(حوالہ از (STONES OF VENICE
۵۔ مقدمہ رباعیات رواں ۔ ص ۱۳
۶۔ ایضاً ۔ ص ۳

تشبیہہ و تمثیل :

(۱) " ایک خوش مذاق شاعر کا کمال فی صرف تشبیہہ و تمثیل کے استعمال میں نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی طغرائے امتیاز تشبیہہ و تمثیل کی لطافت و جدت اور اس کی گہری معنویت پر منحصر ہے [۱]۔"

(۲) " ہم ----- تمثیل و استعارے کے لیے مناظر قدرت کی طرف رجوع کرتے ہیں ----- فطرت کے تمام مظاہر و مناظر بجائے خود ایک مستقل شعر ہیں ہنگام نظارہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک " بسیط فضائے شعریت " میں اڑ رہے ہیں ------ اگر نگاہ تدبر میسر ہو ------ تو پھر یہی مرایا و مناظر شاعر کی نکتہ رس و حسن پرست نظروں میں خود شاہد حقیقی کا خد و خال بن جاتے ہیں [۲]۔"

(۳) " تشبیہہ و تمثیل یا استعارے میں ایک صحیح الذوق شاعر کا فرض فقط یہ نہیں کہ وہ ------ (ان) کو استعمال کر دے بلکہ ------ اگر (وہ) اس میں لطافت و جدت اور کوئی مخصوص معنوی خوبی پیدا نہ کر سکے تو اس کی ------ تمام جانکاہیاں فضول لغو اور مہمل کہلائیں گی [۳]۔"

صنائع و بدائع :

" محاسن شعر میں ضرور داخل ہیں لیکن نہ فی نفسہ شعر ہیں نہ یہ ضروری ہے کہ ان کی کثرت سے کلام میں لطف پیدا ہو جائے ۔ بلکہ انہیں خواہ مخواہ اور بہ تکلف استعمال کرنے سے کلام کا رہا سہا حسن بھی غارت ہو جاتا ہے ۔ اس لیے ایک خوش مذاق و نکتہ شناس شاعر ہمیشہ ان چیزوں کو بڑی احتیاط و اعتدال سے استعمال کرتا ہے [۴]۔"

لفظ و محاورہ کی اہمیت و حقیقت :

(۱) " زبان و محاورہ --------- کی حیثیت عرض و سطح سے زیادہ نہیں [۵]۔"

۱۔ مقدمہ یادگار نسیم ۔ ص ۳۲

۲۔ مقدمہ رباعیات رواں ۔ ص ۱۲

۳۔ مقدمہ یادگار نسیم ۔ ص ۳۲

۴۔ ایضاً ۔ ص ۳۸

۵۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ --- دہلی اور لکھنؤ اسکول ۔ ص ۱۲۸

(۲) " الفاظ و اصطلاحات ، اصلیت و حقیقت کے اشارات ہیں اور وہ ہمیشہ باہم مختلف رہیں گے [1] ۔"

(۳) " ایک شخص (جو کسی انتہائی قوی جذبہ سے سرشار ہے) ---------- اپنی حالت کے اظہار کا بہترین طریقہ وہی خوب جانتا ہے اسے اپنے ادائے مطلب کے لئے بڑے سے بڑے اہل زبان کو حق نہیں کہ تعلیم و تلقین کرے اپنے (جذبہ کا اظہار وہ جس) ------- بیان سے کر دے گا وہ کسی بڑے سے بڑے اہل زبان و خطیب سے، باوجود اپنےتمام مصطلحہ فن خطابت و زباندانی کے بھی ممکن نہیں [2] ۔"

(۴) " اصل میں یہ خود زبان نہیں ہے جو صحیح زوردار، پاکیزہ اور نفیس ہوتی ہے بلکہ ذہن ہے جو اس میں متشکل ہوتا ہے [3] ۔"

"عام شاعری "، سے متعلق اصغر کےخیالات و افکار کا خلاصہ درج ذیل ہے :

(۱) شاعری جذبہ سے جذبہ کا تخاطب ہے ۔ اس کا اصل مقصد مجرد حقائق کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنا ہے ۔ شاعری میں کیف و اثر شاعر کے خلوص ، دردمندی اور صداقت جذبات سے پیدا ہوتا ہے ۔

(۲) جذبات میں خلوص و صداقت، شدت و لطافت مذہب و تصوف سے آتی ہے --- مذہب و تصوف سے شاعر کو مشاہدہ و یقین کی ایسی دولت حاصل ہو جاتی ہے کہ عوام کے لئے اس کی آواز عالم بالا کی آواز معلوم ہوتی ہے ، جس سے وہ متاثر ہوتے ہیں ، لیکن اس کے جذبہ کا صحیح ادراک نہ ہونے کی وجہ سے اس پر تنقید کا حق نہیں رکھتے ۔

(۳) شاعری کا جوہر کیف و اثر ہے، الفاظ و محاورہ کی حیثیت عرض و سطح کی ہے۔

(۴) شاعری میں رقت و الم اتنا نہ ہو کہ دل ڈوبنے لگے ۔

(۵) شاعر کا تخاطب خود اپنے نفس سے ہوتا ہے ۔ شعر کہتے وقت اس کے سامنے دوسرے نہیں ہوتے ۔

(۶) عوام کے مذاق کا لحاظ رکھنا اپنا ذوق برباد کرنا ہے ۔

(۷) اعلیٰ انسان ہی اعلیٰ شاعری کی تخلیق کرتے ہیں ------ شاعری شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے ۔

۱۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ --- دہلی اور لکھنؤ اسکول ۔ ص ۱۲۸

۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۳۶

۳۔ ادارۂ ہندوستانی ، جنوری ۱۹۳۱ء ۔ ص ۱۵۵

اصغر کا نظریہ غزل :

شاعری سے متعلق اصغر کے بنیادی فلسفۂ فکر اور عام نظریات کے احصاء و احاطے کے بعد اب ان کا نظریۂ غزل پیش کیا جاتا ہے کہ ان کی غزل ہی اردو شاعری کا سرمایۂ افتخار اور ان کی شاعرانہ کمال کا مظہر ہے ۔ اس کو سمجھ لینے کے بعد ، افراط و تفریط کا وہ غبار جس نے اصغر کی شخصیت و شاعری کو دھندلا دیا تھا ، خود بخود چھٹ جائے گا ۔ اور اسکے پیچھے سے ، ان کی واضح اور متعین شکل نکل آئے گی یہاں یہ بحث اس لیے بھی ضروری ہو جاتی ہے کہ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ بیشتر شعرائے کرام کا اشہب قلم میدان نظم گوئی ، میں جولاں کار تھا ، غزل مطرود ، مردود ، مطعون ہو رہی تھی اسے "نیم وحشی صنف سخن " اور گردن زدنی " قرار دیا جا رہا تھا ، اصغر نے غزل ہی کو اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ کیوں بنائے رکھا اور اس پر بشرط استواری کیوں قائم و مصر رہے ---------- انہیں دونوں بنیادی مباحث کی تفہیم پر اصغر کے شاعرانہ مرتبۂ و حیثیت کے تعین کا انحصار ہے ۔ اس سوال کا جواب کہ اصغر نے " غزل " ہی کو اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ کیوں بنایا انہی کی زبانی سنیے ۔ وہ کہتے ہیں :

" غزل شاعری کی اعلیٰ ترین صنف ہے ۔ لیکن اس وقت جب کہ شاعر کی فطرت اس کی حقیقی صلاحیت رکھتی ہو ۔ ورنہ غزل سے زیادہ لفظی گرہ بازیوں اور سطحی ہرزہ سرائیوں کا موقع کسی اور صنف شاعری میں نہیں ہے ۔"[1]

اس کے علاوہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ

" فن کی ترقی تقسیم عمل سے ہے ۔ جب تک مختلف شعبوں میں اختصاصیوں کی جماعتیں نہ ہوں ، اس وقت تک فن کی تکمیل نہیں ہو سکتی ۔"[2]

مذکورہ بالا اقتباسات کے تجزیے سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اصغر کو اس بات کا احساس تھا کہ

(۱) ان کی فطرت میں غزل کی حقیقی صلاحیت ہے ،

نیز یہ کہ (۲) غزل کے فن کی تکمیل میں وہ بطور متخصص (SPECIALIST) حصہ لے رہے ہیں ۔

۱۔ مقدمہ یادگار نسیم ۔ ص ۸

۲۔ مقدمہ رباعیات رواں ۔ ص ۱۲

ان حقائق سے یہ واضح ہو گیا کہ اصغر " میدان غزل " میں " پادچوبی سوار " کی حیثیت سے نہیں کود پڑے تھے، بلکہ بہت سوچ سمجھکر اس میں قدم رکھا تھا۔ انہوں نے "غزل " کو محض رسماً و روایتاً نہیں قبول کیا تھا بلکہ اس کا انتخاب شعور و ارادہ کی بھی بیداری کے ساتھ کیا تھا ۔

اس خیال کی تصدیق جناب بشیر احمد صدیقی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے :

" اپنی شاعری کے متعلق ان کو یہ احساس ضرور تھا کہ جو کچھ کہتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں .... اسے صرف وہی لوگ سمجھتے ہیں جن کا مذاق بڑا اعلیٰ ہے[۱] ۔"

حقیقت یہ ہے کہ غزل ہماری شاعری کی آبرو ہے جو نزاکت احساس، لطافت جذبات اور رنگینی تخیل کا حسین ترین مرقع ہوتی ہے ۔ اصغر کو اپنی مرصع طبیعت اور رنگین شخصیت کے انعکاس کے لیے اس سے بہتر " پردۂ مینا[۲] " کوئی اور نظر نہیں آیا ۔

اصغر کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ "فن کا کمال اشارات و کنایات ہیں[۳] ۔" ------ اور تمام اصناف سخن میں غزل ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں معنویت و روحانیت کی لطیف ترین شراب ، اشارات و کنایات کے بلوریں کاغذی جام میں پیش کی جا سکتی ہے ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

" تمام اصناف سخن میں جامعیت و معنویت کے اعتبار سے غزل کا ایک خاص درجہ ہے .... جس طرح بائیسکوپ کی ایک چھوٹی سی حقیر فلم مناظر کی ایک غیر مرئی دنیا لیے ہوتے پردہ پر منعکس ہوتی ہے تو بڑے بڑے وسیع اور دلچسپ مناظر دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے آ جاتے ہیں ۔ اسی طرح (غزل کی) ایک شعر کے دو مصرعے کیفیات باطنی اور حقائق عجیبہ کی ایک وسیع و بسیط دنیا اپنے ساتھ رکھتے ہیں ۔ شاعر جوش بیان و ندرت ادا کا "عمل السحر" دم کرتا ہے تو وہ تمام چیزیں پڑھنے والے کے پردہ احساس پر چھا جاتی ہیں[۴] ۔"

۱۔ گفتگو از مقالہ نگار ۲۰ مئی ۱۹۶۹ء

۲۔ " شعر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے پنہاں بھی ہے جیسے صہبا کے لئے پردۂ مینا ہونا " اصغر

۳۔ مقدمہ رباعیات رواں ۔ ص ۸

۴۔ ایضاً ۔ ص ۸

اسی خیال کو آگے چل کر یوں واضح کرتے ہیں :

" (غزل کا) شاعر (مصور کی طرح) انہیں جزئیات کو منتخب کرتا ہے جو تصویر کے حسن و خوبی کو بڑھاتی ہوں ------- اور بہ حیثیت مجموعی کلام کی لطافت و متانت اور علو و شائستگی میں مزاحم نہ ہوں [1]۔"

اقتباسات بالا سے (اصغر کے خیال میں) غزل کے بنیادی خصوصیات ، اشارات و کنایات معنویت و لطافت ، علو و شائستگی اور متانت ہیں ۔

اب ان کے اشعار سے ، غزل کے متعلق ان کے مزید افکار (غزل کے خصوصیات) کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے ۔ یہ اشعار "نشاط روح " اور " سرود زندگی سے ماخوذ ہیں ۔ ان کے صفحات حاشیے میں درج کر دیئے گئے ہیں :

جو عرض ہے اسے اشعار کیوں نہ کہئے — اچھل رہے ہیں جگر پارہ ہائے خوں آلود [2]

شعر میں رنگینی جوش تخیل چاہیے — مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی [3]

اصغر نشاط روح کا اک کھل گیا چمن — جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو [4]

غزل کیا اک شرار معنی گردش میں ہے اصغر — یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی [5]

اشعار یہ اصغر کے ہے رقص رگ جاں میں — اک موج نسیم آئی کیا باغ مصلیٰ سے [6]

غزل میں درد رنگیں تو نے ایسا بھر دیا اصغر — کہ اس میدان میں روتے رہیں گے نوحہ خواں برسوں [7]

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا — اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے [8]

اصغر غزل میں چاہیے وہ موج زندگی — جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں [9]

زمزمہ طرازی کی گرمی سوا معلوم — موج برق اٹھتی ہے میرے آشیانے سے [10]

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی — ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں [11]

۱۔ مقدمہ پیام زندگی ۔ ص ۲۲۔ بادیہ نصرت ۔

۲۔ نشاط روح اشاعت اول مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ ۔ ص ۱

۳۔ ایضاً ۔ ص ۲۰

۴۔ ایضاً ۔ ص ۳۱

۵۔ ایضاً ۔ ص ۳۳

۶۔ ایضاً ۔ ص ۳۴ --- اشاعت اول میں یہ مصرعہ " اک موج نسیم آئی کیا باغ مصلیٰ سے" جو کتابت کی غلطی ہے جسے دوسری ایڈیشن میں درست کر دیا گیا ہے۔

۷۔ ایضاً ۔ ص ۳۸

۸۔ نسخہ متداول ۔ ملک بک ڈپو لاہور ۔ ص ۱۲۸ -- یہ شعر اشاعت اول میں نہیں تھا ۔ بعد کا اضافہ ہے ۔

۹۔ سرود زندگی اشاعت اول ۔ انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۵ء ۔ ص ۲۲

۱۰۔ ایضاً ۔ ص ۲۸ — ۱۱۔ ایضاً ۔ ص ۳۵

وہ نغمہ بلبل رنگیں نوا اک بار ہو جائے　　کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے [1]

اصغر رنگیں نوا کا یہ تغـزل الامـان　　کفر پھیلاتا ہے یہ مرد مسلماں دیکھـئے [2]

مندرجہ بالا اشعار میں، اصغر نے غزل اور اشعار غزل کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کے تحلیلی تجزیے سے، اس میں حسب ذیل خصوصیات ہوئے :

(۱) اشعار جگر پارہ ہائے خوں آلود (ہوتی) ہیں	(خلوص و صداقت جذبات)
(۲) شعر میں رنگینی جوش تخیل چاہئے	(تخیل کی رنگینی)
(۳) شعر میں نالہ و فریاد نہیں ہونا چاہئے	(کم،، بعض نہیں — نالہ و فریاد کا فقدان)
(۴) خامہ رنگیں نگار کی جنبش سے نشاط روح کا چمن کھل جاتا ہے -	(رنگیں بیانی اور سرور قلب و روح)
(۵) غزل شرار معنوی کی گردش ہے	(معنویت اور روحانیت کا شرارا)
(۶) اشعار باغ مصلیٰ کی موج شمیم ہیں، جن سے رگ جاں رقص میں آ جاتی ہے -	(حافظ کا رقص و مستی)
(۷) غزل "درد رنگیں،، کا مرقع ہے	(سوز اور رنگینی)
(۸) اصغر اپنے اشعار میں کچھ کچھ نمایاں ہیں	(شاعری شخصیت کا پرتو ہے)
(۹) غزل ایسی موج زندگی ہے جس میں بتوں کا حسن اور شراب کی مستی ہے	(حسن و مستی کا مجموعہ)
(۱۰) گرمی نوا" موج برق" ہے	(گرمی، حرارت اور حسن)
(۱۱) عاشق (غزل گو) کی شورش سے کلی کی شکر خوابی کا نشہ اترتا ہے اور اس میں روح بیداری دوڑ جاتی ہے	(موجب بیداری)
(۱۲) بلبل (عاشق - غزل گو) کی رنگیں نوائی سے چمن میں بیداری کی لہر دوڑ جاتی ہے	(جذبات و حسیات میں تموج و تلاطم کا سبب)
(۱۳) اصغر رنگیں نوا کا تغزل کفر* پھیلاتا ہے	(روحانیت کا نشہ طاری کرتا ہے)

۱- سرود زندگی اشاعت اول - انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۵ء - ص ۸۳

۲- ایضاً - ص ۸۹

*- اصطلاح صوفیا میں کفر در وحدت یک رنگ شدہ روی از ماسوا اللـہ تعالیٰ، برتافتن است (ماسوا اللہ سے رو گردانی کر کے وحدت میں یک رنگ ہو جانا) ....

* شریعت و طریقت ،، از افادات مولانا اشرف علی تھانوی رح - مرتبہ محمد دین حنفی چشتی - اشرفیہ جامع مسجد روڈ راولپنڈی - ص ۲۲۸

مختصراً یہ کہ اصغر کی نظر میں ، ان کی غزلیات حسب ذیل خصوصیات کی حامل ہیں:

جذبات کا خلوص، تخیل کی رنگینی ، فرہاد و ماتم کا فقدان، رنگینی بیان، سرور نشاط روح ، روحانیت و معنویت کی شرارگی، سوز و درد ، حافظ کا رقص و مستی ، بتوں کا حسن شراب کی مستی ، برق کی گرمی و حرارت ، جذبات و حسیات کو متموج و متلاطم کرنے کی کیفیت ، روح کی بیداری کا سامان اور روحانیت کا نشہ ۔

موضوعات شعری :

شاعری و غزل سے متعلق اصغر کے افکار و نظریات کی تفصیل کے بعد شاید ان کے " موضوعات شاعری " کی طرف اشارہ کر دینا بے محل نہ ہوگا ۔

اصغر کے نزدیک شاعری کا عام موضوع " حسن " اور غزل کا " عشق " ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

(۱) " شاعری کا عام موضوع حسن ہے ۔ ارباب فقر و تصوف کے نزدیک اس کا مفہوم نہایت وسیع ہے ۔ جس میں مجاز و حقیقت ، اخلاقی اور مادی حسن کی تمام ادائیں داخل ہیں ۔[۱]"

(۲) " غزل کا عام موضوع عشق و محبت اور شوق و طلب کی داستان ہے ۔[۲]"

لیکن " حسن و عشق " کے جو معنی عموماً لیے جاتے ہیں ، اصغر ان کو بہت ہی محدود و پست سمجھتے ہیں ۔ اس کی تفصیل " عقائد اور افکار " میں دی جا چکی ہے ۔ (ص) ۔ یہاں صرف اس کا خلاصہ دیا جاتا ہے تاکہ اصغر کا تصور حسن و عشق مفہوم و معلوم ہو سکے ۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات "سراپا حسن[۳] " ہے اور اس کے خالق " جمیل و اجمل[۴] " سے محبت کرنا انسان کی زندگی کا تقاضا و مقصد ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" روح انسانی ایک جوہر لطیف ہے ۔ خدا کے ساتھ اتحاد و محبت اس کا خاصہ ازلی ہے اس جسد عنصری میں پہونچ کر اپنی دھسروشنہ عظمت کی تلاش ایک تقاضائے فطری ہے ۔[۵]"

۱۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ـــ دھلی اور لکھنؤ اسکول ۔ زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء ص ۱۳۹

۲۔ مقدمہ رباعیات رواں ۔ ص ۱۳

۳۔ یہ حسن یار ہے اور التجائے جانبانی تجھے یہ وہم کہ یہ کائنات عالم ہے

۴۔ اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَالَ ۔

۵۔ مقدمہ رباعیات رواں ۔ ص ۲۲

یہی تقاضا انسان کو ، شاہد حقیقی ، کی طلب و جستجو میں بیقرار رکھتا ہے -
اسی " طلب و جستجو کا نام مذہب (عشق) ہے [۱] -"

(۲) مذہب نے اخلاقی محاسن کے پیکر ---- انسان کامل و اکمل کو آئیڈیل بنا کر ، انہیں عام انسانوں کے لیے " منظور نظر" اور مرکز عقیدت و نیاز بنا دیا ہے جو خود " حسن مطلق " کے پرستار و والہ و شیدا ہوتے ہیں ---- ان اعلیٰ انسانوں سے محبت ، ان کی ذات کے بجائے ان صفات کی وجہ سے ہوتی ہے جو وہ " تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللّٰہِ " پر گامزن ہو کر ، اپنے وجود میں منعکس کر لیتے .... اور " یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ " کے مقام اعلیٰ پر فائز و سرفراز ہوتے ہیں ---- ان " نفوس قدسیہ " سے محبت حقیقتاً اسی " ذات جمیل " کی محبت کا وسیلہ و تتمہ ہوتی ہے - چنانچہ لکھتے ہیں :

" جوش و خروش ، تپش و نیاز .... انسانیت کی جان اور اس کا اصلی غازۂ جمال ہیں - مشرق نے اس کی حصول یابی کے لیے اعلیٰ اور مقدس ہستیوں کو آئیڈیل قرار دیا اور روح انسانی کو اسی آئیڈیل کی طرف گرم عنان کر کے ، جوش و تپش سے لبریز کر دیا [۲] -"

...... یہی جوش و تپش عشق ہے -

تصور محبوب و محب :

مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں " مرکز و موضوع محبت " ---- یعنی " محبوب " کا تصور ، عام تصور کے مقابلے میں پاکیزگی ، تقدس اور روحانیت کا پہلو لئے ہوئے ہے -

(۳) " جنسی محبت " کے سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" جذبہ عشق دراصل نام ہے " عشق شوق و اضطراب " کا - اس کا قیام و بقا بھی ناکامی ہی کے دم سے ہے - اس لیے " عورت " کہ آغوش اشتیاق میں آکر ، آتش اضطراب کو فرو کر سکتی ہے - کسی طرح " موضوع عشق " نہیں ہو سکتی [۳] -"

۱- مقدمہ رباعیات روان - ص ۲۲
۲- دیباچہ مطلع انوار - ص ۵۵
۳- انجمن اردوئے معلیٰ بسلسلہ استفسارات - رسالہ سہیل اعظم گڑھ - جنوری ۱۹۲۶ء

اقتباسات بالا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصغر کے یہاں گوشت و پوست کے انسان سے جنسی محبت ، محبت (عشق) کے تحت نہیں آتی - اس لیے ان کے یہاں محبوب کا کوئی ایسا تصور نہیں ہے ، جس میں جنس و نفس کا شائبہ ہو - ان کے کلام میں کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے ، جس میں " ہوس پرستی " کی کیفیت بیان ہوئی ہو ---- جنسی عشق کے اظہار کو وہ " فسق و بزدلی " ، " بے غیرتی و بے حیائی " سے تعبیر کرتے ہیں - ان کا خیال ہے کہ جو لوگ ذہنی طور پر مریض ہوتے ہیں - یعنی " جن کی پراگندہ زندگی ہوس پرستیوں اور حیا سوز مشاغل کی نذر ہوتی ہے" ، ان کے اعصاب پر عورت سوار ہو جاتی ہے - اور وہی " ان کی کل کائنات ہوتی ہے [۲]" .... اصغر کے " شعور و تحت الشعور " میں اس قسم کی کوئی " جنسی الجھن " نہیں تھی جو ان کے فکر و شعور کے سرچشمہ کو متعفن و مکدر کر دیتی -

جناب مظہر عزیز صاحب اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

" میری سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ بغیر کسی دنیاوی تجربے کے ، انسان روح کی ان بلندیوں تک کیسے پہونچ سکتا ہے - جن کا پتہ اس کے اشعار میں ملتا ہے .... میرے ایک دوست (جنھیں جمالیات و نفسیات دونوں میں شغف ہے) کو بھی یہ فکر تھی کہ کسی طرح اصغر سے اس کی گزشتہ زندگی کے حالات ، ذہنی کاوشیں ، تجربات وغیرہ معلوم کریں تاکہ اسکی شاعری کا پس منظر سمجھ میں آ سکے - چنانچہ انھوں نے ایک دن یہ سوال کر ہی لیا - مگر اصغر نے قسمیں کھا کھا کے یقین دلایا کہ اس کی زندگی میں " جنسیات" کو کبھی دخل نہیں رہا - اور میرے نزدیک کوئی وجہ نہیں کہ اصغر کے بیان کو سچ نہ مانا جائے [۳]-"

مظہر عزیز صاحب کے اس قول کی تصدیق جناب علی ظہیر کی تحریر سے بھی ہوتی ہے - وہ لکھتے ہیں :

" اصغر صاحب نے عشق مجازی کے بارے میں ایک بار میرے سامنے خود فرمایا کہ مجھے آج تک اس کا احساس نہیں ہوا کہ " جنسی کشش کس

---

۱ و ۲ - انجمن اردوئے معلیٰ - بسلسلۂ استفسارات - سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۲۷ء

۳ - اصغر گونڈوی کی شخصیت و شاعری - از مظہر عزیز - رسالہ ساقی دہلی دسمبر ۱۹۳۱ء ص ۲۲ -

بلا کا نام ہے ۔"[1]

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اصغر نے " جذبۂ جنسی " کے وجود کا انکار نہیں کیا ۔ اس لیے کہ " جذبۂ جنسی " عطیات ربانی میں سے ایک زبردست عطیہ ہے۔ اس کا فقدان نہ کوئی خوبی ہے نہ تعریف کی بات ۔ یہ تو ایک طرح کا نقص و عیب اور انعام الٰہی سے محرومی ہوگی ۔ پھر واقعات بھی اس کی شہادت نہیں دیتے ۔ انھوں نے ایک چھوڑ تین تین شادیاں کیں ۔ ایک نہیں ان کے یہاں سات اولادیں ہوئیں ..... پھر ان کی زندگی میں ایک دور ایسا بھی آیا جس میں وہ " بی چھٹن " سے " راز و نیاز " میں مشغول ہیں ۔ اس لیے اس جملے سے کہ " جنسی کشش کس بلا کا نام ہے " صرف یہ مراد ہے کہ جنسی کشش نہ ان کے لیے کبھی ذہنی الجھن بنی ، نہ اس کی عدم تسکین سے ان میں احساس محرومی پیدا ہوا اور نہ اس نے انھیں " فسق و فجور " کے اندھے کنوئیں میں گرایا ۔۔ ۔۔۔ یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بی چھٹن کی طرف میلان میں کسی اور ہی چیز کی تلاش تھی (جیسا کہ رشید صاحب نے اشارہ کیا ہے کہ یہ رشتہ حسن صورت سے زیادہ حسن سیرت پر قائم ہوا تھا) ۔ اور یہ کہ ان کی محبت پاک و معصوم تھی ..... اور جب ان کے " جنسی جذبہ " کی تسکین حدود نکاح میں ہوتی رہی تو ان کے وجود میں " ہیجان فطری " نے سر نہیں اٹھایا ۔۔۔ فطری زندہ دلی کے علاوہ غالباً ان کے کلام میں مسرت و انبساط کی ایک وجہ یہ بھی ہے ۔۔۔ اصغر کی جنسی آلائش سے پاک زندگی اور حسن و عشق کے اسی پاکیزہ تصور نے ، ان کی شاعری کی عمومی فضا کو پاکیزہ و معصوم بنا دیا ہے ۔

عشق مجازی کی آخری حد :

اصغر حسن کے پرستار ہیں ، حسن جہاں نظر آ جاتا ہے وہ اس سے لذت اندوز ہو لیتے ہیں مگر اس احساس کے ساتھ کہ " شعرا کی رنگین مزاجی اور زندہ دلی کی .... آخری حد ایک ضیافت نظر و لذت نگاہ سے زیادہ نہیں ہے"[2] ۔۔۔ اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ " گلشن میں فقط رنگ چمن دیکھنے "[3] سے اصغر کی کیا مراد ہے ۔ جن لوگوں نے اس سے ، اصغر کی دنیا بیزاری ، ترک تعلق ، مجہولیت یا فرار کا حکم لگایا ہے ان کے سامنے اصغر کا " آخری حد لذت نگاہ ہے " کا نقطہ نظر و

۱۔ مکتوب جناب علی ظہیر بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲ ستمبر ۱۹۷۰ء

۲۔ مقدمہ یادگار فسیم ۔ ص ۵

۳۔ بلبل و گل میں جو گزری ہم کو اس سے کیا غرض ہم تو گلشن میں فقط رنگ چمن دیکھا کئے

فلسفۂ زندگی نہیں تھا .... حاصل کلام یہ کہ " حسن مجاز " کی اضطراری صورتوں میں تو وہ لذت نگاہ اور " ضیافت نظر " کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں ، مگر ہوس پرست و ہوس پیشہ انسان کی طرح انھوں نے نظربازی کو مشغلہ نہیں بنایا ۔

اس پس منظر میں اگر اصغر کے یہاں " تصور محبوب " کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان کے کلام میں " خالص عشق مجازی " کے نام کی کوئی چیز نہیں ۔ جو لوگ اصغر کے کلام میں " جنسی محبت کی واردات ، معاملات اور چوما چاٹی " تلاش کریں گے انھیں یقیناً مایوسی ہوگی ---- ہاں اگر " عشق مجازی " سے مراد ماسوا اللہ سے محبت ہے جو اسی عشق حقیقی کے تابع ، اس کا وسیلہ اور تتمہ ہے ، تو اس کی ان کے یہاں کمی نہیں --- " عشق مجازی " کی یہ شکل ان کے کلام میں دو طرح ظاہر ہوتی ہے (۱) عشق رسول اور (۲) عشق مرشد کی صورت میں ۔ اسی لیے ان کے یہاں " محبوب " کا تصور بڑا بلند و ارفع ہے --- جیسا کہ وہ کہتے ہیں ؎

یہ بارگاہ حسن ادب کا مقام ہے — جز درد و اشتیاق تقاضا نہ چاہیے

مذکورہ بالا شعر کو ذرا حسب ذیل شعر کے مقابلے میں رکھ کر دیکھیے تو اس کی اصل روح سمجھ میں آئے گی ؎

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر — نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

اور یہ " ادب گاہ " ظاہر ہے کہ " بارگاہ رسالت " ہے یا انھیں کی سمت و بھری میں شوربور کسی " مرد حق پرست " کا آستانہ ۔ اصغر کی " جبیں نیاز " ان دونوں آستانوں پر سرگرم نیاز ہے ۔ وہ بھی اس طرح کہ ایک بار سر رکھ کے اٹھانا پسند نہیں کرتے ؎

یہ آستان یار ہے صحن حرم نہیں — جب رکھ دیا ہے سر تو اٹھانا نہ چاہیے

اس آستاں سے اٹھائی نہ پھر جبیں میں نے — حرم میں سجدۂ پیہم تھی ایک درد سری

مختصر یہ کہ اصغر کے کلام میں " خدا " کے علاوہ بحیثیت " محبوب " ، " رسول صلعم " اور ان کے " مرشد روحانی " کا ذکر ہے ۔ اور بس ..... اور اگر کہیں کسی شعر میں " مجاز " کا پہلو نمایاں بھی ہوا ہے تو اس میں اتنی وسعت اور جامعیت ہے کہ اس کا رخ کسی طرف بھی پھیرا جا سکتا ہے ۔ مثلاً درج ذیل شعر کا مرجع ، قاری کی وسعت ظرف و نظر کے مطابق ہوگا ؎

کچھ نہ ہم سے ہوسکا اس اضطراب شوق میں — ان کے دامن کو مگر اپنا گریباں کر دیا

آئندہ سطور میں " عشق رسول اور عشق مرشد " کی شہادت ، واقعات ، روایات اور ان کے کلام سے پیش کی جاتی ہے ۔

(۱) عشق رسول صلعم :

اوپر اشارہ گزر چکا ہے کہ اصغر کے یہاں " محبوب " رسول کی ذات گرامی ہے، اس کا ثبوت ان کے عشقیہ اشعار میں ہر جگہ موجود ہے ، لیکن ان مبہم اور غیر واضح اشعار کے علاوہ بھی " نشاط روح " میں ایک نعت اور دو غزلیں رسول صلعم کی شان میں کہی گئی ہیں جن کے مطلعے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

(۱) کچھ اور عشق کا حاصل نہ عشق کا مقصود — جز اینکہ لطف خلش ہائے نالۂ بے سود [1]

(۲) دل نثار مصطفےٰ جاں پایمال مصطفےٰ — یہ اپنی مصطفےٰ ہے وہ جلال مصطفےٰ [2]

(۳) ہر موج ہوا زلف پریشان محمد — ہے نور سحر صورت خندان محمد [3]

ان تینوں " نظم پاروں " کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محض تبرکاً و رسماً شامل دیوان نہیں کئے گئے ہیں بلکہ کہنے والے نے بہت ڈوب کے کہا ہے ---- یوں تو یہ نظمیں سرتا پا کیف و اثر میں ڈوبی ہوئی ہیں، لیکن جب تک ان کے بعض اشعار نہ پیش کئے جائیں ، اس " تعلق خاطر " اور " شدت محبت " کا اندازہ نہیں ہو سکتا جو اصغر کو رسول کی ذات گرامی سے تھی - ذیل میں آخری غزل کا صرف ایک شعر اور نعت کے آٹھ اشعار بلا کسی تنقید و تبصرہ کے پیش کیے جاتے ہیں ، جن کا لب و لہجہ اور جوش بیان شاعر کی کیفیت باطنی کے خود غماز ہیں ؎

ای حسن ازل اپنی اداؤں کے مزے لے — ہے سامنے آئینہ حیران محمد

نعت کے اشعار

چلوں میں جان حزیں کو نثار کر ڈالوں — نہ دین جو اہل شریعت جبیں کو اذن سجود

وہ راز خلقت ہستی ، وہ معنی کونین — وہ جان حسن ازل، وہ بہار صبح وجود

وہ آفتاب حرم، نازنین کنج حرا — وہ دل کا نور، وہ ارباب درد کا مقصود

وہ سرور دو جہاں وہ محمد عربی — بہ روح اعظم و پاکش درود نامحدود

شعاع حسن کا ادنیٰ سا یہ کرشمہ ہے — چمک گئی ہے شبستان غیب و بزم شہود

نگاہ ناز میں پنہاں ہیں نکتہ ہائے فنا — چھپا ہے خنجر ابرو میں رمز " لاموجود "

وہ مست شاہد رعنا نگاہ سحر طراز — وہ جام نیم شبی نرگس خمار آلود

۱- پہلی نظم کا مطلع --- نشاط روح اشاعت اول - مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۵ء ص ۱

۲- دوسری غزل کا مطلع --- ایضاً - ص ۷

۳- اٹھاسویں غزل کا مطلع --- ایضاً - ص ۳۲

کچھ اس ادا سے مرا اس نے مدعا پوچھا   ڈھلک پڑا میں آنکھوں سے گوہر مقصود

مذکورہ بالا اقتباس جس نعت سے ماخوذ ہے ، بارگاہ رسالت سے اس کے " شرف قبولیت" کا ذکر اور " رویت " کا واقعہ مقدمہ مقالہ ہذا میں صفحہ ۳۲ پر درج کیا جا چکا ہے - اس کے علاوہ بھی نظم کی اندرونی شہادت ، اصغر کے دوسرے اشعار اور دیگر ذرائع سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اصغر عشق رسول میں حددرجہ غرق تھے یہاں تک کہ آپ کو خواب میں زیارت سے سرفراز فرمایا گیا - جناب علی ظہیر نے " رویت " کی تصدیق کرتے ہوئے تحریر فرمایا :

" اصغر نے خواب میں آنحضور علیہ السلام کو اس طرح دیکھا کہ وہ ایک عرصے سے اپنے مرشد جناب قاضی عبدالغنی صاحب مدظلہ العالی کے ساتھ رہا کرتے تھے - ایک دفعہ بخارایک سو چار ڈگری کا اصغر صاحب کو چڑھا اور اسی کیفیت میں کسی وقت نیند آ گئی - خواب میں دیکھا کہ بقول اصغر کہ میں دو ڈھائی سال کا بچہ ہوں اور کھیل رہا ہوں - اسی اثناء میں حضور پر نور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما ہوئے اور .... مجھے گود میں اٹھا لیا - جب میں جاگا تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی - یہ خواب اصغر نے اس وقت بیان فرمایا جب میں نے ایک غزل کے چند اشعار سے اندازہ کیا کہ شاید ان اشعار میں کسی خاص واقعہ کی کیفیات بیان ہوئی ہیں - فرمایا سچ کہا تم نے - وہ غزل یہ ہے ؎

کیجئے آج کس طرح دوڑ کے سجدۂ نیاز

یہ بھی تو ہوش اب نہیں پاؤں کہاں ہے سر کہاں

.... یہ اصغر صاحب نے مجھ سے خود بیان کیا تھا -[1] "

مولانا سراج الحق صاحب نے " واقعہ رویت " کے استفسار پر جواباً تحریر فرمایا :

" صرف ایک بار اصغر نے خود فرمایا تھا کہ میں نے جو نعتیہ قصیدہ نشاط روح میں لکھا ہے اس کی شان نزول یہ ہے کہ میں نے ایک بار حضور کی زیارت کی کہ حضور چارپائی پر سفید چادر اوڑھے لیٹے ہیں مجھے معلوم ہوا کہ یہ حضور ہیں تو چارپائی کے پاس بیٹھ کر کانپنے اور رونے لگا - بس اتنا ہی یاد ہے کچھ گفتگو یا عرض کرنا غالباً نہیں

۱- مکتوب جناب علی ظہیر بنام راقم مقالہ مرقومہ ٦ ستمبر ۱۹۷۰ء

کہا تھا مگر صحت میں تو یہ ہے کہ ؎

کہہ اس ادا سے میرا اس نے مدعا پوچھا

ڈھلک پڑا مری آنکھوں سے گوہر مقصود [1] "

ممکن ہے اختلاف روایات کی بنا پر " واقعہ رویت " کی صداقت مشتبہ سمجھی جائے ۔ لیکن راوی اتنے ثقہ ہیں اور روایت خود اصغر کی زبانی بیان کی جا رہی ہے (" جو بددیانت ہرگز نہیں تھے " [2]) ۔ اس لیے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ۔

اس کے علاوہ بھی روایات میں دو قرائن اتنے قوی ہیں کہ " رویت " کی صداقت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا :

(۱) پہلا یہ کہ " رویت رسول " ـــ " اضغاث احلام " ـــ یعنی " شیطانی وسوسہ " نہیں ہو سکتی ـــ اس بات پر علما ، فقہا اور صلحائے امت کا اجماع ہے کہ " شیطان ہر بھیس میں ظاہر ہونے پر قادر ہے " سوائے انبیاء علیہم السلام کی صورت خصوصاً شبیہ رسول صلعم ، میں آنے کے ۔

(۲) دوسرا یہ کہ اگر اس کو محض تخیل و تصور کی کارفرمائی کہا جائے اور بخار کی بحرانی کیفیت سے تعبیر کیا جائے جب بھی یہ نفسیاتی نکتہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ " تحت الشعور میں دبی ہوئی خواہش رویت " نے رویت کی شکل اختیار کرلی ۔ لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ " رویت رسول " ، ہذیانی ، بحرانی یا شیطانی اثرات کا کرشمہ نہیں ہو سکتا ۔ اس لیے اسکو صحیح تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا ۔

(۳) مزید براں یہ امر بھی قابل غور و توجہ ہے کہ آخر اصغر کو خواب میں " رویت " ہی کیوں ہوئی ؟ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ كُلُّ اِنَاءٍ يَتَرَشَّحُ بِمَا فِيْهِ کے مصداق اصغر عشق رسول سے سرشار تھے ۔

بہرحال روایات کے اختلاف کے باوجود رویت کے واقعہ کی صداقت مسلم ہے یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ حضور صلعم کی رویت ہر شخص کے نصیب میں نہیں ہوتی تاوقتیکہ کوئی اس کا اہل نہ ہو اور عشق رسول میں ڈوبا ہوا نہ ہو ۔

---

۱ ۔ مکتوب مولانا سراج الحق بنام مقالہ نگار

۲ ۔ نقوش لاہور جلد ۴۸-۴۷ ۱۹۵۵ء ۔ اصغر گونڈوی از عابدعلی عابد ۔ ص ۵۰۸

(۲) عشق مرشد :

اصغر کو اپنے پیر سے عشق تھا ۔ اس کی تصدیق مختلف بزرگوں کے[1] اقوال و بیانات سے ہوتی ہے ۔ جناب علی ظہیر صاحب رقمطراز ہیں :

" اصغر صاحب کے تاثرات اپنے مرشد اعلیٰ کے بارے میں مثالی تھے ۔ بسااوقات ان کا ذکر کسی (نہ کسی) تقریب سے ہم دونوں طالبوں کے سامنے کرتے تھے ۔ ہمیشہ اٹھ کے بیٹھ جاتے تھے اور محبت کسی لہریں احترام کے ساتھ ، چہرے پر، ذکر کرتے وقت دوڑنے لگتی تھیں ۔ بہت سی چشم دید کرامات قاضی عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کی میں نے اصغر کی زبانی سنی ہیں[2] ۔"

جناب لطیف احمد صاحب عباسی اپنی ساس، اصغر صاحب کی صاحبزادی ، نعیمی کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ

" باپو (اصغر صاحب) کہا کرتے تھے کہ حضرت صاحب کی وجہ سے بعض ایسی باتیں مجھ پر منکشف ہوئیں جو ان کے بغیر شاید نہ ہوتیں[3] ۔"

ان تمام متذکرہ بالا روایات سے، قاضی صاحب سے اصغر کے عشق و عقیدت کی تصدیق ہوتی ہے ۔ اب اس کی تفصیل جناب اسداللہ کاظمی (قاضی عبدالغنی کے بہت ہی قریبی عزیز غالباً بھتیجے) کی زبانی، نقل کی جاتی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" اصغر کو اپنے مرشد سے گہرا تعلق تھا اتنا گہرا کہ ان کی تمام کائنات کو اسنے بدل ڈالا تھا ۔ یہ تعلق روز افزوں ہوتا رہا ۔ راقم الحروف نے اکثر اصغر کو دیوانہ وار اپنے مرشد کے حضور میں اس انداز سے آتے دیکھا ہے کہ چہرے پر یاس کا گہرا رنگ ، دل و دماغ پر ایک شقل و بے کیفی طاری، تخیل سست و پاشکستہ اور کچھ دنوں کے حضوری کے بعد چہرے پر زندگی کی حرارت کا غازہ ، دل و دماغ پر ایک کیف سرمدی ، تخیل میں بلندپروازی و رعنائی غرضیکہ اصغر کی ساری دنیا جاگ اٹھتی تھی[4] ۔"

۱۔ گفتگو جناب مولانا عبدالغنی صاحب نرگس ۔ راولپنڈی ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء

۲۔ مکتوب جناب علی ظہیر بنام راقم مقالہ مرقومہ ۲ ستمبر ۱۹۷۰ء

۳۔ گفتگو جناب لطیف احمدعباسی ۔ راولپنڈی ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء

۴۔ اصغر مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۶۲

مجاھد کاظمی صاحب نے فانی صاحب اور اصغر کے تعلقات کی جو تصویر کھینچی ھے اس کی صرف دو سطریں یہاں پیش کی جاتی ھیں ۔ وہ لکھتے ھیں :

" عجیب بات یہ تھی کہ ان کے قریبی مرید جو ان کی خدمت میں
رہتے تھے کچھ عرصہ بعد ان کے ھم شکل ھو جاتے تھے ۔ اصغر
گونڈوی میں ان کی کافی مشابہت تھی [1] ۔"

آخر یہ یک رنگی عشق کے سوا اور کس چیز کی تھی ؟۔

مختصر یہ کہ اصغر کے کلام میں محبوب کا تصور بہت ھی پاکیزہ، معصوم و مقدس ھے ۔ شاید اردو میں کسی اور شاعر کے یہاں ایسا نہیں ھے (درد اور مرزا مظہر کے یہاں بھی مجاز کا رنگ خاصا گہرا ھے، اوروں کا تو ذکر ھی کیا) ---- " محبوب " کی حیثیت متعین اور تصور واضح ھو جانے کے بعد ، عاشق کی حیثیت خود بخود متعین ھو جاتی ھے ۔ اسی لیے ان کے یہاں محبوب سے تخاطب میں عقیدت و احترام ، عجز و نیاز ، آرزوئے فراواں و شوق بیتاب ھے مگر حفظ مراتب کی نزاکتیں لیے ھوئے، جذبۂ سرشاری و خواھش دید ھے لیکن محبوب کے مقام بلند اور اپنی کم مرتبگی اور کم مائیگی کے احساس کے ساتھ ---- ان تمام کیفیات میں عبودیت ، بندگی ، نیازمندی ، ذوق پرستش ، حسن نیاز کی شدت و حدت موجود ھے --- ان کی مثالیں الگ الگ عنوان کے تحت پیش کرنے کے بجائے یک جا پیش کی جاتی ھیں مزید تفصیل " مرشد کے متعلق اشارات " میں نظر آئے گی (باب شخصیت و شاعری ص ۱۵۱) یہ تمام اشعار روا روی میں منتخب کیے گئے ھیں اور بلا کسی ترتیب کے پیش کیے جا رھے ھیں ۔ ان اشعار میں جذبہ کی جو شدت و معصومیت ھے اور اس کو جس خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ھے وہ اردو شاعری کے لیے ھمیشہ سرمایۂ افتخار رھے گا ۔ اور یہ اشعار عشق کی دنیا میں ھمیشہ قدر کی نگاھوں سے دیکھے جائیں گے ۔ انتخاب اشعار :

مقام محبوب اور طریق عاشقی :

حریم ناز کے آداب اور ھیں اصغر
نیاز رکھ کے بھی عرض نیاز رھنے دے

یہ بارگاہ حسن ادب کا مقام ھے
جز درد و اشتیاق تقاضا نہ چاھیے

مجھ پہ نگاہ ڈال دی اس نے ذرا سرور میں
صاف ڈبو دیا مجھے موج مے طہور میں

تیری ھزار برتری تیری ھزار مصلحت
میری ھر اک شکست میں میرے ھراک قصور میں

۱۔ العلم کراچی اپریل تا جون ۱۹۶۳ء ---- حاشیہ ۔ ص ۸۵ --- ایک ذاتی تحریر جناب مجاھد کاظمی ۔

اس آستاں سے اٹھائی نہ پھر جبیں میں نے — حرم میں سجدۂ پیہم تھی ایک دردِ سری
یہ آستانِ یار ہے صحنِ حرم نہیں — جب رکھ دیا ہے سر تو اٹھانا نہ چاہیے
بے نیازی کو تری کچھ بھی پذیرا نہ ہوا — شکر اخلاص مرا شکوۂ باطل ٹھہرا
اس حریم قدس میں کیا لفظ و معنی کا گزر — پھر بھی سب باتیں پہنچتی ہیں لبِ فریاد کی
مری نگاہوں نے جھک جھک کے کردیے سجدے — جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا
آنکھوں میں تیری بزم تماشا لیے ہوئے — جنت میں بھی ہوں جنت دنیا لیے ہوئے
در پہ جو تیرے آ گیا اب نہ کہیں مجھے اٹھا — گردش مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں
اب وہ زماں نہ وہ ماں اب وہ زمیں نہ آسماں — تم نے جہاں بدل دیا آ کے مری نگاہ میں
صد زماں و صد مکاں و ایں جہاں و آں جہاں — تم نہ آ جاتے تو ہم وحشت میں کیا کیا دیکھتے
خبر کسی کو نہ ہوگی کنار شوق میں آ — جہاں میں چشم مہ و مہر باز رہنے دے

...

ہے یہ طریق عاشقی چاہیے اس میں بیخودی — اس میں چناں چنیں کہاں اس میں اگر مگر کہاں
اصغر حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہے — رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لیئے ہوئے
پڑا ہے کیا اس کے در پہ اصغر وہ شوخ مائل ہے امتحاں — شہرت دے زندگی کا مرکز نیاز اب کارگر نہیں ہے
اسکو منظور ہیں کچھ قلب و جگر کے ٹکڑے — جیب و دامن نہ کوئی پھاڑ کے دیوانہ بنے
بیٹھا ہے اک خاک نشیں محو بیخودی — کچھ حسن سے غرض ہے نہ پروائے عشق ہے
اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں — محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں
یہ رنگ عاشقی ہے سود و حاصل دیکھنے والے — یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے
جنوں عشق میں ہستی عالم پر نظر کیسی — رخ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے
کامیاب شوق کی ناکامیوں کو دیکھئے — حرف مطلب محو ہے جوش دعا کے سامنے

رنگ مجاز :

یہ بحث تشنہ و نامکمل رہ جائے گی اگر اصغر کے کلام سے " رنگ مجاز " کے اشعار کا بھی تجزیاتی جائزہ نہ لیا جائے ۔۔ آئندہ سطور میں " رنگ مجاز " ہی سے بحث کی جائے گی ۔

کلام اصغر میں ، انتہائی کشادہ دلی سے انتخاب کے باوجود ، رنگ مجاز کے اشعار کی مجموعی تعداد ۳۷ نکلی ۔ جن میں ۲۸ اشعار " نشاط روح " میں ملے اور صرف ۹ " سرود زندگی " میں (ممکن ہے باوصاف شعر اور نکل آئیں) ۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اصغر جوں جوں شباب سے شیب کی طرف بڑھے ہیں جسم کی رنگینی ، روح کے کیف و سرشاری

میں منتقل ہوتی گئی ہے یہاں تک کہ " سرود زندگی" میں ایک ایسا دور آ گیا ہے جہاں جسم بالکل غائب ہو گیا ہے اور صرف روح ہی روح رہ گئی ہے ۔ اس دور کی شاعری حقائق و معارف کی شاعری ہے لیکن وہ حقائق و معارف کے بیان میں بے کیفی پیدا ہوتی ہے وہ خالص صوفیانہ واردات کے بیان نہیں ——— رنگینی بیان، جوش و تپش ، درد و گداز ——— ہر جگہ قائم و باقی رہتے ہیں ۔

جن اشعار کا ذکر کیا گیا ہے، اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو انھیں تین مختلف اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

(۱) عام خطاب :

ایسے اشعار جن میں " مطلق حسن " کا ذکر و بیان ہے ——— ان اشعار کا مرجع دنیاوی محبوب (رسمی و روایتی بھی اور گوشت و پوست کا زندہ انسان) بھی ہو سکتا ہے اور روحانی محبوب بھی (مرشد و رسول صلعم) ان میں جسم و روح کی وہ تڑپ اور للک ہے جو عاشق کے لیے حصول محبوب کی راہ میں ناگزیر ہے ۔ یہ کیفیت عشق مجازی و حقیقی میں یکساں ہوتی ہے ۔ اس لیے ان اشعار کو خالصتاً " مجازی " نہیں کہا جا سکتا ، ہاں اگر ان کا مرجع " محبوب مجازی " کو بھی تسلیم کیا جائے جس کی گنجائش اشعار میں موجود ہے ، تو وہ صرف یہ کہ اس سے کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی، بلکہ شعر کا کیف و اثر بڑھ جاتا ہے ۔ اشعار درج ذیل ہیں :

۱۔ وہ مست شاہد رعنا، نگاہ سحر طراز — وہ جام تبسم شبی نرگس خمار آلود
۲۔ تری نگاہ کے صدقے یہ حال کیا ہے مرا — کمال ہوش کہوں یا کمال بے ہوشی
۳۔ مے خانہ کی ایک روح مجھے کھینچ کے دے دی — کیا کر دیا ساقی نگہ ہوش ربا سے
۴۔ شیشے میں موج مے کو یہ کیا دیکھتے ہیں آپ — اس میں جواب ہے اسی بسرق نگاہ کا
۵۔ اب تو یہ ٹھا ہے کسی کو بھی نہ دیکھیں — صورت جو دکھا دی ہے تو لے جاؤ نظر بھی
۶۔ نہ یہ شیشہ نہ یہ ساغر، نہ یہ پیمانہ بنے — جان مے خانہ تری نرگس مستانہ بنے
۷۔ قرباں تری مے کشی، ہاں اے نگہ ساقی — تو صورت مستی ہے تو معنی مے خانہ
۸۔ تبسم کی ادا سے زندگی بیدار ہو جائے — نظر سے چھیڑ دے رگ رگ میں ہشیار ہو جائے
۹۔ ہر جنبش نگاہ تری ، جان آرزو — موج خرام ناز ہے ایمان آرزو
۱۰۔ سحر لائے گی کیا پیغام بیداری شبستاں میں — نقاب رخ الٹ دو خود سحر بیدار ہو جائے

مذکورہ بالا اشعار کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ دس اشعار میں سے آٹھ اشعار ایسے ہیں جن میں " نگاہ سحر طراز " اور "نرگس خمار آلود "

کا ذکر ہے ۔ اگرچہ اشعار کے صوری لب و لہجہ میں سمت و رخ کا تعین نہیں ہے ---- اور " رجوع بہ مجاز " کا پہلو بھی موجود ہے ---- تاہم جب متذکرہ اشعار کا مطالعہ اس تاریخی حقیقت کی روشنی میں کیا جاتا ہے کہ

" ان (قاضی عبدالغنی) کی آنکھوں میں سرخی تھی ۔ اور یہ سورۂ مزمل کے ورد کا اثر تھا ۔"[1]

تو رخ کے تعین میں کوئی دشواری نہیں رہ جاتی ۔

(۲) ادائے حسن ---- ظاہری کیفیت محبوب اور تاثر عاشق :

ایسے اشعار جن میں " حسن مجازی " کے کسی حسین منظر یا ادا کی تصویرکشی بڑے شاعرانہ انداز میں کی گئی ہے ۔ اس قسم کے اشعار میں محبوب کے جسمانی یا مادی حسن کا اظہار رنگین و رقصاں تشبیہات کے ذریعہ کیا گیا ہے ۔ لیکن جسمانیت و نفسانیت کہیں نہیں ہے ۔ بلکہ تشبیہہ میں " لطیف اشیائے فطرت " کی طرف رخ ہے ، اس میں حسن ، دلکشی اور معصومیت پیدا کر دی ہے ۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس کی توضیح و تفہیم کے لیے اشعار نقل کیے جاتے ہیں :

۱۔ اٹھے عجب انداز سے وہ جوش غضب میں　　چڑھتا ہوا اک حسن کا دریا نظر آیا

۲۔ مستی میں فروغ رخ جاناں نہیں دیکھا　　سنتے ہیں بہار آئی گلستاں نہیں دیکھا

۳۔ زاہد نے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا　　رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

۴۔ رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی　　شعاعیں کیا پڑیں ، رنگت نکھر آئی گلستاں کی

۵۔ یہ دیکھتا ہوں ترے زیر لب تبسم کو　　کہ بحر حسن اک موج بےقرار نہ ہو

۶۔ اس کا وہ قد رعنا اس پر وہ رخ رنگیں　　نازک سا سر شاخ اک گویا گل تر دیکھا

۷۔ لالہ و گل پہ جو ہے قطرۂ شبنم کی بہار　　رخ رنگیں پہ جو آئے تو حیا ہو جائے

۸۔ بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشم مست پر　　ہلکا سا ابر بھی سر میخانہ چاہیے

۹۔ یہ حسن کی موجیں ہیں یا جوش تبسم ہے　　اس شوخ کے ہونٹھوں پر اک برق سی لرزاں ہے

۱۰۔ میں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی　　یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں ہنسا دیا

۱۱۔ روشنی ہو جگنو کی جیسے شبستان میں　　وہ مہتاب کا عالم اس کے مسکرانے سے

۱۲۔ ہے سراپا حسن وہ رنگیں ادا جان بہار　　حسن پر حسن تبسم صبح خندان بہار

۱۔ ~~تاریخ مشائخ چشت~~ تذکرہ مشائخ دیوبند ۔ مولفہ مولانا مفتی عزیز الرحمن ۔ مدینہ پریس بجنور بار دوم ۱۹۶۷ء ۔ ص ۶۲

یہ تمام شعری پیکر تحسساتی ہیں ۔ ان میں کوئی "حسین انسان" جسم کی تمام تر دل کشیوں اور تابانیوں کے ساتھ قاری کی چشم تخیل کے سامنے آتا ہے ۔ لیکن اس " سراپائے زیبائی " کی کسی ایک ادا پر نگاہ مرکوز ہوتی ہے ۔ قاری کی نگاہ مادی حسن سے اور تخیل رنگین و رقصاں تشبیہات سے لطف لینے لگتے ہیں تخیل کی کارفرمائی اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ جسم نظروں سے اوجھل ہو کر تصور کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اب قاری بھی طرح تشبیہات میں گم ہو جاتا ہے ۔ جوں جوں وہ ان کی گرہیں کھولتا جاتا ہے، اس کے دل و دماغ پر تعجب آمیز مسرت مستولی ہوتی جاتی ہے ۔ لیکن ان تشبیہات کی تہ تک پہونچنے کے لیے قاری کا تخیل بلند ، طبیعت لطیف اور دماغ نفسیات انسانی کا رازداں و رمزشناس ہونا چاہیے ----- مثلاً " قد رعنا پر رخ زیبا " کو " سرشاخ اک گل تر " حسن برہم " کو " چڑھتا ہوا دریا " " تبسم زیر لب " کو " بحر حسن کی موج بے قرار " اور " جوش تبسم کو " حسن کی موجیں اور " برق ارزاں " کہنا ، جدت ، لطافت اور رنگینی کے ساتھ ساتھ ، بڑی معصومیت اور نفسیات انسانی کی گتھی بصیرت لیے ہوئے ہے ۔ بعض اشعار کی طرف ہلکے ہلکے اشارے سے ، جو کچھ کہا گیا ہے ، واضح ہو جائے گا ۔

مقالہ ھذا میں پہلے چوتھے اور گیارھویں شعر کی تشریح (پاکیزگی و طہارت ص ۱۵۵۔۱۵۹ اور توازن و سنجیدگی ص ۴۶۸) کے تحت ، کی گئی ہے ۔ یہاں صرف پانچویں ، چھٹے اور نویں شعر کی طرف ، اشاروں پر اکتفا کی جاتی ہے ۔

شعر نمبر۵ یہ دیکھتا ہوں تری زیر لب تبسم کو

کہ بحر حسن کی اک موج بے قرار نہ ہو

اس شعر میں " زیر لب تبسم " معصومیت کی کان ہے ۔ اس سے شاعر حسن کی سنجیدہ ، پرتمکین اور لطیف طبیعت کی اس کیفیت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے جس کے زیر اثر ابتہاجی کیفیت اظہار چاہتی ہے ، لیکن مسرت کی لہریں بطون ہی میں اٹھ اٹھ کر رہ جاتی ہیں ، سطح ظاہر پر نہیں آ پاتیں ---- ضبط و سنجیدگی کی گرفت سے بچ بچا کر کوئی لہر نمودار اگر ہو جاتی ہے تو " تبسم زیر لب " کی " موج لطیف " سے آگے نہیں بڑھ پاتی ---- ایسے ہی جیسے سمندر کی تہ میں مچلتے ہوئے طوفانوں کو ، اس کی گہرائی اور عمق سے نہ معلوم کتنی نبرد آزمائیوں کے بعد ایک " موج بیقرار " کی شکل میں ظاہر ہونے کا موقع مل پاتا ہے ۔

شعر نمبر۶ " اس کا وہ قد رعنا اس پر وہ رخ رنگیں

نازک سا سرشاخ اک گویا گل تر دیکھا "

بہار کی آمد آمد ہے ۔ چھتنے ہوئے گلاب کے پودے میں ، لمبی لمبی ، نرم و نازک ، لچکیلی شاخیں پھوٹنے لگی ہیں ۔ سارا درخت کلیوں سے لد گیا ۔ ان میں ایک شاخ جو سب سے

زیادہ لمبی ، نازک اور لچکیلی ہے ، اسکے سرے پر ایک بڑا سا سرخ پھول کھلا ہے ۔ پھول کے بوجھ سے شاخ خم کھا گئی ۔ ہوا کے لطیف جھونکے سے شاخ جھوم جاتی ہے --- اس منظر کو ذہن میں رکھ کر ، کسی نازک اندام ، خوش قامت ، گل چہرہ محبوب کا تصور ذہن میں قائم کیجئے ---- جس کا قد اپنے ہی حسن کے بار سے خم کھا گیا ہے ۔ جب وہ شگفتہ و بشاش چہرے کے ساتھ نرم نرم قدم اٹھاتا ہے تو اور اس کا جسم ہوا میں لہرانے لگتا ہے تو

" نازک سا سر شاخ اک گل تر "

کی کیفیت مجسم ہو کر نظروں کے سامنے آ جاتی ہے ۔

شعر نمبر ۱۱ یہ حسن کی موجیں ہیں یا جوش تبسم ہے

اس شوخ کے ہونٹوں پر اک برق سی لرزاں ہے

اس شعر کی فضا پانچویں شعر سے قدرے مختلف ہے ۔ یہ زیادہ شوخ و رنگیں ہے ۔ اس میں مسرت و شادمانی کی قابو یافتہ (گھٹی ہوئی) کیفیت سے چہرے پر پیدا ہونے والے تاثرات کی عکاسی کی گئی ہے ---- ایک حسین شخص کے اندر ابتہاجی کیفیت کا جوش امڈا آ رہا ہے لیکن تمکین حسن و متانت طبع روک بن جاتے ہیں ۔ کوئی ہلکا سا انبساط چہرہ پر آ جاتا ہے لیکن فوراً ہی ضبط و متانت کی صورت چھا جاتی ہے ۔ ذرا دیر کے بعد پھر بشاشت و شگفتگی کا دور پھیل جاتا ہے ۔ پھر متانت و سنجیدگی کی بے کیفی ۔ آخر صورت کی اس گہری تاریکی میں سے " تبسم لطیف " کی " برق لرزاں " نمودار ہوتی ہے ------ اسی طرح جیسے " لرزش " سے پہلے " برق " فضا میں دیر تک نور و تاریکی کا جال بنتی رہتی ہے اور جب تاریکی گہری ہو جاتی ہے تو " موج نور " بکھیرتی ہوئی فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے --- تبسم بھی اسی طرح ہونٹوں پر لرز کر غائب ہو جاتا ہے ۔ مزید غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بجلی جہاں چمکتی ہے ، اسکے چاروں طرف دیر تک کرنیں لپکتی بجھتی رہتی ہیں ۔ پھر کہیں بیچ میں اک " موج نور " مچلتی ہے ۔ اسی طرح چہرے پر شگفتگی کے نور کی کرنیں وقفہ وقفہ کے بعد پھیلتی سکڑتی رہتی ہیں ۔ آخر میں " وسط بشرہ " پر " برق تبسم " لرزتی ہے ۔ بشبیہہ یہیں ختم نہیں ہوگئی ۔ ایک لطیف اشارہ اس میں یہ بھی پنہاں ہے کہ " چہرۂ محبوب " کی انبساطی کیفیت مستقل اور دیرپا نہیں ہے ، بلکہ وقفہ وقفہ کے بعد نمودار ہوتی ہے ، ہر لہر کے ساتھ حسن دمک اٹھتا ہے ۔ اس غیر مستقل اور وقفہ دار کیفیت ابتہاج کو " حسن کی موجوں " سے تعبیر کرنا بلاغت کی جان ہے ۔ ان تشبیہات پر جتنا غور کیجئے شاعر کی قوت مشاہدہ کی تیزی ، طبیعت کی رنگینی ، شاعرانہ مہارت اور اظہار و ابلاغ پر قدرت کا قائل و معترف ہونا پڑتا ہے ۔

(۳) معاملہ ـــ حسن و عشق کا خفیف کیفیاتی ردو بدل :

لیکن شاعر کی کی رنگینی طبع ، لطافت مزاج ، نفسیات انسانی کی رمزشناسی ، ذکاوت اور نکتہ رسی کا صحیح اندازہ ان " شعری تصویروں " میں ہوتا ہے جہاں وہ عشق کی چھیڑ سے حسن کے باطن میں پیدا ہونے والی کیفیات کی عکاسی کرتا اور نفس کے لطیف تموج سے " بشرہ " پر ظاہر ہونے والے نازک تاثرات کی تصویرکشی کرتا ہے یا حسن کی دید سے عشق پر گزرنے والی کیفیت کا ذکر کرتا ہے۔ ذیل میں اسی قبیل کے اشعار درج کیے جاتے ہیں :

۱- ہو نور پہ کچھ اور ہی اک نور کا عالم ... اس رخ پہ جو چھا جائے مرا کیف نظر بھی

۲- کچھ دعوی تمکیں میں ہے معذور بھی زاہد ... مستی میں تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

۳- جلوۂ رنگیں اتر آیا نگاہ شوق میں ... ہم لطافت جسم کی اے سیم تن دیکھا کئے

۴- تمتما اٹھے وہ عارض میرے عرض شوق پر ... ان گلوں کو چھیڑ کر میں نے گلستاں کر دیا

۵- کچھ نہ ہم سے ہوسکا اس اضطراب شوق میں ... ان کے دامن کو مگر اپنا گریباں کر دیا

۶- عارض نازک پہ ان کے رنگ سا کچھ آگیا ... حسن جاگ اٹھا وہیں ، جب عشق نے فریاد کی

۷- پھر ان لبوں پہ "برق تبسم" ہوئی عیاں ... سامان جوش رقص تمنا لئے ہوئے

۸- اس عارض رنگیں پر عالم وہ نگاہوں کا ... معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

۹- رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق تبسم بھی ... لہریں سے جو اٹھتی ہیں کچھ چشم تماشا سے

۱۰- سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا ... جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

۱۱- اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو ... خود کو آزما بیٹھے مجھکو آزمانے سے

۱۲- ستم کے بعد اب ان کی پشیمانی نہیں جاتی ... نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

۱۳- ہاتھ میں لے کے جام نے آج وہ مسکرا دیا ... عقل کو سرد کر دیا روح کو جگمگا دیا

۱۴- رقص مستی دیکھتے جوش تمنا دیکھتے ... سامنے لا کر تجھے اپنا تماشا دیکھتے

۱۵- ستم دید کو کہتے ہو آئینہ ذرا دیکھو ... خود حسن نکھر آیا اس کیف تماشا سے

ان اشعار میں " حسن و عشق " کے جن نفسی کیفیات کا اظہار ہے وہاں تک عام نظریں نہیں پہنچ پاتیں ۔ ان کا کمال یہی ہے کہ ان میں صوریت بھی ہے ، معصومیت بھی ، ندرت بیان بھی ہے اور مشاہدہ کی بصیرت اور تجربے کی صداقت بھی ۔ ان اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصغر حسن و عشق کے کس درجہ رمزشناس تھے ۔ جن لوگوں نے ان کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ

" اس کا محبوب دنیائے آب و گل سے ماورا ہے [1]۔"

۱- اصغر کی شاعری از خواجہ احمد فاروقی ۔ اصغر مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۱۵۶

یا یہ کہ

" وہ دنیا کے لوگوں سے جذباتی تعلق پیدا کرنے اور ان میں جذباتی
دلچسپی لینے سے معذور تھا [1]"

--- انھیں یقیناً" اصغر کے ان اشعار کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے پر نظرثانی کرنا پڑے گی--
وہ " اصغر جذباتی دلچسپی لینے سے معذور تھے " اور " وہ ان کا محبوب صرف وہ ہستی تھی
" جو دنیائے آب و گل سے ماوراء ہے " - بلکہ ان کے محبوب اسی دنیائے " آب و گل " کی
ہستیاں تھیں (رسول - مرشد) - ہاں یہ ضرور ہے کہ محبوب سے ان کا جذباتی تعلق
صرف روحانی تھا - یا زیادہ سے زیادہ " لذت نظر " اور " ضیافت نگاہ " کا انھوں نے مذکورہ بالا
اشعار میں جو تصویریں کھینچی ہیں وہ خالصتاً" اسی دنیائے آب و گل کی ہیں جو مادی ہونے
کے باوجود بڑی پاکیزہ ہیں - یہی تو اصغر کی انفرادیت ہے کہ اردو شاعری میں ان کے
علاوہ ، مادی حسن کی اتنی رنگین ، معصوم اور پاکیزہ تصویریں کسی اور نے نہیں بنائیں -

سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی وضاحت و شہادت میں چند اشعار
کی تشریح ضروری ہے - میرے نزدیک ایک آدھ شعر کے علاوہ تمام کے تمام اشعار " حسن مجازی "
سے متعلق ہیں - ان کا مرجع کسی اور کو قرار دینا تغزل و معنویت کا خون کرنے کے مترادف
ہوگا - (چوتھے ، پانچویں ، چھٹے اور آٹھویں شعر پر اسی مقالے میں
روشنی ڈالی جا چکی ہے ، یہاں دوسرے اشعار کی تشریح کی جاتی ہے :

شعر نمبر ۱ ہو نور پہ کچھ اور ہی اک نور کا عالم
اس رخ پہ جو چھا جائے مرا کیف نظر بھی

اس شعر میں ایک نفسیاتی نکتہ واضح کیا گیا ہے - نکتہ یہ ہے کہ اگر کسی " حسین "
کو پرکیف نظروں سے دیکھا جائے اور اسے اس کا احساس ہو جائے کہ کوئی " آرزو مندانہ "
اور " پرلذت " نظروں سے دیکھ رہا ہے تو شرم و حیا کی سرخی اور پریشانی و اضطراب کے
آثار ، مل جل کر ، اسکے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں --- " حسن " پر " کیف نظر " کا
حسن ، چہرۂ محبوب کو نور علی نور کر دیتا ہے --- شعر میں لفظ " چھا جانا " بڑی گہری
معنویت کا حامل ہے - ایک طرف اس میں عاشق کی " بے باک نگاہی " کا پہلو ہے دوسری طرف
محبوب میں ، بے باک نگاہی " کے شدید احساس کا - اس احساس شدید سے جبین و رخسار
گل نار اور نم آلود ہو جاتے ہیں - جنھیں دیکھ کر شبنم میں بھیگے ہوئے گل و لالہ کا سماں
آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے ؎

گل و لالہ پہ جو ہے قطرۂ شبنم کی بہار رخ رنگیں پہ جو آئے تو حیا ہو جائے

۱- اصغر گونڈوی کی شخصیت اور شاعر از مظہر عزیز - ساقی دہلی دسمبر ۱۹۴۱ء - ص ۲۶

شعر نمبر ۱۵ تم دید کو کہتے ہو، آئینہ ذرا دیکھو

خود حسن نکھر آیا اس بہت تماشا سے

اس شعر میں بنیادی خیال تو وہی ہے کہ " دید " سے " حسن " میں دلکشی آ جاتی ہے - مگر ساتھ ہی حسن کے اس فطری جذبہ کا بھی اظہار ہے کہ کوئی " گستاخ نظروں " سے کیوں دیکھتا ہے - چنانچہ محبوب عاشق کی بے باک نگاہی پر معترض ہے اور اسے متنبہ کرتا ہے - عاشق جواباً کہتا ہے میری خطا؟ میری دید نے تو تمہارے حسن میں نکھار پیدا کر دیا یقین نہ آئے تو آئینہ دیکھ لو ------ شعر میں " آئینہ ذرا دیکھو " کہ تہ داری غور طلب ہے -

(۱) " آئینہ ذرا دیکھو " ----- تم ہمیں دیکھنے سے روکتے ہو ، اپنا منہ تو ذرا آئینے میں دیکھو ہمیں نے " دلبر " بنایا ہمیں پر قدغن - پھر پیار پچکار کر ، جانی خفا نہیں ہوتے ، ذرا آئینہ دیکھو " دیکھو ہمارے دیکھنے سے کیسا حسن نکھر آیا ہے - (یہ شوخ نفسی اور بے باک نگاری اگرچہ اصغر کے مزاج کے خلاف ہے لیکن " آئینہ ذرا دیکھو " شعر میں جس رخ سے باندھا گیا ہے - اس سے یہ معنی نکلتے ہیں) -

(۲) " آئینہ ذرا دیکھو " تو تم پر خود ثابت ہو جائے گا کہ کسطرح " دید " سے حسن نکھر آتا ہے --- یعنی عاشق کسی طرح بہلا پھسلا کر ، محبوب کو آئینہ دیکھنے پر آمادہ کرنا چاہتا ہے اس کو یقین ہے کہ آئینہ دیکھ کر محبوب خود اپنے حسن پر فریفتہ ہو جائے گا اور اس احساس سے کہ " میں کتنا حسین " ہوں ، اس کا حسن اور نکھر آئے گا - اور عاشق کا دعویٰ کہ " کثرت نظر سے حسن نکھر آیا ہے " صحیح ثابت ہو جائے گا ----- اسکے بعد عاشق کو " دید " کی اجازت مل جائے گی - یہی عاشق کا مقصد ہے (اس معنی میں مومن کا سا شاعرانہ پیدا ہو گیا ہے) الفاظ کی یہ تہ داری اور معنی کی یہ نزاکتیں ، یقیناً غالب اور مومن کی خصوصیات ہیں -

شعر نمبر ۷ پھر ان لبوں پہ برق تبسم ہوئی عیاں

سامان جوش رقص تمنا لئے ہوئے

اس شعر میں ایک دوسرے نکتہ کی گرہ کشائی کی گئی ہے - یہ نفسیاتی حقیقت ہے کہ محبوب کے سامنے " رعب حسن " سے عاشق کی زبان نہیں کھلتی - تمنائیں اندر ہی اندر گھٹ کے رہ جاتی ہیں - لیکن محبوب کی مسکراہٹ عاشق کے رویہ پر اظہار خوشنودی اور اس کی ہمت افزائی کا سبب بن جاتی ہے - اور ایک بار جھجک نکل جائے تو تمنائیں مچلنے لگتی ہیں اور ان کے جوش و سیلاب کے لیے کوئی روک نہیں ہوتی ---- اس شعر میں لفظ " پھر " ایک طرف تواتر و تسلسل کی طویل داستان لیے ہوئے ہے - دوسری طرف محبوب کے ضبط و متانت

کی ---- یعنی وہ عاشق کو اپنی بارگاہ میں بے جھجک نہیں ہونے دیتا اور نہ اس " ربط خاص " کو مسلسل و غیر منقطع بنانا چاہتا ہے - بلکہ بیچ بیچ میں تمکین حسن سے " عاشق خوش اوقات " کو اسکی " اوقات " کا احساس دلاتا رہتا ہے ---- لیکن جوں ہی اس میں (عاشق) مایوسی و بے نیازی محسوس کرتا ہے --- پھر " برق تبسم " کی لہروں سے اسکے سارے وجود میں " تعاون " کی رو دوڑا دیتا ہے -- اور یہ " خوش فعلی " برابر جاری رہتی ہے -- ہر " تبسم " " تجدید تمنا " یا " جوش رقص تمنا " کا محرک ہوتا ہے -

شعر نمبر۹ رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق تبسم بھی
لہروں سے جو اٹھتی ہیں کچھ چشم تماشا سے

اس شعر میں ایک دوسرا نفسیاتی نکتہ بیان کیا گیا ہے - " بات تو صرف اتنی ہے کہ محبوب عاشق کی محبت بھری نظر کے جواب میں بطور اظہار خوشنودی ، مسکرا کر دیتا ہے " - لیکن حقیقتاً شعر میں لفظوں کی ترکیب سے جو شعری فضا تیار کی گئی ہے اس میں عاشق و محبوب دونوں کے مزاج کی عکاسی کی گئی ہے - الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محب و محبوب دونوں متین و ضابط ہیں - نہ عاشق " دیدہ پھٹ " ہے نہ محبوب " شوخ چشم " دونوں کے درمیان بٹے لئے دبے انداز میں جذبات محبت کا رد و بدل ہوتا ہے - عاشق بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ " دزدیدہ نظر " سے محبوب کو دیکھتا ہے لیکن اسکی اس " نیم نگاہی " میں بھی خلوص و نیاز کی ایسی " رو " پوشیدہ ہوتی ہے کہ وہ بکراست محبوب کے دل کے تاروں کو مرتعش کر دیتی ہے - اب یہی رو " برق تبسم " بن کر محبوب کے ہونٹوں پر پھیل جاتی ہے --- " چشم تماشا " کی موجودں کا سوال اور " برق تبسم " کا " جواب باصواب " برابر جاری رہتا ہے ---- ادھر سے لہر اٹھی ادھر سے برق چمکی ---- شعر میں لفظ " کچھ " اپنے پیچھے ایک دبائے معنی لئے ہوئے ہے --- یعنی دل عاشق میں خواہش دید کا ایک تلاطم برپا ہے لیکن عشق کی سنجیدگی و متانت اسے دبائے رکھتے ہیں - کوئی حقیر سا شائبہ (کچھ) چشم تماشا تک آ پاتا ہے - لیکن اس حقیر سی موج کی اثر خیزی قابل دید ہے کہ کس طرح " برق تبسم " اس کی پذیرائی کے لیے بے تاب ہو جاتی ہے ---- اسی طرح لفظ " برق " میں " تبسم " کے " موج دور " کے ساتھ " جلا دینے " کی کیفیت بھی پنہاں ہے - " رہ رہ کے " میں عاشق کے لیے یہ اشارہ اور انتباہ ہے کہ اپنی حد سے تجاوز نہ کرنا ورنہ " برق تبسم " برق غضب بھی بن سکتی ہے ---- یہی لفظوں کی وہ گہری معنویت ہے جسکی طرف اصغر نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے :

" میری شاعری خواجہ میر درد کے معانی اور مرزا غالب کے الفاظ کا مجموعہ ہے "[1]

۱- اصغر کے چند ادبی افادات از مولانا سراج الحق - اصغر مرتبہ عبدالشکور - ص ۱۳

اشعار تو تمام ھی تشریح طلب ھیں - لیکن چوں کہ بحث طویل ھو گئی ھے اس لیے اس کو یہیں ختم کیا جاتا ھے - ان اشعار سے یہ واضح ھو جاتا ھے کہ اصغر کے یہاں محبوب کا عام " تصور " یقیناً" روحانیت و تقدس کا پہلو لیے ہوئے ھے - لیکن ان کے متعلق یہ کہنا کہ " وہ لوگوں سے جذباتی تعلق پیدا کرنے اور ان میں جذباتی دلچسپی لینے سے معذور تھے " نہ ان کے واقعات زندگی ھی سے ثابت ھوتا ھے نہ ان کی شاعری ھی سے - انھوں نے زندگی میں دلچسپی لی ھے - تعلقات قائم کیے ھیں لیکن جہاں " محبوب مجازی " سے جذباتی تعلق کا اظہار کیا ھے ایک تو اسے صوفی رنگ بخش کر ، اس کی شدت کم کر دی ، دوسرے اس پر رنگین الفاظ کی ایسی جھلملیاں ڈال دیں کہ ان کے پیچھے چھپے ہوئے معانی تک نگاھیں نہیں پہنچ پاتیں -- ممکن ھے یہاں یہ سوال پیدا ھو کہ چالیس پچاس شعر کی بنیاد پر یہ کہنا کہ ان کے یہاں " رنگ مجاز " بھی ھے درست نہیں - بجا - لیکن اس سے اصغر کے بہترین غزل گو (مومن اسکول ھونے) کے امکانات تو واضح ھو جاتے ھیں - اگر اصغر نے اپنی یہ روش جاری رکھی ھوتی ، جو انھوں نے ۱۹۲۵ء کے قریب ترک کر دی تو بڑے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ھے کہ انتقال تک ، جو گیارہ سال کی طویل مدت بنتی ھے --- وہ اس رنگ میں بھی منفرد ھوتے -- یہاں یہ اشارہ بھی ضروری ھے کہ اگر اصغر اپنے کو " رنگ مجاز " تک محدود بھی کر لیتے ، جب بھی ان کی پسندیدہ وضع کہ میں " پبلک کا شاعر نہیں ، اپنے دل کا شاعر ھوں[1] " نہ جاتی - اس وقت بھی ان کے دل میں اتر کر دیکھنے والے " خواص " ھی ھوتے -

بحث کو ختم کرنے سے پہلے اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری ھے کہ حسب ذیل تین شعر کے علاوہ ؎

(۱) اٹھے عجب انداز سے وہ جوش غضب میں .... الخ

(۲) اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو .... الخ

(۳) ستم کے بعد اب ان کی پشیمانی نہیں جاتی ......الخ

تمام اشعار میں " حسن سرخوش " کی تصویرکشی کی گئی ھے - یعنی ھر شعری تصویر سے جو نقش ابھرتا ھے اس کا مجموعی تاثر " نشاط و سرخوشی " کا ھے - دو شعر ایسے ھیں جن میں " حسن برھم " اور " حسن پشیمان " کی عکاسی ھے - ان میں بھی شاعر کی اندرونی

۱- اصغر کے چند ادبی افادات از مولانا سراج الحق - اصغر مرتبہ عبدالشکور - ص ۱۵

سرخوشی ظاہر ہو گئی ہے ۔ " چڑھتا ہوا دریا " سے پہلے ، " حسن " کا لفظ بڑھا کر " چڑھتے ہوئے دریا " کی خشونت کو " حسن برہم " کی دلکشیوں میں بدل دیا ۔ اسی طرح " دیہیں جاتی ،، کی تکرار اور " نظر کی فتنہ سامانی ،، محبوب کی نظروں کو شوخ و دلربا بنا دیا ہے ۔ یہ اصغر کی شگفتہ مزاجی اور طبعی زندہ دلی کا بین ثبوت ہے ۔

~~اصغر کے نظریات شعر، ان کے خصوصیات اور ان کی روشنی میں ان کی شعر پر تبصرہ اگلے باب میں کیا گیا ہے ۔~~

......

باب ششم

شخصیت اور شاعری

صفحہ

	صفحہ
۱۔ شخصیت اور شاعری کا ربط	۴۲۷
۲۔ اصغر کی شخصیت کے بنیادی خد و خال :	
(الف) طہارت و پاکیزگی	۴۲۹
(ب) رنگینی طبع و نفاست پسندی	۴۳۱
(ج) جذب و کیف و والہانہ از خود رفتگی	۴۳۳
(د) توازن و سنجیدگی	۴۳۴
(ہ) حیا و بے نفسی	۴۳۵
(و) مسرت و طمانیت	۴۳۶
(ز) اجتہاد	۴۳۷
۳۔ شاعری میں شخصیت کی جلوہ گری :	
(الف) ماضی کی حسین یادیں	۴۳۸
(ب) مرشد کے متعلق اشارات	۴۵۱
(ج) شخصیت کے بنیادی خد و خال : (طہارت و پاکیزگی، رنگینی طبع، جذب و کیف، توازن و سنجیدگی، حیا و بے نفسی، مسرت و طمانیت، اور اجتہاد) کی شاعری میں جھلک	۴۵۵
۴۔ اسلوب و انداز :	
(الف) شخصیت کے بنیادی عناصر (محولہ فوق) کا اسلوب پر اثر	۴۸۹
(ب) شائستہ لہجہ	۴۹۷
(ج) تشبیہات و استعارات	۵۰۴
(د) غالب کا اثر — فارسی تراکیب	۵۱۸
(ہ) نظریات شعری کا اسلوب پر اثر	۵۲۸

ادب میں یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کہ " شاعری میں شخصیت کا اظہار ہوتا ہے "
ںقادوں کا ایک گروہ اس کا منکر ہے - وہ کہتا ہے کہ " شاعری شخصیت کا اظہار نہیں،
اس سے فرار ہے " - ٹی ایس ایلیٹ تو یہاں تک کہتا ہے کہ

" شاعر کے پاس اظہار کے لیے کوئی شخصیت نہیں ہوتی بلکہ اس
کے پاس شخصیت کے بجائے ایک ذریعہ یا واسطہ ہوتا ہے جو ...
... کسی عنوان شخصیت نہیں کہلا سکتا - واسطہ یا ذریعہ
اسکے تاثرات اور اس کے تجربات کو مخصوص اور غیر متوقع طریقوں
پر ملا سکتا ہے - وہ تاثرات و تجربات جو انسان کے لیے اہم
ہیں - اس کی شاعری میں کوئی جگہ نہیں پائیں گے اور جو
تاثرات و تجربات اسکی شاعری میں اہم بن جاتے ہیں وہ اس کی
ذات ، اسکی شخصیت پر .... برائے نام طور پر اثرانداز
ہوں گے -[1] "

اسی مضمون میں آگے چل کر وہ کہتا ہے :

" شاعری شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ فرار ہے -[2] "

اسکے برعکس ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ

" فن کار کی شخصیت اسکے فن پارے میں روح کی طرح رواں دواں
اور پوشیدہ و نہاں ہوتی ہے - "

اس کا کہنا ہے کہ

" ادیب یا ...... فن کار ارتقاء کے کسی اسٹیج پر

۱- روایت اور انفرادیت - ٹی ایس ایلیٹ مترجمہ باقی صدیقی - سویرا لاہور جلد ۱۸،
۱۷، ص ۱۶۲
۲- ایضاً - ص ۱۶۳

اظہار کے غیر شخصی آلے (Impersonal
Instrument) نہیں ہوتے -"[1]

یعنی شخصیت ادب پاروں میں ظاہر ہوتی ہے -

ڈاکٹر عبادت بریلوی ٹی ایس ایلیٹ کے مضمون پر محاکمہ کرتے ہوئے ، واضح الفاظ میں اس حقیقت کا اقرار و اعتراف کرتے ہیں - وہ کہتے ہیں :

" انفرادیت جسکے بغیر ادب اور فن اپنی اصل صورت اختیار نہیں کر سکتے درحقیقت شخصیت کے اظہار کا نام ہے - ہر فنی تخلیق میں یہ شخصیت مختلف راہوں سے اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے -"[2]

محولہ بالا دونوں دعووں میں سے کون سا دعویٰ صحیح ہے ، اس پر رائے دینے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ شخصیت سے کیا مراد ہے -

شخصیت کیا ہے؟

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ ہر فرد میں اس کا ایک " ذاتی تشخص" ایک " میں " ایک " اندرونی قوت " ہوتی ہے ، جو اسے باہر کی وسیع دنیا کے اثرات کا جواب دینے اور اندرونی کیفیات کے اظہار کی محرک ہوتی ہے - اس کا یہ " ذاتی تشخص" ان جواہر تخلیق (Genes) کا کرشمہ اور نتیجہ ہوتا ہے ، جو اسے وراثتاً ان تولیدی خلیوں سے حاصل ہوتے ہیں ، جو اسکے والدین کے کسی مخصوص ذرہ"فنی اور بیضہ کے اتصال سے ، اسکے وجود کا سبب بنتے ہیں - " یہی جواہر تخلیق اس کی نشوونما اور بالیدگی کی (ذہنی ، جذباتی اور جسمانی) صلاحیتوں کو محدود و متعین کرتے ہیں -"[3] ------ یعنی اس فرد خاص کی " انفرادیت و تشخص " کو سمت و رخ دیتے ہیں -

اسکے علاوہ فرد اپنے ماحول اور معاشرے میں پھیلے ہوئے خیالات و افکار اور مراسم و اعمال میں سے اپنے لئے زندگی کا مخصوص نقطۂ نظر، حیات و کائنات کے متعلق مخصوص فلسفہ فکر اور عادات و اعمال کا مخصوص نظام قبول کرکے اپنے " تشخص ذاتی " کی تشکیل ،

۱- روایت اور انفرادیت - ٹی ایس ایلیٹ پر محاکمہ از ظہیر کاشمیری ، سویرا جلد ۱۸، ۱۷ ص ۱۸۳

۲- ایضاً ------ محاکمہ از ڈاکٹر عبادت بریلوی ، سویرا جلد ۱۸، ۱۷، ص ۱۸۳

۳- معاشرتی نفسیات از رہنمولف سیلر اور علاء الدین اختر- مطبوعہ مجمع البحرین لاہور طبع اول ۱۹۵۸ء - ص ۸۲

تعمیر و تہذیب کرتا رہتا ہے ۔ " تشخص " کی تشکیل و تہذیب ، کا یہی پورا نظام ، جو اسکے قول ، فعل ، تحریر ، تقریر اور دیگر حرکات و سکنات سے تشکیل پاتا ہے ، اسکی شخصیت کا اظہار ہے ۔ بالفاظ دیگر اسکو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرف فرد کی مزاجی اور نفسی کیفیات ، احساسات و جذبات اور ذہن و ادراک کا خلقی نظام ہوتا ہے، دوسری طرف معاشرے سے حاصل کردہ فلسفۂ زندگی (حیات ، کائنات اور خالق کائنات سے متعلق فلسفۂ فکر و عمل) ---- ہوتا ہے ۔ انہیں دونوں (اندرونی اور بیرونی) نظامات کے تاثر و تاثیر اور تعمل و تعمیل سے ، کسی فرد کی شخصیت پروان چڑھتی ہے ۔ اس طرح شخصیت کے دو بنیادی عناصر ہوئے ایک خلقی و فطری ، دوسرا معاشرتی و تہذیبی ----- شاعر یا ادیب کی شخصیت ، شہد کی مکھی کی طرح معاشرتی و تہذیبی پھولوں کا رس چوس کر اپنے اندرونی کیمیائی اجزاء (نفسیاتی کیفیات) کے ذریعہ ، اسے شہد میں منتقل کرتی رہتی ہے ۔ پھر یہی " شہد " تحریروتقریر کے ذریعہ معاشرے کو واپس ملتا ہے ۔ جسطرح " شہد " کو نہ ہم خالصتاً پھولوں کا رس کہہ سکتے ہیں اور نہ شہد کی مکھی کی " شخصیت محض " اسی طرح شاعر یا ادیب کے کسی فن پارے کو نہ ہم خالصۃً اجتماعی شخصیت (Colletice Personality) (غالباً جسے ایلیٹ نے واسطہ یا شخصیت سے فرار کہا ہے) کہہ کر فن کار کی شخصیت کا انکار کر سکتے ہیں اور نہ شاعر کی " شخصیت " سے تعبیر کرکے، اجتماعی ذہنیت یا معاشرتی و تہذیبی اثرات ، کو نظرانداز کر سکتے ہیں----- " حقیقت " دراصل یوں ہی ہے ۔ یعنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور آبیاری و تہذیب میں معاشرے کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے ، لیکن اسی کے ساتھ فرد کا اپنا " ذاتی تشخص " بھی ہوتا ہے جو معاشرے میں منتشر و پریشان اعمال و افکار کے رد و قبول سے، اپنے لیے ایک خط سیر (فکر و عمل) متعین کرتا ہے ۔ اسی حقیقت کی طرف درج ذیل حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے :

> مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ وَ قَدْ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ وَ وَالِدَاهُ يُهَوِّدَانِهِ وَيُنَصِّرَانِهِ وَ يُمَجِّسَانِهِ (ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے ، اسکے والدین (معاشرہ) اسے یہودی نصرانی اور مجوسی بناتے ہیں) ۔

پھر جس طرح افراد میں مشابہت ظاہری (ہر فرد اعضاء و جوارح کا مجموعہ ہوتا ہے) کے باوجود ، فرق و اختلاف ہوتا ہے ، اسی طرح شاعر، شاعر میں بھی(موروثی و تہذیبی دونوں حیثیتوں سے) فرق و اختلاف ہوتا ہے ---- یہی فرق و اختلاف جو اسے

دوسرے شاعروں سے ممیز وممتاز کرتا ہے شاعر کی انفرادیت ہے ۔

جناب عارف عبدالمتین نے " شخصیت و انفرادیت " پر مختصر مگر جامع الفاظ میں روشنی ڈالی ہے ۔ وہ رقمطراز ہیں :

" جدید نفسیات کے حوالے سے کسی شخص کی تمام جسمانی اور ذہنی خصوصیات کے اجماع سے رونما ہونے والی وحدت کو اس کی شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے .... اس وحدت کی بدولت کسی شخص کے اندر دوسری تمام شخصیتوں کے مقابلے میں جسو اختلاف رونما ہو جاتا ہے .... جو اس کو ان سب سے ممیز کرتا ہے ، اسے ہم انفرادیت کا نام دے سکتے ہیں ..... ادب ...... میں جب کسی ادیب کی انفرادیت کا ذکر کریں گے تو ...... ذہن میں اس ادیب کی شخصیت کے وہی پہلو ہوں گے جو اسے دوسرے تمام ادیبوں سے ممتاز کرتے ہیں [۱] "

شخصیت و انفرادیت کے معنی متعین ہو جانے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا شخصیت شاعری میں منعکس و جلوہ گر ہوتی ہے یا نہیں ؟

شاعری میں شخصیت : میری ناچیز رائے میں انسان کا کوئی فعل غیر شخصی نہیں ہوتا۔ وہ حیات و کائنات کو اپنے ہی وسیلے سے سمجھتا ہے ، اسکا علم ، اسکا تجربہ ، اسکے احساسات اسکے جذبات ، اسکے مدرکات اسباب و علل سے نتائج کا استخراج و استنباط اور ان کا اظہار و بیان (مع تمام ذہنی اور نفسی کیفیات کے) اسکا اپنا ہوتا ہے ۔ پھر فن کار (شاعر و ادیب) جسکی شخصیت (یقیناً دوسروں کے مقابلے میں) زیادہ قوی ہوتی ہے " اور جسے دوسروں سے زیادہ اظہار و بیان کی قدرت و صلاحیت حاصل ہوتی ہے ۔ اس کلیے سے کیوں کر مستثنیٰ ہو سکتا ہے؟ ---- اس لیے شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ " شاعر کی شخصیت اسکی شاعری میں بھی طرح جلوہ گر ہوتی ہے " ---- یہ الگ بات ہے کہ عام قاری اظہار و بیان کے رنگیں پردوں میں اسکی شخصیت کی تابانی و جلوہ گری نہ دیکھ سکے ۔

۱۔ روایت اور انفرادیت ۔ ٹی ایس ایلیٹ ۔ محاکمہ از عارف عبدالمتین ۔ سویرا لاہور، جلد ۱۸، ۱۷ ۔ ص ۱۸۹

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اصغر کی شخصیت بھی ان کی شاعری میں نمایاں ہوئی ہے یا نہیں ؟ اور اگر ہوئی ہے تو کس طرح ؟

اس بارے میں دو رائیں ہیں ۔ ڈاکٹر عبدالسلام کا خیال ہے کہ نہ صرف یہ کہ " اصغر کی شخصیت ان کی شاعری میں ظاہر نہیں ہوئی " بلکہ یہ بھی کہ " جتنا بعد ان کی زندگی اور شاعری میں ہے شاید اور کسی اردو شاعر کے یہاں نہیں ہے " ۔ عبدالسلام صاحب کے الفاظ یہ ہیں :

" اصغر کے کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری دلی جذبات کی ترجمانی کا نہیں بلکہ ان پر پردہ ڈالنے کا ذریعہ ہے ۔ وضع داری و شرافت چاہے عملی زندگی میں کتنے ہی قابل قدر ہوں لیکن شاعری میں ان کی زیادتی ایک گھٹن سی پیدا کر دیتی ہے ۔ اصغر کے اشعار کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دل کسی بات کو بیان کرنا چاہتا ہے لیکن ان کا متصوفانہ دماغ آ کر اس کا منہ بند کر دیتا ہے ان کا ایک شعر ان کے انداز طبیعت پر بڑی اچھی طرح روشنی ڈالتا ہے ؎

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اشعار میں اپنی شخصیت کو پورے طور پر نمایاں کرنے سے گریز کرتے تھے ۔ ہم ان کے اشعار کی مدد سے ان کی زندگی کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے ۔ وہ سراسر عالم خیال میں زندگی گزارنے والے انسان معلوم ہوتے ہیں ۔ اصغر کے علاوہ اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہو جسکے کلام اور زندگی میں اس قدر بعد پایا جاتا ہو ۔[1] "

آگے بڑھنے سے پہلے اقتباس بالا کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ ضروری ہوگیا ہے اس لیے پہلے اس پر محاکمہ کر کے بدلائل ثابت کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا

۱۔ اصغر گونڈوی مشمولہ تخلیق و تنقید ۔ از ڈاکٹر عبدالسلام ۔ مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ، طبع سوم ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۳۵-۲۳۲

دعویٰ بے بنیاد و باطل ہے - اسکے بعد دوسرے حضرات کی آراء پیش کرکے، اصغر کی شخصیت کے بنیادی عناصر کی نشاندہی ان کے سوانح کی روشنی میں کی جاتی ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں ان کے کلام سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

ذیل میں جناب عبدالسلام صاحب کے اقتباس کا تجزیہ کر کے سلسلہ وار اس پر محاکمہ کیا جاتا ہے :

(۱) اصغر .... کی شاعری دلی جذبات کی ترجمانی کا نہیں بلکہ ان پر پردہ ڈالنے کا ذریعہ ہے -

(۲) وضع داری اور شرافت کی زیادتی نے ان کی شاعری میں گھٹن سی پیدا کر دی ہے -

(۳) اصغر کا دل کوئی بات بیان کرنا چاہتا ہے لیکن ان کا متوازن دماغ اس کا منہ بند کر دیتا ہے -

(۴) وہ اشعار میں اپنی شخصیت کو پورے طور پر نمایاں کرنے سے گریز کرتے تھے —— ہم ان کے اشعار سے ان کی زندگی کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے -

(۵) وہ عالم خیال میں زندگی گزارنے والے انسان معلوم ہوتے ہیں -

(۶) اصغر کے کلام اور ان کی زندگی میں بڑا بعد ہے -

سلام صاحب کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ " اصغر کی شاعری .... دلی جذبات پر پردہ ڈالنے کا ذریعہ ہے " ---- سلام صاحب نے صرف حکم لگا دیا ہے، وضاحت نہیں کی اور یہ حکم بھی ان کی عام شاعری پر ہے - اس کا مطلب یہ ہوا کہ اصغر بطور شاعر انتہائی ناکام رہے ہیں - انھوں نے تمام زندگی منافقت میں گزاری اور ان کی شاعری بھی اسی " نفاق " کا عکس ہے ---- یعنی وہ کوشش کرکے اپنے جذبات کو الفاظ کے رنگین دبیز پردوں میں چھپاتے، دباتے بلکہ دفن کرتے رہے ---- ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد ہے اور اصغر کی شخصیت و مزاج سے عدم واقفیت پر مبنی ہے - یہاں نہ تفصیل میں جانے کا موقع ہے اور نہ گنجائش - اس لیے صرف ایک مثال پر اکتفا کی جاتی ہے - اور وہ یہ کہ اصغر ادب میں صالحیت کے قائل ہیں - اسکے تمام و اہتمام میں انھوں نے جتنا زور قلم صرف کیا ہے اسے ان کے " استفسارات اردوی معلیٰ " کے جوابی مضمون میں ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے (مقالہ ھذا ص ۳۸۷) ---- لیکن چوں کہ شعر کی شرافت و صداقت " عدم صالحیت " کے خلاف تندی جذبات کے متحمل نہ ہو سکتی تھی - اس لیے شعر

کو ریز و تکسیر بنانے کے بجائے ، انھوں نے " صالحیت " کی لطیف ترین روح ، اپنے مجموعات شعری کے ایک ایک لفظ میں بھر دی کہ اظہار جذبات کے مخنثانہ رویے سے ، یہ مثبت رویہ بدرجہا بہتر ہے ۔

سلام صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ " وضع داری اور شرافت کی زیادتی سے ان کی شاعری میں گھٹن سی پیدا ہوگئی ہے ۔"

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اصغر کی شاعری میں انھوں کی شخصیت کا اظہار ہونا چاہیے ۔ اگر وہ حددرجہ شریف اور وضع دار تھے (جو وہ یقیناً تھے) تو ان کی شاعری میں " پھسلن " اور " لحاف " کے قبیل کے جذبات کا اظہار کیوں کر ہوتا ۔ رہا یہ مسئلہ کہ " وضع داری و شرافت " سے ان کی شاعری میں گھٹن پیدا ہو گئی ہے ، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وضع داری و شرافت تو نام ہی گھٹن ---- یعنی قید و رسم کا ہے ۔ بقول اصغر ؎

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی

کچھ قید و رسم نے جسے ایمان بنا دیا

جسکا یہ نظریہ اور معمول زندگی ہو
اور جسکے نزدیک شاعری " شرافت و شہامت کا اعلان ہو[1] " اسکے کلام میں " جذبات کی بے لگامی تلاش کرنا عبث ہے ۔ یہ سوال اٹھا کر سلام صاحب نے خود اپنے ہی دعوے کی تردید کر دی ہے

دوسری بات یہ ہے کہ کوئی بڑا شاعر جذبات کو اسکے انتہائی خام اور نامہذب (CRUDE) حالت میں نہیں پیش کرتا ۔ بلکہ وہ اسے تخیل کے سردخانے میں دبا کر ، اسکی شدت وحدت کو کم کرتا ہے پھر عمل کشید کے ذریعے اسکا " ست " نکالتا ہے اور تخیل کی رنگینی اور جذبات کے لطیف ارتعاشات سے ایک خوشگوار آمیزہ تیار کرکے اسے پیش کرتا ہے ---- اصغر کے اشعار ارتعاشات لطیف اور رنگینی تخیل کا آمیزہ ہیں ---- ان کے یہاں نہ جذبات کا لاوا ہے نہ تعقل کی برودت ۔ بلکہ ان دونوں کا بڑا معتدل اور خوشگوار امتزاج ہے کہ یہی توازن و اعتدال ان کی فطرت کا خاصہ تھا ---- اس سے بھی سلام صاحب کے اس دعوے کی تکذیب ہو جاتی ہے کہ " ان کی شاعری دلی جذبات کی ترجمانی کا نہیں بلکہ ان پر پردہ ڈالنے کا ذریعہ ہے " ---- حقیقت یہ ہے کہ اصغر کی شاعری جذبات پر پردہ ڈالنے

۱۔ مرحوم اصغر گونڈوی ۔ از رشید احمد صدیقی مشمولہ گنج ہائے گرانمایہ ۔ مطبوعہ نحری فرینڈز پبلشر راولپنڈی ۔ ص ۹۹

نہیں
کا ذریعہ رہے بلکہ جذبات کے تصفیے ، تزکیے اور تطہیر و تسطیر کا نام ہے ۔

تیسرے اعتراض کا جواب پہلے دونوں اعتراضات کے جواب میں آ گیا ۔ اس لیے چوتھے اعتراض کا جواب دیا جاتا ہے ۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ " وہ اپنی شخصیت کو پوری طور پر نمایاں کرنے سے گریز کرتے تھے " ۔ ہم ان کے اشعار سے ان کی زندگی کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے اعتراض کے آخری حصے کا جواب ، آخری سوال کے ضمن میں دیا جائے گا یہاں اسکے ابتدائی حصے کا جواب دیا جاتا ہے ۔

اول تو یہ خیال ہی سرے سے غلط ہے کہ شاعر کوشش کرکے شاعری میں اپنی شخصیت کا اظہار کرتا یا اسکے نمایاں طور پر اظہار سے گریز کرتا ہے ۔ شخصیت تو اظہار و بیان کا جزو لاینفک ہوتی ہے اگر شاعر اسکے اظہار سے گریز کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا ۔ وہ محسوس و نامحسوس طریقوں سے اسکی تخلیق میں در آتی ہے کبھی واضح اور نمایاں اور کبھی ڈھکے چھپے انداز میں ، یہ الگ بات ہے کہ ان پردوں کو ہٹا کر شاعر کی شخصیت کو دیکھ لینا آسان نہ ہو ۔ اس حقیقت کا اعتراف تو خود سلام صاحب کو بھی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" شاعر کتنا ہی پہلو تہی کیوں نہ کرے اسکی زندگی کی جھلک اسکے کلام میں ضرور نظر آئے گی ۔"[1]

لیکن اصغر کے معاملے میں نہ معلوم کیوں وہ تسامح یا تجاہل سے کام لے رہے ہیں دوم یہ کہ اپنی بات کی توثیق اور شہادت میں انھوں نے جو شعر پیش کیا ہے

اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

اسکی تشریح و تفہیم میں ، ان سے چوک ہوگئی ۔ اس شعر سے اصغر کے طبیعت کا یہ پہلو نہیں نکلتا کہ " وہ اپنی شخصیت کو پوری طور پر نمایاں کرنے سے گریز کرتے تھے " ۔ بلکہ وہ تو ایک گہری حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ " لوگ مجھ سے ملتے ہیں ، مجھے دیکھتے ہیں لیکن میری حقیقت کو نہیں سمجھتے ۔ جو لوگ میری حقیقت سمجھنا چاہتے ہیں

۱۔ رقعات غالب از ڈاکٹر عبدالسلام مشمولہ تخلیق و تنقید ۔ ص ۱۲۱

وہ اسے میری شاعری میں تلاش کریں " ---- دوسرے لفظوں میں " میری شاعری میری شخصیت کا آئینہ ہے " ---- اس شعر سے تو خود سلام صاحب کے دعوے کی تردید ہو جاتی ہے - یہ شعر بالکل انھیں معنوں میں کہا گیا ہے جن معنوں میں مخفی کا حسب ذیل شعر مشہور ہے ؎

در سخن مخفی منم چوں بوی گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اور ظاہر ہے کہ " بوی گل " وہی محسوس کر سکتا ہے جسکی قوت شامہ (بصورت شعر و نظر) تیز ، قوی اور درست ہو -

سوم یہ کہ شاعر کے تراکم و تزاحم افکار ، تلاطم و طغیان جذبات ، ارتعاش و اهتزاز حسیات بتمامہ گرفت میں نہیں آتے ---- جو ضبط تحریر اور نظم شعر میں آتا ہے ، وہ اسکا اقل قلیل حصہ و شائبہ ہوتا ہے ---- پھر بھی شخصیت کسطرح شعر میں جلوہ گر ہو سکتی ہے - ہاں اسکی جھلک ضرور اس میں ہوتی ہے - اسی حقیقت کی طرف محولہ بالا شعر میں اصغر نے اشارہ کیا ہے - اسکی وضاحت و تصدیق مولانا سراج الحق کی تحریر سے ہوتی ہے - وہ رقمطراز ہیں :

" ایک بار میں نے کہا اصغر صاحب ! آپ کی زبان سے جو باتیں نکلتی ہیں بڑی مفید .... دلچسپ اور عجیب ہوتی ہیں - کاش یہ قلمبند ہو جاتیں اور شائع ہو سکتیں .... کہنے لگے جناب ! میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ میرے منھ سے نکل جائے وہ میرے لئے ...... بیکار اور غیر مفید ہے .... البتہ جو چیز میرے اندر ہے وہ ہے اصل اور وہ ان باتوں سے کہیں ارفع کہیں بہتر ہے -"[1]

سلام صاحب کا پانچواں اعتراض یہ ہے کہ " وہ عالم خیال میں زندگی گزارنے والے انسان معلوم ہوتے ہیں -" یہ بات بھی غلط ہے - اصغر کی زندگی میں کہیں ترک و تجرد عالم خیال کی گوشہ گیری نظر نہیں آتی - وہ بڑے خوش فکر ، خوش گفتار اور خوش صحبت انسان تھے ، ان کے گرد ہمیشہ دوست احباب ، طالبان حق اور طالبان علم کا مجمع رہتا تھا ،

---

[1] - اصغر کے چند ادبی افادات از مولانا سراج الحق مشمولہ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور - ص ۵۲-۵۳

ان کی زندگی کے کسی دور میں خلوت گزینی ، استغراق ، محویت ، گم شدگی یا " درخود خزیدگی" کی کیفیت نہیں ملتی ۔ انہوں نے لذائذ دنیا سے بھرپور تمتع حاصل کیا ------ ایسے شخص کو " عالم خیال میں زندگی گزارنے والا ،، کیسے کہہ سکتے ہیں ---- ہاں ان کی شعریات میں ایسی باتیں ہیں (روحانیت و پاکیزگی کی) جنھیں آج کا انسان " عالم خیال " یا " عالم بالا کی چیز " کہہ کر گزر جاتا ہے اور اپنی دانست میں تنقید کا پورا پورا حق ادا کر دیتا ہے ---- حالانکہ انسانی زندگی کو سب سے زیادہ انہیں چیزوں کی ضرورت ہے ---- اگر یہ باتیں " عالم خیال " کی ہیں تو یقیناً اصغر عالم خیال کے رہنے والے تھے ---- کہ یہی ان کی زندگی کا مطمح نظر و محمول تھا ۔ اگر اصغر کے کلام میں یہ باتیں نہ آتیں تو کیا " عالم مادی میں بسنے والے ،، ---- یعنی جنسیات میں غرق و شرابور (کہ بعض حضرات کی نظر میں زندگی اتنی ہی ہے) ---- انسان کی زندگی کی باتیں آتیں؟ ---- اس سے بھی سلام صاحب کا دعوی بے بنیاد و باطل ہو جاتا ہے ۔

سلام صاحب کے چھٹے اعتراض کہ " اصغر کی زندگی اور شاعری میں بڑا بعد ہے " کا تفصیلی جواب ہی دراصل اس باب کا موضوع ہے ۔ جو آئندہ سطور میں بیان ہوتی ہے ۔ لیکن اس تفصیل سے پہلے دو باتوں کی طرف اشارہ ضروری ہے :

پہلی بات یہ کہ اصغر کی زندگی اور شاعری کے متعلق یہ رائے ، ڈاکٹر عبد السلام صاحب نے صرف ان کا کلام پڑھ کر قائم کی ہے ۔ نہ وہ ان سے کبھی ملے ہیں اور نہ ان کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے ---- اس لیے رائے قائم کرنے میں ان سے غلطی ہوگئی ہے ۔ اور تحقیقی و تنقیدی مطالعے میں ان کی رائے کی کوئی قدروقیمت نہیں ۔ ہاں یہی بات اگر کوئی ایسا شخص کہتا جس نے انہیں قریب سے دیکھا ہو تو یقیناً اسکی رائے میں وزن ہوتا ۔ ---- یہ بات آگے آتی ہے کہ انہیں قریب سے دیکھنے والوں کی رائے ان کی زندگی اور شاعری کی نسبت کیا ہے ۔

دوسری یہ کہ سلام صاحب نے اصغر کی زندگی کو عام شاعروں کی زندگی پر قیاس کر لیا اور جب ان کی شاعری میں " شعرائے بانکپن ،، کی " روایتی ہوس پرستانہ زندگی ،، کا عکس نظر نہیں آیا تو یہ فیصلہ صادر فرمادیا کہ " اصغر کی زندگی اور شاعری میں بڑا بعد ہے ۔،،

یہ دعوی تاریخی واقعات کے خلاف ہے ۔ تاریخی شہادت یہ ہے کہ " ان کی شاعری اور زندگی میں کامل ہم آہنگی اور مطابقت تھی ،، ۔ اسکی شہادت ان کے ہر سوانح نگار

نے دی ہے -

سلام صاحب نے جناب رشید احمد صدیقی اور آنجہانی سر تیج بہادر سپرو کے اقوال نقل کرکے انھیں عقیدت مندانہ کہہ کر نظر انداز کر دیا ہے اور اپنی بات کی بیچ میں اصغر کے چار شعر نقل کرکے ، اس بحث کا قطعی فیصلہ کر دیا اور اپنی دانست میں ہمیشہ کے لیے اسکا دروازہ بند کر دیا ہے - یہ تو بعد میں ثابت ہوگا کہ سلام صاحب کا دعویٰ کہاں تک درست ہے - لیکن یہاں اتنا اشارہ ضروری ہے کہ رشید صدیقی صاحب اور دوسرے حضرات (جن کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں)، اصغر کی زندگی اور شاعرانہ فضا و ماحول کے عینی شاہد بلکہ اسمیں شریک رہے ہیں - انھوں نے ان کی شاعری کو براہ راست شاعر سے سنا تھا - اور اسکی روح تک ان کی رسائی شاعر کی مدد اور وسیلے سے ہوئی تھی ، لہذا ان کی باتیں زیادہ قابل اعتماد ، مرجح اور صحیح ہیں -

اصل موضوع پر آنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام حضرات کے اقتباسات پیش کر دیئے جائیں جنھوں نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے - جناب رشید صدیقی لکھتے ہیں :

" مرحوم کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بار بار ان کا کلام سامنے آ جاتا ہے - اور ان کے کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب جیتے جاگتے مسکراتے سامنے آ موجود ہوتے ہیں - ان کے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجئے تو اصغر صاحب اور اصغر کو الفاظ و عبارت میں تحویل (تحلیل) کیجئے تو ان کا کلام-[۱]"

یہی بات قریب قریب سر تیج بہادر سپرو نے بھی لکھی ہے - وہ رقمطراز ہیں :

" مولوی اصغر صاحب کی شاعری ان کی زندگی کا عکس ہے اور زردشتیوں کے قول کے مطابق ان کی رفتار ، گفتار اور کردار میں مطابقت پائی جاتی ہے -[۲] "

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی رائے بھی یہی ہے - وہ لکھتے ہیں :

" اصغر کی شاعری اردو کے بیشتر غزل گو شعرا کی طرح فرضی یا

۱- مرحوم اصغر گونڈوی - گنج ہائے گرانمایہ - مطبوعہ نئی فرینڈز پبلشرز راولپنڈی ص ۱۱۲

۲- مقدمہ سرود زندگی - مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد - طبع اول ۱۹۳۵ء - ص ۳

پیشہ ورانہ .... نہ تھی - بلکہ ان کا کلام ان کی زندگی
کا بہترین عکس تھا - اردو کے بہت کم شاعر رفتار ، گفتار اور
کردار کی مطابقت میں اصغر کی ھمسری کر سکتے ھیں -[1] "

اس سلسلے کو جناب جلیل قدوائی کے درج ذیل اقتباس پر ختم کیا جاتا ہے تاکہ
بحث کو آگے بڑھایاجا سکے - جناب جلیل قدوائی تحریر فرماتے ھیں :

" مجھے ان کی شخصیت میں وھی سلیقہ وھی رکھ رکھاؤ نظر آیا
جو ان کی شاعری میں تھا - اپنی شاعری ھی کی طرح وہ عام
لوگوں سے منفرد بلکہ خوب صورت معلوم ھوئے .... میں
انھیں خوب صورت ان معنوں میں کہتا ھوں کہ میں نے ان کی
گفتگو ، نشست و برخاست ، خیالات و نظریات زندگی میں وھی
حسن مذاق پایا جو ان کی شاعری کی خوب صورتی سے میل کھاتا
ھے -[2] "

محولہ بالا عام بیانات سے یہ تحقیق ھو جاتا ھے کہ اصغر کو قریب سے دیکھنے
والوں کی نظر میں " ان کی زندگی اور شاعری میں کامل ھم آھنگی ھے " یا بالفاظ دیگر
" ان کی شخصیت ، ان کی شاعری میں پوری طرح جلوہ گر ھوئی ھے " ---- لیکن یہ کہ
ان کی شخصیت کے کون کون سے اجزاء و عناصر ان کی شاعری میں در آئے ھیں - اس پر
تفصیل سے روشنی نہیں پڑتی - سطور آئندہ میں اسی کی تفصیل پیش کی جاتی ھے -

سطور بالا میں شخصیت سے بحث کرتے ھوئے اسکے دو بنیادی عناصر ----
(۱) خلقی و فطری ---- یعنی نفسی و مزاجی کیفیات اور فطری رجحانات و
میلانات
اور (۲) تہذیبی و معاشرتی اثرات ---- یعنی فلسفہ زندگی اور نظریہ حیات
کی طرف اشارہ کیا گیا تھا -

ان میں سے تہذیبی و معاشرتی اثرات ---- عقائد و نظریات اور صوفیانہ و
مذھبی خیالات و افکار کے زیر اثر ، دنیا اور لذائذ و نعم دنیا کے ساتھ ان کا رویہ و

۱- اصغر گونڈوی - چند شخصیتیں چند تاثرات - از ڈاکٹر زور - مطبوعہ اردو اکیڈمی
سندھ کراچی طبع اول ۱۹۶۲ء - ص ۳۷-۳۶

۲- اصغر اور میں - از جناب جلیل قدوائی مشمولہ انتخاب اصغر - طبع اول ۱۹۵۲ء - ص ۲۳

رحجان کیا تھا ---- مقالہ ھذا میں (ص) " عقائد و افکار " کے تحت زیر بحث آ چکے ھیں - یہاں صرف یہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ھے کہ ان کی مخصوص و منفرد نفسیاتی کیفیات اور فطری میلانات کے اجتماع نے ان کی شخصیت کو کس طرح حسین و دلکش بنا دیا تھا کہ یہی " حسین شخصیت " جب " مینائے سخن " میں ڈھل کر ظاہر ھوئی تو ان کی شاعری کی فضا زمین سے آسمان تک عالمؑ انوار ھو گئی ھے -

اس طرح اصغر کی شخصیت و شاعری کی یہ بحث حسب ذیل تین پہلوؤں پر مشتمل ھے :

چہرۂ زیبا کی تجلی :
----

(۱) یعنی (سوانح اصغر کی روشنی میں ان کی) شخصیت کے بنیادی خدوخال فطری میلانات و رحجانات کی نشاندھی و تعین -

(۲) شاعری میں شخصیت کی جھلک ---- شاعری و شخصیت کا انطباق — ان دونوں شقوں کا تعلق بظاھر موضوع و مواد سے ھے ---- اور

(۳) جام رنگیں ---- یعنی شاعری کی کیفیت --- اسکا تعلق اسلوب و انداز سے ھے -

یہ تقسیم محض سہولت کے لیے کی گئی ھے ورنہ یہ کہنا کہ اسلوب و انداز میں شخصیت کا عمل دخل نہیں ھوتا بڑی گمراہ کن بات ھے - حقیقت یہ ھے کہ شخصیت ایک غیر منقسم وحدت ھے جو فن کار کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو محیط ھوتی ھے - جہاں ایک طرف وہ اسکے نظام فکر و عمل کو متعین کرتی اور خود اس سے متاثر و مستفیض ھوتی ھے وھیں اسکے اظہار و بیان کے لیے لفظوں کے پیکر بھی مہیا کرتی ھے -

ذیل میں ان کی سیرت و کردار کی بعض اہم کڑیوں سے ، اصغر کی شخصیت کی تصویر پیش کی جاتی ھے :

(۱) طہارت و پاکیزگی :

اصغر کا فطری میلان طہارت و پاکیزگی کی طرف تھا - اگرچہ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات ، تحقیق کی روشنی میں نہیں آ سکے ، جن سے ان کی مزاجی کیفیات و فطری میلانات کا سراغ مل سکے ، تاھم دور شباب سے بستر مرگ تک کے تفصیلی حالات و واقعات دستیاب ھو گئے ھیں جن سے ان کے میلانات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ھے - چنانچہ

---

(۵) تجلی چہرۂ زیبا کی ھو کچھ جام رنگیں کی + زمیں سے آسماں تک عالم انوار ھو جائے — اصغر

حصے میں آتا ہے کہ جوانی جب اپنے ساتھ دیوانگی لائی تو وہ اسکی کامرانیوں میں اس درجہ غرق و شرابور ہوئے کہ انھوں نے کچھ نہ چھوڑا ۔ صغیر صدیقی صاحب اسکا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" جوانی میں وہ بے راہ رو ہوگئے اور منہیات میں بالکل ڈوب گئے ۔ جو لوگ جانتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے کچھ نہیں چھوڑا ۔[1] "

اب اس کچھ نہ چھوڑنے کی تفصیل سید رشید احمد صاحب سے سنیے :

" اصغر بادۂ شبینہ کی سرمستیوں میں ایسے کھوئے گئے ، ایسے ہمہ تن غرق و شرابور ہوئے کہ حلقۂ شبینہ کے بے آشاموں میں سبقت لے جانے میں ان کا نام ہو گیا ۔ راج بہادر نے ان کو عیاشی کی طرف بھی مائل کر دیا ۔ اس فن میں شہر کے بعض خوش حال گھرانوں کے چشم و چراغ اور جانباز ان کے راہ نما اور پیر طریقت بن گئے ۔[2] "

دوسری جگہ افتخار اعظمی صاحب کے حوالے سے (جنھوں نے یہ روایت جگر سے سنی تھی) ناقل ہیں :

" اصغر صاحب نے کمال کر دیا کہ وہ شراب بھی پیتے تھے اور افیم بھی کھاتے تھے اور یہ دونوں چیزیں یک لخت اس طرح ترک کر دیں کہ پھر ان کو ہاتھ نہ لگایا ۔[3] "

آخر فسق و فجور اور جسمانیت و ہوسناکی کے التہاب نے روح کی تشنگی کو بھڑکا دیا اور ایک روز وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ بلا اطلاع گونڈہ سے بھاگ کھڑے[4] ہوئے اور قاضی عبد الغنی رح منگلوری کی خدمت میں باریاب ہوکر ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہوگئے ۔ مرشد اہل نظر اور صاحب باطن تھے ۔ ان کی صحبتوں میں اصغر کی طبیعت میں ٹھہراؤ اور تھماؤ پیدا ہوا ۔ ان کی اعلیٰ صلاحیتیں بیدار ہو گئیں اور وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند

۱۔ اصغر گونڈوی ۔ از صغیر احمد صدیقی ۔ نقوش لاہور ، شخصیات نمبر جلد دوم ص ۱۳۸۲

۲۔ اصغر صاحب ۔ از سید رشید احمد ۔ جامعہ دہلی ۔ اپریل ۱۹۶۷ء ۔ ص ۱۹۶

۳۔ ایضاً ------ جامعہ دہلی مئی ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۲۱

۴۔ اصغر گونڈوی ۔ از صغیر احمد صدیقی ۔ شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۳۸۲

اثر سے

اور صوفی صافی ہوگئے ۔ قاضی صاحب کے فیض و اصغر کی فکر و نظر کی تطہیر کے ساتھ ان کے افعال و اعمال میں بھی طہارت و پاکیزگی آ گئی ۔ جناب مجنوں گورکھپوری اصغر کی اس کیفیت سیرت و مزاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

" اصغر خود صوفی مزاج انسان ضرور تھے لیکن آج تک کسی صوفی اور ملّا میں ہم کو کردار و گفتار کی وہ نرمیاں اور شرافتیں نہیں ملیں جو اصغر کی سب سے محیط خصوصیت تھی ۔"[۱]

یہاں سے اصغر کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا ۔ وہ تپ کر کندن ہو گئے ۔ جمال ہم نشیں نے ان کو " پارس " بنا دیا ۔ ان میں مقناطیسیت پیدا ہوگئی ، دوسروں کی طرف کھنچنے کے بجائے ، ان کو اپنی طرف کھینچنے لگے ۔ جو ایک بار ان کی صحبت میں آ گیا ان کا اثر قبول کئے بغیر نہ لوٹا ۔ شکاری (جگر اور ان کا پورا کنبہ) خود شکار ہوگئے ۔ اصغر کا رنگ ان پر ایسا چڑھا کہ تائب ہو کر ان کی زندگی کے شریک بن گئے[۲] ۔ اصغر کا " خاک سے کیمیا بنانے " کا یہ سلسلہ مرتے دم تک جاری رہا ۔

(۲) رنگینی طبع و نفاست پسندی : اصغر کی شخصیت کی دوسری نمایاں خصوصیت رنگینی اور نفاست پسندی ہے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بادۂ تصوف کے لذت چشیدہ بلکہ دُرد آشام ہونے کے باوجود انھوں نے نہ کبھی " زہد خشک " اختیار کیا نہ تقشف وتورع کو اپنا مسلک بنایا ۔ نہ جوگیوں اور بیراگیوں کی طرح ترک دنیا اور رہبانیت کو معراج روحانی کا وسیلہ سمجھا اور نہ خانقاہ نشینوں کی طرح " ظواہر درویشی " کو اپنا شیوہ و شعار بنایا ۔ بچپن ہی سے باپ کی رنگینی و نفاست پسندی کا نقش دل پر لیے ہوئے تھے (رنگینی ان کے خمیر میں بھی تھی اور باپ کی وضع قطع نے بھی مثال و نمونے کا کام دیا) مرشد ملے تو شاہی میں فقیری کرنے والے اور " درویش صفت باش و کلاہ تتری دار " پر عامل[۳] ۔ مرشد کے باطنی صفات کے ساتھ ساتھ دنیا کو سلیقے اور نفاست سے برتنے کا یہ طریقہ اصغر کو کچھ ایسا پسند آیا اور اسے انھوں نے اس خوبی سے اپنایا کہ یہ ان کی شخصیت کی ایک اہم اکتسابی خصوصیت بھی بن گئی ۔ اصغر کی رنگینی طبیعت اور نفاست پسندی کی مثالیں جا بجا مقالہ ہذا میں بکھری پڑی ہیں ۔ یہاں نذیر احمد صدیقی نے ، اصغر کی

۱۔ اصغر گونڈوی ۔ از مجنوں گورکھپوری ۔ نیا دور ۔ ۲۲-۲۳ ۱۹۶۱ء

۲۔ اصغر گونڈوی ۔ از نذیر احمد صدیقی ۔ شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۳۸۳

۳۔ ایضاً ۔ ص ۱۳۸۵

جو قلمی تصویر کھینچی ھے ، اسکا اقتباس دیا جاتا ھے ، جس سے اصغر کی شخصیت کے مذکورہ بالا پہلو کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ھے ۔ وہ لکھتے ھیں :

" تھوڑی دیر میں اصغر صاحب تشریف لائے ....
لانبا قد ، کھلتا ھوا سانولا رنگ ، بڑے سر پر ، چہرے پر
فرانچ کٹ داڑھی ، آنکھوں میں غیر معمولی چمک ، لانبا کرتہ
چوڑی دار پاجامہ پہنے ھوئے ، روشن روشن ، صاف صاف ،
نکھرے نکھرے ، گردن اور شانے میں ایک خفیف سا خم جو بقول
رشید احمد صدیقی معلوم ھوتا تھا کہ نیکی اور شرافت کے بوجھ
سے پیدا ھو گیا ھے ۔ متانت اور وقار کے ساتھ چہرے پر ایک
تبسم ذوق پسندیرائی لئے ھوئے ---[1] "

اقتباس بالا میں " روشن روشن ، صاف صاف ، نکھرے نکھرے " سے ان کی نفاست پسندی ہیں "خوبصورت فرنچ کٹ داڑھی ..... کرتہ اور چوڑی دار پاجامہ " سے ان کی رنگینی طبع ، گردن اور شانہ کا ھلکا خم ، سے ان کی شرافت اور شرمیلے پن ، اور " متانت و وقار کے ساتھ چہرے پر تبسم " سے ان کی فطری بشاشت اور خوش دلی ظاھر ھوتی ھے ۔ رنگینی طبع اور خوش دلی کی شہادت مرزا احسان احمد صاحب کی تحریر سے بھی ھوتی ھے۔ وہ لکھتے ھیں :

" باوجود زھد و تقویٰ کے مزاج میں رنگینی اور ظرافت کا عنصر
بہت نمایاں ھے ۔[2] "

نفاست پسندی کی شہادت جناب جلیل قدوائی کے حسب ذیل اقتباس سے بھی ملتی ھے :

" وہ بہت نفیس مزاج واقع ھوئے تھے ۔ " اور بخ ہی کو "
ان کی مرغوب چائے تھی .... تری میں سفید براق کپڑا
بچھا ھوا ، چائے کے برتن صاف ستھرے چائے دانی پر ٹی کوزی
ڈھکی ھوئی ۔[3] "

۱۔ اصغر گونڈوی ۔ از رشید احمد صدیقی ۔ شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۳۸۱
۲۔ مقدمہ نشاط روح از مرزا احسان احمد ۔ طبع اول ۱۹۲۵ء ۔ ص ۵
۳۔ اصغر اور میں ۔ از جلیل قدوائی مشمولہ انتخاب اصغر ۔ طبع اول ۔ ص ۳۲

(۳) جذب و کیفیت اور والہانہ از خود رفتگی :

جناب ضمیر احمد صدیقی نے اصغر کے ساتھ اپنے مقلوم جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے :

" رواداری یہاں تک تھی کہ خود میری صفائی میں کہا کرتے تھے کہ بھئی کوئی آسانی سے نماز نہیں پڑھتا ۔ نماز تو بہت پٹ چکنے کے بعد پڑھی جاتی ہے ۔"[1]

اصغر کے اس چھوٹے سے جملے سے کہ " نماز تو بہت پٹ چکنے کے بعد پڑھی جاتی ہے "، ان کی شخصیات کا ایک اہم پہلو سامنے آتا ہے ۔ میرے نزدیک یہ صرف " شاعرانہ جملہ " نہیں ہے بلکہ " ذاتی تجربہ " ہے جس نے شاعرانہ پیکر اختیار کر لیا ہے ...... اصغر ، جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے ، کافی " پٹ چکنے " کے بعد اس کیفیت کی طرف آئے تھے جسے اصطلاح شریعت میں " نماز " کہتے ہیں ---- نماز روح و شخص کی وہ کیفیت ہے جو سوز و گداز ، خشوع و خضوع ، جذب و کیف اور والہانہ خودسپاری و خود سپردگی کا مظہر ہوتی ہے ۔

(۴) توازن و سنجیدگی :

اصغر بہت سریع الحس اور شدید الاحساس واقع ہوئے تھے ۔ اسی شدت احساس نے جہاں انہیں شاعر بنایا " منہیات میں بھی غرق " کیا ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اصغر جیسے شدید الاحساس شخص کی طبیعت میں جو " تر دامن " ہونے سے بچنے کے بجائے " قعر دریا " میں خوب چھک چھپا کھیلا ہو ، توازن و سنجیدگی کہاں سے آ گئی ؟ جواب اتنا مشکل نہیں ہے جتنا بظاہر نظر آتا ہے ۔ اصل میں اصغر کی فطرت کی تخمیر قوت ضبط و توازن اور پختگی عزم و ارادہ سے ہوئی تھی ۔ چنانچہ دور سرمستی شباب میں بھی ، جب وہ " غرق مے و مینا اور مقرب بزم حسینان " تھے ، ان میں یہ خوبی بھی تابانی کے ساتھ جلوہ گر تھی ۔ جناب سید رشید احمد نے اصغر کے اس دور رنگین کی جو تصویر پیش کی ہے ، اسمیں واضح الفاظ میں اصغر کی خصوصیت کا ذکر و اعتراف کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" اصغر کی یہ عجیب خصوصیت تھی کہ وہ خواہ کتنی ہی شراب پی لیں ، کبھی آپے سے باہر نہ ہوتے اور ہمیشہ اپنے ہوش و حواس پر

۱۔ اصغر گونڈوی ۔ از ضمیر احمد صدیقی ۔ شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۳۸۲

قابو رکھتے .... ظہور نشہ اور سکر کے عالم میں جب
لوگ عموماً دماغی توازن کھو کر ھذیان سرائی شروع کر دیتے
ھیں - اصغر بڑی سنجیدگی اور شائستگی سے مختلف مباحث
پر اظہار خیال کی قدرت رکھتے تھے -[۱]"

اسی طرح " ارباب نشاط " سے دلبستگی اور اس راہ کی کوچہ گردی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ھیں :

" دوستوں کی کوچہ گردی کا تو یہ عالم تھا کہ ایک گلی کی تفریح
سے آسودہ ھو کر ، جلد دوسری گلی کا راستہ اختیار کرتے - مگر
.... اصغر نے اس میں بھی اپنی وضع داری اور انفرادیت
کو قائم رکھا - اس طبقہ کی چھٹی ناسی ایک معمولی شکل و صورت
والی خاتون .... سے (اس درجہ) متاثر ہوئے ....
.... کہ شرع کے مطابق ان سے عقد مناکحت کرکے انھیں
باقاعدہ اپنی شریک زندگی بنا لیا -[۲]"

اوپر ذکر کیا جا چکا ھے کہ جوانی میں بھی ان میں یہ خوبی موجود تھی لیکن مشیت کو ، اسکی " تہذیب و ترفیع " کے لیے کسی مبارک گھڑی کا انتظار تھا - آخر اصغر کی زندگی میں وہ مبارک ساعت بھی آئی یعنی جن دنوں وہ " دریائے معاصی " میں خوب ڈبکیاں کھا رہے تھے اور نکلنے کے لیے ھاتھ پاؤں مار رہے تھے ، ایک " صاحب ھمت " نے انھیں ناکوں ناک پانی سے باھر نکالا اور روحانیت و پاکیزگی کی ردا اڑھا کر تصوف کی راہ پر لگا دیا - ان کی قوت کے غلط نکاسی پر بند لگا کر ، ان کی صلاحیتوں کا رخ صحیح سمت کی طرف موڑ دیا - اور اسطرح ان کے انتشار کو مجتمع کرکے اسے توازن و سنجیدگی میں بدل دیا - اب اصغر کی آنکھ کھلی تو ان کی سمجھ میں آیا کہ " قوت نام ضبط کا ھے انتشار کا نہیں -[۳]"

۱- اصغر صاحب - از سید رشید احمد - جامعہ دھلی - اپریل ۱۹۶۷ء - ص ۱۹۹-۱۹۸

۲- ایضاً - ص ۲۲۰-۱۹۷

۳- اصغر گونڈوی - از مشیر احمد صدیقی - شخصیات نمبر جلد دوم - ص ۱۳۸۳

(۵) حیا و بے نفسی :

اصغر کی مزاج کا ایک بنیادی وصف ، حیا و بے نفسی بھی تھی - ان میں نام و نمود اور پیش قدمی کے بجائے ، سکڑاؤ اور جھجک تھی - وہ منظرعام پر آنے میں شرماتے تھے - وہ بڑے خوش فکر شاعر تھے ، جس مشاعرے میں جاتے مشاعرہ لوٹ لاتے - لیکن ان کی یہی خصوصیت شرکت مشاعرہ میں ہمیشہ مانع رہی - وہ جب بھی پکڑ دھکڑ کر کسی مشاعرے میں لے جائے جاتے ، اپنا کلام دوسروں سے پڑھواتے - اور جب راز فاش ہو جاتا اور براہ راست انھیں داد ملنے لگتی تو وہ شرما جاتے اور اسطرح نظریں نیچی کر لیتے جیسے کوئی بہت بڑا جرم کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں -

مسلم بورڈنگ ہاؤس الہ آباد کے سالانہ مشاعرے (۱۹۳۳ء) کا ذکر کرتے ہوئے منیر صدیقی صاحب نے جو تفصیل دی ہے ، اس سے اصغر کی اس خصوصیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے - وہ لکھتے ہیں :

" اصغر مرحوم بادل ناخواستہ تیار ہوگئے - محفل میں آ کر ڈائس کے پیچھے ایک بنچ پر بے پروائی سے بیٹھ گئے - جب ان کی باری آئی غزل حفیظ جالندھری کو پکڑا دی - انھوں نے .... مطلع پڑھا ـــ

وہ نغمہ بلبل رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہوجائے

اک شور تحسین و آفریں محفل سے جو بلند ہوا تو حفیظ صاحب نے اس داد کو جو انھیں مخاطب کرکے دی جا رہی تھی، دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اصغر صاحب کی طرف پھینکنا شروع کیا ... . لوگوں کا اصرار بڑھا .... اصغر صاحب ڈائس پر .... کشاں کشاں لائے گئے - بہت خاموشی اور وقار سے چہرے پر ایک خفیف سا تبسم لیے بیٹھے رہے .... کبھی کبھی تسلیم کر لیتے مگر داد طلب انداز سے نہیں "[1]

اسی قسم کا واقعہ جناب سید رشید احمد نے بھی لکھا ہے جس سے اصغر کی طبیعت کا " نمود و نمائش سے گریز " کا پہلو نمایاں ہوتا ہے - رشید احمد صاحب

۱- اصغر گونڈوی - از منیر احمد صدیقی - شخصیات نمبر جلد دوم - ص ۱۲۸۲

رقمطراز ہیں :

" میں نے ان کی بعض غزلیں ایک مشہور یورپین فاضل مستشرق ڈیوھرسٹ کو جو ۱۶-۱۹۱۵ء میں گونڈہ میں ڈسٹرکٹ و سشن جج تھے پڑھ کر سنائی تھیں ۔ وہ سن کر جھوم جھوم گئے تھے اور مجھ سے کہا کہ کبھی ان کو یہاں لائیے ۔ میں نے جب کبھی اصغر سے جج صاحب کے یہاں چلنے کے لیے کہا وہ ہیں ہاں کرکے ٹال گئے ۔ کبھی ان کے یہاں نہ گئے ۔ احساس کمتری کی بنا پر نہیں بلکہ انھوں نے فطرتاً طبیعت ہی ایسی پائی تھی جو جلوت کے ہنگاموں (ہو و ہاش) سے ہمیشہ دور رہتی ۔[1] "

(۶) مسرت و طماعیت :

قلب کی اس کیفیت کا نام ہے جسکے تحت انسان ہر حال میں خوش ، مطمئن ، شگفتہ اور پرامید رہتا ہے ۔ وہ آلام و مصائب سے گھبرا کر ہمت نہیں ہار بیٹھتا بلکہ ان کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے ۔ اسکی نظر ہمیشہ معاملات زندگی کے روشن پہلو پر ہوتی ہے ، اور اسے اپنی کامیابی کا یقین ہوتا ہے ۔ اگر لمحے بھر کے لیے کبھی دل و دماغ پر غم و مایوسی کے بادل چھا بھی جائیں تو فوراً ہی ان کے پیچھے سے فطری مسرت و شادمانی کا آفتاب جلوہ ریزی کرنے لگتا ہے ۔ وہ جہاں بیٹھ جاتا ہے دلوں کے کنول روشن ہو جاتے ہیں اور اسکی خوش طبعی اور زندہ دلی کی بدولت محفل لہلہا اٹھتی اور زعفران زار بن جاتی ہے ---- اصغر کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف خوش دلی ، بذلہ سنجی ، مسرت و طمانیت ، پرامیدی اور رجائیت بھی تھی ۔

اصغر کی اس مزاجی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے منظیر صدیقی صاحب لکھتے ہیں :

" ان (اصغر) کے احباب نے ان کو کبھی مایوس ، پریشان ، ملول یا افسردہ نہیں پایا .... اصغر صاحب ہر حال میں آسودہ مطمئن اور شگفتہ رہتے تھے یہی نہیں ان کی طمانیت آسودگی اور سکون ان کے ہم نشینوں میں بھی منتقل ہو جاتا ۔

۱۔ اصغر صاحب ۔ از سید رشید احمد ۔ جامعہ دہلی ، اپریل ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۰۸-۲۰۷

آپ کسی الجھن یا پریشانی میں ہوئے اگر اصغر صاحب کے پاس
تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے آئے تو دل و دماغ کی فضا بدل گئی[1]"۔

اصغر کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب جلیل قدوائی لکھتے ہیں :

" بڑے سے بڑے واقعہ کو وہ ایک بے نیاز تبسم کے ساتھ سنتے اور
ان کی پرسکون طبیعت میں کوئی ہیجان نہ پیدا ہوتا ۔ بعض
دفعہ ان پر بے حس ہونے کا شبہ ہونے لگتا .... بارہا
ان کے پاس کسی افتاد سے متاثر ہو کر گیا مگر یہ احساس لے کر
پلٹا کہ یہ تو دنیا کا ایک نہایت معمولی واقعہ ہے ....
وہ .... ہر واقعہ کو انفرادی کے بجائے دنیا کی کسی بسیط
حقیقت کا جزو بنا دیتے اور مثنوی مولانا روم کی ایک حکایت سنا
کر، یا حضرت مجدد الف ثانی رح کا کوئی واقعہ بیان کرکے یا
حافظ یا اقبال کا کوئی شعر پڑھ کر اس واقعہ کی تلخی کو ہوا
میں اڑا دیتے[2] ۔"

(۷) اجتہاد :

پامال راہوں سے بچ کر چلنا اور اپنے لیے نئی راہ نکالنا اجتہاد ہے ۔ صف اول کا فن کار اگرچہ " روایت " سے اپنے فن کا چراغ روشن کرتا ہے مگر اسلاف کے بنے اور روندے ہوئے راستے پر چلنے کو اپنی پست ہمتی اور عجز طبیعت سمجھتا ہے ۔ اسکی جودت و دراکی طبع اسے ہمیشہ نئی دنیا کی تلاش میں مضطرب اور بیقرار رکھتی ہے ۔ آخر کار یہی ذوق اضطراب و تجسس ، ایک روز اسے منفرد راہ پر ڈال دیتا ہے ۔ اصغر کی شخصیت کا ایک اہم اور نمایاں وصف اجتہاد بھی ہے ۔

اصغر کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ضمیر صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

" وہ زندگی کو ایک مخصوص و منفرد زاویہ نگاہ سے دیکھتے تھے
اور فرسودہ قدروں سے ہمیشہ دامن بچاتے تھے[3] ۔"

۱۔ اصغر گونڈوی ۔ از ضمیر احمد صدیقی ۔ شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۳۸۶
۲۔ " اصغر اور میں " ۔ از جلیل قدوائی ۔ مشمولہ انتخاب اصغر طبع اول ۔ ص ۳۲-۳۱
۳۔ اصغر گونڈوی ۔ از ضمیر احمد صدیقی ۔ شخصیات نمبرجلد دوم ۔ ص ۱۳۸۵

اسی بات کو دوسری جگہ اسطرح ظاہر کرتے ہیں :

" موضوع اور مواد میں وہی مخصوص اور منفرد طرز فکر وہی عام قدروں سے بچ نکلنے کی کوشش [1] ۔"

مختصر یہ کہ اصغر کی شخصیت کی تخمیر ، طہارت [1] و پاکیزگی ، رنگینی [2] طبع و نفاست پسندی ، جذب و کیف [3] و والہانہ از خود رفتگی ، سجیدگی [4] و توازن ، حیا و بے نفسی [5] ، مسرت و [6] طمانیت اور اجتہاد و کاوش سے ہوئی تھی ۔ انہی سات مختلف رنگوں نے ان کی شخصیت کو ، قوس قزح کی طرح رنگین ، دلکش اور حسین بنا دیا تھا اور جب ان کی شخصیت کی " قوس قزحیت " اشعار میں جلوہ گر ہوئی تو ان کی شاعری بھی رنگین ، حسین ، دلکش اور منفرد ہوگئی ۔

...

" مولوی اصغر صاحب کی شاعری ان کی زندگی کا عکس ہے "

سر تیج بہادر سپرو

شاعری میں شخصیت کی جلوہ گری :

(۱) ماضی کی حسین یادیں : اوپر اشارہ گزر چکا ہے کہ توبہ و انابت سے پہلے اصغر کی زندگی لذت گناہ اور نشاط معصیت میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ جوانی کی رعنائیوں سے بھرپور زندگی کا یہ گوشہ گویا ایک پر بہار و رنگین چمن تھا جس میں چاروں طرف پھول کھلے ہوئے تھے ۔ چمن کے بیچوں بیچ ، گنگناتی ، بل کھاتی جوئبار بہہ رہی تھی جس سے مس ہو کر چلنے والی ہوا کے لطیف و خوشگوار جھونکوں نے بھی فضا میں مستی و خواب آلود دھند بکھیر دی تھی ۔ ایک " مرغ نوخیز " اس خنک شباب خیز و رومان پرور فضا سے جی بھر کے تمتع و لذت لے رہا تھا ـــــ کبھی نرگس سے آنکھیں ملاتا ، کبھی سوسن کی زبان پکڑتا ، کبھی گل کے رخسار چومتا اور کبھی چنبیلی کی نازک باہیں گلے میں حمائل کرتا ۔ خوب لطف اور چین سے دن گزر رہے تھے کہ ایک روز اس نشے سے چھک اور ماحول سے اوب اور تھک کر ، آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے پر تولے ، اڑا ہی تھا کہ صیاد نے کھینچ مارا ، " مرغ آزاد " گرفتار ہو گیا ۔ اب کنج قفس ہے اور چمن کی تڑپا دینے والی یادیں ـــــ

۱۔ اصغر گونڈوی ۔ از ضمیر احمد صدیقی ۔ شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۲۸۵

اصغر بھی جس زار شباب سے اسی طرح متمتع ہو رہے تھے کہ روح کی تشنگی نے تڑپا دیا اس سے نکلے ہی تھے کہ انہیں رسوم و قیود میں جکڑ دیا گیا، اور وہ شباب کی کافر یادوں کو سینے سے چمٹائے تقویٰ و تقدس کے قید خانے میں بند ہوگئے ۔ گزشتہ یادیں رہ رہ کر ابھرنا چاہتی ہیں مگر ضبط نفس دبا دیتا ہے ، وہ اظہار چاہتی ہیں لیکن تقدس و حیا مانع آتے ہیں ۔ ایک کشمکش ہے کہ دل و دماغ میں جاری ہے ۔ اسی کشمکش میں " جگر پارہ ہائے خوں آلود *" اشعار میں ڈھل نکلتے ہیں ۔

مذکورہ بالا پس منظر میں جب اصغر کے درج ذیل اشعار کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو ان میں گزشتہ رنگین زندگی کی پھانس اور کھٹک محسوس ہوتی ہے ۔ ان میں ماضی و حال کے درمیان ایک نفسیاتی کشمکش دکھائی دیتی ہے ۔ صاف نظر آتا ہے کہ اصغر اگرچہ تائب ہو چکے ہیں لیکن ماضی کی رنگینیاں اب بھی " آشیان ، چمن اور بہار " کی طرح پرکشش و پرکیف اور موجودہ زندگی " قفس و خزاں " کی طرح بے کیف ہے ۔ جو کچھ کہا گیا ہے ، اسکی وضاحت و شہادت میں اشعار درج کئے جاتے ہیں :

۱۔ یوں نہ اس دور خزاں کو بے حقیقت جانئے
پرورش پائی ہے اس نے زیر داماں بہار

۲۔ لباس زہد پھر ہو کاش نذر آتش صہبا
کہاں کھوئی ہوئی جرات رندانہ برسوں سے

۳۔ پیری میں عقل آئی تو سمجھے کہ خوب تھی
ڈوبی ہوئی نشاط میں غفلت شباب کی

۴۔ سنا ہے حشر میں شان کرم بیتاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاع ذوق عصیاں کو

۵۔ رحمت حق نے بہت دیکھ لی طاعت کی بہار
اب ذرا سامنے رسوائی عصیاں کر دیں

۶۔ میں وہ ہرگز نہیں جس کو قفس سے موت آتی ہو
میں وہ ہوں جس نے خود دیکھا نہ سوئے آشیاں برسوں

۷۔ میں بوالہوس نہیں کہ بجھاؤں گا تشنگی
میرے لئے تو اٹھتی ہیں موجیں سراب کی

۸۔ نہ پوچھو مجھ پہ کیا گزری ہے میری مشق حسرت سے
قفس کے سامنے رکھا رہا ہے آشیاں برسوں

(*) جو عرض ہے اسے اشعار کہیں مرے کہئے اچھل رہے ہیں جگر پارہ ہائے خوں آلود (اصغر)

اقتباس بالا کے پہلے پانچ اشعار میں صرف یہی نہیں کہ پچھلی زندگی کے متعلق واضح اشارات ملتے ہیں بلکہ ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کو دوبارہ " لباس زہد نذر آتش صہبا " کرنے کی حسرت ہے ، اسے جرات رندانہ کے کھو جانے پر افسوس ہے - بچپن میں جب اسے عقل آئی تو اس نے سمجھا کہ " ذہن ہوش نشاط میں غفلت شباب کی " ، خوب تھی اس احساس سے کہ " متاع ذوق عصیاں " کے لیے ، حشر میں شان کرم بے تاب نکلے گی اس نے اسے سینے سے لگا رکھا ہے - اس نے جب یہ محسوس کیا کہ " رحمت حق " کے لیے " طاعت کی بہار " میں کوئی جاذبیت نہیں ہے تو اس نے فوراً " رعنائی عصیاں " کو سامنے کر دیا - ان تمام اشعار سے مترشح ہوتا ہے کہ اصغر کے دل و دماغ میں گزشتہ زندگی کی حسین یادیں رچی بسی ہیں اور وہ ان سے بےحد طرح متلذذ و متکیف ہو رہے ہیں اور ماضی کی طرف بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں -

چھٹے اور ساتویں شعر میں وہ نفسیاتی کیفیت پائی جاتی ہے جسے " کشمکش " سے تعبیر کیا گیا - ان اشعار کا اعترافی انداز خود اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ شاعر اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں ہے - اسکے دل میں تذبذب کی چبھن ہے، اور دل کا یہی کانٹا* شعر بن کر زبان سے نکل پڑا ہے - اشعار درج ذیل ہیں :

" میں وہ ہرگز نہیں جسکو قفس سے موت آتی ہو + میں وہ ہوں جس نے خود دکھادہ سوئے آشیاں برسوں
میں بوالہوس نہیں کہ بجھاؤں کا تشنگی میرے لئے تو اشکشی ہیں موجیں سراب کی "

ان اشعار میں اس بچے کی نفسیات کارفرما ہے جو پٹنے اور کھلونا چھن جانے کے بعد اپنی شکست ، احساس محرومی اور کھلونے کی آرزوئے شدید کی تلافی کھلونے کو برا کہہ کے ، اور اس سے اپنی برات اور بیزاری کا اظہار کرکے، کرتا ہے - اور اپنی چوٹ کھائی ہوئی " انا " کی تسکین " میں - میں " سے کرتا ہے اور جو دوسری کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور اپنے نفس کو فریب طفلانہ دینے کے لیے چیخ چیخ کر اعلان کرتا ہے " میں نے خود کھلونا نہیں لیا - میں کوئی برا بچہ ہوں جو اسکے لئے روؤں - وہ خراب اور گندہ ہے - "

اشعار بالا میں " میں وہ ہرگز نہیں " اور " میں بوالہوس نہیں " میں اعتراف شکست کے ساتھ اپنی پاکدامنی کا اعلان ، " قفس میں موت آتی ہو " اور " بجھاؤں کا تشنگی"

(*) " دل کا کانٹا زباں سے نکلا " ---- غالباً داغ دہلوی

میں احساس محرومی و بیزاری اور " خود سوئے آشیاں نہ دیکھا " اور " میرے لیے تسو اٹھتی ہیں موجیں سراب کی " میں دبی ہوئی للچاہٹ کے ساتھ طفلانہ تسلی ہے -

آخری شعر میں ایک دوسری قسم کی کشمکش ہے - " آشیانہ " ------ (گناہوں کی حسین زندگی) دعوت نظارہ دے رہا - قفس ---(زہد و تسخرلا کی نازک تیلیاں) ، اس تک پہونچنے میں روکاوٹ بنا ہوا ہے - وہ آشیانے کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے - لیکن قید ہے وہ قفس کو لے کر اڑ جانا چاہتا ہے - مگر " قید قفس* میں طاقت پرواز " نہیں پاتا - دل خون ہو جاتا ہے اور وہ کلیجہ مسوس کے رہ جاتا ہے - آشیانے کی طرف للک کر بڑھنے اور بے بسی سے دبک رہنے کا کھیل ایک دو روز نہیں سالوں جاری رہتا ہے - اس کشمکش میں اسے کتنا خون تھوکنا پڑا ہے اسکا سمجھنا مشکل نہیں - درج ذیل شعر میں اسی کیفیت کا اظہار ہے ؎

نہ پوچھو مجھ پہ کیا گزری ہے میری مشق حسرت سے
قفس کے سامنے رکھا رہا ہے آشیاں برسوں

غرضیکہ مندرجہ بالا اشعار میں اصغر کی گزشتہ رنگین زندگی کا عکس ، اسکے لیے تڑپ اس سے محرومی کا احساس ، پرحسرت آہیں ، سطح شعور پر کلبلاتی اور کشمکش یادوں کو تحت الشعور میں دبا دینے کی کوشش ، ان سے بیزاری کا اظہار اور اپنی پاکیزگی اور تقدس مآبی کا اعلان صاف سنائی دیتا ہے -

(۲) مرشد کے متعلق اشارات : اصغر کی زندگی میں سب سے اہم واقعہ قاضی عبدالغنی رحمہ صاحب سے ان کی ملاقات ہے - یہ ملاقات تھی تو بڑی ڈرامائی** لیکن نتیجہ و اثر کے اعتبار سے بڑی دوررس اور مبارک ثابت ہوئی - اصغر نکلے تھے شیخ محمد عمر صاحب کی تلاش میں راستے میں مل گئے قاضی صاحب - ان کی پرکشش و جاذب شخصیت بجلی بن کر اصغر کے ہوش و خرد پر کچھ اسطرح گری کہ انھیں یہ بھی ہوش نہ رہا کہ وہ کسی اور

(*) قید قفس میں طاقت پرواز اب کہاں   رعشہ سا کچھ ضرور ابھی بال و پر میں ہے
اصغر

(**) تفصیل کے لیے دیکھئے مضمون مشیر احمد صدیقی کا مضمون " اصغر گونڈوی " مشمولہ نقوش شخصیات نمبر جلد دوم - ص ۱۲۸۳

کی تلاش میں نکلے ھیں ۔ وہ سب کچھ بھول کر ، قاضی صاحب کے ساتھ ھو لئے اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ھوگئے ۔ بعد میں جب احساس ھوا کہ یہ سب کہاں کر اور کیسے ھوگیا تو دل نے لقمہ دیا " تمہارا یہ خیال غلط ھے کہ تم کسی کی تلاش میں نکلے تھے ، حقیقت یہ ھے کہ کوئی شخص تم کو سراپا لے لینے کے لئے بے چین تھا ؎

میں سمجھتا تھا مجھے ان کی طلب ھے اصغر

کیا خبر تھی وھی لے لیں گے سراپا مجھ کو

اور حقیقت یہ ھے کہ قاضی صاحب نے اصغر کو کچھ ایسا سراپا لے لیا کہ ان کی زندگی یکسر اور ھمیشہ کے لیے بدل گئی[1] ۔ اس کا اظہار وہ اسطرح کرتے ھیں ؎

اب وہ زماں نہ وہ مکاں اب وہ زمیں نہ آسماں

تم نے جہاں بدل دیا آ کے مری نگاہ میں

لیکن اصغر کی زندگی میں یہ تبدیلی آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ آئی ھے ۔ اس تبدیلی کے تمام مدارج و مراحل کے متعلق اشارات ، ان کے کلام میں ملتے ھیں ۔

سب سے پہلا اشارہ تو اس روح پرور ملاقات کے متعلق نظر آتا ھے جسکی شدت تاثر اور کیفیت و سرشاری کو اصغر کبھی نہ بھلا سکے ، جس سے ھمیشہ لذت اندوز ھوتے اور شگاہ ناز کے لیے تڑپتے رھے ۔ اس کیفیت کا اظہار اشعار میں اسطرح کرتے ھیں :

پہلی نظر بھی آپ کی ان کس بلا کی تھی   ھم آج تک وہ چوٹ ھیں دل پر لئے ھوئے

جانبازوں کے سینے میں ابھی اور بھی دل ھیں   پھر دیکھئیے اک بار محبت کی نظر سے

سطور ماقبل میں اشارہ گزر چکا ھے کہ اگرچہ قاضی صاحب سے ملاقات کے بعد اصغر کی زندگی میں انقلاب آ چلا تھا تاھم کبھی کبھی گزشتہ زندگی کی رنگینیوں کو للچائی اور حسرت بھری نظروں سے دیکھتے اور ان کی یادوں سے لطف اندوز ھوتے نظر آتے ھیں ۔ لیکن ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ھے کہ ان کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رھی ۔ قاضی صاحب کی شخصیت دھیرے دھیرے ان پر اثر کرتی اور چھاتی چلی گئی ۔ یہاں تک اصغر اپنے اندر قاضی صاحب کے لیے ایک خاص قسم کی روحانی کشش اور تڑپ اور چاہنے لگے ۔ اب ان کی زندگی ایسے مرحلے میں داخل ھو گئی جہاں قاضی صاحب کا تصور و خیال ان کی روحانی مسرت و انبساط کا موجب، ان کی " برق نگاہ ،، دل و دماغ کے لیے شادابی نشاط ، ان کی " نگاہ " ھوش ربا " ،

۱۔ اصغر گونڈوی از منیر احمد صدیقی ۔ نقوش شخصیات نمبر جلد دوم ۔ ص ۱۳۸۳

" میخانے کی روح " اور " معنی مے خانہ " ، اور ان کی ہر جنبش خرام ، کوثر کی موج نظر آنے لگی ۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس کی شہادت میں اصغر کے اشعار درج ذیل ہیں:

وہ اک دل و دماغ کی شادابی نشاط ۔۔۔ گویا چمک کے اٹھ تری برق نگاہ کا

مے خانے کی اک روح مجھے کھینچ کے دے دی ۔۔۔ کیا کر دیا ساقی نگہ ہوش ربا نے

قربان تری بے کش ہاں اے نگہ ساقی ۔۔۔ تو صورت مستی ہے تو معنی مے خانہ

کیا کہیئے جان خوازی پیکان یار کو ۔۔۔ سیراب کر دیا دل منت گزار کو

کوثر کی موج تھی تری ہر جنبش خرام ۔۔۔ شاداب ہو گیا چمنستان آرزو

مرشد سے والہانہ شیفتگی کے نتیجہ میں ، اصغر کی طبیعت میں دنیا اور دنیا کی چیزوں کی طرف سے بے خبری اور بے نیازی کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوگئی کہ " جہاں ان کی نگاہوں میں معدوم ،، ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا ؎

جہاں بھی میری نگاہوں میں ہو چلا معدوم

ارے بڑا غضب اے چشم سحر کار کیا

شعر محولہ بالا میں جہاں مرشد کی " جادو نگاہی ،، کا اعتراف ہے وہیں " جہاں کے معدوم ،، ہونے پر احساس تاسف بھی ہے ---- لیکن جوں جوں اصغر " نگارہ یار کے لطیف اشاروں ،، کے رازداں ہوتے گئے ان میں " ہوشیاری و بیخودی ،، کی ملی جلی کیفیت آتی گئی ، جس میں احساس تاسف کی جگہ احساس طمانیت نے لے لی ۔ سنیے :

بہت لطیف اشارے تھے چشم ساقی کے ۔۔۔ نہیں ہوا کبھی بیخود نہ ہوشیار ہوا

عالم سے بیخبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں ۔۔۔ ساقی نے اس مقام کو آسان بنا دیا

یہاں صاف محسوس ہوتا ہے کہ پچھلی کیفیت کے برعکس " بیخبری و ہوشیاری کی یہ کیفیت ایک " مقام روحانی ،، ہے جس پر فائز ہونے کے بعد وہ دنیا کی زندگی کو " آسان " سمجھنے لگے ہیں ۔ ان کے کلام کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس " مقام " پر پہنچ کر رک نہیں گئے بلکہ آگے بڑھتے رہے اس روحانی صعود میں آخر ایک " مقام " ایسا بھی آتا ہے جہاں محبوب کے علاوہ انہیں کسی اور کی صورت بھی دیکھنا پسند نہیں ؎

اب تو یہ عالم ہے کسی کو بھی نہ دیکھوں ۔۔۔ صورت جو دکھائی ہے تو لے جاؤ نظر بھی

اب وہ ایک ایسے مقام بلند پر پہونچ گئے ہیں جہاں ان میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اس سے پیشتر جس (متقی اور پارسائی کی) زندگی کو وہ قید و بند اور

قفس کی زندگی سمجھتے رہے - وہی تو اصل زندگی ہے ؎

دھوکا ہے یہ نظروں کا بازیچہ ہے لذت کا
جو کنج قفس میں تھا وہ اصل گلستاں ہے

اتنا ہی نہیں، اب قفس سے انہیں محبت ہو گئی ہے ، اب اسکی یاد انہیں تڑپاتی ہے اور جب اضطراب دل بڑھ جاتا ہے تو وہ ایک ایک شاخ آشیاں کو توڑ کے رکھ دیتے ہیں ؎

قفس کی یاد میں وہ اضطراب دل معاذ اللہ
کہ میں نے توڑ کے اک اک شاخ آشیاں رکھ دی

اس مقام پر فائز ہونے کے بعد ، زندگی کے متعلق ان کا نظریہ بدل گیا - زندگی اب مادی و جسمانی لذت کوشی کا نام نہیں - " روحانی لذت " کا نام ہے - اس لیے اب " مرکز توجہ " ایک ایسی ہستی ہے جو " روحانی تسکین " کا ذریعہ ہے - جب وہ ہاتھ میں جام لے لے کر مسکراتا ہے تو ان کی روح جگمگا اٹھتی ہے اور جب وہ ان پر سرور میں نگاہ ڈال دیتا ہے تو یہ " موج مے طہور " میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں - ملاحظہ ہو ؎

ہاتھ میں لے کے جام مے آج وہ مسکرا دیا   عقل کو سرد کر دیا، روح کو جگمگا دیا
اس نے نگاہ ڈال دی مجھ پہ ذرا سرور میں   صاف ڈبو دیا مجھے موج مے طہور میں

اس مرحلے میں ان میں یہ احساس اور خود اعتمادی بیدار ہو جاتی ہے کہ اب " مجھ میں آدم گری " کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے اور اب میں برسوں روحانیوں کو سبق دے سکتا ہوں ؎

ابھی مجھ سے سبق لے محفل روحانیاں برسوں
رہا ہوں میں شریک حلقۂ پیر مغاں برسوں

مختصر یہ کہ قاضی صاحب کا اصغر پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ وہ ان کے عشق میں سرشار اور ان کے رنگ میں از سر تا پا رنگے گئے ---- اصغر نے اپنے کلام میں نہ تو قاضی صاحب کا کہیں نام لیا اور نہ ان کے متعلق کوئی واضح اشارہ کیا - لیکن ان کے متعلق ان کا تاثر اتنا شدید تھا کہ وہ اشعار میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہ سکا - اور جب کوئی صاحب نظر ان کے کلام کا مطالعہ ان کی زندگی کی روشنی میں کرتا اور واقعات کی ایک ایک کڑی کو جوڑتا ہے ، تو اس میں سے قاضی صاحب کی پاکیزہ شخصیت اور اسکے جلو میں اصغر کی شخصیت ابھرتی نظر آتی ہے - گویا اصغر کا کلام ایک ایسا آئینہ ہے

جسمیں اصغر کی شخصیت کا بھرپور عکس ، اور اسکے پیچھے قاضی صاحب کی حسین شخصیت دکھائی دیتی ہے -

(۳) طہـارت و پاکیزگی :
اصغر کے سوانح حیات کا سب سے درخشاں و نمایاں پہلو ان کی سیرت و کردار کی پاکیزگی و طہارت ہے - وہ کبھی آلودہ دامن ضرور ہوئے تھے لیکن جب اس پرمعصیت زندگی سے دامن جھٹک کے نکلے تو ایسے پاک و پاکیزہ نکلے جیسے شکم مادر سے بچہ طیب و طاہر پیدا ہوتا ہے - چونکہ ان کی زندگی میں یہ انقلاب شعور کی راہ سے آیا تھا ، جو خیالات احساس کا منبع و سرچشمہ ہے ، جس سے پھوٹنے والے حرکت و عمل کے سوتے تمام اعضاء و جوارح کو سیراب کرتے ہیں اسلیے ایک بار جب ذہن و دماغ کی تطہیر ہو جائے تو گفتار و کردار کی تطہیر لازم ہو جاتی ہے - اصغر گفتار و کردار دونوں کے غازی تھے ، جسکی شہادت تقریباً تمام معاصر سوانح نگاروں نے دی ہے -- یہاں یہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی شاعری میں یہ تطہیر فکر کسطرح ظاہر ہوتی ہے -

کسی غزل گو کے لیے سب سے نازک مرحلہ وہ ہوتا ہے جہاں وہ " عشق مجازی " کی کیفیات و معاملات اور خارجی حسن کی عکاسی کرتا ہے - محبوب کی سراپا نگاری ، معاملہ بندی اور وقوعہ گوئی کی راہ " پل صراط " کی طرح تلوار کی دھار سے زیادہ باریک و تیز ہوتی ہے جس سے گزرتے وقت شاعر کی فکر ہر لحظہ ڈگمگاتی رہتی ہے - اگر اسمیں ذرا سا شائبہ سفلسافیت آ جائے تو وہ نگڑی ہو کر ، رکاکت و ابتذال کے بھڑکتے ہوئے جہنم زار میں گر پڑتی ہے - اس " پل صراط " سے وہی شاعر بچ کر نکل سکتا ہے جسکے دل و دماغ کا ریشہ ریشہ طہارت و پاکیزگی سے سیراب ہو اور جس نے ان ریشوں سے نکلنے والے خیالات کے تیز رو دھاروں پر ضبط و توازن کا ایسا جالی دار بند باندھ رکھا ہو کہ ایک طرف دھارے کی رفتار میں خوشگواری ، نرمی اور سبک خرامی آ جائے اور دوسری طرف خیالات کی معمولی سی بھی کثافت چھن کر نہ آنے پائے - لیکن جہاں یہ اہتمام نہ ہو وہاں جذبات و خیالات کے تند و تیز دھارے اپنے ساتھ سفلسافیت و رکاکت کا ایسا ڈھیر لاتے ہیں کہ بھی فضائے شاعری متعفن و مکدر ہو جاتی ہے ----- چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سراپا نگاری ووقوعہ گوئی کے میدان میں عام شاعر تو رہے الگ ، بڑے بڑے شعرائے حال و قال و صاحبان جبہ و دستار بھی کھیت رہے ہیں اور ایسی ایسی گلشنی و ناگفتنی کہہ

گئے ہیں کہ شرافت و تہذیب کی نگاہیں شرم سے جھک جاتی ہیں -

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی وضاحت میں مولانا حسرت موہانی کے دو شعر اور جناب مجذوب[1] کے تین شعر پیش کیے جاتے ہیں :

دن کو ہم ان سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے
رسم پابندی اوقات چلی جاتی ہے

حائل جو بیچ میں تھی رزائی تمام شب
اس غم میں ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

حسرت

ہم بھی ہیں سر راہ کھڑے آج حسینو | بن ٹھن کے نہ نکلو کہ لٹا دیں گے نظر ہم
جانے تو نہیں دیجئے نہ اب تابہ سحر ہم | شب ہائے جدائی کی نکالیں گے کسر ہم
اس ناز سے اس شان سے اس تیز روی سے | گزرو گے تو دنیا ہی سے جائیں گے گزر ہم

مجذوب

تمام شعرا میں ان کا انتخاب اس خیال سے کیا گیا ہے کہ یہ دونوں حضرات سیرت و کردار میں بڑے پاک و پاکیزہ اور ظاہراً و معناً صوفی و اہل حال و قال تھے - لیکن جب ہم اصغر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسمیں رکاکت و ابتذال کے برعکس ایک طرح کی پاکیزگی و طہارت کی فضا رچی بسی نظر آتی ہے -

عالم محسوسات سے لذت اندوز ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پانچ حواس بخشے ہیں - لامسہ ، ذائقہ ، باصرہ ، شامہ اور سامعہ - ان میں سے لامسہ و ذائقہ کی تسکین و سیرابی ممکن نہیں جب تک جسم و مادہ کا تماس نہ ہو - یوں تو باصرہ بھی (بیشتر صورتوں میں) جسم و مادہ کا متقاضی ہے لیکن اس سے لذت و کیفت

۱- خواجہ عزیزالحسن غوری مجذوب ، ڈپٹی کلکٹری سے ملازمت شروع کی - قانون شریعت کے خلاف دوسرے قوانین کے تحت فیصلے کرنے پڑتے تھے اس لیے مستعفی ہوگئے - ان کی خدمات حکومت ہند نے محکمہ تعلیمات کو منتقل کر دیں - آخر زمانے میں الہ آباد میں انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے پر فائز رہے - سخت قسم کے متشرع بھی تھے اور صوفی بھی - صوفی صرف شاعرانہ حد تک نہیں بلکہ واقعتاً اپنے وقت کے ایک بڑے شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانوی رح کے مرید خاص اور خلیفہ (مجاز) تھے -

نقوش شخصیات نمبر جلد دوم - ص ۹۳۶-۹۳۷

کو حاصل کرنے کے لیے قرب و تماس سے زیادہ بعد ضروری ہے ۔ گویا باصرہ ان دونوں (لامسہ و ذائقہ) سے زیادہ لطیف حس ہے ۔ اس لحاظ سے شامہ اور سامعہ لطیف ترین حواس ہیں ۔ کیوں کہ جسم و مادہ کا بعد بتدریج ، بڑھتے رہنے کے باوجود ان کی سیرابی و تسکین میں کوئی قباحت نہیں پیدا ہوتی بلکہ بعض صورتوں میں تو اگر اشیائے محسوس حواس کی آخری حدوں پر ہوں تو زیادہ لذت بخش و سکون پرور ہوتی ہیں ۔

ان حواس پنجگانہ میں تاثر و استعمال کی صلاحیت بڑی حد تک تو فطری ہوتی ہے لیکن تربیت و تہذیب کے ذریعے کسی قدر ان کا " ترفع " بھی ہوتا ہے ۔ حواس کا " ترفع " یہ ہے کہ اسکا قدم جسمانیت و مادیت (لمس و ذائقہ) سے لطافت (رنگ و بو) کی طرف بڑھے ۔ جہاں " ہاتھوں کی جنبش " کے مقابلے میں " آنکھوں کا دم " اور " مشام کی رمق " لذت اندوزی کے لیے کافی ہوں ۔ یہ مقام " معذوری " بھی ہے جو ہمیں غالب کے یہاں ملتا ہے اور " مقام ترک و ترفع " بھی جو اصغر کے یہاں نظر آتا ہے ـــــ مختصراً یہ کہ رنگ و بو کی دنیا ، لمس و ذائقہ کی دنیا سے زیادہ لطیف و پاکیزہ ہے ۔ اس لحاظ سے جن شعرا کے کلام میں جتنی زیادہ " لمس و ذائقہ " ـــــ " جسم کی آنچ " ، " بدن کا لمس " اور " تنفس کی گرمی " کی تجسیم و پیکر تراشی ہوگی اسکی شاعری مادیت و جسمانیت (جسکے اظہار میں ذرا سی بے احتیاطی اور بے لگامی فضائے شاعری کو متعفن و مکدر بنا دینے کے لیے کافی ہے) سے اتنی ہی زیادہ قریب ہوگی ۔ اسکے برعکس جسکے یہاں جتنی زیادہ لطیف حواس کی تصویرکشی ہوگی، اتنا ہی زیادہ اسکا کلام پاک و پاکیزہ ہوگا ۔

اصغر کے کلام کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ " ان کی جان آنکھوں میں کھنچ کر آ گئی تھی " ۔ انھوں نے دنیا کو صرف دیکھا تھا چھوا یا مس نہیں کیا تھا ۔ بہت ممکن ہے " لمس و ذائقہ " کی شاعری " دور جاہلیت " کے ساتھ دریا برد ہو گئی ہو ۔ بہرصورت اس وقت ان کے کلام کے جو مجموعے موجود ہیں ان میں سوا حسب ذیل دو شعروں کے ، کسی اور شعر میں " لمسی کیفیت " کی مصوری نہیں ملتی ۔ وہ اشعار یہ ہیں ؎

کچھ نہ ہم سے ہو سکا اس اضطراب شوق میں
ان کے دامن کو مگر اپنا گریباں کر دیا

قفس کی یاد میں یہ اضطراب دل معاذ اللہ

کہ میں نے توڑ کر اک اک شاخ آشیاں رکھ دی

ان اشعار میں چشم تخیل کے سامنے " دامن کے تار تار ہونے " اور " اک ایک شاخ آشیاں کے توڑنے " کا نقشہ پھر جاتا ہے ---- اگرچہ دونوں لمساتی کیفیت کے مرقعے ہیں مگر " زور اضطراب " کی دیوانگی نے ان میں معصومیت پیدا کر دی ہے -

اصغر کے کلام میں سب سے زیادہ عکاسی " دید " کی ملتی ہے - باصرہ کی تسکین کے لیے انھوں نے بڑی رنگین اور حسین شعری تصویریں بنائی ہیں - لیکن ان میں ان کی لطافت طبع نے ایسے ہلکے ہلکے رنگ بھرے ہیں کہ بیشتر تصویریں معصومیت و لطافت کا مرقع بن گئی ہیں - ان کے کلام میں سراپائے انسانی کی زیادہ سے زیادہ شوخ اور عریاں تصویریں ذیل کے اشعار میں نظر آتی ہیں :

(۱) بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشم مست پر

ہلکا سا ابر بھی سر میخانہ چاہیے

(۲) جلوۂ رنگیں اتر آیا نگاہ شوق میں

ہم لطافت جسم کی اے سیم تن دیکھا کئے

(۳) اٹھے عجب انداز سے وہ جوش غضب میں

چڑھتا ہوا اک حسن کا دریا نظر آیا

شاعر نے پہلے شعر کی فضا ایسی چابکدستی سے تیار کی ہے کہ ایک ہی کینوس پر دو پہلو دو تصویریں بنائی ہیں ، دونوں ادھوری ، دھندلی لیکن حسین اور دلکش---- ایک طرف جھٹپٹا وقت ہے ، پہاڑی کے دامن میں سنگ مرمر کا کوئی سائبان ہے ، جسکی پراسرار روشنی میں کچھ چھوٹے بڑے ڈھیر نظر آ رہے ہیں ---- جام و سبو ---- سائبان میں چاروں طرف بادلوں کے دھوئیں بھرے ہوئے ہیں - جنھوں نے ان ڈھیروں کو اور پراسرار بنا دیا ہے ---- اسی کے برابر ایک دوشیزہ زلفیں بکھیرے اسطرح کھڑی ہے کہ چہرہ قریب قریب بالوں میں چھپ گیا ہے - صرف کٹورا سی دو آنکھیں نظر آ رہی ہیں ---- ایسے ہی جیسے بادلوں میں لپٹے ہوئے بلوریں جام ---- یہ بھی فضا ایسی مبہم ، دھندلی اور رومانی ہے کہ قاری کی نگاہ کسی تصویر پر نہیں جم پاتی - فضا کی دھندلاہٹ اور پراسراریت نے تصویروں کو جاذب نظر اور معصوم بنا دیا ہے -

دوسرے شعر میں اگرچہ " جسم " کا لفظ آیا ہے مگر اس کی " لطافت " کوشش کے باوجود " نگاہ تصور " کو " جلوہ رنگیں " سے آگے نہیں بڑھنے دیتی ۔

تیسرے شعر پر تبصرہ جناب اثر لکھنوی سے سنیے :

" غصے میں سانس پھولنے لگتی ہے ، پھر معشوق کا غضبناک ہو کر اٹھنا ۔ ان دونوں کیفیتوں نے مل کر معشوق کو دریائے حسن ، ہر سانس کو ، ہر ادا کو ایک موج بےقرار بنا دیا ۔ کیسا لطیف شعر اور کس قدر دلکش انداز بیان ہے ۔"[1]

سراپائے محبوب کے سلسلے میں شعرا نے خوب خوب گلکاریاں کی ہیں ۔ اسکا قامت ، تبسم ، چشم و نگاہ ، عشوہ و غمزہ اور معاملہ ، غرضیکہ کوئی پہلو نہیں چھوڑا خصوصاً بعض اہل لکھنو نے تو ایسی ہوس انگیز اور عریاں تصویریں کھینچی ہیں کہ سنجیدہ طبیعتیں محظوظ ہونے کے بجائے پڑھ کر مکدر ہو جاتی ہیں لیکن اصغر نے جس پہلو کی بھی تصویر کشی کی ہے اسمیں کسی نہ کسی ایسے لفظ کا التزام ضرور رکھا ہے جس سے پوری شعری فضا میں پاکیزگی کی روح دوڑ گئی ہے ۔ اور جسے پڑھنے کے بعد قاری پر ایک طرح کی روحانی اور وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ کلام اصغر سے مختلف پہلوؤں کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :

تبسم

یہ حسن کی موجیں ہیں یا جوش تبسم ہے
اس شوخ کے ہونٹوں پر اک برق سی لرزاں ہے

یہ دیکھتا ہوں ترے زیر لب تبسم کو
کہ بحر حسن کہ اک موج بیقرار نہ ہو

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

۱۔ روح نشاط پر ایک نظر ۔ اثر لکھنوی ۔ مشمولہ چھان بین ۔ مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنو ۔ طبع اول ۱۹۵۰ ۔ ص ۷۷

رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی

شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

روشنی ہو جگنو کی جیسے شبستاں میں

وہ نقاب کا عالم اس کے مسکرانے سے

رفتار

اس عارض رنگیں پر عالم وہ نگاہوں کا · معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

اس جوئبار حسن سے سیراب ہے فضا · روکو نہ اپنی لغزش مستانہ وار کو

کوثر کی موج ہے تری ہر جنبش خرام · سیراب ہو گیا چمنستان آرزو

قد

اس کا وہ قد رعنا اس پر وہ رخ رنگیں · نازک سا سر شاخ اک گویا گل تر دیکھا

ان تمام محولہ بالا اشعار میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اصغر کی باحیا و لطیف طبیعت نے تشبیہ کے انتہائی رنگیں پردوں میں جسمانیت کو اس طرح چھپا دیا ہے کہ ان میں پاکیزگی و دلکشی آ گئی ہے -

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ " معاملہ بندی " انتہائی نازک مرحلہ ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے شاعر کے مزاج میں حوروں کی پاکیزگی اور فرشتوں کا تقدس ہونا چاہیے - اس جوہر کے فقدان کی صورت میں اسکا مجموعہ شاعری ننگی تصویروں کا نگارخانہ یا " کوک شاستر " بن کے رہ جائے گا -

شعرا نے اکثر اس موقع کی تصویرکشی کی ہے جہاں " عاشق بیتاب " مجبور ہو کر عرض تمنا کرتا ہے - " عرض شوق " پر " حسن کی برہمی " ، " خاموشی " " چہرے کا رنگ متغیر ہو جانا " بڑی پیش پا افتادہ بات ہے - لیکن جس حسین انداز میں اصغر نے اس موقع کی تصویرکشی کی ہے وہ شاعری کی جان اور غزلیت و نزاکت کا ایمان ہے - لیکن اصغر کے کلام سے مثال پیش کرنے سے پہلے جگر کا ایک ہم مضمون شعر پیش کیا جاتا ہے تاکہ موازنے سے ، دونوں کی طبیعتوں کا فرق بھی واضح ہو جائے اور اصغر کی پاکیزگی کی جس خصوصیت کی طرف اشارہ مقصود ہے اسکے سمجھنے میں بھی مدد ملے -

جگر کا شعر یہ ہے ؎

میرے ہجوم شوق پر منہ سے نہ کچھ وہ کہہ سکے · چہرے پہ رنگ آگیا ہاتھ مراد با دیا

" ہاتھ مرا دبا دیا " میں جنسیات کی بڑی نازک عکاسی ہے جسکی فضا یقیناً جرات کی " چرما چاٹی " سے زیادہ پاکیزہ ہے تاہم اس سے بڑے جنسانیت آتی ہے ۔ اب اسی مضمون کے دو اشعار اصغر کے سنیے :-

تمنا اٹھے وہ عارض میرے عرض شوق پر

حسن جاگ اٹھا رہیں جب عشق نے فریاد کی

عارض نازک پہ ان کے رنگ سا کچھ آ گیا

ان گلوں کو چھوڑ کر میں نے گلستاں کر دیا

پہلے شعر میں " عرض شوق " پر " عارض کے تمتما اٹھنے " سے اگرچہ شعری فضا میں ایک طرح کی تخصیص پیدا ہوگئی ہے اور نگاہوں کے سامنے ایک پیکر حسن جمال آ جاتا ہے لیکن " حسن جاگ اٹھا رہیں جب عشق نے فریاد کی " کی تعمیم فوراً اس اثر کو زائل کر دیتی ہے اور قاری تمتمائے ہوئے عارضوں کی رنگینیوں میں صرف حسن کے جاگ اٹھنے کی کسمساہٹ محسوس کرتا ہوا خود بھی اسی ہم بیداری کی کیفیت میں گم ہو جاتا ہے

دوسرے شعر میں اصغر نے " عارض نازک " پر " رنگ سا آ جانے " کو " گلستاں " کہہ کر ، قاری کے چشم تصور کے سامنے رنگ و بو کی ایک ایسی لطیف و پاکیزہ دنیا لا کھڑی کی ہے جس سے روح کو وجد آنے لگتا ہے ۔

غرضیکہ اصغر کے تمام کلام میں کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جو پاکیزگی و شرافت کے اعلیٰ معیار پر پورا نہ اترتا ہو ۔ بھلا جو شخص " گلشن میں فقط رنگ چمن " دیکھنے کا قائل ہو ، اسے " بلبل و گل کی افتاد " اور " نفسیاتی لذت " کی عکاسی سے کیا تعلق؟ :-

بلبل و گل میں جو گزری ہم کو اس سے کیا غرض

ہم تو گلشن میں فقط رنگ چمن دیکھا کئے

پھر ان کا دیکھنا عام انسانوں کا دیکھنا نہیں ہے ۔ ان کی " دید کی معراج " " کچھ نظر نہ آنا " اور " کیف بیرنگی حیرت " ہے :-

انتہا دید کی یہ ہے کہ نہ کچھ آئے نظر

کیف بیرنگی حیرت ہے نظر کی معراج

ظاہر ہے کہ جو شخص " کیف بے رنگی حیرت " میں غرق ہو اسکا تعلق دنیا سے مادہ پرستانہ نہیں ہو سکتا ۔ پاکبازانہ ہوگا ---- ایسا تعلق جو " موج صبا " کا " چمن " سے ہوتا ہے ۔ " موج صبا " جو " غنچہ و گل " کو منہ سے چھوڑنے کے بعد

بھی پاک دامن رہتی ہے ؂

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو

مگر موج صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

مختصر یہ کہ محولہ بالا تینوں اشعار اصغر کی افتاد طبع ، نظریۂ حیات اور طرز زندگی کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں - ان میں اصغر کے مزاج کی وہ کیفیت جسے پاکیزگی و طہارت سے تعبیر کیا گیا ہے پوری طرح ظاہر ہو گئی ہے -

(۳) رنگینی طبع و نفاست پسندی :

رنگینی طبع سے کیا مراد ہے؟ اسکی تعریف کرنا آسان نہیں تاہم یہاں اسکی حدبندی کی کوشش کی جاتی ہے - پھر انھیں حدود و اشارات سے متعلق اصغر کے کلام سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں -

انسان کے وجود اور اسکی فطرت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسکے وجود سے خارج ایک وسیع و بسیط دنیا ہے - اس خارجی دنیا کے قرب و تماس سے اسکے اندرونی نظام میں دو مختلف کیفیات پیدا ہوتی ہیں ایک کشش ، میلان اور نکہت کی ، دوسری ابا ، فرار اور تنفض کی - خارجی اشیاء کی طرف کشش و میلان حسن پرستی ہے اور ان میں زیادہ سے زیادہ حواس کو شریک کرنا اور ان سے لذت اندوز ہونا رنگینی - رنگینی طبع کے تحت انسان دنیا میں حسن کا پرستار اور شیدائی اور لذت اندوزی کے لیے دیوانہ (محاورۃً نہیں لغوی معنوں میں) رہتا ہے - نفس کی اس کیفیت سے اسکے اندر " دنیا بیزاری " کے بجائے ، اس سے شفتگی و وابستگی ، ترک و رہبانیت کے بجائے اسکو اپنانے کی خواہش اور تنفض و تکدر کے بجائے خوش طبعی اور زندہ دلی کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں - اور " نفاست پسندی " اس " حس لطیف " کو کہتے ہیں ، جس سے انسان میں پاکیزگی و صفائی کا خیال ، نرمی و نزاکت کا احساس ، شائستگی و شرافت کی کیفیت ، چیزوں کی نوک پلک پر نظر اور انھیں سلیقے سے برتنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے ان دونوں کیفیات (رنگینی و نفاست پسندی) کے میل سے انسان میں ایک ایسی صوری کیفیت ابھرتی ہے ، جس سے اسکا ظاہر و باطن دونوں مستنیر و مستفیض ہوتے ہیں - اسکی وضع قطع ، چال ڈھال ، رفتار و گفتار اور خیالات و افکار ---- ہر چیز میں یہ کیفیت منعکس اور جلوہ گر نظر آتی ہے - بالفاظ دیگر رنگین طبع و نفاست پسند شخص کا ظاہر بھی مرتب ، مودب اور مرصع ہوتا ہے اور اس کا باطن بھی شائستہ ، مہذب اور

آراستہ ہوتا ہے ---- گویا وہ ایک ڈھلا ہوا شعر ہوتا ہے جسکے دونوں مصرعے(ظاہر و باطن) برجستہ و موزوں ہوتے ہیں ---- ایسے شخص کو ہم شاعر مزاج اور رومان پسند بھی کہتے ہیں - " رومان جو انسان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے پستی کی طرف نہیں جسکے معنی مزاج و خیال کی رنگینی کے ہیں - مطالبات جنسی کے ہرگز نہیں [1] " - ایسا شخص طبعاً شاعر ہی ہوتا ہے لیکن اگر اصطلاحاً بھی وہ شاعر ہو یعنی اس میں اپنے جذبات و احساسات کے اظہار و ابلاغ کی وہ صلاحیت بھی ہو جسے عرف عام میں شاعری کہتے ہیں تو طبیعت و مزاج کی یہ رنگینی اسکے کلام میں بھی در آئے گی -

اصغر کے سلسلے میں جب رنگینی طبع و نفاست پسندی کا ذکر کیا گیا تھا ، تو اس سے مراد شخص کے یہی کوائف تھے جن کی تفصیل سطور بالا میں دی گئی ہے ---- اس حیثیت سے اصغر کی شاعری کے ظاہر ---- یعنی اسلوب و ادا میں بھی رنگینی و نفاست ہے اور اسکے باطن ---- یعنی موضوع و مواد میں بھی -

اسلوب و طرز ادا کی رنگینی سے بحث مضمون کے تیسرے حصے ---- شاعری کی کیفیت و درجہ ---- میں کی جائے گی - البتہ رنگینی طبع کی کیفیات --- (۱) حسن پرستی اور حسن سے وابستگی (۲) لذت اندوزی اور (۳) خوش طبعی اور زندہ دلی سے بحث سطور آئندہ میں کی جاتی ہے -

گزشتہ سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے رنگین طبع انسان دنیا کو حسن کی جلوہ گاہ اور لذت اندوزی کا وسیلہ سمجھتا ہے - اصغر کا نقطہ نظر بھی یہی ہے وہ دنیا کو " فریب رنگ و بو " نہیں بلکہ " جلوہ گاہ ناز " کہتے اور سمجھتے ہیں - وہ اسکی طرف از خود بھی لپکتے ہیں اور حسن بھی دعوت دیتا اور جانبازی کی التجا کرتا ہے اور حسن کے ہر تقاضے پر ان کی نگاہ سجدہ ریز ہو جاتی ہے - کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :

یہ حسن دوست ہے اور التجائے جانبازی
تجھے یہ وہم کہ یہ کائنات عالم ہے

تو بہت سمجھا تو کہہ گزرا " فریب رنگ و بو "
یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہ ناز ہے

۱- " یادرم کی یاد میں " - از رشید احمد صدیقی - گنج ہائے گراں مایہ - ص ۱۷۵ بادنیٰ تصرف -

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں
میری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسن بار ہوا

لیکن " حسن " کی طرف سے " التجائے جانبازی " اور " تقاضا " کے احساس کے باوجود انھیں یہ بھی احساس ہے کہ " حسن " بے نیاز ہے - مگر اس " بے نیازی " سے ان میں مایوسی نہیں پیدا ہوتی وہ " پردہ گل " میں " چھپے ہوئے اشاروں " سے دل کو تسکین پہونچاتے اور خوش کرتے رہتے ہیں ؎

" حسن کی بیگانگی و بے نیازی سب بجا
اس پہ چھپ کر پردہ گل سے اشارا کیجئے "

---- یہی نہیں کہ " بیگانگی حسن " سے ان میں احساس محرومی اور یاسیت نہیں آتی بلکہ اسکے برعکس انھیں اس میں لطف آتا ہے - وہ " مذاق عاشقی " کی تجدید چاہتے اور " مرمر کے جئے جانے " کے قائل و خواہش مند ہیں - تجدید محبت ان کے لئے لذت بخش ہے اس لیے وہ اس شغل کو جاری رکھنا چاہتے ہیں - سنیے ؎

اک دل بیتاب پھر پہلو میں میں پیدا کروں
مسکرا کر پھر ذرا مجھ سے تقاضا کیجئے
پرورش پاتا ہے رگ رگ میں مذاق عاشقی
جلوہ پھر دکھلائیے پھر مجھ سے پردا کیجئے
جانبازوں کے سینے میں ابھی اور بھی دل ہیں
پھر دیکھئے اک بار محبت کی نظر سے

مختصر یہ کہ اصغر دنیا کو "ساءۂ بے مایہ" نہیں سمجھتے بلکہ ایک ایسی " حقیقت " سمجھتے ہیں جس سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے اور وہ اس سے لذت اندوز ہوتے ہیں - ان کے کلام میں زندگی سے بیزاری و فرار نہیں ہے (جیسا کہ عام طور پر نقادوں نے کہا ہے) - ان میں زندہ رہنے کی شدید خواہش اور دنیا کی چیزوں کے لیے تڑپ اور ہمک ہے - اسی تڑپ سے ان کے اندر زندہ دلی اور خوش طبعی پیدا ہوئی ہے - جن لوگوں نے ان کے یہاں فرار دیکھا ہے وہ اس حقیقت تک نہیں پہونچے کہ وہ زندگی سے مایوس ہونے کے بجائے اس پر نگاہ غلط انداز ڈالتے یا اسکی ناکامیوں سے بے نیازانہ گزر جاتے ہیں - ان کی بے نیازی ملاحظہ ہو ؎

بیٹھا ہے ایک خاک نشیں محو بیخودی

کچھ حسن سے غرض ہے نہ پروائے عشق ہے

وہ اپنی اس بے نیازی بلکہ بقول جناب جلیل قدوائی بے حسی کی نفسیاتی توجیہہ بھی کر جاتے ہیں ؎

بار الم اٹھایا ، رنگ نشاط دیکھا

آئے نہیں ہیں یوں ہی انداز بیحسی کے

اور اگر کبھی " درد عاشقی " ، " چارۂ حرماں " یعنی موت کی طرف ان کو دعوت دیتا ہے تو وہ اسے یہ کہہ کر دھتکار دیتے ہیں ؎

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ درد عاشقی کے

ہم مر کے کیا کریں گے کیا کر لیا ہے جی کے

مذکورہ بالا مثالوں سے اصغر کا نقطہ نظر واضح ہو جاتا ہے -- وہ زندگی کو برتنے ، اس سے دل بہلانے اور خوش رہنے کے قائل ہیں - اس حیثیت سے ان کا نقطہ نظر رجائی ہے - خوش طبعی اور زندہ دلی --- رجائیت ہی کا ایک پہلو ہے ، اس سے تفصیلی بحث مسرت و طمانیت کے تحت کی گئی ہے -

(۵) جذب و کیف و والہانہ از خود رفتگی :

جذب و کیف شخص کی وہ کیفیت ہے جسمیں انسان کسی واقعہ سے (خواہ مادی ہو یا روحانی) اس درجہ متاثر ہوتا ہے کہ " مست و بیخود " ہو جاتا ہے - اس پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے - اور اسکی روح اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہو کر " خود میں مست " ہو جاتی ہے - بعض صورتوں میں اس پر رقص و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے - اس پر سر تا پا جذبہ مستولی ہوتا ہے جسکی گرمی سے گداز دل اور رقت قلب بڑھ جاتی ہے - چونکہ جذبے سے جذبے کو تحریک ہوتی ہے اسلیے دیکھنے والے بھی متاثر ہوتے ہیں - ایسے شخص کی زبان سے اگر کوئی بات نکلے تو جذبے میں ڈوبے ہوئے الفاظ سننے والوں میں بھی رقت و گداز اور ان کے قلب و دماغ میں بھی وہی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں --- جذبے کی شدت اپنے حامل کو اس درجہ مغلوب کر دیتی ہے کہ وہ اسکی رو میں بہنے لگتا ہے (بالکل لفظی معنوں میں) اور خود کو اپنے عامل (جسکی وجہ سے اس پر یہ کیفیت طاری ہوئی تھی) کے سپرد کر دیتا ہے - خود سپردگی اصغر کی شخصیت کی بڑی بنیادی خصوصیت تھی - دور رندی و سرشاری میں

وہ منہیات میں غرق ہوئے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بہت شدید التاثر و شدید الاستعمال تھے - مرشد کی خدمت میں پہونچے تو خود کو ان کی یادوں اور صحبتوں میں غرق کر دیا اور رنگ میں رنگ لیا - جب مرشد نے " ذکر " کا حکم دیا تو " رقت " اور آواز کی گلوگیری کی بدولت ، باوجود کوشش کے اسے جاری نہ رکھ سکے[1] - کبھی ان کے سامنے تلاوت ہوتی یا رسول اکرم ص کا نام لیا جاتا تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے --- جذبہ کی یہی کیفیت و خلوص ان کے کلام میں ملتا ہے - کہیں اس نے جذب و کیف کی شکل اختیار کر لی ہے ، کہیں رقص و مستی کی ، کہیں والہانہ از خود رفتگی کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے اور کہیں رقت و گداز کی - ذیل میں اپنے دعوے کی دلیل میں بلا تنقید و تبصرہ ان کے کلام سے اشعار منتقل کیے جاتے ہیں - پڑھنے کے بعد آپ خود فیصلہ کیجئے کہ کیا ان اشعار کا تخاطب براہ راست جذبے سے نہیں ؟ کیا ان کی چوٹ دل پر نہیں پڑتی ؟ اور کیا ان کے سننے یا گنگنانے سے آپ پر وہی کیفیات نہیں طاری ہو جاتیں ، جن کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے؟ --- اشعار

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کہیں نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں
در پہ جو تیرے آ گیا اب نہ کہیں مجھے اٹھا
گردش مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں
اب وہ زماں نہ وہ مکاں اب وہ زمیں نہ آسماں
تم نے جہاں بدل دیا آ کے مری نگاہ میں

....

یہ ننگ عاشقی ہے سود و حاصل دیکھنے والے
یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے
جنون عشق میں ہستی عالم پر نظر کیسی
رخ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

....

نظر میں وہ گل سما گیا ہے تمام ہستی پہ چھا گیا
چمن میں ہوں یا قفس میں ہوں میں مجھے اب اسکی خبر نہیں ہے

....

۱- اصغر گونڈوی - از صغیر احمد صدیقی - شخصیات نمبر جلد دوم - ص ۱۴۸۴

سکتا جلوہ وہی غارت کن جان حزیں جلوہ

ترے جلوے کے آگے موت کو ہم کیا سمجھتے ہیں

....

بہ ذوق سیر بہ دیدار جلوہ* خورشید

بلا سے قطرہ شبنم کی زندگی کم ہے

....

رقص ہستی دیکھتے جوش تمنا دیکھتے

سامنے لا کر تجھے اپنا تماشا دیکھتے

صد زمان و صد مکاں و این جہاں و آں جہاں

تم نہ آ جاتے تو ہم وحشت میں کیا کیا دیکھتے

....

وہ سامنے ہیں نظام حواس برہم ہے

نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

کہاں زمان و مکان پھر کہاں یہ ارض و سما

جہاں تم آئے یہ ساری بساط برہم ہے

....

دل یہ لیا ہے ، داغ عشق کھو کے بہار زندگی

اک گل تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا

یہ چند اشعار روانی میں دے دیے گئے ہیں ورنہ اس سے کہیں زیادہ اشعار ان کے مجموعات کلام میں بکھرے پڑے ہیں - یہاں دو باتوں کی طرف اشارہ شاید بے محل نہ ہو - اول یہ کہ ان تمام اشعار میں ، وجدانی کیفیت کے ساتھ ایک ایسی موسیقی کی بھی آمیزش کر دی گئی ہے جس سے قلب و روح کی سرشاری اور بڑھ جاتی ہے اور وہ جھوم جھوم اٹھتے ہیں - دوم یہ کہ ان میں " حسن کی دید " سے عشق پر جو کیفیت گزری ہے اسکا اظہار و بیان ہے --- یعنی " حال " ہے اس لیے کیف و اثر سے پر اور " قال " کی بے کیفی و بے اثری سے پاک -

(٦) توازن و سنجیدگی :

توازن ضبط نفس سے پیدا ہوتا ہے - یعنی جب کوئی انسان فطری داعیات و جبلی خواہشات کی تکمیل و تسکین میں کسی ضابطے کے تحت قید و بند لگاتا ہے تو مشق و مواظبت سے اسکے اندر ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ، جو جذبات میں ہیجان و تلاطم کے موقعوں پر ان کے اظہار میں رکاوٹ بن جاتی ہے اسطرح جذبے کے خارجی اظہار سے ضائع ہو جانے والی قوت کو محفوظ رکھتی ہے --- متوازن انسان میں شعور و احساس کچھ اسطرح جذبے میں در آتے ہیں کہ اسکے اظہار و اخراج اور شدت میں ٹھہراؤ اور تعماؤ پیدا ہو جاتا ہے اور اسکی ظاہری سطح پر قعر دریا کا سکوت و وقار آ جاتا ہے - انسان میں ضبط و توازن کی کیفیت اعلیٰ اخلاقی معیار اور بلند و ارفع نصب العین کی پیروی سے بھی آتی ہے کہ جب بھی جذبے کا بہاؤ اسے پستی کی طرف لے جانا چاہتا تو یہ اسے گرنے سے روک لیتے ہیں - اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اصغر کی شخصیت کی ایک اہم اور نمایاں خصوصیت توازن و سنجیدگی بھی تھی - ان کے سوانح سے اسکی مثالیں پیش کی جا چکی ہیں یہاں رشید احمد صدیقی کا ایک چھوٹا سا اقتباس دیا جاتا ہے جسمیں اصغر کی اس مزاجی خصوصیت کی طرف اشارہ ہے - وہ لکھتے ہیں :

" زبان سے مرحبا یا مبارک سلامت کچھ نہ کہتے - البتہ آنکھوں میں خوشی کی چمک ایسی ہوتی کہ مجھے اپنے قلب میں اترتی معلوم ہوتی - لبوں پر مسکراہٹ اور باتوں میں شادی کی وہ گھلاوٹ کہ بیان سے باہر ہے - خوشی کا اظہار اپنے کسی ارادے یا اشارے تک سے نہ ہونے دیتے لیکن سر سے پاؤں تک شگفتہ و زمزمہ سنج معلوم ہوتے "[١]

اصغر کے مزاج کی یہی خصوصیت ---- پروقار خاموشی ، ارادے اور اشارے کو روکے رکھنے کے باوجود سر سے پاؤں تک شگفتگی و زمزمہ سنجی ، تبسم خفیف ----- یعنی روح کی حد درجہ منضبط مسرت و سرشاری کی کیفیت ، جابجا ان کے اشعار میں آ گئی ہے - مثلاً انہوں نے جہاں کہیں محبوب کی انبساطی و ابتہاجی کیفیت کی تصویرکشی کی ہے ، خندہ دندان نما تو رہا ایک طرف ، ان کی سنجیدہ ، لطیف اور پروقار

١- مرحوم اصغر گونڈوی - از رشید احمد صدیقی مشمولہ گنج ہائے گرانمایہ - ص ١٠٦

طبیعت نے " تبسم آشکارا " کو بھی گوارا نہ کیا ،، ۔ اور کبھی " تبسم خفیف " ، " تبسم زیر لب ،، اور " تبسم پنہاں " سے آگے نہیں بڑھے ۔ پھر " تبسم " کو تشبیہہ کے ایسے پردوں میں چھپا کے بیان کیا ہے کہ وہ " کلی کے کھلنے " ، " شبستان میں جگنو کی روشنی " اور " برق لرزاں " سے زیادہ مبہم مگر دلکش ہو گیا ہے ۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی

یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

" مسکرانے کو کلیوں میں جان سی پڑ جانا " کہنا بلاغت اور محاکات کا کمال ہے ۔ ذرا کسی غنچہ دہن محبوب کا شگفتہ چہرہ چشم تصور کے سامنے رکھئے ، جو " تبسم خفیف " کی نورانی شعاعوں سے اور شگفتہ ہو گیا ہو جیسے اکتوبر کی خشک ملیح شام میں ، شبنم کے لطیف چھڑکوں سے چنبیلی کی کسمسائی کلی ۔ کیا اس باریک پردۂ شعر سے اصغر ہی جھانکتے نظر نہیں آ رہے ہیں ؟---- وہی شگفتہ چہرہ ---- وہی شیرینی و گھلاوٹ جو قلب میں اترتی چلی جائے اور وہی سر سے پاؤں تک شگفتگی و زمزمہ سنجی جس سے پوری فضا باغ و گلستاں بن جائے ۔ چند مزید اشعار دیکھئے :

یہ حسن کی موجیں ہیں یا جوش تبسم ہے

اس شوخ کے ہونٹوں پر اک برق سی لرزاں ہے

یہ دیکھتا ہوں شوخی زیر لب تبسم کو

کہ بحر حسن کی اک موج بےقرار نہ ہو

روشنی ہو جگنو کی جیسے شبستاں میں

وہ دستاب کا عالم اس کے مسکرانے سے

رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی

شعاعیں کیا پڑھیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

محولہ بالا اشعار میں ، اوپر کے دو شعروں میں " جوش ابتہاج ،، کے باوجود تبسم زیر لب سے آگے نہ بڑھ سکا ۔ " برق لرزاں " میں ضبط و توازن اور شاعری و بلاغت کا کمال ہے جسکی داد نہیں دی جا سکتی ---- مسلسل ہنسے جانا نہ یہ کہ کوئی اچھی بات نہیں ہے بلکہ شائستگی و سنجیدگی اور ذوق لطیف کے بھی منافی ہے ---- " برق لرزاں " کی تمثیل نے قاری کے تخیل کے سامنے محبوب کے ہونٹوں پر " نور تبسم " کی ایک ہلکی سی لکیر دوڑا دینے کے بعد ، فوراً ہی اسے اوجھل بھی کر دیا ------

تبسم کا رقیقہ قلیل اور ہونٹوں کی " غیر متبسم " کیفیت طویل ---- طویل سایے کے بعد لرزتی ہوئی روشنی کی کرن ، پھر طویل سایہ ، پھر ہلکی کرن ---- ذرا " دھوپ چھاؤں " کی اس کیفیت کو تخیل کے پردۂ سمیں پر گردش دیجئے - پھر ملاحظہ فرمایئے کہ کیا واقعی " شبستان میں جگنو کی روشنی " یا " برق لرزاں " نہیں نظر آتی؟ -

آخری شعر ؎

رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی

شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکل آئی گلستاں کی

پر قلم فرسائی کرنے کے بجائے جناب اقبال سہیل کی تشریح درج کی جاتی ہے - وہ لکھتے ہیں :

" یہاں شباب اور احساس حسن کے مجموعی اثر سے " عارض گلرنگ " پر جو ہلکا سا دروازی تموج ہے اس نے پیکر جمال میں بلا کی دلفریبی پیدا کر دی ہے اور (تبسم پنہاں کی لطیف شعاعوں نے اس سے مل کر جو کیفیت پیدا کر دی ہے وہ) معلوم ہوتا ہے سورج کی شعاعیں پھولوں سے کھیل رہی ہیں رنگ و نور کی اس آمیزش لطیف نے دونوں کی شان دوبالا کر دی ہے -"[۱]

تشریح بالا میں " رنگ و نور " (دو مختلف کیفیات) کی جس آمیزش لطیف کی طرف جناب اقبال سہیل نے اشارہ کیا ہے - فن کار اصغر کے مزاج و شخصیت کی خصوصیت خاصہ ہے --- یعنی ان کے یہاں روشنی و سایہ ---- شوخی و رنگینی اور توازن و سنجیدگی کا بڑا معتدل اور متوازن امتزاج ہے - اسی لیے انھوں نے اپنی بیشتر شعری " تصاویر میں جو رنگ بھرا ہے نہ بہت گہرا اور شوخ ہے نہ بالکل پھیکا اور ہلکا بلکہ ایک خفیف تموج اور تدریجی تشہیر کے ساتھ شوخی و لطافت ، دونوں کی اسطرح آمیزش کی ہے کہ دونوں کے محاسن قائم و نمایاں ہیں - لیکن ایک کو دوسرے سے جدا کرنا دشوار ہے - جس طرح سپیدۂ سحری میں دن کی روشنی اور رات کا سکون مل کر ایک عجیب و غریب سماں پیدا کر دیتے ہیں اور یہ امتیاز دشوار ہو جاتا ہے کہ

۱- تبصرہ بر نشاط روح از جناب اقبال سہیل مشمولہ نشاط روح طبع دوم - ص ۵۵-۵۴

اس طباشیر صبح کی دل فریبی میں شعاع آفتاب کا حصہ زیادہ ہے یا پردہ شب کی اس ہلکی شبہ کا جو اب بھی روئے آفتاب پر نقاب بن کر پڑی ہوئی ہے اور چند لمحوں میں نذر تجلی ہوا چاہتی ہے[1] -

صبح کے اس منظر کا حسین ترین مرقع " صبح بہار " ہوتی ہے - جس میں سایہ و نور خنکی و لطافت اور خوشی و بشاشت کی لطیف ترین آمیزش ہوتی ہے - اصغر کی مذکورہ بالا مزاجی کیفیت کو " صبح بہار " کی تشبیہہ سے ظاہر کیا جا سکتا ہے - درج ذیل شعر میں انھوں نے اپنی شخصیت کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے

ہے سراپا حسن وہ رنگیں ادا جان بہار حسن پر حسن تبسم صبح خندان بہار

مختصر یہ کہ اصغر کے کلام میں ان کی خوشگوار ، معتدل اور متوازن شخصیت " تبسم پنہاں " " تبسم زیر لب " ، " تبسم شگفتہ " اور " صبح بہار " کی علامت بن کر ظاہر ہوتی ہے -

(۷) حسیا و بے حسی :

قصہ آدم میں ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں " آدم و حوا " شیطان کے بہکانے سے " شجر ممنوعہ " کا مزہ چکھ لیتے ہیں اور ان پر ان کے " ستر " کھل جاتے ہیں اور وہ اضطراری طور پر ان کو ڈھانپ لیتے ہیں -

یہاں اس سے بحث نہیں کہ آیا یہ کوئی تاریخی واقعہ ہے جو تاریخ انسانی کے کسی دور دراز عہد میں ایسے ہی رونما ہوا تھا جسطرح بیان کیا گیا ہے ، یا محض تمثیل ہے انسان کی اس ذہنی و جسمانی حالت کی جہاں اس میں " اضافی معنی " کا شعور ابھرتا ہے - نہ اس سے غرض کہ " آدم " کسی فرد خاص کا نام ہے یا انسان کے نمائندے کے لیے بطور علامت آیا ہے - اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ شیطان انسان ہی کے وجود میں چھپا ہوا اس کا نفس ہے جس سے اس پر " بدت ستر " ہوتی رہتی ہے یا اسکے وجود سے خارج کوئی " مخصوص ہستی " - اسی طرح یہ بحث بھی فضول ہے کہ جنت کے معنی " بید اری شعور " سے پہلے کی زندگی ہے جس میں " کسے را با کسے کارے نباشد " کی کیفیت تھی (یا ہوتی ہے) یا جنت سے مراد واقعی لذائذ و نعم سے بھرپور کوئی جیتا جاگتا باغ ہے جس میں آدم کو رہنے کا حکم ملا تھا - اس بحث

۱- تبصرہ بر نشاط روح از جناب اقبال سہیل - مشمولہ نشاط روح طبع دوم - ص ۵۴-۵۵ بادنیٰ تصرف -

کا بھی کوئی فائدہ نہیں کہ "ذائقہ شجر" کے معنی گیہوں یا انجیر کھانے کے ہیں یا "بیداری شعور (Fruit of Consiousness)" کے - قصہ خواہ واقعہ ہو یا تمثیل - اسکے اصطلاحات کی خواہ کوئی تعبیر و تاویل کیوں نہ کی جائے قصے کی شخصیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا - وہ انسانی زندگی کے جن حقایق کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے وہ یقیناً قابل لحاظ اور غور طلب ہیں - میرے نزدیک قصہ جن حقایق کو واضح کرنا چاہتا ہے - وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) جب انسان شیطان کے بہکاوے میں آ جاتا ہے تو اسکے سوات اس پر کھل جاتے ہیں -

(۲) سوات کے کھلنے کا احساس ہوتے ہی وہ انہیں چھپا لیتا ہے - چھپا لینے کا اضطراری فعل وہ فطری شرم و حیا ہے جو اس میں ودیعت کی گئی ہے - تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ آہستہ آہستہ نہیں پیدا ہوئی جیسا کہ بعض "مفکرین مغرب" اور دیسی "طوطیان شیریں گفتار" دہراتے رہتے ہیں -

(۳) "اغوائے آدم" کے لیے شیطان کو، اسکے وجود میں جو سب سے نازک مقام نظر آتا ہے اور جس پر وہ پہلی ضرب لگاتا ہے وہ اسکے "سوات" ہیں ---- یعنی انسانی زندگی میں تمام "شیطانی فتنے" اسی راہ سے آتے ہیں خواہ وہ عورت کے متعلق مزدک کا "مشترکہ ملکیت" کا نظریہ ہو یا اشتراکیت کا "نظریہ 'کوزہ' آب" (Glass-Water Theory) - فرائیڈ کا "نظریہ 'جنس" ہو یا مہذب و متمدن دنیا کی "آرٹ، ثقافت اور فن" کی تعبیر و تشہیر -

(۴) اس جنگ میں "نافرمانی خداوندی" کرکے بظاہر آدم مات کھا جاتا ہے لیکن اگر حقیقتاً دیکھا جائے تو سوات کو چھپا کر وہ اپنے حریف کو پچھاڑ دیتا ہے اور اپنی اخلاقی عظمت ثابت کر دیتا ہے -

(۵) سوات کا چھپانا انسانیت اور اس کا اظہار شیطنت ہے --- اور انسانیت و شیطنت کی یہ جنگ برابر جاری ہے -"[1]

۱- اس پوری بحث میں مولانا سید ابوالاعلی مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن سے استفادہ کیا گیا ہے -

حیا دراصل انسانیت کے اسی قیام و اہتمام ---- یعنی ستر کے چھپانے کا نام ہے ۔ " حیا " کی جو تعریف اوپر بیان کی گئی ہے وہ تو اس کی سب سے " نچلی سطح " ہے جسکے بعد صریح " بے حیائی " شروع ہو جاتی ہے ۔ حیا کے معنی اس سے کہیں زیادہ لطیف و نازک اور اسکے مقام و مراحل اس سے کہیں زیادہ بلند و ارفع ہیں ۔ حیا دراصل ایسے تمام اقوال و افعال ، حرکات و سکنات اور اشارات و کنایات سے اجتناب کا نام ہے جو انسان کی توجہ " ستر " کی طرف منتقل کرکے ، اس میں جنسی رغبت اور اس کی منفی خواہش میں ہیجان و انتشار کا باعث بنیں ۔

سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اصغر نے کس طرح اپنی شاعری میں طہارت و پاکیزگی کی فضا ابھاری ہے یہاں " حیا " کے متعلق ان کی فلسفیانہ توجیہہ پیش کی جاتی ہے ۔

بے محابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی

اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں یہ نظریہ ، عقیدے سے لے کر اقوال و اعمال کے تمام مظاہر میں جاری و ساری رہا ہے ۔ جسطرح ان کے معمولات میں " بے حجابی " کی کوئی مثال نہیں ملتی اسی طرح ان کے لفظی وشعری پیکروں میں بھی " بے حجابی " (جسے جناب عبدالسلام نے خلوص و بیباکی کی کمی سے تعبیر کیا ہے) نظر نہیں آتی وہ ننگی تصویریں نہیں بناتے بلکہ وہ تو اکثر و بیشتر " باحیا شوخی " اور " معصوم بیباکی " کو بھی " حیا " کے دبیز پردوں میں چھپا دینے کے قائل ہیں ۔ مثال میں وہی دونوں شعر پیش کئے جاتے ہیں ، جو " طہارت و پاکیزگی " کے زیر عنوان نقل کیے جا چکے ہیں ۔

تمتما اٹھے وہ عارض میرے عرض شوق پر

حسن چاک اٹھا وہیں جب عشق نے فریاد کی

" عرض شوق " پر عارض کا تمتما اٹھنا ایک فطری و اضطراری فعل ہے اسکے اظہار پر تو اصغر مجبور تھے اگر وہ اس نقش کو نہ ابھارتے تو ان کی شاعرانہ مصوری ناقص رہ جاتی لیکن ایک شریف و باحیا انسان کی حیثیت میں اصغر کے لیے اسکے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ وہ حسن کی اس بے حجابی کو ۔ جس سے بیشتر صورتوں میں عریانی پیدا ہو جاتی ہے زائل کر دیں ۔ چنانچہ دوسرے مصرعے میں فوراً سنبھل گئے اور " حسن چاک اٹھا " کہہ کر جہاں قاری کے سامنے ایک دنیائے معانی لا کھڑی کی وہیں " حسن و عشق " کی تعمیم اور غیر واضح نقوش سے پوری تصویری فضا پر دھندلاہٹ اور ابہام کا پردہ

ڈال دیا ۔

یہی حال دوسرے شعر کا ہے ۔ ملاحظہ ہو ؎

عارض نازک پہ ان کے رنگ سا کچھ آ گیا　　　　ان گلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

یہاں بھی بڑے دبے دبے انداز میں اتنا ہی کہہ سکے کہ " عارض نازک پر رنگ سا کچھ آ گیا " لیکن " گل " گلستاں کیوں کر بن گئے ، وہ کیسی " چھیڑ " تھی جس سے " عارض نازک " گلنار ہو گئے ۔ یہ سب کچھ مقدر چھوڑ دیا گیا ــــ پورے شعر میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو اس طرف رہنمائی کرے ، سوا اسکے کہ قاری خود " بقدر ذوق و ظرف " اس خلا کو پر کرے ۔ پھر اتنا ہی نہیں " سا " کے استعمال نے دھندلی دھندلی ، مٹی مٹی سی ادھ بنی تصویر کو اور بھی دھندلا کر دیا ۔ اصغر کی شاعری میں ابہام و اشاریت کی فضا دوسرے عوامل کے علاوہ بڑی حد تک ان کی فطری شرم و حیا کا نتیجہ بھی ہے ۔

حیا کی ایک کیفیت عاشق میں اس وقت نظر آتی ہے جب وہ " حسن بے محابا " کے دیدار سے " بقدر ظرف و ذوق " لطف اندوز ہونا چاہتا ہے ، لیکن کسی خارجی رکاوٹ کے موجود نہ ہونے کے باوجود اس کی ذہنی رکاوٹ ، اسے " دزدیدہ نظری " سے آگے نہیں بڑھنے دیتی ۔ اور وہ بھرآنکھ کے نہیں دے سکتا ۔ خسرو نے اس سے ملتی جلتی کیفیت کا اظہار یوں کیا ہے ؎

" خوش آں زماں کہ بروش نظر نہفتہ کنم

چو سوی من نگرد او ، نظر بگرد انم "

لیکن ان کے یہاں " نہفتہ نظری " اور " نظر گردانی " میں محبوب کے دیکھ لینے کا خوف ہے ۔ اس میں شخص کی ایک طرح کی " چوری اور خیانت " ہے ۔ لیکن یہاں عاشق کی جس کیفیت کی طرف اشارہ مقصود ہے اس میں " ذہنی جھجک " اور " فطری حیا " خود " دیدار بے محابا " میں روک بن جاتی ہیں ــــ عاشق کی اس کیفیت کی کوئی مثال اصغر کے کلام میں نہیں ملی البتہ محبوب کی حیا کی عکاسی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔ شعر ہے ؎

اس عارض رنگیں پر عالم وہ نگاہوں کا

معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

یہ بات یقیناً مشاہدہ میں آئی ہوگی کہ جب کوئی حسین کسی محفل یا مجلس میں آ رہا ہو اور اس کو یہ احساس ہو جائے کہ دیکھنے والوں کی تیز تیز اور گرم گرم نگاہیں ، چاروں طرف سے اس پر پڑ رہی ہیں تو اسکے چہرے پر کبھی شرم و حیا سے سرخی دوڑ جائے گی اور کبھی رنگ متغیر ہو جائے گا ۔ پشیمانی میں آلودہ نگاہیں بہکی بہکی اور قدم ڈگمگائے ہوئے ہوں گے ۔ اور چلنے میں بار بار خم کھا جائے گا ۔ اس منظر کو نظر میں رکھتے ہوئے ، شعر سے ابھرتی ہوئی تصویر پر غور کیا جائے تو اصغر کی محاکات کی داد دینا پڑتی ہے ---- لیکن اگر " شعری نقش " کو متخیلہ کی گرفت میں اسطرح لانے کی کوشش کی جائے کہ اس پر کوئی واضح تصور ثبت ہو سکے تو محسوس ہوتا ہے کہ پہلا نقش " اس عارض رنگیں پر عالم وہ نگاہوں کا " دوسرے نقش یعنی " معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی " کی حسین اور دلکش تمثیل میں اسطرح ڈوبتا چلا گیا ہے کہ نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گیا ہے اور اسکی جگہ نسیم و صبا کے لطیف جھونکوں سے جنبش کرتی ہوئی سرخ پھولوں کی کیاری نے لے لی ہے ۔ یہاں اصغر کی فطری حیا نے " انسانی تصویر " کے خد و خال ابھرنے نہیں دیئے اور اس پر ابہام و پراسراریت کا جال تان دیا ہے ---- " ادغامی تصویر " ---- (یعنی ایک تصویر کو دوسری میں اسطرح جذب کر دینا کہ پہلی پردۂ تصور سے غائب ہو جائے اور اسکی جگہ دوسری تصویر لے لے ۔ جیسے سینما کے پردے پر ایک منظر آہستہ آہستہ مٹنے لگتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ دوسرا ابھرنے لگتا ہے ، حتیٰکہ پہلا اوجھل ہو جاتا ہے اور نگاہیں دوسرے پر مرکوز ہو کر رہ جاتی ہیں) اصغر کے یہاں کمال پر ہے

حیا کے ساتھ ایک لفظ " بے نفسی " بھی لکھا گیا ہے ۔ " بے نفسی " کو یہاں بڑے وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے ۔ یہ وہ کیفیت ہے جس میں انسان " اپنی ذات " کو نظرانداز کر دیتا ہے ۔ یہ " انکار ذات " اقبال کی " نفی خودی " نہیں ہے بلکہ " صرف ذات " کے تمام پہلوؤں سے اجتناب کا نام ہے ۔ یہ " خود پرستی " اور " خودنمائی " کے ہر شائبے سے پاک و گریزاں ہوتی ہے ۔ اسے شرمیلا پن ، جھجھک اور جھجک بھی کہہ سکتے ہیں جو حیا ہی کی ایک شکل ہے ۔ اسکے تحت انسان منظرعام پر آنے سے گریز و پرہیز کرتا ہے ۔ اصغر کی فطرت میں " بے نفسی " کی یہ کیفیت بہت زیادہ نظر آتی ہے ۔

مسلم بورڈنگ ہاوس الہ آباد کے جس مشاعرے کا تذکرہ ضمیر احمد صاحب کی رہ کے حوالے سے گذر چکا ہے ، اسی میں آگے چل کر اصغر کی اس مزاجی کیفیت کی طرف

اشارہ موجود ہے - وہ لکھتے ہیں :

" .... وہ شاعرانہ ادائیں کہ " شعر ملاحظہ کیجیئے گا " ، ذرا غور کیجیئے گا یہ شعر شاید کسی قابل ہو ، ان میں کہاں -"[۱]

حقیقت یہ ہے کہ اصغر جیسے " بے نفس " انسان کے لیے اس قسم کے پیشہ ورانہ جملے " قدر افزائی ہے " ، " یہ حضور کا حسن نظر ہے " ، " بندہ کس قابل ہے " زبان پر لانا ممکن نہ تھا کہ ان سے " خود پرستی " ، " خودستائی " اور " نمود ذات " کی بو آتی ہے -

" بے نفسی " کی مندرجہ بالا تشریح و تفصیل کی روشنی میں حسب ذیل اشعار پر غور کیا جائے تو جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا سمجھنا دشوار نہ ہوگا -

بے محابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں　　چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی

اس عارض رنگیں پر عالم وہ نگاہوں کا　　معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

حق یہ ہے کہ یہ دونوں شعر اصغر کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں -

عام زندگی میں " بے نفسی " کی اور بھی مختلف صورتیں نکل سکتی ہیں ، ان سے قطع نظر کرتے ہوئے اس کی صرف ایک صورت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو " محبت " میں نظر آتی ہے - محبت کیا ہے؟ اس کا جواب بڑی طوالت چاہتا ہے - مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ " محبت " " بے نفسی " ہی کا دوسرا نام ہے — یعنی " انکار ذات " و " اقرار محبوب " محبت کی یہ منزل بڑی کٹھن ہے - اس میں " محب " اپنی ذات کو بھول کر ، " اپنا آپ " محبوب کے قدموں میں لا ڈالتا ہے - یہی آغاز محبت بھی ہے اور انجام و معراج محبت بھی - اسکے برعکس ایک کیفیت وہ ہوتی ہے جس میں شدت طلب کے باوجود محب کے دل میں محبوب کی بہ نسبت اپنی " ذات کا احساس و اقرار " شدید تر اور اپنے نفع و نقصان کا خیال مقدم تر ہوتا ہے کہتے اسے بھی محبت ہیں ، لیکن یہ محبت کی نوعیں اور ننگ عاشقی ہے ؎

یہ ننگ عاشقی ہے سود و حاصل دیکھنے والے　　یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

محبت کی اس پرفریب کیفیت میں " محب " دراصل اپنی ہی " انا " کی پرستش کرتا ہے - وہ محبوب کی راہ میں مٹنے کے بجائے اس سے ناز برداری کی توقع رکھتا

۱- اصغر گونڈوی از منیر احمد صدیقی - شخصیات نمبر جلد دوم - ص ۱۳۸۷

ہے اور اگر ادھر سے ناز برداری نہ ہو تو وہ اسکو جلی کٹی سنانے سے بھی گریز نہیں کرتا ـــــ اردو فارسی شاعری میں " راسوخت " اسی نفسیاتی کیفیت کا مظہر اور نتیجہ ہے ۔ قرآن اس قسم کے دعویداران محبت کی یوں پردہ دری کرتا ہے :

اَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ ھَوَاہُ اِلٰـہُ

اصغر بھی " اقرار خودی " کو دعوئے ایمان و دین کے خلاف سمجھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک محبت رضا بقضاءہ و تسلیماً بامرہ کا دوسرا نام ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں :

یہ اقرار خودی ہے دعوئے ایمان و دین کیسا

ترا اقرار جب ہے خود سے بھی انکار ہو جائے

محبت کی راہ بڑی پرخار اور زہرہ گداز ہوتی ہے ۔ یہاں قدم قدم پر آلام و مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ اس راہ میں بڑے بڑے جانباز دم توڑ جاتے ہیں جو ذرا سخت جان ہوتے ہیں اور ان سختیوں کو جھیل جاتے ہیں وہ چیخ پکار اور واویلا شروع کر دیتے ہیں ۔ یہ شور و ہنگامہ دراصل " اقرار نفس " ہی کا نتیجہ ہوتا ہے ــــ ان لوگوں کے برعکس ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہوتا ہے ، جو محبت کی بنیاد " بے نفسی" اور " انکار ذات " پر اٹھاتا ہے ان کی نظروں میں راہ محبت کی صعوبت ، صعوبت نہیں ہوتی بلکہ راحت ہوتی ہے ـــ اور اسکے بھڑکتے ہوئے جہنم زار میں انہیں جلوہ" فردوس حسن نظر آتا ہے ـــ

دوزخ بھی ایک جلوہ" فردوس حسن ہے   جو اس سے بیخبر ہیں وہی ہیں عذاب میں

بے نفسی کی یہ کیفیت جب عاشق کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے تو وہ تکلیف و مسرت اور ہجر و وصال کے خیال سے بہت بلند ہو جاتا ہے ـــ

کیا درد ہجر اور یہ کیا لذت وصال   اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

(۸) مسرت و طمانیت : ایک ہی ذہنی کیفیت کے دو رخ ہیں ۔ " مسرت " خوشی کو کہتے ہیں ۔ یہ ایک عطیہ ربانی ہے جو صرف " اہل دل " کو ودیعت کیا جاتا ہے ۔ ہر بوالہوس اس کو شیوہ و شعار نہیں بنا سکتا ۔ جسے یہ انعام ارزانی ہوتا ہے وہ ہر وقت ہشاش و بشاش اور شاد و شگفتہ رہتا ہے ۔ زندگی میں اسکے لیے کشش و جاذبیت ہوتی ہے وہ دنیا کے دھچکوں اور چرکوں کے باوجود اس سے محبت کرتا ہے ۔ حادثات زندگی

کی بے رحمیوں اور دل شکنیوں پر کڑھنے اور بسورنے کے بجائے وہ ان پر قہقہے لگاتا ہے
----- دنیا میں سب سے المناک حادثہ موت ہے ۔ موت کے خیال ہی سے بڑے بڑے رستم زمان
بولنے کی طرح بیٹھ جاتے ہیں ۔ لیکن زندہ دل انسان موت کے خیال کو بھی چٹکی
کر اڑا دیتا ہے ۔ تغیرات و انقلابات زمانہ پر سرکہ جبیں ہونے کے بجائے وہ ان میں
بھی کوئی نہ کوئی روشن پہلو نکال لیتا ہے ۔ حادثات زمانہ اسکی ہمت کے لیے چیلنج
اور اسکی سعی و کوشش کے لیے مہمیز کا کام دیتے ہیں ۔ اسکی نظر ہمیشہ مقصد پر
ہوتی ہے اور وہ حادثات کے کانٹوں کو روندتا ہوا بڑھتا رہتا ہے ۔ اس کا مقصد
" جامد " نہیں ہوتا بلکہ " خوب سے خوب تر " کی طرف ترقی کرتا رہتا ہے -----
یہی مقصد اسکے لیے روشنی کا مینار ہوتا ہے جسکی ضیاپاشیوں میں اسکے قدم بڑھتے
رہتے ہیں ۔ وہ متحرک رہتا ہے اور اپنے قدم کو " منزل آشنا " نہیں ہونے دینا چاہتا
کہ " منزل " حرکت و عمل کی موت ہے ؎

اس سے بڑھ کر کوئی بے راہ روی کیا ہوگی　　کام پر شوق کا منزل سے شناسا ہوتا

شخص کی اسی کیفیت کا ایک رخ " طمانیت " ہے ----- جسکے معنی ہیں
" اطمینان قلب " یعنی شے مطلوب کے عدم حصول سے جو بے اطمینانی اور اندرونی
خلش ہوتی ہے اس کا نہ ہونا ----- لیکن ضروری نہیں کہ حصول مقصد کے بعد کسی
میں " طمانیت قلب " پیدا ہو جائے ۔ " طمانیت قلب " تو ایک " مقام ترک و ترفع " -----
یعنی شخص کی ایک ایسی کیفیت ہے جو وہبی اور فطری ہونے کے ساتھ ساتھ اکتساب و
ریاضت سے پیدا ہوتی ہے ----- مطلب یہ ہے کہ اگر سعی و کوشش سے شے مطلوب حاصل
ہوگئی تو بقدر " ذوق و حوصلہ " متمتع ہو لیے (لیکن اسکی کشش و محبت کو دامن گیر
نہ ہونے دیا ۔ جہاں اس نے دامن آلودہ کرنا چاہا دامن جھٹک دیا) ----- اور اگر
نہ ملی جب بھی مایوس و پژمردہ نہ ہوئے ۔ کیونکہ اسکی نظر میں اشیائے دنیا کی
سکون بخشی، راستے کے سرسبز و شاداب باغ ، لہلہاتے سبزہ زار ، گنگناتی جوئبار اور خنک
سایے کی سکون بخشی سے زیادہ نہیں ۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں ؎

غرض نشاط و الم سے فقط تماشا ہے　　کہ یہ مناظر رہ اور میں ہوں رہ گزری

یہ منزل نہیں راہ منزل کی آسائشات ہیں ۔ اسی حقیقت کے پیش نظر اسے دائمی مسرت
" حرکت " میں ملتی ہے ۔ وہ " سود و حاصل " پر نظر رکھنے کو ننگ عاشقی اور منزل
پر نظر جما کے ٹھٹک جانے کو گمراہی سے تعبیر کرتا اور سعی مسلسل کا قائل ہوتا ہے ؎
یہ ننگ عاشقی ہے سود و حاصل دیکھنے والے　　یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

غم لا انتہا ، سعی مسلسل ، شوق بے پایاں　　مقام اپنا سمجھتے ہیں وہ ہم منزل سمجھتے ہیں

اسکے نزدیک زندگی جستجو اور طلب کا نام ہے اور زندگی کا راز دوری منزل میں ہے

جستجو ہے زندگی ذوق طلب ہے زندگی　　زندگی کا راز لیکن دوری منزل میں ہے

وہ کہتا ہے کہ " دائمی گردش " اور " پیہم دشت نوردی " ہی اصل زندگی ہے ،

جو لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ ایسے تشنگان حقیقت پر یہ واضح کر دیتا ہے

کہ " زندگی کا راز تلاش سراب " میں ہے

اب کوں تشنگان حقیقت سے یہ کہے　　ہے زندگی کا راز تلاش سراب میں

" مسرت و طمانیت " کی تشریح و توضیح کے بعد اب کلام اصغر میں ، اسکے مختلف رنگ و آہنگ کی نشاندہی کی جاتی ہے -

(۱) زندگی کے لیے تڑپ اور امنگ :

سب سے پہلی چیز جو کلام اصغر سے واضح ہوتی ہے وہ زندگی کے متعلق ان کا " رجائی نقطہ نظر " ہے - انھیں زندگی سے محبت ہے - وہ زندہ رہنے کے خواہش مند ہیں - زندگی کے لیے ان کے اندر ایک خاص قسم کی امنگ اور تڑپ ہے - فانی کی طرح زندگی ان کے لیے نہ معمہ ہے اور نہ دیوانے کا خواب ، اور نہ اس خواب کی تعبیر انھوں نے موت میں تلاش کی ہے - فانی کہتے ہیں

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا　　زندگی کا ہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

اے اجل اے جان فانی تو نے یہ کیا کر دیا　　مار ڈالا مرنے والے کو کہ اچھا کر دیا

وہ زندگی کو ایک حقیقت اور موت کو راہ زندگی کے مراحل میں سے صرف ایک مرحلہ سمجھتے ہیں اسی لیے وہ موت کو بھی زندگی عطا کرنے کے قائل ہیں

میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی　　تو کمال زندگی سمجھا ہے مر جانے میں ہے

ان کے نزدیک " مرنا " محض ابتدا کی ایک بات ہے " منتہی کا کمال تو جینا " ہے

مرنا تو ہے ابتدا کی اک بات　　جینا ہے کمال ، منتہی کا

زندگی سے دلچسپی اور اسکی طرف کشش کے متعلق تفصیلی بحث " رنگینی طبع و صناعت پسندی " کے تحت کی جا چکی ، اس لیے اسکو یہیں ختم کیا جاتا ہے -

(۲) خوش طبعی اور زندہ دلی :

جس کی آنکھوں میں حسن درست کی سرسوں پھولی

ہو ـــہ

نظر میں وہ گل سما گیا ہے تمام ہستی پہ چھا گیا ہے

قفس میں ہوں یا چمن میں ہوں میں مجھے اب اسکی خبر نہیں ہے

اسے محرومیوں اور ناکامیوں سے کیا کام ـ اصغر کی اسی فطری خوش دلی اور حسن دوست کی سرمستی نے انھیں کبھی پژمردہ و مضمحل نہیں ہونے دیا ـ زندگی کی محرومیوں اور ناآسودگیوں سے انسان کی طبیعت میں جو طنز کی تلخی پیدا ہو جاتی ہے اصغر اس سے پاک ہیں ـ اسی لیے ان کے کلام میں طنز نظر نہیں آتی ـ بلکہ دنیا والوں (شیخ و واعظ) کی کوتاہیوں اور منافقین پر ان کے اندر پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگتی ہیں ـ وہ دل ہی دل میں اس سے محظوظ ہوتے ہیں اور زیر لب کوئی ایسا فقرہ چست کر دیتے ہیں کہ سننے والا بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا ـ گزشتہ سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ان کی " سنجیدگی و متانت " انھیں " خندہ دندان نما " کی اجازت نہیں دیتی ، ان کی پروقار شخصیت کی مسکراہٹ قاری کو بھی " تبسم زیر لب " سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتی ـ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی ـ

زاہد ، شیخ ، واعظ اور اسی قماش کے دوسرے بزرگوں کا تمسخر و تضحیک بلکہ تحقیر و تذلیل فارسی اور اردو شاعری میں نئی بات نہیں ـ بعض شگفتہ بزرگ بھی اس میدان میں ضلع جگت سے گزر کر پھکڑ بازی اور شہد پن پر اتر آئے ہیں ـ حالی جیسے " مولوی " بھی ایسے موقع پر اپنی " شگفتگی " برقرار نہ رکھ سکے ـ فرماتے ہیں ـــہ

اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت   اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار

اصغر بھی ان " بزرگوں " سے محظوظ ہوتے ہیں مگر بڑے ہی معصوم اور لیے دیئے انداز میں ـ کچھ شعر ملاحظہ ہوں ـــہ

صنم کدے میں تجلی کی تاب مشکل ہے   حرم میں شیخ کو محو نماز رہنے دے

پھر آج بزم عیش میں اے جناب شیخ   وحشت فزائی غم فردا لیے ہوئے

کیا کرے زاہد بیچارہ اسے کیا معلوم   رحم کرتا ہے بانداز عصیاں کوشی

اصغر نہ کھولنا کسی حکمت مآب پر   راز حیات ساغر و مینا کہیں جسے

" بزم عیش میں " جناب شیخ کی وحشت فزائی کی بلاغت اور " رحم کرتا ہے باندازۂ عصیاں کوشی " کی ایمائیت میں زاہد کی بیچارگی و عقل و خرد پر بڑا " لطیف مزاحیہ ماتم " پوشیدہ ہے ـ اور " حکمت مآب " کی ترکیب اردو شاعری کی روایت میں شاعرانہ اضافہ ہے ـ یہ ایک ایسا " نازک نشتر " ہے جو مخمل کی تہوں میں لپٹا ہوا ہے اور

جیسے عمل جراحی میں استعمال کرنے کے بجائے " گوشت پوست کے پہاڑ " میں ہلکے سے چبھو کر لطف لینے کے لیے کام میں لایا گیا ہے ۔ حکمت مآب کا "کفایاتی نشتر " چبھو کر اصغر نے زاہد ، واعظ اور شیخ کی بھاری بھرکم ، بوجھل اور ٹھس شخصیت کو کس کس طرح تڑپایا ہے اور اسے دیکھ کر ، دل میں " خندہ ہائے بلند " کی اٹھتی ہوئی موجوں کو کس کس طرح دبایا ہے کہ وہ " تبسم و شگفتگی" کے خفیف ارتعاشات سے آگے نہیں بڑھ سکیں --- اور چہرے پر بشاشت کا ایک ہلکا سا نور بکھیر کے رہ گئیں ۔ اسی سے اصغر کے طنز و مزاح کی اس دو دھاری مزاجی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جسمیں لطف لینے والی شوخی کا پہلو زیادہ نمایاں ہے ۔

مختصر یہ کہ اصغر کی زندہ دلی اور خوش مزاجی نے ان کے کلام میں معصوم طنز اور لطیف مزاج کی بڑی خوشگوار چاشنی پیدا کر دی ہے ۔

(۳) واقعات کے روشن پہلو پر نظر یا رجائیت :

اصغر کا دل مایوسیوں کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں نہ کبھی ڈوبا اور نہ بجھا ۔ وہ ہمیشہ دھڑکتا رہا اور اس نے اپنی گرم رفتاری اور شعلہ زائی سے راہ کی تاریکیوں میں امید کی شمع روشن رکھی وہ ہمیشہ روشنی کا تعاقب کرتے رہے اور اندھیرے میں بھی اپنی اندرونی روشنی سے اجالا بکھیرتے رہے --- ان کی نظر ہمیشہ زندگی کے روشن پہلو پر پڑی ۔ وہ حرکت و عمل کے قائل اور اسکی طرف دعوت دینے والے ہیں ۔ ان کا دل موج حوادث میں چھوٹ نہیں جاتا بلکہ ہنستا کھیلتا گزر جاتا ہے ۔ ان کے نقطہ نظر سے آسانیاں زندگی کو دشوار بنا دیتی ہیں ---

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے ، وہ موج و تلاطم کی کرہناکی اور جانکنی کو ہی حقیقت سمجھتے ہیں ---

یہاں تو عمر گزری ہے اسی موج و تلاطم میں

وہ کوئی اور ہوں گے سیر ساحل دیکھنے والے

ان کی جان کو " آغوش ساحل " میں لطف نہیں آتا ، ان کو تو طوفان سے کھیلنے میں لطف آتا ہے ---

آغوش میں ساحل کے کیا لطف سکوں اس کو یہ جان ازل ہی سے پروردۂ طوفان ہے

غرضیکہ اصغر کی "طوفان دوستی"، "موج و تلاطم" سے محبت اور ان سے لذت اندوزی نے ان کے نقطۂ نظر کو رجائی اور ان کے کلام کو مردہ دلوں کے پیغام لئے جہد و امل بنا دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کسب حیات نو تری ہر ہر ادا سے ہے　　　مرنا پسند خاطر ارباب جاں نہیں
سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے　　　جو عمر رائیگاں ہے، وہی رائگاں نہیں

بہائے درد و الم درد و غم کی لذت ہے　　　وہ خدنگ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لئے

اک جہد و کشاکش ہے ہستی جسے کہتے ہیں　　　کفار کا مٹ جانا خود مرگ مسلماں ہے
اک ایک نفس میں ہے صد مرگ بلا مضمر　　　جینا ہے بہت مشکل مرنا بہت آساں ہے

یہ سب ناآشنائے لذت پرواز ہیں شاید　　　اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے
بندشوں سے اور بھی ذوق رہائی بڑھ گیا　　　اب قفس بھی ہم اسیروں کو پر پرواز ہے

یہاں کوتاہی ذوق عمل ہے خود گرفتاری　　　جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

لذت جوش طلب، ذوق فنا پرتو دوام　　　ورنہ ہم دیوانگان شوق کی منزل کہاں

ذوق طلب حصول سے جو آشنا نہ ہو　　　یعنی وہ درد چاہیے جس کی دوا نہ ہو

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جسکو سکون سب　　　وہ عین زندگی ہے جو ہو اضطراب میں
کبھی سمجھتے تھے ہم یہ زندگی ہے وہم و بےمعنی　　　مگر اب، موت کو بھی خطرۂ باطل سمجھتے ہیں

مار ڈالے گی مجھے عافیت کنج چمن　　　جوش پرواز کہاں جب کوئی صیاد نہ ہو

کہیں شکوہ سنج گردش لیل و نہار ہوں　　　اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

اصغر "انقلابات زندگی" پر شکوہ سنج ہونے کے بجائے اسے ایک "نئی زندگی" کا پیش خیمہ بلکہ خود نئی زندگی سمجھتے ہیں ۔ جب کوئی شخص زندگی کے متعلق

ایسا " صحت مند انہ نقطہ نظر " رکھتا ہو تو اسمیں ایک ایسی بلند نظر پیدا ہو جاتی ہے ، جس سے وہ ماحول کے تابع ہونے کے بجائے ماحول کو اپنی مرضی کا تابع بنانے کی کوشش کرتا ہے اور " زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز " اسکا مطمح نظر ہو جاتا ہے ---- ایسا شخص اگر پورے خارجی ماحول کو نہیں بدل سکتا تو کم از کم اس کا اقل قلیل حصہ ---- (دوست احباب کا) ضرور اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا ہے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ذہن و فکر کا ایک حصار اپنے گرد کھینچ لیتا ہے - اصغر پورا ماحول تو نہ بدل سکے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ انھوں نے اپنے گرد دوست و احباب اور اعزہ و اقربا کی ایک خاصی تعداد جمع کر لی تھی جو ان کی ہمنوا و ہم خیال تھی - اصغر نے ماحول کے بدلنے میں بڑی خاموشی سے جدو جہد کی ہے اور ان کی کوششیں بارآور ہوئی ہیں جبھی تو اتنی خود اعتمادی کے ساتھ کہتے ہیں ؎

نیاز عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظ ناداں

ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے

جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

بنا لیتا ہے موج خون دل سے اک چمن اپنا

وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے متعلق اسی رجائی نقطہ نظر نے ، اصغر کو زندگی سے محبت کرنا سکھایا - اسکا نتیجہ تھا کہ ان میں بجائے منفی و مجہول رویے کے مثبت رویہ ابھرا انھوں نے خود اپنی شخصیت کو نکھار سنوار کر " پارس " بنایا یہاں تک کہ جو بھی اس سے مس کر گیا کندن بن گیا - اسطرح انھوں نے زندگی کو آگے بڑھایا - سچ تو یہ ہے کہ اقبال کے بعد اردو شاعری میں زندگی سے بھرپور محبت اور حرکت و عمل کی اتنی پاکیزہ مثالیں سوا اصغر کے کسی اور کے کلام میں نہیں ملتیں -

ذہن و فکر کے اسی حصار نے ، جسکی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے اصغر کی طبیعت میں استغنا ، بیخودی اور بے نیازی کی ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی جسکی چھوٹ ان کے کلام میں بھی پڑ رہی ہے ---- طمانیت کی تشریح و تعریف میں سطور گزشتہ میں کافی لکھا جا چکا ہے یہاں صرف اتنا اشارہ مقصود ہے کہ " طمانیت " ایک دلی کیفیت ہے جسکے تحت انسان کبھی " ناآسودہ و ناراحت " نہیں رہتا بلکہ ہمیشہ خوش اور مطمئن رہتا ہے ---- اسی طمانیت کی ایک ارتقائی شکل " استغنا و بے نیازی "

ہے ۔ یعنی کسی حادثے سے مغموم و متاثر ہونے کے بجائے اسے پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دینا ۔ یہاں ایک روایت سے (قطع نظر اس سے کہ صحیح ہے یا غلط) شاید اسکی وضاحت ہو سکے ۔ کہتے ہیں جب سرمد کے قتل کا حکم ہوا اور جلاد پہونچا تو یہ آنکھیں بند کئے بیٹھے ہوئے تھے ۔ شور و غل سن کر آنکھیں کھولیں ایک نظر جلاد اور مجمع پر ڈالی ۔ یہ شعر پڑھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں جو پھر کبھی نہ کھل سکیں ؎

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم

دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

--- موت جیسے زہرہ گداز واقعے سے یوں بے نیازانہ گزر جانا بڑی " ہمت و حوصلہ " کا کام ہے ۔ اصغر کی شخصیت میں بھی " بے نیازی " کی یہ کیفیت ملتی ہے --- ان کے یہاں " بے خودی ، بے نیازی اور قناعت " کی یہ کیفیت ، اسلامی و صوفیانہ تعلیمات سے بھی پیدا ہوئی ، احباب کے حلقہ سے بھی پہونچی اور ذہن فکر کے اس حصار سے بھی آئی جسے انھوں نے اپنے گرد کھینچ رکھا تھا ۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اب خود یہاں تغافل و بیگانگی سی ہے — کچھ یہ بھی طرفہ کاری سودائے عشق ہے

بیخودی کا عالم ہے محو جبہ سائی ہوں — اب نہ در سے مطلب ہے اور نہ آستانے سے

بیٹھا ہے ایک خاک نشین محو بیخودی — کچھ حسن سے غرض ہے نہ پروائے عشق ہے

یہ بیخودی کی معراج ہے جسمیں انسان حسن و عشق سے بے پروا ہو جاتا ہے لیکن اسکا اس " مشینی اور مجہول بے حسی " سے کوئی تعلق نہیں جو انسان میں " بار الم " اٹھاتے اٹھاتے اور " رنگ نشاط " دیکھتے دیکھتے پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور پھر واقعات (خوشی و غم) سے نہ اسمیں کوئی اہتزاز پیدا ہوتا ہے اور نہ انقباض ۔ جیسا کہ اصغر کہتے ہیں ؎

بار الم اٹھایا رنگ نشاط دیکھا — آئے نہیں ہیں یوں ہی انداز بیحسی کے

بلکہ جس " بے پروائی و بے نیازی " --- یعنی " ادائے بیخودی " کی طرف اشارہ مقصود ہے وہ مقام " ترک و ترفع " ہے جو عاشق کے اندر شعور و ارادہ اور کوشش سے پیدا ہوتا ہے ۔ عاشقی میں چناں چنیں اور اگر مگر کا دخل نہیں ہوتا ؎

یہ ہے طریق عاشقی چاہئیے اس میں بیخودی

اس میں چناں چنیں کہاں اس میں اگر مگر کہاں

" بیخودی " کا یہ مقام اگرچہ بہت بلند ہے جسمیں عاشق اپنی " خودی " کو فنا کر

دیتا ہے لیکن ایک مقام اس سے بھی بلند ہے جس پر فائز ہونا منتہائے عاشقی ہے -
وہ ہے " حسن پر فدا ہو کر حسن کی ادا بن جانا ---- تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ
اللّٰہِ یا قرآن کے الفاظ میں صِبْغَۃَ اللّٰہِ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً ----
اصغر کے کلام میں یہ نظریہ روح بن کر جاری و ساری ہے - چنانچہ کہتے ہیں ؎

بے خودی میں دیکھتا ہوں بے نیازی کی ادا　　کیا فنائے عاشقی خود حسن بن جانے میں ہے
اس کی راہ میں مٹ کر بے نیاز خلقت بن　　حسن پر فدا ہو کر، حسن کی ادا ہو جا
انداز ہیں جذب اس میں سب شمع شبستاں کے　　اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

حاصل کلام یہ کہ " مسرت و طمانیت "، سے اصغر کی زندگی کا ہر پہلو
تابناک تھا اور ایسی تابناکی نے ان کی شاعری میں ، ہمک ، تڑپ ، رجائیت ، پرامیدی
عاشقانہ بیخودی و بے نیازی اور حرکت و عمل کے شرارے بھر دیئے ہیں -

(۷) اجتہاد :

سطور گزشتہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ " مسرت و طمانیت " نے
اصغر کی شخصیت میں " رجائیت و بلند ہمتی " پیدا کر دی تھی --- بلند ہمتی
جو انسان کو نئے نئے منصوبوں پر ابھارتی اور کسی مرحلے میں بھی ساکت و جامد نہیں
رہنے دیتی اور ہر وقت نئی سے نئی دنیا کی تلاش میں سرگرداں رکھتی ہے اور جب
" خوب سے خوب تر "، کی جستجو اسکی فطرت کا خاصہ بن جاتی ہے تو " شیوہ "فرسودہ "
اسکی نظروں میں بےوقرو بے وقعت ہو کر رہ جاتا ہے - وہ اس سے متنبہ کرتے ہوئے کہتے
ہیں ؎

خروش آرزو ہو نغمہ خاموش الفت بن
یہ کیا اک شیوہ "فرسودہ" آہ و فغاں بر سوں

دنیا کا دستور ہے کہ آرزو کی عدم تکمیل پر " شور و شیون و نالہ و زاری "
شروع کر دیتی ہے - اصغر اسے " شیوہ "فرسودہ "، سے تعبیر کرتے ہیں اور اسکے برعکس
" خروش آرزو "، و " نغمہ خاموش الفت "، بن جانے کی دعوت دیتے ہیں - یعنی زبان
سے اظہار آرزو کرنے کے بجائے " سراپا آرزو "، بن جانے کو کہتے ہیں --- کمر خمیدہ ،
شانے جھکے ہوئے ، چہرہ التجا و عرض حال کی پیوست و یاسیت سے بےپاک ، شاداب و
شگفتہ --- آرزو کی لہریں دل میں ھلکورے لیتی ہوں نغمگی و زمزمہ سنجی کے ساتھ
بشرے پر پھیلی ہوئی - ظاہری وضع " صورت یہ بین "، کا مجسم اعلان ، لب پر " عالم حیرت"

کی مہر ---- لیکن جبیں بشرہ کی شگفتگی سے درود و صلواۃ کا نغمہ بلند -
خاموش - بے لفظ و بے صدا - جو دل میں اترتا اور روح میں رس گھولتا چلا جائے -
یہ نہ شاعری ہے اور نہ اس شعر کی شاعرانہ تشریح ہے بلکہ یہ اصغر کا عقیدہ و معمول
بھی تھا - اس کی تصدیق جناب نواب سید شمس الحسن کے درج ذیل روایت سے ہوتی
ہے جو انھوں نے اپنی غیر مطبوعہ کتاب جگر مرادآبادی میں نقل کیا ہے - وہ لکھتے
ہیں :

" ایک مرتبہ جگر اصغر کے ہمراہ پیدل جا رہے تھے اثنائے راہ
میں جگر صاحب نے یکایک اصغر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے
عجیب انداز میں کہا کہ ایک بات ہے میں اتنی دعا کرتا ہوں
آخر خدا میری دعا کیوں نہیں سنتا اور میری شراب کیوں نہیں
چھٹ جاتی ، اصغر صاحب نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا
کہ یہ بات نہیں ہے تم دل کے ایک گوشے سے دعا کرتے ہو -
مکمل دعا کرو تو مکمل قبولیت کی توقع بھی کرو - مکمل دعا یہ
ہے کہ تم سر سے پاؤں تک دعا بن جاؤ -[1] "

اسی خیال کو ایک جگہ شعر میں یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

توڑ کر دست طلب محو رضا ہو جائیے　　　سر سے پا تک ہمہ تن آپ دعا ہو جائیے

مذکورہ بالا شعر اور روایت کے تجزیے سے اصغر کی شخصیات کا ایک اہم گوشہ
سامنے آتا ہے وہ یہ کہ ان کے عقیدے کے مطابق احساس شکست و زبان پر گریہ و زاری کرنا
عبدیت و بندگی کے منافی اور رضائے محبوب کے خلاف احتجاج ہے " بندہ " کا رضامند "
محبوب کے اس فرمان کو عَسىٰ اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ عَسىٰ اَنْ تُحِبُّوا
شَيْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ[2] ، نظرانداز کر دیتا ہے - بندہ (عاشق) وہ ہے جسکے لب شکوے
کے الفاظ سے اور پیشانی " چین ناخوشنودی " سے پاک ہی نہ ہو بلکہ اسکے برعکس اس کے
لبوں پر نغمہ درود و صلواۃ اور تحمید و تمجید بلند ہو اور اسکی وضع حال اور زبان قال

۱- جگرمرادآبادی حیات اور شاعری - از ڈاکٹر محمد اسلام - طبع اول ۱۹۶۲ء - ص ۵۹-۹۳

۲- البقرہ - ۲۱۶

اظہار کر رہی ہو ؎

تیری ہزار برتری تیری ہزار مصلحت　　　　میری ہر اک شکست میں، میرے ہر اک قصور میں
باغ نعیم بھی بجا، نار جحیم بھی درست　　　　تو مجھے بخش دے جہاں میری وہیں نجات ہے

اسی جذبہ عبودیت و بندگی سے سرشار ہو کر جب " درود و صلواۃ " اور " جوش دعا "
میں محو و مست وہ بارگاہ محبوب میں حاضر ہوتا ہے تو اسکی زبان پر " حرف مطلب "
نہیں ہوتا ؎

کامیاب شوق کی ناکامیوں کو دیکھئے　　　　حرف مطلب محو ہے جوش دعا کے سامنے

بلکہ بندگی کا ایک مرتبہ اس سے بھی بلند ہے یعنی " حسن مدعا " کے کیف و مستی
میں " طلب " " سود و زیاں " حتیٰکہ " دعا تک کو فراموش کر دینا ؎

طلب کیسی، کہاں کا سود و حاصل کیف مستی میں
　　دعا تک بھول جاتے مدعا اتنا حسین ہوتا

ظاہر ہے جس شخص کا یہ عقیدہ اور معمول ہو وہ " گریہ و زاری " کو
" رسم فرسودہ " ہی سے تعبیر کرے گا ۔ چنانچہ اصغر " رسم فرسودہ " کو ارباب نظر
کے شایاں شان نہ سمجھتے ہوئے انہیں کفر و ایمان سے بلند کسی اور منظر کی تلاش و
جستجو کی ترغیب دیتے ہیں ؎

رسم فرسودہ نہیں شایاں ارباب نظر　　　　اب کوئی منظر بلند از کفر و ایمان دیکھئے

ممکن ہے کہا جائے کہ آخر کفر و ایمان سے بلند کون سا منظر ہو سکتا ہے
یہ تو شاعری ہے دنیا میں کسی ایسے منظر کا وجود ممکن نہیں ۔ میں کہتا ہوں شاعری
ہی سہی لیکن کیا اس سے اصغر کی طبیعت کے اس رجحان کا اندازہ نہیں ہوتا جو
" مکھی پر مکھی " مارنے کے بجائے انسان کو نئے نئے امکانات کا جائزہ لینے اور انہیں اپنی
گرفت میں لانے پر اکساتا اور آمادہ کرتا ہے۔۔۔ اسی ضمن میں دو شعر سنیے جن سے
ان کی طبیعت کے اس رنگ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے جسے اجتہاد کہا گیا ہے
اشعار درج ذیل ہیں ؎

یہ مناظر کچھ نہیں ہیں جب نظر ہو مستعار
　　اپنی آنکھوں سے کسی دن بزم امکاں دیکھئے

اس جہان غیر میں آرام کیا، راحت کہاں
　　لطف جب ہے اپنی دنیا آپ پیدا کیجئے

کسی دوسرے کی " نظر " سے " بزم امکاں " کا مشاہدہ کرنے والے بھلا اسے کیا سمجھیں گے ۔ اس کا لطف اسی وقت ہے جب انسان اپنے حواس کو کام میں لائے اور دنیا پر فکر و تدبر کرکے خود کوئی رائے قائم کرے ــــــ دوسروں کی تراشیدہ راہ پر چلنے اور قائم کی ہوئی رائے کو تنقیح و تہذیب کے بغیر ، من و عن قبول کر لینے والوں کو کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ کے زمرے میں تو شمار کیا جا سکتا ہے لیکن انسانیت کے " مقام اعلیٰ " تک ان کی رسائی ممکن نہیں ہو سکتی ۔ انسان کا مقام " گرواندہ تقلید و پیروی " سے بہت بلند ہے ۔ " انسان " دوسروں کی تراشیدہ و ساختہ دنیا پر مطمئن و خوش نہیں رہ سکتا خواہ وہ فکر و نظر کی دنیا ہو یا فعل و عمل کی ۔ وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرکے اسمیں زندہ رہتا اور لطف زندگی لیتا ہے ۔ اقبال نے کہا ہے ؎

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ

پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار

اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اصغر بھی یہی کہتے ہیں لیکن غزل کے حدود میں رہتے ہوئے انھوں نے اقبال کے زور و طنطنہ کو تغزل کے رسیلے اور دھیمے پن میں بدل دیا ہے ــــــــ تغزل روح کی زمزمہ سنجی و غزل خوانی ــــ دھیمی اور سریلی ــ جس میں تمام سر کو مل لگتے ہیں ۔ فرماتے ہیں ؎

اس جہان غیر میں آرام کیا راحت کہاں

لطف جب ہے اپنی دنیا آپ پیدا کیجئے

مختصر یہ کہ اصغر کی نفسیات کے اس بنیادی وصف (اجتہاد) سے تفصیلی بحث اسلوب کے تحت کی جائے گی جہاں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے " مجتہدانہ مزاج " ، جدت پسندی اور " طبیعت کی اپج " نے شاعری کے میدان میں موضوع و اسلوب کے کیسے نئے نئے گوشے دریافت و آباد کیے ہیں اور ان میں کیسے کیسے حسین پھول کھلائے ہیں ۔ یہاں تو صرف اتنا اشارہ کرنا مقصود تھا کہ اصغر کی شخصیت کے بنیادی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت " اجتہاد " بھی ہے ۔

(۳) جام رنگین --- یعنی شاعری کی کیفیت -- اسلوب و انداز :

شاعر کے اسلوب میں اس کی نفسی و مزاجی کیفیات کے ساتھ اس کے فلسفہ زندگی اور نظریہ شعر و ادب کا آ جانا ناگزیر ہے خصوصاً جب کہ شاعر کی ایک مخصوص طرز زندگی، ایک مخصوص انداز نظر اور ایک خاص نظریہ شعر و ادب ہو بالفاظ دیگر جب اس کی شخصیت و انفرادیت قوی ہو - صفحات گزشتہ میں بالتفصیل دکھایا جا چکا ہے کہ اصغر ایسے ہی شاعر تھے - ابتداءً وہ روایت پرست تھے لیکن جہان (۱۹۱۷ء) سے ان کی شاعری ، مجموعہ (نشاط روح) کی شکل میں منظرعام پر آتی ہے انھوں نے اپنی انفرادیت قائم کر لی تھی - ان کی زندگی کا نصب العین متعین اور شعر و ادب کا نظریہ واضح ہو چکا تھا - آئندہ سالوں میں اسی نصب العین پر ان کا ایمان پختہ ہوتا گیا اور انھی نظریات شاعری میں خلوص و شدت بڑھتی گئی ---- اس لیے اصغر کے اسلوب کی تفہیم کے لیے ان کی نفسی و مزاجی کیفیات کے ساتھ ان کے نظریات شاعری (خصوصاً نظریہ غزل) اور اپنی شاعری کے متعلق ان کی اپنی رائے کو سامنے رکھنا ضروری ہے کہ انھیں اجزاء و عناصر کے امتزاج و آمیزش سے ان کے اسلوب و انداز میں " امتیاز و انفرادیت " پیدا ہوئی ہے -

صفحات گزشتہ (باب ھذا حصہ دوم) میں ان کی شاعری (موضوع و مواد) میں ان کی شخصیت کی جلوہ گری کی نشاندھی کی کوشش کی گئی ہے - یہاں شخصیت کے انھیں عوامل و عناصر کا اثر ان کے اسلوب میں دکھایا جاتا ہے نیز یہ کہ اپنی شاعری کے متعلق ان کی خود کی رائے اور ان کا نظریہ غزل --- ان کے اسلوب پر کیوں کر اثر انداز ہوئے ہیں - اس طرح یہ بحث حسب ذیل تین پہلوؤں پر مشتمل ہے :

(الف) شخصیت کے عوامل نے ان کے اسلوب کو کس طرح متاثر کیا؟

(ب) " اپنی شاعری کے متعلق ان کی اپنی رائے" سے ان کے اسلوب پر کیا اثر پڑا (اس حصہ کو اجتہاد کے زیر عنوان سمیٹ لیا گیا ہے -)

(ج) اور ان کے نظریہ شعر و غزل سے ان کے اسلوب میں کون کون سے خصوصیات آئے -

(الف) اصغر کی شخصیت کے عناصر کا ان کے اسلوب پر اثر :

(۱) پاکیزگی و طہارت :

قاری کو اصغر کی شاعری کی عمومی فضا میں ایک نکھری

اور پھر بھی ہوئی پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے ---- یہ پاکیزگی ان کے یہاں شعر و ادب کے " تصور صالحیت[۱] " سے بھی آئی اور پاکیزگی کے حد درجہ بڑھے ہوئے احساس سے بھی - (اس پر تفصیلی بحث سطور گزشتہ میں کی جا چکی ہے) یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اصغر نے اپنی شاعری کی فضا کو پاکیزہ بنانے کے لیے کن کون سے طریقے اختیار کئے -

(۱) سطور گزشتہ میں تفصیل سے واضح کیا جا چکا ہے کہ انھوں نے ایسے تمام مناظر ، معاملات اور واقعات کی مصوری اور عکاسی سے اجتناب کیا ہے جن میں جنسی تلذذ ہو یا جن میں حسن انسانی کے بیان سے عریانی یا سوقیت پیدا ہونے کا امکان ہو - جہاں حسن کے خارجی مظاہر کا اظہار ناگزیر ہو گیا ہے وہاں بھی انھوں نے کسی نہ کسی ایسے لفظ ، ٹکڑے یا منظر فطرت کا التزام کر دیا ہے کہ عریانی و ابتذال ختم ہو گئے ہیں اور قاری کا ذہن فوراً حسن کے خارجی مظہر سے ہٹ کر، منظر فطرت کے دلکش نقوش پر جم کے رہ گیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے مقالہ ہذا --- پاکیزگی و طہارت - ص)

(۲) فارسی اور اردو شاعری کی عام روایت کی پیروی میں شعرا نے " تصوف و روحانیت " کی آڑ لے کر ، مذہب اور مذہبی شعائر و اقدار کے استہزا و استحقار میں کوئی کسر نہیں چھوڑی - بلکہ اس معاملے میں شوخی و گستاخی سے گزر کر دریدہ دہنی پر اتر آئے ہیں ---- اس بے لگامی سے غیر محسوس طریقے پر فضائے شاعری مکدر اور غیر پاکیزہ ہوگئی ہے - اس رنگ کے شوخ اور چٹ پٹے اشعار جن سے محفل رندان میں گرمی اور چمک آتی ہے، پیش کرنے سے اجتناب کرتے ہوئے، کسی قدر ہلکے رنگ کے دو اشعار درج کیے جاتے ہیں، تاکہ مقصود واضح ہو سکے - اشعار درج ذیل ہیں :

ہر فلک تا بہ مسیحا رشتہ زنار ما ہر زمین منصور افرازی ستون دار ما (نظیری)

اس شعر میں ایک جلیل القدر پیغمبر کی شان میں سوء ادب کا پہلو نمایاں ہے - اسی طرح غالب کے حسب ذیل شعر میں ---

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر

نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

-۱

میں اللہ کے ایک برگزیدہ بندے (مسلمانوں کے عام روایتی عقیدے کے مطابق حضرت خضر پیغمبر) کی شان میں گستاخی ہے ۔ پھر جو الفاظ " چور بنے " استعمال کیے گئے ہیں وہ انتہائی " بازاری اور سوقیانہ " ہیں ---۔ اصغر نے اس نامحمود روایت سے گریز کیا ہے ۔ اپنی شاعری میں پاکیزگی کے خصوصی التزام کے باوجود ، انھوں نے بہت کم اسلامی تلمیحات سے کام لیا ہے اور اگر انھوں کہیں استعمال کیا ہے تو ان کی حرمت و تقدیس کو بھی طرح ملحوظ رکھا ہے اور اسے کسی طرح مجروح نہیں ہونے دیا۔ اس التزام سے ان کے اسلوب کی شفاقت و پاکیزگی میں اضافہ ہوا ہے ۔ اپنے دعوے کی تصدیق میں حسب ذیل اشعار پیش کئے جاتے ہیں :

ہاں وادی ایمن کے معلوم ہیں سب قصے

موسیٰ نے فقط اپنا اک ذوق نظر دیکھا

جس سے کل تک دل بیتاب بھڑکا جاتا تھا

اسی شعلے کو جو دیکھا تو سر طور ہے آج

دل کا ہر داغ ہے سرمایہ رنگینی حسن

دیکھنا ہوگا اسی میں مہ کنعاں کوئی

ساقیا جام بکف پھر ہو ذرا گرم نوا

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا دیکھیں

اس دن بھی میری روح تھی محو نشاط دید

موسیٰ الجھ گئے تھے سوال و جواب میں

موسیٰ ظہور برق تجلی سے غش ہوئے

مجھ کو تو مار ڈالتی شوخی جواب کی

آخری دو شعروں میں کسی قدر شوخی کا پہلو نمایاں ہے ۔ پہلے شعر میں " الجھ گئے تھے " کے ٹکڑے میں قدرے " گراوٹ " ہے لیکن جب " محو نشاط دید " کی نفسیاتی کیفیت کے پس منظر میں اس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس میں " تحقیر " کے بجائے " تشفض و برهمی " نظر آتی ہے ۔ جو سوال و جواب کے " بے محل الجھیڑ " کا فطری نتیجہ معلوم ہوتی ہے ۔ اس طرح اس کی ناخوشگواری " معصوم شوخی " یا " غیر شعوری لاابالی بے حرمتی " سے بدل جاتی ہے ۔

اسی طرح دوسرے شعر میں " موسیٰ کے برق تجلی سے غش ہونے میں "

بظاھر " ذم " کا پہلو نظر آتا ہے لیکن جوں ھی " شوخی جواب " پر " مر جایئے " کا قوی اشارہ سامنے آتا ہے تو قاری اس کی حقانیت اور لذت گیری میں اس درجہ گم ہو جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی " تسذمیم " نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے -

(ب) جذب و کیف و والہانہ از خود رفتگی :

سطور گزشتہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اصغر کی اس مزاجی کیفیت نے ان کے کلام میں رقص و مستی اور وجد و حال کی کیفیت پیدا کر دی ہے ---- جب شاعر کی طبیعت میں رقت و گداز اور جذبات میں ھیجان و سیلان ہو تو الفاظ میں بھی لہر، تھرتھراھٹ ، ترنم اور موسیقیت آ جاتی ہے - اصغر کے کلام میں جذبات کی یہی رقت و گداختگی ایک لطیف موسیقی بن کر جاری و ساری ہوگئی ہے جو قاری و سامع کے جذبات میں بھی ھیجان و تلاطم برپا کر دیتی ہے -- موسیقی کہ یہ مخفی زیریں لہر، اصغر کے کلام میں ہر جگہ محسوس کی جا سکتی ہے - اس کے علاوہ اصغر نے اپنے کلام میں ،حسب ذیل طریقوں سے بھی موسیقی پیدا کی ہے :

(۱) انھوں نے بحور عموماً مترنم اور رواں استعمال کی ھیں -

(۲) عموماً الفاظ کے در و بست اور ترکیب میں اس بات کا خصوصی لحاظ رکھا ہے کہ صوتی آھنگ اور موسیقی کی لہر میں کسی قسم کا خلل نہ آئے اور ان کی ہم آھنگی و مجانست ٹوٹنے نہ پائے -

(۳) بیشتر الفاظ ایسے استعمال کئے ھیں جن میں ملایم و ملیں حروف مثلاً " ر " اور " ل" بار بار آئے ھیں --- اسی کے ساتھ " م" کی لب بستہ آواز کی گمک اور " ن" کی غنائیت و نغمگی اور جھنکار سے موسیقی کی تان کی کیفیت پیدا کی گئی ہے -

(۴) بعض الفاظ ، " ٹکڑوں " اور " بولوں " کی تکرار سے -

مترنم بحور کی مثالیں مقالہ ھذا صفحہ   پر پیش کی جا چکی ھیں اس لیے ان کا اعادہ تکرار لاحاصل ہوگا - البتہ دوسری شقوں کی مثال میں ایک ایک دو دو شعر، وضاحت کے لیے پیش کئے جاتے ھیں :

بول کی تکرار

(۱) ستم کے بعد اب ان کی پشیمانی نہیں جاتی
نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

(۲) ہوتا ہے راز عشق و محبت انھیں سے فاش

آنکھیں زبان نہیں ہیں مگر بے زبان نہیں

مذکورہ بالا مثالوں میں خط کشیدہ الفاظ کی تکرار سے موسیقی پیدا کی گئی ہے ۔ اس کے علاوہ " نون " کے بکثرت استعمال اور " نہیں " کی کشیدہ غنائی آواز نے شعر میں موسیقی کی لہر اور گنگی کی کیفیت پیدا کر دی ہے ۔

" ر" " ل" اور دوسری ملایم آوازوں اور " ن" کی تکرار

شمیم گلشن ، نسیم صحرا ، شعاع خورشید و موج دریا

ہر ایک گرم سفر ہے ان میں کوئی مرا ہم سفر نہیں ہے

نظر میں وہ گل سما گیا ہے تمام ہستی پہ چھا گیا ہے

چمن میں ہوں یا قفس میں ہوں میں مجھے اب اسکی خبر نہیں ہے

ان اشعار کی " بحر " بذات خود بڑی مترنم ہے ، اس سے قطع نظر ، پہلے شعر کے مصرعہ اولیٰ میں " ش " ، " س " اور " ص " کی قریب المخرج آوازوں سے " سسکاری " کی کیفیت اور مصرعہ ثانی میں " ر " کی تکرار سے ایک " لہراتی" ہوئی آواز میں ، وقفے وقفے کے بعد " م " کی گمک سے استمرا اور استحالی کی کیفیت پیدا کی گئی ہے ۔ اسی طرح دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں " ل " اور " م " کی مکرر آوازوں نے اور دوسرے مصرعہ میں " م " کی کثرت استعمال نے ترنم پیدا کیا ہے بحر " نون غنہ " کی نغمگی اور غنائیت نے اس کی موسیقیت میں اور اضافہ کر دیا ہے ---- اسی طرح درج ذیل شعر کو دیکھیے ۔

سرو بھی جوئبار بھی لالہ و گل بہار بھی

جس سے چمن چمن بنا ایک وہ مشت پر نہیں

اس شعر کے مصرعہ اولیٰ میں " ر" ، " ل" اور " ب " کی تکرار سے اور مصرعہ ثانی میں " ج " اور " چ " کی قریب المخرج آوازوں کے متصلاً استعمال سے موسیقی پیدا کی گئی ہے ۔ اب چند اشعار بلا تنقید و تبصرہ درج کئے جاتے ہیں ۔ ان میں موسیقی کی لہر ، تان ، شہد ، گنگی اور گمک ملاحظہ فرمائیے :

پردہ ٔ دہر کچھ نہیں ایک ادائے شوخ ہے

خاک اٹھا کے ڈال دی دیدہ ٔ اشتباہ میں

سو بار جلا ہے تو یہ سو بار بنا ہے

ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہے

پرتو رخ کے کرشمے تھے سر راہ گزر

ذرے جو خاک سے اٹھے وہ صنم خانہ بنے

ہم ایک بار جلوہ جانانہ دیکھتے

پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے

گرنا وہ جھوم جھوم کے رندان مست کا

پھر پائے خم پہ سجدہ شکرانہ دیکھنے

رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق تبسم بھی

لہریں سی جو اٹھتی ہیں کچھ چشم تعنا سے

(ج) توازن و سنجیدگی :

اصغر کی متوازن و سنجیدہ طبیعت نے ان کے اسلوب کو ایک ٹھہرا ہوا، پرسکون مگر مرتعش لب و لہجہ دیا ہے۔ " وہ نہ جذبات کے دھارے میں بہتے ہیں اور نہ احساسات کو بے کم و کاست پیش کرتے ہیں [۱] "۔ وہ جذبات و احساسات کے لطیف ارتعاشات میں بھی تخئیل کی رنگینی اور تخئیل کی رنگین مگر سرد و بے کیف لہروں میں بھی جذبات کی گرمی اور تپش اور احساسات کی لپک اور تھرتھراہٹ پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے بہت کم شعر ایسے ہوں گے جو اثر سے خالی اور تخئیل کی رنگینی سے معرا ہیں۔ وہ جذبہ اور تخئیل کی دھوپ چھاؤں سے بہت اعلیٰ شعری پیکر تیار کرتے ہیں۔ جناب مجنوں گورکھپوری نے صحیح فرمایا ہے :

" وہ اپنے تامل کو تاثر اور تاثر کو تامل بنا دیتے ہیں۔ ان کے جذباتی سے جذباتی اشعار میں ایک فکری میلان اور ان کے حکیمانہ سے حکیمانہ افکار میں ایک جذباتی ارتعاش (Emotional Vibration) پایا جاتا ہے۔ [۲] "

۱۔ اردو شاعری میں اصغر کی انفرادیت از فضل القدیر ۔ مقالہ ایم اے ۔ ڈھاکا یونیورسٹی ۱۹۶۹ء ۔ ص ۱۱۱

۲۔ اصغر گونڈوی از مجنوں گورکھپوری ۔ نیا دور ۲۴-۲۳، ۱۹۶۱ء

تفصیلی بحث باب ھذا حصہ دوم صفحہ   پر گزر چکی ہے اس لیے اس کو یہیں ختم کیا جاتا ہے ۔ البتہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کی وضاحت میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں :

اس کو منظور ہیں کچھ قلب و جگر کے ٹکڑے

جیب و دامن نہ کوئی پھاڑ کے دیوانہ بنے

اس شعر کا جذباتی لب و لہجہ اپنے اندر فکر کی یہ زیریں لہر بھی رکھتا ہے کہ " عاشقی باطنی خلوص کا نام ہے ۔ ظاہری وضع و صورت کا نہیں " ----- اسی طرح اس شعر میں :

یہ سب نا آشنائے لذت پرواز ہیں شاید

اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

یہ معنی پنہاں ہیں کہ " رہائی کے لیے اصل چیز " لذت پرواز " ہے ، شکوہ صیاد فضول و بے معنی ہے ۔ اب چند اشعار بلا تشریح و توضیح پیش کئے جاتے ہیں ۔ ان کے جذباتی لہجہ میں تخئیل کی رنگینی اور تخئیل کی رنگینی میں جذبات و احساسات کی لہر ملاحظہ فرمائیے :

اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ میں

محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی

کچھ قید و رسم نے جسے ایمان بنا دیا

اب کون تشنگان حقیقت سے یہ کہے

ہے زندگی کا راز تلاش سراب میں

اکثر رہا ہے حسن حقیقت بھی سامنے

اک مستقل سراب تمنا کہیں جسے

(د) حیا و بے نفسی :

" بے نفسی " سے اصغر کے لب و لہجہ میں ایک انفرادی شان پیدا ہو گئی ہے وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ۔ اور غزل عشق و عاشقی کی داستان ہے، جس میں بیشتر عاشق کی محرومی و ناکامی ، ہجر کے صعوبات و مصائب اور محبوب کے

مظالم کے دکھڑے بیان کئے جاتے ہیں - بالفاظ دیگر " راہ عشق " میں عاشق کی " انا" برابر بیدار رہتی ہے - وہ محبوب کے مقابلے میں بار بار ابھر کر آتی، شکستی اور اکڑتی ہے - اور جب حسب دلخواہ اس کی " ناز برداری " نہیں ہوتی تو اس میں احساس محرومی پیدا ہو جاتا ہے ---- اور اس کی داستان دکھ بھری پکار بن جاتی ہے - یہ رویہ خالصتاً مجازی ہے - موجودہ دور کی غزل میں یہ " احساس انا " یا عشق کا شخصی رویہ ، غالب کی روایت کی پیروی، عصر جدید کی سیاسی فکری روایت" تصور فرد " اور زندگی کی خالص مادی تشخص کے نتیجہ میں پیدا ہوا- لیکن جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اصغر کا " تصور عشق " خالصتاً تنزیہی و تجریدی ہے اور ان کا محبوب جسم و مادہ سے پاک منزہ اور جور و ستم سے مبرا ہے - اس لیے ان کی شاعری " شکست انا " کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی یاسیت ، محرومی اور خود ترحمی کی کیفیت سے پاک ہے - جیسا کہ انھوں نے بار بار اعلان کیا ہے

ع " مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی "

یا ع " یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی "

ان کی شاعری میں عاشق زیادہ سے زیادہ " ناظر " کی حیثیت سے ابھرتا ہے جو " پیکر حسن و جمال " کی " دید " میں محو و غرق اور اپنی ذات و دنیا و مافیہا سے بے خبر ہے ---- جس کا کام صرف دیکھنا اور نشاط دید میں رقص کرنا ہے - محبت میں اصغر کا یہ ~~غیر شخصی~~ نفس و نفسانیت سے پاک رویہ ان کی غزل کی جان ہے اور ان کی ہر شاعری میں نمایاں ہے لیکن ان کی نظم " کیا ہوں میں " میں پوری طرح کھل کر سامنے آیا ہے - حسب ذیل اشعار سے ، یہ حقیقت ، جس کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے ، واضح ہو جاتی ہے :

سما گئے مری نظروں میں چھا گئے دل پر
خیال کرتا ہوں ان کو کہ دیکھتا ہوں میں

نہ کوئی نام ہے میرا نہ کوئی صورت ہے
کچھ اس طرح ہمہ تن دید ہو گیا ہوں میں

جہاں ہے کہ نہیں جسم و جاں بھی ہیں کہ نہیں
وہ دیکھتا ہے مجھے اس کو دیکھتا ہوں میں

ترا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے
مجھے یہ فرصت کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

اسی پس منظر میں درج ذیل اشعار بھی دیکھئے :

اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ میں

محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں

محو ہے ذوق دید بھی جلوہ حسن یار میں

ایک شعاع نور ہے اب نہ نظر نظر نہیں

....

ہے تابش انوار سے عالم تہ و بالا

جلوہ وہ ابھی تک تہ داماں نظر ہے

غرضیکہ " نشاط دید " سے اصغر کی روح میں جو پھلجڑی سی چھوٹتی ہے، اس نے ان کی شاعری کا لہجہ " نشاطیہ " بنا دیا ہے -

(د) مسرت و طمانیت :

" نشاطیہ لب و لہجہ " جس کا ذکر سطور ماقبل میں کیا گیا ہے - وہ اصغر کی نفسیاتی کیفیت مسرت و طمانیت کا بھی نتیجہ ہے - (تفصیلی بحث مقالہ ھذا ص ۴۸۵ - ۴۷۷ پر، مسرت و طمانیت کے زیر عنوان ملاحظہ فرمائیے)- اصغر کی اس کیفیت مزاج نے میر سے لے کر عہد اصغر تک کی غزل کی عام و پسندیدہ " حزنیہ روایت " کے برعکس ان کا لہجہ " نشاطیہ و رجائی " بنا دیا ہے اور ان کی غزل اردو کی عام " مایوسانہ و مریضانہ " شاعری کے مقابلے میں روشنی کا مینار اور جہد و عمل کا پیغام ہے - اس حیثیت سے اردو غزل میں اصغر منفرد و ممتاز ہیں - اصغر کی اس انفرادیت کو سمجھنے کے لیے اردو غزل میں نشاطیہ لہجہ کی ارتقائی تاریخ پر مختصراً روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے -

نشاطیہ لہجہ کی ارتقائی تاریخ :

اردو غزل ، فارسی غزل کا نقش ثانی ہے اور فارسی غزل ایرانیوں کے قومی مزاج ---- عیش و نشاط ، خوش باشی اور حسن پرستی کی پیداوار اور مظہر ہے - ابتداً فارسی غزل اسی عیش و نشاط اور جمال پرستی کے اظہار کا وسیلہ تھی اور ایرانی شعرا غزل کو حسن و جمال ، رعنائی خیال اور لطافت بیان کا مرقع بنا کر پیش کرتے رہے - جب صوفیانہ عقائد و اعمال کی از سر نو تنظیم ہوئی اور انھوں نے " قومی مزاج " میں

جزو غالب کی حیثیت سے داخل ہو کر، ایرانی مزاج کی تطہیر و تلطیف کی تو مادی شائستگیوں اور لطافتوں کا رخ روحانی لطافتوں اور نظافتوں کی طرف ہو گیا اور ایرانی شعرا مادیات میں مجردات کی تخلیق کرنے لگے ۔ اس طرح ان کی غزل مادی حسن و جمال اور روحانی سرمستی و سرخوشی کا شاہکار بن گئی ۔ لیکن اسی کے ساتھ مایوسانہ لب و لہجہ جو بعض سیاسی حالات اور مقامی غیر اسلامی تصوف کے نتیجہ میں، غزل میں در آیا تھا، غم پسند طبیعتوں کے لیے زیادہ جاذب توجہ اور دل پسند ثابت ہوا ۔ اس طرح فارسی غزل میں بہ یک وقت دو دھارے ---- " مایوسانہ " اور " نشاطیہ " جاری ہو گئے ۔ لیکن چوں کہ بحث " نشاطیہ لہجہ " سے مطلوب ہے اس لیے اس کو اسی تک محدود رکھا جاتا ہے ۔

اردو شاعری میں " نشاطیہ روایت " قلی قطب شاہ سے لے کر پورے دکنی دور، خصوصاً ولی کی غزلوں میں بڑی نمایاں طور پر نظر آتی ہے ۔ " ولی کا تصور حسن تجریدی ہے لیکن وہ عشق مجازی کے بھی قائل ہیں " چنانچہ کہتے ہیں ؎

شغل بہتر ہے عشق بازی کا　　کیا حقیقی کا کیا مجازی کا

ولی کے " حسن و عشق " کے مجازی رخ نے " ان کی شادمانی و کامرانی کو مجازی و رومانی بنا دیا ہے " اور ان کے یہاں وہ " تشخیصی رفعت " نہیں ہے جو اصغر کی روایت نشاط کا خاصہ خصوصی ہے ۔

دبستان دہلی کے ابتدائی دور میں نشاط و شادمانی کے سب سے بڑے علمبردار سودا نظر آتے ہیں ۔ ان کی مفسل بچگی اور بافراغت اور پرمسرت مادی زندگی سے ان کے لب و لہجہ میں توانائی اور ابتہاج کی کیفیت تو ضرور پیدا ہوئی لیکن وہ دہلی کے عام " مایوسانہ مزاج " سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان کا بنیادی " نشاطیہ لہجہ " عمومی " حزنیہ لہجہ " کے ردعمل کے طور پر " ٹھٹھول " مسخرگی اور کھلنڈرے پن، سے گزرتا ہوا " طنزیات و مضحکات " پر جا کر ختم ہوا ۔ سودا کی خوش دلی غم کا بوجھ نہ سہار سکی اس لیے اس کا " ارتقاع ارتقا " نہ ہو سکا اور وہ کوئی قابل قدر، زندگی بخش، پرمسرت لب و لہجہ نہ بن سکی ۔

دبستان لکھنؤ کی ابتدائی اور درمیانی عہد کی شاعری میں بھی نشاط و خوش دلی کی روایت صاف نظر آتی ہے ۔ اس کے نمونے جا بجا جرات، انشا، رنگین اور آتش کی غزلوں میں ملتے ہیں ۔ لیکن جرات، انشا اور رنگین کے نشاط میں مادی کامجوئیوں

اور کامرانیوں کا اثر نمایاں ہے ۔ ان کی غزلیات میں لکھنئو کی عیش پرستانہ اور بوالہوسانہ زندگی کا عکس ہے جو خوش باشی ، جنسی تلذذ ، بے فکری اور زندگی کے گہرے حقائق سے انماض کی پیداوار تھی اس لیے ان کی مسرت و نشاط گوشت و پوست کی سطح سے بلند نہ ہو سکی اور بوالہوسی، سوقیت ، رکاکت ، ابتذال اور سطحیت کا شکار ہو کر رہ گئی ۔ آتش بھی اگرچہ اس " عمومی رنگ " سے نہ بچ سکے لیکن ان کے درویشانہ اور قلندرانہ مزاج نے ان کے نشاط میں ، ان کے معاصرین کے مقابلے میں، بلندی اور رفعت پیدا کر دی ہے ۔

مسرت و شادمانی کی لہر نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں بھی ملتی ہے لیکن ان کی شادمانی " دھلینڈی* کے جھڑوس " کی پھکڑ بازی یا میلے ٹھیلے میں تماشائیوں کو اپنے گرد جمع کرنے والے مداری کے ٹھٹھا ٹھٹھول اور چھچلے بازی کی شادمانی ہے ۔ یہ کسی بلند روحانی تجربے کا نتیجہ نہیں ۔

یہی حال داغ کا ہے ان کی شاعری میں بھی نشاط و خوش دلی کی کمی نہیں لیکن ان کی خوش دلی میں اہل نشاط سے شوخی و شرارت ، چہل ، چھیڑ چھاڑ اور دل لگی کی کیفیت ہے اس میں نہ شائستگی و لطافت ہے اور نہ روح کی سرشاری کا سامان ۔

عہد اصغر میں نشاطیہ روایت کی پیروی حسرت کے یہاں بھی نظر آتی ہے اگرچہ وہ تصوف سے منسلک رہے لیکن ان کے نشاط میں روح کی وہ سرشاری اور سرخوشی نہیں ہے جو کشف و مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے ۔ ان کی مسرت کو زیادہ سے زیادہ کامیاب رومانی زندگی کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے ۔

اصغر کا " نشاطیہ لہجہ " ان سب سے علحدہ ہے ۔ اس کی بنیاد خالصتہً روحانی ہے جو صوفیانہ کشف و مشاہدہ کا اثر و نتیجہ ہے ۔ " کشف و مشاہدے سے ان کے تخئیل کے افق پر جو نورانی شعاع بکھرتی ہے اسے بڑے شائستہ جمالیاتی شعور کے ساتھ

۱۔ ہولی کا دوسرا دن " دھلینڈی " کہلاتا ہے ۔ اس دن ہولی منانے والے شراب اور بھنگ کے نشے میں چور، ڈھولک تاشے اور مجیرے پر ہولی اور کبیر گاتے گروہ در گروہ نکلتے ہیں۔ گانے کے ساتھ ساتھ گالی، فحش ، مغلظات اور گندے اور عریاں اشاروں سے عوام کی ضیافت طبع کرتے رکتے ٹھہرتے گشت کرتے ہیں ۔ حلقہ میں آگے آگے ایک لمبا تڑنگا شخص صنم گلال میں لت پت ، مضحک شکل بنائے، مرکزی کردار ادا کرتا ہے ۔ اس کو " جھڑوس " (بے حیا) کہتے ہیں ۔

وہ فن میں منتقل کر دیتے ہیں اور اپنے اسی روحانی مسرت کی بنیاد پر وہ نشاطیہ فضا تخلیق کرتے ہیں۔[1] اصغر کے لہجہ کا نشاطی اور رجائی آہنگ ، نزہت و لطافت اور رنگینی و نفاست سے مل کر ایک خاصے کی چیز بن گیا ہے جو یقیناً اردو غزل میں ایک منفرد لہجہ ہے -

سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے جب تک اس کی شہادت میں اصغر کے کلام سے مثالیں نہ پیش کی جائیں بات ہوائی رہتی ہے اور دعوے سے آگے نہیں بڑھتی- یوں تو اصغر کے پورے کلام میں مسرت خیزی و نشاط انگیزی کی لہر موجود ہے لیکن یہاں صرف " بہار " کے عنوان پر اکتفا کی جاتی ہے -

" بہار " یا " فصل گل " اردو فارسی شاعری میں مسرت و شادمانی اور نکہت و سرور کی علامت کے طور پر استعمال کی جاتی تھی لیکن غم پسند طبیعتوں نے اسے حسن کی " ستم کاری " اور عشق کی " صعوبت بدوشی " کی علامت بنا لیا۔ اسطرح " بہار " کے ذکر سے ان کے لہجہ میں مایوسی آ گئی ہے - یہ " لے " بعد میں اتنی تیز اور شدید ہوگئی کہ اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس نے " بہار " میں تخریب کا پہلو نہ پیش کیا ہو - اپنے دعوے کے ثبوت میں ذیل میں " بہار " سے متعلق مختلف شعرا کے اشعار بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں - ان سے میرے بیان کی صداقت عیاں ہو جائے گی :

اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی (میر)

مرغان چمن کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آنا ہے اگر تو آ جاؤ اپریل میں ابھی شاداب ہیں ہم
(شاد عظیم آبادی)

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں (انشا)

۱- اردو شاعری میں اصغر کی انفرادیت از فضل القدیر - مقالہ ایم اے - ڈھاکہ یونیورسٹی ۱۹۶۹ء - ص ۹۹ - بادنیٰ لفظی تصرف ---- نشاطیہ لہجہ کے سلسلے میں اس مقالے سے کافی استفادہ کیا گیا ہے -

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کسو توڑینگے

تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے (ذوق)

غنچہ چٹکا اور آ پہونچی خزاں

فصل گل کی تھی فقط اتنی بساط (حالی)

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید

کچھ اب کے بوئے کفن دامن بہار میں ہے (فانی)

تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم

آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا (فانی)

لیکن اصغر کا پورا کلام دیکھ ڈالئے ان کے یہاں ایک شعر بھی " مایوسی میں ڈوبا ہوا " نہیں ملے گا ۔ ان کی شاعری میں " بہار " صرف سرخوشی و سرمستی، حسن کی رنگیں کاری، ذوق نمو اور قوت پرواز کی پیامی بن کر آتی ہے ۔ ملاحظہ ہو :

جوش شباب و نشہ صہبا، ہجوم شوق

تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصل بہار کو

بہار آتے ہی وہ یکبارگی میرا تڑپ جانا

وہ جا پڑنا قفس کا آپ سے آپ اڑ کے گلشن میں

رنج تھا اسیروں کو بال و پر کے جانے سے

اڑ چلے قفس لے کر بوئے گل کے آنے سے

ذرہ ذرہ پھر بنے گا اک جہان رنگ و بو

چپکے چپکے ہو رہا عہد و پیمان بہار

بہار سبزہ و گل ہے کرم ہوتا ہے ساقی کا

جواں ہوتی ہے دنیا میکدہ آباد ہوتا ہے

عجب اعجاز فطرت ہے اسیروں کو بھی حیرت ہے

وہ موج بوئے گل کا خود تڑپ کر بال و پر ہونا

فصل گل کیا ہے یہ معراج ہے آب و گل کی

میری رگ رگ کو مبارک رگ سودا ہونا

موسم گل کیا ہے اک جوش شباب کائنات

پھوٹ نکلا شاخ گل سے حسن عریاں دیکھئے

" بہار " کے ذکر سے ان کی روح میں کچھ ایسے شادمانی کے فوارے سے چھوٹنے لگتے ہیں کہ مرگ و میت اور گور و لحد کے ذکر میں بھی (جن کا ذکر ان کی شاعری میں نہ ہونے کے برابر ہے) مسرت و شادمانی کی " چھوٹ " اور نشاط و انبساط کی فضا برقرار رہتی ہے ۔ شعر ملاحظہ ہو :

نقش قدم ہیں یہ اسی جان بہار کے

اک پنکھڑی پڑی ہے لحد پر گلاب کی

اس شعر میں لہجہ کی نشاط انگیزی کے ساتھ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اگرچہ شعر میں " لحد " " افسردگی اور ویرانی " کی علامت بن کر موجود ہے مگر گلاب کی پنکھڑی نے فضائے شعری کو نہ صرف یہ کہ پژمردہ اور افسردہ ہونے سے بچا لیا بلکہ اس کو اپنی تازگی ، شادابی اور رنگینی بھی بخش دی ---- اور پوری شعری فضا گلاب کی پنکھڑی کی طرح کھل اٹھی ۔

بات طویل ہوتی جا رہی ہے لیکن یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اصغر کے کلام میں لفظ " بہار " کے معنی محض " موسم بہار اور اس کی سرمستیوں اور رنگینیوں " کے نہیں ہیں بلکہ وہ عبارت ہے " جوش شباب و نشہ صہبا ، ہجوم شوق " سے ۔ بالفاظ دیگر ---- " بہار " ۔ شباب یعنی " عہد شباب کے عشق " کی علامت ہے جو ایک فطری قانون اور آفاقی حقیقت ہے اور جس کی سرمستی اور نشاط خیزی اس سے بڑی حقیقت ۔ اس پس منظر میں " بہار " کے ساتھ اصغر کا " پرمسرت اور نشاطیہ لہجہ " کس قدر بامعنی اور فطری نظر آنے لگتا ہے ۔ تشریح بالا کی روشنی میں اگر اصغر کے ان اشعار کا مطالعہ کیا جائے، جن میں " بہار " کا ذکر آیا ہے تو ان کی معنویت بہت بڑھ جاتی ہے ۔

ایک بار " بہار " کے معنی متعین ہو جانے کے بعد گل ، گلشن ، چمن ، آشیانہ بلبل اور قفس کے معنی کے تعین میں دشواری نہیں رہتی ۔ گل محبوب کا استعارہ ہے، گلشن و چمن وہ ماحول و فضا ہے جس میں محبوب کے حسن کو تازگی، بشاشت اور نکھار حاصل ہوتا ہے ۔ بلبل ، عاشق کی علامت ہے ۔ آشیانہ ، عشق کی کیفیت سے خالی زندگی کا پرعافیت ، خصوصاً کمسنی کا دور ہے اور قفس ، ترک و تجرد اور تقویٰ کی زندگی ہے ۔ ان تصریحات کی روشنی میں اگر اصغر کے درج ذیل اشعار نظر میں رکھے جائیں تو جو کچھ کہا گیا ہے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے ۔ اشعار دیکھئے :

قفس کی یاد میں وہ اضطراب دل معاذ اللہ

کہ میں نے توڑ کر اک ایک شاخ آشیاں رکھ دی

میں وہ ہرگز نہیں جس کو قفس سے موت آتی ہو

میں وہ ہوں جس نے خود دیکھا نہ سوئے آشیاں برسوں

نہ پوچھو مجھ پہ کیا گزری ہے میری مشق حسرت سے

قفس کے سامنے رکھا رہا ہے آشیاں برسوں

بہار آتے ہی وہ یکبارگی میرا تڑپ جانا

وہ جا پڑنا قفس کا آپ سے آپ اڑ کے گلشن میں

اصغر کے کلام کے مطالعہ سے یہ نتیجہ قائم کیا جا چکا تھا کہ جناب عابد علی عابد کی حسب ذیل تحریر نظر سے گزری - جس سے میرے خیال کی تصدیق و تائید ہو جاتی ہے - وہ رقمطراز ہیں :

" فارسی شاعری کی علامات کے رموز بالخصوص مجھ پر انھیں (اصغر) کے ذریعہ روشن ہوئے ہیں اور ان میں سے کون کون سے رموز اردو میں منتقل ہوئے ہیں یہ بھی انھیں نے مجھے بتایا ہے - " بہار " فارسی کی کلاسیکی شاعری میں " عہد شباب کا عشق " ہے کہ نشاط سے لبریز ہے " گل " محبوب کا استعارہ ہے اور " بلبل " ظاہر ہے کہ عاشق کی علامت ہے[1] - "

مختصر یہ کہ اصغر کی فطری مسرت و طمانیت اور روحانی نشاط و شادمانی نے ان کے لہجہ کو نشاط خیز و ولولہ انگیز اور رجائی بنا دیا ہے - رجائیت کے سلسلے میں تفصیلی بحث مسرت و طمانیت کے زیر عنوان مقالہ ہذا صفحہ ۱۸۱ پر کی جا چکی ہے - یہاں صرف چند اشعار مثالاً پیش کئے جاتے ہیں :

ذوق طلب حصول سے جو آشنا نہ ہو | یعنی وہ درد چاہئے جس کی دوا نہ ہو

اک جہد و کشاکش ہے ہستی جسے کہتے ہیں | کفار کا مٹ جانا خود مرگ مسلماں ہے

آغوش میں ساحل کے کیا لطف سکوں اس کو | یہ جان ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

۱- اصغر گونڈوی از عابد علی عابد - نقوش ۴۷-۴۸ - ۱۹۵۵ء ، ص ۵۰۹-۵۰۸

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے   اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے

(۵) رنگینی طبع و نفاست پسندی :

شاعر اپنے شاعرانہ افکار کو اپنی مزاجی کیفیات کے ساتھ، الفاظ و تراکیب، تشبیہات و تمثیلات اور استعارات و کنایات کے ذریعہ جسم و جان بخشتا ہے - اس لیے کسی شاعر کی نفسیاتی و باطنی کیفیات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے، الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات کا تجزیاتی مطالعہ ناگزیر ہے - باب ہذا حصہ دوم میں اصغر کی مزاجی کیفیت --- رنگینی و نفاست پسندی --- سے تفصیلی بحث گزر چکی ہے (صفحہ   ) لیکن اسے صرف موضوع و مواد تک محدود رکھنے کی کوشش کی گئی تھی - یہاں تشبیہات و تمثیلات کے تجزیے سے ان کی رنگینی طبع و نفاست پسندی کو ان کے اسلوب میں دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے -(الفاظ و تراکیب اور دوسرے لفظی محاسن " اجتہاد " کے تحت زیر بحث لائے جائیں گے) - تجزیے سے پہلے تشبیہہ و تمثیل کے متعلق اصغر کا نظریہ پیش کرنا ضروری سمجھا گیا ہے تاکہ اس کی روشنی میں تجزیاتی مطالعے کی تفہیم میں آسانی ہو نیز یہ سمجھ میں آ سکے کہ ان کی طبیعت کی رنگینی اور نفاست پسندی کی علامات کے ذریعے ان کی شاعری میں ظاہر ہوتی ہے -

اصغر کا نظریہ "تشبیہہ و تمثیل :

(۱) " ایک خوش مذاق شاعر کا کمال فن صرف تشبیہہ و تمثیل کے استعمال میں نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی طغرائے امتیاز تشبیہہ و تمثیل کی لطافت و جدت اور اس کی گہری معنویت پر منحصر ہے -"[1]

(۲)" ہم ...... تمثیل و استعارے کے لیے مناظر قدرت کی طرف رجوع کرتے ہیں ...... اگر نگاہ تدبر میسر ہو ..... تو پھر یہی مرایا و مناظر شاعر کی نکتہ رس و حسن پرست نظروں میں خود شاہد حقیقی کا خدو خال بن جاتے ہیں -"[2]

۱- مقدمہ یادگار نسیم - ص ۳۲

۲- مقدمہ رباعیات رواں - ص ۱۲-۱۳

اصغر کے محولہ بالا اقتباسات کے تجزیے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں تشبیہ و تمثیل کے ضروری عناصر ، لطافت ، جدت اور معنویت ہیں - نیز تمثیل کو " خود شاہد حقیقی کا خد و خال " کہہ کر انھوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ ان میں :

(۱) جمال ---- (اَللّٰہُ جمیلٌ)

(۲) ظہور* ----(مرایا و مظاہر کے واسطے سے - کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شَانٍ[۱])

اور (۳) مستوری ----(" اس کے جلوے کی ادا اک شان مستوری بھی ہے")[۲]

کی شان بھی (کہ یہ صفات الٰہی ہیں) ہونا چاہیے -

چنانچہ انھوں نے اپنے " افکار " کو جن تشبیہات و تمثیلات یا استعارات و کنایات ---- یعنی اشیائے فطرت کے وسیلے سے ظاہر کیا ہے ان میں جدت ، لطافت اور معنویت کے ساتھ جمال ، ظہور اور مستوری کا بڑا حسین و دلکش امتزاج و اجتماع ہے ، نیز اشیائے فطرت کو " شاہد حقیقی کا خد و خال " سمجھنے نے ان کی دید میں ، اور نتیجۃً ان کے اظہار و بیان میں ایک طرح کی لذت و چاشنی بھر دی ہے - اصغر نے اپنی اس ذہنی کیفیت کی طرف بڑے بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے ؎

تم اس کافر کا ذوق بندگی اب پوچھتے کیا ہو

جسے طاق حرم بھی ابروئے خم دار ہو جائے

ان تمہیدی اشارات کے بعد ان کی بعض تشبیہات و استعارات کا تجزیہ کیا جاتا ہے -

(۱) جمال ، ظہور اور مستوری کی حامل تمثیلات :

اصغر نے اپنی اسلامی و صوفیانہ مزاج ، روحانی نزہت و لطافت اور ذہنی

---

* - حجاب اس کا ظہور ایسا ، ظہور اس کا حجاب ایسا
ستم ہے خواب میں خورشید کا یوں جلوہ گر ہونا (اصغر)

۱- ہر روز ایک نئی شان میں اس کا ظہور ہوتا ہے - سورۂ رحمن - آیت : ۳۰

۲- میں تو ان محجوبیوں پر بھی سراپا دید ہوں
اس کے جلوے کی ادا اک شان مستوری بھی ہے (اصغر)

رنگینی و نفاست کے زیر اثر اشیائے کائنات میں سے " نور " ، " شعلہ " ، " شرر " اور " برق " کو بار بار بطور تمثیل استعمال کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک جمال، ظہور اور مستوری کا حامل اور اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ --- کے مصداق --- شاہد حقیقی کے نور و تجلی سے قریب تر ہے - پھر ان کی فطری مسرت و شادمانی نے " شعلہ و برق" میں تخریبی پہلو --- " قہر و غضب " دیکھنے کے بجائے ان کو رنگ و نور اور تبسم محبوب --- یعنی خوشی و شادمانی کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے - چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

ذرا روکے ہوئے موج تبسم ہائے پنہاں کو
ابھی یہ لے اڑیں گی بجلیاں تار رگ جاں کو

روشنی ہو جگنو کی جیسے شبستاں میں
وہ مہتاب کا عالم اس کے مسکرانے سے

یہ حسن کی موجیں ہیں یا جوش تبسم ہے
اس شوخ کے ہونٹوں پر اک برق سی لرزاں ہے

وہ اک دل و دماغ کی شادابی نشاط
گویا چمک کے اٹ تری برق نگاہ کا

ذرے ذرے کو ہے جنبش ان کے برق حسن سے
اڑ نہ جائے ایک دن یہ خاکدان اضطراب

(۲) جدت ، لطافت ، معنویت کی حامل تشبیہات :

اصغر نے اپنی تشبیہات و تمثیلات میں ، تشبیہہ کے محولہ بالا عناصر کے ساتھ جدت لطافت اور معنویت کا بھی اہتمام و التزام رکھا ہے - حسب ذیل اشعار کی معنویت غور طلب ہے جو اردو شاعری میں اپنی تشبیہہ و تمثیل کے اعتبار سے جدید ، لطیف ، رنگین اور لذت بخش ہے اشعار یہ ہیں :

ابھی اک " موج مے " اٹھی تھی میخانے میں اے واعظ
ابھی اک برق چمکی تھی مرے وادی ایمن میں

سمجھ میں " برق سر طور " کس طرح آئے
جو " موج بادہ " میں ہیجان و انتشار نہ ہو

شاید کہ پیام آیا پھر وادی سینا سے
شعلے سے لپکتے ہیں کچھ کسوت مینا سے

ہر موج کی وہ شان ہے جام شراب میں
" برق فضائے وادی " سینا کہیں جیسے

ان تمام اشعار میں " شعلہ کسوت مینا " اور " موج مے " کی " برق وادی ایمن "،

" برق سر طور " اور " برق فضائے وادی سینا " سے تشبیہہ ، جدید و لطیف ہونے کے ساتھ بڑی گہری مشابہت کی حامل ہے ۔ " مے " " حسن حقیقی " ہے اور " موج مے " " حسن حقیقی کے مظاہر " جو موج در موج کائنات کے " شیشہ و مینا " سے " برق سر طور " کی طرح اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہُ[1] اور اِنَّہٗٓ اَنَا اللّٰہُ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ[2] کی دعوت دے رہے ہیں ۔

پھر " موج مے " (مشبہ یا مستعار لہ) کی لرزش ، حرکت ، نور اور خوش رنگی ، اور " برق " (مشبہ بہ یا مستعار) کی لرزش ، حرکت ، نور اور خوش رنگی میں کس قدر ظاہری مماثلت ہے ۔ اور باطنی مماثلت یہ ہے کہ " برق سر طور " کی حقیقت حقہ ---- اللّٰہُ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ---- (لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ[3]) ---- تمام کائنات میں اسی طرح جاری و ساری ہے جس طرح " مے " کا جوہر یا حاصل یعنی " نشہ " (بے رنگ) " مے " میں ہوتا ہے ۔ ان مماثلتوں کے علاوہ " موج مے " میں لذت ذوق و نظر کے باوجود ، اسے " برق طور " کہہ کر ، ایک طرح کی روحانیت اور احساس پاکیزگی بھی ابھارا گیا ہے ۔ ان تصریحات کے پس منظر میں حسب ذیل اشعار پر غور کیا جائے تو تشبیہہ و تمثیل بالا کی جو تشریح و تفسیر کی گئی ہے درست نظر آئے گی ۔ اشعار ملاحظہ ہوں :

نظر بھی آشنا ہو نشہ' بے نقش و صورت سے — ہم " اہل راز " سب رنگینی مینا سمجھتے ہیں

دھر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے پنہاں بھی ہے جیسے صہبا کے لیے پردہ' مینا ہوتا

پتہ ملتا نہیں آب آتش وادی ایمن کا — مگر " مینائے مے " کی شعلہ افشانی نہیں جاتی

کچھ سمجھ کر ہم نے رکھا ہے حجاب دھر کو — توڑ کر شیشے کو پھر کیا رنگ صہبا دیکھتے

تمثیل بالا کے پردے میں اصغر نے ایک وحدۃ الوجودی صوفی کی طرح یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ " خدا اور کائنات ---- مل کر ایک وحدت ہیں ۔ خدا روح ، نور، نکہت اور نشہ' کائنات ہے اور کائنات اس روح کا جسم، اس نور کا شعلہ ، اس نکہت کا گل اور اس نشہ کی مے ہے ۔ خدا وحدہ تعالی کا نور و جمال ، درخشانی و تابانی اور نکہت و بو اشیائے کائنات اور مرایا و مظاہر فطرت میں جھلک اور مہک رہی ہے ۔

---

[1] ۔ وہ یہ کہ میں ہی اللہ ہوں ---- قرآن سورہ' طہ آیت : ۱۵

[2] ۔ بات یہ ہے کہ میں ہوں اللہ زبردست اور دانا ۔ قرآن سورہ' النمل آیت : ۹

[3] ۔ اس سی کوئی چیز نہیں ---- " اصغر " کی اصطلاح میں " بے رنگ " یا " بے نقش و صورت "

اصغر نے یہی صوفیانہ حقیقت " گل " کی تمثیل سے بھی واضح کی ہے ۔ " گل " جو نکہت و بو ، رنگ و نور ، پاکیزگی و لطافت اور نرمی و نزاکت کا حسین و دلکش ترین مجموعہ ہوتا ہے ۔ اس مثال میں بھی شاعر کی رنگینی مزاج ، لطافت طبع ، احساس پاکیزگی اور فطری شگفتگی و شادمانی ، " گل " کی تمثیل کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے ۔ ذیل میں گل کی تمثیل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں :

ادھر وہ خندۂ گل ہائے رنگیں صحن گلشن میں

ادھر اک آگ لگ جانا وہ بلبل کے نشیمن میں

مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گل ہائے رنگیں پر

چھپا کر کس نے ان پردوں میں برق آشیاں رکھ دی

آتش گل سے ہر طرف دشت و چمن دھک اٹھا

ایک شرار طور ہے خلوتیان راز میں

محبت ابتدا سے تھی مجھے گل ہائے رنگیں سے

رہا ہوں آشیاں میں لے کے برق آشیاں برسوں

وہ نکہت سے سوا پنہاں وہ گل سے بھی سوا عریاں

یہ ہم ہیں جو کبھی پردا کبھی جلوا سمجھتے ہیں

یہاں کچھ دخل پر بکھرے ہوئے اوراق رنگیں ہیں

مگر اک مشت پر سے پوچھئے راز گلستاں کو

دکھائی صورت گل پر بہار شوخی پنہاں

چھپایا معنی گل میں کبھی حسن نمایاں کو

مگر اک مشت پر کی خاک سے کچھ ربط باقی ہے

ابھی تک شاخ گل کی شعلہ افشانی نہیں جاتی

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان تمثیلات کے اظہار میں شاعر کی رنگینی طبع نے وہ ذوق و لذت بھی شامل کر دی ہے جو کسی " مے پرست " کو " صہبائے رنگیں " میں موجیں مارتی ہوئی " مے گل رنگ " یا کسی " گل پرست " کو " تر و تازہ و شگفتہ گل سرخ رنگ کے لہراتے ہوئے تختے " کی دید سے حاصل ہوتی ہے ۔ کلام اصغر کی تشریح کرتے وقت جا بجا یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اصغر " تمتع بالدنیا " کے قائل اور فطرتاً اس کی طرف مائل تھے ۔ اور ان کی شاعری " دنیا " کی انہیں رنگینیوں اور لذت اندوزیوں

کی داستان ہے جن لوگوں نے اصغر کی شاعری کو " ماورائی " یا " عالم بالا " کی آواز کہہ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اس میں نہ زندگی کی حرارت و گرمی ہے اور نہ ہمارے لیے وہ مفید ہو سکتی ہے ۔ انھوں نے ان کی شاعری کا گہری نظر سے مطالعہ نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصغر نے زندگی اور لذائذ زندگی کو جس ذوق و لذت سے دیکھا اور برتا ہے اور زندگی کے " مجرد حقائق " کا اظہار اشیائے فطرت کے وسیلے سے جس شیفتگی اور والہانہ پن سے کیا ہے وہ اردو شاعری میں منفرد ہے --- یہ ضرور ہے کہ انھوں نے زندگی کے " مادی حقائق " ---- " اشتہائے جنس و جسم " کو (جو بعضوں کے نزدیک شاعری کا اصل اور واحد موضوع ہیں) اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا۔ انھوں نے " مجرد حقائق " کے لذائذ کو استعاراتی " مظہر " صورت میں " میخانے شاعری " میں پیش کیا ہے ۔ لوگوں کی نظر صرف میخانے شاعری کی رنگینیوں ہی میں الجھ کر رہ گئی اور زندگی کے ان " مظہر و پوشیدہ حقائق " تک نہ پہونچ سکی جنھیں اصغر نے " بتوں کے حسن اور شراب کی مستی " سے تعبیر کیا ہے۔ اور وہ اپنی اس کم نگاہی اور نارسائی کو اصغر کا نقص و کوتاہی کہہ کر بخیال خود بری الذمہ ہو گئے ہیں ۔ (تفصیلی بحث سطور آئندہ میں دیکھئے) ۔

جس امر کی طرف یہاں اشارہ مقصود ہے اس کو اسی " تمثیل مے و مینا " سے سمجھا جا سکتا ہے ۔ اصغر نے " مے و مینا " کا ذکر جس ذوق و لذت کے ساتھ بتکرار کیا ہے اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ شاعر کو ان چیزوں کا ذاتی تجربہ ہے ۔ اس کی زندگی میں انھیں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اور انھوں نے اس کے ذہن و شعور پر دیرپا ، گہرا ، رنگین اور لذت بخش اثر چھوڑا ہے ۔ یہ تمثیلات نہ صرف بے جان لفظی پیکر ہیں ، نہ سنی سنائی باتیں اور نہ محض روایت کی پیروی میں کہے ہوئے کھوکھلے الفاظ ۔ بلکہ ان میں وہ روحانی لذت شامل ہے جو تجربے کے خلوص اور جذبات کی صداقت کے نتیجہ میں آتی ہے ۔

مرکب تشبیہات :

اصغر کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بیشتر مرکب تشبیہات استعمال کی ہیں ۔ یعنی کسی ایک چیز کو دوسری سے مشابہ کرکے وہیں نہیں چھوڑ دیا بلکہ ایک تصویر کے مقابلے میں اس سے زیادہ خوبصورت تصویر ، ایک مصرادہ فضا کے مقابلے میں

اس سے زیادہ رنگین مصورانہ فضا اور ایک دلکش منظر کے مقابلے میں اس سے زیادہ حسین و دلکش منظر پیش کیا ہے اور یہ تصاویر و مناظر رنگ و نور ، حسن و زیبائی اور دلکشی و رعنائی کے ایسے شاہکار ہیں کہ ان کی شاعری خوبصورت تصاویر کا مرقع بن گئی ہے — انھوں نے اپنے تخئیل کی رنگینی سے " مجردات " کو " مادیات " کی رنگین، رقصاں اور متحرک تشبیہات میں اسطرح منتقل کیا ہے کہ ان کی " تصویریت " اور " رنگینی " براہ راست حواس خصوصاً نظر و بصر کو مسحور کر لیتی ہے ۔ ان کی تمثیلات خواہ " مادی افکار " کی تصویریں ہوں یا " مجردات " کی ، بیشتر حسّی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی " تخئیلی تشبیہات " بھی حس کی لذت و رنگینی سے خالی نہیں ہیں ---- اس کے باوجود ان کی تمثیلات کے " مادی پیکر " بیشتر صورتوں میں " لمس و مس " سے پاک و منزہ ہوتے ہیں ۔ اور ان کی اصل لذت تخئیلی و ذہنی ہوتی ہے ---- ان کی تخئیل نے ذوق جمال کے ساتھ مل کر جہاں اعلیٰ خوبصورت پیکر تراشے ہیں ان کے حد درجہ شائستہ و مہذب احساس پاکیزگی اور نفاست پسندی نے ان تصاویر کی فضا کو پاکیزہ و مطہر بنا دیا ہے اور انھیں ہر طرح کے ابتذال ، پستی اور عریانی سے محفوظ رکھا ہے ---- اگر یہ کہا جائے کہ " حسن حقیقی " یا بقول خود ---" طائر قدس[1] " کو جس طرح " دام گہ مجاز " ---- یعنی مادی تمثیلات میں، اصغر لائے ہیں، وہ اردو کا کوئی اور شاعر نہیں کر سکا تو شاید غلط نہ ہو ۔ " مجاز میں حقیقت دیکھنا بہتی پرانی رسم ہے مگر حقیقت میں مجاز کی رنگینیاں قائم رکھنا (اور اس کی گرمی و حسن دیکھنا) نئی بات ہے[1] ۔" ان کی یہ ذہنی کیفیت آرزوئے شدید بن کر بارگاہ خداوندی میں اس طرح ظاہر ہوتی ہے :

" الہیٰ خاطر اہل نیاز رہنے دے — ذرا بتوں کو بھی بندہ نواز رہنے دے
مجاز کا بھی حقیقت سے ساز رہنے دے — یہ راز ہے تو ذرا حسن راز رہنے دے "

اور یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اصغر نے اپنی تمام شاعرانہ زندگی " مجاز و حقیقت کے اس ساز " کو قائم رکھنے کی کوشش میں صرف کر دی ---- یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے ۔

٭۔ اے دل شوخ و حیلہ جو زیر کمین رنگ و بو
طائر قدس کو بھی لے دام گہ مجاز میں (اصغر)

۲۔ اصغر گونڈوی از مجنوں گورکھپوری ۔ نیا دور ۲۲-۲۳، ۱۹۶۱ء

اصغر کے اسی ذہنی و جذباتی مزاج نے ان کی شاعری کو روایتی متصوفانہ شاعری کی بے کیفی اور بے رنگی سے محفوظ رکھا اور " تصوف برائے شعر گفتن خوب است " کی بدعتی سے بچا لیا۔ ذیل میں مرکب تشبیہات کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

اس عارض رنگیں پر عالم وہ نگاہوں کا — معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

روشنی ہو جگنو کی جیسے شبستان میں — وہ مہتاب کا عالم اس کے مسکرانے سے

یہ حسن کی موجیں ہیں یا جوش تبسم ہے — اس شوخ کے ہونٹوں پر اک برق سی لرزاں ہے

رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق تبسم بھی — لہریں سی جو اٹھتی ہیں کچھ چشم تماشے

ہر موج کی وہ شان ہے جام شراب میں — برق فضائے وادی سینا کہیں جیسے

ہے تیرے تصور سے یہاں نور کی بارش — یہ جان حزیں ہے کہ شبستان حرا ہے

ان میں سے بیشتر اشعار کی تشریح صفحات گزشتہ میں پیش کی جا چکی ہے یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا مقصود ہے کہ شاعر نے ان تمام اشعار میں ہر شعر کے کینوس پر بڑی چابک دستی سے ، پہلو بہ پہلو دو دو تصویریں بنائی ہیں جو ایک دوسرے کا مکمل جواب ہیں لیکن قاری کے لیے یہ فیصلہ و تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں کون سی زیادہ حسین، دلکش اور جاذب نظر ہے -

سطور بالا میں جو تصریحات پیش کی گئی ہیں ان سے اصغر کے اس " ذہنی مزاج کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہونا چاہیے جسے " حقیقت میں مجاز کی رنگینیوں کو قائم رکھنے " سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ تاہم اس کیفیت کی تفہیم کے لیے حسب ذیل شعر:

" ہے تیرے تصور سے یہاں نور کی بارش — یہ جان حزیں ہے کہ شبستان حرا ہے "

کی تشریح کی جاتی ہے -

اس شعر میں " جان حزیں " کو " شبستان حرا " کہا گیا ہے ایسا کہنے کی وجہ " تصور محبوب " میں مضمر ہے ۔ اب ذرا اس کی تہیں کھولیے تو معلوم ہوگا کہ

(۱) " تصور " میں وہی شخص محو و غرق ہوتا ہے جو محبوب سے دور و مہجور ہو اور دور و مہجور شخص کی " جان " کے لیے " جان حزیں " ہی کا لقب موزوں و مناسب ہے -

پھر (۲) " جان حزیں " کو دوری و مہجوری کی تاریکیوں اور ویرانیوں کی وجہ سے " شبستان " کہنا ہی زیب دیتا ہے کہ شبستان تاریکیوں اور ویرانیوں کا مسکن و مخزن ہوتا ہے -

اب لفظ " حرا " اور " تصور " کی مماثلت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ

(۱) جس طرح لفظ " حرا " کے ساتھ ذہن میں ہنگامہ زندگی سے علیحدہ، کعبہ مقصود سے دور بے آب و گیاہ سلسلہ کوہ[۱] میں ایک تنگ و تاریک غار کا تصور ابھرتا ہے جس میں "محمد عربی " معتکف ہوتے تھے ---- اسی طرح لفظ " تصور " میں بھی یہ تمام معنوی پہلو پوشیدہ ہیں ---- یعنی " جان حزیں " بھی نازنین کنج حرا" کی طرح ہنگامہ حیات سے کنارہ گیر ہو کر، ذات محبوب سے دور " تخئیل و تصور کی خلوت و تنہائی کے تنگ و تاریک غار " میں معتکف ہے ۔

(۲) پھر جس طرح " شبستان حرا " کے مکیں کی یہ کیفیت تھی کہ دل میں یاد محبوب کی لگن، آنکھوں میں دیدار کی تشنگی، لب پر درود و صلوۃ کی زمزمہ سنجی اور چہرے پر عجز و مسکنت کا غازہ ---- رب کعبہ کے تصور میں غرق ---- روزن[۱] حرا سے " کعبہ جمیل " پر نظریں جمائے، بانداز عاشقانہ معتکف رہتا اور تخئیل کی نورانی شعاعیں اس کے دل کو ڈھارس اور تسلی دیتی رہتیں ۔ اسی طرح " جان حزیں " کی نظریں بھی اپنے کعبہ مقصود ---- پر جمی ہوئی نور و ضیاء حاصل کرتی ہیں ۔

(۳) اس کے علاوہ جس طرح " شبستان حرا " کی تاریکیاں اور ویرانیاں ایک روز پیغام محبوب کی جلوہ باریوں سے منور اور روشن ہوگئی تھیں ---- اسی طرح " جان حزیں " کی تاریکیاں اور ویرانیاں بھی پیغام محبوب کی جلوہ ریزیوں سے روشن و آباد ہوں گی ---- گویا " شبستان حرا " کی تمثیل میں " جان حزیں " کے لیے پیغام محبوب کی بشارت پوشیدہ ہے ۔ اس معنوی پہلو نے شعر کی ظاہری فضا میں " حزیں اور شبستان " کے استعمال سے جو تلخی اور کرختگی آ گئی تھی اسے دور کرکے، اسے روشن اور پرنشاط بنا دیا ہے ۔

شاعر نے اس شعر کی تصویری فضا کو " جان حزیں و شبستان حرا" اور " نور کی بارش " کے " سایہ و نور " اور دھوپ چھاؤں کی متضاد کیفیات سے بڑی روح پرور اور رومانی بنا دیا ہے ۔ ایک طرف " شبستان حرا " کے ساتھ چشم تخئیل کے سامنے ننگے ننگے کالے کالے پہاڑوں میں گھرے ہوئے ایک کوٹھری نما غار کا تصور ابھرتا ہے، جس کی دیواریں

۱۔ ایک دوست نے جنھیں " عمرہ " کی سعادت نصیب ہوئی ہے، بتایا کہ " حرا" مکہ سے ۸، ۹ میل کے فاصلے پر ، بے آب و گیاہ سلسلہ کوہ میں ایک تنگ و تاریک غار ہے ۔ غار میں ایک چھوٹا سا روزن سمت کعبہ میں ہے جس سے خانہ کعبہ صاف نظر آتا تھا۔ رسول اکرم صلعم اسی غار میں معتکف ہوتے تھے ۔ اس طور پر کہ خانہ کعبہ ہر وقت نظروں کے سامنے رہتا تھا ۔

اندھیں کالے پہاڑوں کی ھیں - غار کے چاروں طرف کا ماحول انتہائی ڈراؤنا، سنسان اور ویران ھے جس پر رات کے سیاہ سایے نے موت کا سناٹا طاری کرکے اس کی ویرانی اور خوفناکی میں اور اضافہ کر دیا ہو ---- دوسری طرف " نور کی بارش " سے ------ ذھن کے سامنے اسی ڈراؤنے ماحول میں آسمان کے ایک گوشے میں جھلملیاں سی چمکنے اور نیچے اترنے لگتی ھیں اور دیکھتے ھی دیکھتے کوٹھری کے اوپر کی فضا روشنی کی پھوار اور نور کے ذرات سے دھوا اٹھتی ھے - یہاں تک کہ کوٹھری کی اندرونی فضا یوں نظر آنے لگتی ھے جیسے اس میں ھزاروں لاکھوں جگنو اڑتے یا چھلنی سے نور چھن چھن کے ھوا میں تیرتے پھر رہے ھوں ---- اصغر کی شاعرانہ مصوری اور محاکاتی شاعری کا یہ شاھکار ان کے مزاج کی رنگینی اور تخئیل کی رنگین کاری کا کرشمہ و کمال ھے - پھر لطیفت یہ ھے کہ اس " مرصع کاری " میں احساس کی تھرتھراھٹ اور جذبہ کی تپش بدستور باقی رھتی ھے - ---- اس شعر کا لہجہ حقیقت کا رنگ لیے ھوئے ھے لیکن مصرعہ اولیٰ کے " مجازی رخ " اور " شبستان حرا " اور " نور کی بارش " کی رنگین حسی مادی تمثیلات کے ذریعہ ، " حقیقت " کو " مجاز " کی رنگینیوں میں مرکوز کر لیا گیا ھے -

استعارات :

اصغر کی رنگینی طبع اور نفاست پسندی ان کے استعارات میں بھی ظاھر ھوتی ھے - استعارہ تشبیہہ ھی کی ایک شکل ھے لیکن اس سے زیادہ شوخ ، رنگین ، پرمزہ اور ابلاغ معنی کا بہتر وسیلہ ھوتا ھے - اس سے تشبیہہ کے مقابلے میں ، کلام میں زیادہ حسن گرمی اور چستی آتی ھے - لیکن استعارے میں " تخئیل " کا عمل دخل زیادہ ھوتا ھے اور اس کے استعمال میں زیادہ مہارت ، فنکاری اور سلیقہ درکار ھوتا ھے — اسی لیے ایسے شعراء جن کے یہاں " تخئیل " غالب ھوتا ھے وہ تشبیہہ و تمثیل کے مقابلے میں استعارے سے زیادہ کام لیتے ھیں ------ ان تمام خوبیوں کے باوجود " استعارے " میں ایک بڑا نقص یہ ھے کہ اگر شاعر کی " پرواز فکر " میں ذرا سی کوتاھی آ جائے یا وہ اتنی بلند ھو جائے کہ عام ذھن اس کا ساتھ نہ دے سکے ---- اور وہ " مستعار " میں " مستعارلہ " کا عکس دکھانے میں ناکام ھو جائے یا " مستعار " کو سن کر، ذھن بآسانی " مستعارلہ " کی طرف منتقل نہ ھو سکے تو اس کی تمام جانفشانیاں اکارت اور " عنقائے خیال " کو " عالم تجرید " سے " دام تصویر " میں پھانس کر " عالم تخلیق " میں

لانے کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں ۔ اور اس کا کلام مبہم ،پیچیدہ ، مشکل اور بے کیف ہو جاتا ہے ۔ اصغر کا کلام ان نقائص سے پاک ہے وہ بے کیف اور دور از کار استعارات کے استعمال سے گریز کرتے ہیں ۔ وہ استعارے میں بھی اپنی تشبیہہ و تمثیل کی روایت کو قائم و برقرار رکھتے ہیں اور " مشبہ بہ " کی طرح " مستعار " بھی رنگیں، رقصاں اور متحرک استعمال کرتے ہیں ۔ ان کے " مستعار " بڑے جانے پہچانے اور مانوس ہوتے ہیں اور " اشیائے فطرت " میں اپنے حسن و رعنائی، رنگینی و لطافت کی بدولت ہر شخص کا مرکز توجہ ہوتے ہیں ۔

ان کے استعاروں کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان کے وسیلے سے خیالات و افکار کے " منظر " پیش کرتے ہیں ۔ یعنی کسی " شے مفرد " کی تصویرکشی کے بجائے وہ بیشتر کسی " منظر " کی تصویر پیش کرتے ہیں ۔ وہ اس طرح کہ شعر کے ایک مصرعہ میں وہ کوئی بہت ہی خوبصورت " موضوع یا منظر فطرت " بطور " مستعارلہ " لاتے ہیں اور متصلاً دوسرے مصرعہ میں اس کا " مستعار " کسی دوسرے " موضوع یا منظر فطرت " کی شکل میں پیش کر دیتے ہیں ۔ اس سے ایک طرف ان کے کلام میں رنگینی و حسن پیدا ہو جاتا ہے دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ عام استعارے میں قاری کے ذہن کو مستعار و مستعارلہ کا درمیانی فاصلہ گھٹا کر اور دونوں کی تصویریں یکجا کرکے، کسی واضح تصور تک پہونچنے میں جو زحمت اٹھانا پڑتی ہے جس سے عام ذہن عموماً ابا و گریز کرتا ہے وہ بالکل نہیں اٹھانا پڑتی ـــ اصغر استعارے کے انتخاب اور مستعارلہ و مستعار کی ترتیب میں، قاری کے لیے یہ زحمت خود برداشت کرتے ہیں اور جب وہ عمل تخلیق سے گزار کر " فکر " کی کوئی تصویر " مستعار " کی شکل میں پیش کرتے ہیں تو اس کا مطلب سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اور وہ ایسی واضح ، عیاں ، حسین اور دلکش ہوتی ہے جیسے ان کی تشبیہات و تمثیلات ہوتی ہیں ۔ جن کی مثالیں صفحات گزشتہ میں پیش کی جا چکی ہیں ۔

یہاں اتنا اشارہ اور ضروری ہے کہ اصغر نے اپنے استعاروں میں بھی، تشبیہات و تمثیلات کی طرح جدت ، لطافت ، معنویت اور جمال و ظہور اور مستوری کا پورا پورا التزام رکھا ہے ۔ اور وہی " موضوعہائے فطرت "، برق ، شعلہ ، گل وغیرہ بطور مستعار استعمال کئے ہیں، جن سے انھوں نے اپنی تشبیہات میں کام لیا ہے ۔

استعارے سے جو بحث سطور گزشتہ میں کی گئی ہے اس کی وضاحت میں کلام اصغر

سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں -

اس جوئبار حسن سے سیراب ہے فضا

روکو نہ اپنی لغزش مستانہ وار کو

خزاں میں بلبل بیکس کو ڈھونڈھئے چل کر

وہ برگ خشک کہیں زیر شاخسار نہ ہو

دل پہ لیا ہے داغ عشق کھو کے بہار زندگی

اک گل تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا

اس نے نگاہ ڈال دی مجھ پہ ذرا سرور میں

صاف ڈبو دیا مجھے موج مے طہور میں

مٹی جاتی تھی بلبل جلوہ گل ہائے رنگیں پر

چھپا کر کس نے ان پردوں میں برق آشیاں رکھ دی

اسرار عشق ہے دل مضطر لئے ہوئے

قطرہ ہے بیقرار سمندر لئے ہوئے

آنکھوں میں تیری بزم تماشا لئے ہوئے

جنت میں بھی ہوں جنت دنیا لئے ہوئے

پاس ادب میں جوش تمنا لئے ہوئے

میں بھی ہوں اک حباب میں دریا لئے ہوئے

قاتل نگاہ یاس کی زد سے نہ بچ سکا

خنجر تھے ہم بھی اک نہ خنجر لئے ہوئے

مختصر یہ کہ تشبیہہ ، تمثیل اور استعارے کی اس تفصیلی بحث کے بعد یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اصغر کی رنگینی طبع اور نفاست پسندی ان کے استعارات و تشبیہات میں پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے جس سے ان کے اسلوب میں رنگینی و نفاست کے ساتھ مصوری کی شان پیدا ہوگئی ہے -

(ی) اجتہاد :

صف اول کے فن کار کے لیے جس قوت اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے وہ اصغر میں بدرجہ اتم موجود تھی - انھوں نے اپنی جدت طبع ، قوت اختراع اور ندرت احساس

کے تحت جہاں موضوع و مواد میں پامال راہوں سے بچتے ہوئے ، خیالات و افکار کے نئے عوالم آباد کئے ہیں وہیں اپنی شاعری کی لفظیات میں بھی جدت و اجتہاد سے کام لے کر اپنا ایک منفرد و ممتاز لب و لہجہ اور اسلوب تیار کیا ہے ۔ تشبیہہ و استعارے کے سلسلے میں گزشتہ صفحات میں جو بحث کی گئی ہے اس سے بڑی حد تک ان کی قوت اجتہاد و اختراع کا اندازہ ہوا ہوگا تاہم اس کی مزید تفصیل و وضاحت کے لئے، یہاں ان کی تراکیب و الفاظ کا جائزہ لیا جاتا ہے جو ان کے دیباچے شاعری میں بطور تار و پود استعمال ہوئے ہیں ۔

اس بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے متعلق ان کا " عام نظریہ " اور " اپنی شاعری کے متعلق ان کی خصوصی رائے " کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے تاکہ ان کی روشنی میں ان کے اسلوب (صرف الفاظ و تراکیب کی حد تک) کے تعین ، اور اس کے اختیار کرنے کی شعوری کوشش کی تفہیم آسان ہو جائے :

(ب) اصغر کا نظریہ شاعری اور اپنی شاعری کے متعلق خصوصی رائے :

اصغر نے جا بجا اپنی تحریروں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ شاعری ایک فطری و وہبی چیز ہے ۔ وہ کسی دباؤ یا خارجی تقاضے کے تحت نہیں کی جاتی ۔ " شاعر کا تخاطب خود اپنے نفس سے ہوتا ہے ۔"[1] جب شاعر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر شعر کہتا ہے ، " شاعری شاعری ہوتی ہے "[2] ۔ لیکن جب وہ اس تقاضے کو نظرانداز کرکے مشاعرے کے لیے شعر کہتا ہے تو اسے .... " ---- مذاق عوام کا ------ ساتھ دینا پڑتا ہے "[3] اور " مشاعرے میں ذوق سخن عموماً پست ہوتا ہے "[4] ۔

اقتباسات بالا سے ان کے اسلوب کا رخ کچھ اس طرح متعین ہوتا ہے :

(۱) ان کی شاعری کا تخاطب خود ان کی ذات سے ہے ۔ عوام سے نہیں ۔

(۲) ان کی شاعری کی سطح پست نہیں ہے (اسلوب اور مواد دونوں کے اعتبار سے) کیوں کہ اس میں مذاق عوام کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے ۔

۱۔ نظم و نثر پر ایک نظر ۔ از رسالہ ہندستانی ستمبر ۱۹۲۹ء ۔ ص ۳۳۹
۲۔ رباعیات رواں ۔ ص ۷
۳۔ مقدمہ پیام زندگی ۔ ص ۲۰
۴۔ اصغر مرتبہ عبد الشکور ۔ ص ۱۷

انھیں دونوں باتوں کا اعتراف و اعلان انھوں نے اس جملے میں کیا ہے :

" میں پبلک کا نہیں اپنے دل کا شاعر ہوں ۔"[1]

اس رویے سے یقیناً ان میں " خواص پسندی " کا رحجان پیدا ہوا اور ان کا اسلوب آسان و سادہ ہونے کے بجائے مشکل ہو گیا ۔

ایک دوسری جگہ اپنی شاعری کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا :

" میری شاعری خواجہ میر درد کے معانی اور مرزا غالب کے الفاظ کا مجموعہ ہے ۔"[2]

اصغر کے اس بیان سے ان کے اسلوب (الفاظ و تراکیب) کا ایک واضح اور متعین رخ نظر کے سامنے آتا ہے ۔ چنانچہ اس بحث کو انھیں پہلوؤں یعنی

(الف) اسلوب خواص یا مشکل پسندی

(ب) میری شاعری .... غالب کے الفاظ کا مجموعہ ہے ۔

تک محدود رکھا جاتا ہے ۔ (خواجہ میر درد کے معانی سے بحث آئندہ سطور میں کی جائے گی) ۔

(الف) اسلوب خواص یا مشکل پسندی :

ان کے اسلوب نثر سے بحث کرتے ہوئے (مقالہ ھذا صفحہ ۳۴۱) یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کا اسلوب ان کی ظاہری شخصیت کی طرح " مرصع ، رنگین ، پاکیزہ ، شائستہ و متین ہے "، اور چوں کہ وہ افکار حکیمانہ اور مسائل غامضہ کے اظہار کے لیے عربی و فارسی الفاظ کا استعمال ناگزیر خیال کرتے ہیں اس لیے ان کے اسلوب میں ایک " عالمانہ شان " آ گئی ہے ۔ یہاں اس میں اتنا اضافہ کیا جاتا ہے کہ یہی عالمانہ اسلوب (فارسی و عربی الفاظ کی کثرت استعمال) ، شاعرانہ احساس ، فلسفیانہ و متکرانہ انداز اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ مل کر، ان کی شاعری کا انفرادی اسلوب بن گیا ہے جسے " خواص پسند " اسلوب کہا جا سکتا ہے ۔

۱۔ اصغر مرتبہ عبد الشکور ۔ ص ۱۵

۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۳

(ب) میری شاعری .... مرزا غالب کے الفاظ کا مجموعہ ہے :

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ اصغر کے اس اقتباس سے ان کے اسلوب کی سمت و رخ کی طرف ایک واضح اشارہ ملتا ہے لیکن اس کے صحیح رخ کے تعین کے لیے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ

(۱) اصغر نے غالب کے الفاظ سے کیا مراد لی ہے؟

(۲) اس کی پیروی یا تقلید میں کہاں تک کامیاب یا ناکام ہوئے ہیں ---- یعنی اس بات کا کھوج لگایا جائے کہ اس پیروی و تقلید میں غالب کی قدآور شخصیت کے زیر اثر وہ اپنی شخصیت کو بالکل کھو بیٹھے ہیں یا انھوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے کوئی الگ راہ نکالی؟

(۳) اگر الگ راہ نکالی ہے تو وہ کیا ہے ---- یعنی ان کے اجتہاد نے ان کو کس راہ پر لگایا ہے - لیکن اصغر کے اسلوب ---- الفاظ و تراکیب ---- کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے اسلوب (یعنی لفظیات)---- کا جائزہ لیا جائے تاکہ ان کی روشنی میں کوئی قطعی فیصلہ کیا جا سکے کہ اصغر کا اشارہ غالب کے کس اسلوب کی طرف ہے -

غالب کی شاعری کے مطالعہ سے، اس کے تین واضح رنگ نظر کے سامنے آتے ہیں:

بے کیف دماغی اسلوب :

(۱) اس کا تعلق غالب کی شاعری کے ابتدائی دور سے ہے جس میں انھوں نے اپنی " غالبیت " اور " اسدیت " کے قیام و ثبوت میں عہد مغلیہ کے دور انحطاط کے شعرا ---- بیدل ، ناصر علی سرہندی، غنی کاشمیری ، جلال اسیر اور اسی قبیل کے دوسرے شعرا کے کلام کو سر مشق و نمونہ بنایا ہے جو شاعری کی لطافتوں سے خالی تھا اور جس میں کھوکھلی فنکارانہ مہارتوں کا اظہار تھا - اگر سچ پوچھا جائے، تو اس دور میں غالب نے " اردو میں فارسی شاعری " کی ہے - وہی خیالات ، وہی پیچیدہ مفاہیم، ان کے اظہار کے لیے وہی طویل تراکیب ، وہی تشبیہات و استعارات ، وہی فارسی محاورے اور ان کے ترجمے، حتیٰ کہ فارسی الفاظ بالکل فارسی معنوں میں، استعمال کیے ہیں، جو اردو میں غریب و نامانوس تھے - ان تمام چیزوں نے مل کر ان کے اسلوب میں غرابت و اشکال

پیدا کر دیا ہے ---- اس دور کی شاعری میں غالب نے وسیع ، پیچیدہ اور غامض خیالات کو ، فارسی تراکیب کے ذریعہ مختصر سے مختصر الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ بعض اوقات "ترکیب سازی" کی یہ لے اتنی تیز اور شدید ہوگئی ہے کہ قاری کے لیے ان کے معانی کو حیطہ خیال میں لانا دشوار ہو جاتا ہے ۔ اگر کسی طرح معانی کا احاطہ کر بھی لیا جائے تو وہ اتنے دور از کار ہوتے ہیں کہ ان سے عقل کی تسکین کے سوا جذبات و حسیات کی ذرا بھی سیرابی نہیں ہوتی ۔ اسی دور کی شاعری کو ڈاکٹر سید عبداللطیف نے " دل کے بجائے دماغ کی شاعری " کہا ہے اور بجا کہا ہے ۔ یہ اسلوب اتنا واضح ہے کہ غالب کے قاری کے لیے کسی مثال کی ضرورت نہیں ہے تاہم بات کی وضاحت کے لیے دو چار اشعار نمونتہً پیش کئے جاتے ہیں :

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

مگر ہو مانع دامن کش ذوق خود آرائی
ہوا ہے نقش بند آئینہ سنگ مزار اپنا

نقش ناز بت طناز بآغوش رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

اہل بینش نے بہ حیرت کدہ شوخی ناز
جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

(۲) آسان و سادہ اسلوب ---- رنگ میر :

اول الذکر رنگ کے بالکل برعکس ایک رنگ ان کا نہایت سادہ، رواں اور آسان ہے ہوا یہ کہ جب ان کے پرتکلف اسلوب پر ہر طرف سے لے دے ہوئی تو کچھ اس کے ردعمل کے طور پر کچھ قلعۂ معلیٰ کے سامعین کی ضیافت طبع کے لیے یا وہاں کے متداول آسان اسلوب سے متاثر ہو کر اور کچھ میر کے اسلوب کے زیر اثر انھوں نے بھی سادہ اور آسان کہنا شروع کیا۔ " جس میں سادگی کے ساتھ دلکشی پائی جاتی ہے ۔ یہ سہل ممتنع کی مثال ہے[۱] ۔" اس رنگ میں غالب نے غزلیں کی غزلیں کہی ہیں جن میں سے چند غزلوں

۱۔ غالب کی فن کاری از اختر اورینوی بحوالہ احوال و نقد غالب مرتبہ محمد حیات خان سیال مکتبہ سخن لاہور ۔ طبع اول ۱۹۶۷ء ۔ ص ۲۱۹-۲۱۸

کے مطلعے درج ذیل ہیں :

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے   حوران خلد میں تری صورت اگر ملے

....

کوئی دن گر زندگانی اور ہے   اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

....

کوئی امید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی

....

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے   آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس اسلوب میں الفاظ نہایت سادہ اور آسان استعمال کئے گئے ہیں ۔ طویل تراکیب اور تہ دار معانی کے حامل الفاظ سے حتی‌الوسع اجتناب کیا گیا ہے ۔

(۳) معتدل اور دلکش اسلوب ـــ غالب کا اصلی رنگ :

مذکورۂ بالا دونوں اسالیب کے درمیان ایک تیسرا ـــ معتدل ، گوارا اور دلکش ـــ اسلوب ہے ۔ اس اسلوب میں دور از کار تشبیہات و استعارات ،طویل الذیل تراکیب اور بلند آہنگ مگر کھوکھلے الفاظ سے گریز کیا گیا ہے بالعکس شاداب تراکیب ، زندہ و رقصاں تشبیہات اور فکر انگیز استعارات کی مدد سے جذبات و احساسات کو ابھارا گیا ہے ۔ اس اسلوب میں جذبہ و فکر دوش بدوش چلتے ہیں ۔ حقیقتاً غالب کا اصل اسلوب یہی ہے ۔ اس کے چند اشعار نمونتاً درج کئے جاتے ہیں :

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں   اٹھئیے بس اب کہ لذت آہ سحر گئی

چپک رہا ہے لہو سے بدن پہ پیراہن   ہمارے جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب   اک آبلہ پا وادی پرخار میں آوے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط   دامان باغبان و کف گل فروش ہے

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ   یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں   نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

ان اسالیب کے جائزے کے بعد اصغر کے مزاج اور ان کی لفظیات کے تجزیاتی مطالعہ کی روشنی میں یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ " غالب کے الفاظ " سے اصغر کی مراد غالب کے تیسرے ـــ معتدل ، خوشگوار اور شاعرانہ اسلوب کے الفاظ سے ہے جس

میں تراکیب معتدل ہیں (بہت طویل نہیں ہیں)، معنی کی پیچیدہ نہیں نہیں ہیں اور جذبہ و فکر دوش بدوش چلتے ہیں -

اصغر کے کلام کے مطالعہ سے ان کا یہ دعویٰ کہ " میری شاعری .... غالب کے الفاظ کا مجموعہ ہے،، بالکل درست و صحیح ثابت ہو جاتا ہے - ان کے دیوان کا کوئی صفحہ غالب کے وضع و انداز کی فارسی تراکیب سے خالی نہیں ہے - لیکن اس کے باوجود اسے غالب کی " تقلید محض" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا- اصغر نے ہر جگہ اپنی انفرادی شان برقرار رکھی ہے - اس انفرادیت کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ میں نے اصغر کے دونوں دیوانوں سے تقریباً دو سو پچاس (۲۵۰) تراکیب ایسی چھانٹیں جو مجھے نئی نظر آئیں اور ان کا مقابلہ اشاریہ کلام غالب[۱] کی مدد سے غالب کی تراکیب سے کیا، تو ان میں بمشکل تمام دس ، پندرہ ترکیبیں ایسی نکلیں جو غالب کے یہاں استعمال ہوئی ہیں، ورنہ تمام کی تمام نئی ہیں - پھر ان کے استعمال میں بھی جو غالب کے یہاں استعمال ہوئی ہیں - اصغر نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے- یہاں ان کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ دونوں کی افتاد مزاج کا اندازہ ہوسکے نیز اصغر کی قوت اجتہاد اور انفرادیت نمایاں ہو سکے :

هجوم درد غریبی

سر پر هجوم درد غریبی سے ڈالیے وہ ایک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے (غالب)

اصغر هجوم درد غریبی میں اس کی یاد آتی ہے اک طلسم تمنا لئے ہوئے (اصغر)

غالب کے شعر میں الفاظ کا آہنگ اتنا تیز و شدید ہے کہ اس نے " هجوم درد غریبی ،، میں " خاک بسر ،، ہونے کی کیفیت کے احساس کو دبا دیا ہے لیکن اصغر نے " هجوم درد غریبی ،، کو جس سیاق و سباق میں استعمال کیا ہے وہ شعر کی فضا سے بھی طرح ہم آہنگ ہے - یہ ایک حقیقت ہے کہ " هجوم درد غریبی" میں " محبوب هستی " کی یاد بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رهبانی کا کام دیتی ہے ---- یعنی جب وہ " طلسم تمنا " بن کر آتی ہے تو اس کی سرمستیوں اور رنگینیوں میں احساس غربت "

۱- اشاریہ کلام غالب - کلام غالب میں فارسی ترکیبیں - مطبوعہ شعبہ اردو- دهلی یونیورسٹی دهلی طبع اول ۱۹۷۰ء - اس حصہ کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

۱- دیوانِ غالب اردو، نسخۂ عرشی، علی گڑھ، ۱۹۵۸ء

۲- نقدِ غالب، ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، علی گڑھ، ۱۹۵۶ء

کی تلخی اور کرختگی چھٹ جاتی ہے ---- شاعر کا ذاتی تجربہ نفسیاتی آفاقی حقیقت میں ڈھل کر شعر کو بہت بلند کر گیا ہے ۔

دیدۂ بینا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے، اور جزو میں کل

کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا (غالب)

اب خود ترا جلوہ جو دکھا دے وہ دکھا دے

یہ دیدۂ بینا تو تماشا نظر آیا (اصغر)

غالب کے شعر میں زیادہ سے زیادہ ایک علمی یا فلسفیانہ حقیقت کا اظہار کیا جا سکتا جسے شعریت یا شاعرانہ حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ پھر فلسفیانہ حقیقت کے اظہار کے لیے جو لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے وہ کسی طرح موزوں نہیں ہے ---- " دیدۂ بینا " کو " لڑکوں کا کھیل " کے پہلو میں بٹھا کر بظاہر" دیدۂ بینا" کی حقیقت بینی " میں اضافہ کیا گیا ہے لیکن " لڑکوں کا کھیل " کے سوقیانہ اور "غیر ثقہ" لہجہ نے "فلسفیانہ حقیقت " کی متانت کو مجروح کر دیا ہے ۔ شعر ایک بلند بانگ دعوے سے آگے نہیں بڑھتا ۔ نہ ذاتی تجربہ بنتا ہے نہ آفاقی حقیقت ۔

اس کے برعکس اصغر نے " دیدۂ بینا " کو " تماشا " کہہ کر اپنا اور پوری انسانیت کا تجربہ بیان کیا ہے اس طرح " دیدہ بینا " کو کم اعتبار و بے وقعت ٹھہرایا ہے ۔ پھر " خود جو دکھا دے وہ دکھا دے " میں " خود " پر زور دے کر محبوب کی رہنمائی ، اس کے جلوے کی اہمیت ، عاشق کی نیازمندی و محتاجی کے اعتراف کے ساتھ دیکھنے کی شدید خواہش اور " دکھا دینے " کی استدعا ، الحاح اور التجا بھی شامل کر دی ہے ---- شعر میں " دیدۂ بینا " میں معنی کی ہلکی تہ کے ساتھ " انسانی بے بسی " اور " آرزوے دید " کا احساس و جذبہ کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ شعر بہت بلند ہو گیا ہے ۔

اب چند اشعار بلا تشریح و تبصرہ پیش کئے جاتے ہیں ۔ اگر کہیں ضرورت محسوس ہوئی تو صرف اشارے پر اکتفا کی جائے گی ۔

دیدۂ خونابہ فشاں

ہے خون جگر جوش میں، دل کھول کے روتا ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور (غالب)

تھا لطف جنوں دیدہ خونبا بہ فشاں سے	پھولوں سے بھرا دامن صحرا نظر آیا (اصغر)

صرف روایتی شعر ہے کوئی خاص بات نہیں ہے ۔ غالب کا شعر بہت اچھا ہے ۔ ایک دوسرا شعر اصغر نے ذرا سی ترمیم کے ساتھ اور کہا ہے ۔ ہے اگرچہ وہ بھی روایتی لیکن پہلے کے مقابلے میں غنیمت ہے :

روانی رنگ لائی دیدۂ خونبا بہ افشاں کی

اتر آئی ہے اک تصویر دامن پر گلستاں کی	(اصغر)

دعوئے تمکیں

خراب نالۂ بلبل، شہید خندۂ گل	ہنوز دعوی تمکین و بیم رسوائی	(غالب)

کچھ دعوی تمکیں میں معذور ہے زاہد	مستی میں تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا (اصغر)

اصغر کے یہاں " دعوئے تمکیں " کی معنویت گہری، رنگین اور شوخ ہے ۔

لغزش پا

قطع سفر ہستی و آرام فنا ہیچ	رفتار نہیں بیشتر از لغزش پا ہیچ	(غالب)

حیران ہے زاہد مری مستانہ ادا سے	سو راہ طریقت کھلیں اک لغزش پا سے	(اصغر)

نیاز عشق

نیاز عشق خرمن سوز اسباب ہوس بہتر

جو ہو جائے نثار برق مشت خار و خس بہتر	(غالب)

نیاز عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظ ناداں

ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی	(اصغر)

ان مثالوں سے اصغر کی انفرادیت نمایاں ہوگئی ہوگی ۔ ذیل میں اصغر کی انفرادیت اور اس کے وجوہ و اسباب درج کئے جاتے ہیں :

جیسا کہ سطور گزشتہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے غالب کی شاعری کا ایک خاص پس منظر ہے ـــــ غالب نے جب شاعری شروع کی تو عہد مغلیہ کا دور انحطاط تھا ـــــ ناصر علی سرہندی، غنی کاشمیری ، بیدل، جلال اسیر ـــــ کی شاعرانہ فضا چھائی ہوئی تھی ۔ اردو میں سودا اور ناسخ ـــــ جن کے رنگ کو انہیں شعرائے فارسی کا " اردو ہندی رنگ " کہنا چاہیے ، رائج تھا۔ غالب کا دور فارسیت کے زیادہ قریب تھا، غالب کو

اپنی فارسی دانی پر ناز بلکہ غرہ تھا، اردو ان کے لئے " بےرنگ " کا حکم رکھتی تھی، اس میں " رنگ " فارسی ہی سے بھرا جا سکتا تھا ۔

چنانچہ انھوں نے اس رنگ کا جا و بے جا استعمال کیا۔ ان کے زمانے میں فارسی الفاظ و محاورات، ان کے تراجم اور ان کا اردو میں چربہ اتارنا نہ صرف یہ کہ معیوب نہیں تھا، بلکہ مستحسن، مروج اور متداول تھا --- ان چیزوں کے علاوہ غالب کے مزاج اور ان کی تخئیل کی بلند پروازی نے ان کی تراکیب کو جو رنگ و آہنگ بخشا ہے، وہ بالکل فطری ہے ۔

اصغر کا معاملہ دوسرا تھا۔ غالب اور اصغر کی شاعری کا درمیانی وقفہ تقریباً پون صدی کا ہے اس پون صدی میں زبان منجھ چکی تھی، ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہو چکا تھا، غالب اور مومن کی غریب اور نامانوس تراکیب سے کان آشنا اور شعراء ان کے نقائص پر مطلع ہو چکے تھے خود غالب نے امتداد زمانہ اور بدلتے ہوئے حالات کے تحت اپنے پرانے اسلوب ترکیب سازی میں گوارائی، روانی اور شاعرانہ حسن پیدا کر لیا تھا — لکھنئو اسکول کی " مرصع سازی " نے زبان کے نکھار میں بڑا کام کیا تھا---" اردو کا مزاج " اور " لہجہ " متعین ہو چکا تھا۔ اس ادبی پس منظر میں اصغر نے غالب کے انداز کی ترکیب سازی اور فارسی الفاظ کا استعمال تو قبول کیا لیکن اپنے دور کے تقاضے اور مزاج کے مطابق ترکیبوں میں گوارائی، سادگی، روانی اور شاعرانہ حسن پر زیادہ زور دیا۔ اور ان کو ہی اردو کے لہجہ کے مطابق ڈھالا ۔ لہذا اصغر کی تراکیب، غالب سے مختلف ہیں ۔ مثلاً

(۱) ان کی تراکیب غالب کی تراکیب کی طرح طویل الذیل نہیں ہیں، بیشتر تراکیب دو یا زیادہ سے زیادہ تین الفاظ پر مشتمل ہیں ۔ اس لیے ان کے یہاں غالب کی تراکیب کی طرح معنی کی وہ پیچیدہ نہیں، افکار کا وہ عمق و گیرائی اور تخئیل کی وہ بلند پروازی نہیں ہے، جہاں " مدعائے ترکیب " " عنقا " ہو جاتا ہے یا جس میں " کوہ کندن و کاہ بر آوردن " کا شدید احساس ہوتا ہے ۔ اصغر کی بیشتر تراکیب شاعرانہ حسن اور مصورانہ شان کے ساتھ کیف و اثر کی حامل ہوتی ہیں ۔ مثال میں جستہ جستہ اشعار پیش کرنے کے بجائے مسلسل اشعار پیش کئے جاتے ہیں تاکہ جو باتیں کہی گئی ہیں واضح ہو سکیں ۔

چلوں میں جان حزیں کو نثار کر ڈالوں

نہ دیں جو اہل شریعت جبیں کو اذن سجود

*

وہ راز خلقت ہستی ، وہ معنی کونـمـن

وہ جان حسن ازل ، وہ بہار صبح وجـود

وہ آفـتاب حرم ، نازنین کنج حرا

وہ دل کا نور، وہ ارباب درد کا مقصود

وہ سرور دو جہاں ، وہ محمد عربی

بہ روح اعظم و پاکش ، درود نامحدود

وہ مست شاہد رعنا ، نگاہ سحر طراز

وہ جام ہوسم شبی ، نرگس خمار آلـود

کچھ اس ادا سے مرا اس نے مدعا پوچھا

ڈھلک پڑے مری آنکھوں سے گوہر مقصـود

ایک دوسرا قطعہ ملاحظہ ہو ۔ اس کی تراکیب میں بھی وہی حسن ، رنگینی اور شعریت ہے :

نہ اب وہ عرض مطالب میں شوخی عنوان ۔۔۔ نہ اب وہ شوق کی نیرنگی ادا باقی

نہ اب وہ ذوق عبادت کی سعی لاحاصل ۔۔۔ نہ اب وہ لذت عصیان کا ولولہ باقی

نہ وہ بیان حقیقت یہ نقش آرائی ۔۔۔ خیال میں نہ رہا رنگ ما سوا ساقی

بڑا غضب یہ دل شعلہ آرزو نے کیا ۔۔۔ کہ مدعی کا پتہ ہے ، نہ مدعا باقی

رہا نہ تار رگ جاں میں ارتعاش خفی ۔۔۔ نہ اب وہ نغمہ بے لفظ و بے صدا باقی

خبر نہیں ہے کہ کیا حال ہے کہاں ہوں میں ۔۔۔ ہستا کا ہوش نہ تاب مستی فنا ساقی

جوسب لیا ہے تو یہ سوز و ساز بھی لیلے ۔۔۔ یہی رہا ہے کہ یہ امتیاز بھی لے لے

(۲) اس کے علاوہ اصغر کے عہد کے تقاضے غالب کے عہد سے مختلف تھے ۔۔۔ آزادی کی تحریکات زوروں پر چل رہی تھیں ۔ قومی آزادی کے ساتھ انفرادی آزادی کا تصور زور پکڑ رہا تھا ۔ اقبال کا " تصور خودی " ۔۔۔ احساس خودی ، خود شناسی ، خود نگری سے لے کر انانیت کے وسیع تر مفاہیم و معانی کے ساتھ ذہین افراد کے شعور کی گہرائیوں میں اترتے جا رہے تھے ، ایک زندہ ، فعال اور باشعور انسان کا تصور ابھر رہا تھا ، جو کائنات کا مرکزی نقطہ تھا اور جس کی بدولت کائنات کو روشنی و رونق اور نئے معنی

ملے تھے ---- ان تمام تصورات کا عکس اصغر کی تراکیب میں جھلکتا ہے، کہیں جدید تراکیب کی شکل میں ، کہیں پرانی ترکیبوں میں نئی شراب کے رنگ میں - غالب کے یہاں ان کی مثالیں نہیں ہیں اور ہونا بھی نہیں چاہئیں - ذیل میں مختلف عنوانات کے تحت ایک ایک دو دو اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں ، جن میں مذکورہ بالا تصورات تراکیب کے " تصویری پیکروں" یا " لفظی پیمانوں " میں ظاہر ہوئے ہیں -

آزادی کے تصور سے متعلق تراکیب

بندشوں سے اور بھی ذوق رہائی بڑھ گیا　　اب قفس بھی ہم اسیروں کو پر پرواز ہے

قفس کیا، حلقہ ھائے دام کیا، رنج اسیری کیا　　چمن پر مٹ گیا جو ہر طرح آزاد ہوتا ہے

یہ سب ناآشنائے لذت پرواز ہیں شاید　　اسیروں میں ابھی تک شکوہ٫ صیاد ہوتا ہے

یہاں کوتاہی ذوق عمل ہے خود گرفتاری　　جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

مار ڈالے گی مجھے عافیت کنج قفس　　جوش پرواز کہاں جب کوشش صیاد نہ ہو

تلقین عمل

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو　　پیکر عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

برگ گل کے دامن پر رنگ بن کے جمنا کیا　　اس فضائے گلشن میں موجہ٫ صبا ہوجا

خود آگہی کی تلقین

قطرہ٫ تنک مایہ ، بحر بیکراں ہے تو　　اپنی ابتدا ہوکر، اپنی انتہا ہو جا

چمک دمک پر مٹا ہوا ہے، یہ باغباں تجھ کو کیا ہوا ہے

فریب شبنم میں مبتلا ہے چمن کی اب تک خبر نہیں ہے

انسان رونق کائنات ہے

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی　　ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

پتے پتے پر چمن کے ہے وہی چھائی ہوئی　　عندلیب زار کو ایک مشت پر سمجھاتھا میں

انقلاب نئی زندگی کی بشارت ہوتا ہے

کیوں شکوہ سنج گردش لیل و نہار ہیں　　اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

تمام محولہ بالا خط کشیدہ تراکیب میں نئے معانی اور جدید تصورات کی چھوٹ صاف نظر آ رہی ہے -

مختصراً یہ کہ اصغر کی مذکورہ بالا خصوصیات (جو ان کی قوت اجتہاد کا نتیجہ ہیں) ان کو غالب کا " مقلد محض " ہونے سے بچا لیا - اور انھوں نے غالب کی پیروی کے باوجود اپنی انفرادیت کو قائم و برقرار رکھا - یہ بحث نامکمل رہ جائے گی اگر اصغر کی حسب ذیل تراکیب ، جو اردو میں یقیناً خوشگوار اضافہ ہیں ، درج نہ کی جائیں :

بادہ ازہ فریب شہود ، راز خلقت ہستی ، جان حسن ازل ، بہار صبح وجود (رسول اکرم صلعم) جام مہ شبی ، آفتاب مہ شبی ، مئت پذیر کم نظری ، دل شعلہ آرزو ، مستقل سراب تمنا (حسن حقیقت) نغمہ بے لفظ و بے صدا ، دماغ صحبت روحانیاں ، دل شورش ادا ، زبان بے نگہ ، نگاہ بے زبان ، تبسم غمناک ، گریہ خندان آرزو ، شعلہ عریاں (گل) ، نغمہ خاموش الفت ، میکدہ مجاز ، نگہ فتنہ زا ، شبستان حرا ، آفت نشان اضطراب ، قطرہ منصور مزاج -

ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس قدر شعریت میں ڈوبی ہوئی ہیں - یہاں اگر اصغر کی تراکیب کا سرسری تجزیہ کر دیا جائے تو ان کی اہمیت و نوعیت کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور شاید بے محل بھی نہ ہو -

اصغر نے بیشتر مرکبات اضافی اور توصیفی استعمال کئے ہیں جن میں کثیر تعداد ایسے مرکبات کی ہے جو سادہ ہیں یہاں ان سے بحث نہیں ---- یہاں ان تراکیب (اضافتی و توصیفی) سے بحث ہے ، جن سے اصغر نے اپنی شاعری میں رنگینی ، شعریت اور مصوری کی شان پیدا کی ہے - یہ تراکیب تین طرح کی ہیں :-

(الف) تشبیہی و استعاری (ب) توصیفی (ج) مصورانہ تراکیب

(الف) <u>مرکب تشبیہی و استعاری</u> : اس قسم کی تراکیب میں دو طرح کے تصرفات سے کام لیا گیا ہے - مثلاً

(۱) <u>مرکب استعاری سادہ</u> : کام شوق ، دیدہ امتیاز ، خامہ فطرت ، رگ بہار ...

(۲) <u>مرکب استعاری شاعرانہ</u>: معنی کونین ، جان حسن ازل ، راز خلقت ہستی ، بہار صبح وجود ، آفتاب حرم ، نازنین کنج حرا -

(۴) اسی طرح مرکب توصیفی میں بھی دو طرح کے مرکبات نظر آتے ہیں:

(۱) مرکب توصیفی سادہ : نالہ بے سود ، نگاہ بے زبان ، زبان بے نگہ ،
نگہ فتنہ زا ، دل شورش ادا ، درد جان نواز ،
نگاہ مست --- وغیرہ

(۲) مرکب توصیفی تضادی : یعنی ایسی تراکیب جن میں دو متضاد المعنی الفاظ
جمع کئے گئے ہیں - مثلاً تبسم غمناک ، نغمہ خاموش ،
سکون بے بات ، نغمہ بے لفظ و بے صدا ، گریہ خندان
آرزو - وغیرہ

(ج) مرکبات تصویری یا مصورانہ تراکیب : ان میں ایسے دو یا دو سے زائد الفاظ جمع کئے گئے ہیں جن کے سننے سے چشم تخئیل کے سامنے کوئی حسین تصویر ابھرتی ہے - یہ مرکبات استعماری بھی ہیں اور توصیفی بھی - مثلاً یہ تراکیب دیکھئے :

رنزش شوری ، خندہ گل ہائے رنگین ، موج بیقرار، لغزش مستانہ وار ،
دل شعلہ آرزو ، آتش ایمن ، نرگس خمار آلود ، برق نگاہ، برگ خشک ،
موج بادہ ، شمع شبستان حرا، برق فضائے وادی ایمن -

یہاں یہ اشارہ ضروری ہے کہ ان مرکبات میں بیشتر ایسی ہیں، جن میں حسن و حرکت ہے -

اس تفصیلی بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اصغر کی قوت اجتہاد نے الفاظ و تراکیب کے وسیلے سے شاعری میں کیسی کیسی گلکاریاں کی ہیں :

(ج) اصغر کے نظریہ شعر و غزل سے ان کے اسلوب میں کون کون سے خصوصیات آئے

اس عنوان کے تحت کوئی نتیجہ قائم کرنے سے پہلے اصغر کے خاص خاص نظریات شعر و غزل کا احصار و احاطہ ضروری ہے - اس لیے پہلے ان پر روشنی ڈالی جاتی ہے :

اصغر کے نظریات شعر و غزل

شعر میں رنگینی جوش تخئیل چاہئیے مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی
غزل کیا اک شرار معنوی گردش میں ہے اصغر یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

غزل میں درد رنگین تو نے ایسا بھر دیا اصغر

که اس میدان میں روتے رهیں گے نوحه خوان برسوں

اصغر غزل میں چاهئے وہ موج زندگی

جو حسن هے بتوں میں جو مستی شراب میں

ان اشعار کے تجزیه سے اصغر کے نظریات شعر و غزل متعین و واضح هو جاتے هیں جن کی تفصیل درج ذیل هے :

(۱) شعر میں جوش تخئیل کی رنگینی هونا چاهئے -

(۲) غزل شرار معنوی کی گردش کا نام هے -

(۳) اصغر نے غزل میں درد رنگین بھر دیا هے -

(۴) غزل میں وہ موج زندگی --- جو بتوں میں حسن اور شراب میں مستی هے --- چاهئے -

(۵) غزل میں نالہ ، فریاد یا ماتم نهیں هونا چاهیئے -

ان خصوصیات میں سے آخری خصوصیت (فریاد و ماتم کا فقدان) کی طرف اشارہ نشاطیه لہجه کے زیر عنوان (مقالہ هذا صفحه ۵۰۴-۶۹۷) کیا جا چکا هے - اس لیے اسے نظرانداز کیا جاتا هے - باقی عنوانات کو ترتیب وار زیر بحث لایا جاتا هے -

(۱) رنگینی جوش تخئیل :

اصغر کی غزل کی اس خصوصیت سے بحث کرتے هوئے جا بجا تخئیل کی رنگین کاری کی طرف اشارہ کیا گیا هے اس لیے تفصیل میں جانے کے بجائے صرف اشارات پر اکتفا کی جائے گی - سطور گزشته میں یه واضح کیا جا چکا هے که اصغر کا شاید هی کوئی شعر ایسا هو جس میں تخئیل کی رنگینی اور جذبه کی گرمی دست و گریبان نه هوں لیکن یہاں چونکه صرف تخئیل کی رنگینی سے بحث مقصود هے اس لیے اس کو اسی تک محدود رکھا جاتا هے - اصغر کے اشعار میں یوں تو یه تخئیل کی رنگینی هر هر لفظ میں منظر آئے گی لیکن تشبیہه و استعارے میں اس کی جھلک بڑی واضح هے - تفصیل کے لیے دیکھئے تشبیہات و استعارات مقالہ هذا صفحه ۵۰۲-۵۱۵ - یہاں صرف درج ذیل شعر میں اس کی نشاندهی کی کوشش کی جاتی هے :

(۱) پاس ادب میں جوش تمنا لئے هوئے میں بھی هوں اک حباب میں دریا لئے هوئے

شعر میں ایک ایسے عاشق کی تصویر پیش کی گئی ہے جو ہزاروں تمناؤں کے باوجـود
ان کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اب ذرا اس شعر میں " فکر کی زیریں لہریں" اور " رنگین
تہیں " کھولئے تو اصغر کے تخئیل کی رنگین کاری اور لطافت مزاج کا اندازہ ہوگا :-

اظہار تمنا میں رکاوٹ کا سبب

پاس ادب

(۱) راہ محبت کے آداب و مراسم

(۲) حریم ناز -- کے آداب -- محبوب کی پر احترام بارگاہ

(۳) خود عاشق کی شائستہ ، مہذب اور ضابط طبیعت

لیکن (۴) فطری آرزو کا جوش و طغیان --- دریا کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا ہے - اس
طوفان کو روکے رکھنا آسان نہیں - خطرہ ہے کہ کسی وقت یہ لہریں بے قابو ہو جائیں تو
پھر کیا ہوگا؟ (۵) ان کو روکے رکھنے والا ---- پاس ادب ---- " حباب " کی طرح
نازک ہے -- جو ان طوفانوں کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا - اب ان استعارات پر
ذرا دوسری طرح نظر ڈالئے :

(۶) " پاس ادب " کے ظاہری " خول " کو " حباب " کا ظاہری
خول تصور کیجئے - اور " جوش تمنا " کو حباب میں " بھری ہوئی ہوا " --- جو خول
میں ذرا سی کمزوری پا کر نکل جانا چاہتی ہے -

(۷) اس میں یہ تصور بھی پوشیدہ ہے کہ جس طرح " حباب کی پتلی
جھلّی " اندرونی ہوا کے زور سے پھٹ جاتی ہے اسی طرح " پاس ادب " بھی
" جوش تمنا " سے کسی وقت پھکحر ہو سکتا ہے -

(۸) اسی میں یہ اشارہ بھی پنہاں ہے کہ " ادب کا لحاظ یا پاس "
ایک لطیف نازک احساس ہے ---- اتنا ہی کمزور و نازک جتنی " حباب کے خول کی جھلّی "
ہوتی ہے -

(۹) " میں بھی ہوں اک حباب میں دریا لئے ہوئے " میں ، " میں بھی "
پر زور نے عاشق کی اس قابل رحم اور بے بسانہ کیفیت کا اظہار کر دیا ہے جہاں اس کے بطون
میں خارجی موانع اور اندرونی قوتوں کے درمیان کشمکش جاری ہے -

(۱۰) اور آخر میں عاشق یہ کہہ کر اپنی معذوری بھی ظاہر کر دیتا ہے
کہ " حباب میں دریا " کہیں بند ہوا ہے؟

اب ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو :

(۲) قاتل نگاہ یاس کی زد سے نہ بچ سکا خنجر تھے ہم بھی اک نہ خنجر لئے ہوئے

شعر کا بنیادی تھیم صرف " مقتول کی نگاہ یاس کی دل دوزی دکھانا ہے"

لیکن تصویر پر سے فکر کے رنگین پردے ایک ایک کرکے اٹھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ کتنے تہ در تہ ہیں ۔ ذیل میں ان پردوں کو ہٹانے کی کوشش کی جاتی ہے :

تصویر کی فکری تہیں
----

(۱) قاتل ایک گرانڈیل شخص ، گٹاسی نکلی ہوئی خونیں آنکھیں ، بڑی بڑی گھنی مونچھیں ، لمبی بڑھی ہوئی ہاتھ میں چمکدار دو دھاری خنجر لئے ہوئے ۔

(۲) ایک مظلوم و بےبس کو پٹک کر زمین پر پیٹھ کے بل گرا دیتا ہے ۔

(۳) اور اس کے سینے پر دونوں گھٹنے رکھ کر چڑھ جاتا ہے ۔

(۴) پھر خنجر سے اس کا گلا کاٹ دیتا ہے ۔

(۵) مقتول یاس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہے ۔

(۶) اس طرح کی پتلیاں قاتل کی طرف مڑی ہوئی ، ایک خاص زاویہ پر رک گئی ہیں --- حسرت و یاس کی مجسم تصویر بنی ہوئی ۔

(۷) قاتل پر اس منظر کا گہرا اثر ہوا--- اسے اپنے ظلم کا احساس اور اس پر ندامت ہوئی ۔

(۸) ان کے علاوہ " ہم بھی " کے ٹکڑے میں اپنے " جذبہ انتقام کی تسکین " اور " فتح یابی پر اظہار مسرت " کا پہلو بھی شامل ہے ۔

(۹) نیز " مسرت " اس خیال پر بھی کہ جو کام جیتے جی ممکن نہ تھا --- یعنی قاتل کو ظلم کا احساس دلانا --- وہ مرتے مرتے ممکن ہوگیا --- اور مقتول سکون و طمانیت کے ساتھ مر سکا۔

اتنے مختلف النوع اور طویل الذیل افکار کو اختصار و جامعیت کے ساتھ رنگین پیرایہ میں منضبط کرنا ، تخئیل ہی کی کارفرمائی اور کرشمہ ہو سکتا ہے ۔

شعر محولا بالا کو روایتی کہتے ہوئے ، مرحوم جناب عندلیب شادانی نے اپنے مخصوص انداز میں اس پر یوں تبصرہ فرمایا ہے:

" کاش اصغر صاحب زندہ ہوتے تو ہم .... ان سے پوچھتے کہ کیا واقعی آپ کی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ آیا تھا کہ

آپ سر جھکائے ہوئے ہیں اور وہ خنجر لئے ہوئے آپ کو ذبح
کرنے کے لیے تیار ہے اور اس کے بعد روہیلہ سردار کی طرح
جب وہ آپ کو پچھاڑ کر قتل کی نیت سے آپ کی چھاتی پر
سوار ہوا اور چھری گلے پر رکھ دی تو آپ نے کچھ ایسی
یاس بھری نظروں سے اسے دیکھا کہ اس کا " ہارٹ فیل
ہو گیا " ۔ تو مولانا ایک راستباز انسان کی طرح یقیناً یہی
جواب دیتے کہ نہیں میاں یہ تو محض شاعری ہے حقیقت سے
اسے کیا واسطہ؟ "[1]

اب اسے بدقسمتی کہہ لیجئے کہ جناب شادانی بھی اللہ کو پیارے ہوگئے ورنہ ان کی خدمت میں مودبانہ گزارش کرتا کہ " ضروری نہیں کہ خود شاعر پر یہ کیفیت گزری ہو ۔ شاعر جہاں اپنے نفس کا مطالعہ کرتا اور اس کے اندرونی کوائف کو اپنی شاعری کے ذریعہ زبان بخشتا ہے وہیں اپنے وجود سے باہر کی وسیع و عریض کائنات کے واقعات و مشاہدات کو بھی ---- جو اس کے ذاتی تجربہ کا جزو ہوتے ہیں ---- اپنی شاعرانہ بصیرتوں اور خلاقانہ صلاحیتوں کے ذریعہ الفاظ میں زندہ و مرکوز کر دیتا ہے ------
شعر کے پس منظر یا شان نزول کے سلسلے میں اتنا اشارہ کافی ہے کہ ممکن ہے شاعر کے مشاہدے میں حسب ذیل واقعات یا ان سے ملتا جلتا کوئی واقعہ آیا ہو اور اس نے دیکھا ہو کہ :

(۱) کسی باز نے کوئی کبوتر پکڑا ---- اور اس کی آنکھیں حسرت و بےبسی کا مجسمہ بن گئیں ۔

یا (۲) کسی بلی نے کسی خرگوش یا چوہے کو دبوچا ---- اور اس کی موتی کی طرح چمکنے والی آنکھیں پہلے خوف و ہراس سے بے آب ہو گئیں ---- پھر ان میں رحم کی التجا کروٹیں لینے لگی ۔

(۳) یہ بھی ممکن ہے کہ اصغر پر خود یہ واقعہ گزرا ہو کہ جب انھوں نے قربانی کے جانور کو پچھاڑ کر اس کی گردن پر چھری پھیری تو حسرت و بےبسی سے بھری ہوئی پتلیاں ان کی طرف پھر کر پتھرا گئی ہوں ۔

اور حسرت و یاس میں بجھے ہوئے نگاہوں کے یہ تیر ان کے کلیجے میں اتر گئے ہوں ---- پھر انھوں نے جذبات و احساسات کی شدت کے زیر اثر اور متخیلہ کی مدد سے ،

۱۔ دور حاضر اور اردو غزل گوئی ۔ عندلیب شادانی ۔ مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور
طبع دوم ۱۹۶۲ء ۔ ص ۴۵

کہ یہ شاعر کا ذریعہ "فطری ہیں - یہ واقعہ اپنے اوپر طاری اور وارد کر لیا ہو - اور مقتول کی " نگاہ یاس " کو ---- (جس کا شاعر زخم خوردہ ہے) "شاعرانہ گہرائی " دے دی ہو ---- یہ روایتی شاعری نہیں ہے - یہ ہے اصل شاعری --- یعنی روزانہ کے معمولی واقعات کو شاعرانہ تصرف اور تخئیل کی رنگ آمیزی کے ذریعہ آفاقی بنانا --- یا ذہن کو کسی آفاقی حقیقت کی طرف منعطف کرنا ------ " قاتل " و " مقتول " تو صرف علامات ہیں ان کے " رنگ و معنی " اتنے ہی وسیع ہیں جتنی خود زندگی اور اس کی نیرنگیاں ہیں -

ذیل میں رنگینی تخئیل کی مثال میں بجائے متفرق اشعار دینے کے ایک ہی غزل کے چند مسلسل اشعار درج کئے جاتے ہیں :

جان نشاط، حسن کی دنیا کہیں جسے	جنت ہے ایک، خون تمنا کہیں جسے
اس جلوہ گاہ حسن میں چھایا ہر طرف	ایسا حجاب، چشم تماشا کہیں جسے
اکثر رہا ہے حسن حقیقت بھی سامنے	اک مستقل سراب تمنا کہیں جسے
ہر موج کی وہ شان ہے جام شراب میں	برق فضائے ، وادی سینا کہیں جسے
میں ہوں ازل سے گرم رو عرصہ وجود	میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے
شاید مرے سوا کوئی اسکو سمجھ سکے	وہ ربط خاص، رنجش بیجا کہیں جسے
اصغر نہ کھولنا کسی حکمت مآب پر	راز حیات ساغر و مینا کہیں جسے

۲- غزل --- " شرار معنوی " ہے :

اس عنوان پر قلم فرسائی سے پہلے " شرار معنوی " کے معنی کے تعین کی ضرورت ہے - شرر ، شرارہ ، شرار کے معنی ہیں ، چنگاری ، پتنگا ، شعلہ - معنوی - منسوب بمعنی --- یعنی روحانی ، باطنی یا حقیقت و معنی سے تعلق رکھنے والا - شرار معنوی کے معنی ہوئے - روحانیت کا شرارہ یا شعلہ ---- مطلب یہ ہوا کہ غزل میں " روحانیت " اور " مجردات " کے کوندے لپک اور پتنگے اڑ رہے ہوں -

اصغر کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے جا بجا یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے " قماش شاعری " کا تانا بانا --- الفاظ و معنی --- نزہت و لطافت ، تقدس و پاکیزگی اور روحانیت و شرافت سے تیار کیا گیا ہے اس میں روحانی دنیا کی تمام شائستگیا ں اور ترمیاں بھر دی گئی ہیں - اور اسکے مطالعہ سے قاری کو روحانی بالیدگی و شادابی

حاصل ہوتی ہے ۔ یہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ اس پر بحث اطناب لاطائل کے مترادف ہوگی ۔ اس کو یہیں ختم کیا جاتا ہے (تفصیلی بحث مقالہ ہذا باب ششم ۔ زیر عنوان تصور محب و محبوب ، ص ملاحظہ ہو) ۔

ان تصریحات کی روشنی میں بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اصغر کی غزل میں واقعی " شرار معنوی کی گردش " سے پیدا ہونے والے " شعلہ جوالہ " کی کیفیت ہے ۔

(۳) " غزل میں درد رنگیں ..... "

درد تو سمجھ میں آتا ہے ۔ لیکن یہ " درد رنگیں " کیا ہوتا ہے؟ جب تک اس کے معنی کا تعین نہ ہو جائے، اصغر کی غزل کے اس رخ یا رنگ کے متعلق کوئی قطعی اور حتمی بات کہنا ممکن نہیں ۔ اس لیے پہلے اس کے معنی متعین کئے جاتے ہیں ۔

" درد رنگیں " پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ " شاعر کے ذہن میں " درد " سے مختلف کوئی اور ہی کیفیت ہے ۔ چونکہ " درد " میں " بے کیفی " " تکدر " اور " بدخلقی " کا تصور بھی شامل ہے اس لیے " درد رنگیں " یقیناً " بے کیفی " اور " بدخلقی " سے مختلف اور متضاد کیفیت ہوگی --- اب ذرا " درد " کا تجزیہ کرکے اس میں پوشیدہ تمام پہلوؤں کا احاطہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ :

درد اس کیفیت کو کہتے ہیں جو انسان کے روح یا شخص میں کسی روحانی یا جسمانی صدمہ (زخم یا چوٹ) کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے ،

(۱) جس کا میلان غم و ملال کی طرف ہوتا ہے

(۲) جس میں زخم اور زخم لگانے والے کے خلاف ابا و بیزاری ہوتی ہے

(۳) اور جس کا اظہار فریاد و ماتم اور نالہ و زاری کی صورت میں ہوتا ہے

----- گویا " درد " ایک مخلوط کیفیت ہے جس میں بیک وقت حسب ذیل میں " کیفیات شامل ہوتی ہیں :

(۱) غم و ملال (۲) ابا و بیزاری (۳) فریاد و ماتم --- لہجہ حزنیہ ۔

" درد " کی جو تشریح اوپر کی گئی ہے اس کی روشنی میں " درد رنگیں " --- ایک ایسی کیفیت درد کو کہیں گے جس میں دردمند شخص کو لذت اور نتیجتاً مسرت و طمانیت اور شادمانی و شادکامی حاصل ہوتی ہے ۔ اصغر نے اپنی اس ذہنی کیفیت کی طرف جا بجا اشارے کئے ہیں ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

زخم آپ لیتا ہوں لذتیں اٹھاتا ہوں ‏‎ ‎‏تم کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

دے مسرت مجھے اور عین مسرت مجھ کو ‏‎ ‎‏چاہئے غم بھی باندازہ راحت مجھ کو

نگہ ناز کو یہ بھی تو گوارا نہ ہوا ‏‎ ‎‏اک ذرا درد میں ملتی تھی جو راحت مجھ کو

ذوق طلب حصول سے جو آشنا نہ ہو ‏‎ ‎‏یعنی وہ درد چاہئے جس کی دوا نہ ہو

تیری ہزار برتری تیری ہزار مصلحت ‏‎ ‎‏میری ہر اک شکست میں میری ہراک قصور میں

ہے خستگی کے دم سے رعنائی تخیل ‏‎ ‎‏میری بہار رنگیں پروردۂ خزاں ہے

سطور بالا میں " درد رنگیں " کو " درد " کی متضاد کیفیت ثابت کیا جا چکا ہے اس لیے اس کی تعریف اگر بالکل " درد " کے انداز میں کی جائے تو کچھ اسطرح ہوگی :

درد رنگیں وہ کیفیت ہے جو انسان کی روح یا نفس میں کسی روحانی یا جسمانی صدمہ کے نتیجہ میں پیدا ہو۔

(۱) اس کا میلان مسرت و شادمانی کی طرف ہو

(۲) اس میں زخم اور زخم لگانے والے کی طرف ذوق و میلان ہو

(۳) اس کا اظہار نشاط و انبساط کی صورت میں ہو ۔

ــــــــ یعنی درد رنگیں میں حسب ذیل تین عناصر ہوتے ہیں :

۱۔ مسرت و شادمانی ‏ ۲۔ ذوق و میلان ‏ ۳۔ نشاط و انبساط ـــ لہجہ نشاطیہ

اصغر کے اسلوب سے بحث کرتے ہوئے ان تینوں عناصر سے فرداً فرداً تفصیلی بحث کی جا چکی ہے:

مسرت و شادمانی ـــ ‏ مقالہ ہذا صفحہ ۴۸۵-۴۷۷

ذوق و لذت ـــ رنگینی طبع ‏ مقالہ ہذا صفحہ ۴۷۵-۴۶۳

نشاط و انبساط ـــ نشاطیہ لہجہ ‏ مقالہ ہذا صفحہ ۵۰۲-۴۹۷

اس لیے اس پر مزید کچھ لکھنا تکرار لاحاصل ہوگا۔

" درد رنگیں " کے ایک معنی لذت بخش کیفیت کے ہیں ۔ اس حیثیت سے اگر اصغر کے اسلوب کا جائزہ لیا جائے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلوں میں قدم قدم پر اس " لذت بخش " کیفیت کا احساس ہوتا ہے ۔ چونکہ یہ ایک ذوقی و وجدانی کیفیت ہے اس لیے اس پر کچھ لکھنے کے بجائے ان کی دو غزلوں کے مسلسل اشعار نقل کئے جاتے ہیں، اور فیصلہ قاری کے ذوق پر چھوڑ دیا جاتا ہے :

پہلی غزل

حسن کو وسعتیں جو دیں ، عشق کو حوصلا دیا

جو نہ ملے نہ مٹ سکے وہ مجھے مدعا دیا

ہاتھ میں لیے کے جام مے آج وہ مسکرا دیا

عقل کو سرد کر دیا روح کو جگمگا دیا

دل پہ لیا ہے داغ عشق کھو کے بہار زندگی

اک گل تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا

لذت درد و خستگی ، دولت دامن تہی

توڑ کے سارے حوصلے اب مجھے یہ صلا دیا

کچھ تو کہو یہ کیا ہوا تم بھی تھے ساتھ ساتھ کیا

غم میں یہ کیوں سرور تھا درد نے یہ کیوں مزا دیا

دوسری غزل

وہ سامنے ہیں نظام حواس برہم ہے

نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

خوشا حوادث پیہم خوشا یہ اشک رواں

جو غم کے ساتھ ہو تم بھی تو غم کا کیا غم ہے

یہ ذوق سحر یہ دیدار جلوۂ خورشید

بلا سے قطرہ شبنم کی زندگی کم ہے

کسی طرح بھی تیری یاد اب نہیں جاتی

یہ کیا ہے روز مسرت ہے یا شب غم ہے

کہاں زمان و مکان پھر کہاں یہ ارض و سما

جہاں تم آئے یہ ساری بساط برہم ہے

....

(۲) اصغر غزل میں چاہئیے وہ موج زندگی جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

اس پر تفصیلی بحث آخری باب میں کی جائیے گی — جہاں " موج زندگی "

کے تعین کی کوشش کی جائیے گی یہاں صرف غزل کے ان خصوصیات کی طرف اشارہ مقصود ہے

جیسے اصغر نے " بتوں کے حسن " اور " شراب کی مستی " سے تعبیر کیا ہے --- اگر ان الفاظ پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ " حسن " ظاہری چیز ہے اور مستی باطنی کیفیت ---- یعنی اصغر کی نظر میں غزل کو حسن ظاہر اور کیفیت باطنی کا مجموعہ ہونا چاہئے --- کیفیت پر مزید غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں " ذہن اور حس " دونوں شامل ہوتے ہیں ---- یعنی ایک طرف یہ دونوں کی پیداوار ہوتی ہے دوسری طرف دونوں کی تسکین و سیرابی کا سبب ہوتی ہے ۔ اس تشریح کے مطابق کیفیت باطنی سے مراد وہ کیفیت ہوگی جس میں تخیل اور جذبہ دونوں کی سیرابی کا سامان ہو --- ان تشریحات کی روشنی میں " بتوں کا حسن " اور " شراب کی مستی " (جنھیں اصغر نے لازمۂ غزل ٹھہرایا ہے) کے حدود و معنی متعین کئے جائیں تو اصغر کے نقطۂ نظر سے غزل کو " حسن بیان ، حسن خیال اور علو جذبات اور لطافت احساس کے خوش گوار ترین امتزاج کا حامل ہونا چاہیے ۔

" غزل کا یہ معیار " اصغر کا صرف نظری نہیں ہے بلکہ وہ اس پر کاربند رہے ہیں ۔ گزشتہ سطور میں غزل کے ان خصوصیات ---- حسن بیان ، حسن خیال اور لطافت جذبات ---- سے فرداً فرداً بحث کی جا چکی ہے ۔ ان پر مزید بحث تکرار بے جا کے مترادف ہوگی۔ ان تمام مباحث کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اصغر کی غزل میں " حسن بیان ، حسن تخیل اور لطافت جذبات " کا خوش گوار ترین امتزاج ہے ۔ مثال میں ایک غزل (کے چند اشعار) " نشاط روح " سے ایک " سرود زندگی " پیش کی جاتی ہے :

غزل نشاط روح

آنکھوں میں تیری بزم تماشا لئے ہوئے	جنت میں بھی ہوں جنت دنیا لئے ہوئے
پاس ادب میں جوش تمنا لئے ہوئے	میں بھی ہوں اک حباب میں دریا لئے ہوئے
پھر ان لبوں پہ برق تبسم ہوئی عیاں	سامان جوش رقص تمنا لئے ہوئے
صدہا تو لطف مے سے بھی محروم رہ گئے	بے امتیاز ساغر و مینا لئے ہوئے
رگ رگ میں اور کچھ نہ رہا غیر خیال دوست	اس شوخ کو ہوں آج سراپا لئے ہوئے
اصغر ہجوم درد غریبی میں اس کی یاد	آئی ہے اک طلسم تمنا لئے ہوئے

غزل سرود زندگی

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں

محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں

حسن ہزار طرز کا ایک جہاں اسیر ہے

ملحد باخبر بھی گم جلوہ ناله سیں

در پہ جو تیرے آ گیا اب نہ کہیں مجھے اٹھا

گردش مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

اب وہ زماں نہ وہ مکاں اب وہ زمیں نہ آسماں

تم نے جہاں بدل دیا آ کے مری نگاہ میں

لفظ نہیں بیاں نہیں یہ کوئی داستاں نہیں

شرح نیاز و عاشقی ختم ہے ایک آہ میں

اس طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اصغر کا نظریہ فن (شاعری) اور ان کے مزاجی کوائف ان کے اسلوب میں پوری طرح جلوہ گر اور عکس ریز ہیں - ان کے زیر اثر ان کا جو " نشاط شاعری " --- اسلوب --- تیار ہوا ہے اس کے نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں :

(۱) پاکیزگی (۲) رنگینی (۳) موسیقیت

(۴) جذبہ اور تخیل کا لطیف متوازن امتزاج (۵) نشاط خیزی اور

(۶) مشکل مگر شاعرانہ

اس کو عبارت میں یوں بیان کریں گے :

" اصغر کا عام اسلوب مشکل مگر شاعرانہ ہے اور اس کا لہجہ نشاطیہ اس کی ممتاز خصوصیت پاکیزگی اور الفاظ کی رنگینی و مرصع کاری ہے اس میں جذبے کی ندرت و لطافت اور تخیل کی رنگینی سے گرمی اور موسیقی کی زیریں لہر اور صوتی آہنگ سے حسن و دلکشی پیدا کی گئی ہے --- مختصراً ان کے اسلوب کو پاکیزہ ، مترنم اور شاعرانہ کہہ سکتے ہیں --- "

باب ہفتم

تقابلی مطالعہ

صفحہ

۱- اصغر اور درد :

(الف) درد کے تین رنگ ۵۳۲

(ب) موضوعات شعری ۵۳۷

(ج) متحد المعنی اشعار ۵۵۳

۲- اصغر اور غالب ۵۵۵

۳- اصغر اور مومن ۵۵۶

۴- اصغر اور اقبال :

(الف) تصوّر فن ۵۶۱

(ب) موضوعات شعری ۵۶۳

۵- اصغر اور حسرت :

(الف) رنگین نگاری ۵۷۰

(ب) فارسی تراکیب ۵۷۱

۶- اصغر اور فانی :

(الف) رنگ لکھنؤ، رنگ داغ ۵۷۶

(ب) عاشقانہ ، عارفانہ ۵۷۸

(ج) فارسی تراکیب ۵۸۱

(د) لہجہ ۵۸۲

۷- اصغر اور یگانہ :

(الف) یگانہ کی خصوصیات ۵۹۳

(ب) یگانہ پر میر، آتش، غالب کا اثر ۵۹۷

(ج) یگانہ کا اصل رنگ ۵۹۷

(د) اسلوب ۶۰۰

۸- اصغر اور جگر :

اصغر سے اثر پذیری

۱) اسلوب ۶۰۵

۲) موضوعات ۶۱۳

گزشتہ ابواب میں اصغر کے سوانح حیات ، نقوش و آثار ، شخصیت کا عہد بہ عہد ارتقا اور نظریہ فن ـــ نثر اور شعر و غزل ، زیر بحث لا کر ان کا ربط ان کی نثر اور شاعری سے واضح اور بحیثیت نثر نگار اور نقاد ان کے مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے ۔ ساتھ ہی " شخصیت و شاعری " کے زیر عنوان ان کی شخصیت کے خد و خال روشن کئے گئے ہیں اور ان کا عکس ، ان کی شاعری میں دکھایا گیا ہے ۔ اس باب میں بعض پیشرو شعرا ـــ (درد ۔ غالب اور مومن ـــ جن کے فکری و فنی اثرات ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں) اور ممتاز معاصرین ـــ (اقبال ، حسرت ، فانی ، یگانہ اور جگر ـــ جن کا شمار " جدید غزل " کے معماروں میں ہوتا ہے) سے ان کے تقابل کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اس تقابلی مطالعہ کے بعد جب " جدید غزل " کی تعمیر و ترقی میں ان کی اہمیت واضح اور بحیثیت شاعر ان کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ مطالعہ پس منظر کا کام دے سکے ۔ تقابل شروع کیا جاتا ہے ۔

اصغر کا تقابلی مطالعہ :

(۱) اصغر اور درد

گزشتہ صفحات میں " اجتہاد " کے زیر عنوان اصغر کا درج ذیل قول کہ :

" میری شاعری خواجہ میر درد کے معانی اور غالب کے الفاظ کا مجموعہ ہے ۔"

نقل کر کے اس کے آخری حصے ـــ " میری شاعری ـــ غالب کے الفاظ کا مجموعہ ہے " پر تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے ۔ یہاں اس کے پہلے حصے ـــ " میری شاعری خواجہ میر درد کے معانی ـــ کا مجموعہ ہے " سے بحث کی جاتی ہے ۔

خواجہ میر درد کے اعلیٰ تغزل پر تمام ناقدین کا اتفاق ہے ۔ اس پر بھی سب متفق ہیں کہ ان کی شاعری میں عارفانہ رنگ غالب ہے اور یہ ان کا حال ہے قال نہیں ـــ

اور جب اصغر نے " درد کے معانی " کہا ہے تو ان کی مراد بھی اپنی شاعری کے عارفانہ اور صوفیانہ رنگ ہی سے تھی ---- لیکن یہ " عارفانہ اور صوفیانہ " رنگ اپنے اندر معانی کی اتنی وسعتیں اور پہنائیاں رکھتا ہے کہ جب تک ان کی حد بندی کرکے ان کا موازنہ اصغر کے کلام سے نہ کیا جائے یہ معلوم کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوگا کہ تصوف کے کن افکار و خیالات کو اصغر نے کس حد تک قبول کیا ہے اور کن افکار و خیالات کو مسترد کر کے اپنی انفرادیت کو قائم و برقرار رکھا ہے ۔ ذیل میں درد کے مختلف افکار یا رحجانات کے تعین کی کوشش کی جاتی ہے پھر فرداً فرداً ان کا اصغر کے افکار و خیالات سے موازنہ و مقابلہ کر کے اصغر کی انفرادیت واضح کی جائے گی ۔

درد کے کلام کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے کلام میں تین واضح رنگ ہیں :

۱۔ خالص مجازی

۲۔ مجازی و حقیقی کی آمیزش--- یعنی ایسے اشعار جن کا مرجع کسی کو ٹھہرایا جا سکتا ہے

۳۔ خالص عارفانہ

ان تینوں کو الگ الگ لے کر ان کا موازنہ اصغر کے کلام سے کیا جاتا ہے ۔

(۱) خالص مجازی رنگ :

ایسا رنگ جو عام طور پر دنیاوی محبوب کی محبت کے اظہار میں اختیار کیا جاتا ہے، جس کی تشریح و تعبیر، کسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت یا اس کے صفات و شیون کی جلوہ گری سے نہیں کی جا سکتی ۔ اس میں لب و رخسار گیسو و کاکل ، قد و قامت اور اسی قسم کے دوسرے خارجی حسن کا اظہار ہوتا ہے ---- اس رنگ میں اگر بے باکی کی لے بڑھ جائے اور احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو شعر میں سوقیت ، پستی اور ابتذال آ جاتا ہے ---- درد کے یہاں سوقیت و ابتذال تو نہیں ہے لیکن بے باک گوئی اور شوخی کا رنگ گہرا ہے ---- کہیں کہیں تو سراپا نگاری اور صنائع لفظی کا رنگ اتنا شوخ ہو گیا ہے کہ ان کی شاعری ، لکھنؤ کی شاعری کا نقش اول نظر آنے لگتی ہے ۔ اور اشعار اسی طرح بے کیف ہو کر رہ گئے ہیں ۔ مثلاً حسب ذیل اشعار دیکھیے :

زلف و رخسار کا ذکر

اگر میں تشنہ رسی سے ترا دہان* پاؤں — کمر کو چاہوں تو اس کے تئیں کہاں پاؤں

زلفوں* میں تو سدا سے یہ کج ادائیاں ہیں — آنکھوں* نے پر یہ اور ہی آنکھیں دکھائیاں ہیں

کیا جانئے کس دل کے تئیں آہ ڈسیں گے — زلفوں نے تو بے طرح یہ اب چھوڑے ہیں کالے

ان اشعار میں سوا روایت پرستی، یا رعایت لفظی کے اور کوئی خاص بات نہیں ہے - اصغر نے اس قسم کے اشعار سے اجتناب کیا ہے تاہم بالکل نہیں بچ سکے - ان کے یہاں بھی زلف و رخسار، قدو رفتار اور اسی قبیل کے انسانی اعضاء و جوارح یا حرکات و افعال کا ذکر ہے - لیکن ان کے یہاں یہ رنگ بڑی نزہت، لطافت اور شیرینی لئے ہوئے ہے- جہاں خالصتاً مجازی رنگ ہے وہاں بھی رنگین تشبیہہ و استعارے کے ذریعہ شعر کا لطف دوبالا کر دیا ہے - چند اشعار دیکھئے تو دونوں کا فرق واضح ہو جائے گا :

رخ رنگیں یہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی

شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

اٹھے عجب انداز سے وہ جوش غضب میں

چڑھتا ہوا اک حسن کا دریا نظر آیا

رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق تبسم بھی

اس شوخ کے ہونٹوں پر اک برق سی لرزاں ہے

اس جوئبار حسن سے سیراب ہے فضا

روکو نہ ابھی لغزش مستانہ وار کو

درد کا خالص مجازی رنگ

ذکر وفا کیجئے اس سے کہ واقف نہ ہو — کہتے ہو کس سے یہ تم ٹک تو ادھر دیکھنا

کیوں بھوں تانتے ہو بندہ نواز — سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا

---

*- اصطلاحات صوفیہ میں اگرچہ دہان کے معنی صفت حیات، ابرو چشم کے معنی کلام والہام غیبی اور زلف کے معنی غیب ہویت (ذات و حقیقت کا غائب ہونا) کے ہیں لیکن ان اشعار بالا اور اسی قبیل کے دوسرے اشعار میں یہ توجیہات ہر جگہ ممکن نہیں ہیں - اور صرف یہ مجاز ہی پر منطبق ہو کر رہ جاتی ہیں - یہ تمام اصطلاحات تعلیم الدین بحوالہ شریعت و طریقت -- از افادات مولانا اشرف علی تھانوی رح - مرتبہ محمد دین حنفی چشتی سے ماخوذ ہیں --- صفحہ ۳۲۲، صفحہ ۳۳۸، صفحہ ۳۳۹ -

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما — اس طرف کو کبھو گزر نہ کیا

کتنے بندوں کو جان سے کھویا — کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا

تجھ سے ظالم کے سامنے آیا — جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً، لیکن — میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

اصغر کے یہاں یہ رنگ تقریباً مفقود ہے ۔ کچھ اشعار ضرور مل جائیں گے لیکن ان میں درد کی بے باک گفتاری اور شوخی نہیں ہے ۔ ان کے یہاں عشق مجاز کے بعض معاملات کا ذکر ہے مگر انتہائی رنگین پردوں میں ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ ہذا رنگ مجاز ۔ صفحہ ۱۲۲-۱۱۴)

(۲) مجازی اور روحانی دونوں تعبیریں

عارفانہ غزل کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں ایسے اشارات و کنایات لائے جائیں کہ اس کا مرجع محبوب مجازی یعنی ایسا محبوب جس سے محبت کی بنیاد " جنس " پر قائم ہو یا ایسا محبوب جس سے روحانی تعلق ہو ۔۔ مثلاً کوئی مذہبی پیشوا یا مرشد دونوں کو ٹھہرایا جا سکے ۔ درد کے یہاں ایسے اشعار خاصی تعداد میں ہیں، لیکن سادہ ، رواں اور آسان رنگ میں ۔ مثلاً درج ذیل اشعار دیکھئے :

گزری شب وہ آفتاب نکلا — تو گھر سے بھلا شتاب نکلا

جان یہ کھیلا ہوں میں میرا جگر دیکھنا — جی نہ رہے یا رہے مجھ کو ادھر دیکھنا

گرچہ وہ خورشید روئت ہے مرے سامنے — تو بھی میسر نہیں بھر کے نظر دیکھنا

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدان شہر — اے درد آ کے بیعت دست سبو کریں

ساقی اس وقت کو غنیمت جان — پھر نہ میں ہوں نہ تو نہ یہ گلشن

درد کے یہاں اس قسم کے اشعار میں سادگی و روانی کے ساتھ عاشقانہ و رندانہ شوخی ہے اور ان میں عشق کی تیز دشتریت ہے ۔ اصغر کے یہاں بھی یہ رنگ ہے لیکن اس میں عاشقانہ ادب و احترام کے ساتھ عارفانہ سنجیدگی ہے ۔ وہ بڑے خلوص سے اظہار عشق کرتے ہیں لیکن

محبوب کے حفظ مراتب کا پاس برابر رہتا ہے ۔ ان تمام اشعار میں رنگینی و لطافت حد درجہ ہے ۔ مثلاً درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں :

هر جنبش نگاه تری، جان آرزو — موج خرام ناز ہے ایمان آرزو

سحر لائے گی کیا پیغام بیداری شبستاں میں — نقاب رخ الٹ دو خود سحر بیدار ہوجائے

اس نے نگاہ ڈال دی مجھ پہ ذرا سرور میں — صاف ڈبو دیا مجھے موج مے طہور میں

شیشے میں موج مے کو یہ کیا دیکھتے ہیں آپ — اس میں جواب ہے اسی برق نگاہ کا

مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ اصغر اور درد کے اس قسم کے اشعار میں بنیادی فرق رخ اور لہجے کا ہے ۔ درد کے اشعار کا رخ " خالص مجاز " کی طرف جھکا ہوا ہے اس کے برعکس اصغر کے اشعار کا " رخ " روحانیت کی طرف ہے ۔

(۳) عشق حقیقی :

درد کے کلام کا معتدبہ حصہ عشق حقیقی کے اشعار پر مشتمل ہے ۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں :

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا — تو ہی آیا نظر، جدھر دیکھا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

دین و دنیا میں تو ہی ظاہر ہے — دونوں عالم کا ایک عالم ہے

درد کی شاعری اپنے اسی خاص رنگ کے لئے مشہور ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کیف و اثر میں ڈوبی ہوئی ہے اس لیے کہ یہی ان کی زندگی تھی ۔

جیسا کہ اوپر تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ اصغر بھی راہ تصوف کے سالک اور سلسلہ چشتیہ صابریہ اور قادریہ سے منسلک تھے ۔ تصوف کے نظریات اور اس کے اصول، ان کی زندگی میں رچ بس گئے تھے، انہیں کا عکس ان کی شاعری میں بھی منظر آتا ہے ۔ عشق حقیقی کے کچھ اشعار نمونتاً درج کئے جاتے ہیں :

پھر میں نظر آیا نہ تماشا نظر آیا	جب تو نظر آیا مجھے تنہا نظر آیا
کس درجہ ترا حسن بھی آشوب جہاں ہے	جس ذرے کو دیکھا وہ تڑپتا نظر آیا
ذرے ذرے سے نمایاں ہے تجلی قدم	ہوش گم ہیں وسعت صحرائے امکاں دیکھ کر
تو برق حسن اور تجلی سے یہ گریز	میں خاک اور ذوق تماشا لئے ہوئے

غرضیکہ اصغر کے کلام کا خاصا بڑا حصہ عشق حقیقی کی سرمستیوں سے لبریز ہے، اور سلوک و معرفت کے مقام و مراحل اور صوفیانہ کیفیات و اصطلاحات کے ذکر اذکار سے بھرا ہوا ہے لیکن ہر جگہ اصغر نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے ۔ اس پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے لیکن آگے بڑھنے سے پہلے درد اور اصغر کے بنیادی فرق کو اگر سمجھ لیا جائے تو دونوں کی شاعری کا فرق خود بخود واضح ہو جائے گا ۔ درد کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی رقمطراز ہیں :

" ان کی فکر و عمل دونوں پر تصوف کی گہری چھاپ تھی ۔ اسی کے ساتھ وہ ایک بڑے شاعر بھی تھے ۔ انھوں نے عاشقانہ مزاج پایا تھا ۔ اس لئے ان کی شاعری میں درد و اثر کا ہونا کوئی تعجب نہیں ۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ پہلے صوفی تھے پھر شاعر ------ ان کی شاعری تصوف کی تابع ہے ۔ تصوف شاعری کا تابع نہیں ہے ۔ اگر وہ شاعر نہ ہوتے تو بھی صوفی ہوتے ۔"[1]

اصغر اس کے برعکس از اول تا آخر شاعر تھے ۔ تصوف نے تو ان کے جذبات میں خلوص و شدت پیدا کی تھی ۔ تصوف کا مقصد انسان کے فکر و نظر کی تطہیر، جذبات میں نزہت و لطافت اور تخیل میں رنگینی و سرمستی پیدا کرنا ہے ۔ اصغر نے عملی تصوف سے اپنے اندر کے انسان کے لئے روح کی یہی غذا و سامان حاصل کیا تھا ، ان چیزوں سے ان کی شاعرانہ صلاحیتیں کو جلا ہوئی اور ان کی شاعری دوآتشہ ہوگئی ۔ ان کی شاعری تصوف کے ظاہر (اصطلاحات و موضوعات) کی نہیں ، اس کی لطافتوں ، شائستگیوں اور شرافتوں کی شاعری ہے ۔ اس حیثیت سے ان کی شاعری اصطلاحی معنوں میں صوفیانہ شاعری نہیں ہے ۔ ان کے یہاں تصوف شعریت کو مجروح نہیں کرتا ۔ دونوں کے مزاجوں کا یہی بنیادی فرق دونوں کی شاعری کا فرق بھی ہے ۔

---

۱ ۔ دیوان درد ۔ مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ، طبع ثانی ۱۹۶۳ء ۔ صفحہ ۳۸

مثلاً دونوں کے یہاں تصوف کی بعض اصطلاحات ــــ فنا، بقا، بے خبری، جلوہ، پردہ، غیب، شہود، کثرت، وحدت، دید، آئینہ، آفتاب، ذرہ، نیستی و ہستی بار بار آئے ہیں لیکن درد کے یہاں ان کے بیان کو زیادہ سے زیادہ صوفیانہ یا فلسفیانہ اظہار حقیقت کہا جا سکتا ہے، اس قسم کے اشعار میں شعریت تقریباً مفقود ہو گئی ہے ـ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

دونوں جہاں کو روشن کرتا ہے نور تیرا ‏ ‏ اعیان ہیں مظاہر ظاہر ظہور تیرا

ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت ‏ ‏ یاں بھی شہود تیرا واں بھی حضور تیرا

ہووے کب وحدت میں کثرت سے خلل ‏ ‏ جسم و جان گو دو ہیں پر ہم ایک ہیں

آئینۂ عدم ہی میں ہستی ہے جلوہ گر ‏ ‏ ہے موجزن تمام یہ دریا سراب میں

کیافرق داغ و گل میں اگر گل میں بو نہ ہو ‏ ‏ کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

ہووے نہ حول و قوت اگر تیری درمیاں ‏ ‏ جو ہم سے ہو سکے ہے سو ہم سے کبھو نہ ہو

یہ تمام اشعار کیف و اثر سے خالی ہیں ـ اس قسم کے اشعار دیوان درد میں خاصی تعداد میں موجود ہیں ـ اصغر کے یہاں ایسے اشعار نہ ہونے کے برابر ہیں ـ جہاں اس قسم کی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں ان میں شعریت و رنگینی برابر قائم و برقرار رہی ہیں ـ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

ضیائے حسن کا ادنیٰ سا یہ کرشمہ ہے ‏ ‏ چمک گئی ہے شبستان غیب و بزم شہود

ہزار جامہ دری، صد ہزار بخیہ گری ‏ ‏ تمام شورش و تمکین مستار بے خبری

خبر نہیں ہے کہ کیا حال ہے کہاں ہوں میں ‏ ‏ بقا کا ہوش نہ اب مستی فنا باقی

کیافیض تمثیاں ہیں رخ بے نقاب کی ‏ ‏ ذروں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی

ہے ایک ہی جلوہ جو ادھر بھی ہے ادھر بھی ‏ ‏ آئینہ بھی حیران ہے آئینہ نگر بھی

اب دونوں کے کلام سے کچھ مشترک خیالات و افکار پیش کئے جاتے ہیں تاکہ دونوں کا رنگ طبیعت اور اسلوب بیان، جس کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، واضح ہو سکے ـ تصوف کے بنیادی افکار میں سے ایک مسئلہ وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود کا ہے ـ درد اور اصغر دونوں کے یہاں سے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں ـ

<u>وحدۃ الوجود</u>

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں

ہم آئینہ کے سامنے جب آ کے ہو کہیں

اے درد کر ٹک آئینہ دل کو صاف تو

پھر ہر طرف نظارۂ حسن و جمال کر

بستے ہیں ترے سایے میں سب شیخ و برہمن

آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بت خانہ تھا

ہم سبھی مہمان تھے واں، اک تو ہی صاحب خانہ تھا

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا

تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

تجھ کو نہیں ہے دیدہ بینا وگرنہ یاں

یوسف چھپا ہے آن کے ہر پیرہن کے بیچ

تیرا ہی حسن جگ میں ہرچند موجزن ہے

تس پر بھی تشنہ کام دیدار ہیں تو ہم ہیں

گزرا ہے بتا کس بن صبا آج ادھر سے

گلشن میں تیرے پھولوں کی وہ باس نہیں ہے

ان تمام اشعار میں ایک سادہ حقیقت سیدھے سادے انداز میں بیان کر دی گئی ہے اب ذرا چند اشعار اصغر کے دیکھئے :

پرتو رخ کے کرشمے تھے سر راہ گزر

ذرے جو خاک سے اٹھے وہ صنم خانہ ہے

کیا فیض بخشیاں ہیں رخ بے نقاب کی

ذروں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی

یہ جلوے کی فراوانی یہ ارزانی یہ عریانی

پھر اس شدت کی تابانی کہ ہم پردا سمجھتے ہیں

نکھر کے تو اسی پردے میں جلوہ آرا ہے

بہار لالہ و گل شوخی صبا معلوم

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردا میں نے

مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا

تصوف کا بنیادی موضوع حسن و عشق ہے - درد کے یہاں عشق کو بڑی اہمیت دی گئی ہے ، اصغر کے سلسلے میں یہ تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ ان کی شاعری کے

بنیادی موضوع بھی حسن و عشق ہیں - اب دونوں کے اشعار دیکھئے :

آتشِ عشق جی جلاتی ہے   یہ بلا جان ہی پہ آتی ہے

آتشِ عشق قہر و آفت ہے   ایک بجلی سی آن پڑتی ہے

مستِ شرابِ عشق وہ بیخود ہے جس کو حشر   اے درد چاہے لائے بخود پر نہ لا سکے

ہارے یہ داغِ عشق ہوا شہرِ یار دل   مدت سے ہے چراغ پڑا تھا دیار دل

عشق ہرچند مری جان سدا کھاتا ہے   پر یہ لذت تو وہ ہے جی ہی جسے پاتا ہے

یہ چند اشعار درد کے کلام سے پیش کئے گئے ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا آدھا دیوان عشق و عاشقی کی داستان ہے -

اصغر بھی عشق کی عظمت سے واقف اور ، اس کی کارفرمائیوں کے رمز شناس ہیں - چنانچہ متفرق اشعار کے علاوہ انھوں نے دو مسلسل غزلیں عشق پر اور ایک " آرزو " پر کہی ہے، جو دراصل عشق ہی کا دوسرا نام ہے - بڑی بڑی غزلیں تو نقل کرنا طولِ امل کا باعث ہوگا البتہ غزل سے دو دو ایک ایک شعر، اور کچھ متفرق اشعار درج کئے جاتے ہیں - ان کے مطالعہ سے درد اور اصغر کا فرق سمجھ میں آ سکے گا :

برق میں جوش و اضطراب ذرے میں سوز و سازِ عشق

کل یہ فضائے دہر ہے سجدۂ پر گدازِ عشق

فتنۂ دہر مٹ گیا، حشر اٹھا تھا اٹھ چکا

ختم مگر نہ ہو سکا مرحلۂ درازِ عشق

بیخود و محو جسم و جاں، مست زمیں و آسماں

جس نے دستِ ناز سے چھیڑ دیا ہے، سازِ عشق

......

ذروں کا رقص مستی صہبائے عشق ہے

عالم رواں دواں یہ تقاضائے عشق ہے

کس درجہ ایک خاک کے ذرے میں ہے تپش

ارض و سما میں شورش و غوغائے عشق ہے

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں

سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے

اس کی نگاہ ناز نے چھوڑا کچھ اس طرح

اب تک اچھل رہی رگ جان آرزو

چاہا جہاں سے منظر فطرت بدل دیا

ہے کل جہاں تابع فرمان آرزو

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصغر عشق سے زیادہ حسن و جمال کے شاعر ہیں -
اور یہی چیز ان کو درد سے منفرد و ممتاز کرتی ہے -

تصوف اسلام کا دوسرا اہم موضوع لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِی اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ، اور لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ کے مطابق " عظمت آدم " اور " شرف انسانی " ہے - درد نے اس کو اپنی شاعری کا اہم موضوع بنایا ہے - چند اشعار ملاحظہ ہوں :

باغ جہاں کے گل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں

گر یار ہیں تو ہم ہیں اغیار ہیں تو ہم ہیں

الفاظ خلق ہم بن ، سب مہملات سے ہیں

معنی کی طرح ربط گلستار ہیں تو ہم ہیں

انسان کی ذات سے ہیں خدائی کے کھیل یاں

بازی کہاں بساط پہ گر شاہ ہی نہیں

میں گو نہیں ازل سے پر تا ابد ہوں باقی

میرا حدوث آخر جا ہی بھڑا قدم سے

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے

وہاں پہونچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

اصغر کا بھی یہ محبوب موضوع ہے ، لیکن اس کو انھوں نے غزل کی تمام تر رچاؤ اور گھلاوٹ کے ساتھ انتہائی شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے - اور کہیں کوئی شعر غزل کی رمزیت و ایمائیت سے خالی اور اس کے دائرے سے خارج نہیں ہوا ہے - اور باوجود مضمون کی اہمیت کے ، نہ اس میں وعظ کی بے کیفی اور سپاٹ پن آیا ہے اور نہ اس کے بوجھ سے شعریت مجروح ہوئی ہے - اشعار ملاحظہ ہوں :

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی

ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب

پتے پتے پر چمن کے ہے وہی چھائی ہوئی

عندلیب زار کو اک مشت پر سمجھا تھا میں

میں ہوں ازل سے گرم رو عرصۂ وجود

میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

حیات و موت بھی ادنیٰ سی اک کڑی میں

ازل سے لے کے ابد تک وہ سلسلہ ہوں میں

نالوں سے میں نے آگ لگا دی جہان میں

صیاد جانتا تھا فقط مشت پر مجھے

وہ شورشیں نظام جہاں جن کے دم سے ہے

جب مختصر کیا انھیں انسان بنا دیا

درد کے یہاں تیسری چیز جو بار بار نظروں کے سامنے آتی ہے وہ " دید "

یا " دیکھنا " ہے ---- صوفیا کے یہاں " دید " کو بڑی اہمیت حاصل ہے چنانچہ

مولانا روم کہتے ہیں ؎

" آدمی دید است باقی پوست است   دید آں باشد کہ دید دوست است "

درد کے یہاں " دید " یا " دیکھنا " بار بار اشعار میں آتے ہیں - اور ان

اشعار میں ایک خاص قسم کی کیفیت و لذت کا احساس ہوتا ہے - یہ اشعار دیکھئے :

جان پہ کھیلا ہوں میں میرا جگر دیکھنا

جی نہ رہے یا رہے مجھ کو ادھر دیکھنا

گرچہ وہ خورشید رو ہے مرے سامنے

تو بھی میسر نہیں بھر کے نظر دیکھنا

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک

اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا

تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

فرصت زندگی بہت کم ہے

مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

جلوہ تو ہر اک طرح کا ہر شان میں دیکھا

جو کچھ کہ سنا تجھ میں سو انساں میں دیکھا

اصغر کے یہاں بھی " دید " کے موضوع کو بہت اہمیت دی گئی ۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ حقیقتاً " کیفیت دید " ہی کے شاعر ہیں تو شاید غلط نہ ہو۔ صرف چند اشعار ملاحظہ ہوں :

اب تو یہ تمنا ہے کسی کو بھی نہ دیکھوں

صورت جو دکھا دی ہے تو لے جا و منظر بھی

مستی میں فروغ رخ جاناں نہیں دیکھا

سنتے ہیں بہار آئی گلستاں نہیں دیکھا

ہر حال میں بس پیش نظر ہے وہی صورت

میں نے کبھی روئے شب ہجراں نہیں دیکھا

جلوہ رنگیں اتر آیا نگاہ شوق میں

ہم لطافت جسم کی اے سیم تن دیکھا کئے

یہ دیکھتا ہوں ترے زیر لب تبسم کو

کہ بحر حسن کی اک موج بیقرار نہ ہو

اس کا وہ قد رعنا اس پر وہ رخ رنگیں

نازک سا سر شاخ اک گویا گل تر دیکھا

گم کر دیا ہے دید نے یوں سر بسر مجھے

ملتی ہے اب انہیں سے کچھ اپنی خبر مجھے

ہم ایک بار جلوہ جاناں نہ دیکھتے

پھر کچھ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے

رقص مستی دیکھتے جوش تمنا دیکھتے

سامنے لا کر تجھے اپنا تماشا دیکھتے

جاں ہے محو تجلی چشم و گوش و لب ہیں بند

حسن کو حسن بیان حسن نظر سمجھا تھا میں

دکھا جلوہ وہی ظالم کی جاں حزیں جلوہ

ترے جلوے کے آگے جاں کو ہم کیا سمجھتے ہیں

محو ہے ذوق دید بھی جلوۂ حسن یار میں

ایک شعاع نور ہے اب یہ نظر نظر نہیں

اصغر کے یہاں " دید " کی دوھری کیفیت کا اظہار ہے ، ایک " حسن کی " رنگین " کیفیات " کا اظہار، دوسرے حسن کی دید سے عشق کے باطن میں جو کیفیت کیفیت سرور و انبساط پیدا ہوتی ہے اس کا اظہار، اور چونکہ شاعر کو ان دونوں کیفیات کا ذاتی تجربہ ہے اس لیے ان کے اظہار میں رنگینی و حسن کے ساتھ کیف و لذت بھی ہے - درد کے یہاں ان دونوں کیفیات کا پتہ نہیں -

اس تقابل کو ختم کرنے سے پہلے دونوں کے متحد المصدر اور ہم مضمون اشعار منقل کئے جاتے ہیں اس سے ایک طرف یہ بات واضح و ثابت ہو جائے گی کہ اصغر نے خیالات و افکار میں درد سے استفادہ کیا ہے ---- جیسا کہ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے، دوسری طرف مزاجوں کے اختلاف اور طبیعتوں کے فرق سے، معنی اور رنگ کا فرق بھی نمایاں ہو جائے گا۔

درد

تو اپنے ہاتھوں آپ ہی پڑتا ہے تفرقے میں

اے امتیاز مار ان تک امتیاز کرنا

اے درد چھوڑتا ہی نہیں مجھ کو جذب عشق

کچھ کہربا سے چل نہ سکے برگ کاہ کا

رات جب پہونچا میں اس کے رو برو

جوں زبان شمع گم تھا مدعا

اصغر

صدہا تو لطف مے سے بھی محروم رہ گئے

یہ امتیاز ساغر و مینا لئے ہوئے

وہ میں دیوانہ ہو اصغر نہ مجھ کو ذوق عریانی

کوئی کھینچےلئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

اس کی شعاع مہر خود مجھ کو اڑا کے لے چلی

شبنم خستہ حال کو حاجت بال و پر نہیں

شعاع مہر خود بیتاب ہے جذب محبت سے

حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پرواز شبنم کی

کامیاب شوق کی ناکامیوں کو دیکھئے

حرف مطلب محو ہے جوش دعا کے سامنے

کھل گیا جو کچھ کہ تھا اے نیستی
ہستی موہوم کا یہاں افترا

....

میں تو کچھ ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

....

میں سامنے سے جو مسکرایا
ہونٹ اس کا بھی درد ہل گیا ہے

....

تم آ کر جو پہلے ہی مجھ سے ملے تھے
نگاہوں میں جادو سا کچھ کر دیا تھا

....

شادی کی اور غم کی ہے دنیا میں ایک شکل
گل کو شگفتہ دل کہو تم یا شکستہ دل

....

ملنے لگے ہیں تم سے غیر دل میں رکھو ہو ہم سے بیر
یہ ہے رضا تری تو خیر ہم سے تو کچھ خطا نہیں

....

درد کی طرح وہ ہوجاتے ہیں کچھ اور کے اور
بے خبر از خود شدگاں جب کہ بخود آتے ہیں

....

اے درد یاں کسو سے نہ دل کو پھنسائیو
لگ چلیو سب سے پر تو یہ جی مت لگائیو

....

جب تک ہے دل کے شیشے میں رنگ امتیاز کا
ہے اے ہوس تبھی تلک آئینہ ساز کا

....

اک قطرۂ شبنم پر خورشید ہے عکس آرا
یہ نیستی و ہستی افسانہ ہے افسانہ

ہوتا ہے راز عشق و محبت انھیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق تبسم بھی
لہریں سی جو اٹھتی ہیں کچھ چشم نما سے

پہلی نظر بھی آپ کی اف کس بلا کی تھی
ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لئے ہوئے

بہار انجام سمجھوں اس چمن کا یا خزاں سمجھوں
زبان برگ گل سے مجھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے

نار جحیم بھی بجا، باغ نعیم بھی درست
تو مجھے بخش دے جہاں میری وہیں نجات ہے

جیسے لیا ہو آ کر اس سے اب درس جنوں لے لے
سنا ہے ہوش میں ہے اصغر دیوانہ برسوں سے

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو
مگر موج صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

جمال یار کی زینت بڑھا دی رنگ و صورت سے
قیامت ہے قیامت میرا پابند نظر ہوتا
کچھ سمجھ کر ہم نے رکھا ہے حجاب دہر کو
توڑ کر شیشے کو پھر کیا رنگ صہبا دیکھئے

اس تفصیلی بحث[1] سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ اصغر کے یہاں یقیناً درد کے معانی ہیں ـــــ لیکن تصوف کی خشکی ، یبوست اور بے کیفی کے بجائے، تصوف کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی کیفیات کی فرحت و لطافت اور ذہنی و تخیلی رنگینی ہے - اس کے علاوہ اصغر کا لہجہ نشاطیہ ہے جب کہ درد کا حزنیہ - درد نے مجاز کو مجاز اور حقیقت کو حقیقت کے رنگ میں پیش کیا ہے لیکن اصغر نے دونوں دنیاؤں کو ملانے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے اور حقیقت میں بھی مجاز کے رنگ کو قائم رکھا ہے - یہ چیز ان کو درد سے ممتاز کرتی ہے (دیکھئے مقالہ ہذا صفحہ ۵۱۳ - ۵۱۰) درد کے یہاں ہندی الفاظ کا استعمال زیادہ ہے جس سے غزل میں لذت و چاشنی آ جاتی ہے - زبان سادہ اور آسان ہے - کہیں کہیں صنائع کا بیجا استعمال ہے ، جس سے تکلف پیدا ہو گیا ہے - اصغر کا اسلوب مرصع رنگین اور شعریت میں ڈوبا ہوا ہے - الفاظ مشکل اور صنائع فطری اور برجستہ انداز میں استعمال کئے گئے ہیں -

(۲) اصغر اور غالب :

تفصیلی بحث گزشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے یہاں صرف ایک دو باتیں اشارۃً اور کہی جاتی ہیں -

(۱) پہلی یہ کہ غالب کے یہاں اکثر اشعار لہجے کے اختلاف سے کئی کئی معنی کے حامل نظر آتے ہیں - اصغر کے یہاں ایسا نہیں ہے -

(۲) دوسری یہ کہ غالب کے تمام اشعار کی سطح یکساں بلند نہیں ہے جب کہ اصغر کبھی ایک خاص سطح سے نیچے نہیں آتے ـــــ یعنی اصغر کا کلام غالب کے مقابلے میں زیادہ ہموار ، متوازن و معتدل ہے -

(۳) تیسری یہ کہ اصغر یک آہنگ ہیں ـــــ لیکن غالب صد آہنگ

(۴) اور آخری بات یہ ہے کہ غالب کی صوفیانہ شاعری دماغی یا روایتی ہے اس لئے اس سے ذہن کی سیرابی و تسکین تو کسی قدر ہوتی ہے لیکن روحانی مسرت و سرشاری نہیں حاصل ہوتی - اس کے برعکس اصغر کے یہاں تصوف ان کی زندگی کا لائحہ عمل اور اس کے مقام و مراحل ان کا ذاتی تجربہ ہیں - اس لیے ان کی شاعری میں لذت و کیف اور روحانی سرمستی و سرشاری کا سامان ہے -

---

۱- اس بحث میں دیوان درد مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی سے مدد لی گئی ہے -

(۳) اصغر اور مومن :

اصغر کی شاعری کا سلسلہ ایک طرف وحید بلگرامی کے واسطے سے غالب سے دوسری طرف تسلیم لکھنوی کے واسطے سے حکیم مومن خاں مومن سے ملتا ہے - جہاں تک غالب سے استفادہ کا تعلق ہے خود اصغر نے اس کا اعتراف کیا ہے - اس سے کسی قدر تفصیلی بحث " تراکیب فارسی " کے سلسلے میں اوپر گزر چکی ہے - یہاں یہ دیکھنا ہے کہ آیا مومن بھی کسی طرح اصغر کی طبیعت اور انداز شاعری پر اثر انداز ہوئے ہیں؟ اگر ہوئے ہیں تو کس حد تک ؟

میرے سوال کے جواب میں کہ

" اصغر کے مطالعہ میں عموماً کیسی کتابیں رہتی تھیں - ان کا خاص موضوع مطالعہ کیا تھا؟ کوئی خاص مصنف یا شاعر جس سے اصغر کو بڑا شغف تھا؟ "

مولانا سراج الحق مچھلی شہری نے تحریر فرمایا :

" اقبال ، حسرت ، غالب اور مومن -[۱] "

مولانا سراج الحق صاحب کے جواب سے اصغر کا مومن سے ذہنی لگاؤ تو ثابت ہوتا ہے لیکن اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ یہ ذہنی تعلق ان کی شاعری میں کس طرح ظاہر ہوا ؟

میرے درج ذیل سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ

" آیا اصغر ، جناب تسلیم لکھنوی کے رسمی شاگرد تھے یا ان سے کچھ معنوی فیض بھی حاصل کیا؟ "

مولانا افسر موہانی نے، جنھوں نے اصغر کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان کے خواجہ تاش --- یعنی تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہیں، تحریر فرمایا :

" اب میرے لئے یہ بتانا تو محال ہے کہ وہ استاد کے رسمی شاگرد تھے یا انھوں نے کس حد تک معنوی فیض حاصل کیا -[۲] "

لیکن بعض خصوصیات اصغر کے کلام میں ایسی ہیں جو خاص سلسلۂ مومن کی ہیں - مثلاً

" تخیل کی بلندی، لطافت بیان اور تراکیب شائستہ جن میں ندرت کا خاص جز ہوتا ہے - وہ حضرت مومن اور ان کے سلسلۂ تلامذہ کا خاص

۱- بر پشت مکتوب مقالہ نگار بنام مولانا سراج الحق مچھلی شہری مرقومہ ۲۲ فروری ۱۹۶۹ء

۲- مکتوب جناب مولانا افسر موہانی بنام مقالہ نگار مرقومہ ۲ جولائی ۱۹۶۹ء

حصہ ہے ۔ جو دوسرے سلسلوں میں کم یاب بلکہ نایاب ہے ــ
ــــ اصغر صاحب کے کلام میں بھی اکثر مقامات میں سلسلۂ
مومن کی بندشیں اور تراکیب پائی جاتی ہیں [1] ۔"

جن خصوصیات کا ذکر، اقتباس بالا میں ہوا ہے اور جنھیں مومن اور شاگردان سلسلۂ مومن کے خصوصیات خاصہ کہا گیا ہے ۔ وہ اصغر کے کلام میں بھی پڑی ہیں ۔ اس کے علاوہ اگر اصغر کے کلام کی شعریت، غزلیت اور فارسی تراکیب (جن کا ذکر غالب کے سلسلے میں اوپر کیا گیا ہے) کو نظر میں رکھا جائے تو وہ غالب کے مقابلے میں مومن سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں ۔ لیکن میری ناقص رائے میں مومن کی جس خصوصیت نے اصغر کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ان کی رنگین نگاری اور تصویر آفرینی ہے ـــ یعنی رنگین رقصاں تشبیہات و استعارات کے ذریعہ "معاملات حسن و عشق" کی رنگین تصویریں بنانا۔ مومن نے اپنی رنگینی طبیعت کے زیر اثر معاملات حسن و عشق کے بڑے رنگین و دلکش مرقعے تیار کئے ہیں جن سے ان کے مشاہدے کی تیزی ، نفسیاتی بصیرت اور حسن و عشق کی رمز شناسی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ مومن کی معاملہ بندی پر اظہار خیال کرتے ہوئے صفیر بلگرامی لکھتے ہیں :

"جرات اس رنگ کے موجد تھے مگر بہ سبب کم علمی کے بہت
کھل گئے تھے ۔ مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل
بندشوں اور نرالی ترکیبوں سے ایسے پردے میں رکھا کہ
اہل اشعار ہی اس کے مزے کو جانتا ہے [2] ۔"

اس بیان پر اگر اتنا اور اضافہ کر دیا جائے کہ مشکل بندشوں اور نرالی ترکیبوں کے ساتھ مومن کی پیچیدہ بیانی اور نازک خیالی ان تصویروں کو مبہم، دھندلی اور ناقابل فہم بنا دیتی ہے "، تو شاید غلط نہ ہو ۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس کی روشنی میں حسب ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے :

کیا قہر طمع بوالہوس بے ادب ہوا جرم رقیب قتل کا میرے سبب ہوا
بوسے دم غضب لئے الٹی سمجھ تو دیکھ بل جب پڑا جبیں تھا کو لب ہوا
کیا کیا شکن دیئے ہیں دل زار کو، مگر اس کے خیال میں ورق انتخاب تھا

---

۱ ۔ مکتوب جناب مولانا انقر موہانی بنام مقالہ نگار مرقومہ ٦ جولائی ١٩٦٩ء
٢ ۔ "جلوہ خضر" ، از صفیر بلگرامی بحوالہ دیوان مومن مرتبہ ضیاء احمد ضیاء ۔ مطبوعہ شانتی پریس الہ آباد ، طبع چہارم ١٩٦٢ء ۔ صفحہ ٧٥

لیکن جہاں اشعار صاف اور آسان نکل آئے ہیں ، تصویر واضح ، دلکش رنگین اور لذت بخش ہو گئی ہے ۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے :

ہر ایک سے اس بزم میں شب پوچھتے تھے نام
تھا لطف جو کوئی مرا ہم نام نکلتا

چیں جبیں کو دیکھ کے دل بستہ تر ہوا
کیسی کشود کار کشاد نقاب میں

محو مجھ سا دم نظارۂ جاناں ہوگا
آئینہ ، آئینہ دیکھے گا تو حیران ہوگا

صورت اغیار کو دیکھے ہے وہ حیرت زدہ
میرے رنگ رخ نے آئینہ مگر دکھلا دیا

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز، تو دیکھو

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم
کہیں پامال سر نہ ہو جائے

محولہ بالا اشعار کی تصویر آفرینی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی امیجری حسی و مادی ہے ۔ ان کے تخئیلی نقوش کے آب و رنگ بھی مادی ہیں اور ذہنی کیفیات کی مصوری دنیائے حسن و عشق کے مجازی پہلوؤں تک محدود ہے ۔ اس کے برعکس اصغر کی جمال پرستی اور تصویر آفرینی انہیں بیشتر روحانی کیفیات اور قلبی واردات کی عکاسی پر اکساتی ہے ۔ " ان کے تخئیلی نقوش " حسن مطلق " کی اداؤں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کا فنکارانہ کمال یہ ہے کہ وہ اپنے جمالیاتی تاثرات کو عمل تجسیم کے ذریعہ حد درجہ لطیف و خیال انگیز بنا دیتے ہیں " ---- یعنی وہ " حسن مطلق " کے اظہار میں بھی مجاز کی رنگینی کو برقرار رکھتے ہیں ۔(تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ ھذا صفحہ ۵۱۰ - ۵۱۴)

مگر جب وہ مومن کے انداز میں " حسن مجاز " کی تصویر کشی کرتے ہیں تو

اس وقت بھی ان کے تصویری پیکر حسن و زیبائی، رنگینی و رعنائی اور لطافت و پاکیزگی میں ، مومن کی تصویروں سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں —— بالفاظ دیگر " مومن کی شاہزادہ مصوری " اصغر کے یہاں پہنچ کر زیادہ رفیع و لطیف ہو گئی ہے جس میں جنسی و لمسی کیفیت کا شائبہ تک نہیں ——— یہی خصوصیت خاص ، مومن سے اصغر کا اکتساب فیض ہے، جسے انھوں نے اپنی پاکیزہ، لطیف اور رنگین طبیعت اور فنکارانہ ریاضت و مہارت سے انفرادی شان بخش دی - اس کے ثبوت و شہادت میں اصغر کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں، ان میں مومن کے تمام خصوصیات ——— لطافت بیان، تراکیب شائستہ ، نازک خیالی اور رنگین کاری یکجا ہو گئی ہیں ، مگر اصغر کی انفرادیت ہر جگہ قائم ہے - اشعار ملاحظہ ہوں :

اٹھے عجب انداز سے وہ جوش غضب میں

چڑھتا ہوا اک حسن کا دریا نظر آیا

رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی

شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

اس عارض رنگیں پھر عالم وہ نگاہوں کا

معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

تنتنا اٹھے وہ عارض مرے عرض شوق پر

ان گلوں کو چھوڑ کر میں نے گلستاں کر دیا

پھر ان لبوں پہ برق تبسم ہوئی جہاں

سامان جوش رقص تھا لئے ہوئے

رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق تبسم بھی

لہریں سی جو اٹھتی ہیں کچھ چشم تما سے

حقیقت یہ ہے کہ اصغر مومن اسکول کے بہترین غزل گو ہیں - " اگر انھوں نے اپنی یہ روش (رنگ مجاز) جاری رکھی ہوتی تو وہ اس رنگ میں بھی منفرد ہوتے . . . . . اس وقت بھی ان کے دل میں اتر کر دیکھنے والے " خواص " ہی ہوتے -[1] "

(۳) اصغر اور اقبال :

اصغر اور اقبال کا موازنہ بظاہر کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے ایک سرتا پا غزل گو دوسرا کسی صنف سخن پابند نہیں - لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت

---

۱ - مقالہ ہذا - صفحہ

ہے کہ دونوں میں بعض ذہنی مماثلتیں ہیں، اور اصغر اقبال سے کچھ اس درجہ متاثر ہیں کہ جب تک ان کی نشاندہی نہ کی جائے اور اس اثر پذیری کے باوجود جب تک اصغر کی انفرادیت واضح نہ کی جائے ان کے مقام و مرتبہ کا تعین درست نہ ہوگا ۔

اصغر اقبال سے ذہنی طور پر کافی متاثر تھے، ان کی فکری مماثلتوں کا سراغ تو ان کے کلام سے لگایا جائے گا لیکن یہاں ان کے ایک طویل مکتوب کا اقتباس درج کیاجاتا ہے جس سے اقبال کے متعلق ان کے تاثرات کا اندازہ ہوگا :

" .... ذاتی طور پر میں اپنے تمام معاصرین کو اپنے سے بہتر سمجھتا ہوں اور " موازنہ و مقابلہ " کی رسم قبیح کو کسی طرح جائز نہیں سمجھتا .... رہی علامہ اقبال کی ذات اس بارے میں صرف اسی قدر عرض کرنے پر اکتفا کروں گا کہ اگر میں صحیح طور پر ان کا قدرشناس ہو سکوں اور وہ میرا شمار اپنے مداحوں اور نیازمندوں میں کرنے لگیں تو یہی چیزمیرے فخر و عزت کا باعث ہوگی چہ جائیکہ موازنہ و مقابلہ ۔ استغفراللہ ۔

لاہور کے قیام میں جو لمحے استفادۂ موصوف کی صحبت میں بسر ہو جاتے ہیں انہیں حاصل زندگی اور اس معصیت قیام کا کفارہ سمجھتا ہوں .... تاریخ اسلام کے صدہا ورق جب الٹ چکتے ہیں تو کہیں ایسی نادر الوجود ہستی بساط شہود پر نمودار ہوتی ہے جو یہ کہے ؎

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی نہ افغانی نہ تورانی

جس نے یہ کہا ہے وہ متفقہ طور پر تمام عالم اسلامی کا شاعر ہے ...... میری اس تحریر کی اصل غرض صرف یہ تھی کہ میں اپنی نیازمندانہ عقیدت کا اظہار کر دوں جو مجھے علامہ ممدوح سے ہے

احقر
اصغر (گونڈوی) "[1]

۱۔ مکتوب اصغر بنام مدیر نیرنگ خیال لاہور مرقومہ ۱۳ مارچ ۱۹۲۷ء ۔ بحوالہ نیرنگ خیال جون ۱۹۲۷ء ، صفحہ ۷۰-۶۷---- یہ خط مولانا عبدالمجید صاحب سالک کے کالم " افکار و حوادث " زمیندار کالاہور ۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ سالک صاحب نے یہ کالم کسی محمد صدیق صاحب/ بجنوری ایم ۔ اے کے مقالہ پر بہت برافروختہ ہو کر لکھا تھا ۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے افکار و حوادث ۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء اور مکتوب محولہ بالا)

مکتوب محولہ بالا کے ایک ایک لفظ سے ، اصغر کی علامہ اقبال سے عقیدت و احترام اور روحانی و قلبی تعلق کا اظہار ہوتا ہے اسی سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس ذہنی تعلق کی بنیاد " اسلام " پر ہے ---- یہی ذہنی قرب ہے جس نے اصغر کو اقبال کے خیالات و افکار سے استفادہ کے لئے آمادہ کیا اور انھوں نے (اصغر) اقبال کے افکار و مفاہیم کو اپنی غزل کا موضوع بنایا اس طرح کہ غزل کی نزاکت کسی طرح مجروح نہ ہونے پائے ۔ تفصیل آئندہ سطور میں پیش کی جاتی ہیں ۔

سب سے پہلی چیز جو قاری کو اقبال اور اصغر دونوں کے یہاں نظر آتی ہے وہ فن (شعر و ادب) کا ایک واضح شعور ہے ۔ دونوں کے نزدیک فن کا مقصد انسان کے جذبات عالیہ کی تہذیب ، تلطیف اور ترفیع ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ شعر و ادب میں صلاً جذبہ کی نزہت ، لطافت اور رفعت کا سامان فکر و اسلوب کے ذریعہ داخل کیا جائے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ادبی زندگی اسی جہاد کے لئے وقف کر دی ۔ دونوں نے ادب میں پھیلتی ہوئی ستی ، جذباتیت ، عریانی اور فحش نگاری کے زہر کو روکنے کے لئے اپنا زور قلم صرف کر دیا اور اپنی شاعری کو پاکیزگی و لطافت اور شائستگی و شرافت کا اعلیٰ نمونہ بنا کر پیش کیا .... لیکن اس سے ہٹ کر اقبال کے نزدیک فنون لطیفہ کا اصل کمال اور مقصد وحید یہ ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کو قوت سے لبریز اور جوش سے سرشار کر دے ۔[1]

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فن کے متعلق انھیں مختلف زاویہ ہائے نظر نے دونوں کے فن کی راہیں ایک دوسرے سے مختلف کر دی ہیں ---- یعنی اصغر کے یہاں جذبات کی نزہت لطافت و ترفیع پر زیادہ زور ہے ۔ شاید اس لیے کہ وہ شاعر پہلے تھے مفکر بعد میں اور شاید اس لیے بھی کہ وہ غزل کے شاعر تھے اور غزل کے گلدستے میں اسی قسم کے نرم و نازک لطیف اور حسین پھولوں کی ضرورت ہوتی ہے ---- اصغر کا یہ " تصور فن " ان کے شعور و تحت الشعور میں اس حد تک رچ بس گیا تھا کہ وہ ان کی شریانوں میں خون بن کر گردش کرنے لگا ---- اور اس گردش خون کے نتیجہ میں ان کے فکر و عمل کا ہر شعبہ خواہ عملی زندگی کا ہو یا ادبی، لطیف و نظیف ، طاہر و طیب اور با نزہت و رفیع بن گیا ۔

اس کے برعکس اقبال نے ایک فلسفی اور مفکر کی طرح اقوام عالم کے ارتقائے تاریخی

---

۱ ۔ دیکھئے مقالات اسرار خودی اور تصوف صفحہ ۱۶۶ ، جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ صفحہ ۱۸۹-۱۸۸ بحوالہ مقالات اقبال مرتبہ سید عبد الواحد معینی مطبوعہ اشرف پریس لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء

کا مطالعہ کیا تھا اور ارتقائے تاریخی کے ہر دور میں پیدا ہونے والے ادب اور اجتماعی زندگی کی تعمیر یا تخریب میں اس کے اثرات کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ قائم کیا تھا کہ جب کوئی قوم قوت عمل سے عاری ہو جاتی ہے تو اضمحلال و افسردگی اور ترک و رہبانیت اجتماعی زندگی کا معمول و مقصود اور شعر و ادب کا مایۂ خمیر بن جاتے ہیں ---- لہذا قوم میں قوت و جوش عمل پیدا کرنے کے لیے انھوں نے شعر و ادب میں سب سے زیادہ زور انھیں عوامل پر دیا ---- یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اصغر کا اس پر ایمان نہیں تھا لیکن اتنا کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ اردو شاعری کی مفلوج اور مضمحل رگوں میں قوت عمل کی برقی رو دوڑانے کا احساس جس شدت سے اقبال نے دلایا ۔ اور اس کی تبلیغ اپنی شاعری کے ذریعہ جس شدومد کے ساتھ انھوں نے کی اس کی مثال اردو شاعری میں نہیں ملتی ---- اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ اصغر کے کلام میں حرکت و عمل کی دعوت اقبال ہی سے متاثر ہونے کے نتیجہ میں آئی ہے تو شاید غلط نہ ہو ۔

گزشتہ سطور میں ، اصغر کی شخصیت کے عوامل و عناصر میں سے " مسرت و طمانیت ،، کو ایک فطری عنصر ثابت کیا گیا ہے --- لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اصغر کی اس نفسیاتی کیفیت کی " تہذیب و ارتفاع ،، میں اسلامی و صوفیانہ تعلیم، عارفان خود آگاہ و خدا آگاہ کے فیض صحبت کے علاوہ اقبال کی شاعری و تعلیمات کا بھی گہرا اثر ہے ---- اسی مزاجی کیفیت نے ان کی شاعری کو جہد و عمل کا پیغام اور ان کے لہجہ کو نشاطیہ و رجائی بنایا۔ اس سے تفصیلی بحث مقالہ ہذا میں جا بجا کی جا چکی ہے ، ذیل میں اصغر کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں اس سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ان پر اقبال کا اثر کتنا گہرا اور شدید ہے :

اک جہد و کشاکش ہے ہستی جسے کہتے ہیں
کسار کا مٹ جانا خود مرگ مسلماں ہے

آغوش میں ساحل کے کیا لطف سکوں اس کو
یہ جان ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

یہاں تو عمر گزری ہے اسی موج و تلاطم میں
وہ کوئی اور ہوں گے سیر ساحل دیکھنے والے

بندشوں سے اور بھی ذوق رہائی بڑھ گیا
اب قفس بھی ہم اسیروں کو پر پرواز ہے

یہ سب نا آشنائے لذت پرواز ہیں شاید

اسیروں میں ابھی تک شکوہ صیاد ہوتا ہے

مار ڈالے گی مجھے طاقت کنج چمن

جوش پرواز کہاں جب کشش صیاد نہ ہو

اقبال کے نزدیک افراد و اقوام کے لئے قوت و عمل کا سر چشمہ فکر و عمل کا وہ اجتماعی نظام ہے جو اسلام نے دیا ہے ۔ اسی لئے انھوں نے اپنی شاعری کو قرآنی اور اسلامی تعلیمات کی تشریح و تفسیر کے لیے وقف کر دیا ہے اور اس میں تمام ایسی تعلیمات کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور ان پر تنقید و تبصرہ کیا ہے جو اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں ، یہاں تک کہ بعضوں کے خیال میں اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہو کر رہ گئے ہیں ---- اصغر نے اقبال کے مثبت رویہ ---- " اسلامی تعلیمات " ---- کو ذہناً قبول کیا اور کہیں کہیں اس کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ۔ مثلاً انھوں نے بھی ایک " نظم نما غزل " " خطاب بہ مسلم " لکھی ہے جو غزل ہی کی طرح مختصر، جامع اور پرکیف ہے ۔ اس کے علاوہ ایک اور غزل میں اقبال کی آواز اور اسلام کی دھن صاف سنائی دیتی ہے ۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے :

ترک مدعا کر دے عین مدعا ہو جا	شان عبد پیدا کر مظہر خدا ہو جا
اس کی راہ میں مٹ کر بے نیاز خلقت بن	حسن پر فدا ہو کر حسن کی ادا ہو جا
تو ہے جب پیام اس کا پھر پیام کیا تیرا	تو ہے جب صدا اس کی آپ بے صدا ہو جا
آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو	پیکر عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا
قطرہ تنگ مایہ بحر بیکراں ہے تو	اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کی روح کو اپنے اندر جذب کر کے اس کی روشنی اپنی شاعری میں منعکس کی ہے، اس کی تبلیغ کے لیے اپنی شاعری وقف نہیں کی ------ بنیادی طور پر دونوں (اصغر و اقبال) میں یہی فرق ہے ۔ اقبال پر مقصدیت اتنی غالب ہے کہ ان کی شاعری اپنے اندر ہر قسم کے شاعرانہ وسائل رکھنے کے باوجود کہیں کہیں مقصد سے دب گئی ہے اور ان کی " نوا تلخ تر " ہو کر حدی اور رجز بن گئی ہے — اصغر کے اندر کا شاعر ہر حال میں شاعر رہتا ہے ۔ وہ اپنی " فکر " کو ذہن و شعور کے محمل میں " کشید " کرتا رہتا ہے اور جب اس کا " ست " نکال لیتا ہے تو اسے الفاظ کے انتہائی نازک رنگین بلوریں جاموں میں پیش کرتا ہے ۔ اس کا " کشیدہ فکر " " کشیدہ روح " ہوتا ہے ۔

اقبال اور اصغر میں ایک فرق اور بھی ہے ۔ اور وہ یہ کہ اقبال آپ کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے" اسلام ،، اور اس کی " تاریخی روایات ،، کا سہارا لیتے ہیں اور ان کے حوالے او تکرار سے جذبات کو متحرک و متاثر کر کے، اس کی رو میں آپ کو اتنی دور بہا لے جاتے او اس میں اس درجہ غرق کر دیتے ہیں کہ آپ بے بس ہو جاتے ہیں ۔ اس کے برعکس اصغر آپ کے جذبات کے نازک و لطیف ترین تاروں کو چھیڑتے ہیں اور فن کی بری نزاکتوں اور نفاستوں ---- (الفاظ کے حسن انتخاب موسیقی، معنوی وغیرہ) کے ساتھ ان میں رقت و گداز اور علو و ترفع پیدا کرتے ہیں اور یہ سب کچھ ----- کسی خارجی وسیلے کے (یعنی جذبۂ اسلام کو برانگیختہ کئے) بغیر چپکے سے کر جاتے ہیں --- اقبال کے یہاں حرقت شعلہ بیانی و لذت خطابت ہے ، اصغر کے یہاں لطافت شاعری و لطف غزلیت ۔ اقبال کا کلام کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک ہے گریہ آور و رقت انگیز اصغر کا کلام کسی مرد خدا مست کی آواز طربناک ہے ۔ مسرت بخش و نشاط خیز ۔ اقبال کے کلام میں جوش، طنطنہ اور بلند آہنگی ہے جس کی تیز ضرب سے قوی خستہ اور اعصاب شکستہ ہو جاتے ہیں، اصغر کے کلام میں رچاؤ، سریلا پن اور زمزمہ سنجی ہے جس کے مدھم سر سے جذبات مرتعش اور روح بیدار ہوتی ہے ۔ اقبال مبہوت و مسحور کرتے ہیں اصغر محظوظ و مسرور ۔ (یہ تبصرہ صرف ان کے اس حصۂ شاعری پر ہے جس میں وہ اسلام کے کسی پہلو یا مسلمانوں کے حالات کا اظہار کرتے ہیں ۔ عام شاعری پر نہیں)

اقبال کے یہاں " قوت عمل ،، کا مرکزہ (Nucleus) " خودی ،، ہے " خودی ،، پر انھوں نے بحیثیت فلسفی و مفکر نظر ڈالی ہے اور اس کے گرد فکر و فلسفہ کا ایک پورا نظام قائم کر دیا ہے اور اس کی تبلیغ و اشاعت میں اس گرم جوشی، ولولہ اور غلو سے کام لیا ہے کہ " شیطان ، چنگیز اور لینن ،، کہ ان میں سے ہر ایک " خود شناس و خود آگاہ ،، سے کہیں زیادہ انانیت کا پیکر اور فرعون زمان تھا ---- کی شخصیات پسندیدہ و دلکش بن گئی ہیں ۔ اقبال کے نظام فکر کی منطقیت اور بیان کی شعریت نے " غلطۂ فکر " کو معقول و گوارا بنا دیا ہے ---- اصغر کے یہاں بھی " خودی ،، کا تصور ہے لیکن انھوں نے اسے ایک صوفی اور عاشق کی حیثیت سے دیکھا ہے، جس کی غایت " اقرار محبوب ،، اور جس کا منتہا " دیدار محبوب ،، ہے ۔

صفحات گزشتہ میں اس امر پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ اصغر " دید ،، کے شاعر ہیں ۔ انھوں نے " خودی ،، کے مسئلے کو بھی " دید ،، ہی کے وسیلے

سے سمجھا ہے ---- یعنی انھوں نے " خودی " اور " خدا " کے رشتہ کو روح کے ذریعہ محسوس و مفہوم اور " خدا " کو وجدان کے وسیلے سے مشاہدہ کیا ہے - یہ ان کا روحانی و وجدانی تجربہ معلوم ہوتا ہے ، اس لیے وہ " خودی انسانی " اور " خودی مطلق " کے درمیان " تعلق دید و شہود " کے علاوہ کسی اور تعلق کے قائل نہیں - ان کا یہ روحانی تجربہ ان کی نظم " کیا ہوں میں " میں بہت واضح ہو کر سامنے آیا ہے - نظم کے ابتدائی حصہ میں انھوں نے " میں " کے متعلق مختلف نظریات ایک ایک کر کے بیان کئے ہیں مگر انھیں میں ایک دو لفظ ایسے رکھ دیے ہیں کہ ان " نظریات " کی اہمیت و وقعت ختم ہو گئی ہے - آخر میں " خودی مطلق " سے ، جو ان کے نقطہ نظر سے " خودی انسانی " کا " مرکز و منتہائے دید " ہے ، انتہائی والہانہ انداز میں یوں خطاب کیا ہے ـــ

کہاں ہے سامنے آ مشعل یقیں لے کر	فریب خوردۂ عقل گریز پا ہوں میں
دوئے راز کا سجدہ میں خون ہوتا ہے	ستم ہے لفظ پرستوں میں گھر گیا ہوں میں
سما گئے مری نظروں میں چھا گئے دل پر	خیال کرتا ہوں ان کو کہ دیکھتا ہوں میں
نہ کوئی نام ہے میرا نہ کوئی صورت ہے	کچھ اس طرح ہمہ تن دید ہو گیا ہوں میں
نہ کامیاب ہوا میں نہ رہ گیا محروم	بڑا غضب ہے کہ منزل پہ کھو گیا ہوں میں
جہاں ہے کہ نہیں ، جسم و جان بھی ہیں کہ نہیں	وہ دیکھتا ہے مجھے اس کو دیکھتا ہوں میں
ترا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے	مجھے یہ فرصت کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

نظم بالا سے مترشح ہوتا ہے کہ جس طرح وہ اس " سراپائے حسن " کے نور و جمال سے مست و سرشار اور اس کی تجلیوں کی دید میں* گم ہو کر " خودی " یا " میں " کا احساس کھو بیٹھے ہیں اسی طرح چاہتے ہیں کہ وہ دنیا کو بھی اس کی " دید " سے مبہوت و مسحور کر دیں جو " میں " کے متعلق طرح طرح کے لنتات تراش رہی اور اس کے وجود کے اثبات میں قسم قسم کے دلائل و نظریات پیش کر رہی ہے تاکہ " لفظی بحث " ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے -

اس کے برعکس اقبال کا فلسفہ خودی خالصتہً فکری ہے -- انھوں نے خودی کی ماہیت ، اس کی قوت و صلاحیت کار اور " خودی مطلق " سے اس کے رشتہ و تعلق کو بڑے منطقیانہ و شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے - ان کے شاعرانہ بیان میں فکر کی غذا اور عقل کی تسکین کا سامان ہے اور وہ منزل بہ منزل آگے بڑھتی معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں

---

*- تری جلوہ میں گم ہو کر خودی سے بیخبر ہو کر
تمنا ہے کہ رہ جاؤں زسرتا پا نظر ہو کر (جگر)

جذبہ کی وہ سرشاری و سیرابی نہیں ہے جو اصغر کے یہاں ہے نہ ان کا یہ کوئی روحانی و وجدانی تجربہ معلوم ہوتا ہے ۔ اصغر کے اشعار اوپر درج کئے جا چکے ہیں ، یہاں دونوں کے ذہنی نہج اور شاعرانہ انداز کے فرق کی وضاحت کے لئے " خودی " سے متعلق اقبال کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں :

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے	خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے راز درون حیات	خودی کیا ہے بیداری کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند	سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک	من و تو میں پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے	نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
خودی شیرمولا جہاں اس کا صید	زمیں اس کی صید ، آسماں اس کا صید
یہ ہے مقصد گردش روزگار	کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

اس تقابلی مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کی طرح اصغر کے یہاں بھی " میں " کا تصور ہے لیکن " خودی " کے متعلق دونوں کا approach مختلف ہے ۔ اقبال کے یہاں فلسفہ کی گہرائی اور گیرائی اور عقل کی غذا ہے، اصغر کے یہاں جذبہ کی تسکین کا سامان اور غزل کا لطف و کیف ہے ۔

اسی " میں " یا " خودی " کے احساس نے " عظمت آدم " کا تصور اردو شاعری کو دیا ـــــ اگرچہ " عظمت آدم " کے تصور کی جھلک کہیں کہیں صوفیانہ شاعری میں بھی ملتی ہے (درد کے سلسلہ میں گزشتہ صفحات میں تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے)ـــــ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صوفیانہ شاعری میں " کسر خودی " یعنی عاشقانہ عجز و مسکنت کی لے (جس میں عاشق کی ذات درمیان سے بالکل غائب ہو جاتی ہے)، اس درجہ غالب آ گئی تھی کہ " عظمت آدم " کا تصور اردو شعر و ادب سے غائب ہو گیا تھا۔ اقبال پہلے شخص ہیں جنھوں نے بڑے والہانہ اور شاعرانہ انداز میں یہ سبق دہرایا اور اردو شاعری میں پھر سے یہ تصور داخل کیا ۔ اصغر کے یہاں " عظمت آدم " کا تصور یقیناً دیگر اسباب و عوامل (یعنی تصوف اسلامی اور اسلامی تعلیمات) کے علاوہ اقبال کی تعلیم کے نتیجہ میں آیا ۔ اصغر کے کلام سے اردو اشعار کی مثالیں مقالہ ہذا صفحہ ۵۵۱ پر پیش کی جا چکی ہیں ۔ اس لئے " تکرار بے کیف " سے بچنے کے لئے فارسی کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں، ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ اصغر پر اقبال کا اثر کتنا گہرا اور شدید ہے

ز فیض ... ذوق رنگین صد بہارے کردہ ام پیدا

ز خون دل کہ می جوشد نگارے کردہ ام پیدا

بسے روحانیاں را در کمند شوق آوردم

بہ اوج عرش اعلیٰ هم شکارے کردہ ام پیدا

ز موج خون دل صد بار من رنگین قبا گشتم

بخاک کربلا هم صد بہارے کردہ ام پیدا

ز "لا" تسخیر کردم این جہان ماہ و انجم را

ز جوش بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

جہانے را تہی بخشم جہانے را بہ وجد آرم

درین خاکسترے حسن شرارے کردہ ام پیدا

......

بہ شب ہائے سیاہے چند آہے کردہ ام پیدا

بہ هر سیارۂ صد رسم و راہے کردہ ام پیدا

تو در قید جہان پا بستہ و صد شکوہ سنجی ها

من از هر ذرہ سازے کردہ راہے کردہ ام پیدا

غبار از دامن خود بارها افشاندہ ام اصغر

بہ هنگام جنون صد مہر و ما هے کردہ ام پیدا

اقبال " خودی " کی تربیت ، تہذیب و استحکام کے لئے " عشق و آرزو " کو ضروری خیال کرتے ھیں ۔ پھر بڑے منطقیانہ و فلسفیانہ انداز میں ،خودی کے مراحل و مقام کی نشاندھی اور تعین کرتے ھیں ۔ اصغر ان تفصیلات میں تو نہیں جاتے لیکن وہ بھی " عشق و آرزو " کو انسانی خودی کی ایک محرک قوت اور محیط صلاحیت تسلیم کرتے ھیں ۔ چنانچہ " آرزو " کی ردیف میں انھوں نے ایک غزل لکھی ھے جس میں اس کی قوت و کارفرمائی واضح کی گئی ھے ۔ چند اشعار ملاحظہ ھوں :

جلوے تمام حسن کے آ کر سما گئے — اللہ رے یہ وسعت دامان آرزو

اس میں وھی ھیں یا مرا حسن خیال ھے — دیکھوں اٹھا کے پردۂ ایوان آرزو

اس نو بہار ناز کی صورت کی ھو بہو — تصویر ایک ھے تہ دامان آرزو

اور درج ذیل شعر تو اقبال کے " فلسفۂ آرزو " کا خلاصہ ھے :

چاھا جہان سے منظر فطرت بدل دیا — ھے کل جہان تابع فرمان آرزو

تشریحات بالا کی روشنی میں یہ بات پوری وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اصغر فکری طور پر اقبال سے بہت متاثر تھے لیکن انھوں نے جو فکر بھی قبول کی، اس میں اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے، اسے انتہائی شاعرانہ اند از میں، غزل کی تمام تر لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ پیش کیا۔ یہی اصغر کا کمال ہے ۔

اصغر اور اقبال کے اس موازنہ کو جناب رشید صدیقی کے درج ذیل اقتباس پر ختم کیا جاتا ہے جو میری طویل بحث کی مصدق اور اس کی مختصر و جامع ترین صورت ہے :

" اس سلسلے میں محض افہام و تفہیم کی خاطر میں ضمناً اقبال کا ذکر کر دینا چاہتا ہوں ۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے ، حاتم طائی کے کوہ ندا کی مانند وہ اپنی پہلی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں لا ڈالیں گے اور آپ سے کچھ نہ بن پڑے گا۔ اصغر سے رجوع کیجئے وہ آپ کے ساتھ ہو لیں گے۔ اقبال آپ کو سرمو ادھر ادھر نہ ہونے دیں گے ۔ اصغر سے آپ خود علیحدہ نہ ہوں گے ۔ اقبال کے یہاں موضوع فکر (تفہیم) اور دعوت عمل ہے اور اصغر کے یہاں تصورات جمیل اور دعوت دید ۔ اقبال حکومت کرتے ہیں اصغر رفاقت ۔ معنوی حیثیت سے دونوں جدا ہیں اور اپنی اپنی وادی کے امام ۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کے درو بست کے اہتمام (ترصیع) میں دونوں انتہائی احتیاط و صناعت کاری کو دخل دیتے ہیں اور سلیقہ و شرافت کو ہاتھ سے نہیں دیتے ۔"[1]

اب تک اصغر کا موازنہ ان شعرا سے کیا گیا ہے جن سے وہ ذہناً متاثر تھے ۔ لیکن اصل میں ان کا موازنہ ان معاصر شعرا سے ہونا چاہیے جنھوں نے اپنی شاعری کو غزل تک محدود رکھا اور جن کا شمار جدید غزل کے معماروں میں ہوتا ہے ---- یوں تو غزل کی اصلاح کا کام حالی کے زمانہ ہی سے شروع ہو چکا تھا اور غزل کے دامن کو موضوعات کے اعتبار سے وسیع کرنے اور اس کو غزل کا وقار اور نکھار بخشنے میں اکبر، حالی اور شاد عظیم آبادی نے بڑا کام کیا ہے لیکن جدید غزل کے معماروں میں جن شعرا کے نام خصوصیت سے لئے جاتے ہیں

۱۔ گنج ہائے گراں مایہ از رشید احمد صدیقی ۔ مطبوعہ آئینہ ادب لاہور ، طبع پنجم ۱۹۶۲ء ۔ ص ۱۲۸-۱۲۷

وہ حسرت ، فانی ، اصغر اور جگر ہیں ۔ بعض ناقدین نے ان کے ساتھ یگانہ اور فراق کو بھی شامل کیا ہے ۔ آئندہ سطور میں اصغر کا موازنہ ، فراق کے علاوہ باقی شعراء سے کیا جاتا ہے ۔ فراق کو اس لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ ان کو یہ مقام اصغر کے انتقال کے بعد حاصل ہوا ۔

اصغر اور حسرت :

جدید غزل کے بانیوں میں متفقہ طور پر پہلا نام حسرت کا لیا جاتا ہے یہ بھی تسلیم کیا جا چکا ہے کہ غزل کو اس کا کھویا ہوا بانکپن اور نکھار بخشنے اور زندگی کے بدلتے ہوئے حالات و اقدار کا ترجمان بنانے میں ، ان کا بڑا ہاتھ ہے ۔ یہ مجاہدہ حسرت نے اس وقت کیا جب غزل پر چاروں طرف سے یورش و یلغار ہو رہی تھی ، اسی لئے ناقدین نے ان کے خدمات کے اعتراف میں انھیں " رئیس المتغزلین ،، جیسے گران قدر خطاب سے نوازا ہے ۔ ان تمہیدی تصریحات کی روشنی میں ، اصغر کی انفرادیت اور جدید غزل گوئی میں ان کے مرتبہ کے تعیین کے لئے حسرت سے ان کا موازنہ ضروری ہو جاتا ہے ۔

حسرت کے کلام کے سرسری مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کے کلام میں وہ یکسانی اور ہمواری نہیں ہے جو اصغر کے کلام کا خاصہ ٔ خصوصی ہے ۔ عبدالشکورصاحب نے حسرت کو " عاشقانہ ، عارفانہ اور فاسقانہ اشعار کا عدیم المثال استاد[1] ،، کہا ہے ۔ اس سے ان کے مختلف النوع رنگ شاعری کا اندازہ ہوتا ہے ۔ انھوں نے خود بھی جا بجا مختلف اساتذہ ٔ قدیم سے کسب فیض کا دعویٰ اور اعتراف کیا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن — طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

اس فیض کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے کلام میں انتخابی خصوصیات کی جھلکیاں نمایاں ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی شاعری کا دامن فکر کی اس روایت سے ، جو میر و غالب اور بعض دوسرے شعراء کے کلام میں نظر آتی ہے ، خالی ہے ۔ اس حیثیت سے وہ اصغر ، فانی اور یگانہ سے پیچھے ہیں ۔ ان کی شاعری کی سطح ان کے معاصرین (اصغر ، فانی ، یگانہ) کی شاعری کی بلندی کو نہیں پہونچتی ۔ " ان کی بہترین شاعری بھی صرف وجدان کی مرہون منت ہے اور ظاہر ہے کہ صرف وجدان کے سہارے آج تک کبھی بڑی شاعری نہیں ہوئی ہے ۔ بڑی شاعری وجدان و فکر دونوں کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے[2] ۔،،

۱۔ حسرت مرتبہ عبدالشکور ۔ مطبوعہ انوار بک ڈپو لکھنئو ۔ طبع سوم ۔ صفحہ ۵۸

۲۔ حسرت کی عظمت از آل احمد سرور بحوالہ حسرت کی غزل مرتبہ مسرور کیفی ۔ مطبوعہ دارالادب لاہور ۔ صفحہ ۱۳۶

حسرت کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت ان کی رنگین نگاری ہے جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ؎

طرز مومن میں مرحبا حسرت — تیری رنگین نگاریاں نہ گئیں

مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے حسن و عشق کی رنگین نگاری میں مصحفی ، جرات ، مومن ، نظام رامپوری سب سے کسب فیض کیا ہے ۔ ان کی رنگین نگاری کا کمال وہاں دیکھنے کے قابل ہوتا ہے جہاں وہ شعر میں کوئی واقعہ یا معاملہ باندھتے ہیں ۔ ان کا جنسی محبت کا مطالعہ بڑا گہرا اور بھرپور ہے ۔ انھوں نے حسن و عشق کی معصوم چالیں اور گھاتیں بیباکانہ بیان کی ہیں جن میں تجربہ کی صداقت اور مشاہدے کی باریک بینی نے حسن و دلکشی پیدا کر دی ہے ۔ ان کی شعری تصویروں میں "حسن و عشق" کی نفسیاتی کیفیات اس چابکدستی اور شاعرانہ مہارت سے مصور کر لی گئی ہیں کہ واقعہ مجسم ہو کر نظروں کے سامنے آ جاتا ہے اور قاری اس کی رنگینیوں میں ڈوب جاتا ہے ۔ ان کی بیشتر تصویریں حسی و لمسی ہیں ۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے :

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہار حسن — آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے
مجھ سے وہ کھلیں کیا کہ نظر اٹھ نہیں سکتی — محجوب ہیں پہناش داماں میں لگے ہیں
بے باک تھا ز بسکہ مرا اضطراب شوق — شرما کے وہ کبھی ، کبھی جھنجلا کے رہ گئے
دل میں کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی — روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

یہ تمام تصویریں بڑی رنگین ، جاندار ، معصوم اور دلکش ہیں مگر ان کی بیباک گوئی اور برجستہ نگاری ، شائستگی و لطافت کے اعلیٰ معیار کا پاس و لحاظ کئے بغیر ، انھیں معمولی اور فوری جمالیاتی تاثرات کی تصویرکشی پر بھی اکساتی اور آمادہ کرتی ہیں اور وہ پورے خلوص سے انھیں بھی مصور کر لیتے ہیں ۔ مثلاً حسب ذیل اشعار دیکھئے کہ بہ تدریج ان کی سطح کس طرح گرتی جا رہی ہے :

بزم اغیار میں ہرچند وہ بیگانہ رہے — ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا
آہ کہنا وہ ترا پا کے مجھے گرم نظر — ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں
دیکھا جو مجھے گرم نظر بزم عدو میں — وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر
مجھے گرم نظارہ دیکھا تو ہنس کر — وہ بولے کہ اس کی اجازت نہیں ہے
ٹوکا جو بزم غیر سے آتے ہوئے انھیں — کہنے بنا نہ کچھ وہ قسم کھا کے رہ گئے
رشک سے مٹ مٹ گئے ہم دیکھ کر گرم نظر — غیر نے محفل میں جب انگلی دبائی آپ کی

اندھیرے میں وہ آ لپٹے تھے پہلے کس کے دکھوئیے ہیں کہ جب آخر مجھے دیکھا تو گھبرا کر کہا "تم ہو"

هم چھپ کے لیے بھی گئے ہاں آپ کے منہ کا کہتے ہی رہے آپ کہ دیجئے دے دیا ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

حائل تھی بیچ میں جو رزائی تمام شب اس غم سے ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

یہ رنگین نگاری ہمیں اصغر کے یہاں بھی نظر آتی ہے لیکن اصغر کی مہذب ، شائستہ اور باحیا طبیعت اس قسم کی تصویرکشی پر کسی طرح آمادہ نہیں ہو سکتی ۔"وہ جمالیاتی تاثرات کو تخیل کے رنگین شیشے میں ڈھالنے کے قائل ہیں" ۔ اول تو وہ روحانی کیفیات و قلبی واردات کی تصویرکشی کرتے ہیں مگر جب کبھی " حسن مجاز " کی اداؤں کی عکاسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کا " اشرافانہ مزاج " ان کو ایک خاص سطح سے نیچے آنے کی اجازت نہیں دیتا ---- اور وہ تصویر کی تزئین و رنگین کاری میں تخئیل کا گہرا رنگ شامل کر کے اس پر " ابہام اور پراسراریت " کا ایسا پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اس کی لطافت اور رومانیت بڑھ جاتی ہے ۔ تفصیلی بحث صفحات گزشتہ میں جا بجا کی جا چکی ہے اس لیے یہاں مثالوں سے گریز کیا جاتا ہے ۔

اصغر اور حسرت کی دوسری مشترکہ خصوصیت ، " فارسی تراکیب " کا استعمال ہے ۔ دونوں تسلیم لکھنوی کی نسبت سے سلسلۂ مومن سے منسلک ہیں اس لیے اپنے مکتب شاعری سے دونوں نے اکتساب فیض کیا ہے ۔ لیکن " ترکیب سازی " میں دونوں نے اپنی اپنی راہ الگ نکالی ہے ۔ دونوں کی تراکیب میں مومن کی تراکیب کی شیرینی اور گھلاوٹ ہے ۔ مگر حسرت کی تراکیب میں معنی کا وہ تنوع ، وہ شاعرانہ حسن ، مصورانہ شان اور شعریت نہیں ہے جو اصغر کی تراکیب میں نظر آتی ہے (یہ رائے حسرت کی ان تراکیب کو سامنے رکھ کر ، قائم کی گئی ہے جن کی ایک مختصر سی فہرست عبدالشکور صاحب نے " حسرت موہانی " میں دی ہے) جو کچھ کہا گیا ہے اس کی وضاحت و تفہیم کے لئے ذیل میں اصغر اور حسرت کی چند "فارسی تراکیب " درج کی جاتی ہیں :

حسرت	اصغر
سرگرم نیاز ، مایۂ عشرت بے حد ، سرگرم خود آرائی ، جفاهائے التزامی ، ساعد رنگین ، کشت خیال ، پامال نشاط شرمسار انتظار ، کامیاب عیش ، ترجمان شوق ، تغافل هائے بیجا ، نوازش ہائے پنہاں / دفور اشک پیہم ، روش حسن مراعات	راز خلقت هستی ، جان حسن ازل ، آفتاب نیم شبی دل شعلہ آرزو ، سراب تمنا ۔ نغمہ بے لفظ و بے صدا تبسم غمناک ، گریۂ خندان آرزو ، شعلہ عریان نغمہ خاموش الفت ، سکون بیتاب ، قطرۂ مضمور مزاج ، زبان بے نگہ ، نگاہ بے زبان ، نگہ فتنہ زا دل شورش ادا ، درد جان نواز

حسرت	اصغر
اکرام اقامت، زندان تمنا ، نگاہ کرشمہ بار ، آگاہ رعنائی داغ ناتمامی، تہذیب وضعداری ، بادۂ پس خوردہ، ادعائے ضبط غم ، عصیان نظری، میکش‌نا شکیبا،[2] چراغ رہ گزر باد -[1]	یورش شوق، نرگس خمار آلود چمنستان تمنا - شمع شبستان حرا عارض رنگین،

چوں کہ اس قسم کے مقابلہ و موازنہ پر کوئی فیصلہ کرنا ایک ذوقی و وجدانی چیز ہے اس لیے اس میں اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے - لیکن اگر دونوں کی ایسی تراکیب دوش بدوش رکھی جائیں جن میں کوئی لفظ مشترک ہو تو شاید فیصلہ میں زیادہ دشواری نہ ہو - اس لیے ذیل میں چند ایسی ترکیبیں درج کی جاتی ہیں :

حسرت	اصغر
سر گرم ناز	سر گرم تجلی (گرم اور تجلی کی رعایت نے زیادہ حسن پیدا کر دیا ہے)
ساعد رنگین	رخ رنگین (یہ زیادہ واضح ، دلکش اور مصورانہ ہے)
کامیاب عیش	کامیاب شوق (عیش کے ساتھ ، تعیش پرستی کا تصور ابھرتا ہے)

لیکن شوق میں حجاب اور جھجک قائم رہتا ہے - اس کے علاوہ صوتی اعتبار سے کامیاب عیش کے مقابلے میں کامیاب شوق کا آہنگ زیادہ خوشگوار ہے -

حسرت	اصغر
نوازش ہائے پنہاں	تبسم ہائے پنہاں

" نوازش ہائے پنہاں " بڑا معنی خیز ہے لیکن تبسم ہائے پنہاں کی " تصویریت " سے عاری ہے -

حسرت	اصغر
نگاہ کرشمہ بار	نگاہ بے زباں ، نگہ فتنہ زا

اصغر کی دونوں ترکیبیں زیادہ " خوش آہنگ " اور رواں ہیں، اس کے علاوہ معنویت کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں -

اسی طرح ان تراکیب کو دیکھئے :

حسرت	اصغر
زندان تمنا	چمنستان تمنا، سراب تمنا
آبشار آرزو	گرہ خندان آرزو

۱-۲، حسرت موہانی از عبدالشکور - مطبوعہ انوار بک ڈپو لکھنئو - طبع سوم - صفحہ ۷۳، صفحہ ۱۰۲

بہرحال بات ہے تو سخن گسترانہ ، مگر اس موازنہ کے بعد یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں رہا کہ اصغر کی تراکیب زیادہ شاعرانہ اور دلکش ہوتی ہیں ۔

یہ تو واضح ہوگیا کہ دونوں نے " فارسی تراکیب " کے استعمال سے اپنے کلام کی آرائش و تزئین ، کی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تراکیب کے " مصرف " اور استعمال کے فرق سے، دونوں کے اسلوب میں نمایاں اور بین فرق پیدا ہو گیا ہے ۔ حسرت نے ان تراکیب کو سادہ اور آسان زبان میں اس طرح پیوست کیا ہے کہ اس کی سادگی پر کوئی اثر نہیں پڑا اور اس کی شیرینی بڑھ گئی ہے ۔ اس کے برعکس اصغر نے رنگین اور مرصع الفاظ کے ساتھ ان کا ایسا پیوند لگایا ہے کہ زبان کی رنگینی اور مرصع کاری میں اضافہ ہوا ہے ۔ حسرت کا اسلوب ان کی ظاہری سج دھج کی طرح سادہ اور بے تکلف ہے ۔ اصغر کا ان کی وضع قطع کی طرح رنگین ، مرصع اور پرتکلف ، مگر تکلف و ساختگی کسی بے کیفی سے پاک ۔ حسرت کے اسلوب میں " زبان لکھنئو* " کے دعوے کے باوجود ، لکھنئو کی زبان کا وہ بانکپن اور رنگینی نہیں ہے جو اصغر کے یہاں ہے ۔ ہاں ان کا رنگ، رنگ دہلی سے یقیناً قریب تر ہے ۔ اصغر نے اپنا رنگ ، لکھنئو کی زبان کی رنگینی و مرصع کاری میں جذبہ کی تھرتھراہٹ اور تخیل کی رنگینی شامل کر کے بالکل منفرد اور علیحدہ تیار کیا ہے جسے لکھنئو اور دہلی کی طرز کا " ایک خوشگوار ترین امتزاج کہا جا سکتا ہے ۔

حسرت اور اصغر میں ایک خصوصیت اور بھی مشترک ہے ۔ وہ ہے ان کا " نشاطیہ لہجہ " لیکن جیسا کہ صفحات گزشتہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ حسرت کے " نشاطیہ لہجہ " کا سبب ان کی کامیاب جنسی و رومانی زندگی ہے اور اصغر کے نشاط و انبساط کا سرچشمہ ان کا روحانی کشف و مشاہدہ ہے ۔ اس لیے ان کا " نشاطیہ لہجہ " حسرت کے مقابلہ میں زیادہ بافرحت ، لطیف اور کیف آور ہے ۔ نیز ان کے لہجہ میں " نشاطیہ آہنگ " کے ساتھ ایک طرح کا " رجائی آہنگ " بھی شامل ہے ، جس سے حسرت کا لہجہ خالی ہے ۔

حسرت کی شاعری کی غالب لے " عاشقانہ " ہے لیکن اس میں " عارفانہ " لے بھی شامل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بعض عارفانہ غزلیں بڑی پراثر اور کیف آور ہیں ۔ مگر بحیثیت مجموعی ان کی شاعری کو " صوفیانہ شاعری " نہیں کہا جا سکتا ۔ ان

---

* ۔ ہے زبان لکھنئو میں رنگ دہلی کی نمود تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہوگا
(حسرت)

کی شاعری میں تصوف صرف بزرگان دین، صوفیائے کرام ، ائمہ اطہار اور رسالت مآب صلعم سے اظہار عقیدت کا نام ہے ۔ ان کے اس قسم کے کلام میں " جذبہ عقیدت " سے زیادہ " تک بندی " ہے اسی لیے کلام سپاٹ اور بے کیف ہو گیا ہے مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تا قیامت رہے قائم مرے سرکار کا باغ وہ جسے کہتے ہیں سب حضرت انوار کا باغ

خاص آرام گہ حضرت وہاب شہید شاہ رزاق کا والی شہ ابرار کا باغ

......

دستگیری کا طلب گار ہوں شیئاً للہ میر بغداد میں لاچار ہوں شیئاً للہ

......

خیال غیر کو دل سے مٹا دو یا رسول اللہ خرد کو اپنا دیوانہ بنا دو یا رسول اللہ

یہ کچھ انہیں اشعار کا حال نہیں ہے ۔ ان کی غزلیں کی غزلیں اسی رنگ میں ہیں ۔ حسرت کی اس قسم کی صوفیانہ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب عطاء الرحمن کاکوی نے بالکل درست فرمایا ہے :

" تصوف کلام میں سوز و گداز بھی پیدا کرتا ہے اور پھیکا پن بھی ۔ تصوف کی رمزیت اگر قائم رہی تو کلام معجز نظام ہوجاتا ہے اور سپاٹ تصوف کلام کو بھی سپاٹ بنا دیتا ہے ۔ حسرت کا کلام نعت و منقبت ان کے لئے وسیلہ نجات سہی ۔ مگر انہوں نے یہ " اوج " بڑی گراں قیمت پر خریدا ہے ۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ حسرت نے دوسرے قالب میں جنم لیا ہے .... پہلے وہ حسرت تھے آخر میں ایک دم " مولوی فضل الحسن " ہو کر رہ گئے ہیں [1]۔"

حسرت کے برخلاف اصغر کی شاعری میں عارفانہ رنگ غالب ہے ۔ ان کے یہاں صوفیانہ رموز و علائم استعمال ضرور ہوئے ہیں لیکن کلام سپاٹ اور بے کیف نہیں ہونے پایا اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی شاعری میں صوفیانہ اصطلاحات سے کہیں زیادہ سلوک و عرفان کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی کیفیات کا پاکیزہ و پرمزہ بیان ہے ۔ اس حیثیت سے اصغر کی شاعری زیادہ لطیف ، رفیع ، بامزہ، پرکیف اور پراثر ہے ۔

حسرت ، خالص غزل ---- " از زبان سخن گفتن " --- میں یقیناً اصغر سے بہت آگے ہیں ۔ انہوں نے " سوادی حسن " اور " جنسی محبت " کی جیسی بیباک ترجمانی

---

۱ ۔ " مطالعہ حسرت " از عطاء الرحمن کاکوی ۔ مطبوعہ عظیم الشان بک ڈپو ۔ پٹنہ ۔ بار اول ۱۹۶۶ء ۔ صفحہ ۵۵

کی ھے وہ اصغر کے بس کی بات نہیں ھے ۔ اصغر کے یہاں " جنسی محبت " کا شائبہ تک نہیں ۔ ان کا محبوب اس دنیائے آب و گل سے ماوراء ھے اور اس سے اصغر کے محبت کی نوعیت روحانی ھے ۔ یہی " روحانی محبت " ان کی شاعری کا موضوع ھے ۔ جب کہ حسرت کی شہرت کا تمام تر انحصار و مدار ان کی خالص جنسی و مادی عشق کی شاعری پر ھے ۔ جناب فضل القدیر نے حسرت کی شاعری پر مختصر مگر جامع الفاظ میں بالکل درست تبصرہ کیا ھے ۔ وہ لکھتے ھیں :

" حسرت کا کارنامہ خاص یہ ھے کہ انھوں نے داغ و جرات کی واقعیت اور مومن کی صوریت جز مشقیہ تجربات کی صداقت کو بڑے معصوم اور مہذب جمالیاتی شعور کے ساتھ پیش کیا ھے ۔ وہ سوادی حسن کے بھی بڑے بیباک ترجمان ھیں ۔ انھوں نے عشق کو ارضی اور زمینی سطح ھی پر رکھا ۔ جنسی صداقت کا بھی انھیں گہرا شعور ھے .... انھوں نے جرات و انشا کے جنسی رنگ کو نئے جمالیاتی مزاج کے ساتھ پیش کر دیا ھے ۔ ان کی واقعیت نے غزل کو پھر سے مانوس و گوارا ضرور بنایا لیکن وہ غزل کی سطح بلند نہ کر سکے[1] ۔ "

مختصر یہ کہ جہاں اس تقابلی مطالعہ سے یہ بات واضح ھوتی ھے کہ حسرت و اصغر کی شاعری میں بعض خصوصیات کے اشتراک کے باوجود ، دونوں کا رنگ و آھنگ جدا ھے ۔ وھیں یہ بھی ثابت ھو جاتا ھے کہ اگر حسرت نے غزل کو دوبارہ سنوار اور نکھار کر نیا رنگ روپ بخشا ھے تو اصغر نے بھی جدید غزل کو پاکیزگی ، نفاست ، رنگینی ، ذھنی شائستگی ، تفکر و تامل کی گہرائی اور گیرائی عطا کر کے ، حسرت سے کسی طرح کم خدمت انجام نہیں دی ۔

اصغر اور فانی :

اصغر کے دوسرے نامور معاصر فانی ھیں ۔ انھوں نے غزل کی آبرو بچانے اور اس کی سطح بلند کرنے میں بڑی خدمت انجام دی ھے ۔ ان کا شمار بجا طور پر " جدید غزل " کے ارکین خمسہ میں ھوتا ھے ۔ اس حیثیت سے ان کی شاعری سے ، اصغر کی شاعری کا موازنہ ناگزیر ھو جاتا ھے ۔

۱۔ اردو شاعری میں اصغر کی انفرادیت از فضل القدیر ۔ مقالہ ایم ۔ اے (اردو) ۔ ڈھاکا یونیورسٹی ۱۹۶۹ء ۔ صفحہ ۸۵-۸۳

فانی کی شاعری کا مطالعہ ذرا گہری نظر سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز تقلیدی و روایتی رنگ سے کیا ۔ رنگ لکھنؤ کی ہمہ گیری اور ابتدائی ایام میں قیام لکھنؤ نے ان کی شاعری کے لب و لہجہ کو خاصا متاثر کیا ہے ۔ لکھنوی زبان کی نوک پلک ، آرائش اور تزئین تو آخر دم تک قائم رہی لیکن دبستان لکھنؤ کے روایتی موضوع و مضامین کی سطحیت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی (اگرچہ ختم آخر دم تک نہیں ہوئی) یہاں تک کہ انھوں نے اپنا ایک انفرادی لب و لہجہ قائم کر لیا۔ لکھنوی رنگ کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں داغ کا اثر بھی نمایاں ہے اور یہ دونوں رنگ ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہو گئے ہیں کہ ان کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں کی آمیزش سے جو رنگ تیار ہوا ہے اس میں ایک نئی شان اور حسن پیدا ہو گیا ہے ۔ ذیل میں دونوں رنگوں کے الگ الگ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ۔ تاکہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ سمجھ میں آ سکے ۔

رنگ لکھنؤ :

الہیٰ آگ لگ جائے زمانہ کی دو رنگی کو
جنھیں نازک بدن سمجھو وہی پتھر نکلتے ہیں

مبارک فانی بسمل کہ تیری ذبح کرنے کو
نئی چھریاں نکلتی ہیں، نئے خنجر نکلتے ہیں

طوق منت کے بڑھا ہو گئی منت پوری
بیڑیاں موت نے کاٹیں ترے دیوانوں کی

وہ من شکایت پر چپ کھڑے ہیں محشر میں
بت انھیں بناپایا اب خدا خدا کر کے

غرور حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

رنگ داغ :

تم کیوں گئے تھے آئینہ خانہ میں بےحجاب
اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی

مرا قتل ان کے ہاتھوں یہ سب تو باتیں
کچھ ان کے منہ کی ہیں کچھ نامہ بر کی

مانا حجاب دید میں بیخودی ہوئی
تم وجہ بیخودی نہیں، یہ ایک ہی ہوئی

قلب و جگر کے درد کاپھر کس کو ہوش تھا
جب اس نے مسکرا کے یہ پوچھا "کہاں، کہاں"

شکوہ ہجر پہ سر کاٹ کے فرماتے ہیں
اب کرو گے کبھی اس منہ سے شکایت میری

اس قسم کی شاعری میں ایک طرح کا باسی پن ہے ۔ یہ اردو شاعری میں کوئی نئی آواز نہیں معلوم ہوتی ---- اصغر کے یہاں یہ رنگ شاعری کسی مرحلہ و منزل میں نظر

نہیں آتا۔ ممکن ہے ابتدائی زمانہ کی شاعری میں (جو ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہوگئی) یہ یا اسی قسم کا کوئی روایتی رنگ رہا ہو ۔ لیکن اب جو کلام موجود ہے، وہ اس قسم کے اشعار سے پاک ہے ۔

اصغر اور فانی کی شاعری میں ایک نمایاں فرق اور ہے اور وہ یہ کہ حسرت کی طرح فانی کے یہاں بھی تغزل اور " معاملہ بندی" میں بے باکی ہے ۔ یہ بے باکی عکاسی میں بھی ہے اور زبان و بیان میں بھی ۔ مثلاً فانی شعرائے لکھنؤ کی طرح بعض ایسے الفاظ و محاورات استعمال کر جاتے ہیں جو کسی زمانے میں بے تکلف دوستوں کے درمیان رائج تھے لیکن اب نہ صرف یہ کہ وہ کانوں کو بھلے نہیں معلوم ہوتے بلکہ ان میں ایک طرح کی سوقیت و ابتذال پیدا ہو گیا ہے ۔ اصغر کے یہاں اس قسم کے الفاظ کا استعمال بالکل نہیں ہے ۔ مثلاً ان اشعار کا " لہجہ " " زبان" اور " تیور" دیکھئے :

خفا نہ ہو تو یہ پوچھیں کہ " تیری جان سے دور "

جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

اب انہیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے

" چشم بد دور" دلھن ہی کے شباب آتا ہے

یکتائے زمانہ ہونے پر " صاحب " یہ غرور خدائی کا

سب کچھ ہو مگر " خاکم بدہن" کیاکوئی خدا ہوجاتا ہے

" دشمن جاں" تھے تو جان مدعا کیوں ہو گئے

تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول گئے

وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں

کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

محشر ہے یہی قتل شہیدان وفا کا

جلاد کی چتون ہے جو شرمائی ہوئی سی

نہ بن پڑا کوئی عذر جفا کسی سے تو ہائے

ادا وہ پیار ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی

جب ذرا پردے سے جھانکا بجلیاں گرنے لگیں

ہے یہ کوئی دیکھنے میں " بندہ پرور " دیکھنا

اصغر نے بھی معاملہ باندھا ہے لیکن بہت ہی لئے دئے انداز میں - وہ ہر " معاملہ " کے دوش بدوش کسی حسین و خوبصورت " موضوع فطرت " (Object of Nature) کی تشبیہہ و تمثیل رکھ کر، ایک طرف " معاملہ " سے ابھرتی ہوئی " جسمانیت و مادیت " کو چھپا دیتے ہیں، دوسری طرف تشبیہہ و تمثیل کی متبادل و متوازی تصویر کی رنگینی سے اس کے حسن میں اضافہ کر دیتے ہیں - اصغر کی اس خصوصیت سے مقالہ ھذا میں جا بجا تفصیلی بحث کی جا چکی ہے ، یہاں دونوں کے مزاج ، لہجہ اور رنگ کے فرق کو واضح کرنے کے لئے صرف چند اشعار نمونۃً درج کئے جاتے ہیں - مثلاً دونوں کے کلام سے " تبسم " کی مثال دیکھئے :

فانی	اصغر
اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی	یہ حسن کی موجیں ہیں یا جوش تبسم ہے
دیکھوں تری ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی	اس شوخ کی ہونٹوں پر اک برق سی لرزاں ہے
	رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
	شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی
	روشنی ہو جگنو کی جیسے شبستاں میں
	وہ مہتاب کا عالم اس کے مسکرانے سے

اب ذرا " حیا " پر دونوں کے دو دو اشعار سن لیجئے :

فانی	اصغر
اب انہیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے	لالہ و گل پہ جو ہے قطرۂ شبنم کی بہار
چشم بدور دولھن بن کے شباب آتا ہے	رخ رنگیں پہ جو آئے تو حیا ہو جائے
تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول گئے	اس عارض رنگیں پر عالم وہ نگاہوں کا
وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے	معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

اصغر کے اشعار، فانی کے اشعار کے مقابلے میں، رنگینی ، شعریت ، معنویت اور تصویریت میں بہت بلند ہیں پھر ان کے بیان میں جو لطافت ہے وہ فانی کے اشعار میں نہیں ہے -

فانی کی شاعری کو موضوعات کے لحاظ سے دو بڑی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : (۱) عاشقانہ اور (۲) صوفیانہ

فانی کی عشقیہ شاعری، روایتی عشقیہ شاعری سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے - ان

کی شاعری میں نہ " جنسی محبت " کی وہ مہذب و شائستہ کیفیت ہے جو حسرت کی شاعری کی خصوصیت خاصہ ہے اور نہ تجریدی محبت کی وہ نزہت و لطافت ہے جو اصغر کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے ۔ حسرت کا محبوب ، صنف لطیف کا ایک عام فرد معلوم ہوتا ہے جس کے انداز و اطوار معمولی اور جس کی ادا ہائے محبت عام انسانوں کی ہوتی ہیں ۔ اور جب حسرت اس کی ادا ہائے دلستاں کی تصویرکشی کرتے ہیں تو یہ تصویریں ہمارے روزانہ کے مشاہدہ و تجربہ سے قریب تر ہونے کے باوجود اپنی فطری تازگی و رنگینی کی وجہ سے دلکش رہتی ہیں ۔ اصغر کا محبوب اس دنیائے آب و گل سے ماوریٰ عالم بالا کی ہستی معلوم ہوتا ہے لیکن وہ اس کا تذکرہ بڑے لطف و لذت اور اس کے " حسن و ادا " کا ذکر بڑی شیفتگی و وارفتگی سے کرتے اور اس کی " دید " میں اس درجہ محو و گم ہو جاتے ہیں کہ اپنے " آپ " کو بھی بھول جاتے ہیں ۔ اس بیخودی و گم شدگی میں ان کی زبان سے جو مستانہ نغمے نکلتے ہیں وہ قاری پر بھی رقص و مستی اور بے خبری و بیخودی کی کیفیت طاری کر دیتے ہیں ـــــ لیکن فانی کا " محبوب " ان دونوں کے محبوب سے مختلف ہے ان کے یہاں محبوب کے تصور کے ساتھ ہی لہو، قاتل، صیاد ، جلاد ، میت و جنازہ ، کافور و کفن اور شمشیر و خنجر کے الفاظ و تصورات کچھ اس طرح چمٹے ہوئے چلے آتے ہیں کہ ان کی عام شاعری دبستان لکھنؤ کی قدیم "روایتی شاعری " اور " جدید غزل " سے تھوڑے ہی فاصلہ پر رہ جاتی ہے ـــــ یعنی اگر فانی کی شاعری سے کسی طرح تفکر کی " گہری سنجیدگی " اور " ذاتی غم " کی آنچ کو نکال لیا جائے، تو لکھنؤ کی " جدید غزل " کا مثیل بن جائے گی ۔

رہی فانی کی صوفیانہ شاعری تو یہ ان کے فطری رجحان سے زیادہ ان کی طبیعت کی مایوسی و محزونی کی تسکین کا سبب و نتیجہ معلوم ہوتی ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی مغموم و محزون طبیعت نے صوفیانہ مضامین ـــــ نفی خودی ، ترک، مرگ ، جبر و اختیار ـــــ میں اپنے لیے پناہ اور اپنی تسکین کا سامان تلاش کیا ہے اور ان مضامین کو اپنے لئے مخصوص و محفوظ کر لیا ہے ۔ لیکن چونکہ یہ مضامین بھی اردو شاعری کے لئے نئے نہیں ہیں اس لیے یہاں بھی فانی کی شاعری روایت و تقلید سے کاملاً آزاد نہیں رہ سکی ۔ سوا ذاتی غم کی چاشنی اور فنی و شاعرانہ مہارت و بلاغت کے جو ان کے کسب و ریاض کا نتیجہ ہے ۔ ان مضامین کے علاوہ ان کے بیشتر صوفیانہ خیالات و مضامین روایتی، کتابی اور فکری ہیں۔ ان کی عارفانہ غزلوں میں حسن و عشق اور ان کے ربط وتعلق کی فلسفیانہ توجیہات ہیں، ان میں

جذبہ کی وہ تپش اور تپک نہیں ہے جو " تجربہ " سے آتی ہے ۔ ان کا تصوف دماغی و فکری ہے جذباتی اور روحانی نہیں ۔ تصوف کے لئے جس مزاج و رجحان ، جس تربیت و تہذیب نفس اور جس وسعت قلب و نظر کی ضرورت ہے فانی کے یہاں اس کا سراغ نہیں ملتا۔ انھوں نے " زندگی " کو " موت " کے وسیلہ سے سمجھا ہے اس لیے ان کے یہاں صوفیا کی طرح زندگی کے تسلسل و دوام اور انقلاب حالات پر یقین نظر نہیں آتا۔ ان کے نزدیک زندگی ایک " اندھی جبریت " کے تابع ہے جس میں آنسوؤں اور آہوں کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ دیکھئے اس نظریہ کا انداز بیان کتنا رالبھادہ ہے:-

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں — ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

ہر نفس آہ اور انفاس پہ جینے کا مدار — زندگی آہ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد — مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں — اک بے قرار تڑپا اک دل فگار رویا

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی — زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

فانی کے برخلاف اصغر مزاجاً بھی صوفی تھے اور عملاً بھی ۔ وہ ایک سلسلہ حقہ سے منسلک اور صاحب کشف و حال تھے ۔ انھیں سلوک و معرفت کے وسیلہ سے زندگی کا صحیح عرفان حاصل ہوا تھا۔ ان کے نظریہ کے مطابق کائنات ایک " حسن بسیط " اور زندگی ایک " ازلی و ابدی حقیقت " ہے ۔ زندگی کا ہر بدلتا ہوا لمحہ ایک نئی زندگی کا پیامی اور ایک نئے " حسن " کا موجب ہوتا ہے ---- ان کے اس نقطۂ نظر نے ان کے مزاج میں نشاط ، مسرت ، طمانیت ، پرامیدی اور " حسن بینی " کی کیفیت پیدا کر دی تھی ۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں ان کے انھیں مزاجی خصائص کا عکس ملتا ہے ۔ اصغر کے درج ذیل اشعار کا فانی کے محولہ بالا اشعار سے مقابلہ کیجئے تو دونوں کی افتاد ذہنی اور نقطۂ نظر کا صحیح ادراک ہو سکے گا :

یہ حسن دوست ہے اور التجائے جانبازی — تجھے یہ وہم کہ یہ کائنات عالم ہے

تو بہت سمجھا تو کہہ گزرا فریب رنگ و بو — یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہ ناز ہے

کس طرح حسن دوست ہے بے پردہ آشکار — صدہا حجاب صورت و معنی لئے ہوئے

ہر ہر قدم پہ جلوہ رنگیں ہے دو بہ دو — خود تنگی نگاہ جو زنجیر پا نہ ہو

چھایا ہوا ہے ہر دو جہاں میں جمال دوست — اے شوق دید چشم بھی اب وا ہو یا نہ ہو

....

جستجو ہے زندگی ذوق طلب ہے زندگی ‏ ‏ زندگی کا راز لیکن دوری منزل میں ہے

لذت جوش طلب، ذوق نگاہ دوام ‏ ‏ ورنہ ہم شوریدگان شوق کی منزل کہاں

خوب جی بھر کے اٹھالے جوش وحشت کے مزے ‏ ‏ پھر کہاں یہ دشت ، یہ ناقہ کہاں ، محمل کہاں

کیوں شکوہ سنج گردش لیل و نہار ہوں ‏ ‏ اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

فانی نے بھی حسرت اور اصغر کی طرح اپنی تمامتر شاعری کو فارسی تراکیب سے زینت بخشی ہے ۔ حسرت نے ان کی مدد سے زبان میں رنگینی و شیرینی پیدا کی ہے ، لیکن اصغر و فانی نے رنگینی و شیرینی کے ساتھ ، معنویت اور فکری تعمق بھی پیدا کیا ہے ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی کوششیں مشکور و کامیاب ہوئی ہیں ۔ اصغر کی طرح فانی کے یہاں بھی " غالب کے انشائے خصوصی یعنی فارسی کے نامانوس محاورے ، ثقیل ترکیبیں اور عربی کے لغات غریبہ بالکل ناپید ہیں[1] "۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو فانی کی فارسی تراکیب ، غالب کی تراکیب سے زیادہ گوارا اور پاکیزہ ہونے کے باوجود ان سے قریب تر ہیں ۔ جب کہ اصغر کے یہاں شیرینی، رنگینی اور شعریت پر زیادہ زور ہے ----- اس لحاظ سے فانی کی مرصع اور ترکیب آمیز زبان میں رنگینی تو ہے لیکن وہ شیرینی و حلاوت نہیں ہے جو اصغر کی زبان میں ہے ۔ اس کے علاوہ فانی کی تراکیب کی معنوی تہیں ، اصغر کی تراکیب کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ اور دقیق ہیں ۔ اس لیے ان کے یہاں فکر و تامل کا غلبہ نسبتاً زیادہ ہے کہیں کہیں تو فکر کی دھند بھری کی پوری غزل پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ جذبات و حسّیات کی گرمی اور لپک اس میں دب کر رہ گئی ہے ۔ اصغر کے یہاں ایسا نہیں ہے ۔ ان کے یہاں جہاں تہاں کوئی شعر سپاٹ ہو گیا ہو تو اور بات ہے ۔ ورنہ شروع سے آخر تک " فلسفہ بافی "، کہیں نظر نہیں آتی ۔ وہ " فکر و تخیل "، کو زیادہ تر اشعار میں رنگینی پیدا کرنے کے لیے کام میں لاتے ہیں ۔ ان کے اشعار صرفاً " عمیق تفکر "، کی بے کیفی و یبوست سے پاک ہوتے ہیں ۔ فانی کی فارسی تراکیب سے ان کی غزلوں میں پیدا ہونے والی جس خصوصیت کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، وہ درج ذیل اشعار سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے :

میں ہوں اک مرکز ہنگامۂ ہوش ورم ہوش ‏ ‏ دل اگر عالم مستی ہے تو سر عالم ہوش

عدم ہوش پہ ہے فطرت ہستی مائل ‏ ‏ کس توقع پہ اٹھائے کوئی ناز غم ہوش

۱۔ اقتباس از عبارت رشید احمد صدیقی بحوالہ انتخاب کلام فانی ۔ مرتبہ شاہد علی خان آزاد کتاب گھر ۔ دہلی ۔ صفحہ ۱۲

بیخودی، مایۂ عرفان خودی ہے یعنی	محرم جلوۂ اسرار ہے، نامحرم ہوش
مظہر ہستی و خلاق عدم ہے مری ذات	کچھ نہ تھا ورنہ بجز سلسلہ برہم ہوش

....

چراغ کشتۂ آرام گاہ بے نشانی ہوں	میں رسوائے پریشان فنا ہوں یعنی فانی ہوں
خلوص ربط مرگ و عشق میں کچھ شک نہیں لیکن	عزیز خاطر نامہربان سخت جانی ہوں

ان اشعار کے علاوہ فانی کی کچھ اور تراکیب ذیل میں درج کی جاتی ہیں تاکہ ان کی فارسی تراکیب کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے واضح ہو سکے -

عالم امکان تمنا، خواب زلیخائے محبت، معتقد اہل ہوش، دلیل گمرہی چشم و گوش، رسوائے جوش حیرت، جواب بے سوال، سوال بے جواب، ستم رسیدۂ آوازۂ بسمان، آہ الامان انجام، جاودان بے آغاز، آغاز جاودان انجام، قبر بے نشان انجام، خراب لذت دیدار یار، چشم و چراغ جنون، مجموعۂ ذرات صحرا بسیز، تصویر گرد باد وفا، نقطۂ موہوم اتصال، عقل غم فروش فراغت دعا، حساب حسرت جرم نظارہ، مجبور تماشائے سراب -

ان تمام محولہ بالا تراکیب کو اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بیشتر غالب کی تراکیب کی طرح طویل الذیل اور تہ دار ہیں، لیکن ان میں وہ شیرینی اور شعریت نہیں ہے جو اصغر کی تراکیب میں ہے (اصغر کی تراکیب کی تفصیلی بحث مقالہ ہذا صفحہ ۵۲۱-۵۲۸ پر ملاحظہ فرمائیے)

اصغر اور فانی کے اسلوب میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ فانی جب رنگ میر میں لکھنے پر آتے ہیں تو ان کی سادہ نگاری سہل ممتنع کی حدیں چھونے لگتی ہے - اس رنگ میں وہ بے دھڑک ہندی کے ملائم اور رسیلے الفاظ استعمال کرتے ہیں ---- اس طرح فانی کے دو مختلف رنگ ہیں، ایک سادہ و آسان، دوسرا مرصع و رنگین - اصغر کے یہاں شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ ہے (سوا دو ایک غزلوں کے) - مرصع و رنگین -

فانی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے میر و غالب کے رنگ کو ایک دوسرے میں سمو کر اس میں اپنے ایک مستقل فکری میلان ---- غم پسندی اور یاسیت کے شوخ اور ہلکے چھینٹے شامل کر کے اپنا ایک نیا رنگ نکالا ہے جس کی فضا اسلوبی سجاوٹ اور رنگینی کے باوجود ماتمی اور حزنیہ ہے - لیکن ان کا حزنیہ لہجہ میر کے لہجہ سے مختلف ہے - میر کے لہجہ میں صرف الفاظ نرم و ملائم ہوتے ہیں اور غم کی زیریں لہر ان سے ایسی دست و گریبان ہوتی ہے کہ الفاظ و مضمون کا مجموعی اثر نشتر کی طرح دل میں اتر جاتا ہے -------

فانی لفظوں کی آرائش اور سجاوٹ سے غم ناک فضا کی تیاری میں مدد لیتے ہیں، لیکن ان کا غم قاری کے اوپر چپکے سے اس طرح حملہ آور نہیں ہوتا جیسے میر کا ۔ ان کے یہاں اثر تک پہونچنے کے لیے راستہ سے لفظوں کا جال ہٹانا پڑتا ہے ۔ بالفاظ دیگر فانی غمناک فضا کی تیاری میں، دل سے زیادہ دماغ سے کام لیتے ہیں ۔ ان کا غم فکری اور ذہنی ہے ۔ میر کا جذباتی ---- فانی کے اسلوب کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کی وضاحت شاید حسب ذیل اشعار سے ہو سکے :

دل ہے وہ طاق غم کدۂ عمر دوش کا ۔ رکھی ہے جس میں شمع تمنا بجھی ہوئی

ہر نفس عمر دو روزہ کی ہے میت فانی ۔ زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

مری حیات ہے محروم مدعائے حیات ۔ وہ رہ گزر ہوں جسے کوئی نقش پا نہ ملا

دل میں سما کے پھرگئی آس بعد ها کے پھرگئی ۔ آج نگاہ یار نے کعبہ بنا کے ڈھا دیا

نامرادی حد سے گزری حال فانی کچھ نہ پوچھ ۔ ہر نفس ہے اک جنازہ آہ بے تاثیر کا

دل کی مفارقت کو کہاں تک نہ روئیے ۔ اللہ ایک عمر کا ساتھی بچھڑ گیا

ان تمام اشعار کی فضا سوگوارانہ ہے لیکن ان میں الفاظ کے رچاؤ اور رنگینی پر نظر پہلے جاتی ہے غم کی لہر براہ راست دل سے نہیں ٹکراتی ------ فانی کے برعکس اصغر کا لہجہ نشاطیہ ہے ، جس طرح فانی نے " غم " کے ساتھ کسی اور رنگ کی آمیزش کو شرک سمجھا ہے، اسی طرح اصغر نے بھی نشاطیہ لہجہ اور آہنگ کے ساتھ، حزنیہ رنگ و آہنگ کی شمولیت کو گوارا نہیں کیا ---- فانی کی " حزنیہ لے " میں الفاظ کی تراش خراش، نوک پلک ، رنگینی اورمرصع کاری ، پرتکلف معلوم ہوتی ہے ---- ایسے ہی جیسے کوئی رونے کے لیے سرتال کا اہتمام کرے ، اس کے برعکس اصغر کے " رنگ " میں یہ چیزیں نہ صرف یہ کہ پرتکلف نہیں لگتیں بلکہ عین فطری معلوم ہوتی ہیں ۔

فانی اور اصغر کی شاعری کا اصل اور بنیادی فرق ، دونوں کے مزاج و شخصیت کا فرق ہے ۔ فانی کی زندگی کچھ* تو غم میں گزری ، جس نے ان کی طبیعت کو غم پسند بنا دیا، کچھ ان کی " مُحزنی طبیعت " نے غم کو ان پر طاری و مسلط کر دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فکری و جذباتی دونوں حیثیتوں سے " غم پسند اور قنوطی " ہو کر رہ گئے ۔

---

* ۔ ایسے تاریخی شواہد ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ فانی کی ابتدائی زندگی اچھی خاصی عیش و عشرت اور خوش حالی میں گزری تھی ۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے خلیل الرب صاحب کا مضمون " فانی کے نظریۂ حیات کا ان کی شاعری پر اثر " -- فانی مرتبہ عبدالشکور ۔ کتابی دنیا۔ لمیٹڈ ۔ دہلی ۔ بار اول ۱۹۳۷ء ۔ صفحہ ۱۰۳)

ان کی نظر ہمیشہ زندگی کے تاریک پہلو پر رہتی ۔ اس کے برخلاف اصغر زندہ دل ، خوش طبع اور خوش باش تھے ، تصوف کی تعلیم اور سلوک و معرفت کی عملی تربیت نے ، ان کی اس مزاجی کیفیت کو مزید جلا بخشی ـــ ان کی پرنشاط طبیعت ہر چیز میں مسرت و شادمانی ہی کا پہلو تلاش کرتی ــــ مزاجوں کا یہی اختلاف ان کی شاعری میں بھی ظاہر ہوا ہے ، یعنی ایک ہی طرح کی بات کہنے کے لئے جب بھی دونوں نے زبان و بیان کا کوئی اسلوب اختیار کیا ہے یا الفاظ کے تانے بانے سے کوئی شعری پیرہن تیار کیا ہے ، تو وہ قطعاً ایک دوسرے سے مختلف رہے ہیں ۔ ایک (فانی) کی فضا بیشتر ماتمی و سوگوارانہ اور لے حزنیہ اور دوسرے (اصغر) کی پربہجت و انبساط اور لے نشاطیہ رہی ہے ۔

یہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے تاہم آئندہ سطور میں ، جا بجا اس کی طرف بھی اشارے کئے گئے ہیں ۔

اصغر اور فانی کی اس تقابلی بحث کو ختم کرنے سے پہلے اگر جناب مجنوں گورکھپوری کے درج ذیل مبالغہ آمیز اقتباس سے بغیر تعرض و تبصرہ گزر جایا جائے تو اصغر کی شاعرانہ حیثیت دھندلا اور دب کر رہ جائے گی اس لیے ضروری ہوا کہ اسے نقل کر کے اس کی روشنی میں ان کی صحیح حیثیت متعین کی جائے ۔

جناب مجنوں فانی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

" ان کی شاعری کی " فکری کائنات ،، سے بالکل قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو بھی وہ اپنے رنگ کے تنہا شاعر ہیں ۔ میر سے لے کر امیر تک اردو غزل کا جو ترکہ رہا ہے اس کا بہترین حصہ فانی کے حصہ میں آ گیا ۔ ان کے اسلوب میں جو تربیت یافتہ نزاکتیں اور صدیوں کی رچی ہوئی بلاغتیں ہیں اور ان کی زبان میں پشت ہا پشت کا جو کمایا ہوا نکھار ہے اور ان کے لہجہ میں جو پرگداز متانت اور گہری سنجیدگی ہے وہ اردو غزل کی دنیا میں بہت کم شخصیتوں کو نصیب ہوتی ہے ۔ ایسی گہری شعریت اور بلیغ نغمگی کم سے کم نئے دور میں ہم کو کسی دوسرے غزل گو شاعر کے کلام میں نہیں ملتی ۔[1] ،،

---

۱ ۔ فانی بدایونی بحوالہ نقوش و افکار از مجنوں گورکھپوری ۔ صفیہ اکیڈمی کراچی ۔ طبع اول ۱۹۶۶ء ۔ صفحہ ۱۰۱-۱۰۰

محولہ بالا اقتباس پر کاملاً دہ تبصرہ کی یہاں گنجائش ہے نہ اس کی ضرورت ہے تاہم دو باتوں کی طرف اشارہ ضروری ہے :

اول یہ کہ کسی شاعر کا شاعرانہ مرتبہ متعین کرتے وقت اس کی " فکری کائنات " کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اگر فانی کی فکری کائنات محدود ہے (اور یقیناً محدود ہے) تو ان کا شمار بڑے شاعروں میں نہیں ہو سکتا ۔

دوم مجنوں صاحب کا یہ فرمانا کہ " اسلوب کے اعتبار سے بہت کم لوگ ان کے مقابلہ میں آ سکتے ہیں نیز یہ کہ "بلیغ دھنگی اور شعریت " میں کوئی جدید شاعر (دور فانی کا) ان کے مرتبہ کو نہیں پہونچتا " ۔ اس میں مجھے کلام ہے ۔ موصوف کی یہ رائے جانبدارانہ اور انتہا پسندانہ ہے ۔ دوسرے شاعروں کے متعلق یہاں کچھ کہنے کا موقع نہیں ہے ، البتہ اصغر کو ان شعراء میں شامل کر کے، مجنوں صاحب نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ

" معنوی حیثیت سے اصغر فانی سے کہیں بہتر شاعر ہیں رہا اسلوب تو حقیقت تو یہی ہے کہ وہ اس میں بھی بڑھے ہوئے ہیں تاہم اگر محتاط سے محتاط الفاظ میں کہنے کی کوشش کی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ اصغر اگر فانی سے بہتر نہیں ہیں تو کمتر بھی نہیں ہیں ۔"

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مجنوں صاحب کی رائے سے اختلاف صرف جواب دعویٰ کے طور پر نہیں کیا گیا ہے بلکہ محکم دلائل کی بنا پر کیا گیا ہے ۔

اول دلیل تو وہی تقابلی جائزہ ہے جو صفحات گزشتہ میں پیش کیا جا چکا ہے جس میں جا بجا یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اصغر فانی سے بہتر شاعر ہیں۔

دوم یہ کہ ذیل میں دونوں کے کلام سے ہم مضمون و متحد المعنی اشعار کی ایک بڑی تعداد دوش بدوش پیش کی جاتی ہے (ان میں دو تین اشعار کی تشریح بھی کی گئی ہے) تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ اصغر بہتر ہیں ۔ اس محل پر اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ مطالعہ "کلیات فانی کے وقت پہلے فانی کے اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے ۔ اصغر کے اشعار بعد میں مگر ساتھ ہی ساتھ ذہن میں آتے گئے ہیں --- ایسا بہرحال نہیں ہوا کہ پہلے اصغر کے اعلیٰ اشعار منتخب کر لئے گئے ہوں، بعد میں فانی کے پست اشعار ان کے مقابل لکھ دئے گئے ہوں ۔ اس اظہار حقیقت کے بعد اب اشعار پیش کئے جاتے ہیں :

اصغر	فانی
	شعر نمبر ۱ -
دل پہ لیا ہے داغ عشق کھو کے بہار زندگی	شدر درد دل غم دنیا کیا
اک گل تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا	اک مٹایا داغ اک پیدا کیا

مندرجہ بالا دونوں اشعار بظاہر ہم معنی نظر آتے ہیں - دونوں میں بنیادی طور پر عشق کو دنیا اور اس کی زندگی پر ترجیح دی گئی ہے - لیکن اگر ان پر الگ الگ غور کیا جائے تو اصغر کا شعر اپنی معنویت ، شعریت ، رنگینی ، ترنم ، الفاظ کے درو بست اور کیف و اثر میں فانی کے شعر سے کہیں زیادہ ارفع و بلند ہے - اور اپنے لہجہ اور آہنگ کی بنا پر اردو غزل میں بالکل نئی آواز معلوم ہوتا ہے - ذیل میں دونوں اشعار کی تشریح کی جاتی ہے -

فانی کے شعر میں، دونوں مصرعوں کے درمیان معنوی سقم ہے - شعر میں کلیدی لفظ " شدر " ہے لیکن اس کے موزوں اور صحیح استعمال نہ ہونے کی وجہ سے شعر، شعریت سے عاری و محروم ہو کر ایک سیدھی سادی اور معمولی سی بات میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے ـــــ مصرعہ اولیٰ میں " شدر " جس رخ سے باندھا گیا تھا اس کا تقاضا تھا کہ " درد دل " کو ترقی دے کر " غم دنیا " سے بہتر ثابت کیا جاتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مصرعہ اولیٰ میں " درد دل " کو جس بلندی پر لے جایا گیا ہے، مصرعہ ثانی میں اس کو مزید ترقی دینا تو رہا ایک طرف وہ بلندی بھی قائم نہیں رہ سکی اور وہ ایک دم سے " غم دنیا " کی زمینی سطح پر آ کر صرف " داغ " رہ گیا ہے ـــــ اس تشریح کے بعد شعر کی حقیقت صرف اتنی رہ جاتی ہے کہ " درد دل اور غم دنیا دونوں داغ ہیں، میں نے غم دنیا کا داغ مٹا کر درد دل کا داغ اپنایا ہے " اس میں موزونیت کے علاوہ شاعری کہاں ہے - اس میں نہ لفظی حسن ہے نہ معنوی محاسن

فانی کی ساختہ ، مغموم اور سوگوار شخصیت اس شعر میں پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے - یعنی شعر میں " درد دل " ، " غم دنیا " ، " داغ " تین تین الفاظ جمع کرنے کے باوجود وہ سوگوارانہ فضا نہ پیدا ہو سکی جو ہونا چاہیے تھی البتہ آخری مصرعہ میں " اک مٹایا داغ اک پیدا کیا " میں کسی قدر افسوس اور بےبسی ہے۔ پھر بھی اس میں غم کی وہ کیفیت و نشتریت نہیں ہے جو دل میں اتر جائے -

اب اصغر کا شعر دیکھئے :

ان کے شعر کے دونوں مصرعوں میں، فانی کے شعر کے برعکس، گہرا معنوی ربط ہے -

مصرعہ اولیٰ کے ابتدائی ٹکڑے میں جو بات کہی گئی ہے وہ زینہ بہ زینہ ترقی کرتی ہوئی مصرعہ ثانی کے آخری بول پر اپنی انتہائی بلندی کو پہنچ جاتی ہے ---- ذیل میں مضمون کی تدریجی اور منطقی ترقی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے ۔

شعر میں بات کی ابتدا " بہار زندگی " کو کھو کر " داغ عشق " کے لینے سے ہوئی ہے لیکن جب منطقی ربط قائم کیجئے اور معنی کی تہیں کھولئے تو سمجھ میں آتا ہے کہ " بہار زندگی " کو کھو کر جو " داغ " لیا جائے گا، اسے کوئی بہت وقیع و گراں قدر متاع ہونا چاہیے ۔ چنانچہ شعر میں ایک بہت ہی جامع اور بلیغ لفظ " لیا " ایسا رکھ دیا گیا ہے جس میں کشادہ آغوشی ، خندہ روئی اور ہمک کے معنی پنہاں ہیں، ان سے " داغ عشق " کی " عظمت اور گراں قدری " ثابت ہو جاتی ہے ۔ پھر دوسرے مصرعہ میں اسی " داغ عشق " کو " گل تر " --- " حاصل چمن " (حاصل زندگی اور خلاصۂ کائنات) کہا گیا تو معنوی اعتبار سے مضمون میں اور ترقی ہوئی، اور " داغ عشق " کی وقعت و عظمت اور قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ۔ بات کو یہیں نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ ایسی " متاع گراں بہا " کے " لینے " پر ، لینے والے کو جو روحانی مسرت حاصل ہونا چاہیے ، اس کا اظہار بھی " میں نے چمن لٹا دیا " کے ٹکڑے سے کر دیا گیا ہے ---- مختصر یہ کہ شعر پڑھتے وقت شعر کے ہر بول کے ساتھ، قاری کے جذبات بلندی کی طرف بڑھتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ " میں نے چمن لٹا دیا " پر پہنچ کر اس کا جوش فرو ہو جاتا اور دل میں ایک خاص قسم کے سکون ، طمانیت اور مسرت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ لگے ہاتھوں شعر کے لفظی محاسن پر بھی غور کرتے چلئے ۔ " داغ عشق " تو خیر بڑا پرانا لفظ ہے لیکن زندگی کے تمام مفہومہ وسیع الذیل معانی ---- ہماہمی، رونق ، رنگینی ، لطف و لذت کو ایک لفظ " بہار زندگی " میں سمیٹ لینا شاعری اور بلاغت کا کمال ہے ، اسی طرح " داغ عشق " کو " گل تر " اور " بہار زندگی " کو " چمن " کے استعاروں سے ظاہر کرنے اور " گل تر " ہی میں " حاصل چمن " کا تصور شامل کر دینے میں، کتنی معنویت ، شعریت اور رنگینی ہے --- اب ذرا " داغ " کے ساتھ " گل " (وہ نشان جو دھات گرم کر کے جسم پر دیتے، یا آگ سے جلنے سے جسم پر پڑ جاتا ہے) کو رکھ کر دیکھئے تو ایہام تناسب پیدا ہو جاتا ہے ، اور بہار اور چمن کے ساتھ ملائیے تو صنعت مراعاۃ النظیر ---- غرضیکہ شعر کی تخلیق میں کیسے کیسے شاعرانہ وسائل سے کام لیا گیا ہے اس پر تعجب ہوتا ہے ۔ پھر لطف یہ کہ یہ تمام لفظی و معنوی محاسن اس بے ساختگی اور برجستگی سے کام میں لائے گئے ہیں کہ انھوں

نے شعر کی تاثیر کا خون نہیں کیا بلکہ اس میں اضافہ کیا ہے ۔ شعر کے ایک ایک لفظ " گل تر "، " بہار زندگی "، " چمن " اور سب سے بڑھ کر، شعر کی اندرونی روح میں اصغر کی حوصلہ مند، خندان، بشاش اور وجد کرتی ہوئی شخصیت عکس ریز ہے۔

فانی	اصغر
شعر نمبر ۲۔
خوں کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی	بنا لیتا ہے موج خون دل سے اک چمن اپنا
موسم گل آ گیا زندان میں بیٹھے کیا کریں	وہ پابند قفس جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے

فانی اور اصغر دونوں نے بظاہر ایک طرح کا مضمون باندھا ہے لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو معناً ان میں بڑا فرق ہے ۔ اگر اس فرق کو سمجھ لیا جائے تو دونوں میں بہ حیثیت شاعر جو فرق مراتب ہے وہ خود بخود واضح ہو جائے گا ۔

فانی نے اپنے شعر میں ایک مری اور بجھی ہوئی طبیعت کے پست ہمت انسان کی عکاسی کی ہے جس کے اندر بہار (مع جوش و نمو اور قوت کار) میں صرف اتنا جوش پیدا ہوتا ہے کہ وہ زندان (موانع جوش و عمل) میں اپنے خون کی چھینٹوں سے پھولوں کے خاکے بنائے ۔ اس کو اپنے خوں کی رنگینی پر نہ صرف یہ کہ اعتبار نہیں ہے بلکہ اس کے ہلکے پن اور بے رنگی پر اتنا یقین ہے کہ اس سے فرش و دیوار زندان پر گلکاری ہونے کے بجائے صرف دھندلے سے خاکے بن سکتے ہیں ۔ پھر اس کے خون میں نہ وہ جوش ہے جو اسے درو دیوار زندان کو لالہ زار بنانے پر مجبور کرے، نہ اس میں برضا و رغبت اور خوشی و خندہ پیشانی سے " خاکہ سازی " کی لہر یا امنگ پیدا ہوتی ہے ۔ اس کا یہ فعل بامر مجبوری یا بطور شغل بیکاری کے ہے ۔ وہ سوچتا ہے کہ یوں زندان میں بیٹھے کیا کریں، چلو پھولوں کے خاکے ہی بنائیں ـــــ یہ شعر فانی کی نفسیات و مزاج کے عین مطابق ہے ۔ وہ جس طرح اپنے خول میں سکڑ گئے تھے اور وسیع کائنات سے تقریباً اپنے کو کاٹ لیا تھا اور اصول فطرت اور قانون الہیٰ کو نظرانداز کرتے ہوئے وسائل معیشت و معاشرت سے تقریباً قطع تعلق کئے، گوشہ عزلت میں پڑے رہے اور خون تھوک تھوک کر، کنج خانہ میں لالہ کاری کرتے رہے ـــــ اپنے اسی فعل کو عین فطری سمجھتے رہے ـــــ اسی کی تلقین وہ اس شعر میں کرتے ہیں ۔ یہ شعر زندگی کے اصولوں کے منافی اور افراد و اقوام کی قوت جہد و عمل کے لئے زہر ہلاہل ہے ـــــ شعر کے لہجہ میں ذاتی تجربہ اور احساس بے بسی سے تھوڑی سی غمناکی آ گئی ہے لیکن اس میں وہ بلیغ شعریت نہیں ہے جس

کی طرف مجنون صاحب نے اشارہ کیا ہے ۔ رہی شعریت ، تو اس کو زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب روایتی شعر کہہ سکتے ہیں (اس لئے کہ تجربہ کی گرمی کے باوجود شعر کا مضمون روایتی مضمون سے زیادہ قریب ہے) ۔

فانی کے برعکس اصغر کا شعر سنت الہیٰ اور قانون فطرت کے عین مطابق ہے ہر وہ فرد یا قوم جو فطرۃً آزاد ہوتی ہے وہ جدو جہد زندگی اور کشمکش حیات میں، موانع کے قید و بند سے ہمیشہ نبرد آزما رہتی اور اپنے خون رنگین سے زمین و زمان کو لالہ زار و گلنار کرتی رہتی ہے ـــــ اس شعر میں ایک پرعزم ، غیور اور باہمت شخص کی روح بول رہی ہے ، جسے اپنے خون کی رنگینی پر ناز اور اس کی " چمن سازی " کی صلاحیت پر یقین و اعتماد ہے اور جو دوسروں کو اسیر کرنے والی جابر و قاہر قوتوں کے خلاف نعرہ جہاد بلند کر رہی ہے ۔ ان تمام رجزیہ مضامین و معانی کے باوجود شعر غزل کے رموز و علائم کے سہارے آگے بڑھتا ہے اور اس کی حد سے باہر نہیں ہوا ہے ۔ شاعر کا مزاج و روح عصر ایک دوسرے کے ساتھ آمیز ہو کر ، شعر میں اس طرح جلوہ گر ہو گئے ہیں کہ شعر کسی ایک فرد ، یا کسی خاص عہد و زمانہ ہی کی آواز نہیں رہا ، بلکہ ایک آفاقی حقیقت بن گیا ہے ۔

اب ذرا دونوں اشعار کے کلیدی الفاظ پر غور کیجئے ۔ ایک طرف " خون کی چھینٹیں " ہیں دوسری طرف " موج خون " ، ایک طرف " پھولوں کے خاکے " ہیں دوسری طرف " چمن " ـــــ خون کی چھینٹوں میں تواتر و تسلسل کا وہ تصور نہیں ہے جو " موج خون " میں ہے ۔ اسی طرح پھولوں کے خاکے میں جو بے رنگی اور کوشش و عمل کی جو بے قدری و کم وقعتی ہے وہ چمن میں نہیں ہے ۔ " چمن " موج خوں سے سج کر آراستہ کیا جاتا ہے اس میں چمن سازی سے لے کر چمن بندی تک کی ـــــ مسلسل و متواتر جہد و عمل کی ایک دنیا پنہاں ہے ـــــ مختصر یہ کہ جو شعریت ، بلاغت اور دنیائے معانی اصغر کے شعر میں ہے وہ فانی کے شعر میں نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ اصغر کے لہجہ میں جو توانائی و برنائی ہے، فانی کا شعر اس سے خالی ہے ۔ ہاں فانی کے شعر میں ایک ہلکی سی غمناک لے ہے ، خصوصاً پہلے مصرعہ میں :

شعر نمبر ۳ــ فانی	اصغر
بوئے خزاں سے مست ہیں یاد ہمیں بہار کیا	دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوس حسن ہے
ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا	جو اس سے بے خبر ہیں وہی ہیں عذاب میں

فانی کے شعر میں پھر وہی قباحت ہے کہ دونوں مصرعوں میں معنوی ربط پیدا نہ ہو سکا جو مضمون مصرعہ اولیٰ میں ادا کیا گیا ہے، مصرعہ ثانی میں، بلندی کی طرف جانے کے بجائے اس میں تنزل آ گیا ہے ـــــ شاعر اپنی اس خصوصیت کا اظہار کرتا ہے کہ ہم چمن دنیا میں آلام و مصائب سے اس طرح لطف و لذت لیتے ہیں کہ ہمیں خوشی و شادمانی (کی بہار) کی یاد ستاتی بھی نہیں ۔ لیکن دوسری ہی سانس میں وہ یہ کہنا شروع کر دیتا ہے کہ اصل میں ہم چمن پرست ہیں، ہماری نظروں میں پھول اور خار میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ شعر کہنے میں شاعر ناکام ہو گیا۔ پہلے مصرعہ کا تقاضا یہ تھا کہ دوسرے مصرعے میں ایسے الفاظ لائے جاتے جن سے " خار " کو پھول پر ترجیح حاصل ہو جاتی ۔ اور " بوئے خزاں سے مست ہیں " سے شعر کا جو " حزنیہ لہجہ " بن رہا تھا، وہ دوسرے مصرعہ میں جاری رہتا۔ مگر ہوا یہ کہ دوسرے مصرعہ نے نہ صرف یہ کہ پہلے مصرعہ کے آہنگ کو بری طرح مجروح کیا ہے بلکہ ایک ہی شعر میں دو آہنگ پیدا ہو گئے ہیں ۔ یہ شعر کا نقص اور شاعر کے عجز طبیعت کی دلیل ہے ۔ شعر میں لفظی محاسن کا التزام ضرور کیا گیا ہے مثلاً" خزاں و بہار، اور پھول اور خار سے صنعت تضاد پیدا کی گئی ہے اور چمن کی رعایت سے خزاں، بہار، پھول اور خار جمع کئے گئے ہیں ۔ " بوئے خزاں " سے ایک نیا پہلو اور تصور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس میں صرف شاعرانہ تخیل ہے واقعات کی دنیا سے اسے کوئی تعلق نہیں نہیں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ فانی سوچ سوچ کر غم کی فضا پیدا کرتے ہیں، غم کی لہر دل سے نہیں اٹھتی ۔

اصغر کے شعر کے دونوں مصرعے آپس میں اسطرح پیوست اور چسپاں ہیں کہ ان سے ایک وحدت بنتی ہے ۔ انھوں نے پہلے مصرعہ میں جو دعویٰ کیا ہے، دوسرے مصرعے میں اسے آگے بڑھایا، اور اس کی دلیل فراہم کر کے، بات پوری کی ہے ۔ وہ ایک وسیع النظر اور عالی ظرف انسان کی طرح تاریکی سے روشنی کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے کہتے ہیں ــ دوزخ بذاتہ کوئی چیز نہیں، دوزخ انسان کے نفس کی وہ کیفیت ہے جو اسے " حسن نظر " سے محروم اور " حسن شناسی " کے جوہر سے عاری کر دیتی ہے ـــــ بالفاظ دیگر جس شخص کا یہ نظریہ نہیں ہوتا کہ کائنات میں سوا " حسن " کے ہے کیا؟ اور جو اپنے اندر ایسی نظر نہیں پیدا کر لیتا کہ وہ ہر چیز میں صرف " حسن " دیکھے وہ نہ صرف یہ کہ " حسن شناسی " کا حق ادا نہیں کرتا بلکہ اپنے لئے باعث اذیت اور موجب عذاب ہوتا ہے ۔حسن نظر کا یہی فقدان دوزخ ہے ۔

اصغر کا شعر ان کے مزاج و شخصیت کا ہو بہو عکس ہے ۔ اور معنوی اعتبار سے فانی کے شعر سے بہت بلند ہے ۔ اور لفظی محاسن ، شعریت اور شگفتگی میں کسی طرح اس سے کم نہیں ہے ۔

اب چند اشعار بلا تنقید و تشریح پیش کئے جاتے ہیں ۔ البتہ جہاں کہیں ضروری سمجھا گیا ہے ،ہلکے ہلکے اشارے کر دیئے گئے ہیں ۔

فانی	اصغر
قاتل سنبھل کہ یہ نگہ واپسیں نہیں	قاتل نگاہ یاس کی زد سے نہ بچ سکا
خنجر ہے میرے دل کے لہو میں بجھا ہوا	خنجر تھے ہم بھی اک نہ خنجر لئے ہوئے
لالے پہ جھک پڑی ہے گل یاسمن کی شاخ	اللہ رے جوش باد بہاری ترا اثر
یا دست نازنیں میں ہے ساغر شراب کا	ہر شاخ گل ہے ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

اصغر کا شعر فانی کے مقابلہ میں معنوی اعتبار سے بھی بہتر ہے اور رنگینی و تصویر آفرینی کے اعتبار سے بھی " شاخ گل " سے واقعی ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے انسان کی مکمل تصویر ابھرتی ہے ۔ لیکن فانی کے شعر سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ ناقص ہے ۔ چنبیلی کی شاخ کے لالے پر جھکنے سے لالہ کی شاخ بھی جھک جائے گی اور لالہ کے پھول سے ، ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیالے کی تصویر نہیں بنے گی ۔ شاعر کا مشاہدہ ناقص اور محاکات نامکمل ہے ۔

فانی	اصغر
گلشن صلائے عام اسیری ہے سر بسر	فریب دامگہ رنگ و بو معاذ اللہ
پھیلا دیا بہار نے پھولوں پہ دام عیش	یہ اہتمام ہے اور ایک مشت پر کے لئے

فانی کے شعر میں " صلائے عام اسیری ، بہار اور دام عیش " سے شعر میں شگفتگی پیدا ہو گیا ہے ۔ اس کے برعکس اصغر کے یہاں فریب دامگہ رنگ و بو اور اہتمام مشت پر " کے تقابل سے بڑی معنویت پیدا ہو گئی ہے پھر جو برجستگی اور روانی اصغر کے شعر میں ہے وہ فانی کے شعر میں نہیں ہے ۔ اصغر کا شعر فانی کے شعر سے بہت بلند ہے ۔

فانی	اصغر
ساری ہے درد دل میں مری رگ رگ میں چارہ ساز	میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں
کیا پوچھتا ہے درد کہاں ہے کہاں نہیں	رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے

اصغر کا شعر یقیناً فانی کے شعر سے بہت اچھا ہے ۔ فانی کے یہاں لفظ " ساری " کا استعمال جدید روزمرہ کے خلاف ہے، اس کے علاوہ مجرد " درد " کا رگ رگ میں جاری و ساری

ہونا تو سمجھ میں آتا ہے " درد دل " کا رگ رگ میں ساری ہونا، بڑی بھونڈی بات ہے (یہ ایسی ہی بات جیسے کوئی یہ کہے کہ میرے تمام جسم میں " درد سر " ہو رہا ہے) ۔ اصغر نے درد میں اس کی " دشتریت " کے اضافہ سے شعر کو بہت بلندی پر پہونچا دیا ہے ۔

فانی میں وہ ہوں نقطۂ موہوم اتصال
جس میں عدم کی دونوں حدیں ہیں ملی ہوئی

حیات و موت بھی ادنیٰ سی اک کڑی میری
ازل سے لے کے ابد تک وہ سلسلہ ہوں میں

اتصال اور ملی ہوئی میں سے ایک لفظ زائد ہے ۔ اس کے علاوہ اصغر کا شعر اپنے لہجہ ، نقطہ نظر ، تزئین و آرائش الفاظ کی بنا پر فانی کے شعر سے بہت بلند ہے

سامنے آئیں جو ہوں دعویٔ تقویٰ والے
چشم ساقی کی ادا میکدہ بر دوش ہوئی

کچھ دعوئے تمکیں میں ہے معذور بھی زاہد
مستی میں تجھے چاک گریبا نہیں دیکھا

اصغر کا شعر زیادہ برجستہ اور رواں ہے ، " دعوئے تقویٰ والے " کے مقابلہ میں زاہد کا لفظ زیادہ بلیغ اور گہری معنویت کا حامل ہے ، اس کے علاوہ اصغر کے شعر میں زاہد کی دعوی تمکیں سے معذوری کا جواز کتنا حسین ہے ۔

مژدہ فصل گل کا لائے تو سہی باد بہار
ہر کڑی زنجیر کی زنداں کے باہر دیکھنا

بہار آتے ہی وہ یکبارگی میرا تڑپ جانا
وہ جا پڑنا قفس کا آپ سے آپ اڑ کے گلشن میں
رنج تھا اسیروں کو بال و پر کے جانے سے
اڑ چلے قفس لے کر ہوئے گل کے آنے سے

....

چمن میں دل ہے تو میری نگاہ میں ہے چمن
چمن سے تو مجھے لے جائے گا کہاں صیاد

قفس ہو، دام ہو، کوئی چھڑائے اب یہ ناممکن
ازل کے دن کلیجہ میں بٹھایا تھا گلستاں کو

....

ہر نفس وقت خیال رخ جاناں کر لیں
زندگی ہجر میں دشوار ہے آساں کر لیں

کچھ تو کہو یہ کیا ہوا، تم بھی تھے ساتھ کیا
غم میں یہ کیوں سرور تھا، درد نے یہ کیوں مزا دیا

....

ہوش رہے نہ دوش کا فکر مآل رہ نہ جائے
خلوت یاد یار میں کوئی خیال رہ نہ جائے

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں

....

هر حال میں بس پیش‌نظر وهی صورت
میں نے کبھی روئے شب هجراں نہیں دیکھا

....

چشم ساقی کہ وہ مخمور نگاهی توبہ
آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

یکا یک توڑ ڈالا ساغر مے هاتھ میں لے کر
مگر هم بھی مزاج نرگس رعنا سمجھتے هیں

....

کیوں کر میں کہوں تم نے آئینہ نہیں دیکھا
بے وجہ نہیں هرگز آئینے کو حیرانی

هے ایک هی جلوہ جو ادھر بھی هے ادھر بھی
آئینہ بھی حیران هے آئینہ نگر بھی

....

هر دل هے تیرے غم کی امانت لئے ہوئے
ذرے هیں اک جہان حقیقت لئے ہوئے

اسرار عشق هے دل مضطر لئے هوئے
قطرہ هے بیقرار سمندر لئے هوئے

اس موازنہ و مقابلہ سے یہ بات واضح هو گئی هوگی کہ اصغر هر اعتبار سے فانی سے بہتر اور بلند تر شاعر هیں - اصغر کی شاعری سے همیں جینے کا جو حوصلہ مصائب برداشت کرنے کا جو عزم، کشاکش حیات سے نبرد آزما هونے کی جو همت اور قوت و عمل کی جو توانائی و برنائی ملتی هے، فانی* کی شاعری نہ صرف یہ کہ اس سے خالی هے بلکہ اس کے برعکس وہ " موت " کو اس قدر خوشگوار اور مثبت اور انفعالی قوتوں کو اتنا دلکش بنا کر پیش کرتی هے کہ اس کا مطالعہ قوائے عمل کے لئے مہلک ثابت هوتا هے - اس سے همارے قویٰ میں اضمحلال افسردگی اور تھکن پیدا هوتی هے -

---

*اس حصہ کی تیاری میں حسب ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا هے :

۱) فانی - عبدالشکور - کتابی دنیا لمٹیڈ - دهلی - بار اول ۱۹۳۷ء
۲) فانی اور ان کی شاعری - ڈاکٹر محمد احسن فاروقی - مکتبہ ماحول کراچی - طبع اول ۱۹۶۴ء
۳) انتخاب کلام فانی - مرتبہ شاهد علی خان - آزاد کتاب گھر- دهلی- سنہ طباعت ندارد
۴) نقوش و افکار- مجنوں گورکھپوری - صفیہ اکیڈمی کراچی - طبع اول ۱۹۶۶ء
۵) جدید شعرائے اردو ---- فیروز سنز - لاهور - سنہ طباعت ندارد
۶) غزل اور متغزلین - ڈاکٹر ابواللیث صدیقی - اردو مرکز - لاهور - طبع اول ۱۹۵۳ء
۷) تاریخ و تنقید - حامد حسن قادری - لکشمی نرائن اگروال - آگرہ - طبع دوم ۱۹۳۷ء
۸) اردو شاعری میں اصغر کی انفرادیت - فضل القدیر - مقالہ ایم اے (اردو) - ڈھاکا یونیورسٹی ۱۹۶۹ء

اصغر اور یگانہ :

یگانہ اصغر کے ہم عمر و ہمعصر تھے ۔ لیکن دونوں کی شخصیت و مزاج اور نظریات زندگی کے فرق نے ، دونوں کی شاعری کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف راستے پر ڈال دیا ـــــ صفحات گزشتہ میں تفصیل سے واضح کیا جا چکا ہے کہ اصغر از اول تا آخر ہند ایرانی تہذیب کے ساختہ و پرداختہ تھے، اسلامی تصوف کے خراد پر چڑھ کر جب ان کی تہذیبی اقدار اور شخصی کردار کا ان گھڑ حصہ گھڑ گھڑا کر سڈول ہو گیا، اور ان کے مزاجی خصوصیات کی جلا ہوئی ، تو ان کی ظاہری و باطنی شخصیت زیادہ دلکش ، جاذب اور حسین ہو گئی ـــــ ان کی شخصیت کی یہ "تہذیبیت، مرصعیت اور مستعلیقیت ،، اپنی تمام تر رعنائیوں اور زیبائیوں کے ساتھ ان کی شاعری میں آ گئی ہے ۔

یگانہ عظیم آبادی تھے ۔ عظیم آباد کی خاک سے بڑے بڑے صاحب بصیرت اور نابغۂ روزگار اٹھے لیکن دہلی اور لکھنؤ کے مقامی تعصب کا برا ہو (اس معاملہ میں اہل لکھنؤ زیادہ متشدد ہیں) کہ اس نے اہل عظیم آباد کی خدمات کا جائز اعتراف بھی نہ ہونے دیا ۔ یگانہ کی بدقسمتی کہ وہ عظیم آباد سے نکلے تو لکھنؤ میں آباد ہوئے ۔ اہل لکھنؤ جنھوں نے خود لکھنؤ والوں کو (چند خاص محلوں کے رہنے والوں کو چھوڑ کر) اہل زبان تسلیم نہیں کیا وہ بھلا کسی عظیم آبادی کو یہ درجہ دینے کو کب تیار ہو سکتے تھے ۔ یہ بات ، یگانہ کو کھا گئی اور ان کے ذہن میں ایک " نفسیاتی گتھی ،، بن کر رہ گئی ـــــ اس کے علاوہ یگانہ صورتاً کم رو اور جسمانی طور پر بیمار اور نحیف و نزار تھے (شاید) اس کمی نے بھی انھیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیا اور ان کے ذہن میں ایسی " کج ،، لگا دی کہ جب کسی بات پر اڑ جائیں تو ٹوٹ جائیں لیکن جھکنے کا نام نہ لیں ۔ اپنی اس فطری خصوصیت کی طرف انھوں نے خود اشارہ کیا ہے ؎

ٹکرا کے دیکھیں تم کیا ہو ہم کیا   جیتے تو جیتے ہارے تو ہارے

ان کے یہاں ہار جیت بے معنی ہے اصل چیز ٹکرانا ہے ۔ " محاربہ و تصادم ،، کی یہی خصوصیت ان کی نفسیات کی بنیادی خصوصیت ہے ۔ اسی سے ان کی شخصیت کا ریشہ ریشہ سیراب ہوا ہے ۔ ان کی اس خصوصیت نے ان کی شخصیت کو کوئی تناور درخت ثمر و سایہ دار نہ بننے دیا ۔ ہاں وسیع صحرا میں تنہا اکا ہرا ببول کا ایسا درخت ضرور بنا دیا جو (غصہ و بغض کی) تیز دھوپ میں جل بھن کر اتنا ٹھٹھر گیا ہو کہ اس پر سے طوفانوں کے

جھکڑ کے جھکڑ گزر جانے کے باوجود نہ لچکا نہ ٹوٹا بلکہ ان کی سختیاں سہہ سہہ کر اور سخت ، کھردرا اور کٹھیلا ہو گیا ہو ۔

یگانہ اس " ھیکڑ " بچہ سے مشابہ ھیں جو پٹنے کے بعد اور اکڑتا ہے اور کسی قیمت پر اپنی ھار نہیں مانتا ۔ جو غنیم کو شکست دینے کے لیے برابر بر سر پیکار رہتا ہے اور جب یہ محسوس کر لیتا ہے کہ کچھ پیش نہیں چلے گی تو گالی گلوچ ، طعن و تشنیع اور طنز و تعریض سے اپنا انتقام لیتا ہے ۔ اس میں ایک صالح خصوصیت بھی ہوتی ہے ۔ وہ یہ کہ وہ صحیح معنوں میں بہادر ، طاقتور اور شریف بچہ کی قدر کرتا ہے ۔ ایسا بچہ اپنی جسمانی کمزوری ، ضد ، اکڑ، جوش عمل ، جانبازانہ پیش قدمی اور سر فروشانہ عزائم کی بنا پر ہزاروں میں پہچان لیا جاتا ہے ۔ اگر اس کی نفسیات کا تجزیہ کیجئے تو اس کی تہ میں حسب ذیل " خیالی لہریں " اور " رویے " کارفرما نظر آئیں گے :

(۱) دنیا ایک رزم گاہ ہے جہاں چاروں طرف دشمن ہی دشمن ہیں ـــ رویہ معاندانہ و منتقمانہ ـــ اظہار میں جھنجلاہٹ ، غصہ ، نفرت ۔

(۲) یہاں کوئی مقام پیدا کرنے کے لئے ھاتھ پاؤں مارنے پڑیں گے ـــ رویہ ۔ جہد و عمل

(۳) جو نہیں ہے اپنے کو اس سے بڑا کر کے دکھانا ـــ خود شناسی ، خود آگاہی ۔ خود پرستی ، انانیت ۔

(۴) اپنی عظمت منوانے کے لئے مروجہ اقدار (رسوم و عادات و روایات) اور مسلمہ شخصیات و ادارات سے ٹکرا جانا ـــ رویہ بغاوت

(۵) ایسا کام کرنا جو کوئی نہ کر سکتا ہو ـــ رویہ جانبازانہ ، سرفروشانہ ۔ مجتہدانہ

یہی پانچ عناصر یگانہ کی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں ہیں ، انہیں کا عکس ان کی شاعری میں ہے ـــ بالفاظ دیگر ان کی شاعری غصہ ، بغاوت ، خود پرستی ، جہد و عمل اور اجتہاد کی شاعری ہے ۔ اور چوں کہ یہ ان کا ذاتی تجربہ ہے جس میں ان کے خون کی گرمی اور رنگینی شامل ہے اس لیے ان کی شاعری کا حصہ اپنی کرختگی و درشتی اور خشونت و تلخی کے باوجود جاندار اور قابل قدر ہے ۔

شاعری کے اس مقام پر وہ ایک دن میں نہیں پہونچ گئے اس مقام تک پہونچنے کے لئے

انھیں دل کا خون بھی کرنا پڑا ہے اور خون تھوکنا بھی پڑا ہے ۔ یوں معلوم ہوتا ہے
کہ شروع شروع میں حالات سازگار تھے اور انھوں نے بہ حیثیت اہل زبان اور استاد فن ،
اپنی عظمت قائم کرنے اور منوانے کے لئے (کہ یہ ان کی دبی ہوئی نفسیاتی خواہش تھی)
اپنا سارا زور صرف کیا اور وہ اس میں کامیاب ہوئے ۔ ان کا مجموعہ کلام " نشتر یاس "
اس کا شاہد عادل ہے ۔ لیکن اس کے بعد جب لکھنئو کی محفلوں میں، ان پر کھلے ڈلے
حملے کئے جانے لگے اور انھوں نے یہ محسوس کیا (یہ احساس درست تھا یا غلط ، اس سے
بحث نہیں) کہ ان کے کمال کا اعتراف ان کے حسب دل خواہ نہیں کیا گیا بلکہ غالب کی
اندھی عقیدت پرستی میں (جسے وہ بدقسمتی سے ایسا ہی سمجھتے تھے) ان کی
" مرزائیت " کو للکارا جا رہا ہے تو وہ بپھر کر یاس سے یگانہ ، پھر چنگیزی بن گئے ---
اور اپنی اس " چنگیزیت " کی رو میں دوسروں سے لڑنے اور ٹکرانے کے ساتھ ساتھ " غالب "
سے بھی ٹکرا گئے ۔ غصہ میں وہ اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ ان کو یہ بھی دھیان نہ
رہا کہ غالب میں خود بھی بڑی صلابت و سختی ہے اور لوگوں نے اس سے بھی زیادہ
" سخت و سنگین اس کا بت " بنا لیا ہے ۔ اس سے ٹکرانے سے سوا لہو لہان ہونے ، اور
دوسروں کی " اندھی عقیدت " کو مزید بھڑکا کر ، ان کو اپنے خلاف کر لینے کے، کچھ
حاصل نہیں ہونے کا ۔ لیکن جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے یگانہ تھے ہیکڑ وہ ڈرنا اور
دبنا دبانا کیا جانیں، آنکھ بند کر کے ٹوٹ پڑے ۔ پھر تو مذہبی فدائیوں کا (غالب
کی شاعری پر ایمان سب سے بڑا مذہب اور اس کی کسی شق سے انکار سب سے بڑا کفر ہے)
ایک غول ان کے خلاف صف بستہ ہو گیا ۔ آخر میں مذہب تو پس پشت جا پڑا البتہ کافر
(یگانہ) اور مومنین (عزیز اور ان کے حواریین) کے درمیان خوب خوب سر پھٹول ہوا ۔
یہاں تک کہ مومنین نے بزعم خود کافر یگانہ کو موت کی نیند سلا کر، میدان ادب سے
ہمیشہ کے لئے نکال باہر کیا ۔

اس تصادم و جہاد میں کفر و ایمان کا فیصلہ تو خیر کیا ہوتا ۔ اتنا ضرور ہوا
کہ کافر یگانہ کے مجاہدانہ و سرفروشانہ وار کے کاٹ کے سامنے بڑے بڑے نہ ٹھہر سکے ۔ ان کی
دیوانگی و جوش انتقام بڑھتا گیا یہاں تک کہ ان کی شدت نے ان کے " فشار خون " کو بڑھا
کر ان کے قلب کی شریانوں کی دھجیاں بکھیر دیں --- اور " صحیفہ غزل " لالہ زار بن گیا ۔
جو آج تک رنگین بھی ہے اور تازہ اور " سدا بہار " بھی ۔ یگانہ چنگیزی کی شاعری اسی
حرب و ضرب ، کشت و خون ، شکست و ریخت اور للکار اور پھٹکار کی شاعری ہے ۔

جب یگانہ ، یگانہ چنگیزی نہیں بنے تھے ، یاس عظیم آبادی ہی تھے تو ان کی شاعری

میں میر کی نرم رو اور پرگداز یاسیت (روایت پرستی کی حد تک)، آتش کا مجاہدانہ عزم و مردانہ لہجہ اور غالب کا پرفکر تزئینی اسلوب ، مل جل کر ایک نئے بانکپن کے ساتھ جلوہ گر ہو گئے تھے ۔ ان کا یہ اسلوب بڑا رنگین، مرصع ، دلکش اور جاندار ہے اس میں حسن کاری کے ساتھ تازہ کاری بھی ہے ۔ ان کی اس دور اور اسلوب کی شاعری استادانہ اور ماہرانہ ہے لیکن شاعرانہ روح سے عاری ہے ۔ اس میں وہ " یگانگی " (وہ خاص بانکپن جس نے یاس کو ، یگانہ چنگیزی بنایا) نہیں ہے جو ان کی بعد کی شاعری کا طرۂ خاص و امتیاز ہے ۔ اسی دور کی شاعری میں ، اہل زبان بننے کی دھن میں انھوں نے اہل زبان کے روزمرے اور محاورے باندھنے میں استادانہ مہارت صرف کی ہے لیکن ان کی محاورہ بندی داغ اور ذوق سے قطعاً مختلف ہے ۔ ذیل کی غزلیات اور متفرق اشعار میں دیکھئے ، میر، آتش اور غالب کے رنگ کس طرح گھل مل گئے ہیں مگر اس میں یاس کی اپنی آواز بھی شامل ہے :

ہنسوز زندگی تلخ کا مزا نہ ملا
کمال صبر ملا ، صبر آزما نہ ملا

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے
مزاج اس دل بے اختیار کا نہ ملا

جواب کیا وہی آواز باز گشت آئی
قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزا نہ ملا

امیدوار رہائی قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیق غائبانہ ملا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے تدبیر دیکھنا
منزل قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا

آوازے مجھ پہ کستے ہیں سب بندگان عشق
پڑ جائے پھر نہ پاؤں میں زنجیر دیکھنا

مردوں سے شرط باندھ کے سوتی ہے میری موت
ہاں دیکھنا ذرا فلک پیر دیکھنا

ہر خوب و زشت آپ ہی اپنی مثال ہے
حد کمال کاتب تقدیر دیکھنا

اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور
بے ربطی نوشتۂ تقدیر دیکھنا

ہم ایسے بدنصیب کہ اب تک نہ مر گئے
آنکھوں کے آگے آگ لگی آشیانے میں

آنکھ اٹھا کر نہ کسی سمت قفس سے دیکھا
موسم گل کی خبر سنتے رہے کانوں سے

یگانہ کا اصلی رنگ وہ ہے جس میں ان کی شخصیت " شمشیر برہنہ " ہو کر ظاہر ہوتی ہے ۔ اس میں جو کڑک ، گرج ، جھنکار ، للکار ، جھنجلاہٹ ، غصہ ، طنز و تعریض ، مجنونانہ قہقہہ بلکہ باغیانہ ڈپٹ ہے اردو کے کسی شاعر کے کلام میں نہیں ہے ۔ چند اشعار دیکھئے :

ادھر کبھی معرفت اندھوں کو حاصل ہوتی جاتی ہے
حقیقت جو تھی کل تک ، آج باطل ہوتی جاتی ہے

خدا کے سامنے دامن پسارنے والے
وہ ہاتھ تھک گئے کیا ، مال مارنے والے ؟

بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دست ہوس　　گھٹتے گھٹتے ایک دن دست دعا ہو جائے گا

کیا خبر تھی یہ خدائی اور ہے　　ہائے میں نے کیوں خدا لگتی کہی

لڑا کے دیکھیں تم کیا ہو ہم کیا　　جیتے تو جیتے ، ہارے تو ہارے

بندہ وہ بندہ ، جو دم نہ مارے　　پیاسا کھڑا ہو دریا کنارے

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا　　خدا بنے تھے یگانہ ، مگر ، بنا نہ گیا ؟

بڑے ہو کس سے کونے میں تنہا　　یگانہ ! کیوں؟ خدائی ہو چکی - بس؟

دوار حشر کیا کیوں عہد شباب کا مزا　　شہد بہشت تھا ، مگر ، دست بخیل کا دیا

لیکن یگانہ کی شاعری کا سب سے زیادہ قابل قدر حصہ وہ ہے جس میں زندگی کا احترام ، زندہ رہنے کی خواہش ، جدو جہد کے بل پر زندگی بسر کرنے کا عزم اور خود حرمتی جیسے جاندار عناصر ملتے ہیں - ذیل کے اشعار میں یگانہ کے فکری کارناموں اور ذاتی کردار کی بڑی کامیاب تصویر ملتی ہے :

اتنا تو زندگی کا کوئی حق ادا کرے　　دیوانہ وار حال پہ اپنا ھنسا کرے

زمیں پاؤں تلے سے نکل گئی تو کیا　　ہم اپنی دھن میں زمانے سے بے خبر گزرے

اٹھو اے سونے والو سر پہ دھوپ آئی قیامت کی　　کہیں یہ دن نہ ڈھل جائے نصیب دشمناں ہو کر

دل طوفاں شکن تنہا جو آگے تھا سواب بھی ہے　　بہت طوفان ٹھنڈے پڑ گئے ٹکرا کے ساحل سے

گرفتاران ساحل کود پڑتے ڈر نکل جاتا　　کبھی تو زیست مشکل آزمائے مرگ آساں کو

حرارت ہے دل کی ابھی تک وہی　　زمانے نے اتنا سمجھا تو کیا

منزل کی دھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے　　شور جنوں سے دل نہ رہا اختیار میں -[1]"

اب تک یگانہ کی شاعری کے جو خصوصیات گنائے گئے ہیں - اصغر کی شاعری ان سے پاک ہے ، سوا اس آخری خصوصیت کے - یعنی اصغر کی شاعری میں بھی ، زندگی سے محبت ، اس میں لذت ، زندہ رہنے کی شدید خواہش ، اور پیہم و مسلسل عمل کی دعوت و تلقین ، یگانہ کی شاعری سے کسی طرح کم نہیں ہے (گزشتہ صفحات میں اس سے تفصیلی بحث کی جا چکی ہے)- البتہ موضوع ایک ہونے کے باوجود دونوں کا طرز احساس اور طرز ادا مختلف ہے - ایک جہدو عمل کو اس لیے ضروری سمجھتا ہے کہ اسے رزمگاہ حیات میں اپنی عظمت منوانا ہے (جیسا کہ ابتدائے مضمون میں واضح کیا گیا ہے) ، دوسرے کا نظریۂ حیات ہی یہ ہے کہ

۱- یگانہ ان کی شاعری اور شخصیت - از عتیق احمد - بحوالہ مہر نیمروز - کراچی فروری ۱۹۵۷ء
صفحہ ۲۳-۲۲

زندگی ازل سے ابد تک ایک " بسیط حقیقت " ہے اور انسان کا وجود اس " سلسلہ دراز" کی ایک کڑی ۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں ؎

" حیات و موت بھی ادنیٰ سی اک کڑی میری ازل سے لے کے ابد تک وہ سلسلہ ہوں میں"

اسی طرز فکر و طرز احساس ، نیز اختلاف مزاج نے دونوں کے لہجہ میں فرق و اختلاف پیدا کر دیا ۔ اصغر کا لہجہ نرمی ، لطافت ، رنگینی اور احساس جمال سے تیار ہوا ہے یگانہ کا غصہ ، تلخی ، خشونت اور طنز و تعریض کی کڑک دار ، کڑوی ، ڈسنے اور چھیدنے والی کیفیات سے ۔

یگانہ کے یہاں تلخیوں اور ناکامیوں سے پیدا ہونے والی " بدمزگی " کے نتیجہ میں عملاً " مردم بیزاری " ، " مردم آزاری " بلکہ " مردم گزیدگی " آ گئی تھی ، لیکن اس کے باوجود ان کے کلام میں بھی نوع انسان کے لئے ایک خاص قسم کی تڑپ ، دلسوزی اور ہمدردی نظر آتی ہے ۔ بظاہر یہ دونوں متضاد کیفیات معلوم ہوتی ہیں ، لیکن جیسا کہ سطور گزشتہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ یہ صالح خصوصیت یگانہ جیسے لوگوں کی فطرت میں ہوتی ہے نیز جب انھوں نے اپنی طرح دوسروں کو مظلوم پایا یا محسوس کیا ، تو ان کے جذبۂ ہمدردی و دلسوزی کو تازیانہ لگا اور انھوں نے اس قسم کے اشعار کہے ؎

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

من کہ ہر دمی تاہم درد زیستن تنہا صبحدم چسان بینم شمع انجمن تنہا

صدرفیق و صدہمدم پر شکستہ و دل تنگ داور را نمی زیبد بال و پر زدن تنہا

یگانہ کے برعکس اصغر مردم دوست تھے ، چاہیتے اور چاہے جانے والے ۔ وہ یاران باوفا میں شمع محفل ، رندان درد آشام میں " شعلۂ ایاغ " اور زاہدان باصفا میں " چراغ کعبہ " تھے انھوں نے لوگوں کے قلوب میں گرمی بھی پیدا کی ، نور بھی ، ان کی تمام زندگی ہی دوسروں کی تہذیب و اصلاح نفس میں گزری پھر کیوں کر کہا جائے کہ وہ اپنے ابنائے جنس کے غم اور ان کی دلسوزی و ہمدردی میں نہیں گھلے ---- لیکن یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ یہ " احساس " شعر بن کر ان کے قلم سے نہیں ٹپکا ۔ شاید اسی بنیاد پر سجاد باقر رضوی صاحب نے ان کی شاعری میں " ایک بعد انسان پرستی (Humanism) کی کمی[1] محسوس کی ہے اور وسعت موضوعات اور پیرایۂ بیان کے

۱۔ اصغر گونڈوی از سجاد باقر رضوی بحوالہ تہذیب و تخلیق ۔ مکتبہ ادب جدید ۔ لاہور طبع اول ۱۹۶۶ء ۔ صفحہ ۱۵۸

تنوع میں فانی اور یگانہ سے کمتر درجہ کا شاعر ،، کہا ہے[1] ---- بہر صورت اگر شاعری میں انسان پرستی (Humanism) کی للکار اور پکار ہی شاعری ہے اور اس کا فقدان شاعری کا نقص ہے تو یگانہ ہی نہیں ، تمام نام نہاد ترقی پسند شاعر اصغر سے بڑے ہیں، لیکن اگر" شعر حسن تخئیل و حسن بیان ،، کے مجموعے کا نام ہے اور اس کا مقصد جذبات انسانی کی تہذیب ، تلطیف ، تنزیہہ اور ترفع ہے، تو اصغر کا شمار یقیناً بڑے شاعروں میں ہوگا۔

یگانہ اور اصغر میں سوا اس خصوصیت کے کہ دونوں غزل کے شاعر ہیں اور کوئی خصوصیت مشترک نہیں ۔ البتہ اسلوب کی سجاوٹ میں ان کے یہاں بھی اصغر کی طرح فارسی تراکیب سے کام لیا گیا ہے ۔ انہوں نے بھی فارسی کی معنی خیز تراکیب کے ذریعہ اپنی شاعری میں تفکر و تعمق پیدا کیا ہے اور شاید اصغر سے زیادہ ، لیکن حسن کے تاثر اور جذبے کی شدت کی کمی کی وجہ سے ان کی پرفکر شاعری کیف و اثر سے خالی ہی رہی ۔ شاعری کے باطن کے علاوہ اس سے اس کا ظاہر ---- اسلوب اور لب و لہجہ ، بھی متاثر ہوا ہے ۔ یعنی مقصد شاعری اور مزاجوں کا اختلاف یہاں بھی ظاہر ہوا ہے۔ اصغر کا مقصد تراکیب کی مدد سے تعمق و تفکر کے ساتھ شیرینی و رنگینی میں اضافہ کرنا ہے جب کہ یگانہ کا مقصد فکر کی گہرائی پیدا کرنا، اپنی عظمت (بحیثیت شاعر اور اہل زبان) جتانا اور منوانا اور ایسا کام کر دکھانا ہے جو کوئی اور نہ کر سکا ہو (جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے) ---- لہذا اپنی انفرادیت قائم اور ثابت کرنے کی دھن میں انہوں نے فارسی تراکیب کی مرصع کاری میں ، اردو روزمروں اور محاوروں کے پیوند اور ہندی کے نامانوس الفاظ اور بول کے ٹکڑوں (ایسے الفاظ اور بول جو اردو میں کم یا بالکل استعمال نہیں کئے گئے) کے جڑاؤ سے، ایک منفرد لب و لہجہ اور اسلوب تیار کر لیا۔ محاورات سے ان کی دلچسپی کمزوری کی حد تک بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے ، ان کے بادہ ہدے کے شوق میں وہ عامیانہ ، سوقیانہ اور مبتذل محاورات تک سے گریز نہیں کرتے ۔ انہوں نے جہاں ان سے اور کام لئے ہیں، ایک کام خصوصیت کے ساتھ یہ بھی لیا ہے کہ ان کو اپنی مزاجی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے ۔ اس حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو ان کا اسلوب اصغر سے بالکل مختلف ہے ۔ اس سمت خاص میں وہ اصغر سے بہت آگے ہیں ۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس کی وضاحت میں ، ذیل میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں :

۱۔ اصغر گونڈوی از سجاد باقر رضوی بحوالہ تہذیب و تخلیق مکتبہ ادب جدید ۔ لاہور طبع اول ۱۹٦٦ء ۔ صفحہ ١٦٣

برابر بیٹھنے والے بھی کتنی دور تھے دل سے
مرا ماتھا جبھی ٹھنکا، فریب رنگ محفل سے

دل طوفان شکن تھا جو آگے تھا سو اب بھی ہے
بہت طوفان ٹھنڈے پڑ گئے ٹکرا کے ساحل سے

حسن پر فرعون کی پھبتی کہی
ہاتھ لانا، یار کیوں، کیسی کہی

میں سمجھ لوں گا دوست ہے تو کون
مجھ کو رہ رہ کے تاڑنے والا

حسن کافر، گناہ کا پیاسا
بے گناہوں کو سانٹنے والا

کس سادگی سے میں نے بڑھایا تھا دست شوق
ہتھے سے بدمزاج یکا یک اکھڑ گیا

منہ زوروں کا حوصلہ سرکار حسن سے
آخر پڑی وہ مار کہ چرسا ادھڑ گیا

رلا رلا کے غریبوں کو ہنس چکا کل تک
مری طرف سے اب اپنی دسا پہ ہنستا جا

بول بالا رہے یگانہ کا
نام باجے جگت میں چاروں دانگ

اصغر اور یگانہ کے اسلوب میں ایک فرق اور بھی ہے - یگانہ بھی حسرت اور فانی کی طرح جب سادہ اور سہل کہنے پر آتے ہیں تو غزلیں کی غزلیں سہل ممتنع میں کہتے چلے جاتے ہیں، اس سہل و سادہ اسلوب میں بھی وہ کہیں کہیں فارسی تراکیب سے مرصع کاری کرتے جاتے ہیں لیکن روانی میں کہیں فرق نہیں آتا - جب کہ اصغر کا اسلوب شروع سے آخر تک (سوا چند غزلوں کے) ایک ہی ہے ـــــ مرصع و رنگین یگانہ کی اس رنگ کی غزلوں کے چند اشعار دیکھئے :

کیوں کسی سے وفا کرے کوئی
دل نہ مانے، تو کیا کرے کوئی

موت بھی آ سکی نہ منہ مانگی
اور کیا التجا کرے کوئی

مفلسی میں مزاج شاہانہ
کس مرض کی دوا کرے کوئی

شمع کیا شمع کا اجالا کیا
دن چڑھے سامنا کرے کوئی

کس کی آواز کان میں آئی
دور کی بات دھیان میں آئی

~~ہائے کیا کیا نگاہ بھٹکی ہے~~
~~جب کبھی امتحان میں آئی~~

ہائے کیا کیا نگاہ بھٹکی ہے
جب کبھی امتحان میں آئی

یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی
کہئے کیا بات دھیان میں آئی

....

کارگاہ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

کیمیائے دل کیا ہے خاک ہے، مگر کیسی
لیجئے تو مہنگی ہے، بیچئے تو سستی ہے

خضر منزل اپنا ہوں، اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے

اصغر اور یگانہ کی شاعری کا فرق وہاں کھلتا ہے جب ہم دونوں کے کلام میں تغزل کی چاشنی ، عاشقانہ جذبات کی تہذیب ، فکر و خیال کی رنگینی ، صوفیانہ مضامین کی نزہت و لطافت ، احساس جمال اور تاثر حسن کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی ترصیع و تزئین تلاش کرتے ہیں جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے - یہ میدان یگانہ کا تھا ہی نہیں - غزل کی شاعری کے لئے جس تہذیب نفس ، لطافت جذبات ، خود سپردگی و دل گداختگی ، دل کشائی اور دل گرفتگی ، روح کے کرب ، جمالیاتی احساس کی بیداری و بالیدگی اور حسن کے احترام و رمز شناسی کی ضرورت ہوتی ہے، شاید یگانہ اس سے محروم تھے یا ان کے حد درجہ شدید جارحانہ و قتالانہ جذبات کی طغیانی نے ، (جو غزل کی زمین میں اگر زیادہ ہو جائے تو شوریت پیدا کر دیتی ہے) ان کو دبا دیا تھا ، سبب خواہ کچھ بھی ہو، ان کی غزل ، غزل کی خارجی ہئیت رکھنے کے باوجود ، اصغر کی غزل کے حسن اور کیف و اثر کو نہیں پہونچتی -

یگانہ یقیناً بڑی مجتہدانہ صلاحیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے - لیکن ان کی صلاحیتیں زیادہ تر منفیانہ قوتوں کی تعمیر اور اظہار میں صرف ہوئیں ---- انھوں نے اردو غزل کو نیا لہجہ نیا آب و رنگ اور نئی توانائی تو دی لیکن غزل کی مانوس رسیلی، دل میں اتر جانے والی پرگداز لے (جیسے شاد ، فانی کی ہے) یا رقص و وجد میں لانے والی پرکیف آواز (جیسے حسرت ، اصغر اور جگر کی ہے) نہ دے سکے -

یگانہ کی شاعری کی اس بحث کو جناب ظہیر صدیقی کے درج ذیل جامع تبصرہ پر ختم کیا جاتا ہے - وہ رقمطراز ہیں :

" ان کے (یگانہ کے) فن میں جمال سے زیادہ جلال، تغزل سے زیادہ تفکر، بیان کی رعنائی سے زیادہ خیال کی گہرائی، عشق کے تجربات سے زیادہ عشق کے تصورات ، جذبوں سے زیادہ شعور ، داخلیت سے زیادہ خارجیت ، ترنم سے زیادہ توانائی اور مہذبانہ کم بیانی (Under-statement) سے زیادہ وحشیانہ صاف گوئی پائی جاتی ہے -" [1]

۱- یگانہ چنگیزی از ظہیر صدیقی بحوالہ ادب لطیف سالنامہ ۱۹۶۲ء - صفحہ ۷۹

اس مضمون کی تیاری میں حسب ذیل کتب و رسائل سے استفادہ کیا گیا ہے :

۱) تاثرات و تعصبات - ظہیر صدیقی - شعبہ تحقیق و اشاعت مدرسہ عالیہ ڈھاکا - طبع اول ۱۹۶۲ء

۲) تہذیب و تخلیق - سجاد باقر رضوی - مکتبہ ادب جدید لاہور - طبع اول ۱۹۶۶ء

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہی خصوصیات ان کی غزل کی کمزوری کا سبب ہوئے - ان خصوصیات نے ان کو بہت بڑا " مجتہد ،، ضرور بنایا لیکن وہ بہت بڑے غزل گو نہ بن سکے - غزل میں اصغر ہی کا پلہ بھاری ہے -

اصغر اور جگر :

اصغر کے چہیتے معاصر جگر تھے جو عمر میں ان سے کافی چھوٹے تھے اور ان کے انتقال کے بعد قریب قریب چوتھائی صدی تک (پورے چوبیس سال) زندہ رہے - اس حساب سے جگر نے خاصی طویل عمر پائی - مگر اس طوالت عمر کا ان کی شاعری پہر اچھا ہی اثر پڑا ---- یعنی بجائے بڑھاپے کی طرف جانے کے وہ برابر جوانی و بلوغت کی طرف قدم بڑھاتی رہی - بالفاظ دیگر کسی مرحلہ یا منزل میں رک جانے کے بجائے وہ برابر ترقی کرتی رہی -

جگر کی شاعری کو اس کے صحیح پس منظر میں سمجھنے ---- ان کے ذہنی ارتقا کا صحیح ادراک حاصل کرنے اور ان عناصر و عوامل کا احاطہ کر کے ان کے اثرات ، خصوصاً اصغر کے گہرے اور دیرپا اثرات کو ان کی شاعری میں دکھانے ، اور نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی گئی - اس لیے جب تک ان اثرات کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی نہ کی جائے، جگر کی شاعری ، غزل میں ان کا کارنامہ اور جدید غزل میں ان کے مقام و مرتبہ کا صحیح تعین اور سب سے بڑھ کر ، اصغر کے مقام و مرتبہ کا صحیح اندازہ اور اس کا تعین اگر مشکل نہیں تو یک طرفہ ضرور ہوگا اس لیے بڑی حد تک غلط ہوگا - آئندہ سطور میں جگر کی شاعری میں اصغر کے انھیں اثرات کو واضح کرنے اور ان کی روشنی میں، دونوں کی حیثیت و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے -

جگر جس وقت اصغر سے ملے ہیں (جنوری فروری ١٩١٧ء میں) اس وقت اگرچہ ان پر صحیفہ عشق نازل ہو چکا تھا (یعنی وحیدن کی عشق میں مبتلا ہو کر انھیں یا/کے

(گزشتہ سے پیوستہ)

٣) اردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ - یگانہ چنگیزی - انجمن ترقی اردو ہند - علی گڑھ طبع اول ١٩٦٠ء

٤) اردو شاعری میں اصغر کی انفرادیت از فضل القدیر - مقالہ ایم اے (اردو)- ڈھاکا یونیورسٹی ١٩٦٩ء

٥) مہر نیمروز - کراچی فروری ١٩٥٧ء - یگانہ - ان کی شخصیت و شاعری از عتیق احمد

کھو چکے تھے) لیکن ان کا شمار نہ صاحبان کتاب* میں تھا اور نہ صاحبان دیوان میں ۔
ان کا پہلا دیوان " داغ جگر " چار سال بعد ۱۹۲۱ء[1] میں شائع ہوا اس میں رسمی اور
روایتی مضامین کی کثرت ہے لیکن کہیں کہیں اصغر کا رنگ جھلک جاتا ہے ۔ اصغر کے
اثرات اگرچہ ان کے یہاں آ چلے تھے لیکن جگر نے ابھی اپنے کو نہیں پایا تھا۔ یہ زمانہ
دراصل پانے کا تھا بھی نہیں ۔ یہ زمانہ تو ان کا اپنے کو کھونے کا تھا۔ اور انھوں نے
اپنے کو خوب جی بھر کے کھویا ۔ جہاں گئے ، جس در پر گئے " اپنے کو کھو آئے " ۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس گم شدگی کے باوجود اپنے کو پانے کے لئے ۔ بقول اصغر " تم کہیں
بھی جاؤ آنا تم کو اسی در پر ہے " ---- وہ آئے اصغر ہی کے در پر ۔ اسی در کی
خاک نے جگر کو ہر اعتبار سے جگر بنایا ۔ اس کی تفصیل مقالہ ھذا میں اصغر و جگر کے
زیر عنوان دی جا چکی ہے ۔ وہیں اصغر سے کسب فیض کے سلسلے میں یہ جملہ بھی
لکھا گیا تھا :

" اکتساب معنوی سے جگر نے خوب جھولیاں بھری ہیں "

یہ جملہ بڑی ذمہ داری کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ اس میں نہ مبالغہ ہے نہ شاعری بلکہ
اظہار حقیقت ہے جس کی تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی ۔

جناب رشید صدیقی نے مقدمہ آتش گل ---- " جگر میری نظر میں " میں تحریر
فرمایا ہے کہ

> " جگر کو اصغر سے بڑی گہری عقیدت ہے لیکن شاعری میں وہ
> اصغر سے بالکل علیحدہ ہیں۔ اصغر سے ان کا شغف شخصی ہے
> شاعرانہ نہیں ۔ جس طرح حالی کا غالب سے تھا۔ اصغر کے یہاں
> تخئیل زیادہ ہے جذبہ کم ہے ۔ جگر کے یہاں جذبہ کی شدت ہے
> اسی لئے تخئیل کی کمی[2] ۔"

---

* ۔ ہم پہ نازل ہوا صحیفۂ عشق صاحبان کتاب ہیں ہم لوگ (جگر)

۱ ۔ جناب ڈاکٹر محمد اسلام نے " داغ جگر " کا سال طباعت ۱۹۲۲ء لکھا ہے ، جو غلط ہے۔
جگر حیات اور شاعری ۔ صفحہ ۱۹۷۰ء

۲ ۔ جگر میری نظر میں ۔ از رشید احمد صدیقی ۔ بحوالہ آتش گل ۔ پاکستان کواپریٹو بک
سوسائٹی لمٹیڈ ۔ کراچی سنہ ندارد ۔ صفحہ ۲۵

اگر رشید صاحب کے اس جملے کا مقصد جذبہ اور تخئیل کے فرق کے علاوہ ، اصغر کے اثرات سے کلی انکار کے ہیں (جیسا کہ مترشح ہوتا ہے) تو مجھے اس سے اختلاف ہے ۔ جگر نہ صرف یہ کہ اصغر سے ذہنی اور نظریاتی طور پر مستفید و مستفیض ہوئے ہیں بلکہ انھوں نے شاعری میں بھی، موضوع و مضامین کے علاوہ الفاظ و تراکیب، کی پیروی کی ہے ۔ تفصیل آگے آتی ہے ۔

جگر پر اصغر کے اثرات کا اعتراف جناب ڈاکٹر محمد اسلام[1]، جناب شارب رودولوی[2] اور جناب فضیل القدیر[3] نے کیا ہے لیکن ان حضرات[1] نے جگر کے اصغر سے کسب فیض کو صرف " میلان تصوف " تک محدود کر دیا ہے ۔ البتہ جناب فضیل القدیر نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ

" جگر کے کلام میں اصغر سے فنی اکتسابات کی مثالیں بھی ملتی ہیں[4] ۔"

لیکن ان کو مثالوں سے واضح نہیں کیا کہ یہ پتہ چلتا کہ جگر نے اصغر سے کیا کیا چیزیں لیں اور ان کو کس طرح پیش کیا ۔

جگر نے اصغر سے اپنی عقیدت کا اظہار نثر و نظم دونوں میں کیا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ ھذا صفحۂ ۳۰۷-۳۰۶) اور بقول جناب رشید احمد صدیقی :

" اب تو یہ عالم ہے کہ وہ اصغر صاحب کے مخصوص انداز و اطوار میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی بعض بعض باتوں کو اصغر صاحب کے تصرف کا صدقہ سمجھتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں[5] ۔"

حیرت ہے کہ جو شخص اصغر کا اس قدر گرویدہ اور ان سے اس درجہ مرعوب و متاثر ہو کہ اپنے کو ان کے انداز و اطوار میں ڈھالنے کی کوشش کرے وہ ان سے فن شاعری میں کسب فیض نہ کرے ------- جگر صاحب کے متعلق اکثر کہا گیا ہے کہ وہ " جو کچھ

۱۔ جگر مرادآبادی ، حیات اور شاعری ۔ صفحہ ۲۰۰-۱۹۷

۲۔ جگر فن اور شخصیت ۔ مطبوعہ شاہین پبلشرز ۔ الہ آباد ۔ طبع اول ۱۹۶۱ء ۔ صفحہ ۱۳۰

۳-۴۔ اردو شاعری میں اصغر کی انفرادیت ۔ صفحہ ۹۲

۵۔ گنج ہائے گرانمایہ ۔ رشید احمد صدیقی ۔ مطبوعہ نصری فرینڈز پبلشر ۔ اردو بازار ۔ راولپنڈی ۔ ۱۹۲۳ء ۔ صفحہ ۱۱۳-۱۱۲

بھی ہوں مخالق و رنگ کار دہیں تھے " ۔ اگر یہ درست ہے اور یقیناً درست ہے ، اس لئے کہ ان کے حالات زندگی اس کے شاہد عادل ہیں، تو جگر کے درج ذیل اشعار :

بدن سے جان بھی ہو جائے گی رخصت جگر لیکن

نہ جائے گا خیال حضرت اصغر مرے دل سے

نگاہ حضرت اصغر کی ہر ودیعت خاص

قرار بن کے جگر کے دل حزیں میں رہی

حریم حسن معنی ہے جگر کا شانۂ اصغر

جو بیٹھو باادب ہو کر تو اٹھو باخبر ہو کر

کیا دن تھے جگر وہ دن جب صحبت اصغر میں

مسرور طبیعت تھی ، مجبور مرا دل تھا

کہیں کر بہار شعر سے تھکے نہ اے جگر

رنگ کلام حضرت اصغر نظر میں ہے

میں سن کے حضرت اصغر کے اے جگر اشعار

وہ مست ہوں کہ کوئی پی کے بادہ خوار نہ ہو

یوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہل کمال

خاص ہے حضرت اصغر سے عقیدت مجھ کو

بڑی گہری معنویت کے حامل ہو جاتے ہیں ۔ ان سے نہ صرف اصغر سے جگر کی روحانی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ ادبی عقیدت کا بھی ۔ بدقسمتی سے ان اشعار کو صرف مبنی بر عقیدت (روحانی) سمجھ لیا گیا اور ان میں اصغر سے جگر کی جو ادبی عقیدت پنہاں ہے، اور رنگ اصغر کے بعض عناصر (مسرت ، حرارت ، " بہاریت " ----- رنگینی اور کیف مستی) ---- اور کمال فن ---- سے کسب فیض کا جو اقرار و اعتراف ہے، اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جگر نے (جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے) اصغر سے خیالات و افکار تو لئے ہی ہیں، الفاظ و تراکیب حتیٰ کہ پورے کے پورے مصرعے تک لے لئے ہیں ۔ جب تک گہری نظر سے نہ دیکھا جائے اس کا اندازہ مشکل ہے ۔ جگر کے اسی رویے کا اظہار ایک بار اصغر نے یوں کیا تھا :

" کبھی کبھی میرے اشعار کتر بھی لیا کرتے ہیں ۔"[1]

---

۱ ۔ مقالہ ہذا ۔ تلامذۂ اصغر ۔ صفحہ ۱۸۹

سطور گزشتہ میں جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کی شہادت و ثبوت میں دونوں کے اشعار آئندہ سامنے درج کئے جاتے ہیں :

جگر

ہر اک لرزش پہ چیخ اٹھنا ، ہر اک جنبش پہ ڈر جانا
قفس تک جائے میرا اس طرح بے بال و پر جانا

اللہ ری مجبوری آداب محبت
گلشن میں رہے اور گلستاں نہیں دیکھا

کیا جانئے کیا گزری ہنگام جنوں لیکن
کچھ ہوش جو آیا تو اجڑا ہوا گھر دیکھا

یہ مجرم الفت ہے تو وہ مجرم دیدار
دل لے کے چلے ہو تو لئے جاؤ نظر بھی

اس نے ساغر کو اچھالا تھا کسی دن دم کیف
بن گیا عالم ہستی ہمہ تن عالم کیف

ہاں اس طرف بھی اک نگہ نیشتر نواز
کب سے تڑپ رہی ہے رگ جاں آرزو

مجھے آغوش طوفاں ہی جگر آغوش مادر ہے
وہ کوئی اور ہوں گے اس ساحل دیکھنے والے

پروردۂ طوفاں کو کشتی کی نہیں حاجت
موجوں کے تلاطم میں ساحل نظر آتا ہے

اصغر

قفس* تک کس طرح صیاد لایا دیکھ لو جا کر
پڑے ہوں گے ابھی کچھ بال و پر میرے نشیمن میں

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

کیا کیا ہوا ہنگام جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

اب تو یہ تمنا ہے کسی کو بھی نہ دیکھوں
صورت جو دکھا دی ہے تو لے جاؤ نظر بھی

اس نے مجھے دکھا دیا ساغر نے اچھال کر
آج بھی کچھ کمی نہیں چشمک برق طور میں

اس کی نگاہ ناز نے چھیڑا کچھ اس طرح
اب تک اچھل× رہی ہے رگ جاں آرزو

یہاں تو عمر گزری ہے اسی موج و تلاطم میں
وہ کوئی اور ہوں گے سیر ساحل دیکھنے والے

آغوش میں ساحل کے کیا لطف سکوں اس کو
یہ جان ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

---

*- یہ شعر اصغر نے اپنے دیوان سے خارج کر دیا ہے، یہ شعر جناب اقبال سہیل کے تبصرہ " نشاط روح " مطبع صدیق بک ڈپو لکھنؤ - طبع دوم سے ماخوذ ہے (صفحہ ۵۷) اور " مستردات " میں شامل کر دیا گیا ہے -

×- اصغر کی یہ غزل زمانہ - کانپور اگست ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی ہے - اس میں مصرعہ ثانی " اب تک تڑپ رہی ہے رگ جان آرزو " چھپا ہے - یہ ایک واضح قرینہ ہے اس بات کا کہ شعر کہتے وقت جگر کے سامنے اصغر کا مذکورہ بالا شعر تھا - اصغر نے بعد میں " تڑپ " کو " اچھل " بنا دیا - جگر نے ویسے ہی رہنے دیا -

عشق وحدت آشنا و شوق صورت آفریں
اک نظر ابھی ہی کعبہ اک نظر بت خانہ ہے
اک مئے بے نام جو اس دل کے پیمانے میں ہے
وہ کسی شیشے میں ہے ساقی نہ پیمانے میں ہے

آرزو پیکر تراش و شوق میں جاں آفریں
شب معاذ اللہ ہماں مخلوق میں معبود بود
رندوں کو کام نشۂ بے رنگ و* نام سے
وہ شیشہ دیکھتے ہیں نہ پیمانہ دیکھتے
ہوں نہ مایوس ہو اے شورش ناکام ابھی
میری رگ رگ میں ہے اک آتش بے نام ابھی

....

ایک ایسا راز بھی دل کے نہاں خانے میں ہے
لطف جس کا کچھ سمجھنے میں نہ سمجھانے میں ہے
شیشہ مست و بادہ مست و حسن مست و عشق مست
آج پینے کا مزہ پی کر بہک جانے میں ہے

اک ایسی بھی تجلی آج مے خانے میں ہے
لطف پینے کا نہیں ہے بلکہ کھو جانے میں ہے

....

پھر نقاب اس نے الٹ کر روح تازہ پھونک دی
اب نہ کعبہ میں ہے سناٹا نہ بت خانے میں ہے

یہیں پر ختم ہو جاتی ہیں بحثیں کفر و ایماں کی
نقاب اس نے الٹ کر یہ حقیقت ہم پہ عریاں کی

....

بادۂ کوثر کی اک موج آج پیمانے میں ہے
معنی صورت، صورت معنی فکر و نظر کے دھوکے ہیں
فکر و نظر تک رہ جانا، فکر و نظر کی پستی ہے

کوثر کی موج تھی تری ہر جنبش خرام
یہ حسن تمہیں سے ظاہر ہو کہ باطن ہو
یہ قید نظر کی ہے وہ فکر کا زنداں ہے

....

مے و مینا کے پردے ان کو دھوکا دے نہیں سکتے
ازل کے دن سے جو راز مے و مینا سمجھتے ہیں

نظر بھی آشنا ہو نشۂ بے رنگ و صورت سے
ہم اہل راز سب رنگینی مینا سمجھتے ہیں

....

*- معلوم ہوتا ہے کہ اصغر نے پہلے یہ مصرعہ اسی طرح کہا تھا جیسے بعد میں "رندوں کو صرف نشۂ بیرنگ سے غرض " کر دیا گیا (اور طبع اول میں اس مصرعہ کو یونہی شائع کیا گیا ہے -) اس خیال کو اس سے تقویت پہونچتی ہے کہ " رباعیات رواں پر ایک سرسری نظر " مطبوعہ زمانہ دسمبر ۱۹۲۸ء میں یہ مصرعہ " رندوں کو کام نشۂ بے رنگ و نام سے " ہی چھپا ہے، جگر کے سامنے مذکورہ بالا شعر ابھی اصلی صورت میں تھا -

آج تو کر دیا ساقی نے مجھے مست الست
ڈال کر خاص نگاہیں مرے پیمانے میں

اس نے نگاہ ڈال دی مجھ پہ ذرا سرور میں
صاف ڈبو دیا مجھے موج مے طہور میں

....

ہوشیار او شکوہ سنج زندگی
زندگی انعام ہی انعام ہے

کیوں شکوہ سنج گردش لیل و نہار ہیں
اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں

....

کسی کی مست خرامی کا واہ کیا کہنا
که جیسے حافظ شیراز چور چور آئے

میں اس ادائے مست خرامی کو کیا کہوں
میری نظر تو غرق ہے موج شراب میں

....

اصغر کی نظم " کیا ہوں میں " کو سامنے رکھ کر جگر کی نظم " مجذوب کی صدا "
کا مطالعہ کیجئے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ نظم کہتے وقت ، جگر کے پیش نظر، اصغر کی
مذکورہ بالا نظم ضرور تھی - یہ اشعار دیکھئے :

اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں
اگر نہیں ہیں تو کیوں کر، جو ہیں تو کیا ہوں میں
مجھے تلاش کر اے بیخودی شوق سجود
پہونچ کے منزل مقصد پہ کھو گیا ہوں میں

تمام دفتر حکمت الٹ گیا ہوں میں
مگر کھلا نہ ابھی تک کہاں کیا ہوں میں
نہ کامیاب ہوا میں نہ رہ گیا محروم
بڑا غضب ہے کہ منزل پہ کھو گیا ہوں میں

یہ مصرعے دیکھئے :

فریب خوردۂ رنگینی ادا ہوں میں
وہ ایک نغمۂ بے سازو بے صدا ہوں میں

فریب خوردۂ عقل گریز پا ہوں میں
نہ اب وہ نغمۂ بے لفظ و بے صدا باقی

....

آتش گل :

دل بن گیا نگاہ، نگہ بن گئی زبان
آج اک سکوت شوق قیامت ہی ڈھا گیا

ہوتا ہے راز عشق و محبت انہیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

....

نہیں کہ دل مرا وقف غم نہاں نہ رہا
مگر وہ شیوۂ فرسودۂ بیاں نہ رہا

خروش آرزو ہو نغمۂ خاموش الفت ہن
یہ کیا اک شیوۂ فرسودۂ آہ و فغاں ہرسن

....

اے کمال سخن کے دیوانے
ماورائے سخن بھی اک بات

ماورائے سخن بھی ہے کچھ بات
بات یہ ہے کہ گفتگو نہ کرے

......

بحمد اللہ تو ہے جس کا ہمدم
کہاں اس قلب میں گنجائش غم

ہر حال میں بس پیش نظر وہی صورت
میں نے کبھی روئے شب ہجراں نہیں دیکھا

......

مرا ذوق بھی مرا شوق بھی ہے بلند سطح عوام سے (جگر)
کیا درد ہجر اور یہ کیا لذت وصال (اصغر)
ترا ہجر بھی ترا وصل بھی مرے درد دل کی دوا نہیں (جگر)
اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے (اصغر)

....

آتا ہے جو بزم جاناں میں پندار خودی کو توڑ کے آ (جگر)
اصغر حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہے (اصغر)
اے ہوش و خرد کے دیوانے یاں ہوش و خرد کا کام نہیں (جگر)
رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لئے ہوئے (اصغر)

محولہ بالا اشعار کے موازنہ و مقابلہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جگر کو اصغر سے صرف شخصی شغف نہیں تھا بلکہ انھوں نے شاعری میں بھی شعوری و غیر شعوری طور پر ان سے خوب خوب لفظی و معنوی استفادہ کیا ہے - یہاں دو باتوں کی طرف اشارہ غالباً بے محل نہ ہو، اول تو یہ کہ جتنے اشعار مثال میں پیش کئے گئے ہیں، ان سے کہیں زیادہ (بخوف طوالت) نہیں دیئے جا سکے۔ نیز یہ کہ جگر نے یہ استفادہ صرف ایک دو سال نہیں، بلکہ پچیس تیس سال تک کیا ہے(۱۹۱۷ء تا ۱۹۳۵ء)، دوم یہ کہ جگر نے جتنے اشعار لئے ہیں ان میں بیشتر صورتوں میں نہ مضمون میں ترقی دے سکے ہیں، نہ اسلوب و بیان میں-

جگر کے ابتدائی کلام (شعلہ طور*) پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ " شراب و شاہد " کے علاوہ ان کی شاعری کا کوئی اور موضوع نہیں ہے اور اس میں بھی بڑی سطحیت اور

---

*- " شعلہ طور " پہلی بار ۱۹۳۲ء میں (جون تا ستمبر) شائع ہوا جو جگر کے پسند خاطر نہ ہونے کی وجہ سے ضائع کر دیا گیا اور منظر عام پر نہ آ سکا۔ اس کی دوسری طباعت سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے زیر نگرانی جناب نواب سید شمس الحسن صاحب، ۱۹۳۵ء میں ہوئی(جناب ڈاکٹر محمد اسلام نے " غالباً ۱۹۳۴ء لکھا ہے" - جگر مراد آبادی حیات اور شاعری، صفحہ ۱۹۲- جو یقیناً غلط ہے - شعلہ طور پر تبصرہ زمانہ کانپور اکتوبر ۱۹۳۵ء میں ہوا ہے (صفحہ ۲۶۴)، زمانہ اگست ۱۹۳۵ء میں صفحہ ۱۱۹ پر یہ اطلاع دی گئی ہے کہ " شعلہ طور" بہت جلد شائع ہو کر منظر افروز ہوگا" - یہی نسخے جامعہ ملیہ دہلی کو دے دیئے گئے جن پر انھوں نے اپنا گردپوش چڑھا کر، طبع اول کے نام سے ۱۹۳۶ء میں شائع کیا - ۱۹۳۶ء تک اس کی متعدد اشاعتیں طبع اول کے نام سے وہ شائع کرتے رہے - اس وقت پاکستان میں " شعلہ طور" کا متداول نسخہ وہ ہے جو ادارہ "فروغ اردو، لاہور سے زیر اہتمام جناب محمد طفیل مدیر نقوش، شائع ہوا ہے - اس میں ۱۹۳۸ء تک کی غزلیات شامل ہیں - جگر کے ابتدائی کلام سے مراد، شعلہ طور کا وہی کلام ہے جو ان کے عالم ہوش (۵ نومبر ۱۹۳۸ء تاریخ ترک شراب) میں آنے سے پہلے کا ہے -

او سستا پن ہے اسی لئے بعض ناقدین نے (مجنون گورکھپوری ، کلیم الدین احمد اور مجاز فتحپوری نے) ان کو بڑا شاعر تسلیم نہیں کیا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں ان کے یہاں یہی رنگ غالب رہا ہے اور وہ

آستینوں کا وہ چڑھا لینا	گوری گوری کلائیاں توبہ
نظر ملا کے مرے پاس آ کے لوٹ لیا	نظر ہٹی تھی کہ پھر مسکرا کے لوٹ لیا
ایک رنگین نقاب نے مارا	حسن بن کر حجاب نے مارا
کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی	اٹھ اٹھ کے رہیں بیٹھ گیا درد جگر بھی
جو، اب بھی نہ تکلیف فرمائیے گا	تو بس ہاتھ ملتے ہی رہ جائیے گا

کے قبیل کی غزلیں کہتے رہے جن میں ایک وقتی جذبہ اور عارضی لذت کے سوا کوئی گہری معنویت نہیں تھی ۔ ان میں عام طور پر " عشق مجاز " کی عامیانہ واردات ، عامیانہ انداز وزبان میں بیان کی گئی ہیں ۔ جن میں بلا کی آمد اور سادگی ہے (اسی رنگ کو بعض لوگوں نے داغ کے رنگ سے تعبیر کیا ہے) ---- یہی وجہ ہے کہ یہ غزلیں یکہ والوں سے لے کر اسکول کالج کے لڑکوں تک میں بڑی مقبول ہوئیں -------- لیکن جوں جوں جگر کا اصغر سے ذہنی قرب بڑھتا گیا (یہ تبدیلی شعوری طور پر واقعہ توبہ کے بعد زیادہ نمایاں ہوئی ہے) اور وہ ان کے رنگ میں رنگتے گئے ، اس ہیجانی کیفیت سے نکلتے گئے ۔ ان کی طبیعت میں ٹھہراؤ اور سنجیدگی آتی گئی ۔ وہ عشق کی صحیح کیفیت سے آشنا ہوتے گئے ۔ اب تصوف کے عقائد و نظریات پر غور و فکر کا موقع ملا اور ان پر عشق حقیقی اور " حسن مطلق " کے رموز کھلے (یہ تمام باتیں ان کے یہاں اصغر کی صحبت اور ان کے طفیل میں آئیں ۔ کہنے کو تو جگر قاضی عبدالغنی رحمہ منگلوری سے بیعت تھے لیکن ان کو حقیقی فیض اصغر ہی سے پہنچا ۔ قاضی صاحب کے حیات میں بھی، جو جگر کی رندی و سرشاری کا دور تھا ، جب جگر قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے ان کو اصغر کے پاس بھیج دیا جاتا۔ قاضی صاحب کے وصال کے بعد (١٩٢٨ء) تو لے دے کر جگر کا سہارا اصغر ہی رہ گئے تھے ۔ یوں جگر نے اصغر سے براہ راست ٢٠ سال --- ١٩١٧ء تا ١٩٣٦ء ، استفادہ کیا ۔ لیکن یہ سلسلہ ان کے انتقال --- ستمبر ١٩٦٠ء تک جاری رہا) ---- تو ان کی شاعری میں بھی سنجیدگی اور وزن و وقار بڑھتا گیا۔ اب ان کے یہاں عشق صرف ہیجانی کیفیت کا نام نہیں رہا اس میں فکر و شعور متانت و وقار بھی شامل ہو گیا۔ اس دور میں ان کے یہاں عشق کے مادی تصور میں ، تنزیہی تصور کا رجحان بھی ملتا ہے اسی طرح " حسن " صرف " حسن انسانی " تک محدود نہیں رہا ۔ ایک " بسیط حقیقت " بن کر

تمام عالم ہستی میں نظر آنے لگا۔ " حسن و عشق " کا یہ رسیع ، صوفیانہ تصور انہیں
اصغر سے ملا ۔ جگر کے درج ذیل اشعار میں ان کی جھلک دیکھئے :

شوق بے انتہا کے پردے میں — کون ہنگامہ زا ہے کیا کہئے
سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے — جس حال میں ہوں اب مجھے افسوس نہیں ہے
ہر ایک مکاں میں کوئی اس طرح مکیں ہے — پوچھو تو کہیں بھی نہیں دیکھو تو یہیں ہے
مجھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر — بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر
ہو جو ذوق جمال بے پایاں — کیا نہیں چشم آشنا کے لئے
جب تجھے دیکھ کے کونین کی وسعت دیکھی — حسن ہی حسن ، محبت ہی محبت دیکھی
عشق لامحدود جب تک رہنما ہوتا نہیں — زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں

ان صوفیانہ نظریات سے ان کے کلام میں گہرائی اور گیرائی ، عارفانہ سرمستی اور ماورائیت آئی ۔ لیکن اصغر کی طرح ان کے کلام میں ماورائیت کی لے زیادہ نہیں ہے ۔ اس حیثیت سے ان کے کلام کو صوفیانہ کلام نہیں کہا جا سکتا ۔ اصغر کی طرح ان کے یہاں بھی صوفیانہ کیفیات کا عاشقانہ اظہار ہے ۔

اصغر کے یہاں حسن و عشق کا تنزیہی تصور غالب ہے لیکن ان کے اظہار میں ، وہ " مجاز " کے تمام وسائل اور رنگینیاں کام میں لائے ہیں ۔ اسی چیز نے ان کے کلام کو صوفیانہ کلام کی خشکی و بے کیفی سے بچا لیا۔ اصغر کے برعکس جگر کے یہاں " حسن و عشق " کا شخصی و ارضی تصور غالب ہے اور اس کے بیان میں حد درجہ نزہت و لطافت اور رنگینی و رعنائی ہے ۔ اس حیثیت سے جگر اپنے تمام معاصرین سے سبقت لے گئے ہیں ۔ جناب آل احمد سرور نے جگر کی اس خصوصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ

" وہ اصغر کے اور قریب جانا چاہتے تھے مگر ان کی افتاد طبع نے ان کو حسرت کے قریب کر دیا ۔[1] "

مجھے اس سے اختلاف ہے ۔ حسرت کے یہاں یقیناً حسن و عشق کا ارضی و مجازی تصور ، اور اس کے اظہار و بیان میں رنگینی و مسرت ہے مگر وہ وقتی تاثر کو بھی موزوں و منظوم کر کے پیش کرنے سے گریز نہیں کرتے، جب کہ اصغر حسن کے تاثر کو تخیل کے رنگین شیشوں میں ڈھال کر ، جب تک مقطر و دوآتشہ نہ کر لیں ، پیش نہیں کرتے ۔ جگر نے یہ صفت اصغر ہی سے لی ہے ۔ تاثرات حسن کے اظہار و بیان میں ان کے یہاں وہی رکھ رکھاؤ ، وہی متانت و رنگینی

۱۔ دیباچہ آتش گل از آل احمد سرور ۔ بحوالہ آتش گل مطبوعہ پاکستان کوآپریٹو بک سوسائٹی لمیٹڈ ۔ کراچی ۔ سنہ ندارد ۔ ص ٣١

اور وہی تہذیب و شائستگی ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ ان کی طبیعت میں جو شدت احساس، جو آمد، جذبہ کے اظہار میں جو بے تکلفی اور غنائیت تھی وہ برابر قائم رہی ہے ۔ یہی چیز ان کو اصغر اور حسرت سے ممتاز کرتی ہے ۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ حسرت، اصغر اور جگر تینوں کے اشعار نقل کر کے یہ واضح و ثابت کیا جائے کہ جگر حسرت سے زیادہ قریب ہیں یا اصغر سے ۔ لیکن اصغر اور جگر دونوں کے اشعار نقل کر کے اصغر سے ان کے قرب کی نشاندہی کی جاتی ہے جس کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے :

جگر	اصغر
عرق آلود چہرۂ تاباں شبنم و آفتاب کا عالم	لالہ و گل پہ جو ہے قطرۂ شبنم کی بہار رخ رنگیں پہ جو آئے تو حیا ہو جائے
محو خرام ناز ہیں صحن چمن میں وہ گستاخی نسیم سحر دیکھتا ہوں میں	
وہ ایک شعر مجسم وہ ایک پیکر حسن وہ سیر باغ ہائے ناز بے نیازانہ نظر نظر متبسم اگرچہ بے پروا نفس نفس متوجہ اگرچہ بیگانہ	اس عارض رنگیں پر عالم وہ نگاہوں کا معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

....

جگر	اصغر
میرے ہجوم شوق پر منہ سے نہ کچھ وہ کہہ سکے چہرہ پہ رنگ آ گیا، ہاتھ مرا دبا دیا	تمتما اٹھے وہ عارض میرے عرض شوق پر حسن چاک اٹھا وہیں، جب عشق نے فریاد کی

(اس شعر میں کسی قدر حسرت کا رنگ آ گیا ہے)

جگر	اصغر
وہ مری عرض شوق بے حد پر کچھ حیا، کچھ عتاب کا عالم	عارض نازک پہ ان کے رنگ سا کچھ آ گیا ان گلوں کو چھیڑ کر میں نے گلستاں کر دیا

....

جگر	اصغر
وہ قدّ رعنا وہ روئے رنگیں عالم ہی عالم، منظر ہی منظر	اس کا وہ قد رعنا اس پہ وہ رخ رنگیں نازک سا سرشاخ اک کھلا گل تر، دیکھا

....

جگر	اصغر
حسن کا فر شباب کا عالم سر سے پا تک شراب کا عالم	میں اس ادائے مست خرامی کو کیا کہوں میری نظر تو غرق ہے موج شراب میں

....

پھر حسن مفصل متبسم ہے زیر لب
یک قطرہ اشک زینت مژگاں کئے ہوئے

رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق تبسم بھی
لہریں سی جو اٹھتی ہیں کچھ چشم تفا سے

ان تمام اشعار پر اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جگر نے بھی، اصغر کی طرح حسن کی اداؤں کا بیان، رنگین و دلکش تشبیہات، استعارات اور شاعرانہ اشارات کے ذریعہ کیا ہے، جس سے ان کے کلام میں رنگینی آ گئی ہے - یہی وہ بات ہے، جس کی طرف جگر نے یہ کہہ کر، اصغر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف اور ان کی اس خصوصیت خاص کی پیروی کا اقرار کیا ہے ؂

کیوں کر بہار شعر سے ٹپکے نہ اے جگر
رنگ کلام حضرت اصغر نظر میں ہے

لیکن ان مماثلتوں کے باوجود جو چیز جگر کو اصغر سے ممتاز کرتی ہے (جیسا کہ سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے) وہ ان کا حسن کے شخصی تصور ---- " انسانی حسن" کے اظہار و بیان کی طرف شدید میلان ہے - انھوں نے " حسن کا سراپا"، ایسے پرکیف و والہانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کی نظیر اردو شاعری میں نہیں ملتی - (جوش کے یہاں بعض نظموں کے پس منظر میں دلکشی و رنگینی پیدا کرنے کے لئے اس سے کام لیا گیا ہے لیکن وہ نظم پارے تشبیہات و استعارات سے اتنے گراں بار ہو گئے ہیں کہ رنگینی کے باوجود، ان میں جگر کے " سراپوں " کی بے ساختگی اور والہانہ پن نہیں ہے) ---- ان سراپوں میں تہذیب و شائستگی، نزہت و لطافت اور رنگینی و دلکشی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے کہیں کہیں سے چند اشعار دیکھئے :

وہ حسن کافر اللہ اکبر
تخریب دوراں، فتنۂ محشر

وہ قد رعنا وہ روئے رنگیں
عالم ہی عالم، منظر ہی منظر

وحشت نظریں جب جھک گئی ہیں
ٹکرا گئے ہیں، ساغر سے ساغر

گفتار شیریں، رفتار نازک
خیام و حافظ، تسنیم و کوثر

نغمہ ہی نغمہ، خوشبو ہی خوشبو
صہبا ہی صہبا، ساغر ہی ساغر

....

ایک ایک نظر شعر و شباب و مے و نغمہ
ایک ایک ادا حسن محاکات کا عالم

نازک سے ترنم میں اشارات کے دفتر
ہلکے سے تبسم میں کنایات کا عالم

وہ عارض پر نور وہ کیف نگہ شوق
جیسے کہ دم صبح مناجات کا عالم

....

مجسم وہ تعبیر خواب محبت   وہ اک جلوۂ بے اماں اول اول
تکلم میں بے ربط سا اک تسلسل   خموشی میں حسن بیاں اول اول

جگر کی سراپا نگاری کے شوق اور کمال کا یہ ذکر نامکمل رہ جائے گا اگر ان کے فارسی زبان کے ایک " سراپا " سے چند اشعار یہاں پیش نہ کئے جائیں :

از چشم لرزاں لرزاں دو عالم   و ز زلف برہم، برہم نظامے
گاہے بہ مستی طاؤس رقصاں   گاہے بشوخی آہو خرامے
از بار مینا لرزش بدستے   و ز کیف صہبا لغزش بدستے

یہاں اس بات کی طرف اشارہ غالباً بے محل نہ ہو کہ حسن و عشق کے اس ارضی و مجازی تصور کے باوجود ان کے یہاں محبوب سے وہ " مانوسیت " اور بے تکلفی نہیں ہے جو عموماً اردو کے غزل گو شعرا کے یہاں ملتی ہے ۔ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب نظیر صدیقی رقمطراز ہیں :

" حسن کی ادائیں اور عشق کی آرزوئیں جگر کی شاعری کے نمایاں موضوعات ہیں ۔ لیکن وہ ان اداؤں کے بیان اور آرزوؤں کے اظہار میں " حد ادب " کے قائل ہیں .... اس کا سبب شاید یہ ہے کہ اصغر کی طرح جگر بھی شاعری میں شائستگی اور شرافت کے ضرورت سے زیادہ قائل ہیں ۔[1] "

نظیر صدیقی صاحب کے اس شک کے جواب میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جگر شاعری میں شائستگی اور شرافت کے .... قائل ہی نہیں تھے بلکہ عامل بھی تھے اور یہ یقیناً اصغر کی صحبت کا فیض و اثر تھا ۔ جن دونوں نمایاں موضوعات کی طرف صدیقی صاحب نے جگر کی شاعری میں اشارہ کیا ہے، یہی اصغر کے بھی پسندیدہ مضامین تھے اور ان کے اظہار و بیان میں انھوں نے بھی " حد ادب " کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے ۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں ہے، اصغر کے اس رویے کا اظہار و اعلان خود ان کے الفاظ میں سنیے :

" اشخاص و اجسام کا تصور ، مادیات کا عشق اور ان کا ذکر چھوڑیئے مجردات کی طرف ذہن کو لے جائیے ۔ فسقیہ جذبات و فسقیہ زبان کو ترک کیجئے ۔ مجردات کی شاعری اصل شاعری ہے ۔[2] "

---

۱ ۔ جگر مراد آبادی ۔۔ از نظیر صدیقی بحوالہ تاثرات و تعصبات ۔ شعبہ تحقیق و اشاعت مدرسہ عالیہ ڈھاکا ۔ طبع اول ۱۹۶۲ء

۲ ۔ اصغر مرتبہ عبدالشکور ۔ ص ۱۷

انھیں خیالات کو انھوں نے اشعار میں بھی جا بجا ظاہر کیا ہے ۔ ذرا حسن کا احترام ملاحظہ فرمائیے :

یہ بارگاہ حسن ادب کا مقام ہے — جز درد و اشتیاق تقاضا نہ چاہیے

حریم ناز کے آداب اور ہیں اصغر — نیاز رکھ کے بھی عرض نیاز رہنے دے

اصغر نے تمام زندگی اس پر عمل کیا وہ اپنی شاعری کو ادائے حسن کی تصویروں اور آرزوئے عشق کی داستانوں سے رنگین بناتے رہے لیکن " حسن " کے ادب کا ہمیشہ لحاظ رکھا اور اس سے بے تکلف نہیں ہوئے ۔ اسی کی پیروی جگر نے کی، یہی وجہ ہے کہ عشق کے ارضی تصور کے غلبہ کے باوجود ، ان کے بعد کے کلام میں وہ عامیانہ رنگ اور سستا پن نہیں ہے جو عام طور پر ایسے کلام میں آ جاتا ہے ۔ بلکہ وہ رنگینی و دلکشی ہے جو اصغر کے کلام کا خاصہ ہے ۔ جگر کے اس رنگ کے اشعار کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ " مجازی عشق " کی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں ۔ یہ چیز اصغر کے یہاں کم نہیں ہے ۔

جگر کی زندگی کا خاصا طویل حصہ رندی و سرشاری میں گزرا ۔ ان کی شاعری میں " مے و میخانہ " کا ذکر قدم قدم پر ملتا ہے ۔ جناب آل احمد سرور نے ان کی خمریات پر اظہار خیال فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ

> " ان کے یہاں ------ ریاض اور حسرت کے بعد خمریات کے اچھے شعر ملتے ہیں ۔[1] "

لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ۔ ریاض اور حسرت کے یہاں شراب اور اس کے متعلقات کا ذکر رسمی و تقلیدی ہے ۔ جگر کے یہاں زندگی اور زندگی کا تجربہ ۔ ایک نے شراب دیکھی اور چھوئی تک نہیں تھی، دوسرا " غرق جام شراب " تھا، اس کے شریانوں میں شراب خون بن کر دوڑ رہی تھی، یہ کیسے ممکن ہے کہ " روایت " میں تجربہ کی شدت ، خلوص ، لذت اور کیف و اثر پیدا ہو جائے ۔ میری ناقص رائے میں " مے و میخانہ " کے بیان میں جو شوق و شیفتگی ، کیف و لذت اور والہانہ پن جگر کے یہاں ہے وہ اردو کے جدید شاعروں میں سوا جوش کے (وہ بھی رباعیات میں) کسی اور کے یہاں نہیں ہے ۔ یہ حصہ جگر کی شاعری کا بڑا پرکیف ہے ۔ اس کی تفصیل میں جانے کے بجائے جگر کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے میرے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے :

۱۔ جدید غزل گو شعرا ۔ نئے اور پرانے چراغ ۔ از آل احمد سرور ۔ مطبوعہ سرفراز پریس لکھنئو طبع سوم ۱۹۵۵ء ۔ صفحہ ۲۰۹

کہ ھر سے برق چمکتی ھے دیکھیں اے واعظ ۔۔۔ میں اپنا ساغر اٹھاتا ھوں تو کتاب اٹھا

اے محتسب نہ پھینک، مرے محتسب نہ پھینک ۔۔۔ ظالم شراب ھے ارے ظالم شراب ھے

جتنی بھی آج پی سکیں عذر نہ کر پلائے جا ۔۔۔ مست نظر کا واسطہ مست نظر بنائے جا

اک جام آخری تو پینا ھے اور ساقی ۔۔۔ اب دست شوق کانپے یا پاؤں لڑکھڑائیں

یہ ذکر نامکمل و ناقص رہ جائے گا اگر ان کے چند اشعار " شکست توبہ " کے نہ پیش کئے جائیں ۔ سنئے :

ساقی کی ھر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا ۔۔۔ لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا

بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا ۔۔۔ توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی گیا

آزردگی خاطر ساقی کو دیکھ کر ۔۔۔ مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا

اے رحمت تمام مری ھر خطا معاف ۔۔۔ میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

اس جان میکدہ کی قسم بارہا جگر ۔۔۔ کل عالم بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

ان تمام اشعار میں ایک " رند شرابی " کا شراب سے قلبی تعلق ، اس کے لئے شوق اور تڑپ ، اس کے حصول کے لئے جو والہانہ للک اور اس سے جو عشق ھوتا ھے ، چھلکا پڑتا ھے ۔

اصغر نے بھی " مے و میخانہ " کو اپنی شاعری میں جگہ دی ھے ۔ اگرچہ اس کا رخ " شراب انگور " سے " شراب معرفت " کی طرف پھیر دیا گیا ھے اور وہ محض صوفیانہ رموز و علائم کے طور پر استعمال کی گئی ھے لیکن ان علائم کے ذکر میں جو لذت ان کے یہاں ملتی ھے (جس کی طرف سطور گزشتہ میں اشارہ کیا جا چکا ھے) وہ کسی طرح جگر سے کم نہیں ھے ۔ فرق صرف یہ ھے کہ انھوں نے (اصغر) ان علائم کو " لذت و کیف اور رنگ و نور " کے لئے بطور تشبیہہ و استعارہ استعمال کیا ھے ۔ اور ان سے کلام میں رنگینی پیدا کی ھے ۔ دو ایک شعر دیکھئے تو بات واضح ھو جائے گی :

میخانہ کی اک روح مجھے کھینچ کے دے دی ۔۔۔ کیا کر دیا ساقی نگہ ھوش ربا سے

شیشہ میں موج مے کو یہ کیا دیکھتے ھیں آپ ۔۔۔ اس میں جواب ھے اسی برق نگاہ کا

ابھی اک موج مے اٹھتی تھی میخانے میں اے واعظ ۔۔۔ ابھی اک برق چمکی تھی مری وادی ایمن میں

نہ یہ شیشہ نہ یہ ساغر نہ یہ مے خانہ ھے ۔۔۔ جان مے خانہ تری نرگس مستانہ ھے

قربان ترے عکس ھائے اے نگہ ساقی ۔۔۔ تو صورت مستی ھے تو معنئ میخانہ

شاید کہ پیام آیا پھر وادی سینا سے ۔۔۔ شعلے سے لپکتے ھیں کچھ کسوت مینا سے

هر موج کی وہ شان ہے جام شراب میں
برق فضائے وادی سینا کہیں جیسے

موجوں کا عکس ہے خط جام شراب میں
یا خون اچھل رہا ہے رگ ماہتاب میں

جگر کے یہاں ابتدائی کلام میں " مجرد شراب " کا ذکر ہے ۔ آخر میں کہیں کہیں یہ " علامت " بن کر ان کے یہاں آتی ہے لیکن اسے انہوں نے شاعرانہ وسائل (تشبیہہ و استعارہ) کے طور پر اتنا اور اس خصوصیت کے ساتھ استعمال نہیں کیا جتنا اصغر نے کیا ہے ۔

جگر کے آخری کلام میں (خصوصیت کے ساتھ) ایک " بلند تر انسان " کا تصور آ گیا ہے ۔ یہ تصور اسلامی تصوف کے وسیلے سے اردو و فارسی شاعری میں پہلے سے موجود تھا لیکن اقبال نے اسے بڑی آب و تاب کے ساتھ پیش کیا۔ اصغر کے یہاں بھی اس موضوع پر بڑے اثر انگیز اشعار ملتے ہیں (اس سے تفصیلی بحث "اصغر و درد" اور " اصغر اور اقبال " کے زیر عنوان گزر چکی ہے) جگر نے بھی یہ تصور اصغر ہی سے لیا ۔(ممکن ہے دوسرے ذرائع سے بھی آیا ہو مثلاً اقبال کے کلام کے مطالعہ سے لیکن یہ " تصور " ان پر آہستہ آہستہ اصغر کی صحبتوں اور ان کے اشعار پر غور و فکر سے واضح ہوا) ۔ چند اشعار دونوں کے ملاحظہ فرمائیے :

اصغر	جگر
وہ شورشیں نظام جہاں جن کے دم سے ہے	اگر گھٹئے تو بس اک مشت خاک ہے انسان
جب مختصر کیا انہیں انساں بنا دیا	بڑھے تو وسعت کونین میں سما نہ سکے
شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی	عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں	یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہوجائے
بسے روحانیاں را در کمند شوق آوردم	اسی انسان میں سب کچھ ہے پنہاں
بہ اوج عرش اعلیٰ هم شکارے کردہ ام پیدا	مگر یہ معرفت دشوار بھی ہے
تو در قید جہاں پا بستہ وصد شکوہ سنجی ها	وہ ہمیں ہیں کہ جن کے ہاتھوں نے
من از هر ذرہ سازے کردہ راهے کردہ ام پیدا	گیسوئے زندگی سنوارے ہیں
میں ہوں ازل سے گرم رو عرصۂ وجود	بلندی چاہیے انساں کی فطرت میں پوشیدہ
میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے	کوئی ہو بھیس لیکن شان سلطانی نہیں جاتی

ان اشعار کے موازنہ سے میری دعوے کی تصدیق ہو جاتی ہے ۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ جگر و اصغر دونں کے یہاں " تصور " اور " مضمون " ایک ہی ہے لیکن جو طنطنہ ، جوش ، خلوص اور شعریت اصغر کے اشعار میں ہے وہ جگر کے اشعار میں نہیں ہے ۔ جگر کے اشعار کو زیادہ سے زیادہ کلام موزوں کہہ سکتے ہیں ۔

اصغر ہی کی صحبت میں جگر پر یہ راز بھی کھلا کہ " زندگی جہد و کشاکش اور مسلسل تگ و تاز کا نام ہے ۔ اس کا ہر لمحہ ایک تازہ زندگی کا پیامی ہے ۔ اس لئے گردش روزگار کی شکوہ سنجی بے معنیٰ ہے ۔ زندگی ازل سے ابد تک ایک سلسلہ دراز ہے ، موت اس کا خاتمہ نہیں کر سکتی (میں یہ نہیں کہتا کہ یہ خیال ان کی شاعری میں صرف اصغر کے ذریعہ آیا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اصغر کے خیالات و تصورات نے یقیناً جگر کے ذہن میں اس " تصور " کے راسخ کرنے میں موثر عامل کا کام کیا ہے) ۔ دونوں کے اشعار آگے سامنے درج کئے جاتے ہیں ۔ ان سے اندازہ لگائیے :

اصغر	جگر
حیات و موت بھی ادنیٰ سی اک کڑی ہوں	زندگی نکلی مسلسل امتحاں در امتحاں
ازل سے لے کے ابد تک وہ سلسلہ ہوں میں	زندگی کو داستاں ہی داستاں سمجھا تھا میں
کہیں شکوہ سنج گردش لیل و نہار ہیں	ہوشیار اے شکوہ سنج زندگی
اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں	زندگی انعام ہی انعام ہے
اک جہد و کشاکش ہے ہستی جسے کہتے ہیں	زندگی ہے نام جہد و جنگ کا
کفار کا مٹ جانا خود مرگ مسلماں ہے	موت کیا ہے بھول جانا چاہیے
مرنا تو ہے ابتدا کی اک بات	زندگی اک حادثہ ہے اور کیسا حادثہ
جینا ہے کمال ہستی کا	موت سے بھی ختم جس کا سلسلہ ہوتا نہیں

زندگی کے متعلق اس عارفانہ تصور نے ، اصغر کی طرح جگر کے کلام میں بھی رجائیت پیدا کر دی ہے ۔ اصغر کی رجائیت سے تفصیلی بحث مقالہ ہذا میں جا بجا کی جا چکی ہے یہاں صرف اشارہ کر کے یہ دکھانا مقصود تھا کہ اصغر کی صحبت میں جب جگر کا تصور حیات اور نقطہ نظر بدلا تو ان کی شاعری میں وہ تمام عناصر خود بخود آ گئے جو اصغر کی شاعری میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ۔ جگر کے چند اشعار دیکھئے :

طول غم حیات سے گھبرا نہ اے جگر
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں

مسرت زندگی کا دوسرا نام
مسرت کی تمنا مستقل غم

کارگاہ حیات میں اے دوست
یہ حقیقت مجھے نظر آئی

ہر اجالے میں تیرگی دیکھی
ہر اندھیرے میں روشنی پائی

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے شاید یہ احساس ہو کہ جگر کے " ایوان شاعری" کی ہر چیز اصغر کا عطیہ ہے ۔ اگر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے تو غلط ہے ۔ جگر اصغر سے متاثر ہونے کے باوجود شروع سے آخر تک جگر رہے ۔ انہوں نے اصغر سے بعض چیزیں (جن

کا ذکر سطور گزشتہ میں کیا جا چکا ہے) یقیناً ہیں ، جن سے ان کی شاعری میں گہرائی، گیرائی، ندرت و لطافت اور رنگینی پیدا ہوئی جس سے اس کا وزن و وقار بڑھ گیا۔ لیکن اس میں جو بے پناہ آمد ، برجستگی و روانی، جذبات کا طغیانی و ہیجان اور اسلوب کی صفائی ہے وہ ان کا خاص اپنا حصہ ہے جو شروع سے آخر تک برابر برقرار رہتا ہے ۔ اس آمد میں وہ اپنے تمام معاصرین سے برتر ہیں ۔ ان کی آمد ، اقبال کی یاد دلاتی ہے ۔ لیکن اقبال کی آمد کسی طوفانی دریا کی آمد معلوم ہوتی ہے جس میں بڑے بڑے بوجھل اور سنگین مضامین کی چٹانیں بہتی نظر آتی ہیں ۔ جگر کی آمد میدانی دریا کی روانی معلوم ہوتی ہے جو ہمیشہ ایک انداز سے بہتا ہے جس میں مضامین اس کی فطری رو میں بہتے چلے جاتے ہیں ۔

اس کے علاوہ جگر کا ایک اسلوب انتہائی سادہ ، رواں اور آسان ہے ۔ خصوصاً چھوٹی بحروں میں ۔ جگر کو اس اسلوب پر اتنی قدرت حاصل ہے کہ غزلیں کی غزلیں کہتے چلے جاتے ہیں اور طبیعت کی روانی میں فرق نہیں آتا۔ اصغر کے یہاں اس رنگ کی کمی ہے وہ بہت سوچ سوچ کر الفاظ لاتے ہیں اور ان کے دروبست میں بانکپن اور ترصیع کا خاص لحاظ رکھتے ہیں ۔ ان کے اشعار میں باریک " مینا کاری " کا کام ہوتا ہے جس کا ہر لفظ نگینہ کی طرح جڑا ہوا ہوتا ہے ۔ پھر نگینہ کی تلاش و تراش میں وہ پورا پورا اہتمام کرتے ہیں اسی لیے بعض لوگ ان کے اسلوب کو پرتکلف کہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس " مرصع کاری " میں ایسی چابکدستی و مہارت سے کام لیتے ہیں کہ ان کے مصنوعات (اشعار) فطری معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے اسلوب کی دیدہ ریزی ، صناعی اور اس کی نفیس و نازک ترصیع کو پیش‌نظر رکھ کر، کوئی یہ کہے کہ یہ کام آسان نہیں ہے اس میں تکلیف و تکلف سے کام لیا گیا ہے ---- جگر کے جس سادہ و رواں اسلوب کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے وہ اتنا عام ہے کہ اس کی مثال کی ضرورت نہیں ہے تاہم مثلاً دو چار اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں :

آنکھوں میں بس کے دل میں سما کر چلے گئے ۔۔۔ خوابیدہ زندگی تھی جگا کر چلے گئے

چہرے تک آستیں وہ لا کر چلے گئے ۔۔۔ کیا راز تھا کہ دل میں چھپا کر چلے گئے

رگ رگ میں اس طرح وہ سما کر چلے گئے ۔۔۔ جیسے مجھی کو مجھ سے چرا کر چلے گئے

....

اب تو یہ بھی نہیں رہا احساس ۔۔۔ درد ہوتا ہے یا نہیں ہوتا

عشق جب تک نہ کر چکے رسوا ۔۔۔ آدمی کام کا نہیں ہوتا

ٹوٹ پڑتا ہے دفعتاً جو عشق | بیشتر دیرپا نہیں ہوتا
دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے | جب کوئی آسرا نہیں ہوتا

یہ جگر کا عام رنگ ہے - یہاں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ جگر کے یہ اشعار عام پڑھا لکھا آدمی سمجھ سکتا ہے - جب کہ اصغر کے اشعار کو سمجھنے کے لئے خاصے پڑھے لکھے ہونے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے بہت بلند و پاکیزہ ذوق کی ضرورت ہے -

ایک اور فرق جو جگر اور اصغر کی شاعری میں بہت نمایاں ہے، وہ " روح عصر" اور " سیاسی اثرات " کا ہے - گزشتہ صفحات میں اس حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اصغر کی شاعری اپنے عہد کے اثرات سے خالی نہیں ہے (جیسا کہ بعض ناقدین نے خیال ظاہر کیا ہے) لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے جتنے گہرے نقوش جگر کی غزلیات میں ملتے ہیں ، وہ ان کے معاصرین (فانی - اصغر) کے یہاں نہیں ہیں - حسرت نے سیاسی شعور کا اظہار اپنی شاعری میں جا بجا کیا ہے لیکن وہ بیشتر منظوم کلام بن کر رہ گیا ہے - اس میں غزلیت کی شان و روح برقرار نہیں رہ سکی - جگر نے چوں کہ ان حضرات سے زیادہ طویل عمر پائی، فکری طور پر از کار رفتہ نہیں ہو گئے تھے، جذباتی طور پر شاید جوان سے جوان تر ہوتے جا رہے تھے اس لئے ان کے کلام میں، ان کے ارتسامات بہت گہرے اور واضح ہیں - کہیں غزل کے پورے رچاؤ اور گھلاؤ کے ساتھ، کہیں نظم کے خارجی اظہار و بیان کے ساتھ ---- بہرحال یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جگر نے غزل کا دامن موضوع و اسلوب ، دونوں کے اعتبار سے وسیع کیا اور نئی نسل کے لئے غزل کے امکانات کو روشن کیا- جو کچھ کہا گیا ہے اس کی تفصیل کا موقع نہیں - چند منتخب اشعار، جو غزل کے حدود میں ہیں، اپنی بات کی وضاحت کے لئے پیش کئے جاتے ہیں ---- اگرچہ جگر کی بیشتر نظم نما غزلیں، شہرت میں ڈوبی ہوئی ہیں تاہم لہجہ کی تیزی و درشتی سے غزلیت مجروح ہو گئی ہے - اشعار ملاحظہ ہوں :

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن | لاکھ بلائیں ایک نشیمن
برق حوادث ، اللہ اللہ | جھوم رہی ہے شاخ نشیمن
بیٹھے ہم ہر بزم میں، لیکن | جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن
کام ادھورا اور آزادی | نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی | سایہ ہے لیکن روشن روشن

....

انجام ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے　　میں صاف ان آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں
صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن　　صیاد کا لٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

....

وہ جن کے سایے سے بھی بجلیاں لرزتی تھیں　　مری نظر سے کچھ ایسے بھی آشیاں گزرے
بھری بہار میں تاراجی چمن مت پوچھ　　خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گزرے

....

کانٹے کسی کے حق میں کسی کو گل و ثمر　　کیا خوب اہتمام گلستاں ہے آجکل

....

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشہ گوشہ میں　　کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے
یہ میکدہ کی یہ ساقی گری کی ہے توہین　　کوئی ہو جام بکف کوئی شرمسار آئے
خلوص و ہمت اہل چمن پہ ہے موقوف　　کہ شاخ خشک میں بھی پھر سے برگ و بار آئے

مختصر یہ کہ اس موازنہ و مقابلہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جگر نے اصغر سے خوب دل کھول کر استفادہ کیا ہے - اس کے نتیجہ میں ان کے آخری دور کے کلام میں گہرائی اور گیرائی نزہت و لطافت ، سرمستی و رنگینی ، حسن مجاز کی تصویرکشی کے باوجود تہذیب و شائستگی اور " حد ادب " کا لحاظ اور ایک ہلکی سی ماورائیت آئی ہے - ان خصوصیات میں جگر کی اپنی معصومیت و سادگی ، والہانہ کیف و سرمستی ، غنائیت و نغمگی اور اسلوب کی برجستہ اور رواں دواں انداز نے ایک نئی شان پیدا کر دی ہے - اس لئے جگر کا نام ان اساطین کے ساتھ بجا طور پر لیا جاتا ہے جنھوں نے " جدید اردو غزل " کو نیا آب و رنگ اور لہجہ و آہنگ دیا -

اصغر اور جگر کے اس طویل تقابلی بحث کو جناب مظہر صدیقی کے درج ذیل اقتباس پر ختم کیا جاتا ہے :

" مجھے ایسا لگتا ہے کہ اپنی زندگی کی طرح ، اپنی شاعری میں بھی وہ (جگر) سب سے زیادہ اصغر ہی سے قریب رہے .... اتنی بات واضح ہے کہ ان دونوں میں لطافت خیال ، نزاکت احساس اور نفاست بیان مشترک عناصر کی حیثیت رکھتی ہیں - حسن کی ادائیں اور عشق کی آرزوئیں جگر کی شاعری کے نمایاں موضوعات ہیں لیکن وہ ان اداؤں اور آرزوؤں

کے اظہار میں " حد ادب " کے قائل ہیں ...... ![1]

اتنے اضافہ کے ساتھ ختم کیا جاتا ہے کہ جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے وہ اصغر کے یہاں جگر کے مقابلہ میں زیادہ لطیف و رفیع ہیں ۔ ان میں اگر رنگینی تخئیل اور احساس جمال کے لطیف تقاضے شعور کے ساتھ رنگینی و نزاکت بیان کی ایک سموئی ہوئی کیفیت پیدا کر دیجئے تو اصغر ہو جائیں گے ، اگر برجستہ اور رواں اسلوب شامل کر دیجئے تو جگر ۔

گزشتہ صفحات میں اصغر کے کلام کا، دوسرے شعرا کے کلام سے جو تفصیلی موازنہ کیا گیا ہے امید ہے اس سے اصغر کی " انفرادیت و اہمیت " کے متعلق کوئی واضح رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی ۔ آئندہ باب میں ناقدین اصغر کے آرا کے تجزیاتی مطالعہ کے بعد " قول فیصل " کے تحت اصغر کی انفرادیت کے خدو خال روشن اور بحیثیت شاعر ان کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔

......

۱۔ جگر مراد آبادی از پروفیسر نذیر صدیقی ۔ بحوالہ " تاثرات و تعصبات " ۔ صفحہ ۲۱۰
اس کے علاوہ اس حصہ کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا :

۱) جگر فن اور شخصیت ۔ شارب ردولوی ۔ سرائے گڑھا الہ آباد ۔ طبع اول ۱۹۶۱ء
۲) جگر مراد آبادی حیات اور شاعری ۔ ڈاکٹر محمد اسلام ۔ سرفراز پریس لکھنئو ۔ طبع اول ۱۹۶۲ء
۳) نئے اور پرانے چراغ ۔ آل احمد سرور ۔ ادارہ فروغ اردو ۔ لکھنئو ۔ طبع سوم ۱۹۵۵ء
۴) حسرت موہانی ۔ عبد الشکور ۔ انوار بک ڈپو لکھنئو ۔ طبع سوم سنہ ندارد
۵) شعلہ طور ۔ جگر مراد آبادی ۔ ادارہ فروغ اردو ۔ لاہور ۔ طبع دوم سنہ ندارد
۶) آتش گل ۔ جگر مراد آبادی ۔ پاکستان کواپریٹیو بک سوسائٹی لیمیٹڈ ۔ کراچی سنہ ندارد

باب ہشتم

شاعری میں اسٹر کا مقام اور مرتبہ

صفحہ

۱- ناقدین کے اعتراضات پر محاکمہ ۶۲۶

۲- ستائش آزاد کا تنقیدی جائزہ ۶۷۲

۳- اصغر کی انفرادیت ۶۸۷

۴- شاعری میں اصغر کا مقام و مرتبہ ۶۹۲

اصغر پر ان کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد بہت کچھ لکھا گیا ۔ ایک طرف ان کی تحسین و تعریف میں مرزا احسان احمد ، اقبال احمد سہیل ، مولانا ابوالکلام آزاد ، سر تیج بہادر سپرو ، رشید احمد صدیقی ، مولانا عبدالماجد دریابادی ، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ، اثر لکھنوی اور مجنوں گورکھپوری جیسے قدر اول کے اہل قلم رطب اللسان ہیں ، تو دوسری طرف خواجہ احمد فاروقی ، عبدالشکور ، ڈاکٹر مسعود حسین ، اسلوب احمد انصاری ، شان الحق حقی ، عابد رضا بیدار ، عبدالسلام اور بحمل امجد جیسے ذہین اور ہونہار جدید ناقدین نے خراج تحسین پیش کیا ہے لیکن تحسین و تعریف کا ہر ایک کا انداز جداگانہ اور موضوع دلچسپی کی نوعیت مختلف ہے ۔ ان تمام مختلف الخیال ناقدین کے آراء کا اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو بیشتر لوگوں کا اس بات پر اتفاق نظر آتا ہے کہ

۱۔ اگر اصغر اپنے عہد کے سب سے بڑے فن کار (ڈاکٹر مسعود حسین صاحب کا یہی خیال ہے) نہیں تو بہت بڑے فن کار ضرور تھے ۔

۲۔ ان کا ایک انفرادی اسلوب اور مخصوص آواز ، لہجہ اور آہنگ تھا ۔ (تفصیل آگے آئے گی)

لیکن ساتھ ہی جناب نیاز فتح پوری اور بعض جدید ناقدین نے اصغر کے کلام میں زبردست کمی محسوس کی ہے اور اپنی تحریروں میں اس کمی کی طرف بعض نے محض اشارے کئے ہیں ، بعض نے تفصیلی بحث کی ہے جن کو سمجھے ، چھیڑے اور حل کئے بغیر ، اصغر کا کوئی مطالعہ ، جامع ، علمی اور دور جدید کے مذاق اور تقاضے کے مطابق نہیں کہا جا سکتا ۔ اس سے تفصیلی بحث آگے آئے گی ۔

اس کے علاوہ اعتراض کرنے والوں کا ایک قابل توجہ گروہ اور بھی ہے جس میں یگانہ ، چنگیزی ، نیاز فتحپوری اور اثر لکھنوی جیسے بزرگ اور محترم ادیب شامل ہیں ۔ مذکورہ بالا گروہوں کے علاوہ ایک گروہ ، اصغر کی حیات میں ایسا بھی تھا جس نے ان کو

شاعر ہی تسلیم نہیں کیا اور ان کی استادی و مہارت کی آزمائش کے لئے برابر " شاعرادہ دنگل " کے لئے چیلنج دیتے رہے (تفصیل سوانحی باب میں ہندوستانی اکیڈمی کے تحت دی جا چکی ہے) ---- اس گروہ کا رویہ چوں کہ معاندانہ و مخاصمانہ تھا اس لیے ان کی آواز پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا اور تحریک کے بانی اور سرگروہ جناب سید حامد علی المتخلص بہ سرکوب الہ آبادی کے انتقال کے ساتھ ہی یہ آواز دب گئی - تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ ان لکھنے والوں نے اصغر کے زبان و بیان میں جن اسقام و اغلاط کی نشاندہی کی ہے، ان میں کچھ صحیح بھی ہیں -

اصغر کی شاعری میں الفاظ و لغات ، معانی و بیان اور عروض کے تسامحات اور اسقام پر گرفت جناب یگانہ[1] ، جناب نیاز فتحپوری[2] ، شاہ معین الدین[3] ندوی اور آزاد کاکوری[4] نے بھی کی ہے - یگانہ کا لہجہ اور اسلوب حسب عادت و معمول غیر شستہ اور غیر سنجیدہ تھا اس لیے تنقیدی ادب میں اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں تاہم تاثیر[5] مرحوم نے بطریق احسن اس کا جواب دیا - جناب نیاز فتحپوری کی تنقید کے بارے میں جناب آل احمد سرور کا تاثر یہ ہے کہ اصغر پر ان کی تنقید پڑھنے کے قابل ہے - یہاں اس پر تفصیل سے کچھ کہنے کا موقع نہیں صرف اتنا اشارہ کیا جاتا ہے کہ نیاز صاحب کا جیسا ترکی بہ ترکی اور شافی و کافی جواب جناب مانک چند عشرت گونڈوی[6] نے دیا ہے اس سے ان کا جارحانہ قلعہ بکلی مسمار ہو گیا ہے - اسی طرح شاہ معین الدین صاحب ندوی کا بھرپور جواب جناب صغیر احمد صدیقی[7] نے اور آزاد کاکوری کا جواب سراج احمد صاحب علوی فانی[8] نے دیا ہے اور حق یہ ہے کہ جواب کا حق ادا کر دیا ہے ---- لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اصغر کا کلام اسقام و اغلاط سے پاک نہیں ہے اور ہو

۱- نشاط روح پر وکیلوں کی مقدمہ طرازی یا پھبتیوں کی پھبتیاں -- آب آموز (یگانہ) - نیرنگ خیال اگست ۱۹۲۶ء (مسلسل)

۲- اصغر گونڈوی کا جدید مجموعہ کلام (سرود زندگی) - نیاز فتحپوری - نگار مارچ ۱۹۳۶ (مسلسل

۳- تبصرہ سرود زندگی - شاہ معین الدین ندوی - معارف ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۰ء

۴- سرود زندگی - اظہر علی آزاد کاکوری - الناظر جولائی، اکتوبر نومبر ۱۹۳۶ء

۵- ادب آموز کی تنقید پر تنقید - تاثیر - نیرنگ خیال - ستمبر ۱۹۲۶ء

۶- نیاز کی جرات بیجا - مانک چند عشرت - الناظر (ستمبر، دسمبر) ۱۹۳۶ء، مارچ اپریل، مئی جون ۱۹۳۷ء

۷- سرود زندگی پر فنان تنقید - صغیر احمد صدیقی - نیرنگ خیال، اپریل ۱۹۳۷ء اور جون ۱۹۳۷ء

۸- اصغر اور آزاد - سراج احمد علوی فانی - الناظر جولائی ۱۹۳۷ء ، ستمبر اکتوبر ۱۹۳۷ء

بھی کیسے سکتا ہے کہ یہ کوئی خدائی کلام تو ہے نہیں ۔

یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ کسی شاعر کے کلام کو صرف الفاظ و محاورات کے معیار پر پرکھا جائے اور اس کے دوسرے محاسن کو نظرانداز کر دیا جائے ۔ صحیح تنقید یہ ہے کہ ایک طرف شاعر کے مطالب و مفاہیم کو دیکھا جائے، دوسری طرف اس کی فنی کارانہ صلاحیت ـــ یعنی اظہار و ابلاغ کو نظر میں رکھا جائے، تیسری طرف یہ دیکھا جائے کہ اس کی اپنی کوئی انفرادی آواز بھی ہے یا نہیں ۔ سطور گزشتہ میں اصغر کی انفرادیت اور فنی کارانہ مہارت پر متفقہ رائے کا اظہار کیا جا چکا ہے لیکن تفصیل نہیں دی گئی ۔ تفصیل آئندہ سطور میں پیش کی جائے گی لیکن اس " متفقہ رائے " کی اصابت یا عدم اصابت پر کوئی حتمی رائے دینے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان اعتراضات کا تنقیدی جائزہ لے لیا جائے، جو مجاز صاحب اور بعض جدید ناقدین کی طرف سے اصغر کی شاعری پر کئے گئے ہیں۔

جناب مجاز کا اعتراض :

اصغر کی شاعری پر جناب مجاز کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ " تصوف ـــ یعنی جھاڑ پھونک " کی شاعری ہے ۔ اس سلسلہ میں وہ رقمطراز ہیں :

" جناب اصغر کی شاعری کے متعلق ایک سے زائد بار اپنی رائے ..... ظاہر کر چکا ہوں .... اب بھی جو کچھ کہوں گا .... شاید اسی کا اعادہ ہوگا ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ فارسی کے صوفی شعرا کی غزلوں میں بھی مجھے کبھی کوئی لطف نہیں آیا ۔ اردو والوں کا کیا ذکر ہے کہ یہاں تو سوائے نقل و اتباع کے وہ پرخود غلط جوش بھی نہیں ہے جو ان کے یہاں پایا جاتا ہے .... غزل نام ہے ان باتوں کا جو گوشت پوست والے عاشق اور گوشت پوست والی معشوقہ کے درمیان ہوا کرتی ہے وہ اس سے ملنا چاہتا ہے اور اسی حس کے ساتھ، اسی تمنا کے ساتھ جو ایک انسان میں دوسرے انسان کے لئے پیدا ہو سکتی ہے ۔ پھر آپ لاکھ کہئے کہ " تو وہ

ہے اور وہ تو ،، لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں اس وقت تک
نہیں آ سکی جب تک وہ اس کی آغوش محبت میں نہ ہو ۔
خدا سے محبت کرنے کے سلسلہ میں ممکن ہے یہ " اڑان گھاٹیاں"
کام دے جائیں لیکن ایک انسان کی محبت انسان سے،کبھی ان
چیستان طرازیوں سے مطمئن نہیں ہو سکتی ۔ الغرض یہ جھاڑ
پھونک والی شاعری مجھے کبھی پسند نہیں آئی[1] ۔،،

نیاز صاحب کے لہجہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ " سلوک و معرفت ،، کے ادارہ ہی سے بیزار ہیں ۔ یہ بہرحال ان کا حق اور پسند ہے اس پر کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں پہونچتا لیکن یہ حق نیاز صاحب کو بھی نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے " مزعومہ عقائد ،، کی بنیاد پر مخلص اور نیک نفس انسانوں کے اتنے بڑے گروہ کی تضحیک فرمائیں ۔ آخر اتنے بندگان خدا نے اس راہ میں کوئی خوبی تو دیکھی تھی، جس کی طرف نفس و نفسانیت کے تمام شائبہ سے بلند ہو کر انھوں نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کو دعوت دی اور اس تحریک کو کامیاب بنانے میں سلاطین وقت ، امرائے عہد اور علمائے عصر سے مخالفت مول لی اور زندگی کے عیش و آرام کو خیرباد کہہ دیا ۔

جو لوگ سلوک و معرفت کے منازل و مراحل سے گزرے ، اس راہ کی صعوبتوں اور دشواریوں سے دو چار ہوئے یا ان کو کوئی ایسا روحانی تجربہ حاصل ہوا جس سے ان کے اندر مسرت و شادمانی کے فوارے چھوٹنے لگے اور انھوں نے ان کیفیات سے سرشار ہو کر ، ان کا اظہار ایسے اسلوب و انداز میں کیا جسے اصطلاح عام میں شاعری کہتے ہیں تو کیا جرم کیا ۔ اب اگر ان اشعار کو سن کر کسی کے جذبات و حسیات میں تموج و تلاطم برپا نہیں ہوتا یا یہ انداز کسی کو پسند نہیں آتا ۔ تو اس میں قائل کا کیا نقص ہے نقص تو سامع کا ہے جو اتنا " ٹھس ،، اور اس قسم کے جذبات کی طرف سے " بے حس ،، واقع ہوا ہے ۔ اگر نیاز صاحب کی اس دلیل کو تسلیم کر لیا جائے کہ " تصوف کی شاعری جھاڑ پھونک کی شاعری ہے تو اردو فارسی کا آدھا کلام " دریا برد ،، یا نیاز صاحب کے اسلوب میں " غرق مے ناب ،، کرنا پڑے گا ۔ کم از کم اردو فارسی پڑھنے والوں کی کثیر تعداد اس بات پر راضی نہیں ہوگی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا خاصا بڑا حصہ اس بات پر متفق نظر آئے گا کہ :

" تصوف کے مضامین سے شعر میں عمق ، کیف و اثر اور لطافت و پاکیزگی

۱۔ اصغر گونڈوی کا جدید مجموعۂ کلام ۔ نگار مارچ ۱۹۳۶ء ۔ ص ۵۰-۳۸

پیدا ہوتی ہے "

تو شاید غلط نہ ہو ۔ اصغر خود اس بات کے قائل تھے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

" فقر و تصوف کے مسلک (سے) .... معلوم ہوتا

ہے کہ وہی معمولی معتقدات جو تمام مذاہب میں یکساں

طور پر مشترک ہیں ۔ ان پر خود اپنے نفس میں تصدیق و

یقین کی شان پیدا کریں .... شاعری کی تمام تر

بہار جذبات پر ہے ۔ تصوف یعنی تصدیق و یقین سے

جذبات کی لطافت و شدت بڑھ جاتی ہے[1] ۔"

اصغر صاحب چوں کہ راہ معرفت کے سالک اور بادۂ عرفان کے لذت شناس

ہیں اس لیے انھوں نے اپنے " احوال و کوائف " کو اشعار میں ڈھالا ہے بلا اس خیال و

لحاظ کے کہ اس سے نیاز صاحب یا ان جیسے دوسرے بزرگ محظوظ و لطف اندوز ہو

سکیں گے یا نہیں ۔ ذیل میں اصغر صاحب کے کلام سے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں

ان سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ یہ محض جھاڑ پھونک کی شاعری ہے یا ان میں

واقعی شدت و لطافت جذبات ہے ؟ ۔

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں

محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں

حسن ہزار طرز کا ایک جہان اسپر ہے

ملحد با خبر بھی گم جلوۂ لالہ میں

در پہ جو تیرے آ گیا اب نہ کہیں مجھے اٹھا

گردش مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں

یہ عشق عاشقی ہے سود و حاصل دیکھنے والے

یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

جنون عشق میں ہستی عالم پھر نظر کیسی

رخ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

(۲) نیاز صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ " غزل میں گوشت پوست والی

معشوقہ سے محبت کے احوال و معاملات بیان ہونا چاہیں " ۔۔۔ اس سے بحث جدید

ناقدین کے اعتراضات کے تحت کی جائے گی ۔

۱۔ اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ۔ دہلی اور لکھنؤ اسکول ۔ زمانہ ستمبر ۱۲۹ ۔ ص ۱۳۶-۳۵

یہاں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ اصغر کو اپنے خیالات و افکار، جذبات و واردات ، حسیات و تیقنات کو شعری جامہ پہنانا تھا۔ نیاز صاحب یا کسی اور کے نہیں ـــــ اس لیے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اصغر نے جو کچھ کہا ہے وہ (کسی کے معیار عقل و دانش اور میزان ایمان و اعتقاد میں کتنا ہی سبک اور کم وزن کیوں نہ ہو) کس طرح کہا گیا ہے ۔ اس سلسلہ میں بھی (جیسا کہ سطور گزشتہ میں مذکور ہوا) نیاز صاحب نے زبان و بیان اور معانی و مطالب کے اغلاط و اسقام کی نشاندھی کی ہے اور اصغر کے اشعار پر کہیں کہیں اصلاح بھی دی ہے ۔ اس کا جواب مانک چند عشرت گونڈوی نے " الناظر " کے چار شماروں (ستمبر، دسمبر ۱۹۳۶ء اور مارچ اپریل ، مئی جون ۱۹۳۷ء) میں بڑی تفصیل سے دیا ہے ۔ یہاں صرف ایک اعتراض اور اس کا جواب درج کیا جاتا ہے ۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں رسائل مذکور)

شعر اصغر

کہاں ہے سامنے آ مشعل یقیں لے کر فریب خوردۂ عقل گریز پا ہوں میں

اعتراض جناب نیاز

اس شعر سے یہ بات بالکل ظاہر نہیں ہوتی کہ مشعل یقین لے کر کس کو سامنے آنے کی دعوت دی جاتی ہے ۔ اگر اس سے مراد علاوہ اپنے کوئی اور ہے تو انداز بیان درست نہیں کیوں کہ اس سے مبارزہ طلبی ظاہر ہوتی ہے نہ کہ التجا .... پہلے مصرعہ میں مشعل کا لفظ بیکار ہے کیوں کہ دوسرے مصرعہ میں تاریکی کا مفہوم کسی لفظ سے پیدا نہیں ہوتا اس لیے بجائے " مشعل یقیں " کے " حجت یقیں " لکھنا چاہیے ...... عقل گریز پا کے معنی ہوئے " جلد زائل ہو جانے والی عقل " کے دراں حالیکہ شعر کو دیکھتے ہوئے عقل کو " دیرپا " ہونا چاہیے تھا .... شعر کو اس طرح بلند کیا جا سکتا ہے ــ[1]

نہیں ہوں در خور ایقاں یہ جانتا ہوں میں فریب خوردۂ عقل گریزپا ہوں میں

جواب عشرت

نیاز صاحب آپ شعر کو بالکل نہیں سمجھے " گریزپا " .... کے معنی آپ " جلد زائل ہونے والی " لکھتے ہیں ۔ حالاں کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی جانتا ہے

۱۔ اصغر گونڈوی کا جدید مجموعہ کلام ـــ از نیاز فتحپوری ۔ نگار مارچ ۱۹۳۶ء ۔ صفحہ ۵۳-۵۲ (ملخص)

کہ " گریز " مصدر " گریختن " سے مشتق ہے جس کے معنی بھاگنے کے ہیں اور " پا "
کے معنی " پسر " کے ہیں ۔ پتہ نہیں کہ اس کے معنی آپ نے " جلد زائل ہونے والی "
کہاں کر نکالے ۔ اس کے معنی تو ہونگے " ایک مقام پر نہ ٹکنے والی " ، " ایک مقام سے
دوسرے مقام کو بھاگنے والی" ۔

اب اس شعر کے معنی سمجھنے کی کوشش کیجئے تو شاید سمجھ میں آ جائیں
عقل کے پاس " دلائل کا دھیمی روشنی والا دیا " ہے جس کی مدد سے وہ حقائق اشیا
سے کماحقہ واقف نہیں ہوتی ۔ یہی وجہ ہے کہ عقل پہلے ایک چیز کو بہتر سمجھتی
ہے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دوسری چیز کی طرف بھاگتی ہے اور اسے بہتر سمجھنے
لگتی ہے اسی طرح زندگی میں ہزاروں بار انسان " عقل گریز پا " کے فریب میں آتا ہے ۔
اس سے زچ ہو کر شاعر اپنے معشوق حقیقی سے کہتا ہے " تو کہاں چھپا ہے مشعل یقین
لے کر آ کہ جس کی زبردست روشنی میں میں یک در گیر و محکم گیر کا مصداق بن جاؤں
اور بار بار مجھے اپنی رائے نہ بدلنا پڑے ۔

یہ مفروضات تغزل میں مسلم ہیں کہ اگر شعر میں " میں " اور " تو "
.... آئے تو " میں " شاعر یا عاشق کے لئے ہوتا ہے اور " تو " معشوق کے لئے
.... آگے چل کر آپ کو انداز بیان پر بھی اعتراض ہے ۔ آپ کو مبارزہ
طلبی دکھائی پڑتی ہے ۔ آپ بچپن میں (Hide & Seek) .... ضرور
کھیلے ہوں گے .... مان لیجئے آپ چھپ گئے ہیں ۔ آپ کا کوئی دوست آپ
کو ڈھونڈ رہا ہے ۔ وہ بہت زچ ہو چکا ہے اور آپ نہیں مل رہے ہیں مگر اس کو
یقین ہے کہ آپ کہیں نزدیک ہی چھپے ہیں ۔ ایسی حالت میں وہ یقیناً یہی کہے گا
" بھائی نیاز نکلو کہاں ہو میں تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے پریشان ہو گیا " اگر اس سے
آپ سے کافی بے تکلفی ہے اور وہ زیادہ زچ ہو چکا ہے تو وہ چلا اٹھے گا " میرزا کہاں
چھپا ہے ۔ نکل " اس انداز بیان میں جو سچی التجا اور پریشانی کا سچا فوٹو ہے
وہ " آپ والے " تکلفانہ انداز میں کہاں .... یہ آپ کیا کہنے لگے کہ دوسرے
مصرعہ میں تاریکی کا مفہوم کسی لفظ سے پیدا نہیں ہوتا ۔ کیوں صاحب ! ....
تاریکی کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے آپ لفظ " مشعل " بیکار سمجھتے ہیں ....
مگر یہ نہ سمجھے کہ ذکر " مشعل " خود تاریکی کے وجود کی دلیل ہے ۔ تاریکی کا اور
کیا اشارہ چاہیے .... شعر تو مطلق نہیں سمجھے اور لگے اصلاح کرنے " مشعل یقین "

کو " حجت یقین " سے بدل دیا ۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ عقل و حجت سے شاعر زچ ہو چکا ہے اور آپ اس کو خواہ مخواہ وہی لفظ دے رہے ہیں جس سے اس کو غصہ آئے ۔

اس کے بعد آپ نے شعر کو بلند کیا ہے جس کی بلندی ظاہر ہے آپ اپنی مایۂ ناز بلندی سے چلا رہے ہیں " نہیں ہوں در خور ایقان " بیشک آپ میں یقین کی اہلیت نہیں اور یہ آپ ہی کو مبارک رہے ۔ اصغر صاحب کو اس کی ضرورت نہیں ۔ اور " یقین " کے بجائے " ایقان " کا روڑا جو آپ نے اصلاح میں اٹکا دیا وہ لطافت شعر کے لیے کتنا گراں بار ہے اس کو ذوق سلیم ہی سمجھ سکتا ہے ۔[1]

غرضیکہ نیاز صاحب کے بیشتر اعتراضات اور ان کے جوابات اسی قبیل کے ہیں ۔ اس کو عمدرداںہ مطالعہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیاز صاحب نے " تصوف ـــ یعنی جھاڑ پھونک " اور اصغر کی شاعری کے خلاف دل کا بخار نکالا ہے اور جب دل و دماغ " بخار زدہ " ہوں تو صحت مند تنقید و تبصرہ معلوم ۔

جدید ناقدین کے اعتراضات :

سطور گزشتہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ جدید ناقدین کو جن میں جناب خواجہ احمد فاروقی جناب ڈاکٹر مسعود حسین، جناب عبدالسلام جناب سجاد باقر رضوی ، جناب شارب ردولوی ، جناب مظہر صدیقی بطور خاص قابل ذکر ہیں ، اصغر کے کلام میں بعض نقائص اور کوتاہیاں (بلحاظ موضوع) نظر آتی ہیں جن کی وجہ سے اصغر کا کلام عصر حاضر ـــ یعنی جدید ذہن کے لیے اپنے اندر کوئی جاذبیت ، دلکشی اور افادیت نہیں رکھتا۔ اگر ان کوتاہیوں کو مجملاً بیان کیا جائے تو یوں کہیں گے کہ

" ان کے کلام میں ماورائیت ہے " اگر اس ماورائیت کی تشریح و تفصیل ان حضرات کے بیانات کی روشنی میں تلاش کی جائے تو حسب ذیل باتیں سامنے آتی ہیں :

(۱) اصغر کے کلام میں حسن و عشق کا تنزیہی تصور ہے ـــ یعنی " حسن مطلق " اور " عشق حقیقی " کی باتیں کرتے ہیں ۔ چنانچہ جناب شارب ردولوی جگر صاحب کے کلام

۱۔ نیاز صاحب کی جرات بیجا ـــ از عشرت گونڈوی ، الناظر اگست ۱۹۳۶ء ، صفحہ ۳۶-۴۳(ملخص

پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

" اصغر کی فیض صحبت نے ان کے کلام میں ایک عارفانہ سرمستی پیدا کر دی تھی اور انھیں کے اثر سے جگر کو بھی تصوف سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اور ان کے کلام میں صوفیانہ ماورائیت کی آمیزش ہوئی[1] ۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :

" اصغر کے یہاں تصور عشق ماورائی زیادہ ہے[2] ۔"

اس سے بعض ناقدین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اصغر کے اس رویے سے ان کے کلام میں جذبات کی وہ گرمی نہیں ہے جو عشقیہ شاعری کی جان ہوتی ہے ۔ دوسرے یہ کہ یہ فرسودہ باتیں ہیں ان سے انسانی زندگی کو کیا فائدہ پہونچتا ہے ان حضرات کے نقطہ نظر سے عشقیہ شاعری میں جذبات کی گرمی ، رونق اور آبادی " جنسی محبت " کے معاملات و واردات سے آتی ہے اور اصغر کے کلام میں چوں کہ ان واردات و معاملات کا ذکر نہیں ہے اس لیے اس میں ایک طرح کی " ماورائیت " ، بے رونقی اور برودت آ گئی ہے ۔ گویا دوسرا نقص ان کے کلام میں یہ ہے کہ

(۲) " اس میں جنسی محبت کا اظہار و بیان نہیں ہے "

اس بنیادی نقص کو مختلف ناقدین نے اپنے اپنے انداز میں ظاہر کیا ہے ۔ سطور گزشتہ میں جناب نیاز فتحپوری کا طویل اقتباس پیش کیا جا چکا ہے جس میں اس امر پر زور دیتے ہوئے انھوں نے رقم فرمایا ہے :

" غزل نام ہے ان باتوں کا جو گوشت پوست والے عاشق اور گوشت پوست والی معشوقہ کے درمیان ہوا کرتی ہے ۔"

جناب خواجہ احمد فاروقی رقمطراز ہیں :

" اصغر ہماری گوشت پوست کی رگوں پر زخمہ زن نہیں ہوتا ...
.... عاشق اور محبوب کے " تعلقات جنسی " کو کبھی ان کا شعور لطیف اور رنگین نہیں بنا سکا ۔ اسی لیے ان کی روحانیت

۱۔ جگر فن اور شخصیت ۔ شاہین پبلشرز الہ آباد ۔ طبع اول ۱۹۶۱ء ۔ صفحہ ۱۲۰

۲۔ ایضاً ۔ صفحہ ۱۸۲

بھی کچھ ویران سی ھے اور ان کی محبت بھی بے رونق ۔
ان کے تخئیل میں رنگینی ھے لیکن جذبات میں گرمی نہیں ھے [۱] ۔"

قریب قریب یہی بات جناب عبدالسلام نے بھی کہی ھے ۔ وہ فرماتے ھیں :

" اصغر کے مزاج میں بڑی نفاست تھی ۔ یہی نفاست ان کی شاعری میں نظر آتی ھے ۔ یہ تمام چیزیں قابل قدر ھیں لیکن عشقیہ شاعری میں محض نفاست ، شرافت اور رنگینی تخئیل ناکافی ھیں .... ممکن [×] ھے اخلاقیات کی دنیا میں اس کی قدر ھو لیکن عشقیہ شاعری میں اس کے لیے یقیناً کوئی ثواب [*] مخصوص نہیں ھے .... زیادہ افسوس اس بنا پر ھے کہ ... ... وہ جان بوجھ کر جمالیاتی تجربات کو تصوف میں لپیٹ کر پیش کرتے ھیں [۲] ۔"

جناب نظیر صدیقی نے جگر پر اظہار نظر فرماتے ھوئے تحریر فرمایا ھے :

" حسن کی اداؤں اور عشق کی آرزوؤں جگر کی شاعری کے نمایاں موضوعات ھیں لیکن وہ ان اداؤں کے بیان اور آرزوؤں کے اظہار میں " حد ادب " کے قائل ھیں .... شاید ...... اصغر کی طرح جگر بھی شاعری میں شائستگی اور شرافت کے ضرورت [**] سے زیادہ قائل ھیں [**۳] ۔"

۱۔ اصغر کی شاعری از خواجہ احمد فاروقی بحوالہ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور ۔ صفحہ ۱۲۵

۲۔ اصغر گونڈوی ۔ عبدالسلام بحوالہ تخلیق و تنقید ۔ صفحہ ۲۵۶-۲۵۲

×۔ گویا جناب عبدالسلام کے نزدیک اخلاقیات کی دنیا میں بھی اس کی کوئی قدر نہیں ۔

*۔ یعنی عشقیہ شاعری ثواب کی نیت سے کی جاتی ھے اور ثواب صرف اسی صورت میں ملے گا جب اس میں " جنسی محبت " کے معاملات کا برملا اظہار کیا گیا ھو ۔

**۔ جناب نظیر صدیقی نے یہ نہیں فرمایا کہ اس ضرورت کی " حد " کون متعین کرے گا۔ ایک شخص کی ضرورت اسے بر سر عام " بوس و کنار " اور " جذبۂ جنس " کی تسکین پر آمادہ و مجبور کرتی ھے ۔ اس کے عملی اظہار اور شاعری میں اس کے اظہار کے متعلق کیا ارشاد ھے؟ کیا تہذیب و شائستگی کے معیار (جو مذھب اور اخلاقیات نے متعین کر دیا ھے) کے علاوہ بھی کوئی معیار ھے یا ھو سکتا ھے؟

۳۔ جگر مرادآبادی ۔ تاثرات و تعصبات ۔ صفحہ ۲۱۰

اصغر کی شاعری سے یہی شکایت جناب سجاد باقر رضوی کو بھی ہے ۔ وہ رقمطراز ہیں :

" ان کی شاعری میں معاملہ بندی نہیں ۔ عشق کے وہ تجربے نہیں جو جسمانی سطح کے ہیں ان کے رکھ رکھاؤ اور پرتصنع معاملات زندگی نے انہیں شاید اس بات کی اجازت ہی نہیں دی ۔ نتیجہ ظاہر ہے اصغر موضوعات ، زبان ، موڈ ، پیرایۂ بیان کے اعتبار سے بالکل محدود ہو گئے ۔"[۱]

(۳) تڑپتے ہوئے مسائل کا فقدان :

اصغر کی شاعری پر چوتھا اعتراض یہ ہے کہ وہ زندگی کے تڑپتے ہوئے مسائل سے آنکھیں بچا کے نکل گئے ، ان کے ارتسامات ان کی شاعری میں نظر نہیں آتے ۔ چنانچہ ڈاکٹر مسعود حسین رقمطراز ہیں :

" اس میں ...... ہماری سماجی زندگی کے تڑپتے ہوئے مسائل نہیں .... اصغر کی غزل " خلش ہائے روزگار" کی متحمل نہیں ۔ اس لیے ان کی شاعری پر عہد جدید کا ٹھپہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کی شاعری یا تو عہد قدیم کی یادگار سمجھی جائے گی یا دور کے دور مستقبل کی بہار۔"[۲]

(۴) واردات کا فقدان :

اس کی توضیح فرماتے ہوئے جناب ڈاکٹر مسعود حسین رقمطراز ہیں :

" سوالیہ نشان قائم کرنے کے بعد ہی اس زمانہ میں ماورائی شاعری کا جواز تلاش کیا جا سکتا ہے ۔ میں نے اصغر کی شاعری کو ماورائی بالقصد کہا ہے ۔ صوفیانہ شاعری ہو کہ عشقیہ ، اصغر کہیں[*] بھی واردات میں مبتلا نظر نہیں آتے ۔

۱۔ اصغر گونڈوی ۔ تہذیب و تخلیق ۔ صفحہ ۱۲۲

۲۔ اصغر گونڈوی اور جدید تنقید ۔ انتخاب اصغر ۔ صفحہ ۲۲-۲۱ (ملخص)

*۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ فتویٰ اصغر کی عام شاعری کے متعلق ہے ۔

ایک فاصلہ ہے جو ان کے اور واردات کے درمیان ضرور نظر آئے گا۔ اس فاصلہ کی وجہ سے ان کے کلام میں کمال درجہ کی شگفتگی آ گئی ہے ۔ یہ شگفتگی براہ راست اس بے لاگی سے پیدا ہوتی ہے جو شاعر اور اس کی واردات کے مابین ہے [1]۔"

(۵) اصغر کی صوفیانہ شاعری دل کی نہیں دماغ کی ہے :

یہ اعتراض جناب خواجہ احمد فاروقی کا ہے ۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :

" ہر چند کہ اصغر کو شاہ عبدالغنی صاحب سے شرف بیعت حاصل تھا لیکن ان کے صوفیانہ کلام کا تعلق دماغ سے زیادہ ہے اور دل سے کم ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قلب ماہیت دشگاہ کے بجائے کتاب سے ہوئی تھی ۔ درد اور آتش کا سوز ان کے یہاں نہیں ہے [2]۔"

(۶) " وہ ہمیشہ دنیا کی سطح سے کچھ بلند رہتے ہیں " :

اس اجمال کی تفصیل جناب عبدالسلام اس طرح فرماتے ہیں :

" وہ ہمیشہ دنیا کی سطح سے کچھ بلند رہتے ہیں ۔ وہ دنیا کا مشاہدہ انہوں نے ضرور کیا ہے لیکن دنیا سے کچھ بلند ہو کر ۔ وہ روداد چمن اس طرح سنتے ہیں جیسے انہوں نے گلستاں دیکھا ہی نہیں ۔ افسانہ ہستی بھی وہ کہیں دور ہی سے سنتے ہیں ۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس سے انہیں زیادہ واسطہ نہیں وہ تو صرف دنیا کی رنگینیوں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں ...... اصغر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن سے ان کے رجحان پر روشنی پڑتی ہے :

سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی — کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرز ادا ہے

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں — جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

۱۔ اصغر گونڈوی اور جدید تنقید ۔ انتخاب اصغر ۔ صفحہ ۳۲

۲۔ اصغر کی شاعری ۔ بحوالہ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور ۔ صفحہ ۱۵۳

بلبل و گل میں جو گزری ہم کو اس سے کیا غرض — ہم تو گلشن میں فقط رنگ چمن دیکھا کئے
دوڑتے پھرتے تھے جلوے ان کے " موج نور" میں — دور سے ہم راز شمع انجمن دیکھا کئے[1]

(۷) انسان پرستی کے بعد کی کمی :

جناب سجاد باقر رضوی نے اصغر کا مطالعہ کرتے وقت شدت سے اس کی کمی محسوس کی ہے ۔ چنانچہ اس کمی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے، رقمطراز ہیں :

" اصغر " درد ہجر " اور " لذت وصل " کے موضوع سے گھبرائے ہوئے ضرور لگتے ہیں اس لیے کہ شاید اس میں انسانی عشق کی بو آتی ہے یا شاید غزل کو دھو کر پاک کرنا چاہتے تھے ...... اس بلند نظری کا اثر ان کی شاعری پر یہ ہوا کہ وہ انسان اس کے احساسات و جذبات ، حیات و کائنات سے اس کا رشتہ ، یہ سب کچھ بھول گئے ۔ ان کی نظر بلند تو ہوئی مگر خلاؤں سے شاعری کے موضوعات نہیں آتے وہ تو زندگی سے پیدا ہوتے ہیں اسی لئے اردو شاعری کی روایت کی ایک " بعد " (Dimension) اور کم ہو گئی ۔ یہ " بعد " انسان پرستی(Humanism) کے نظریہ پر مبنی تھی[2] ۔"

(۸) " اصغر کی شاعری کو نئی شاعری نہیں کہہ سکتے" :

یہ فتویٰ جناب سجاد باقر رضوی کا ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

" نئی شاعری کی زبان عام بول چال کی زبان سے قریب ہونا چاہیے[3] ۔"

(اور اصغر کی شاعری اس " حسن " سے عاری ہے ------ مقالہ نگار)

۱۔ اصغر گونڈوی ۔ تخلیق و تنقید ۔ صفحہ ۲۲۷-۲۲۶

۲۔ اصغر گونڈوی ۔ تہذیب و تخلیق ۔ صفحہ ۱۵۸-۱۵۷

۳۔ اصغر گونڈوی ۔ تہذیب و تخلیق ۔ صفحہ ۱۲۵

(۹) " منزل کی طرف اشارہ نہیں ہے" :

یہ اعتراض جناب خواجہ احمد فاروقی کی طرف سے کیا گیا ہے - کسی نقاد نے (فاروقی صاحب نے حوالہ نہیں دیا) اصغر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہیں لکھا تھا کہ

" غزل گو شعرا میں صرف اصغر ہی ایسے ہیں جنھوں نے سماجی انقلابات اور زمانہ کی تبدیلی کو محسوس کر کے غزل کے ساز پر گایا -"

اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے فاروقی صاحب تحریر فرماتے ہیں :

" یہ رائے اس شاعر کے متعلق صحیح نہیں ہو سکتی جو اپنے کو ماہ و انجم کا ہم نشین سمجھتا ہو جو رنگ چمن کو دور سے دیکھنے کا عادی ہو

" دور سے ہم راز شمع انجمن دیکھا کئے "

...... جو " تاب خلش ہائے روزگار" نہ رکھتا ہو - جو افسانہ" ہستی کو اس سے زیادہ کچھ نہ سمجھے

" کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے، کچھ طرز ادا ہے"

...... اصغر ہمیں یہ تو بتلاتے ہیں کہ زندگی کی راہ پر پیچ اور مشکل ہے لیکن وہ کیا دقتیں ہیں اور منزل مقصود کیا ہے - اس کی طرف وہ اشارہ بھی نہیں کرتے[۱] -"

اگر ان مذکورہ بالا اعتراضات پر فرداً فرداً ناقدانہ نظر ڈال کر ، حق و انصاف کی روشنی میں ان کی معقولیت یا غیر معقولیت کے متعلق کوئی فیصلہ کر لیا جائے تو اصغر کے شاعرانہ مرتبہ کے تعین میں اس سے بڑی مدد ملے گی - ذیل میں اسی کی کوشش کی جاتی ہے :

پہلا اعتراض " حسن و عشق کا تنزیہی تصور "

اس سے مستنبط ہونے والے جن دو اعتراضات یا نقائص کی طرف سطور گزشتہ میں اشارہ کیا گیا تھا وہ درج ذیل ہیں :

اول یہ کہ اس کے کلام میں گرمی نہیں پیدا ہوتی جو عشقیہ شاعری کی جان ہے-

---

۱- اصغر کی شاعری - بحوالہ " اصغر" مرتبہ عبدالشکور - ص ۱۳۹

اس کا جواب نیاز صاحب کے اعتراض کے جواب میں دیا جا چکا ہے اور اصغر کے کلام سے اشعار پیش کر کے ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ کلام میں گرمی پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ کہ کلام میں عمق و گہرائی، نزہت و لطافت اور شائستگی و پاکیزگی آتی ہے۔

دوم یہ کہ " یہ فرسودہ باتیں ہیں اس سے انسانی زندگی کو کیا فائدہ پہونچتا ہے؟ "

اس کا جواب تفصیل چاہتا ہے جو آئندہ سطور میں پیش کی جائے گی۔ یہ قریب قریب وہی اعتراض ہے جو اصغر کے زمانہ میں بھی کیا گیا تھا اور جس کا جواب انھوں نے تفصیل سے دیا تھا (ملاحظہ ہو " عقائد و افکار "، مقالہ ھذا، صفحہ ۲۴۳-۲۴۹) - یہاں اس کا آخری حصہ پیش کیا جاتا ہے:

" حقیقی صاحبان ذوق نے " حسن مطلق " کو اپنی شیفتگی اور وارستگی کا موضوع قرار دیا ---- " حسن مطلق " کسی پرستش کے یہ معنی ہیں کہ " حسن " کہیں ہو کسی صورت میں ہو، کسی مرتبہ اور کسی شعبۂ حیات میں ہو اس کو ہر جگہ پہچانا جائے اور ہر مقام پر اس کا صحیح حق ادا کر دیا جائے - یہ صحیح ہے کہ " حسن کامل " یا " حُسنِ مطلق " سے لطف اندوز ہونے کے لیے صلاحیت درکار ہے - دیکھنے میں تمام انسان انسان ہیں مگر ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو یا تو صرف " دل " ہیں یا صرف " دماغ " - کچھ ایسے ہیں کہ " شکم و بہیمیت " کے سوا ان کی کوئی ہستی ہی نہیں - " کمال حسن " کی شناخت کے لئے " انسانیت " کی تکمیل ضروری ہے - پس اگر وہ نہیں ہے تو یہ رونے کا مقام ہے دلیری اور خیرہ چشمی سے اس پر معترض ہونے کا نہیں .... حقیقت و صداقت دوسروں کی نااہلی و کم فہمی کی ذمہ دار نہیں[1] - "

۱- اردو شاعری کی ذہنی تاریخ - دہلی اور لکھنؤ اسکول - زمانہ ستمبر ۱۹۲۹ء - ص ۱۳۸

دوسرا اعتراض :

" ان کی شاعری میں " جنسی محبت " کا اظہار و بیان
نہیں ہے اسی لئے ان کی روحانیت ویران سی ہے اور محبت
بے رونق "

اصل میں اصغر اور ان کے ناقدین کے درمیان نقطۂ نظر کا اختلاف ہے
(تفصیلی بحث آگے آئے گی) اصغر عورت اور اس کے تعلقات کو " خلوت کدہ کا راز "[1]
اور اس کے اظہار و بیان کو " فسق و بزدلی " بلکہ بے حسی و بے غیرتی[2] " سے تعبیر
کرتے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے " نظریۂ فن " ---- شعر و غزل مقالہ ھذا
صفحہ ۳۸۹-۳۸۷ ، اور " رنگ مجاز کی آخری حد " صفحہ ۴۰۷) جب کہ ان کے ناقدین
اس کو شعر و شاعری میں گرمی ، رونق اور آبادی اور شاعری کی گرم بازاری کا موجب
ٹھہراتے ہیں - ایک شخص جو ایسی باتوں سے اجتناب و گریز کو حیا و عفت اور پاکیزگی و
شائستگی سمجھتا ہو اس سے ان کے اظہار کی توقع فضول ہے -

جہاں تک کلام میں گرمی اور رونق کا تعلق ہے تو ایسا بھی نہیں ہے
کہ " حسن پرستی " نے (جو شعرا خصوصاً صوفی شعرا کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے) ان
کو " حسن مجاز " کی رنگینیوں اور لطافتوں کی عکاسی پر مجبور نہ کیا ہو - لیکن انھوں
نے اپنی " جنسی خواہش " کو (فرائڈ کے نقطۂ نظر سے کسی چیز میں حسن و کشش
کا احساس جنسی خواہش کا نتیجہ ہوتا ہے ---- یہ صرف حسن کی مادی تفسیر و
توجیہہ ہے) " لذت نگاہ " سے آگے نہیں بڑھنے دیا کہ ان کے نقطۂ نظر سے

" مہذب معاشرہ میں شعرا کی رنگین مزاجی اور زندہ دلی
کی ...... آخری حد ایک ضیافت نظر و لذت نگاہ سے
زیادہ نہیں[3] - "

اس لئے انھوں نے حسن و عشق کے ایسے معاملات (جن سے جنسی خواہش کو تحریک یا
اشتعال ہو یا جن تصویروں کو دیکھ کر لذت گیر و لطف اندوز ہونے کے بجائے شرم و حیا

۱- انجمن اردوئے معلیٰ بسلسلہ استفسارات - سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۲۶ء - صفحہ ۱۰۶
۲- ایضاً
۳- مقدمہ یادگار نسیم - صفحہ ۵

کی نظریں جھک جائیں) کی تصویر آفرینی سے اجتناب کیا ہے - ان کے یہاں صنفی خواہش کی " ناپختہ اور نیم شائستہ " شکل نہیں ملتی جو عام طور پر عشقیہ شاعری کی جان سمجھی جاتی ہے بلکہ اس کی اشتہائیں " شائستہ ، رفیع اور مرتفع " صورت جو " تخیل و تخئیل " کے رنگین شیشے میں اتر کر " حسن خیال اور حسن نظر " بن جاتی ہے، ان کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے - انھوں نے جسمانی معاملات کے بجائے، جسم کی رنگینیوں اور لطافتوں کی باز آفرینی کی ہے - اپنے اسی نقطہ نظر کی وضاحت انھوں نے درج ذیل شعر میں کی ہے - جس کی تشریح و تفسیر لوگوں نے غلط کی ہے - شعر یہ ہے ؎

بلبل و گل میں جو گزری ہم کو اس سے کیا غرض ہم تو گلشن میں فقط رنگ چمن دیکھا کئے

یعنی ہمیں بلبل و گل کی واردات و معاملات سے کوئی غرض نہیں - ہمیں تو گل کی " شعلگی " ---- " حسن " اور " بلبل کی شعلہ نوائی اور آتش زیرپائی " ---- " عشق " سے سروکار ہے کہ یہی چمن میں رنگ و بو اور گرمی کا سبب ہیں -

جناب عابد رضا بیدار نے صحیح فرمایا ہے :

" عشق ہوس پوری کر لینے ہی کا نام نہیں - ناکام عشق ، ترس ترس کر رہ جانے والا عشق ، ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے کا انداز، مجاز کی آلودگیوں کے بجائے مجاز کی رعنائی اور لطافت اور محبوب کے بجائے اس کے حسن کا ذرا فاصلہ سے لطف اٹھانے کا انداز ہے ---- یہ ہے بڑا عشق اور اسی کے بل پر دنیا کے عظیم ترین کارنامے انجام پائے ہیں - اصغر نے اس قسم کی شاعری میں مرصع کاری کی ہے ----"[1]

بات طویل ہوتی جا رہی ہے اس لئے اس کو یہیں ختم کیا جاتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ ہذا " تصور محب و محبوب " صفحہ ۲۰۴ - ۲۰۵)- اور اصغر کے کلام سے خالص " رنگ مجاز " کے دو چار اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے اعتراض باطل ہو جاتا ہے :

جلوہ رنگیں اتر آیا نگاہ شوق میں ہم لطافت جسم کی اے سیم تن دیکھا کئے

زاہد نے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

۱- اصغر کا مطالعہ - عابد رضا بیدار - آجکل جون ۱۹۵۷ء - صفحہ ۲۱

رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی　　شعاعیں کیا بنیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

کچھ نہ ہم سے ہو سکا اس اضطراب شوق میں　　ان کے داماں کو مگر اپنا گریباں کر دیا

رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برق تبسم بھی　　لہریں سی جو اٹھتی ہیں کچھ چشم تمنا سے

اشک اب نہیں تھمتے دل پہ اب نہیں قابو　　خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے سے

تیسرا اعتراض:

" خلش ہائے روزگار یا تڑپتے ہوئے مسائل کا فقدان "

اس کا مختصر ترین جواب تو یہ ہے کہ ناقدین جدید نے اصغر کے کلام میں جن مسائل کے فقدان کا احساس دلا کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ " اصغر اگلے وقتوں کے لوگ ہیں، یہ ان کی تنقید کا یک رخا پن ، سطحیت اور ان کی کم نظری ہے ۔ اسی مقالے میں جا بجا یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اصغر کے کلام میں " عصری تقاضے " کی گہری چھاپ ہے ۔ کیا " عظمت آدم " ، " وحدت آدم " ، " احترام آدمیت " " آزادی " اور " احساس ذات " آج کے انسان کے تڑپتے ہوئے مسائل نہیں ہیں؟ ----- اصل میں یہ قباحت اس لیے پیدا ہوئی کہ ان مسائل کے اظہار کے جس رخ اور نہج کی تلاش یہ حضرات اصغر کے کلام میں کرتے ہیں وہ وہاں نہیں ہے ۔ یہ مسائل ان کے یہاں اس رخ سے ، اتنے واضح ، نامہذب اور خام پختہ صورت میں نہیں بیان ہوئے وہ اپنے ساتھ بہت ہی لطیف شاعرانہ پیکر لے کر آئے ہیں جہاں تک عموماً نگاہ نہیں جاتی اور لوگ اسے اصغر کا تصوف کہہ کر گزر جاتے ہیں ۔

اس کے علاوہ " تڑپتے ہوئے مسائل " کی نوعیت اور ان کے تقدم و ترجیح میں اصغر اور ان کے نقادوں کے درمیان اختلاف ہے (تفصیل آگے آئے گی) مثلاً ناقدین اصغر صرف " جسمانی مسائل " کو انسان کا اصل مسئلہ سمجھ کر انھوں نے اس کے دوسرے اہم اور سنگین مسائل کو نظرانداز کر دیا ہے جب کہ اصغر ان مسائل کے ساتھ روحانی مسائل کو بھی اہمیت بلکہ جسمانی مسائل پر ترجیح دیتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں " انسان کا سب سے اہم اور سنجیدہ مسئلہ شکم و جنس کا مسئلہ نہیں، روح کا مسئلہ ہے جس کی بنا پر وہ حیوانوں ہی سے نہیں فرشتوں سے بھی بلند ہے ۔ اور میری شاعری انسان میں اسی عظمت و بلندی کا احساس پیدا کر کے، اسے انسانیت کے مقام اعلیٰ پر فائز کرنا چاہتی ہے ۔ *

-----

*۔ واوین کے الفاظ مقالہ نگار کے ہیں ۔ اصغر کا اقتباس نہیں ہے ۔ البتہ الفاظ میں چھپی ہوئی روح اصغر کی ہے ۔

جناب ڈاکٹر مسعود کا یہ ارشاد کہ

" ان کی شاعری پر عہد جدید کا ٹھپہ نہیں لگایا جا
سکتا ۔ ان کی شاعری یا تو عہد قدیم کی یادگار سمجھی
جائے گی یا دور کے دور مستقبل کی بہار "

ایک " غلطہ منطقی " سے زیادہ نہیں ۔ گویا ڈاکٹر صاحب نے خود بھی یہ تسلیم کر لیا ہے اور دنیا کو بھی یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ آج کا انسان صرف " شکم پہیمت " ہے ۔ اور وہ " روح اور اس کے مطالبات و ضروریات " سے بے نیاز ہے ۔

دوسری بات جو ڈاکٹر صاحب نے یہ فرمائی ہے کہ

" پیٹ اور پیٹ کا مسئلہ جب عمومی طور پر حل ہو جائے گا
تو " جہان راز " کی بات پھر چھڑے گی "

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ " پیش گوئی " درست ثابت ہوگی ۔ قرائن تو یہ بتا رہے ہیں کہ اس وقت " شکم و جنس " انسان پر اتنے غالب آ چکے ہوں گے کہ " روح اور روحانیت " کا لفظ ہی اس کے لغات زندگی میں نظر نہ آئے گا ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے مطابق ان ممالک میں جہاں یہ مسائل کاملاً یا بڑی حد تک حل ہو چکے ہیں، یقیناً " جہان راز " کی تحقیق و تدقیق اسی طور پر ہو رہی ہوگی جس طرح " تسخیر کائنات " یا " ہلاکت آدم " کی کوششیں ہو رہی ہیں؟ ----
حقیقت یہ ہے کہ " جسم و روح " کی جو " آویزش چپقلش " پہلے انسان سے شروع ہوئی ہے وہ آخری انسان تک برابر جاری رہے گی ۔ ڈاکٹر صاحب کا ماضی ، حال اور مستقبل کا تصور ناقص ہے ۔ زمانہ اور انسان ایک ہی وحدت کی دو مختلف شکلیں ہیں ۔ جس طرح " دور جاہلیت قدیم " میں بعض لوگوں کے نزدیک جسم کو روح پر تقدم و ترجیح حاصل تھی اسی طرح ~~دور جدید کے~~ اس مشور و روشن دور میں بھی حاصل ہے جس طرح قرون ماضیہ میں کچھ لوگ " روحانی اقتدار " کے قیام و بقا میں کوشاں رہے اور انھوں نے اپنے تمام ذرائع و وسائل کو اس کام میں صرف کر دیا ۔ اسی طرح آج بھی لوگ اس میں لگے ہوئے ہیں اور آئندہ بھی اسے جاری رکھیں گے ۔ یہ انسان کا ازلی و ابدی مسئلہ ہے ۔ اصغر اسی روحانی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں ۔ یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور انھیں کے قبیل کے دوسرے نقاد ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ کو، شعر و ادب میں رومن کیتھولک مابعد الطبیعاتی تصورات اور روحانی اقتدار کی تبلیغ و اشاعت کے باوجود ، دور جدید کا " بطل عظیم " اور اس عہد کو

" عہد لیلیٹ " قرار دیتے ہیں اور اسے اپنی روشن خیالی ، ترقی پسندی اور حق شناسی تصور کرتے ہیں لیکن انہیں بنیادیں (روحانی اقدار) پر اصغر کی شاعری پر " عہد جدید کا شبہہ " تسلیم کرنے میں انہیں تکلف ہوتا ہے ۔ اگر روحانی اقدار کی فراوانی کی وجہ سے کسی کو اصغر کے کلام میں " جنسی معاملات " یا " زندگی کے تڑپتے ہوئے مسائل " کی کمی محسوس ہوتی ہے تو یہ اصغر کے بجائے خود اس کا نقص ہے کہ وہ اسے غلط جگہ پر تلاش کر رہا ہے ۔ دیکھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ اصغر کے یہاں کن مسائل کی کمی ہے دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے جن مسائل کو انسان کے " تڑپتے ہوئے مسائل " سمجھ کر، اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے ان کے اظہار و ابلاغ میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں ۔

چوتھا اعتراض:

" واردات کے فقدان " ـــ ڈاکٹر مسعود حسین فرماتے ہیں :

" صوفیانہ شاعری ہو کہ عشقیہ اصغر کہیں واردات میں مبتلا نظر نہیں آتے ، ایک فاصلہ ہے جو ان کے اور واردات کے درمیان ضرور نظر آئے گا ۔"

ڈاکٹر صاحب نے یہ بہت بڑا دعویٰ کیا ہے اسی پر اصغر کے " شاعر یا ناشاعر" ہونے کا دارو مدار ہے ۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ " کہیں واردات میں مبتلا نظر نہیں آتے " تو وہ محض تک بند رہ جاتے ہیں اور اگر اس کو غلط ثابت کر دیا جائے تو اصغر کی " شاعرانہ حیثیت " مسلم و موثق ہو جاتی ہے ۔ مگر دقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے " واردات " کا مفہوم متعین نہیں کیا تاکہ اس رخ سے بحث کی جاتی ۔ اس لیے پہلے " واردات " کے معنی متعین کئے جاتے ہیں پھر اس کی روشنی میں بحث کو آگے بڑھایا جاتا ہے ۔

" واردات " کے معنی وارد ہونے والی (کیفیات) ـــ یعنی خارجی دنیا کے کسی واقعہ یا سانحہ سے انسان کے بطون میں پیدا ہونے والی کیفیات ، جن سے اس کا جذباتی نظام متاثر و متحرک ہو جائے ــ " واردات " ہی کو ہم " تجربہ " بھی کہیں گے یعنی ایسے " جذباتی اور حسیاتی " ارتعاشات و اهتزازات یا طغیان و ہیجان جن سے انسان خودگزارا ہو ـــ اس حیثیت سے کوئی انسان ایسا نہیں ہے کہ وہ " واردات " میں مبتلا

نہ ہو اگر یہ کہ وہ " فرشتہ ہو یا پتھر " ـــــ پھر شاعر جس کے متعلق یہ کلیہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ وہ عام انسانوں سے زیادہ ذکی الحس اور شدیدالاحساس ہوتا ہے وہ کیوں کر اس سے محروم ہوگا۔

" واردات " کی اس تشریح کے بعد اب یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس کا اظہار کیسے ہوتا ہے ۔ اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر " واردات " سے انسان کے باطن میں اس کا " ردعمل " رونما ہوتا ہے ۔ یہی " ردعمل " " واردات " میں مبتلا انسان کے حرکات و سکنات ، چیں بپیشانی ، چہرے بشرے ، تشخص و آواز یا کسی دوسرے علامات کے وسیلہ سے ظاہر ہوتا ہے (جس کو واردات کا اظہار سمجھا جاتا ہے)۔ اظہار واردات کی ایک شکل تو وہ ہوتی ہے جہاں " ردعمل " فوراً انتہائی ناپختہ ، نامہذب اور خام شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے دوسری شکل وہ ہوتی ہے جہاں " واردات " عمل تقطیر و تطہیر کے ذریعہ ، ذہن و تخیل میں اتر کر، ذہنی و تخیلی کیفیت میں جاتی ہے (یہ اس کی استہائی مقطر ، شائستہ اور لطیف صورت ہوتی ہے) اس کے اظہار میں بھی حد درجہ نرمی شائستگی و لطافت ہوتی ہے ۔ عام طبائع ان لطیف واردات سے محظوظ نہیں ہو پاتیں ۔ اصغر کے کلام میں اسی قسم کی " مقطر ، مُطَہَّر اور لطیف واردات " کی فراوانی ہے ۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ڈاکٹر مسعود کے دعوے کے مطابق کیا واقعی اصغر کی شاعری واردات سے خالی ہے؟ ۔ سطور گزشتہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ " واردات " (یعنی واردات کے ردعمل) کا اظہار کسی علامت کے ذریعہ ہوتا ہے ۔ یہاں چوں کہ شاعری زیر بحث ہے اس لئے " واردات " کی تلاش لفظی علامات (جو دراصل شاعر کے جذباتی یا وارداتی پیکر ہوتے ہیں) میں کرنا ہوگی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی شاعر کے الفاظ کو کھرکھلا اور بے کیف یا پراثر اور باکیف کہنے کے لیے ہمارے پاس کیا معیار ہے ۔ ابھی تک سائنس اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں کر سکی جس سے کسی کی زبان یا قلم سے نکلی ہوئی کسی " لفظی علامت " کی کیفیت یا اثر کو ناپا جا سکے ۔ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے معاملہ میں تو بہت سے دوسرے " قرائن و شواہد " ایسے ہوتے ہیں ، جن کی مدد سے ان کے پیچھے چھپی ہوئی کیفیت و اثر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن کاغذ پر بکھری ہوئی " عبارت یا شعر " کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے ۔ یہاں تو لے دے کے " ذوق و وجدان " ہی کا معیار رہ جاتا

ہے - یعنی اگر کسی عبارت یا شعر کی قرات یا تسمیع سے ہمارے حسیات و جذبات میں
اہتزاز و ارتعاش یا ہیجان و طغیان پیدا ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ شاعر یا ادیب
پر یہ کیفیت گزری ہے ---- لیکن ہے یہ بہت ہی نازک ، لطیف اور غیر صحیح
(INACCURATE---- سائنسی نقطہ نظر سے) معیار - اس لئے کہ " وجدان لطیف"
اور " ذوق سلیم " میں دو انسان برابر نہیں ہوتے تاہم جب تک سائنس کوئی " مقیاس
الکیف " نہیں ایجاد کرتی ، کیف و اثر کا فیصلہ ذوق و وجدان ہی کے ذریعہ کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے جملے میں " کہیں " لکھ کر یہ کہنا چاہا ہے کہ اصغر
کی " عام شاعری " واردات یعنی کیف و اثر سے خالی ہے - بڑی مشکل یہ ہے کہ اصغر
کے کلام سے زیادہ اشعار مثال میں پیش نہیں کئے جا سکتے کیوں کہ بات بہت طویل ہو
جائے گی اس لئے صرف یہاں سات شعر پر اکتفا کی جاتی ہے وہ بھی ایک ہی غزل سے
کہ بقول اصغر " شاعر کو اسی طرح سمجھنا چاہئیے "[1] - ان اشعار کو پڑھ کر خود فیصلہ
کیجئیے کہ ان میں " واردات قلب " پیدا ہوتی ہیں یا نہیں :

وہ سامنے ہیں نظام حواس برہم ہے	نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے
زمیں سے تا بہ فلک کچھ عجیب عالم ہے	یہ جذب مہر ہے یا آرزوئے شبنم ہے
بہار جلوۂ رنگیں کا اب یہ عالم ہے	نظر کے سامنے حسن نظر مجسم ہے
خوشا حوادث پیہم خوشا یہ اشک رواں	جو غم کے ساتھ ہو تم بھی تو غم کا کیا غم ہے
یہ ذوق سیر یہ دیدار جلوۂ خورشید	بلا سے قطرۂ شبنم کی زندگی کم ہے
کسی طرح بھی تری یاد اب نہیں جاتی	یہ کیا ہے روز مسرت ہے یا شب غم ہے
کہاں زمان و مکاں پھر کہاں یہ ارض و سما	جہاں تم آئے یہ ساری بساط برہم ہے

پانچواں اعتراض :

" اصغر کی صوفیانہ شاعری دل کی نہیں دماغ کی ہے " ---- یعنی
صوفیانہ واردات سے خالی ہے - اس سلسلہ میں خواجہ احمد فاروقی صاحب رقمطراز ہیں :

> " ان کے (اصغر کے) صوفیانہ کلام کا تعلق دماغ سے زیادہ
> ہے اور دل سے کم - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قلب ماہیت
> دماغ کے بجائے دل سے ہوتی تھی - درد اور آتش کا سوز ان کے
> یہاں نہیں ملتا -"[2]

۱- مرحوم اصغر گونڈوی- گنج ہائے گرانمایہ - مطبوعہ آئینہ ادب لاہور بار پنجم ۱۹۶۲ء - ص ۱۲۵

اس اقتباس سے یہہ واضح ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب کی یہہ رائے اصغر کی عام شاعری کے بارے میں ہے اس لیے ان کی عام شاعری ہے کے پس منظر میں اس کے جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے -

قول بالا کے تجزیے سے دو اعتراض مستنبط ہوتے ہیں :

(الف) " ان کا کلام صوفیانہ واردات سے خالی ہے " --- اس کا تفصیلی جواب سطور گزشتہ (نیازؔ صاحب کے پہلے اعتراض اور چوتھے اعتراض) میں دیا جا چکا ہے اس لئے انہیں باتوں کی تکرار ، تکرار بےجا ہوگی -

(ب) " درد اور آتش کا سوز ان کے یہاں نہیں ملتا " - درد اور اصغر کے تقابلی مطالعہ میں بہ دلائل ثابت کیا جا چکا ہے کہ درد کے یہاں اکثر صوفیانہ اصطلاحات کی بے کیف شاعری ملتی ہے اس کے مقابلہ میں اصغر کے یہاں صوفیانہ کیفیات کو شاعرانہ زبان میں پیش کیا گیا ہے اس لئے فاروقی صاحب کے دعوے کا نصف حصہ تو باطل ہو جاتا ہے - رہ گیا مسئلہ آتش کا - اس سلسلہ میں یہہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری میں درد سے بڑا کوئی اور صوفی شاعر تسلیم نہیں کیا جاتا جب اصغر کا کلام درد کے کلام کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ آتش کے کلام سے کیوں کر کمتر ہو سکتا ہے -

چھٹا اعتراض:

" وہ ہمیشہ دنیا کی سطح سے کچھ بلند رہتے ہیں -"

اس کا کافی و شافی جواب شخصیت و شاعری کے زیر عنوان مقالہ ھذا (ص ۴۳۸ - ۴۳۱) میں تفصیل سے دیا جا چکا ہے اس لئے اس پر کچھ روشنی ڈالنے کے بجائے صرف ان اشعار کے متعلق کچھ توضیحی اشارے کئے جاتے ہیں جنہیں عبدالسلام صاحب نے بطور دلیل پیش کیا ہے - اگر اشعار کی توجیہہ غلط ثابت کر دی جائے تو سلام صاحب کا دعوی ساقط ہو جاتا ہے - سلام صاحب نے جن اشعار پر اپنے دعوے کی بنیاد قائم کی ہے ، وہ درج ذیل ہیں :

۱- سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے ، کچھ طرز ادا ہے

۲- روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں

جیسے کبھی آنکھوں سے گلستا نہیں دیکھا

۳- بلبل و گل میں جو گزری ہم کو اس سے کیا غرض

ہم تو گلشن میں فقط رنگ چمن دیکھا کئے

۴- دوڑتے پھرتے تھے جلوے ان کے، " موج نور " میں

دور سے ہم راز شمع انجمن دیکھا کئے

ان میں تیسرے شعر کے متعلق بعض اشارات دوسرے اعتراض کے جواب میں کئے جا چکے ہیں یہاں ان پر اتنا اضافہ کیا جاتا ہے کہ " جنسی محبت " اور " دنیاوی تعلق " کے متعلق اصغر کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے جن اشعار کو کلیدی سمجھ کر پیش کیا جاتا ہے ، اور ان کی روشنی میں اصغر کو " خیالی دنیا کاباشندہ " یا " عالم بالا کی مخلوق " ثابت کیا جاتا ہے - وہ کلیدی نہیں ہیں - اس لئے ان کی بنیاد پر جو رائے قائم کی گئی ہے وہ غلط ہے - کلیدی اشعار یہ ہیں :

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو

مگر موج صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

برگ گل کے دامن پر رنگ بن کے جمتا کیا

اس فضائے گلشن میں موجۂ صبا ہو جا

اشعار محولہ بالا میں " صبا " کی تمثیل میں اصغر نے ایک " معیاری زندہ مگر پاکیزہ شخص " انسان --- پیش کیا ہے جس کے بنیادی اوصاف

(۱) حرکت --- عمل و جدوجہد ، نیز ارتقائے ذہنی و دماغی

(۲) چھیڑ --- اشیائے عالم سے لطف و لذت حاصل کرنا

(۳) دامن کشیدگی --- ملوث ہو کر نہ رہ جانا

(۴) اخذ روح --- نکہت و بو --- ہیں

یہی اصغر کی زندگی تھی، یہی ان کی شاعری - ان تصریحات کو نظر میں رکھے بغیر ، اصغر کے متعلق رائے قائم کرنے میں لغزش کا امکان ہے -

اب دوسرے اشعار کی طرف اشارات کئے جاتے ہیں :

شعر نمبر ۱ : سنتا ہوں بڑے غور سے افسانہ ہستی

کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرز ادا ہے

اس شعر کی تشریح سے پہلے سلام صاحب کے اس ارشاد کہ " افسانہ ہستی بھی وہ کہیں دور ہی سے سنتے ہیں " کی تصحیح ضروری ہے ۔ اصغر نے " غور سے سنتا " لکھا ہے ، سلام صاحب نے " دور سے سنتا " کر دیا ہے اس معمولی تبدیلی سے ، معنوی اعتبار سے بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے ۔ اگر انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تو یہ " علمی بددیانتی " ہے اگر " تسامح " ہو گیا ہے تو علمی دنیا میں قابل گرفت ہے -------

بہرصورت اب آئیے شعر کی طرف ۔ شعر میں کلیدی لفظ " افسانہ " ہے جس پر غور نہیں کیا گیا ۔ " افسانہ " ---- ایسی غیر حقیقت یا حقیقت نما غیر حقیقت ، جو دلچسپی اور لطف و لذت کا باعث ہو ۔ شاعر دنیا اور دنیا کی زندگی کو " افسانہ " کہہ کر خود سلام صاحب اور ان جیسے دوسرے ناقدین کے دعوے کی تردید کر رہا ہے وہ دنیا اور اس کی زندگی کو دلچسپی اور لطف و لذت کی چیز بتا رہا ہے پھر مزید توثیق کے لئے " غور سے " اور " کچھ اصل ہے " کا اضافہ کر کے " افسانہ ہستی کی بے حقیقی و بے ثباتی یا وحدۃ الوجودی صوفیا کے نزدیک دنیا " سایہ بے مایہ " ہے کا تصور ختم کر دیتا ہے ۔ رہا " کچھ خواب ، کچھ طرز ادا " ، تو کیا دنیاوی زندگی کی حقیقت " خواب " کی سی نہیں ہے ۔ حقیقی ہوتے ہوئے بھی غیر حقیقی ، اور کیا دنیاوی زندگی کی مختلف النوع توجیہات ، تفسیرات اور تشریحات کو " طرز ادا " کے علاوہ کچھ اور بھی کہہ سکتے ہیں؟ ۔ یہ شعر دنیاوی زندگی کے متعلق " حکیمانہ انداز نظر اور شاعرانہ ابلاغ " کا بہترین شاہکار ہے لیکن یہ دنیاوی زندگی کے متعلق اصغر کے رویہ کا رخ اور سمت متعین نہیں کرتا ۔ لیکن اگر کسی صاحب کو اسی پر اصرار ہو تو شعر میں " افسانہ " اور " اصل " ان کے " رویہ " کی پوری پوری نشاندہی کرتے ہیں :

شعر نمبر ۲ : روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

اس شعر میں عموماً حضرات ناقدین حضرات کا زور دوسرے مصرعہ

" جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا "

پر رہا ہے ۔ اور انہوں نے " جیسے " کا لفظ نظرانداز کر کے صرف " آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا " پر نظریں مرکوز کر دی ہیں اور اس کو " اصغر کا گلستان نہ دیکھنے " -- یعنی دنیا سے علیحدگی کا اعتراف و اعلان سمجھ لیا ہے ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔ شاعر نے خود کو جس " مرغ گرفتار " کی تمثیل میں پیش کیا ہے اس میں یہ بات چھپا

دی ہے کہ " میں نے ایک عمر چمن میں گُزاری ہے ، اس کے گوشے گوشے اور پتے پتے سے مجھے محبت ہے ۔ لیکن اب یہ باتیں میرے لیے ایسی ہیں (یا لوگ ایسا سمجھتے ہیں) جیسے میں نے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا " ــــــ اگر اصغر کی زندگی نظر میں ہے تو قاری اس شعر کو ان کے حسبِ حال پائے گا۔ اس میں دنیاوی زندگی کے تجربے اور دنیا کی رنگینیوں سے لطف و لذت لینے کا جو اثبات ، اقرار ، اعلان اور تیقن ہے وہ مشکل ہی سے کسی اور کے شعر میں ملے گا ۔ حیرت ہے کہ خواجہ احمد فاروقی صاحب اور عبدالسلام[x] صاحب نے اس شعر سے " اصغر کی دنیا سے علیحدگی " کیسے ثابت کرنا چاہی ہے ۔

شعر نمبر ۳ :　　دوڑتے پھرتے[*] تھے جلوے ان کے موج نور میں

دور سے ہم " راز شمع انجمن " دیکھا کیے

اس شعر میں بھی " دور سے دیکھا کیے " پر شعر کی بنیاد رکھ کر یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ اصغر نے " دنیا کو دور سے دیکھا ہے " ۔ اور اس سے " الگ تھلگ رہے ہیں " ۔ اس بات پر قطعاً غور نہیں کیا گیا کہ شاعر کس چیز کو " دور سے دیکھنے " کو کہہ رہا ہے ۔ شعر تو بہت واضح ہے تاہم اس کی نثر کرنا ضروری ہے تاکہ کوئی اشتباہ نہ رہ جائے ۔ نثر درج ذیل ہے :

" ان کے جلوے شمع انجمن (کے) نور میں دوڑتے پھرتے تھے یہ راز (شمع انجمن) ہم دور سے دیکھا کیے ۔"

اس شعر میں بنیادی اور کلیدی الفاظ " شمع انجمن " ، " راز " اور " دور سے دیکھنا " ہیں ۔ انہیں کی صحیح تفہیم پر شعر کی صحیح تفہیم منحصر ہے ۔ " شمع انجمن " ظاہر ہے کہ استعارہ ہے ہر ایسی " ذات " اور " شے " کے لیے جو ایک طرف خود (کسی کی محبت میں) جل رہی ہے اور اپنی گرمی و نور کی وجہ سے رونق محفل اور مرکز توجہ بھی ہوتی ہے ، دوسری طرف اپنی گرمی و نور، اپنے گرد جمع ہونے

---

x۔ عبدالسلام صاحب کا مضمون " اصغر گونڈوی " مشمولہ " تخلیق و تنقید " جناب خواجہ احمد فاروقی کے مقالہ " اصغر کی شاعری " کی آواز بازگشت ہے ۔ تصدیق و توثیق کے لیے دونوں مضامین کو ایک ساتھ ، غور سے پڑھنا چاہیے ۔

*۔ غالباً یہاں یہ اشارہ بے محل نہ ہو کہ خواجہ احمد فاروقی صاحب نے " دور سے دیکھا کیے " لکھ کر جو تاثر دینے کی کوشش تھی ، وہ عبدالسلام صاحب نے پورا شعر نقل کر کے زائل کر دیا ۔

والوں میں منتقل کر رہی ہے .... عاشق " شمع " کو " دور سے دیکھتا " ---- یعنی اس پر غور کرتا ہے ، اور اس کی کشش ، حسن ، گرمی اور گرد آوری پروانہ کا راز ، اس میں موجیں مارتے ہوئے جلوۂ محبوب کو سمجھتا ہے ---- اس شمع سے اس کی محبت اور اس میں لطف و لذت اور بڑھ جاتی ہے ۔ اس شعر سے پھر اصغر کا " دنیا کی چیزوں کو دیکھنے ، برتنے ، ان سے محبت کرنے اور لطف و لذت لینے " کا رویہ ثابت ہوتا ہے اس سے ترک و تجرد ، کنارہ کشی اور بے تعلقی کہاں ثابت ہوتی ہے .... اصغر کا مزاج سمجھنے کے لئے درج ذیل شعر کو بھی نظر میں رکھئے ؎

نظارۂ پرشوق کا اک نام ہے جینا　　　　مرنا اسے کہئے کہ گزرتے ہیں ادھر سے

یعنی " دید کی نعمت " ---- " نظارۂ پرشوق " ، " ذوق سیر و دیدار جلوۂ خورشید "* ہی اصل زندگی ہے چنانچہ جس نے اس دنیا میں " نظارۂ پرشوق " سے جتنا زیادہ " بہرہ " پایا ہے اتنا ہی زندہ اور جان دار ہے اور اس سے جتنا زیادہ محروم اور بے بہرہ ہے اتنا ہی بے روح اور " مردہ " ---- عاشقی کی زبان میں آدمی دید است باقی پوست است " ---- ایسے جاندار اور مثبت نظریہ کے حامل اور اس پر عامل شخص کے متعلق یہ تاثر دینا کہ " دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس سے انہیں زیادہ واسطہ نہیں " سراسر غلط ہے ۔ ان تصریحات کی روشنی میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ عبدالسلام صاحب کا اعتراض غلط اور دعویٰ باطل ہے ۔

ساتواں اعتراض :

" انسان پرستی (Humanism) کے " بُعد " کا فقدان "

اس اعتراض کے تحت سجاد باقر رضوی صاحب نے جتنی باتیں کہی ہیں ان میں سے ان کے اس اعتراض کا جواب کہ

" وہ انسان اس کے احساسات و جذبات ، حیات و کائنات سے اس کا رشتہ ، سب کچھ بھول گئے ۔"

---

* یہ ذوق سیر یہ دیدار جلوۂ خورشید　　بلا سے قطرۂ شبنم کی زندگی کم ہے

اصغر

پورے مقالے میں اور خصوصیت کے ساتھ اشعار بالا کی تشریحات میں دیا جا چکا ہے اس لیے اس پر مزید قلم فرسائی فضول ہے ۔ البتہ موصوف کے درج ذیل اعتراض کہ

" اصغر درد ہجر اور لذت وصل کے موضوع سے گھبرائے ہوئے لگتے ہیں اس لئے کہ شاید اس میں انسانی عشق کی بو آتی ہے ۔"

کا جواب دیا جاتا ہے ۔

جہاں تک " انسانی عشق " کا تعلق ہے اس سے تفصیلی بحث تصور " محب و محبوب " مقالہ ھذا صفحہ اور " اعتراض دوم " ، میں کی جا چکی ہے ، اس پر مزید کچھ لکھنا تکرار بے مزہ کا مترادف ہوگا۔ البتہ یہاں اتنا اشارہ ضروری ہے کہ اصغر ان موضوعات سے گھبرائے ہوئے نہیں ہیں ۔ البتہ انھوں نے " چھ بچھ" وصل میں چھپک چھپا کھیلنے " اس کے " سامعہ نواز نغمہ " اور آتش ہجر میں سوختہ و بریان کباب سیخ " کی چراندھ سے اپنی شاعری کی فضا کو محفوظ رکھا ہے ۔ اس قسم کی " غذائے روحانی " سے محظوظ ہونے اور ضیافت طبع کے لیے اردو کا " ایوان شاعری " ہر طرح مزین اور آراستہ ہے ۔ پس کیا ضرور ہے کہ کباڑیے کی دوکان کی طرح اصغر کے یہاں سے بائیبل کے خوبصورت نسخے کے ساتھ پرانا فوجی جوشنہ بھی خریدا جائے[1] " ۔ " ہر کسے را بہر کارے ساختند " کے پیش نظر ان کو اس معاملہ خاص میں معذور سمجھنا چاہیے ۔

جناب باقر رضوی نے اصغر کے کلام میں " انسان پرستی کے بعد کی کمی " کی بھی شکایت کی ہے ۔ اس سلسلے میں اصغر اور یگانہ کے تقابلی مطالعہ میں کسی قدر روشنی ڈالی جا چکی ہے یہاں بعض اشارات پر اکتفا کی جاتی ہے ۔

پہلی چیز تو لفظ (Humanism) ہی ہے جس کا ترجمہ رضوی صاحب نے " انسان پرستی " کیا ہے ۔ میری ناقص رائے میں " انسان دوستی " ہونا چاہیے ۔ اس سے قطع نظر ، مذہب اور تصوف سے بڑھ کر " انسان دوستی " اور " انسان نوازی " کہاں ہے ۔ کیا " وحدت آدم " ، " عظمت آدم " کے تصورات مذہب و تصوف سے نہیں آئے اور کیا صوفی شعرا نے اپنے اشعار میں " انسان دوستی " کی دعوت و تلقین نہیں کی ؟

۱۔ اصغر کے چند ادبی افادات ۔ از مولانا سراج الحق مچھلی شہری ۔ بحوالہ " اصغر " عبدالشکور ۔ صفحہ ۲۶-۲۵

Humanism کا لفظ تو انگریزی ادب میں (جہاں سے یہ تصور اور لفظ سجاد باقر رضوی صاحب نے اخذ کئے ہیں) بہت بعد میں داخل ہوا - کیا مشرقی ادب میں اسی انسان دوستی کی ایک شکل " صلح کل " ، " وسعت نظر " ، " بے تعصبی " " مذہب و ملت کی تفریق کا بطلان " اور " احترام آدمیت " بن کر ، " آواز غالب " کی حیثیت سے نہیں چھائی رہی؟ اور کیا اصغر کے " خریطۂ شاعری " میں دبے ہوئے ان " مشک ریزوں " سے " انسان دوستی " کی خوشبو نہیں آ رہی ہے؟

دیر و حرم بھی منزل جاناں میں آئے تھے

پر شکر ہے کہ بڑھ گئے دامن بچا کے ہم

یہ حسن تمیں سے ظاہر ہو کہ باطن ہو

یہ تیسد نظر کی ہے وہ فکر کا زندان ہے

صدہا تو لطف مے سے بھی محروم رہ گئے

یہ امتیاز ساغر و مینا لئے ہوئے

دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوس حسن ہے

جو اس سے بے خبر ہیں وہی ہیں عذاب میں

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی

کچھ قید و رسم نے جسے ایمان بنا دیا

رندوں کو صرف نشۂ بے رنگ سے غرض

یہ شیشہ دیکھتے ہیں نہ پیمانہ دیکھتے

فروغ حسن سے ترے چمک گئی ہر شے

اداؤ رسم بلا لی وہ طرز بو لہبی

اصغر کی اس خصوصیت (انسان دوستی) پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب عابد رضا بیدار نے بالکل درست فرمایا ہے :

" آریوں کی سرزمین ھند نے ادب کی ایک صنف " غزل " کو جنم دیا اور اس کے ساتھ ایک خاص روایت کو بھی - جس نے انسان کو بہ حیثیت انسان کے دیکھا۔ جس نے صرف محبت سیکھی ، جس نے صرف جمال پر نظر رکھی اور جو حسن انسان اور کائنات کے حسن اور محبت انسان اور کائنات کی ہر ہر چیز سے بے پناہ محبت کے گرد گھومتی رہی ، جس نے مذہبی کٹر پن کا دل کھول کر مذاق

اڑایا جس نے فرقہ واری   کو جی بھر کے برا بھلا کہا

----- ان ------ میں تصوف کی راہ سے یہ روایت صرف

اصغر کے یہاں پہنچی اور اصغر نے اسے اپنا لیا یہ شعر رسماً

نہیں کہے گئے - ان میں انسانیت کا دل دھڑک رہا ہے ---

--- یہ رشدی کے پردے میں انسان دوستی کا جذبہ اور میکدے

کی دنیا میں انسانوں میں محض انسانیت کی بنیاد پر ملاپ --

--- رسم ہلالی اور طرز بولہبی دونوں کا یکساں احترام ---

لطف مے کے لئے امتیاز ساغر و مینا کو یکسر مٹا دینے کی صلائے عام

----- اور مختلف مذاہب اور متضاد زاویہ ہائے نظر میں

سازگاری کی یہ سعی مشکور بذات خود ہماری تہذیب کو اتنی بڑی

دین ہے کہ صوفی شاعر (اصغر) کے یہاں اس کے سوا کچھ

بھی نہ ہوتا تو بھی وہ ہماری توجہ کا مرکز بنا رہتا - لیکن

اس کے یہاں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے -[۱] "

" انسان دوستی " ہی کی ایک شق " عظمت آدم " کا تصور ہے، اس پر " اصغر اور درد " اور " اصغر اور اقبال " کے تقابلی مطالعہ میں بہت تفصیل سے لکھا گیا ہے اس کا اعادہ بے فائدہ ہوگا-

اگر " انسان دوستی " سے جناب سجاد باقر رضوی کی مراد " اشتراک زن، زمین و زیور " کی شاعری ہے تو یقیناً اصغر کی شاعری کا دامن ان " گھرہائے آبدار " سے خالی ہے - جیسا کہ سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ان کی نظر میں انسان کا اہم ترین مسئلہ " روحانی " ہے اس لیے انھوں نے " پیٹ، پیٹ اور جنس " کے مسائل نہیں چھیڑے - ان تصریحات کی روشنی میں جناب باقر رضوی کا اعتراض جزوی طور پر درست کہا جا سکتا ہے -

آٹھواں اعتراض :

" اصغر کی شاعری کو بڑی شاعری نہیں کہہ سکتے " کیوں کہ " بڑی شاعری کی زبان عام بول چال کی زبان سے قریب ہونا چاہیے"

۱- اصغر کا مطالعہ - عابد رضا بیدار - آجکل دہلی جون ۱۹۵۷ء - صفحہ ۳۰

یہ فیصلہ جناب سجاد باقر رضوی کا ہے ۔

سجاد باقر صاحب رضوی کے فتوے کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شاعری عام بول چال کی زبان سے قریب ہوگی اس کا شمار بڑی شاعری میں ہونا چاہیے ۔ اس کی رو سے ذوق ، داغ اور ریاض خیرآبادی سے بڑا شاعر پھر اردو میں کوئی نہ ہوا۔

(۲) اس دلیل کی روشنی میں غالب اور اقبال کی شاعری کی مسلمہ حیثیت پر نظرثانی کرنا پڑے گی ـــــ یعنی ان کی شاعری کو بھی بڑی شاعری نہیں کہا جائے گا۔

(۳) " بڑی شاعری " جذبہ میں فکر کی آمیزش کے بغیر تخلیق نہیں پا سکتی ۔ فکر کی شمولیت سے بات میں وزن ، وقار اور عمق پیدا ہوتا ہے اور جب بھی شعر میں یہ عناصر داخل ہو جائیں زبان عام بول چال کی زبان سے بلند ہو جائے گی ۔ لہذا زبان کے عام بول چال کی زبان سے قریب ہونے کو بڑی شاعری کی لازمی شرط نہیں قرار دیا جا سکتا ۔

(۴) اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ " عوام کی سمجھ میں آ سکے " ۔ تو یہ بھی کوئی معقول شرط نہیں ۔ اس لیے کہ " تفکر و تامل " عوام کے لئے ہمیشہ دقت و زحمت کا سبب ہوتے ہیں (خصوصاً ہمارے ملک میں) لہذا باقر صاحب کے اس اعتراض میں بھی کوئی وزن نہیں ہے ۔

<u>دواں اعتراض :</u>

"منزل کی طرف اشارہ نہیں ہے "

یہ اعتراض جناب خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے ۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :

" اصغر ہمیں یہ تو بتلاتے ہیں کہ زندگی کی راہ پرپیچ اور <u>مشکل</u> ہے لیکن وہ کیا دقتیں ہیں اور منزل مقصود کیا ہے اس کی طرف اشارہ نہیں کرتے ۔"

اصغر کس منزل کی طرف بلاتے ہیں اس سے بحث تو آئندہ سطور میں " مربوط انداز " میں کی جائے گی لیکن یہاں دو ایک باتوں کی طرف اشارہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا ۔

(۱) اوّل تو یہ کہ " غزل " کے شاعر سے کسی واضح " منزل مقصود " کا مطالبہ

کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے ۔ اس مطالبہ کو اردو غزل گو شعرا مثلاً میر، درد ، مصحفی ، غالب ، مومن دورِ جدید میں حسرت ، فانی اور فراق --- میں سے کون کون سے شاعر پورا کرتے ہیں ۔ اگر کوئی نہیں کرتا تو اصغر ہی سے یہ مطالبہ کیوں ہے؟

(۲) دوم یہ کہ اقبال کی طرح ہر شاعر کا کوئی " مربوط فلسفہ زندگی " یا واضح " منزل مقصود " نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے (جیسا کہ اصغر کی ہے) تو غزل میں وہ " ترتیب ، تنظیم اور تفصیل " نہیں ہوتی جو نظم میں ہوتی ہے غزل کی شاعری تو صرف اشارات کی شاعری ہوتی ہے ۔ اس لیے اس کے اشعار کی مدد سے شاعر کا فلسفہ زندگی مرتب کرنا مشکل ہی نہیں خطرناک بھی ہے ۔ اس کے لئے شاعر کے سوانح حیات اور عقائد و افکار کے بھرپور مطالعہ کی ضرورت ہے ۔ اصغر کی شاعری تو لوگوں نے پڑھی لیکن بدقسمتی سے ان کے سوانح حیات کے پس منظر میں نہیں پڑھی ۔

(۳) سوم یہ کہ خواہ نظم نگار ہو یا غزل گو ۔ وہ شاعر ہوتا ہے اور اشارات میں باتیں کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور اشارات --- " اشتباہ مطالب " اور " اختلاف معانی " کا دروازہ کھلا چھوڑ دیتے ہیں یہ نقص نثر میں نہیں ہوتا ۔ اس لئے اگر کسی شاعر نے نثر بھی لکھی ہے تو اس کی شاعری کو اس کی نثری تحریروں کی روشنی میں پڑھنا اور سمجھنا چاہیے خصوصاً اصغر جیسے شاعر کو جو صرف شاعر نہیں تھے بلکہ ان کا ایک " مربوط فلسفہ فکر " اور ایک " متعین منزل " بھی تھی ۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ شاید بے محل نہ ہو کہ اصغر کے بیشتر ناقدین نے ان کی شاعری کا مطالعہ ان کی " نثری تحریرات " سے بے نیاز ہو کر کیا ہے اس لیے ان کے مطالعہ میں " اسقام " رہ گئے ہیں ۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد " اصل موضوع " --- یعنی فاروقی صاحب کے اعتراض کی طرف رجوع کرنا چاہیے تھا لیکن اس کی صحیح معرفت اس وقت تک ممکن نہیں ہوگی جب تک ان تمام اعتراضات کی تہ میں چھپی ہوئی بنیاد کا کھوج نہ لگا لیا جائے جس پر یہ اعتراضات قائم ہیں ۔ اگر بنیاد متزلزل ہو گئی اور ڈھے گئی تو اعتراضات خود بخود ختم ہو جائیں گے ۔ ذیل میں اسی کی کوشش کی جاتی ہے ۔

اصل میں اصغر اور ان کے جدید ناقدین کے درمیان سوا شاعری کے کوئی چیز قدر مشترک نہیں --- بالفاظ دیگر ان کے درمیان نقطہ نظر، طرز فکر اور طرز احساس کا اختلاف ہے ۔ اگر اس کو زیادہ واضح الفاظ میں کہا جائے تو اس کو یوں کہیں گے کہ ان کے

درمیان وہی جھگڑا " مذہبیت اور لامذہبیت " اور " روحانیت و مادیت " کا ہے ۔
اصغر روحانیت اور مذہبیت کے علمبردار ہیں اور جدید ناقدین لامذہبیت اور مادیت کے
شکار (حاشا اس سے کسی کے مذہب و ایمان پر حملہ مقصود نہیں) لہذا ان کے لئے
اصغر کا سمجھنا آسان نہیں رہا۔ انہوں نے اپنے عقائد و افکار کی روشنی میں جتنے
اعتراضات کئے ہیں (اگر ان کی بنیاد کو تسلیم کر لیا جائے تو) سب درست اور حق بجانب
ٹھہرتے ہیں اور اگر اصغر کی بنیاد کو تسلیم کر لیا جائے تو باطل ۔

اب مسئلہ کی نوعیت یہ نہیں رہی کہ دونوں میں کون حق پر ہے بلکہ اصل
مسئلہ یہ ہو گیا کہ دونوں کے " ذہنی پس منظر " اور " نقطہ نظر " کے فرق کو واضح
کر کے ان کی راہیں الگ الگ کر دی جائیں اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ
دونوں میں سے کسے ترجیح دیتا ہے ۔ یہ بہرحال اس کے لیے ممکن نہیں رہے گا کہ وہ
بہ یک وقت دونوں محرابوں میں سجدہ کرے ۔ ذیل میں دونوں (جدید ناقدین اور
اصغر) کے " ذہنی پس منظر " کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے :

<u>جدید ناقدین کا ذہنی پس منظر :</u>

تمام ناقدین جن کے اسمائے گرامی سطور گزشتہ میں بار بار آئے ہیں پیدائشی
اور جذباتی طور پر کھرے مسلمان ہیں لیکن فکری طور پر انھوں نے اسلام سے کماحقہ
استفادہ نہیں کیا ان کے ذہن و دماغ کی تزئین و آرائش میں غالب حصہ (جو بیشتر
صورتوں میں بنیادی بن گیا ہے اور اس نے ان کے انداز نظر اور طرز فکر کو منقلب کر دیا
ہے) مغربی افکار و نظریات کا ہے خصوصاً نشاۃ ثانیہ کے بعد ابھرنے والے افکار کا ۔
" نشاۃ ثانیہ " نے " جدید مغربی تہذیب اور علوم " کو دو بنیادی افکار دیئے :

(۱) دنیا دو لخت ہے ---- ایک دنیا دوسری عقبیٰ

(۲) مذہب کا تعلق عقبیٰ سے ہے، انسان کی دنیاوی زندگی اس کے
دائرے سے خارج ہے ۔

" دنیا و عقبیٰ " اور " مادیت و روحانیت " کی دوئی اور مذہب کے ناقص تصور
سے سیراب ہو کر جب مغربی تہذیب نے " درخت ثمر دار " کی شکل اختیار کر لی تو انسانیت
کی جھولی کو اس نے اپنے " ثمرہائے نورس " سے مالا مال کر دیا ذرا ان " ثمرہائے خوش رنگ و
خوش مزہ " کو بھی دیکھتے چلئے :

(۱) مذہب کا تعلق صرف اخلاقی اور روحانی زندگی سے ہے ۔ یہ افراد کا

دجی معاملہ ہے ۔ اس کی پیروی سے ترقی کی راہیں مسدود ہو
جاتی ہیں اور انسان رجعت پسند ہو جاتا ہے ۔

(۲) انسان کی اصل ترقی " مادی ترقی " ہے اور مادی ترقی یہ ہے کہ
" انسان کے جسم کو پالا جائے "

(۳) جسم کی پرورش اس کی ضروریات کی تسکین و تکمیل پر ہے ۔

(۴) جسم کی بنیادی ضروریات " شکم ، جنس اور سردی گرمی سے اس کی
(جسم) حفاظت " ہیں ۔

(۵) جو " ادارے " ، " علوم " اور " افراد " انسان کو اس ترقی کے لئے
تیار نہیں کرتے وہ " فرسودہ " ہیں ۔ یعنی وہ انسان کو " رجعت پسندی "
" ماورائیت " ، " دنیا سے کنارہ کشی " اور " مولویت " کی دعوت دیتے
ہیں ۔

اگر بغور دیکھا جائے تو ان افکار کی بنیاد اسی " لا مذہبیت "
---- یعنی " مذہب کے ناقص تصور " (جو انجام کار انکار مذہب پر منتج ہوتا ہے)
اور " مادیت " پر ہے (جس کی طرف سطور گزشتہ میں اشارہ کیا گیا ہے) ۔ جدید
ناقدین کا " معیار خیر و شر " یا " معیار تنقید " یہی افکار و نظریات ہیں ۔
جیسا کہ ڈاکٹر مسعود حسین نے واضح طور پر تحریر فرمایا ہے ۔ وہ رقمطراز ہیں :

" جدید تنقید سماجی علوم پر مبنی ہے اور انہیں کی روشنی
میں وہ فنی شاہکاروں کو پرکھتی ہے[1] ۔"

اور " سماجی علوم " " جدید مغربی تہذیب کے بطن " سے پیدا ہوئے ہیں جس کی
بنیاد " مادیت " پر ہے ۔ بہرحال زندگی کی اس " مادی تفسیر " کو تسلیم کر لیا
جائے تو اصغر پر ناقدین کے تمام اعتراضات جائز اور درست ہو جاتے ہیں ۔

اب اصغر کے " ذہنی پس منظر " کا مختصر جائزہ بھی لیتے چلئے

اصغر کا ذہنی پس منظر :

تفصیل " شخصیت عہد بہ عہد " میں دی جا چکی ہے ، یہاں صرف اشارات
پر اکتفا کی جاتی ہے ۔

۱۔ اصغر گونڈوی اور جدید تنقید ---- انتخابات اصغر ۔ صفحہ ۳۶

اصغر کے ذہن و فکر کا ریشہ ریشہ " اسلام اور اسلامی تصوف " کی تعلیمات سے سیراب ہوا تھا اس لئے ان کے (اصغر) عقائد و افکار انھیں کے (اسلام اور اسلامی تصوف) بنیادی میں تلاش کرنا ہوں گے ۔

اسلام کی بنیاد " توحید " پر ہے ـــــ " توحید " کی تفسیر صرف " خدائے واحد " کے تصور تک محدود کر دی گئی حالاں کہ " توحید " انسانی زندگی کے تمام بنیادی تصورات کو محیط ہے ـــــ بالفاظ دیگر اسلام " وحدت آدم " ، " وحدت کائنات " ، " وحدت دنیا و عقبیٰ " اور " وحدت جسم و روح " کا قائل ہے اور اپنے پیروؤں میں یہی نقطہ نظر پیدا کرنا چاہتا ہے ۔

" تصور وحدت آدم " کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ انسانی ترقی کی صرف اسی صورت کو تسلیم کرتا ہے جس میں انسان کے " جسم و روح " دونوں کی ترقی ہو (وہ صرف مادی ترقی یا صرف روحانی ترقی کا قائل نہیں) ۔ جس طرح انسان کی جسمانی ترقی کے پیش نظر اس نے اس کی ضروریات کو فطری اور لازمی قرار دیا اور ان کی تسکین و تکمیل کے لئے کائنات کو پورے نظام کے تسلیم کیا ، اسی طرح انسان کی " روح " کو تسلیم کرتے ہوئے ، اس کی ترقی کے لئے مذہبی اور اخلاقی نظام کو ناگزیر اور لازمی ٹھہرایا ۔ اس کے یہاں مذہب Other - Worldliness نہیں ہے بلکہ اسی دنیا میں زندگی گزارنے کا طریقہ ہے اور " روحانیت " دنیا کی زندگی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ مذہب و اخلاق کے حدود میں رہتے ہوئے زندگی بسر کرنے کا نام ہے ۔

اسلام نے اپنے اخلاقی ضابطہ کی بنیاد ، جسم کے اقرار اور اس کی ضروریات کے اعتراف پر استوار کی ہے لیکن اتنا کیا ہے کہ ان کی تسکین کے حدود متعین کر دیئے ہیں ۔ اسلامی ضابطہ حیات میں مرد اور عورت کے " جنسی تعلق " کو اللہ کی آیات* میں

---

* وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی ۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں ۔

الروم : ۲۱ ۔ تفہیم القرآن جلد سوم ۔ صفحہ ۷۳۳

سے ایک آیت قرار دے کر، نہ صرف یہ کہ اس کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے بلکہ اس کی " حرمت و تقدیس " کا تصور بھی دیا گیا ہے " جنسی معاملہ " میں وہ اس درجہ حساس ہے کہ " تعیین نکاح " کے حدود متعین کر دینے کے بعد اس نے " جنسی تسکین " کے تمام طریقوں کو ممنوع و حرام قرار دے دیا ہے خواہ وہ " لذت نگاہ " کے لیے دیکھنا ہو، یا ذہنی ہوش جنسی خواہش کی سیرابی کے لیے " محض گفتگو " جیسی " بے ضرر " چیز ہو - ایسی تمام باتوں کو جن سے جنسی ترغیب ہوتی ہے یا معاشرہ میں جنسی انتشار پھیلتا ہے، اس نے " زنا " ---- ہاتھ، پاؤں ، آنکھ ، کان اور زبان کی زنا ---- سے تعبیر کیا ہے اور ان سے سختی سے روکا ہے اور ان سے پرہیز کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے اور اسے عفت ، حیا اور تقویٰ سے تعبیر کیا ہے -

اصغر کا " معیار خیر و شر " ---- " معیار زندگی اور معیار شعر و ادب " ، وہی ہے جو اسلام کا ہے - اسلام کے نزدیک شعر و ادب آپ اپنی غایت نہیں ہیں بلکہ ایک مقصد عظیم کا وسیلہ ہیں - یعنی ان کا کام انسان کو بااخلاق ، پاکیزہ، شریف اور صالح بنانا ہے - بقول اصغر :

" فنون لطیفہ کی اعلیٰ ترین غرض ایک " موضوع جمیل " ---
یعنی (مسلم) کی اس طرح تخلیق و تشکیل کرنا ہے کہ اس
میں دل گرم، نگاہ پاک بیں اور جان بیتاب پیدا ہو جائے"[1]

اصغر کے اس نقطہ نظر کو سمجھ لینے کے بعد ، ان کا شعر و ادب میں " روحانی اقدار" کے قیام و اہتمام میں کوشش کرنا اور ان کی طرف دعوت دینا عین فطری معلوم ہوتا ہے اور ان کے اس رویہ کو کسی طرح " ماورائیت " سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا- اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو " مادی نقطۂ نظر" سے ان کی شاعری پر جتنے اعتراضات کئے گئے ہیں (یعنی جدید ناقدین کے تمام اعتراضات) خود بخود ساقط ہو جاتے ہیں - اسی میں جناب خواجہ احمد فاروقی کے سوال کہ

" منزل مقصود کیا ہے اس کی طرف وہ اشارہ بھی نہیں کرتے "

کا جواب بھی مضمر ہے - تاہم مختصراً ان کا جواب یہ ہے :

۱- مقدمہ پیام زندگی جلد اول - صفحہ ۲۲-۲۳ (بادنی تصرف) تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ ھذا ، نظریہ فن ---- شعر و غزل - صفحہ

اصغر کی منزل مقصود :

جیسا کہ سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے :

" اصغر انسانی زندگی کا اصل مسئلہ جسمانی سے زیادہ
روحانی سمجھتے ہیں اور اس کے حل کے لئے اسے اسلام اور
اسلامی تصوف کے نظام فکر و عمل ، کی طرف بلاتے ہیں "

۱- اسلام

اس کی تفصیل کے لئے " شخصیت عہد بہ عہد " ـــ عقائد و افکار (مقالہ ھذا ، صفحہ) کی طرف رجوع کیجئے ، مختصراً ان کی منزل مقصود کو سمجھنے کے لئے ان کی نظم " خطاب بہ مسلم " کے درج ذیل اشعار پیش نظر رکھئے :

کہاں اے مسلم سرگشتہ تو محو تماشا ہے
جب اس آئینہ ہستی میں تیرا ہی سراپا ہے

جہان آب و گل میں ہے شرار زندگی تجھ سے
تری ذات گرامی ارتقا کا اک ہیولا ہے

تجھی سے اس جہاں میں ہے بنا آئین و حکمت کی
کہ سب ہے کی بدولت اصطلاح جام و مینا ہے

ضوابط دین کامل کے دیئے ہیں ہاتھ میں تیرے
تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام لینا ہے

تجھی کو دیکھتا ہوں روح اقوام و مذاہب میں
یہ راز زندگی سن لے کہ ہر قطرے میں دریا ہے

جو ہو للّٰہیت تو دین بن جاتی ہے یہ دنیا
اگر اغراض ہوں تو دین بھی بدتر ز دنیا ہے

فرائض کار رہے احساس عالم کے مذاہب میں
یہی عارف کا مقصد ہے یہی شارع کا ایما ہے

۲- اسلامی تصوف

اصغر کی منزل مقصود کی دوسری سمت ، اسلامی تصوف ہے -
اسلامی تصوف اسلام سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے - اسلام ہی کے بنیادی عقائد کو

" فلسفیانہ انداز " میں مربوط کر کے ان پر دل میں تصدیق و یقین کی کیفیت پیدا کرنا، اسلامی تصوف ہے ۔ انھوں نے اپنے اسی " صوفیانہ فلسفۂ فکر " کو اپنی غزل کا لازمہ ٹھہرایا ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

" اصغر غزل میں چاہیئے وہ موج زندگی جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں"

اس شعر کے " مفاہیم " کی تفصیلات میں جانے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سے متعلق دوسرے ناقدین کے آراء کا جائزہ لے لیا جائے :

محولہ بالا شعر سے عموماً نقاد سرسری گزر گئے ہیں اگر کسی نے اس سے کچھ " تعرض " کیا بھی ہے، تو اس نے غزل کو " بتوں کے حسن " اور " شراب کی مستی" تک محدود کر دیا ہے اس کی گہرائی میں اترنے کی کوشش نہیں کی ۔ بعض حضرات خواجہ احمد فاروقی کی طرح ، دوسرے اشعار کے ساتھ اس شعر کو بھی نقل کر کے، صرف اتنا کہہ کر رہ گئے ہیں :

" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصغر نے غزل کو محدود معنی میں استعمال نہیں کیا ہے ۔ اس کی شاعری کا محور شگفتگی اور تبسم زیر لبی ہے[1] ۔"

البتہ جناب یحییٰ امجد پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس شعر کو اہمیت دی ہے لیکن وہ بھی اس سے زیادہ کوئی بات نہ کہہ سکے ۔ وہ شعر نقل کر کے اس کے ذیل میں فرماتے ہیں :

" ان کی غزل میں زندگی کی موج تو ہے لیکن زندگی کے تجربات اور مسائل اور زندگی کا فلسفہ نہیں ہے[2] ۔"

اس شعر سے متعلق قریب قریب یہی خیال جناب فضل القدیر نے بھی ظاہر کیا ہے (جو جناب یحییٰ امجد کی آواز بازگشت معلوم ہوتا ہے) وہ رقمطراز ہیں :

" جہاں تک موج زندگی کا تعلق ہے (وہ ہے) ۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے کلام میں زندگی کا کوئی فلسفہ نہیں لیکن وہ حیات و کائنات کے متعلق ایک ایسا شعور ضرور رکھتے ہیں

۱۔ اصغر کی شاعری ۔ بحوالہ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور ۔ صفحہ ۱۲۷

۲۔ اصغر کی انفرادیت ۔ " اوراق " لاہور شمارہ خاص (۳) نومبر ۱۹۶۸ء ۔ صفحہ ۱۱۶

جس سے ان کے طرز نگاہ کی آفاقیت ظاہر ہوتی ہے [1]۔"

جناب یحییٰ امجد نے " تجربات اور مسائل زندگی " کے فقدان کا ذکر دوبارہ چھیڑا ہے، جس سے غالباً موصوف کا اشارہ ادھیں " مسائل " کی طرف ہے ، جن سے تفصیلی بحث سطور گزشتہ میں ، کی جا چکی ہے اس لئے موضوع کو صرف " فلسفہ زندگی " تک محدود رکھا جاتا ہے -

یہاں اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ " فلسفہ زندگی " سے کیا مراد ہے، تو اصغر کے فلسفہ زندگی کے سمجھنے میں آسانی ہوگی- " فلسفہ " وہ علم ہے جو حقیقت اشیاء (خصوصاً خدا ، کائنات اور انسان) کے ادراک کو کوئی واضح تصور دے کر، ایک "نظام فکر " میں مرتب کرتا ہے - اور " فلسفہ زندگی " مختلف نظام ہائے فکر میں سے کسی ایک پر (خدا ، کائنات اور انسان کے بنیادی تصور کے تعین اور تیقن کے بعد) زندگی استوار کرنا ہے - بالفاظ دیگر ذہن میں " خدا ، کائنات اور انسان " کا کوئی واضح تصور قائم کر کے ، ان پر اس درجہ یقین پیدا کرنا کہ زندگی کے تمام معاملات اسی " محور " کے گرد ، گردش کرنے لگیں ، کسی کا " فلسفہ زندگی " کہلاتا ہے - اس تعریف کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو اصغر کا فلسفہ زندگی " اسلام " اور " تصوف اسلام " (اس سے تفصیلی بحث شخصیت عہد بہ عہد ــــ عقائد و افکار کے تحت گزر چکی ہے) ہے - یہی " فلسفہ زندگی " ان کی شاعری میں روح کی طرح جاری و ساری ہے جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں :

اصغر غزل میں چاہئیے وہ موج زندگی جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

یہ محض ان کا دعویٰ نہیں ہے بلکہ اگر اس شعر کا تجزیہ کیا جائے تو اس دعوے کی صداقت عیاں ہو جاتی ہے -

شعر میں اصغر نے واضح انداز میں اپنا " موضوع غزل " " وہ موج زندگی ــــ وہ افکار و اعمال جن سے زندگی عبارت ہے ــــ فلسفہ زندگی) بتایا ہے ، جو بتوں میں " حسن " اور شراب میں مستی ہے - بالفاظ دیگر زندگی کا وہ نہج جس سے اس میں " حسن " ــــ یعنی حسن نظر (جو ہر چیز کو حسین بنا دیتا ہے) اور مستی ــــ یعنی سرمستی عشق (جس سے زندگی میں کیفیت پیدا ہوتی ہے) پیدا ہو -

---

۱- اردو شاعری میں اصغر کی انفرادیت - مقالہ ایم اے اردو، ڈھاکا یونیورسٹی ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۲۲

" حسن نظر " اور " سرمستی عشق " ــــ ان روحانی کیفیات کا نام ہے جو انسان کے جذبات میں شدت ، لطافت ، نزہت اور علو و ترفع پیدا کر کے اس کی (انسان) تکمیل کرتے ہیں ۔ اور " انسانیت کی تکمیل " اسلام اور اسلامی تصوف کے نظام زندگی پر عمل پیرا ہونے سے ہوتی ہے ۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اصغر کا " فلسفہ زندگی " اسلام اور اسلامی تصوف ہے ۔ اسلام سے متعلق ان کے نظریات ان کی نظم " خطاب بہ مسلم " سے واضح کئے جا چکے ہیں ۔ اب " اسلامی تصوف " کا ایک " مربوط نظام فکر " ذیل میں ، مختلف عنوانات قائم کر کے درج کیا جاتا ہے بعد میں انہیں عنوانات کے تحت ان کے کلام سے اشعار درج کئے جاتے ہیں ۔

اسلامی تصوف کا نظام فکر (یا اصغر کا فلسفہ زندگی)

(۱) خدا خالق کائنات ہے جو " حسن مجسم " ہے ، اسی کو " حسن مطلق " بھی کہتے ہیں ۔

(۲) کائنات اسی حسن مطلق کے مظاہر و شیئون کا نام ہے ــــ کائنات میں حسن ہی حسن ہے ۔

(۳) انسان افضل و حاصل کائنات ہے ۔ اس کا مقصد " حسن کی دید " ، اس کی قدرشناسی اور اس سے عشق ہے ــــ یعنی انسان ناظر، عبد اور عاشق ہے ۔

(۴) " عشق " اس کشش کا نام ہے جو " حسن " سے ناظر (یعنی انسان) میں پیدا ہوتی ہے ۔

(۵) عشق انسان میں

(الف) حرکت ــــ آرزو ، اضطراب ، جہد و عمل

(ب) خلوص

(ج) احترام محبوب

(د) خودنگری یا احساس ذات عاشق

(ر) عبدیت (انکار مرضی عاشق)

(س) وسعت نظر ــــ یعنی کائنات میں صرف حسن دیکھنا

پیدا کرتا ہے ۔

انسان میں انہیں صفات کا پیدا کرنا تہذیب و تکمیل انسانیت ہے اور یہی

انسان کا مقصود و منتہا اور اس کی معراج ہے ۔

اب انہیں عنوانات کے تحت دو دو چار چار شاعرانہ شہادتیں پیش کئے جاتے ہیں :

(۱) خدا " حسن مطلق " اور " حسن مجسم " ہے

چھایا ہوا ہے ہر دو جہاں میں جمال دوست
اے شوق دید چشم بھی اب وا ہو یا نہ ہو

وہ گل سے بھی سوا عریاں وہ نکہت سوا پنہاں
یہ ہم ہیں جو کبھی جلوہ کبھی پردا سمجھتے ہیں

دکھائی صورت گل پر بہار شوخی خنداں
چھپایا معنی گل میں کبھی حسن نمایاں کو

(۲) " کائنات " ۔ " مظاہر و شیون حسن " ہے

یہ حسن دوست ہے اور التجائے جانانی
تجھے یہ وہم کہ یہ کائنات عالم ہے

تو بہت سمجھا تو کہہ گزرا فریب رنگ و بو
یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہ ساز ہے

ردائے لالہ و گل پردۂ مہ و انجم
جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے

(۳) انسان افضل کائنات اور حاصل کائنات ہے

پتے پتے پر چمن کے ہے وہی چھائی ہوئی
عندلیب زار کو اک مشت پر سمجھا تھا میں

وہ شورشیں نظام جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انہیں انسان بنا دیا

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

الہیٰ کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے

غضب کی ایک مشت خاک زیر آسماں رکھ دی

......

اس کا مقصد حسن کا " مشاہدہ "، اس کی " قدرشناسی " اور اس سے " عشق " ہے -

(الف) " مشاہدۂ حسن "

رقص مستی دیکھتے جوش تمنا دیکھتے

سامنے لا کر تجھے اپنا تماشا دیکھتے

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کہیں نگاہ میں

محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں

اب تو یہ تمنا ہے کسی کو بھی نہ دیکھیں

صورت جو دکھا دی ہے تو لے جاؤ نظر بھی

(ب) " قدرشناسی حسن "

مری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے

جہاں جہاں سے تقاضائے حسن یار ہوا

کھل گیا رنگ حسیناں کھل گیا رنگ چمن

کم سے کم اتنا نظر میں حسن پیدا کیجئے

(ج) عشق حاصل زیست

عشق ہی سعی مری عشق ہی حاصل میرا

یہی منزل ہے یہی جادۂ منزل میرا

متاع زیست کیا ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں

جسے سب درد کہتے ہیں اسے ہم دل سمجھتے ہیں

کس درجہ ایک خاک کے ذرہ میں ہے تپش

ارض و سما میں شورش و غوغائے عشق ہے

(۴) " عشق " " کشش حسن " ہے

کہیں عشق ، کہیں ہے کشش ، کہیں حرکت

بھرا ہے خامہ فطرت میں رنگ فتنہ گری

اس کی شعاع مہر خود مجھ کو اڑا کے لے چلی

شبنم خستہ حال کو حاجت بال و پر نہیں

شعاع مہر خود بیتاب ہے جذب محبت سے

حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پرواز شبنم کی

ذروں کا رقص مستی صہبائے عشق ہے

عالم رواں دواں بہ تقاضائے عشق ہے

نشہ عشق میں ہر چیز اڑی جاتی ہے

کون ذرہ ہے جو سرشار محبت میں نہیں

(۵) " عشق " سے انسان میں پیدا ہونے والی کیفیات

(الف) حرکت :

۱- آرزو

یہ ذوق سیر ، یہ دیدار جلوہ خورشید

ملا ہے قطرہ شبنم کی زندگی کم ہے

دکھا جلوہ وہی غارت کن جان حزیں جلوہ

ترے جلوے کے آگے جان کیا ہم کیا سمجھتے ہیں

ہر جنبش نگاہ تری جان آرزو

موج خرام یار ہے آسمان آرزو

جلوے تمام حسن کے آ کر سما گئے

اللہ رے یہ وسعت دامان آرزو

اس میں وہی ہیں یا مرا حسن خیال ہے

دیکھوں اٹھا کے پردہ ایوان آرزو

۲- اضطراب

ذرے ذرے کو ہے جنبش ان کے ہوق حسن سے

اڑ نہ جائے ایک دن یہ خاکدان اضطراب

کس نے پہلو میں مرے لا کر بٹھایا ہے تجھے

او دل شوریدہ او آفت نشان اضطراب

اسرار عشق ہے دل مضطر لئے ہوئے

قطرہ ہے بیقرار سمندر لئے ہوئے

۳- جہد و عمل

ذوق طلب حصول سے جسو آشنا نہ ہو

یعنی وہ درد چاہئے جس کی دوا نہ ہو

جستجو ہے زندگی ذوق طلب ہے زندگی

زندگی کا راز لیکن دور منزل میں ہے

یہ سب نا آشنائے لذت پرواز ہیں شاید

اسیروں میں ابھی تک شکوہ صیاد ہوتا ہے

(ب) خلوص

اس کو مطلوب* ہیں کچھ قلب و جگر کے ٹکڑے

جیب و دامن نہ کوئی پھاڑ کے دیوانہ بنے

یہ مسلک عاشقی ہے سود و حاصل دیکھنے والے

یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

عاشقی کیا ہے ہر اک شے سے تہی ہو جانا

اس سے ملنے کی ہے دل میں ہوس خام ابھی

(ج) احترام محبوب

یہ بارگاہ حسن ادب کا مقام ہے

جز درد و اشتیاق تقاضا نہ چاہئے

---

* لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ
نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے - الحج: ۳۷
تفہیم القرآن جلد سوم - ص ۲۲۸

حسرم ساز کے اداب اور ہیں اصغر

ساز رکھ کے بھی عرض نیاز رہنے دے

(د) خودنگری یا احساس ذات عاشق

وہ شوخ بھی معذور ہے مجبور ہیں میں بھی

کچھ فتنے اٹھے حسن سے کچھ حسن نظر سے

ستم جو چاہے کرے مجھ پہ ذوق عکس نظر

بساط آئینہ حسن خود نما معلوم

مری مذاق شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ

میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویر یار کو

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں

سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے

(ر) عبدیت — (انکار مرضی عاشق)

یہ اقرار خودی ہے دعوی ایمان و دین کیسا

ترا اقرار جب ہے خود سے بھی* انکار ہو جائے

ہے یہ طریق عاشقی چاہئے اس میں بے خودی

اس میں چناں چنیں کہاں اس میں اگر مگر کہاں

اصغر حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہے

رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لئے ہوئے

(س) وسعت نظر — صرف حسن پر نظر رکھنا

تیری ہزار برتری تیری ہزار مصلحت

میری ہر اک شکست میں میرے ہر اک** قصور میں

---

*۔ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ — اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے ۔ البقرہ : ۲۰۷ تفہیم القرآن جلد اول، صفحہ ۱۵۹

**۔ وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ — ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو وہی تمہارے لیے بہتر ہو ۔ البقرہ : ۲۱۶ — تفہیم القرآن جلد اول ۔ صفحہ ۱۶۳

دوزخ بھی ایک جلوہ فردوس حسن ہے

جو اس سے بے خبر ہیں وہی ہیں عذاب میں

باغ نعیم بھی بجا نار جہیم بھی درست

تو مجھے بھیج دے جہاں میری وہیں نجات ہے

جیسا کہ سطور گزشتہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ انھیں صفات کا پیدا کرنا " تکمیل انسانیت " ہے - سہ

ضوابط دین کامل کے دیئے ہیں ہاتھ میں تیرے

تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام لینا ہے

اس " تکمیل انسانیت " کی تشریح اصغر سے سنیئے :

" انسانی ہستی کا اگر ہر ریشہ ہوشیار و بیدار ہو تو کائنات عالم میں کیا ہے جس کا اس سے تعلق نہیں کون سی چیز ہے جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کیف و لذت کا ادراک نہ ہوتا ہو اس لئے .... عالم میں " حسن " اور محض حسن کے سوا اور موجود ہی کیا ہے .... لیکن کمال حسن کی شناخت کے لئے انسانیت کی تکمیل ضروری ہے۔[1] "

اصغر کی شاعری اسی " تکمیل انسانیت " کی داستان ہے -

اس تفصیلی بحث کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ باتیں زندگی کے مسائل ، انسانی زندگی اور خود اصغر کی زندگی کے تجربات اور ان کا " فلسفہ زندگی " نہیں ہیں؟ اتنی واضح " منزل مقصود " کی نشاندہی کے باوجود اگر جناب خواجہ احمد فاروقی کو منزل کی طرف اشارہ نظر نہیں آتا تو حیرت ہے -

میرے خیال میں یہ اتنی زیادہ تعجب انگیز بات بھی نہیں ، افتاد ذہنی اور نقطہ نظر کا اختلاف تو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز نتائج کا سبب ہوتا ہے ، بنیادی بات وہی ہے جس کی طرف بطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے اور جس کی توثیق و تصدیق جناب رشید احمد صدیقی نے کسی قدر مختلف الفاظ کے ساتھ فرمائی ہے :

" اگر جدید اسکول اسے (اصغر کی شاعری کو) پسند نہیں کرتا

۱- اردو شاعری کی ذہنی تاریخ ـــ دھلی اور لکھنؤ اسکول - زمانہ ستمبر ۱۹۲۹ء - صفحہ ۱۳۸

تو یہ اصغر صاحب کا قصور نہیں - قصور اس مقصدو معیار کا
ہے جس کے اصغر نہ واقف ، نہ مقلد نہ مداح -[1]"

اب تک اصغر کے کلام پر ناقدین کے آراء کا تنقیدی جائزہ لے کر، بدلائل یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان کے اعتراضات کی بنیاد ، اصغر کے مطالعہ کے نقص (عدم روادہ مطالعہ کے فقدان) اور نقطہ نظر کے اختلاف پر ہے، اس لیے یہ اعتراضات بے بنیاد اور باطل ہیں - اب ان ناقدین کے آراء کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جنھوں نے ان کی شاعری کی دل کھول کر داد دی ہے اور اسے قدر اوّل کی چیز کہا ہے -

ابتدائی باب میں ان ناقدین کے نام گنائے جا چکے ہیں - ذیل میں ان کے آراء کا مختصراً تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے :

اصغر کے متعلق ستائشی آراء کا تنقیدی جائزہ :

اصغر کو اول اول اہل ذوق سے متعارف کرانے والے مرزا احسان احمد صاحب ہیں ، جنھوں نے سب سے پہلے ان کا تذکرہ ضمناً " داغ جگر "[2] کے مقدمہ میں کیا - پھر علی گڑھ میگزین دسمبر ۱۹۲۱ء میں ان پر ایک مفصل مضمون لکھا اور آخر میں ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر نشاط روح (طبع اول ۱۹۲۵ء) میں شامل کیا جو آج تک بدستور چلا آ رہا ہے - مرزا صاحب نے اس مقدمہ میں اصغر کے خصوصیات کلام -------- فلسفہ و حکمت ، لطافت ، ندرت ادا ، صفائی و برجستگی ، جوش و مستی اور سوز و گداز گنوانے کے بعد اس بات پر زور دیا ہے کہ

" وہ اکثر حکیمانہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس طرح کہ
شعریت کو کہیں صدمہ پہنچنے نہیں پاتا -[3]"

اس بیان میں بڑی حد تک صداقت ہے لیکن یہ کہ " شعریت کو کہیں صدمہ پہنچنے نہیں پاتا " غلط ہے - تفصیل میں جانے کے بجائے صرف ایک غزل کے چند اشعار

۱- گنج ہائے گرانمایہ - مطبوعہ آئینہ ادب ۱۹۶۴ء - صفحہ ۱۳۹
۲- " داغ جگر " ۱۹۲۱ء کے آخری ربع میں شائع ہوا ، اس پر معارف دسمبر ۱۹۲۱ء (صفحہ ۳۸۰) میں تبصرہ کیا گیا ہے -
۳- مقدمہ " نشاط روح " - طبع دوم - صفحہ ۱۱

درج کئے جاتے ہیں، " جو کسی بلند صداقت تک تو پہنچاتے ہیں لیکن ان سے جذبات و حسیات میں کوئی تموج و تلاطم نہیں ہوتا اس لیے ان کو کلام موزوں تو کہا جا سکتا ہے لیکن ان میں شعریت نہیں ہے[1]۔" اشعار ملاحظہ ہوں :

خستگی نے کر دیا اس کو رگ جاں سے قریب
جستجو ظالم کہے جاتی تھی منزل دور ہے

نور آنکھوں میں اسی کا جلوہ خود نور محیط
دید کیا ہے کچھ تلاطم میں ہجوم نور ہے

آنکھ ہو جب محو حیرت تو نمایاں ہے وہی
فکر ہو جب کارفرما تو وہی مستور ہے

دیکھتا ہوں میں کہ ہے بحر حقیقت جوش پر
جو حباب اٹھ اٹھ کے مٹتا ہے سر منصور ہے

چوں کہ مرزا صاحب کی یہ رائے " نشاط روح " سے متعلق ہے اس لئے مثال بھی اسی سے دی گئی ہے ورنہ " سرود زندگی" میں بھی ایسے اشعار مل جائیں گے۔ مرزا احسان صاحب کے محولہ بالا بیان میں صرف اتنی صداقت ہے کہ اصغر نے بیشتر صورتوں* میں فلسفہ حکمت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ شعریت مجروح نہیں ہونے پائی لیکن کہیں کہیں شعر سپاٹ ہو گیا ہے۔

مرزا صاحب نے اپنے طویل مقدمہ کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے :

"(۱) ان کی لطافت آفرینوں نے تغزل کے انداز قدیم میں، رقص و سرور کا ایک نیا عالم پیدا کر دیا جو اب تک نگاہوں سے مخفی تھا ---

(۲) حضرت اصغر نہ کسی صنعت سخن کے موجد ہیں نہ دنیا

۱۔ " نظم و نثر پر ایک نظر " از اصغر ۔ ہندوستانی الہ آباد جولائی ۱۹۳۱ء ۔ صفحہ ۳۳۵ (بادنیٰ تصرف)

*۔ مولوی عبدالحق صاحب کی بھی یہی رائے ہے ۔ وہ لکھتے ہیں " بہت سے اشعار ان کے حکیمانہ ہیں لیکن اس انداز و اسلوب سے انہیں ادا کیا ہے کہ شعر کی خوبی و نزاکت ہاتھ سے نہیں گئی ۔"

(تبصرہ نشاط روح ۔ اردو اپریل ۱۹۲۶ء ۔ صفحہ ۳۳۷)

میں کوئی پیغام لے کر آئے ہیں ۔

اور (۳) .... نہ ان کی لطافت روحانی مادیت کے گرد و ار

کی متحمل ہو سکتی ہے ۔ ان کی نگاہیں صرف عالم قدس کے

روح پرور مناظر کی اداشناس ہیں ۔

(۴) موجودہ مذاق جو عالم مادی کے حوادث و افکار کی

مرقع نگاری کا دلدادہ ہے ممکن ہے حضرت اصغر کی لغزش مستانہ

کے خیر مقدم کے لئے تیار نہ ہو ۔"[1]

محولہ بالا مسلسل عبارت میں نمبر ڈال کر چار دعوؤں کی شکل دے دی گئی

ہے ۔ ذیل میں نمبر وار ان پر تبصرہ کیا جاتا ہے :

دعویٰ نمبر ۱

بالکل درست ہے ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ ھذا ، جذب و کیف ،

صفحہ ۶۴۷-۶۶۵ اور " مسرت و طمانیت " صفحہ ۵۰۲-۴۹۷

دعویٰ نمبر ۲

کا پہلا حصہ کہ " وہ کسی خاص صنف کے موجد نہیں " درست ہے ۔

البتہ دوسرا حصہ کہ " دنیا میں کوئی پیغام لے کر آئے ہیں " اس سے

مجھے اختلاف ہے ۔ سطور گزشتہ میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی

ہے ۔ ان کے پیغام کو " حسن شناسی " کہا جا سکتا ہے کہ یہی انسانی

اخلاق و کردار ـــــ " نیکی ، شرافت اور شائستگی " کا مرکزہ

(Nucleus) ہے ۔

دعویٰ نمبر ۳

اس میں جزوی صداقت ہے ۔ مرزا صاحب کا یہ بیان کہ " ان کی نگاہیں

صرف عالم قدس کے روح پرور مناظر کی اداشناس ہیں " محل نظر ہے ۔

اصغر کے سوانح حیات نیز دوسرے ابواب میں جا بجا اشارہ کیا گیا ہے کہ

اصغر نے دنیا میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور اس کے " مناظر و

مظاہر اور واقعات و حوادث " سے محظوظ و مغموم ہوئے ہیں ۔ یہ ضرور

۱۔ مقدمہ نشاط روح ۔ طبع دوم ۔ صفحہ ۳۱

ان کی شاعری میں ـــــ مومن ـــــ کی بداعت اسلوب اور شگفتگی ترکیب اور غالب کا زور بیان اور نکتہ آفرینی شیر و شکر ہو کر نئی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں ـ جس میں تصوف و عرفان نے تاثیر کی روح پھونک دی ہے ـ ان کی شاعری چونکہ مسلک ثانی ہے اس لئے مسلک اول کی خامیوں سے پاک ہے ..
...... اس حیثیت سے اگر ان کو طرز خاص کا موجد کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہے ...... جناب اصغر کا مجموعہ کلام اردو کی دنیائے نظم کا بہترین شاہکار ادب ہے ـ غزلیات اصغر کی سب سے بڑی خصوصیت معیار اخلاق کی بلندی ہے ـ آپ کو تلاش سے بھی ایک شعر ایسا نہیں مل سکتا جو اعلیٰ ترین تہذیب سے فروتر ہو ـ"[1]

اقتباس بالا میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان پر سلسلہ وار تبصرہ کیا جاتا ہے ـ

(۱) اصغر کے کلام میں غالب اور مومن کے انداز کا خوشگوار ترین امتزاج ہے ـ یہ نتیجہ درست ہے ـ تفصیلی بحث اصغر و غالب ، صفحہ ۵۱۸-۵۲۸ اور اصغر و مومن صفحہ ۵۵۶-۵۵۹ مقالہ هذا میں ملاحظہ فرمائیے ـ

(۲) "ان کے کلام میں تصوف و عرفان نے تاثیر کی روح پھونک دی ہے " یہ بھی بالکل صحیح ہے (البتہ کہیں کہیں شعر بے کیف ہو گیا ہے ـ مثال اوپر دی جا چکی ہے) ـ اس پر اصغر اور درد کے تقابلی مطالعہ میں تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے ـ یہاں جناب سہیل کے بیان کی تصدیق و شہادت میں چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

تری جلووں کے آگے همت شرح و بیان رکھ دی
زبان بے نگہ رکھ دی ، نگاہ بے زبان رکھ دی

نیاز عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظ ناداں
هزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

۱ـ تبصرہ نشاط روح ـ طبع دوم ـ صفحہ ٦٩-٦٨

کھینچئے آہ کس طرح دوڑ کے سجدۂ نیاز
یہ بھی تو ہوش اب نہیں پاؤں کہاں ہے سر کہاں
اس کو مطلوب ہیں کچھ قلب و جگر کے ٹکڑے
جیب و داماں نہ کوئی پھاڑ کے دیوانہ بنے

(۳) " ان کا رنگ متقدمین اول کی خامیوں سے پاک ہے " - صحیح ہے - تفصیلی بحث اصغر اور غالب ، اور اصغر اور مومن میں کی جا چکی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ایک طرف اصغر کا کلام غالب کی فارسی تراکیب کی گرانباری ، ناہمواری اور بے کیف تہ داری سے پاک ہے ، دوسری طرف مومن کی رنگین حسی مصوری کی پیچیدہ بسیاری سے مبرا ہے - اصغر کے یہاں مومن سے زیادہ رنگینی و لطافت اور غالب کی تراکیب سے زیادہ شعریت ہے - سہیل صاحب کے بیان پر اتنا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کے رنگ کا بہت ہی لطیف ، شائستہ اور رنگین امتزاج اصغر کے یہاں ملتا ہے

(۴) " طرز خاص کا موجد " بھی درست ہے البتہ طرز خاص کے عناصر ترکیبی میں غالب اور مومن کے رنگ کے علاوہ صرف تصوف و عرفان ہی نہیں ہے اور بھی بہت کچھ ہے - مثلاً ان کے مزاج کی شرافت و نفاست ، نزہت و لطافت ، شگفتگی و شادمانی ، پاکیزگی و معصومیت اور رنگینی کے ساتھ ساتھ کمال درجہ کی تصویر آفرینی ، مرصع کاری اور موسیقیت ہے -

(۵) " مجموعہ کلام اردو کی دنیائے نظم کا بہترین شاہکار ادب ہے " - اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ اس سے بہتر کسی اور کا کلام نہیں تو اس میں تامل ہے لیکن اگر مقصود یہ ہے کہ بہترین شاہکار میں سے ہے تو اس میں کلام نہیں - باقی رہی یہ بات کہ کوئی شعر اطیع ترین تہذیب سے فروتر نہیں ، تو اس میں مشکل سے دو رائیں ہو سکتی ہیں - اصغر کی شاعری کی اس خصوصیت کا تقریباً سبھی ناقدین نے اعتراف کیا ہے - اصغر کے " رنگ خاص " کا اعتراف مولوی عبدالحق نے بھی کیا ہے - وہ لکھتے ہیں :

" حضرت اصغر اردو کے ان چند زندہ شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اردو غزل میں ایک " خاص رنگ " پیدا کیا ہے - وہ کائنات کو

حکیمانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور اسی میں ان کا تخیل اور
ان کے جذبات پنہاں ہیں۔ نظر بلند اور خیال وسیع ہے ۔
اسلوب بیان بھی پختہ ہے لیکن ان کی شاعری خواص* کے لئے
ہے عوام کے لئے نہیں ۔[1]"

سر تیج بہادر سپرو بھی اصغر کے رنگ خاص کے مقر و معترف ہیں ۔ وہ اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں :

" میں اردو میں جدید رنگ پیدا کرنے والے پانچ چھ شعرا
میں مولوی اصغر صاحب کو بھی زمانۂ حال کے بہترین شاعروں
میں سمجھتا ہوں ...... مولوی اصغر صاحب کی شاعری ان
کی زندگی کا عکس ہے اور زردشتیوں کے قول کے مطابق ان کی
رفتار ، گفتار اور کردار میں مطابقت پائی جاتی ہے ۔[2]"

کلام اور شخصیت میں کامل ہم آہنگی کی تصدیق جناب رشید احمد صدیقی ، جناب ڈاکٹر محی الدین قادری زور، جناب جلیل احمد قدوائی اور جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی تحریرات سے بھی ہوتی ہے ۔ ان میں سے اول الذکر تین حضرات کے اقتباسات " شاعری میں شخصیت " کے تحت (مقالہ ہذا ، صفحہ ۴۳۸ - ۴۳۷) پیش کئے جا چکے ہیں اس لئے یہاں صرف ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا اقتباس درج کیا جاتا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" جو انہیں جانتے ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے شعر
ان کی ذات سے الگ کوئی مصنوعی چیز نہ تھے بلکہ ان کی
زندگی ہی کا ایک پرتو تھے ۔ ہم آہنگ شخصیت خود شعر
بن جاتی ہے ۔ حق کے تجربۂ داخلی سے روح میں شعریت پیدا
ہو جاتی ہے پھر قلب کی یہ واردات کسی طرح بھی اوروں پر

---

*۔ اصغر کے کلام کے بارے میں یہی رائے جناب رشید احمد صدیقی کی بھی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں " اصغر عوام کے شاعر نہیں ہیں ۔ ان کے کلام کے حسن و تاثیر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ بہت کچھ لکھے پڑھے ، بھلے مانسوں میں بیٹھے اور ذوق و بصیرت رکھتے ہوں ۔" گنج ہائے گرانمایہ ۔ صفحہ ۱۲۹

۱۔ تبصرہ سرود زندگی ۔ اردو اپریل ۱۹۳۵ء ۔ صفحہ ۲۱۲-۲۱۱

۲۔ مقدمہ سرود زندگی ۔ طبع اول ۱۹۳۵ء ۔ صفحہ ۲

ظاہر ہو اپنے حسن باطن کی جھلک ساتھ لاتی ہے ۔

خاکستر پروانہ شمع شبستاں کے انداز جذب کر کے خود حسن کی ایک دنیا بن جاتی ہے ؎

انداز ہیں جذب اس میں سب شمع شبستاں کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

اصغر کے شعر کو ان کی ذات کے ساتھ بھی گہرا علاقہ تھا ۔ اس لیے اردو زبان کے ایک بڑے شاعر کا ماتم نہیں ۔ ہمیں تو سچ یہ ہے ایک نیک آدمی کی جدائی پر رونا چاہیے ۔ الفاظ کے پیشہ ور صناعوں میں ایک آدمی تھا ۔ افسوس کہ نہ رہا[1] ۔"

تحسینی آراء کی یہ فہرست ناقص و نامکمل رہ جائے گی اگر دو ان بزرگوں کے اقتباسات درج نہ کئے جائیں ، جن کا ادبی ذوق اور بصیرت مسلّم ہے ۔ یہ بزرگ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی ہیں ۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اصغر کے کلام پر تنقید نہیں کی، تقریظ لکھی ہے جس میں ذاتی تاثر بیان کیا جاتا ہے اور تقریظ نگار اس کا پابند نہیں ہوتا کہ کلام کا تجزیہ کر کے اس کے محاسن گنائے ۔ مولانا نے یہی کیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ مولانا کا اتنا لکھنا بھی کہ " جو شاعر یہ کہہ سکے اور یوں کہہ سکے اسے میں ایسا کیوں نہ کہوں"[2] اصغر کے ایک اعلیٰ شاعر ہونے کے لئے سند کا درجہ رکھتا ہے ۔ مولانا آزاد نے اصغر کو یوں داد دی ہے :

" مجھے اس اعتراف میں تامل نہیں کہ جوں ہی دو چار شعر نظر سے گزرے میں چونک اٹھا ---- میں نے محسوس کیا کہ وقت کی عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں ہیں ----- میں نے یہ مجموعہ بے دلی کے ساتھ اٹھایا تھا لیکن جب رکھا

۱۔ پیغام بہ سلسلہ "یوم اصغر" ۔ علی گڑھ میگزین اپریل ۱۹۳۷ء

۲۔ یہ جملہ جناب شان الحق صاحب حقی کا ہے جو موصوف نے اصغر کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کی شان میں رقم فرمایا ہے --- انتخابات اصغر ۔ صفحہ ۲۹

تو اس اعتراف کے ساتھ رکھا کہ اردو میں ایک شاعر موجود ہے جس کی موجودگی سے میں اس وقت تک بے خبر تھا ۔
میری نگاہ نکتہ چینی میں کمی نہیں کرتی ۔ میں معیار کی پستی پر کسی طرح اپنے کو راضی نہیں کر سکتا ــــ ــــ میں محسوس کرتا ہوں کہ ــــــ (اصغر) کی شاعری بحث و اثبات کی محتاج نہیں ہو سکتی ــــــ محاسن کا حق ہے کہ ان کی شہادت دی جائے ۔ میں نے اصغر صاحب کے کلام میں حسن و خوبی پائی میرا فرض تھا کہ اس کی شہادت دوں [1] ۔"

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے مخصوص انداز میں اصغر کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے ۔ وہ تحریر فرماتے ہیں :

" ایسی معرفت بین نگاہیں اردو شاعر میں شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوئی ہیں ۔ ایک ایک شعر بہتوں کے ایک ایک دیوان پر بھاری ۔ کلام مختصر لیکن سب کا سب منتخب ۔ ضرورت انتخاب سے مستغنی ــــ " نشاط روح " کا ہر شعر نشاط روح کا سامان " سرود زندگی " کے ہر ورق میں نغمۂ حقیقی کی شان [2] ۔"

اقتباسات بالا میں اصغر کی شاعری کے جن خصوصیات کی طرف اشارے کئے گئے ہیں ان سے تفصیلی بحث کی جا چکی ہے اس لئے ان پر تبصرہ سے گریز کیا جاتا ہے ۔

تسامحات اصغر :

ان بزرگوں کے علاوہ جناب اثر لکھنوی نے بھی اصغر کی تعریف کی ہے اور خوب جی کھول کر داد دی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

" حضرت اصغر کے اچھے شاعر ہونے میں شک نہیں ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے [3] ۔"

۱۔ تقریظ سرود زندگی ۔ طبع اول ۔ صفحہ ۲۰ ۔ ۱۲ (ملخص)
۲۔ پیغام بہ سلسلۂ یوم اصغر ۔ علی گڑھ میگزین اپریل ۱۹۳۷ء
۳۔ روح نشاط پر ایک نظر ۔ مرقع لکھنؤ مارچ ۱۹۲۶ء ۔ صفحہ ۲۵

اسی مضمون میں ایک شعر کی تشریح کرتے کرتے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

" بہت کچھ لکھا مگر معلوم ہوتا ہے کچھ نہیں لکھا "

یہ " کچھ نہیں لکھا " شعریت کی آخری حد ہے – ع

" جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود [1] "

مگر جیسا کہ سطور بالا میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اثر صاحب نے اصغر کے کلام پر اعتراض بھی کئے ہیں مگر عالمانہ اور ہمدردانہ انداز میں – مقصد اعتراض نہیں تھا (جیسا کہ نیاز ، یگانہ اور دوسرے ناقدین کا تھا) بلکہ شاعر کو دوستانہ مشورہ یا فہمائش تھی – چنانچہ مقصد اعتراض واضح کرتے ہوئے مضمون کو رائمر (Rymer) کے درج ذیل اقتباس پر اس طرح ختم کرتے ہیں :

" کوئی صنّاع ہیرے کو جلا نہ کرے اگر اسے خیال ہو کہ اس کے جرم پر کسی اور کی نظر نہ پڑے گی – اسی طرح شاعر بے پروا ہو جائیں اگر نقاد خورده گیری نہ کریں –"

اسی مقصد کو پورے خلوص کے ساتھ ان الفاظ میں واضح کیا ہے :

" مجھے حضرت اصغر کے کلام میں لغزشیں بھی نظر آئیں گو ان کی وقعت اس سے زیادہ نہیں جیسے شاہد ان رعنا کے چہروں میں بعض کے رخسار پر کوئی بدنما خال ہو – میں نے ایسے معشوقوں کی طرف سے آنکھیں پھیر کر دوسروں کسے جمال بے مثال سے آنکھیں سینکیں – [2] "

پھر جب ان لغزشوں اور غلطیوں کی طرف اشارے کئے تو اس اعتذار کے ساتھ:

" روح نشاط * میں ـــــ زبان کی خامی اور عجز نظم کی متعدد مثالیں نظر آتی ہیں ـــــ میں ہرگز آمادہ نہ ہوتا اگر یہ امید نہ ہوتی کہ مضمون مفید ثابت ہوگا – جو ترمیم سمجھ میں آئی درج کر دی گئی – حاشا اس کا مقصد اصلاح دینا نہیں ہے – [3] "

---

۱ – اصغر

۲ – تصحیح روح نشاط پر ایک نظر – مرقع لکھنؤ مئی ۱۹۲۶ء – صفحہ ۲۸

۳ – " روح نشاط کا دوسرا رخ " – مرقع لکھنؤ مئی ۱۹۲۶ء – صفحہ ۳۸

* – دیوان کا اصل نام " نشاط روح " ہے ، اثر صاحب سے تسامح ہو گیا ہے –

اسی جذبہ کے تحت موصوف نے اصغر کے " نشاط روح " پر چھبیس[1] اعتراض کئے جن میں سے " بعض بعض شاعرانہ اصول[2] " کے مطابق حق بجانب ہیں ۔ ذیل میں دو چار اعتراضات درج کئے جاتے ہیں تاکہ ان کی نوعیت و حقیقت کا اندازہ ہو سکے ۔

شعر اصغر

اگر خموش رہوں میں تو تو ہی سب کچھ ہے　　جو کچھ کہا کہ ترا حسن ہو گیا محدود

اعتراض جناب اثر

دوسرے مصرعہ کی ترکیب غلط ہے لفظ " کہ " کے قبل " جو کچھ کہا " کے بجائے " کچھ کہا نہیں " چاہئے تھا " کچھ کہا نہیں کہ ترا حسن ہو گیا محدود " مگر مصرعہ اس طرح نظم ہونا مشکل تھا ۔ دوسری صورت یہ تھی کہ " کہ " کے بجائے " تو " لایا جاتا " جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود " ۔ مگر یہ لفظ " تو " اپنے لفظ مابعد " ترا " سے مل کر تنافر پیدا کرتا ۔ " تو " پہلے مصرعہ میں بھی موجود ہے اس کا ترک ہی اولیٰ تھا ۔ تیسری صورت یہ تھی کہ لفظ " کہ " نکال کر مصرعہ کا زور لفظ " بھی " سے قائم رکھا جاتا اور یہ سکتی تھا " کہا جو کچھ بھی ۔ ترا حسن ہو گیا محدود " ------ زبان کا عیب مٹ گیا ۔ لفظ " بھی " ایسی جگہ واقع ہوا ہے کہ اس کے بعد قدرے توقف لازم ہے جس سے حسن کے محدود ہو جانے کی آواز کے ذریعہ سے تصویر کھنچ جاتی ہے ۔

شعر اصغر

ایک مشت خاک کا کیا ہو بیاں اضطراب　　ذرے ذرے میں نہاں ہے اک جہان اضطراب

۱۔ " روح نشاط کا دوسرا رخ " ۔ مرقع لکھنؤ مئی ۱۹۲۶ء صفحہ ۳۸

۲۔ روح نشاط کے دوسرے رخ پر ایک نظر ۔ از جناب صفدر مرزاپوری ۔ صلائے عام دھلی جون جولائی ۱۹۲۶ء ۔ بحوالہ مرقع نومبر ۱۹۲۶ء ۔ صفحہ ۲۹۔ صفدر صاحب کی اصل عبارت یہ ہے " اس سے مجھے یا کسی سخن فہم کو انکار نہیں ہو سکتا کہ (جناب اثر کے ۔ مقالہ نگار) بعض بعض اعتراضات شاعرانہ اصول کی بنا پر حق بجانب ہیں ۔"

*ث اصغر صاحب نے بعد میں یہ مصرعہ ایسے ہی بنا دیا ۔

اعتراض جناب اثر

پہلا مصرعہ فصاحت سے گرا ہوا ہے ۔ " بسمل " کی اضافت غلط ہے ۔
اس کی شکل یوں ہوگی :

" ایک مشت خاک کا اضطراب کیا بسمل ہو "

جس میں اضافت کو دخل نہیں ۔

شعر اصغر

نہیں معلوم کتنے جلوہ ہائے حسن پنہاں ہیں
کوئی پوچھا نہیں گہرائیوں میں اشک پیہم کی

اعتراض جناب اثر

" میں " کی جگہ " کو " چاہئے اب مصرعہ محاورہ کی حدوں میں آ گیا ۔

شعر اصغر

اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں   تم پھاڑ کر تو سینہ پروانہ دیکھتے

اعتراض جناب اثر

غالباً لفظ " چیر "* غیر مہذب سمجھا گیا ۔ مگر " پھاڑ " بھی اس کا
ہم پلہ ہے ۔ چاک جو دونوں سے بہتر تھا آ سکتا تھا ۔ ع

" گر چاک کر کے سینہ پروانہ دیکھتے "

پہلے مصرعہ میں " ہے " کی جگہ " تھا " چاہئے ورنہ ردیف غلط ہو جائے گی ۔

اثر صاحب کے بعض اعتراضات ایسے بھی ہیں جن میں اختلاف کی بہت کچھ
گنجائش ہے ۔ ذیل میں دو ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

شعر اصغر

اسیران بلا نے آہ کچھ اس درد سے کھینچی   نگہبان چیخ اٹھے ہل گئی دیوار زنداں کی

---

*۔ طبع دوم میں یہ ترمیم قبول کر لی گئی ہے اور مصرعہ یوں بنا دیا گیا ہے

ع " تم چیر کر تو سینہ پروانہ دیکھتے "

اعتراض جناب اثر

نگہبان پر جو کچھ گزری ہو مگر شعر کے سامع پر چیخ اٹھنے سے کانپ اٹھنے کا اثر کہیں زیادہ ہوتا ہے

ع " نگہبان کانپ اٹھے ہل گئی دیوار زنداں کی "

عرض مقالہ نگار

ممکن ہے " چیخ اٹھنے " کا لفظ بعض انتہائی نازک طبائع پر بار ہو لیکن " دردناک آواز " سے جو بے ساختہ " چیخ " نکل جاتی ہے اس کی تصویر " کانپ اٹھنے " سے نہیں بنتی ۔ پھر " آہ " کتنی ہی درد سے کیوں نہ کھینچی جائے اس سے " دیوار زنداں کا ہل جانا " سمجھ میں نہیں آتا ۔ مگر جب اس " تاثیر آہ " میں، نگہبان کی " اضطراری بلند چیخ " بھی شامل ہو جائے تو وہ " بھونڈا مبالغہ " جو کانپ اٹھنے سے پیدا ہوتا تھا (جو اثر صاحب نے ترمیم میں پیش کیا ہے) خود بخود رفع ہو جاتا ہے ۔ اس لئے یہاں " کانپ اٹھے " کے مقابلہ میں " چیخ اٹھے " زیادہ جامع ، موثر اور بلیغ ہے ۔

شعر اصغر

پھر گئی آنکھوں کے نیچے وہ ادائے برق حسن

چیخ اٹھے سب مرا چاک گریباں دیکھ کر

اعتراض جناب اثر

یہاں بھی " چیخ " کا لفظ معنوی خوبیوں سے معرا ہے ۔ " پھر گئی آنکھوں کے نیچے " اس ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے " برق حسن " کی ادائیں دیکھ چکے ہیں اور " حسن " کے ادا شناس ہیں ۔ لہذا " چاک گریباں " کی تجلی دیکھ کر جذبۂ حیرت طاری ہوگا نہ کہ چیخ اٹھیں گے ۔ اگر یہ کور باطن ہیں تو " چاک گریباں " کی وقعت ان کی نظروں میں ایک " چار گرہ کپڑے " سے زیادہ نہیں ہو سکتی (وہ بھی بوسیدہ) وہ متاثر ہی نہ ہوں گے بالفرض متاثر ہوئے اور چیخ بھی اٹھے تو کون سی قابل فخر بات ہوئی ۔ یہاں بھی " چیخ اٹھے " سے " کانپ اٹھے " کہیں اچھا تھا ۔

عرض مقالہ نگار

" حیرت میں بھی چیخ نکل جاتی ہے " یہاں شاعر نے یہی کیفیت پیدا کی ہے دیکھنے والوں کو " گریبان کی تجلی " نے نہیں (جیسا کہ اثر صاحب نے فرمایا ہے) " سینۂ عاشق " کی تجلی نے مبہوت کر دیا اور جب " چاک گریبان " کے پیچھے سے " برق حسن کے کوندے لپکے " تو حیرت میں ان کے منہ سے چیخ نکل گئی -

حیرت

(۱) جس " برق حسن " کی تلاش میں ہم سرگرداں ہیں وہ زیر گریبان عاشق پوشیدہ ہے؟

(۲) اس کو (عاشق کو) تو ہم نے بہت ہی " معمولی اور حقیر " سمجھ رکھا تھا۔ اس نے اپنے اندر " شمع شبستاں "* کے انداز جذب کر کے خود کو حسن کی دنیا بنا رکھا ہے؟

یہ ہے سبب " حیرت میں چیخ اٹھنے " کا - یہ بات " کانپ اٹھنے " سے ہرگز نہیں پیدا ہوتی -

شعر اصغر

ہائے وہ دن گزر گئے جو شش اضطراب کے

چھنشد قفس میں آ گئی اب غم بال و پر کہاں

اعتراض جناب اثر

چھنشد ایک عارضی کیفیت ہے - قاطع غم نہیں ہو سکتی - لفظ غم سے اس کا تقابل بھی نہیں نہ قفس والوں کو چھنشد آتی ہے - البتہ قفس سے خوگر ہونے کے بعد " چین " آ جاتا ہے مگر ایسا " چین " جس کے پردے میں ہزاروں اضطراب انگڑائیاں لیتے ہیں - دوسرا مصرعہ یوں پڑھیے اور شعر کی بلاغت پر غور کیجئے -

ع " چین قفس میں آ گیا اب غم بال و پر کہاں "

---

* انداز ہیں جذب اس میں سب شمع شبستاں کے

اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ (اصغر)

عرض مقالہ نگار

شعر کی بلاغت پر غور نہیں کیا گیا (حضرت اثر کی روح سے معذرت کے ساتھ) شاعر نے ایک لفظ " ہائے " کو تین مختلف قابل تاسف کیفیات کے لئے استعمال کیا ہے :

(۱) جوشش اضطراب کا ختم ہو جانا

(۲) قفس ، جہاں عہد نہیں آنا چاہیے وہاں بھی عہد کا آ جانا

اور (۳) بال و پر کے غم (ہوا یا خیال) سے غفلت

گویا قفس سے لڑ لڑ اور الجھ الجھ کر اس درجہ مغلوب اور دل شکستہ ہو گیا کہ مجبوراً " قفس " کو گوارا کر لیا اور سکھ چین سے سونے لگا ۔ اپنے " خوبصورت اور قوی پر و بال " سے اس درجہ اغماض اختیار کیا کہ قفس کی ذلت گوارا کر لی ۔ ہائے کیسی " قلب ماہیت " ہوئی ہے ۔

بہرصورت اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ جناب اثر کے تمام اعتراضات درست ہیں جب بھی اس سے اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے شاعروں کی طرح اصغر کے یہاں بھی اغلاط و تسامحات راہ پا گئے ہیں ۔ اس سے اصغر کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اعتراض کرتے وقت یہی تاثر اثر صاحب کا بھی تھا۔ وہ رقمطراز ہیں :

> " میں ...... نہایت آزادی اور سچے دل سے کہتا ہوں کہ اگر وہ تمام معائب جو " روح نشاط " میں مجھے نظر آئے معائب مان لئے جائیں تو بھی صنعت کے کمال میں فرق نہیں آتا۔ حضرت اصغر نے بہ کثرت ایسے اشعار کہے ہیں جن کی مثل کوئی دس بیس بھی کہہ لے تو کوس " لمن الملک الیوم " بجانے کا مستحق ہو جائے ۔ تسامحات سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اصغر انسان ہیں فرشتہ نہیں [۱] ۔"

مختصر یہ کہ حضرات ناقدین کے آراء کے تنقیدی جائزہ سے جو باتیں منقح و محقق

---

* تمام اشعار اور ان پر جناب اثر کے اعتراضات رسالہ مرقع لکھنؤ مئی ۱۹۲۶ء سے ماخوذ ہیں (صفحات ۲۲ - ۳۸)

۱ - روح نشاط کا دوسرا رخ - جناب اثر لکھنوی - مرقع مئی ۱۹۲۶ء - صفحہ ۳۸

ہو کر سامنے آئیں وہ یہ ہیں :

(۱) اصغر ایک اچھے شاعر تھے ۔

(۲) ان کا اپنا ایک انفرادی رنگ تھا ۔

لیکن ان کا کیا انفرادی رنگ تھا اور ان کو شعراء کے زمرہ میں کہاں جگہ دینا چاہیے ۔ یہ کسی نے کھل کر نہیں کہا۔ ذیل میں ناقدین قدیم و جدید کی تحریرات کی مدد سے ، اصغر کی " انفرادیت " اور " شاعرانہ مرتبہ " کے تعین کی کوشش کی جاتی ہے :

اصغر کی انفرادیت :

اصغر کی انفرادیت کا صحیح تعین مقالہ ہذا باب پنجم " شخصیت و شاعری " کے تحت کیا جا چکا ہے تاہم اس کو اس شکل میں پیش نہیں کیا گیا ۔ یہاں انہی باتوں کو مختصراً (محض عنوانات کے ذریعہ ـــ یا دو چار جملوں کے ذریعہ) نئی ترتیب کے ساتھ مع شواہد کے (دوسرے نقادوں کے اقتباسات) پیش کیا جاتا ہے ۔

طہارت و پاکیزگی :

اصغر کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت طہارت و پاکیزگی کی وہ روح ہے جو شروع سے آخر تک ، اس میں جاری و ساری ہے ۔ اس خصوصیت میں کوئی اور غزل گو ان کا ثانی نہیں ہے ۔ ان کے کلام میں پاکیزگی کی فضا حسب ذیل باتوں سے آئی ہے :

(۱) عشق کے تنزیہی و تجریدی تصور سے

(۲) " جنسی محبت " کے معاملات کی عریاں نگاری سے اجتناب سے

(۳) اسلامی شعائر اور تلمیحات پر طنز و تعریض سے شعوری پرہیز سے

(۴) محبت کے " روایتی تصورات " کی اصلاح ، اور ان تصورات کے اظہار سے اجتناب سے ۔

(۵) ان " فرسودہ " ، " پامال " اور " بے جان " الفاظ ـــ مثلاً " ماہ وش " ، " ماہ رو " " ظالم " ، " قاتل " ، " رقیب " ـــ سے اجتناب سے ۔

جناب شان الحق حقی کے موخرالذکر دو باتوں کی طرف بجا طور پر اشارہ فرمایا ہے ۔ وہ رقمطراز ہیں :

" اصغر نے جہاں اپنے شگفتہ انداز سے اردو غزل کی عام روش کو اپنے زمانہ میں متاثر کیا وہاں غزل میں محبوب اور محبت کے روایتی تصورات پر بھی نظرثانی اور ان کی اصلاح کی ــــــ قاتل اور رقیب کو سب سے پہلے انہوں نے ہی شعر بدر کیا ــــــ حسن کے تصور میں بھی اصغر کے ہاں نہ صرف ایک خوش مذاقی بلکہ انفرادیت موجود ہے[1]۔"

(تفصیل کے لئے دیکھیے مقالہ ھذا " طہارت و پاکیزگی " صفحہ ۴۹۲ - ۴۹۰ / ۴۶۲ - ۴۵۵ " تصور محب و محبوب " صفحہ ۴۱۳ - ۴۰۵)

۲- جذب و کیف و والہانہ از خود رفتگی :

یہ وہی خصوصیت ہے ، جسے مرزا احسان احمد صاحب نے " رقص و سرور " سے تعبیر کیا ہے ۔ (حوالہ سطور گزشتہ میں گزر چکا ہے) ۔ اصغر نے اپنی شاعری میں یہ کیفیت ، اپنی روحانی موسیقی کو الفاظ کے نازک آبگینوں کی کھنک اور جھنکار سے ملا کر پیدا کی ہے ۔ اس خصوصیت خاص میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز اور اردو غزل کی پوری تاریخ میں منفرد ہیں ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ ھذا جذب و کیف و والہانہ از خود رفتگی ، صفحہ ۴۴۳ اور صفحہ ۴۷۵ - ۴۷۶) ۔

جناب عابد رضا بیدار نے ان کی شاعری کی " موسیقیت " کو بجا طور پر سراہا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" اصغر نے ــــــ شاعری میں مرصع کاری کی ہے ۔ سبک رو تجرباتی اسلوب بیان ، اردو کے حسین ترین الفاظ کا استعمال ، ایسے نازک اور خوبصورت الفاظ جو اردو کیا کسی بھی زبان کی شاعری میں کم شاعروں کو نصیب ہوئے ہوں گے ۔ الفاظ کو الفاظ سے ٹکرا کر موسیقی کی جھنکار پیدا کرنے کی تکنیک ــــ اور ان سب پر چھایا ہوا ایک گہرا اور باوقار ترنم[2]۔"

۱- اصغر کی غزل ــــ انتخابات اصغر ۔ صفحہ ۷۲

۲- اصغر کا مطالعہ ۔ آجکل دہلی جون ۱۹۵۷ء ۔ ص ۳۱

۳- شاطیہ لہجہ :

سطور بالا میں بدلائل ثابت کیا جا چکا ہے کہ اردو غزل کی پوری تاریخ میں، اصغر " شاطیہ لہجہ " کے سب سے بہتر شاعر ہیں ۔ اس تحقیقی مطالعہ کے بعد یہ بات پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ

" اصغر اردو کا بہترین شاطیہ شاعر ہے یعنی المیہ عشقیہ غزل میں جو مقام میر کا ہے وہی مقام لطافت احساس اور نشاط تخیل کی شاعری میں اصغر کا ہے[1] ۔"

(تفصیل مقالہ ھذا " شاطیہ لہجہ ، صفحہ ۴۹۷-۵۰۴ پر ملاحظہ ہو)

۴- رنگین تصویر آفرینی اور نقاشی :

اس خصوصیت میں بھی اصغر منفرد و ممتاز ہیں ۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ شعرائے قدیم و جدید میں کسی نے ان کی طرح رنگین شاعرانہ مصوری اور نقاشی نہیں کی تو غلط نہ ہوگا ۔ جناب اسلوب احمد انصاری نے بجا طور پر ان کو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا نقاش کہا ہے ۔ وہ رقمطراز ہیں :

" شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ اصغر اپنے معاصر غزل گو شعرا میں سب سے بڑھ کر نقاش ہیں[2] ۔"

(تفصیل کے لئے دیکھئے مقالہ ھذا " رنگینی طبع و نفاست پسندی " ص ۵۰۴-۵۱۵ ، میری شاعر غالب ـــــ ص ۵۲۴-۵۲۷ ، اصغر اور مومن ، ص ۵۵۱-۵۵۸ اور اصغر اور حسرت ، ص ۵۲۱)

۵- حسن گفتار :

بات کو حسین ترین اور موثر ترین انداز میں پیش کرنا ـــــ یعنی کلام کو رنگینی، موسیقی اور نفاست و نزاکت کی آمیزش سے جنت نگاہ اور فردوس گوش بنانے میں مشکل سے کوئی دوسرا ان کا ثانی ملے گا ۔ جناب شان الحق حقی نے بالکل درست

۱- اصغر کی انفرادیت ۔ از جناب یحییٰ امجد ۔ اوراق ۔ لاہور ۔ شمارہ خاص (۳) ۱۹٦۸ء ۔ صفحہ ۱۰۹

۲- اصغر گونڈوی کا رنگ تغزل ۔ اسلوب احمد انصاری ایضاً صفحہ ٦۷

فرمایا ہے :

" میں غزل کا ذکر کر رہا ہوں اور اس صنف میں خالص
" حسن گفتار " پر اصغر سے ذرا پہلے یا اصغر کے زمانہ
میں کسی کی نظر اس قدر نہ تھی جتنی کہ اصغر کی ۔
الفاظ میں موسیقی اور رنگینی پیدا کرنے کا ایسا خیال اور
ایسا ملکہ ان کے ہمعصروں یا پیشروؤں میں سے کسی کو نہ
تھا۔ کہیں اگر ہے مثلاً غالب کے یہاں تو مضمون اکثر بوجھل
ہو جاتا ہے ۔ جہاں سنبھل گیا وہاں کیا کہنا ۔" [۱]

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ۔ مقالہ ھذا " رنگینی طبع و نفاست پسندی
صفحہ ۵۰۲-۵۱۵ ، جذب و کیف ۔۔۔ صفحہ ۴۶۵-۴۶۷/۴۴۳ ، اجتہاد ۔ میں ۔۔۔
غالب ، صفحہ ۵۱۸-۵۲۸)

۲۔ برکیف تشزئینی اسلوب :

اس خصوصیت خاص میں اردو غزل کی پوری تاریخ میں اصغر کا کوئی ثانی
نہیں ہے ۔ اس سلسلہ میں جناب خواجہ احمد فاروقی کا درج ذیل بیان بڑی حد
تک درست ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" اصغر کو کرسی تشبیہی تراکیب کا خاص سلیقہ ہے اور اس
نے الفاظ کی مینا کاری سے اشارات و کنایات کا ایک طلسم
کھول دیا ہے ۔۔۔۔ جہاں تک تخلیق معانی ، ایجاد
اسالیب ، تزئین بیان ، شادابی گفتگو ، استخوان بندی تراکیب ،
تصویرکشی اور مرصع کاری کا تعلق ہے اصغر شعرائے عصر حاضر
میں ایک ممتاز درجہ کا مالک ہے ۔" [۲]

اصغر کے تزئینی اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے ایک دوسری جگہ یوں لکھتے ہیں :

" ان کا آرٹ ۔۔۔۔ بہت رچا ہوا اور بڑی ریاضت کا نتیجہ
ہے ۔ یہ بقول شخصے ڈھاکے کی ململ اور لکھنؤ کی جامدانی

۱۔ اصغر کی غزل ۔ انتخابات اصغر ۔ صفحہ ۷۰

۲۔ اصغر کی شاعری ۔ بحوالہ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور ۔ صفحہ ۱۵۹

کی طرح بڑا شریف آرٹ ہے ۔ وہ اپنے دامن پر ذرا سی
گرد کا دھبّہ گوارا نہیں کر سکتا ۔"[1]

اور جناب ڈاکٹر مسعود حسین نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

" غالب کے بعد رنگ قدیم میں صرف اصغر کا کلام فنکار
طبیعتوں کے لئے بادۂ خوش رنگ کا حکم رکھتا ۔"[2]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے محض پہلو بچانے کے لئے ایسا کہا ہے ورنہ گزشتہ صفحات میں بدلائل ثابت کیا جا چکا ہے کہ غالب کا اسلوب جہاں حددرجہ رنگین ہو گیا ہے بے کیف اور ثقیل ہو گیا ہے جہاں سادہ اور آسان ہو گیا ہے سہل ممتنع ہو گیا ہے ۔ ان کے کلام میں اتنی یک رنگی اور ہمواری نہیں ہے جتنی اصغر کے کلام میں ۔ حق یہ ہے کہ

" اصغر نے اپنا رنگ لکھنؤ کی زبان کی رنگینی و مرصع کاری
میں جذبہ کی تھرتھراہٹ اور تخیل کی رنگینی شامل کر کے
بالکل منفرد اور علیحدہ تیار کیا ہے جسے لکھنؤ اور دہلی
کی طرز کا خوشگوار ترین امتزاج کہا جا سکتا ہے ۔"[3]

(تفصیلی بحث کے لئے دیکھیے مقالہ ھذا ، جام رنگین ۔ اسلوب و انداز ۔ میری ـــ غالب صفحہ ۵۱۸-۵۲۸ ، اصغر اور حسرت صفحہ ۵۷۱-۵۷۳)

۷۔ " فلسفۂ زندگی " :

اصغر واحد غزل گو ہیں ، جنھوں نے اپنی شاعری میں ایک واضح اور متعین فلسفۂ زندگی پیش کیا ۔ (مقالہ ھذا ، صفحہ)

۸۔ جمالیات میں خودی :

اردو غزل گو شعرا میں اصغر تنہا شاعر ہیں جنھوں نے اردو غزل کو " عاشق کی شخصیت " کا ایک نیا اور اچھوتا تصور دیا ۔ ان کی غزلیں نہ وہ "روایتی عاشق"

۱۔ اصغر کی شاعری ۔ بحوالہ " اصغر " مرتبہ عبدالشکور ۔ صفحہ ۱۳۳

۲۔ اصغر گونڈوی اور جدید تنقید ۔ انتخابات اصغر ۔ صفحہ ۳۵

۳۔ اصغر اور حسرت ۔ مقالہ ھذا ۔ صفحہ

کی طرح " هجمیز " هے اور نه غالب اور دور جدید کے شعرا کی طرح " انانیت پسند" بلکه " انانیت کا پیکر " ۔ وہ محبوب کی " حرمت و تقدیس " کے بھی قائل هیں اور " حسن " کے مقابله میں عاشق کی " قوت مشاهده اور کیفیت دید " کے بل پر ، اس کی " خودی " کے قائل بھی ۔ جناب مظہر عزیز کا یه فرمانا بالکل درست هے :

> " اصغر پہلا شخص هے جس نے اردو شاعری میں
> حسن ذهنی و باطنی (Intellectual Beauty)
> کو ایک ممتاز درجه عطا کیا اور حسن و عشق کی جمالیاتی
> تفسیر پیش کی ۔ اس نے جمالیات میں بھی خودی کی
> اهمیت جتلائی اور حسن کو عشق کا پرتو قرار دیا [1] ۔"

اصغر کی اس خصوصیت کا جناب اسلوب احمد انصاری نے بھی اعتراف کیا هے ۔ وہ تحریر فرماتے هیں :

> " وہ حسن سے متاثر هونے کے باوجود حسن کو عشق هی کے
> جذبه کی کارفرمائی کا نتیجه سمجھتے هیں -------- وہ
> اس کے قائل هیں که حسن فی نفسه کوئی شے نہیں بلکه وہ
> عاشق کی دیده وری اور بلندی شوق هی کا عکس هے ۔
> یہی نظر حسن کو متحرک اور مجسم دیکھتی هے [2] ۔"

قول فیصل (شاعری میں اصغر کا مقام و مرتبه)

اس طویل بحث کا خلاصه یه هے که اصغر کے متذکرہ بالا امتیازی خصوصیات نے نه صرف یه که ان کو جدید اردو غزل کے معماروں میں سب سے بلند مقام پر فائز کر دیا هے بلکه اس تحقیقی مطالعه کے بعد اب یه پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا هے که

> " هم نے اردو کے بڑے شاعروں کی جو فہرست بنائی هے ۔
> میر ، غالب ، اقبال اور فراق اس میں ایک مزید نام یعنی اصغر

۱۔ اصغر گونڈوی کی شخصیت اور شاعری ۔ ساقی دسمبر ۱۹۳۱ء ۔ صفحه ۳۱

۲۔ اصغر گونڈوی کا رنگ تغزل ۔ اوراق شمارہ خاص (۳) ۱۹۶۸ء ۔ صفحه ۶۸

کا اضافہ کرنا ہوگا ۔[1]"

مختصر یہ کہ اصغر کا کارنامہ یہ نہیں ہے کہ انھوں نے بھی غزل کہہ کر غزل گو شعرا کی فہرست میں ایک اور نام کا اضافہ کیا ۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس بدنام صنف کو پاکیزہ و معصوم بنایا۔ اس میں نزہت ، لطافت اور رنگینی پیدا کی، روحانی حقایق کو مجاز کی رنگینیوں سے آراستہ اور صوفیانہ تجربات کو جمالیات سے ہم آہنگ کیا۔ ان کی عظمت اس میں ہے کہ انھوں نے اسلام اور اسلامی تصوف کی روح ـــــ عاشقی و عبدیت ، حسن نظر و حسن اخلاق جہد و عمل کی عظمت ، جمال و زیبائی کی پرستش اور زندگی سے محبت ، کو اپنی غزل کا موضوع قرار دے کر اسے اپنی صوفیانہ جمال پرستی اور رنگینی کے ذریعہ ، فنکاری اور صناعی کا شاہکار بنایا اور اس طرح شعر و غزل کے شیدائیوں کے " اندر کے انسان "کو پاک و منّور بنانے اور زندگی سے نبرد آزما ہونے کا درس دیا ۔ اصغر کا کارنامہ یہ ہے کہ جس طرح انھوں نے اپنی شرافت نفس اور متانت وضع و طبع سے اپنے دور کے شائستہ ، مہذب اور رچے ہوئے تہذیبی مذاق کے اصحاب ـــــ سر تیج بہادر سپرو ، سروجنی نائیڈو ، علامہ اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین خان ، رشید احمد صدیقی ، اقبال احمد سہیل اور مولانا عبدالماجد دریابادی ـــــ کو اپنا گرویدہ اور شیدا بنا لیا تھا اسی طرح اپنی شاعری کی شرافتوں اور نزاکتوں سے ، شاعرانہ تہذیب سے آراستہ اور مزین طبائع کے حاملین ـــــ " جگر ، فراق ، اقبال سہیل ، انجم فوقی، حبیب احمد صدیقی ، راز یزدانی[2] " ، پروفیسر منیر احمد خان (مرحوم) اور پروفیسر صفی حیدر دانش[3] کو متاثر کیا۔ ان کی عظمت و انفرادیت اس میں ہے جس طرح لوگ ان کے محاسن اخلاق سے متاثر ہونے کے باوجود خود کو ان کے وضع و انداز میں نہ ڈھال سکے اسی طرح ان کے رنگین شاعرانہ اسلوب سے اثر پذیر ہونے کے باوجود اس کی کامیاب تقلید نہ کر سکے ۔

اصغر کی شاعری ہر دور اور ہر زمانہ کے انسان کی زندگی کی تطہیر و تزکیہ کرتی رہے گی ۔ اس کی آفاقیت و ابدیت ، انسان کی آفاقیت و ابدیت کے ساتھ قائم رہے گی۔

......

۱۔ اصغر کی انفرادیت ۔ یحییٰ امجد ۔ اوراق شمارہ خاص (۳)۱۹۶۸ء ۔ صفحہ ۱۰۹
۲۔ اصغر کا مطالعہ ۔ عابد رضا بیدار ۔ آجکل جون ۱۹۵۷ء ۔ صفحہ ۳۲
۳۔ گفتگو از مقالہ نگار ۔ ۲۶ جون ۱۹۶۹ء

باب دہم

حاصل مطالعہ — اصغر بہ یک نظر

اصغر بہ یک نظر :

نام : اصغر حسین تخلص : اصغر

والد : منشی تفضل حسین (صدر قانون گو)

وطن : گورکھپور ۔ یو پی ۔ بھارت

ولادت : یکم مارچ ۱۸۸۴ء

جائے ولادت اور وطن ثانی : گونڈہ ۔ یو پی ۔ بھارت

تعلیم : میٹرک تک ۔ اوائل ۱۹۰۲ء میں تعلیم ترک کر دی ۔ مطالعہ جاری رکھا ۔ تصوف ، مذہبیات، شعر و ادب خاص موضوع مطالعہ تھے ۔

ملازمت و مشاغل :

(۱) ریلوے:۔ ٹائم کیپر ۔ جرول روڈ ۔ ضلع برائچ ۔ یو پی ۔ بھارت ۔۔ از وسط ۱۹۰۲ء تا اواخر ۱۹۱۲ء

(۲) بیکاری : اوائل ۱۹۱۳ء تا اوائل ۱۹۱۵ء (۲ سال)

(۳) دوکان بساط خانہ : اوائل ۱۹۱۵ء یا اوائل یا وسط ۱۹۱۷ء (تقریباً ۲ سال)

(۴) عینک کا کارخانہ : وسط ۱۹۱۷ء یا اوائل ۱۹۱۸ء تا اوائل ۱۹۲۶ء (۹ سال)

(۵) مدیر معاون " قیصر ہند " و " پیغام" (فیض آباد) ۱۹۱۳ء تا ۱۹۲۱/۲۲ء

(۶) مہتمم اردو مرکز لاہور : اوائل ۱۹۲۶ء تا وسط مارچ ۱۹۲۷ء

(۷) مشیر ادبی، انڈین پریس ، الہ آباد : جون ۱۹۲۷ء تا اکتوبر ۱۹۳۰ء

(۸) مدیر "ہندوستانی"، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد :
اکتوبر ۱۹۳۰ء تا ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء

ازواج :

پہلی شادی : موضع شاہ پور ۔ ضلع گونڈہ ۱۹۰۳ء
بیوی کا انتقال ۱۹۲۲ء

دوسری شادی : (چھٹی) اواخر ۱۹۱۲ء ، انتقال ۱۹۲۶ء

تیسری شادی : نسیم خاتون ۱۹۲۶ء ، بقید حیات ، کاشانہ جگر ۔ گونڈہ

اولاد :

اولاد نرینہ کوئی نہیں ہوئی ۔ پہلی بیوی سے سات بیٹیاں ہوئیں ، صرف دو شادی کی عمر تک پہنچیں ، اور شادی ہوئی ، اب ان دونوں کا انتقال ہو چکا اور ان سے کوئی اولاد بھی حیات نہیں ۔

شعرگوئی کا آغاز : ۷-۱۹۰۶ء

مشورہ سخن : (۱) وجد بلگرامی ۷-۱۹۰۶ء
(۲) تسلیم لکھنوی ۱۱-۱۹۰۹ء

رندی و سرشاری : اواخر ۱۹۰۷ء تا واخر ۱۹۱۲ء یا اوائل ۱۹۱۳ء (۵ سال)

توبہ : اواخر ۱۹۱۲ء یا اوائل ۱۹۱۳ء

بیعت : از قاضی عبدالغنی رح ۔ منگلور شریف ضلع سہارنپور (یوپی)
اوائل ۱۹۱۵ء تا اوائل ۱۹۱۶ء کے درمیان کی کوئی تاریخ ۔

تعلق تحریک ریشمی رومال : وسط یا اواخر ۱۹۱۵ء تا فروری ۱۹۱۷ء
(سال، ڈیڑھ سال)

وفات : ۲۹ اور ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کی درمیانی شب

مزار : پائنتی شاہ محب اللہ ۔ کھلد گنج الہ آباد

عمر : ۵۲ سال ۹ ماہ بحساب سال انگریزی

نقوش و آثار :

شعری مجموعے :

(۱) "نشاط روح" ۱۹۲۵ء

(۲) "سرود زندگی" ۱۹۳۵ء

نثری تصانیف :

(۱) اردو شاعری کی ذہنی تاریخ (غیر مطبوعہ)
۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۳ء

(۲) سلسلہ تحائف :

(الف) تحفہ لندن — سال طباعت ۱۹۲۸ء

(ب) تحفہ جاپان — ۱۹۲۹ء

(ج) تحفہ مصر و حبش — ۱۹۲۹ء

(د) تحفہ جرمنی — ۱۹۳۳ء

(ر) تحفہ فرانس — نامعلوم

(س) تحفہ چین — نامعلوم

(ل) تحفہ آسٹریلیا — نامعلوم

(م) تحفہ امریکا — نامعلوم

(۳) یادگار نسیم : مقدمہ ، ترتیب و تحشیہ ، مثنوی
گلزار نسیم ۱۹۳۰ء

(۴) دیوان مظہر جانجاناں : ترتیب و مقدمہ (غیر مطبوعہ)
اکتوبر ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۲ء

مقالات و مضامین :

(الف) ادبی و تنقیدی :

(۱) انجمن اردوئے معلیٰ (بسلسلہ استفسارات)
سہیل علیگڑھ جنوری ۱۹۲۶ء

(۲) مقدمہ روح رواں — ۱۹۲۶ء

(۳) مقدمہ پیام زندگی — ۲۷-۱۹۲۶ء

(۴) اردو شاعری کی ذہنی تاریخ — زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۹ء

(۵) دیباچہ مطلع انوار — ۱۹۲۹ء

(۶) مقدمہ یادگار نسیم — ۱۹۳۰ء

(۷) نظم و نثر پر ایک نظر — ہندوستانی الہ آباد
جولائی ۱۹۳۱ء

(۸) اردو کی نشو و نما — اضطراب بنارس ،
مارچ ، اپریل ، مئی ۱۹۳۱ء

(ہ) مضامین (اور تراجم) :

(۱) بابو چنتامنی گھوش (سوانح) زمانہ، کانپور، ستمبر ۱۹۲۸ء

(۲) موہنجوداڑو (الف) ہندوستانی، الہ آباد، اکتوبر ۱۹۳۲ء

(ب) ہندوستانی، الہ آباد، اپریل ۱۹۳۳ء

(۳) نکولس روبرک ہندوستانی، الہ آباد، اپریل ۱۹۳۴ء

(۴) رگ وید کا زمانہ ہندوستانی، الہ آباد، جولائی ۱۹۳۵ء

(۵) ہندوستان کا قدیم تمدن، ہندوستانی، الہ آباد، اکتوبر ۱۹۳۵ء

حیثیات :

(الف) شاعر صفِ اوّل

(ب) ناثر صاحب طرز

(ج) مترجم منفرد و ممتاز

...

اصغر ذہن و فکر کے اعتبار سے مسلمان فلسفی ، عمل میں متشرع مگر تقشف و تورع کی خشکی و یبوست سے گریزاں ۔ قرآن کے حامل ، اسلامی شرافتوں اور قدروں کے حامل اور ہند ایرانی تہذیب کی شائستگیوں اور شائستگیوں کا پیکر تھے ۔ آنکھوں میں موہنی، باتوں میں جادو، عمل میں دلکشی و دلنوازی ـــ طبیعت رنگین لیکن معصیت سے بیزار ، لذائذ و نعم سے متمتع مگر " باد صبا کی طرح پاکدامن "* "۔۱

---

* چمن میں چھیڑتی ہے کس مزہ سے غنچہ و گل کو
مگر موج صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی
(اصغر)

صحبت میں کیمیا اثر جو چھو گیا کندن ، جو داخل ہوا اسے " اپنا بنا کے چھوڑ دیا "* ۔ نہ آزاد نہ گرفتار ۔ اسیری و رہائی کے درمیان معلق ۔ طبیعت میں جلال لیکن شان جمال غالب ۔ حسن و رعنائی کا پیکر مجسم ۔ صورت و سیرت دونوں حسین ، دونوں دلکش ۔ رنگینی و پاکبازی کا حیرت انگیز امتزاج ، جس نے ان کی شخصیت کو آج کے انسان کے لئے معمہ بنا دیا ۔[1]

ان کا خمیر غزل سے اٹھایا گیا تھا ۔ وہ سراپا غزل تھے ۔ ظاہر غزل کا پھڑکتا ہوا شعر، باطن تغزل کی جان ۔ وہ اردو شاعری کی تاریخ میں غزل کی " آبرو اور بانکپن " بن کر نمودار ہوئے ۔ جب " شمع غزل " جھلملا رہی تھی اور کچھ بوڑھے اس کی " آخری بھڑک " کے منتظر تھے، یہ آگے بڑھے اور انھوں نے اس کی " لو " اکسائی ، اس میں " نیا نور " ، " نئی روشنی " اور " نئی تابناکی " پیدا کرنے کے لیے بیس سال تک " خون جگر " دیا ۔ اور اس میں اپنی زندگی کی گرمی، تابناکی، پاکیزگی ، لطافت و نفاست ، رنگینی اور غزلیت منتقل کر دی ۔ ان کی غزل کیف و اثر میں بڑے بڑے صاحب دیوان شعرا کی غزل سے زیادہ بامزہ اور لطافت خیال رنگینی فکر اور معصومیت جذبات میں بے مثال ہے ۔ وہ خواص کے شاعر تھے ، جو عوام کی تہذیب نفس اور تربیت فکر میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں ۔ دنیا جب بھی پاکیزگی و معصومیت اور تقدس و فرشتگی کی طرف قدم بڑھائے گی کہ انجام کار یہی اس کا مقسوم و مقدر ہے ، تو اصغر کے کلام سے اسے اپنی منزل تک پہنچنے میں بڑی مدد ملے گی ۔

اصغر صرف شاعر ہی نہیں تھے انھیں نثر لکھنے پر بھی اتنی ہی قدرت حاصل تھی جس صنف پر قلم اٹھایا اپنی شخصیت کی گہری چھاپ چھوڑتے چلے گئے ۔ بچوں کے ادب کی طرف آئے تو ان کی نفسیات کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے، ان کی دلچسپیوں اور مشاغل کو بیان کیا لیکن اصلاح احوال و تہذیب نفس کا خیال کہیں نظر سے اوجھل نہیں ہونے پایا۔ پھر زبان اتنی سادہ و آسان اور آہستہ آہستہ رنگینی کی طرف قدم بڑھاتی ہوئی کہ بچہ " ادبیت کی چاشنی " سے لذت اندوز اور غیر شعوری

---

*۔ مجھے اپنا بنا کے چھوڑ دیا   کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے   (جگر)

۱۔ اصغر کا تصوف ۔ مظہر عزیز ۔

یہ غزل کی آبرو ۔ ریڈیائی تقریر ۔ دہلی ، حسن نعیم ۲ تا ۹ ستمبر ۱۹۷۲ء

طور پر اس کا دلدادہ اور گرویدہ ہوتا چلا جائے ۔

اصغر کی نثر کے دو واضح اسلوب ہیں ۔ بچوں کے ادب ، تراجم اور بیانیہ مقالات و مضامین میں اسلوب : سادہ ، آسان ، عام فہم اور رواں ہے لیکن تنقیدی اور علمی مضامین میں : فلسفیانہ ، رنگین ، فکر انگیز اور مدلل ۔ نثر میں وہ حالی و سر سید اسکول کے برخلاف شبلی ، ابوالکلام آزاد ، سجاد انصاری اور مہدی افادی کے دبستان کے بزرگ ہیں ۔ لیکن ابوالکلام کی ابوالکلامیت اور جا و بے جا عربیت سے گریزاں ، سجاد انصاری اور مہدی افادی کے " ادب لطیف " کے موضوع خاص یعنی " عورت اور اس کے متعلقات " کے بیان سے دامن کشاں ، مگر ان کے اصلی رنگ کو " ادب لطیف " ہی سے تعبیر کیا جائے گا ۔ جو بقول خود اصغر :

" وسعت علم ، احساس شعریت و حکیمانہ نزاکت خیال کے حسین امتزاج سے پیدا ہوتا ہے ۔"

اس حیثیت سے وہ شبلی سے زیادہ قریب ہیں ۔ لیکن جو چیز انہیں شبلی سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے تحریر میں ان کے " طنز و مزاح " کے ہلکے ہلکے چھینٹے —— اصغر کی یہ خصوصیت انہیں غالب اور رشید احمد صدیقی کے قریب لاتی ہے ۔ لیکن غالب کے یہاں " طنز " کے بجائے " ظرافت " ہے ۔ غالب کی تحریر کا کینوس شخصی و ذاتی ہے اس لئے محدود —— (یعنی وہ اپنے اردگرد دیکھتے ہیں ۔ نظر اٹھتی ہے تو دوست احباب پر جا پڑتی ہے ۔ وہ دہلی سے باہر کبھی نہ دیکھ سکے اور دہلی میں بھی اتنا ہی دیکھا تھا جتنے میں خود سمائے تھے یا جتنا خود ان میں سمایا تھا) اصغر کا کینوس وسیع ہے ۔ ان کے سامنے فکر و نظر کا ایک وسیع میدان ہے —— مشرق و مغرب کی آویزش و کشمکش ہے ، مغربی طرز فکر اور مشرقی روایات کی ٹکر سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں ۔ اپنے بچاؤ کی تدبیریں ہیں ، قومی تحفظ کا واضح اعلان ہے —— دو قومی نظریے کی چھوٹ ہے ، ہندی اردو کا مناقشہ ہے اور " ادب لطیف" کی " عورت زدگی" کا رجحان ہے —— ان مسائل سے اصغر کی طبیعت میں جھنجلاہٹ آئی جس نے ان کی تحریروں میں " لطیف طنز " سے گزر کر " تلخ گفتاری" اور بعض صورتوں میں شائستہ " دشنام طرازی " کی شکل اختیار کر لی ۔ اپنی جھنجھلاہٹ کے اظہار کے لئے انہوں نے بہت سے لفظ وضع کئے جو رائج تو نہ ہو سکے لیکن اس سے ان کی مجتہدانہ شان اور زبان و بیان پر قدرت ظاہر ہوتی ہے —— " تلخ گفتاری " کے باوجود مسائل

پر ان کی نظر ناقدانہ اور ترقی پسندانہ ہے ۔ ایک طرف مشرقی روایات کے صالح عناصر کی بحالی کی سعی پیہم ہے لیکن بیجا بچ داری سے پاک ، دوسری طرف مغربی افکار سے استفادہ کی شعوری کوشش ہے مگر " مرعوبیت و مغرب زدگی " یا " مغرب بیزاری جاہلیہ " سے مبرا ۔ اپنے اس رویہ و رجحان کی بدولت وہ اپنے معاصرین میں ممتاز و منفرد نظر آتے ہیں ۔

اصغر نقاد بھی تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تنقیدی نظر و بصیرت سے بہرہ وافر عطا کیا تھا ۔ عمر زیادہ نہیں پائی لیکن جو کچھ لکھ گئے اگر ان کو یکجا اور ان کے تنقیدی نظریات کا تجزیاتی مطالعہ ، کیا گیا ہوتا ، تو ان کا شمار اردو میں " تنقید جدید " کے بانیوں میں ہوتا ۔

تنقید کے متعلق ان کا ایک واضح تصور تھا ۔ وہ فرد و جماعت دونوں کی اہمیت کے قائل تھے ---- اور شعر و ادب کی پرکھ میں ---- انفرادی اور اجتماعی دونوں عوامل کو یکساں ضروری سمجھتے تھے ۔ ۱۹۲۶-۳۰ء میں جب باستثنائے حالی ، اردو ادب میں تنقید کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا اور حالی کی اصلاحی کوشش کے باوجود وہ لفظی شعبدہ بازی اور صنعت گری کی بحث کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکی تھی ۔ اور اس نے " جدید روش " کی طرف کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا تھا ۔ اصغر پہلے شخص ہیں جنہوں نے معاشرتی و تہذیبی عوامل کو " اجتماعی ذہنیت " اور " روح عصر " سے تعبیر کیا اور انفرادی مزاج کی تشکیل و تعمیر میں اس کے اثر و اہمیت کو تسلیم کیا --- اسی طرح انفرادی خصوصیات و صفات کی اہمیت جتلاتے ہوئے ، تنقید میں اعتدال و توازن کی راہ متعین کی اور اردو تنقید میں سائنٹفک اور تاریخی تنقید کو فروغ دیا ---- اصغر کا یہ کارنامہ اردو تنقید کی تاریخ میں حالی کے بعد ، بالکل نئی آواز تھی ۔ تنقید کے اس نئے شعور کی بدولت انہیں اپنے معاصر نقادوں میں ایک بلند اور منفرد مقام حاصل ہے ۔

خلاصہ یہ کہ اصغر اردو شعر و ادب کی تاریخ میں ایک منفرد مقام کے مالک ہیں ۔ وہ بہ یک وقت شاعر بھی ہیں ، ادیب بھی ، نقاد بھی ہیں ، نفسیات دان بھی فلسفی بھی ہیں اور صوفی بھی ۔ اور سب سے بڑھ کر ایک " اعلیٰ انسان " بھی ۔ اس " اعلیٰ انسان " کے افکار و نظریات اور اس کی روح سے سرشار شعر و ادب کی ، دنیائے اردو کو ہمیشہ ضرورت رہے گی ۔

......

ضمیمہ اوّل

"اردو شاعری کی ذہنی تاریخ"

— اصغر

ضمیمہ اوّل

اردو شاعری کی ذہنی تاریخ
دہلی اور لکھنؤ اسکول
از جناب اصغر گونڈوی

...

اردو شاعری کی یہ عجیب بدقسمتی ہے کہ تنقید و تبصرہ کے نام سے عام طور پر جو مضامین لکھے جاتے ہیں ان میں زبان و محاورہ یا علم معانی و بیان کے چند فرسودہ اصولوں کو معیار قرار دے کر داد سخن فہمی دی جاتی ہے ۔ لطف یہ ہے کہ اس طریق بحث میں اس قدر گنجائش ہے کہ موافقت و مخالفت کا کوئی سا پہلو اختیار کر لیجئے اور قیامت تک اس قضیے کو چلاتے جائیے ۔ تنقید شعر کا یہ ایک عام نقش ہے کہ یا تو واہ واہ سبحان اللہ سے آگے بات نہیں بڑھتی یا پھر یہ کہ زبان غلط ہے ، محاورہ صحیح نہیں ہے ایطا ہے اللّٰہ اللّٰہ خیر صلاح ۔

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ ابھی ملک میں صحیح تنقید کا مذاق پیدا نہیں ہوا ۔ اس بے بسی میں قدرتی طور پر نگاہیں وہاں پہونچتی ہیں جہاں مغربی طرز تنقید کا آوازہ بلند ہو ۔ وہاں ترتیب بحث و آہنگ بیان کے بلا شبہ وہ تمام اسلحے موجود ہیں جو ان موقعوں پر کام میں لائے جاتے ہیں لیکن غضب یہ ہے کہ جن آلات و اسلحہ کی مدد سے بے راہ رووں کی گرفتاری عمل میں آتی ہے وہی تمام سائنٹفک اوزار و آلات جرائم کی اعانت و بے راہ روی کی حمایت میں بھی کام میں لائے جا سکتے ہیں ۔ مغربی علوم و فنون نے ہمارے ہاتھوں میں کارآمد آلات ضرور دے دیئے مگر ان کے منصفانہ استعمال کا سلیقہ ابھی ہمیں حاصل کرنا باقی ہے ۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ جس کے پیش نظر کولرج اور ڈرائیڈن وغیرہ کا طرز تنقید ہے اور جس سے یہ امید تھی کہ وہ تنقید عالیہ کے زور سے ملک میں صحیح مذاق پھیلائے گا۔ اسکے ایک حصے نے تو اردو شاعری کو قطعاً* بے جان و بیکار سمجھ کر بالکل طاق نسیان کے حوالہ کر دیا ۔ دوسرا حصہ وہ ہے کہ جس کے مذاق شعر و ادب میں رفعت و بلندی کے بجائے ایک قسم کی " سیاست " کارفرما ہے ۔ وہ اسلاف کے کارناموں کو نمایاں کرنا چاہتا ہے مگر اسے اخلاف کی بربادی مذاق کی چنداں پروا نہیں ۔ وہ دیکھتا ہے کہ اپنی روایات واعتقادیات کی کل کائنات انہیں شورشوں کی تشہیر پر موقوف ہے اس لیے مغربی طرز کے مسالے لگا لگا کر

اس نے سی (   ) تیار کرنا شروع کر دیا ۔

واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری کا بیشتر حصہ ملک کے زمانہ غفلت و پستی کی ایک افسوسناک یادگار ہے اس لیے اول تو اسمیں ایسی چیزیں ہی بہت کم ہیں جو سنجیدہ توجہ اور تنقید عالیہ کی حقیقی طور پر مستحق ہوں ۔ اس پر مذکورہ " سی خوانیوں " کا انجام یہ ہوا کہ ایک " نقادفن " کو جاں صاحب کے کلام میں اخلاق و سیاسیات کے گہرے اور غامض مسائل نظر آنے لگے ۔ انتہا یہ کہ انھوں نے اس حیا سوز دفتر سے " ترک موالات " کے اصول تک ماخوذ و مستنبط کر کے رکھ دیئے ۔ ایک صاحب کو بے روح چیزوں میں فلسفہ زندگی کی تڑپ اور لفظ پرستیوں میں دشت ایمن کی مقدس تجلیاں نظر آنے لگیں ۔ ممکن ہے کہ یہ " پرواز خیال " کسی خاص قومی و جماعتی زاویہ ٔ نگاہ سے بہت بڑی زیرکی و دانشمندی ہو لیکن اس کی داد " تنظیم یا سنگٹھن " سے لینا چاہیے ۔ " مذاق صحیح " کو اس مآل اندیشی و مصلحت بینی سے کیا غرض ۔

بہرصورت تنقیدوں میں اگر صحت رائے اور احساس توازن کا یہی عالم رہا اور غلطیوں اور نافہمیوں کی تائید اسی " عاقلانہ " طور پر کی گئی اور خاک اڑا اڑا کر اسی طرح اندھیر مچایا گیا تو معلوم نہیں حقیقت و اصلیت کی صبح جمیل کب تک عام نظروں سے پوشیدہ رہے گی

عام طور پر بے خبر انسان اپنی تنگ و محدود اغراض کے لیے حقیقتوں کو مسخ اور اصلیتوں کو چھپاتا ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ اسکے کھوٹے سکے بازار میں اشرفیوں کے مول بکنے لگیں لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب تمام انسان اپنی بینائیوں سے قطعاً محروم ہو جائیں اور سکہ ٔ قلب کی شناخت کا سلیقہ یک لخت دنیا سے معدوم ہو جائے ۔

آج ہم صاف طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ وسعت نظر و رفعت خیال کے ساتھ ساتھ نئے نئے میدانوں کی تلاش و جستجو میں سرگردان ہے ۔ یہ صلاحیت کہیں تو مغربی لٹریچر کے برکات سے پیدا ہوتی ہے اور کہیں غیر صالح ملکی لٹریچر کی نا رضا وت سے ۔ بہرصورت شعر و ادب کی حقیقی عظمتوں کی جانب ان کی توجہ مائل ہو چکی ہے ۔ جسے اب پست ملمع سازیوں کے زور سے روکا نہیں جا سکتا ۔ یہ کہنا بھی کہ ملک میں مذاق تنقید کہیں باہر سے لایا جائے گا قطعاً صحیح نہیں ۔ اگر شعر و ادب کا مذاق کسی وجہ سے نکھر رہا ہے تو مذاق تنقید بھی اس کے ساتھ غیر ارادی طور سے ترقی کرتا جائے گا ۔ شعر کا مفہوم جس وقت تک صرف الفاظ کی ترتیب و تنظیم ہو اس وقت کا " مذاق تنقید " بھی " لفظ و محاورہ " سے آگے نہیں بڑھتا لیکن جس زمانے میں لوگوں کی نظر خیالات کی تازگی ، جذبات کی صحت اور مطالب کی ارواح منفیہ کی جانب بھی مائل ہو چکی ہو، اس وقت

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ صرف " بولی ٹھولی " اور " زبان و محاورہ " کی سطحی فرمانروائی ختم ہو چکی اور خودساختہ فن کی ژولیدہ بیانیوں اور کج بحثیوں کی عمریں تمام ہو گئیں -

اس سے میری غرض یہ نہیں کہ زبان ، محاورہ اور فن کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے اور یہ تمام چیزیں سرے سے ناقابل توجہ ہیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ آخر اس " مکتبی بحث " کے کچھ تو حدود قائم ہونے چاہئیں - یہ کیا ہے کہ آپ کے یہاں کا بڑے سے بڑا شاعر یا تو " زبان و محاورہ " خوب کہتا ہے یا پھر کوئی غلطی کرتا ہے تو وہ بھی اسی زبان و محاورہ کی - اس طرح اگر شعر و ادب کی کل کائنات اور اس کا تمام تر مفہوم صرف " زبان و محاورہ " ہے تو آخر اس کے حاصل کرنے کی تدبیر کیا ہے -

آج یہی ہندوستانی ہے کہ غیر ملکی زبانوں کو اس کمال کے ساتھ حاصل کر لیتا ہے کہ اس ملک کے بڑے بڑے شاعر و ادیب اس کے کمال کے معترف ہو جاتے ہیں مگر اسی ملک میں رہ کر اور صبح و شام یہیں کی اردو بول کر بھی وہ اس زبان و محاورہ میں بالکل ہی طفل مکتب ہے - پھر اگر یہ چیز اس قدر مشکل اور ناقابل حصول ہے تو بعض ہندو دوستوں کی یہ تجویز کیا بری ہے کہ ملک میں ہندی زبان رائج کر دی جائے اس لیے کہ ایسی بیکار زبان جس کے شعرا و ادیب اس کے صحیح صحیح استعمال کرنے پر قادر نہ ہو سکے قابل ترک نہیں تو اور کیا ہے - مطلب یہ ہے کہ اگر زبان اظہار خیال کا آلہ ہے تو آلہ کی اس شدید دیکھ بھال میں آلہ کا صحیح مقصد یعنی اظہار خیال و جذبات نہ فوت ہونے دیجئے اور اگر خیال و جذبات کی طرف سے بالکل " سناٹا " ہے تو زبان کی آڑ لے کر اپنا اور دوسروں کا وقت بیکار نہ ضائع فرمائیے - اس لیے کہ اگر " زبان و محاورہ " کی تحصیل میں اتنا وقت صرف ہو سکتا ہے تو یاد رکھنا چاہیے کہ خیال و جذبات اس سے کہیں رفیع تر ہیں اور ان کی جلا و تربیت میں بھی ایسی باتیں درکار ہیں جو کسی لغت اور عروض کی کتاب میں دستیاب نہیں ہو سکتیں - الفاظ کو نظم کر لینے کی صلاحیت حاصل کر کے اس وقت سیکڑوں انسان ایسے موجود ہیں جن کی استعداد ذہنی اب تک " شعر " کے تصور سے بھی قاصر ہے ؎

آں شعلہ کہ افتد بہ خس و خار نہ عشق است
ہر سوختہ زہرہ نشہ خوردار نباشد

پھر اگر زبان و محاورہ ایسی چیزیں ہیں جس کی حیثیت عرض و سطح سے زیادہ نہیں اور لوگوں کو بیجا نکتہ چینیوں کا حق حاصل ہے تو پھر جو کچھ " محاورہ اور زبان کی حدوں " میں فرمایا جاتا ہے اس کی " معنویت و لطافت " کا بھی اسی سختی کے ساتھ کیوں

نہ جائزہ لیا جائے ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے جائزہ کی مطلق ضرورت نہیں ۔ زمانہ خود بہت بڑا نقاد ہے ۔ اس نے لوگوں کو ان کا اٹھتا ہوا جنازہ ان کی آنکھوں سے دکھا دیا ہے ۔ اس سے زیادہ " نقد " اور کون سی تنقید ہو سکتی ہے ۔

انگلستان کا زبردست ادیب جان رسکن جب وینس کی سیاحت سے واپس ہوا تو اس نے اپنی معرکۃ الارا تصنیف " دی اسٹونس آف وینس " ( ) شائع کی اس میں جن امور سے اس نے بحث کی ہے وہ تنقید کی جان ہے اس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایک قوم جو فنون لطیفہ و صنائع جمیلہ کے آثار چھوڑ جاتی ہے ان میں اس کے اخلاق و روحانیت کا ایک ایک خط و خال موجود ہوتا ہے جس کے دیکھنے سے بخوبی طرح یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قوم کو وہ حقیقی شادمانی اور وہ سچی مسرتیں جو ایک اعلیٰ و مہذب زندگی اور شاندار رفعت خیال کے لوازم ہیں ، حاصل ہوتی تھیں یا نہیں؟

ایک ماہر نفسیات اور ایک قیافہ شناس باوجود غازہ و روغن کی فراوانی کے اگر خال و خط کے انداز اور پیشانی کی ہلکی ہلکی شکنوں سے نفس کی چھپی ہوئی شقاوتوں اور خباثتوں کو پڑھ سکتا ہے -(مختصر یہ کہ جب آجکل چہرے پہچان لیے جاتے ہیں) تو شعر و ادب کے اس طولانی دفتر سے شعرا کی اصل حقیقت کیوں کر پوشیدہ رہ سکتی ہے - خیر یہ ذکر تو ارباب نظر کے چیدہ چیدہ حلقوں کا ہے مگر عام طور پر جو غلط بحث رائج ہے اس کا کیا علاج ؟ کچھ نقائص بتا کر تمام خوبیوں پر پانی پھیر دینا یا کچھ محاسن کا ذکر کر کے تمام معائب پر پردہ ڈال دینا وہ الزامات ہیں جو ہر ناقد ایک دوسرے پر عائد کیا کرتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جو کسی نہ کسی حیثیت و پہلو سے معائب و محاسن دونوں کی حامل نہ ہو اس لیے بظاہر اس جرم سے کسی طرح مفر نہیں - جس طرح ایک حقیقی و خوش گو شاعر کے مجموعہ کلام میں زبان ، محاورہ ، تلفظ اور مرکز کی غلطیاں نکالی جا سکتی ہیں اسی طرح ایک یاوہ گو ہرزا سرا کے دفتر خرافات سے کچھ اچھے اشعار بھی تلاش کر کے پیش کیے جا سکتے ہیں اور اسطرح گمراہیوں کا سلسلہ برابر قائم رہ سکتا ہے- اب رہا انصاف و اعتدال یعنی معائب و محاسن کا ساتھ ساتھ تذکرہ (تو) وہ بھی خدشہ سے خالی نہیں اس لیے کہ فن تحریر کی لوچ لچک میں ہر قسم کی گنجائش موجود ہے اور فرض کیجئے کہ وہ بھی نہ سہی تو بقول اکبر مرحوم ع

" جو اعتدال کی کہئیے تو وہ ادھر نہ ادھر "

اگر معائب و محاسن کے چکر میں شائقین تحقیق کسی نتیجے تک پہونچ ہی نہ سکے تو وہ بھی ایک کاوش مہمل اور فعل عبث سے زیادہ نہیں ۔

هر ایک اردو شاعر کے حقیقی قدر و اندازہ کے لیے سب سے پہلے یہ معلوم کر لینے کی ضرورت ہے کہ اردو شاعری نے اپنی اس مدت حیات میں دِلّی اور لکھنؤ اسکول کے نام سے جو دو مختلف " ذہنیتیں " پیدا کیں ان کے اجزا و عناصر کیا تھے - اور ان دونوں (اسکولوں) کی بنیاد میں کون سی مخفی اسپرٹ کارفرما رہی ہے - اردو شعر و ادب کی جو متعدد تاریخیں اس وقت تک لکھی جا چکی ہیں ان میں متفرق طور پر اس کا مواد موجود ہے لیکن ضرورت یہ ہے کہ باقاعدہ ومنضبط حیثیت سے "اردو شاعری کی ایک ذہنی تاریخ" مرتب و مدون ہو جس میں ہر دور کے سیاسی ، مذہبی ، اخلاقی و معاشرتی حالات کے ساتھ شعر و ادب کے اجتماعی و انفرادی ذہنیت کے نفسیاتی اسباب و علل سامنے لائے جائیں - اس صورت میں شعر و شاعر کو پہچاننے میں عموماً جو غلط فہمیاں ہوتی رہتی ہیں اس کا ایک بڑی حد تک سدباب ہو سکتا ہے -

ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں اور اس میں اہلیت و صلاحیت کے علاوہ فرصت بھی درکار ہے - ملک میں بہت سی ہستیاں ایسی موجود ہیں جنھیں یہ دونوں چیزیں مجھ سے زیادہ میسر ہیں ان کا فرض ہے کہ اس خدمت علمی کو انجام دیں - فی‌الحال موضوع پیش نظر کے اعتبار سے یہاں مختصر سے مختصر الفاظ میں کچھ سرسری اشارات کیے جاتے ہیں جنھیں ذہن نشین رکھ کر اردو شاعری کے متعلق عموماً اور بعض شعرا کے مرتبۂ شاعری کے بارے میں خصوصاً ایک حد تک صحیح صحیح اندازہ ہو سکے گا -

" اردو شاعری کی مختصر ذہنی تاریخ "

اردو زبان کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور اس کا حقیقی مولد و منشا کون سا مقام ہے؟ محققین ادب کی انتہائی کاوشوں کے باوجود اسکے جواب میں ابھی اختلاف و نزاع کی گنجائش باقی ہے - عام طور سے یہی تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ شرف اولیت دکن کو حاصل ہے مگر حال میں ایک آواز اور بلند ہوئی ہے کہ " نہیں اس کا حقیقی سہرا پنجاب کے سر ہے " اصل یہ ہے کہ ہندی میں عربی و فارسی کے الفاظ اور فارسی تحریروں میں ہندی (الفاظ) کی آمیزش کا سراغ ہر اس مقام سے جہاں ہندو مسلمانوں کو باہم مل جل کر رہنے کا اتفاق ہوا ہو بآسانی مل سکتا ہے اس لیے یہ یقین رکھنا چاہیے کہ جہاں جہاں بھی ہندو مسلمانوں کو مخالطت باہمی کا موقع ملا ہے وہاں اردو زبان کا ہیولیٰ بھی تیار ہوتا رہا ہے - چنانچہ اگر ایک " علمی بحث بازی " مقصود ہو تو جہاں سے بھی اس قسم کی آواز بلند کر دی جائے کچھ نہ کچھ اس میں معنی ضرور ہی پیدا ہو سکتے ہیں - بہ ہر صورت اردو زبان کا شرف ایجاد کسی خطۂ زمین کو حاصل ہو مگر غالباً

اس امر سے کسی کو اختلاف نہیں کہ اردو شاعری کی حقیقی تربیت دکّن میں ہوئی - جس طرح بچے کی ولادت سے قبل ہی فطرت اس کے نشوو نما کے لئے شیر مادر تیار کر دیتی ہے ٹھیک اسی طرح اردو کے عالم وجود میں آنے سے قبل ہی ہندی اور فارسی شاعری کا ایک نہایت صالح اور جاندار ذخیرہ دلی میں تیار ہو چکا تھا - اردو شاعری کا مایۂ خمیر اور اس کا اصلی مزاج یہی سرمایہ تھا -

ہندی شاعری :

بابر کے زمانے میں کبیر کے دوہوں کی شہرت عام ہو رہی تھی - اکبر خود ہندی کا شاعر تھا اس کے زمانے میں سورداس ، تلسی داس ، ٹوڈرمل اور بیربل ایسے باکمال ہندی شعرا موجود تھے - شاہجہان اپنی مادری زبان کی طرح ہندی زبان بھی (اگر وہ راجپوتنی کے بطن سے تھا تو اس کی مادری زبان ہندی تھی - یہ الگ بات ہے کہ پورے ماحول پر فارسی و ترکی چھائی ہوئی تھی ---- اقبال) اچھی طرح جانتا تھا - اس کے دربار میں ہندی شعرا کی بڑی وقعت تھی - دارا شکوہ ہندی اور سنسکرت کا زبردست عالم تھا اس نے اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا - اورنگ زیب نے باوجود اپنے سخت نقشت مذہبی کے شاہزادہ معظم کی فرمائش پر چند آموں کے نام " سدھا رس " اور " رسنا ولاس " رکھے تھے -

کوتیا کومدی (कविता कौमुदि) میں مسلمان ہندی شعرا کی جو فہرست دی گئی ہے اس سے چند نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :

حضرت امیر خسرو ، ملک محمد جائسی ، اکبر ، قادر بخش ، خانخاناں ، عثمان ، سید ابراہیم رس کھان ، مبارک ، احمد ، وہاب ، عبدالرحمن ، جلیل ، یعقوب خان ، ذوالفقار ، انور خان ، یوسف ، اعظم ، طالب علی ، اور عالم ---- ہندی کے ابتدائی دور کے شعرا ہیں - امیر خسرو ، ودیا پتی ، کبیر اور نانک کو اور دوسرے دور میں سورداس ، تلسی داس ، رحیم خانخاناں اور رس کھان کو رکھا گیا ہے اور یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے عروج و ترقی کے ساتھ ساتھ ہندی شاعری کو عروج و ترقی ہوئی اور ان کے زوال و تنزل کے ساتھ ہندی شاعری کو بھی زوال و تنزل ہوتا گیا -

فارسی شعرا :

صفویہ خاندان کے زمانے میں شعرائے ایران نے مال و دولت کی کشش سے ہندوستان کا رخ کیا یہاں وہ مال و دولت ہی سے فیضیاب نہیں ہوئے بلکہ انھیں ایک ایسا ماحول بھی مل گیا جس سے بڑی حد تک ان کے مذاق کی جلا و تربیت ہوئی - خانخاناں نہ صرف ہندی

اور ترکی زبانوں کا زبردست شاعر تھا بلکہ فارسی میں بھی اس کی نظر اتنی بلند تھی کہ نظیری ایسا باکمال شاعر اس کی اصلاح و ہدایت کو اپنے لیے فخر سمجھتا ہے ۔ اکبر بظاہر حرف شناس تک نہ تھا مگر صحت ذوق کا یہ عالم تھا کہ اس نے " ملک الشعرائی " کا ایک عہدہ قائم کیا تھا ۔ فارسی شعرا کے کلام پر اسکی بعض بعض اصلاحیں اس کی خوش مذاقی کا بین‌ثبوت ہیں ۔ جہانگیر کا مذاق شعر و ادب ، تزک جہانگیری سے ظاہر ہے ۔ کس قدر نکتہ رس اور دقیقہ شناس طبیعت پائی تھی ۔ جس شاعر کی بابت جو رائے دے دی وہ بالکل جچی تلی ہے خود بھی کبھی کبھی جو کچھ کہتا تھا یا کسی کے شعر میں کوئی اصلاح و ترمیم کرتا تھا اس سے صحت مذاق و نکتہ شناسی کا پتہ چلتا ہے ۔

عہد مغلیہ کا مشہور فارسی شاعر چندر بھان برہمن اس نے اپنی کتاب " چہار چمن* " میں اس زمانہ کے نصاب تعلیم کا ذکر کیا ہے اسی سلسلے میں اس نے ان کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اس زمانہ میں عام طور پر مطالعہ میں رائج تھیں ۔ ان میں مثنوی مولانا روم ، دیوان شمس تبریز ، حدیقہ حکیم سنائی ، پندنامہ فریدالدین عطار ، کلیات امیر خسرو ، مولانا جامی وغیرہ داخل ہیں ۔ جس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس دور کے تعلیم یافتہ دماغ کس قسم کے خیالات و مضامین سے ترتیب پا رہے تھے ۔ شاعری کی عام تر بنیاد اخلاص و کیف پر ہے جن شعرا کی طبیعت میں یہ مادہ زیادہ ہے اسی نسبت سے ان کا کلام بھی پرتاثیر واقع ہوا ہے ۔ " برکیفت اخلاص " صحت ذوق کی دلیل اور خود شاعری کی اصل روح حیات ہے ۔ جن لوگوں کو خود یہ نعمت حاصل ہو ان کا کیا کہنا ۔ لیکن عام طبائع تقلید و تتبع کی عادی ہیں ۔ تقلید و تتبع میں بھی اگر " صحیح المذاق " لوگوں کو پیش نظر رکھا جائے تو بہرصورت وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں ۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

مور مسکین ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد
دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

دلی چونکہ اکثر صوفیاے عظام کا آستانہ تھی اس لیے یہاں ایسے فارسی شعرا کی کثیر تعداد موجود تھی جو خود صاحب ذوق تھے مگر ان سب میں حضرت امیر خسرو کو ایک خصوصی امتیاز حاصل ہے ۔ ان بزرگوں کے روحانی نغموں سے دلی کا ذرہ ذرہ گرم تواجد اور کیف و شعریت سے لبریز تھا ۔ اکبر ، جہانگیر اور خانخانان وغیرہ کی اصلاح و تربیت کے علاوہ ایرانی شعرا کے کلام میں اعتدال و لطف پیدا ہونے کے باعث دلی کا یہ بابرکت ماحول بھی تھا ۔

---

* ۔ یہاں ان کو تسامح ہو گیا ہے ۔ میری خیال میں کتاب کا نام " چہار چمن " کے بجائے " چہار چمن " ہے ۔ مقالہ نگار

اردو شاعری اور دلی اسکول:

حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی پیدائش تیرھویں صدی عیسوی کی ہے ۔ ایک طرف تو ان کی یہ حیثیت ہے کہ ان کا شمار زبردست مشائخ و صوفیا میں ہے ۔ ان کی تمام زندگی جوش و خروش اور درد و گداز کا زندہ نمونہ تھی ۔ وہ اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیا رح کے وصال کی خبر پا کر تمام اثاثہ لٹا کر ان کے مزار پر معتکف ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ شاہد حقیقی کو نقد جان سپرد کر کے دم لیتے ہیں دوسری طرف وہ ہندی اور فارسی کے باکمال شاعر ہیں ۔ ان کے کلام میں درد و تاثیر کا یہ عالم ہے کہ ان کی زندگی شاعری اور ان کی شاعری میں زندگی معلوم ہوتی ہے ۔ طبیعت میں اس قدر جدت و اختراع کا مادہ ہے کہ مکرنی ، انمل ، دو سخنے پہیلیاں اور ان کے علاوہ اور طرح طرح کی چیزیں ان کی ایجاد فکر کی مرہون منت نظر آتی ہیں ۔ ہندی اور فارسی الفاظ کے علاوہ کبھی کبھی پورے فقروں کو بھی اسطرح باہم دست و گریبان کر دیا کہ ایک نئی زبان کی طرح و بنیاد قائم ہو جاتی ہے ۔ "خالق باری" بھی انھیں کی تصنیف کہی جاتی ہے گو اس روایت کی بنیاد زبردست تاریخی شواہد پر نہ ہو تاہم اردو کی تاسیس و تشکیل کا سہرا انھیں کے سر تسلیم کیا جاتا ہے ۔ میر تقی میر اپنے "نکات الشعرا" میں ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ۔

"حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ"

"مجمع کمالات و صاحب حالات ۔ فضائل او اظہر من الشمس است ۔ احوال امیر مذکور در تذکرہ ہا مسطور ۔ این نوشتن احقر العباد فضولیست ۔ اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد ۔ درین خود تردد نیست ۔ ازانجملہ یک قطعہ تیمناً" نوشتہ آید ؎

زر گر پسرے چو ماہ پارا　　کچھ گھڑیئے سنواریئے پکارا

نقد دل من گرفت و بشکست　　پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا [1]

سب سے پہلے اردو غزل جس میں فارسی اور ہندی الفاظ باہم ملائے گئے ہیں اور فارسی اوزان سے کام لیا گیا ہے آپ ہی کی جانب منسوب ہے ۔

ملک محمد جائسی ایک صوفی منش بزرگ تھے ان کا زمانہ ۱۵۲۰ھ ہے ان کی مشہور و معروف کتاب "پدماوت" فارسی رسم الخط میں لکھی گئی تھی اس کے بعد پندرھویں صدی سے سترھویں صدی کی ابتدا تک کبیر اور تلسی داس کا کلام لوگوں میں بھگتی اور درد و گداز کی روح پھونکتا رہا ۔ ان تمام بزرگوں کے کلام میں فارسی کے الفاظ برابر جابجا

۱۔ ہسٹری آف اردو لٹریچر از رام بابو سکسینہ

ہے کہ انھوں نے " حسن مجاز " کے " جنسی پہلو " کا اظہار نہیں کیا ۔
لیکن کائنات کے جتنے حسین مرقعے اور مناظر، رنگین تشبیہات و استعارات
کے ذریعہ اردو غزل میں انھوں نے منتقل کئے ہیں بہت کم شعرا نے کیا ہے۔
جناب عابد رضا بیدار کے اس بیان میں بڑی صداقت ہے :

" اردو غزل کی پوری تاریخ میں فطرت سے ایسا لگاؤ اور قدرتی حسن کا اتنا شدید احساس اصغر کے علاوہ کہیں اور نہیں ملے گا ۔[1] "

دعویٰ نمبر ۳

دعویٰ نہیں پیشین گوئی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا صاحب کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہو رہی ہے بحیثیت مجموعی مرزا صاحب کا مقدمہ افراط و مبالغہ کا شکار نہیں ہوا۔ اسے زیادہ سے زیادہ " حق دریافت " کی سرخوشی کہہ سکتے ہیں جس نے کہیں کہیں اظہار میں غلو کی طرف مائل کر دیا ہے ۔

اصغر کے قدیم ترین نقادوں میں دوسرے نمبر پر جناب اقبال احمد سہیل آتے ہیں ۔ جناب اقبال سہیل نے " نشاط روح " پر تبصرہ کرنے میں بڑی بالغ نظری اور بصیرت کا ثبوت دیا ہے ۔ اگر تبصرہ کے مندرجات کی ایک ایک شق سے بحث کی جائے تو دفتر درکار ہوگا۔ اس لیے صرف خلاصتہ البحث پر اظہار نظر کیا جاتا ہے ۔ اقبال سہیل صاحب اختتام تبصرہ پر رقمطراز ہیں :

" حقیقت یہ ہے کہ غالب و مومن نے اساتذۂ ایران کے تتبع اور اپنے زور طبیعت سے اردو شاعری میں جو دو نئے باب اضافہ کئے تھے وہ محض نقش اول تھے ۔ جناب اصغر حکیم مومن خاں کے سلسلہ تلامذہ میں ہیں اور غالب کے شیدائیوں* میں اور خوش قسمتی سے بادۂ تصوف کے ذوق شناس بھی ہیں، اس لئے

۱۔ اصغر کا مطالعہ ۔ عابد رضا بیدار ۔ آجکل دہلی جون ۱۹۵۷ء ۔ صفحہ ۳۹

*۔ اصغر وحد شاگرد قدر بلگرامی کے رشتہ سے ، غالب کے سلسلہ تلامذہ میں بھی ہیں ۔

بکھری ہوئے نظر آتے ہیں ۔

دکن میں بھی اردو کی ابتدا ہندو مسلمانوں کے باہم روادارانہ تعلقات کا نتیجہ تھی ۔ بہمنی سلطنت کے تعلقات ہندوں سے نہایت شگفتہ (خوشگوار --- اقبال) تھے مسلمان صوفیا نے (جن کی پاکیزہ طبیعت اکثر قومی و ملکی تعلقات سے دور رہی ہے) اپنے واردات قلبیہ کو ملکی زبان میں شعر کا جامہ پہنایا ۔ سید جلال الدین حسین بخاری جن کا نام و نسب برہان الدین عبداللہ بن محمود تھا اور جن کو گجرات والے " قطب عالم" کہتے ہیں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے پوتے تھے ۔ ان کے بڑے صاحبزادے کا نام سراج الدین محمد عبداللہ تھا ان کو " شاہ عالم " بھی کہتے ہیں ۔ حاکم سندھ نے اپنی ایک لڑکی کا ان سے عقد بھی کر دیا تھا ۔ ان بزرگوں کی طرف بھی چند فقرے ایسے منسوب ہیں جن میں فارسی اور دکنی زبان کی باہم آمیزش نمایاں ہے ۔ غرضیکہ یہ تمام امور مل جل کر دکن میں اردو اور اردو شاعری کی ابتدا کا باعث ہوئے ۔ اس دور کا اول[1] شاعر شجاع الدین نوری کہا جاتا ہے جو فیضی کا دوست اس لیے اکبر کا ہمعصر تھا ۔

ولی دکنی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دو مرتبہ دلی آیا ۔ پہلی مرتبہ ١٧٠٠ھ میں جو اورنگ زیب کا زمانہ تھا اور دوسری مرتبہ ١٧٢٢ھ میں جو محمد شاہ کا زمانہ تھا ۔ پہلی ہی مرتبہ وہ شاہ سعداللہ گلشن رح کا مرید ہوا اور آپ کی ہدایت کے مطابق اپنے کلام میں مناسب اصلاح و ترمیم کر کے اسے اردو شاعری کا ایک بہترین نمونہ بنا دیا ۔ ولی کے تعلقات لالہ کھیم داس اورنگ آبادی اور امرت لال اور گوہر لال سے بھی تھے ۔ یہ لوگ بھی اس زمانہ میں کافی ادبی شہرت رکھتے تھے ۔

دلی کی تمام فضا پہلے ہی شعر و روحانیت کے آتش گیر مادہ سے لبریز تھی ۔ ولی نے جب شاہ سعداللہ گلشن کے ارشاد و ہدایت کے موافق اپنا دیوان مرتب کیا اور یہ کلام دلی کے گلی کوچوں میں پھیلا تو ہر طرف اک آگ سی لگ گئی ۔ دلی میں ولی کے معاصر آبرو ، حاتم ، ناجی ۔ مضمون اور حضرت میرزا مظہر جانجاناں رح تھے ۔

ان میں سے شاہ مبارک آبرو شاہ محمد غوث گوالیاری کے سلسلے میں ایک صوفی منش بزرگ تھے ۔ شاہ شرف الدین مضمون ابتداء ایک سپاسی پیشہ شخص تھے مگر آخر میں فقر و تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے ۔ یہ بابا فرید شکر گنج علیہ الرحمۃ کی اولاد میں تھے ۔ آپ کے بعد خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ نے اردو شاعری کو بہ اعتبار زبان و بہ اعتبار خیالات

١۔ ہسٹری آف اردو لٹریچر ۔ رام بابو سکسینہ

و جذبات آسمان پر پہنچا دیا ۔ حضرت مرزا مظہر جانجانان سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور بزرگوں میں ہیں ۔ آزاد کا قلم ان بزرگوں کے ذکر میں بہت رک رک کر چلا ہے ۔ مگر میر تقی میر ان الفاظ میں ان کا ذکر کرتے ہیں :

" مرزا جان جاناں مظہر "

" مظہر تخلص ۔ میر دست مقدس مظہر ۔ درویش ، عالم ، صاحب کمال ، شہرۂ عالم بے نظیر ۔ معزز و مکرم ۔ اصلش از اکبر (آباد ۔۔ اقبال) است ۔ پدر او مرزا جان نام داشت ۔ از فرط شفقت مرزا جان جان می گفت ۔ ازین سبب به همین اسم موسوم است ۔ بندہ بخدمت او رفتہ سعادت اندوز گشتہ است ۔ اکثر اوقات در یاد الہی صرف می کند خوش تقریر بمرتبہ ای ست کہ در تحریر نمی گنجد دیوان شعر فارسی او بہ نظر فقیر مولف آمدہ است ۔ از سلیم و کلیم پایۂ کمی ندارد اگرچہ شعر گفتش دون مرتبہ است لیکن گاهے متوجہ این فن بے حاصل می شود "

آپ کے فارسی اشعار تمام تر سوز و درد سے لبریز ہیں ۔ یہاں اردو کے چند اشعار نمونۃً درج کیے جاتے ہیں :

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام گلشن میں و لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا ، گل اپنا ، باغباں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا
لیکن ۔ اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

اتنی رخصت دے کہ رخصت ہولیں اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایے میں تھے آزاد ہم

مت اختلاط کر اے شہسوار تو ہم سے
چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں

آتش کہو ، شرارہ کہو ، کوئلا کہو
مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

تجلی تیری گر پست و بلند ان کو نہ دکھلاتی
فلک یوں چرخ کیوں کھاتا ، زمیں کیوں فرش ہو جاتی

خدا کو اب تجھے سونپا ای دل
یہیں تک تھی ہماری زندگانی

...

زبان کی آراستگی اور لفظی ریزہ کاریوں کو دور کر کے ان اشعار کو غور سے پڑھیے ان میں عام شرائی کا بے سود و لاحاصل تبسم نہیں ہے بلکہ وہ شعلے ہیں جو کبھی طور پر چمکتے ہیں اور کبھی ارباب درد کے سینوں کو پر گداز کر دیتے ہیں ۔ خواجہ میر کلز درد کا ذکر میر تقی میر اس طرح کرتے ہیں :

" میاں صاحب میاں خواجہ میر سلمہ اللہ تعالی "

" المتخلص بہ درد ، جوش بہار گلستان سخن ، عندلیب خوش خوان چمن ایں فن زبان گفتگویش گرہ کشای زلف شام مدعا ، مصرع موشتہ اش بر صفحہ کاغذ از کامل صبح خوش نما ۔ طبع سخن پیرداز او سرو مائل چمنستان انداز است ۔ گاہے در کوچہ باغ تلاش بہ طریق گلگشت قدم رنجہ می فرماید ۔ در چمن شعرش لفظ رنگین چمن چمن گلچین خیال او را گل معنی دامن دامن ۔ شاعر زور آور ریختہ ، در کمال خلاقگی وارستہ خلیق ، متواضع آشنائی درست ۔ شعر فارسی هم می گوید ۔ اما بیشتر رباعی ، گرمی بازار وسعت مشرب اوست غرض از آشنائی مطلب اوست ۔ متوطن شاہجہان آباد ۔ بزرگ و بزرگ زادہ ۔ جوان صالح از درویشی بہرہ وافی دارد ۔ فقیر را بہ خدمت او بندگی خاص است ۔ اگرچہ حسن سلوک عام سر حسن سلوک بہائے خود گرفتہ امتزار را از گوشۂ دل نہادہ ۔ خلف الصدق حضرت خواجہ ناصر عندلیب سلمہ اللہ تعالیٰ است کہ مقتدای عالم است ۔ ایامے کہ فقیر بخدمت آن بزرگوار شرف اندوز می شد از زبان مبارکش می فرمود کہ میر محمد تقی تو میر مجلس خواهی شد الحمدللہ والمنتہ کہ حرف آن سر سلسلہ خدا پرستان موثر افتاد ۔ باطن آن خضر قافلہ اهل عرفان کہ از ظاهرش ظاهر تر است زود کار کرد ۔ مجلس ریختہ

کہ بخانۂ بندہ بہ تاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است واللہ از ذات
ہمین بزرگ است زیرا کہ پیش ازین این مجلس بخانۂ اش مقرر بود ۔
خداش ابداً لآباد سلامت دارد ۔"

خواجہ صاحب کا کلام عام طور پر شائع ہو چکا ہے اس لیے بخوف طوالت یہاں درج نہیں کیا جاتا ۔

شاعری اور تصوف کا باہمی تعلق :

دہلی اسکول کے مزاج ذہنی میں فقر و تصوف کا عنصر غالب ہے اس لیے شعر و تصوف کے باہمی تعلق پر یہاں کچھ عرض کر دینا غالباً بے موقع نہ ہوگا ۔ میں یہاں تصوف کی کوئی مبسوط تاریخ نہیں پیش کروں گا اور نہ اس کے مسائل پر کوئی طویل بحث کروں گا ۔ بلکہ اس سلسلے میں صرف چند ایسی باتیں عرض کر دینا چاہتا ہوں جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ شاعری کا تصوف سے نہایت قریبی تعلق ہے ۔

الفاظ و اصطلاحات ، اصلیت و حقیقت کے اشارات ہیں اور وہ ہمیشہ باہم مختلف رہیں گے ۔ یہ اختلاف اشارات کتنے ہی اعتباری کیوں نہ ہوں مگر دراصل انھیں کی بدولت قوموں اور جماعتوں کے امتیازات باقی ہیں ۔ عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے

ہندیاں را اصطلاح ہند مدح   سندھیاں را اصطلاح سندھ مدح
ہر کسے را سیرتی بہ نہادہ ام   ہر کسی را اصطلاحی دادہ ام

بہرصورت " سیرت و اصطلاح " کے پردے کو ہٹا کر اور ہندو مسلم امتیازات کو الگ رکھ کر ہم فقر و تصوف کے مسلک اور اس کے حقیقی مقصود پر جب نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہی معمولی معتقدات جو تمام مذاہب میں یکساں طور پر مشترک ہیں ان پر خود اپنے نفس میں تصدیق و یقین کی شان پیدا کریں ۔ ارباب فقر و تصوف کے نزدیک عام طور سے جو مذہب رائج ہے وہ صرف اس لیے ظاہری سطحی اور بے اثر ہے کہ اس کی حیثیت رسمی یا زیادہ سے زیادہ علمی ہے ۔" یقینی اور علمی " یا " ظاہری اور وجدانی " کے باہمی فرق کا اندازہ اس مثال سے بخوبی ہو سکتا ہے ۔ فرض کرو کہ تم شیر کے وجود کو تسلیم کرتے ہو ، تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مہیب بھی ہے اور وہ انسان کو مار بھی ڈالتا ہے ۔ اب تمھارا گزر ایک جنگل میں ہوتا ہے تمھیں شیر کا خیال آتا ہے اور جھاڑی میں سے کچھ سرسراہٹ معلوم ہوتی ہے پھر تمھیں کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور یکایک ایک شیر تمھارے سامنے نمودار ہو جاتا ہے ۔ ابتدائی حالت میں جو شیر تمھارے ذہن میں تھا وہی شیر آخر تک تمھارے ذہن میں رہتا ہے ۔ صرف یقین کی زیادتی (شدت ـــ اقبال) کے باعث خوف کے جذبہ میں اس درجہ

ترقی ہوتی گئی ہے کہ تمہارا وہ ابتدائی "علمی شیر" موجودہ شیر سے جو تمہارے "یقین و مشاہدہ" کا نتیجہ ہے بالکل مختلف معلوم ہوتا ہے ۔

تمام مذاہب کے نزدیک خدا موجود ہے ۔ وہ حاضر و ناظر ہے ۔ وہ تمام اشیاء کا خالق ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس "حقیقت علمی" پر جب "تصدیق و یقین" کی روشنی پڑتی ہوگی تو اس وقت انسان کی کیا حالت ہوتی ہوگی ۔

شاعری کی تمام تر بنیاد جذبات پر ہے ۔ تصوت یعنی تصدیق و یقین سے جذبات کی لطافت و شدت بڑھ جاتی ہے ۔ جس کا اندازہ تمہیں مذکورہ مثال سے بخوبی ہو چکا ہوگا ۔ اس لیے شاعر کے جذبات میں جس قدر شدت و لطافت ہوگی اس قدر اس کی شاعری کامیاب ہوگی ۔ کلام کی تاثیر کے متعلق بھی میں اسی مذکورہ مثال کی جانب تمہاری توجہ دوبارہ مائل کراؤں گا ۔

ایک شخص شیر کی شکل و صورت کو اچھی طرح جانتا ہے ۔ وہ اس کے ایک ایک عضو کے متعلق پوری معلومات رکھتا ہے ۔ اسی کے ساتھ اسے قوت گویائی بھی حاصل ہے وہ شیر کے متعلق جو کچھ بیان کرے گا اسے سن کر تمہیں ایک حد تک لطف آ سکتا ہے ۔ لیکن ایک ایسا شخص جس کے سامنے شیر کی صورت ہو وہ شیر کی شکل و صورت کے متعلق ممکن ہے کوئی تفصیلی و مکمل بیان نہ پیش کر سکے ممکن ہے وہ "ارے شیر" ہی کہہ دے یا صرف ایک چیخ مار دے ۔ بہرصورت اپنی حالت کے اظہار کا بہترین طریقہ وہی خوب جانتا ہے ۔ اسے ادائے مطلب کے لیے کسی بڑے سے بڑے اہل زبان کو حق نہیں کہ تعلیم و تلقین کرے ۔ غرض خوف و ہراس کا جو اظہار وہ اپنے اس نامکمل بیان سے کر دے گا وہ کسی بڑے سے بڑے اہل زبان و خطیب سے ، باوجود اپنے تمام مصطلحہ فن خطابت و زباندانی کے بھی ممکن نہیں اس لیے اگر شاعری کی غرض یہ ہو کہ جو کچھ خود محسوس کرتا ہے وہ دوسروں سے بھی محسوس کرائے اور جن جذبات سے وہ خود متاثر ہے ان سے دوسروں کو بھی متاثر بنائے تو اس میں قوت بیان سے کہیں زیادہ خود اس کے یقین و مشاہدہ اور احساس و جذبات کی شدت مطلوب ہے ۔ اور لفظ و بیان سے کہیں زیادہ شاعر کا یقین و مشاہدہ اور اسکی کیفیت نفسی کی شدت لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ اسی کو ایک عامیانہ فقرہ میں اس طرح کہا گیا ہے :

"آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد"

۲ اس زمانہ کی ہوس پرستانہ بیچارگیوں نے کمال سنجیدگی سے یہ سوال پیدا کیا ہے کہ "عشق حقیقی" جو اکثر قائلین فقر و تصوف کا ادعا ہے وہی سرے سے غیر فطری اور غلط معلوم ہوتا ہے ؎

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے　　　ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

"حسن نسوانی " کی ادائیں تو اس طور پر ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں ان کی تاثیر میں فطرت کی اعلیٰ ترین مصلحت توالد و تناسل بھی مضمر ہے لیکن " حسن حقیقی " اور " حسن مطلق " سے " شیفتگی " لوگوں کی ایک کورانہ تقلید ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی بیسویں صدی میں کہیں سے ضرورت ہو ۔ اس لیے جس شاعری میں کھلے کھلے " حسن نسوانی " کے علاوہ متصوفانہ " حسن حقیقی " و " حسن مطلق " کا ذکر ہو تو اسے غیر فطری و غیر متنزلانہ کہنا بیجا نہ ہوگا ۔

اس اعتراض کا آہنگ بیان کتنا ہی شوخ و ادیبانہ کیوں نہ ہو مگر اس کی بنیادیں وہی قدیم سوال " مذہب و لامذہبیت " کا ہے جسے " عرصہ گاہ شعر و ادب " سے کہیں باہر طے کرنا چاہیے تھا ۔ تاہم " مذہب و لامذہبیت " کے اصل موضوع کو بچا کر جس حد تک ممکن ہوگا میں یہاں کچھ عرض کروں گا ---- " نسوانیت " کی کشش اور اس کی قوتوں کا اعتراف مسلم اور یہ بھی تسلیم کہ اس سے ہمارے بعض قویٰ و جذبات کی سیرابی بھی ہوتی ہے اسی احتیاج کے باعث نسوانیت کی اس کشش کو ہم " حسن " کے نام سے پکارتے ہیں ۔ مگر کیا ہماری انسانیت چند خاص قویٰ و جذبات تک محدود ہے؟ اور کیا ان کے علاوہ ہماری دوسری احتیاجات زندگی نہیں ہیں؟

اگر آبشار کی آواز اور مغنی کا نغمہ ہمیں بیخود بنا دیتا ہے اور شفق کی سرخی اور مرغزار کی سبزی ہم میں کوئی کیفیت پیدا نہیں کرتی تو اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ ہمارا " سامعہ " تو صحیح ہے مگر ہماری " بصارت و بینائی " میں یقیناً " نقص ہے ۔ انسان کے احساسات و ادراکات کا استقصا و شمار آسان نہیں کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری ہستی کے کون کون سے اجزاء کو کن کن چیزوں کی کشش و احتیاج ہے ۔ انسان خود کو جس قدر وسیع کرتا جاتا ہے اتنا ہی حسن بھی اس کے سامنے وسیع ہوتا جاتا ہے ۔ جو لوگ حسن کو کسی مخصوص چیز میں مقید دیکھنا چاہتے ہیں وہ اپنے بعض جذبات میں گنتی ہی قوت و ہیجان پائیں لیکن بہرحال یہ ایک قسم کی تنگی و تقید ہے جو انسان کے وسیع نقطۂ نظر سے کسی طرح محمود ~~مستحسن~~ نہیں ۔ ہمارے حواس خمسۂ ظاہری رنگ و بو ، آواز ، نرمی و سختی اور ذائقہ کے علاوہ کسی دوسرے حسن سے قطعی بے خبر ہیں ۔ ہمارے باطنی حواس " حسن معنیٰ " " حسن تخیل " اور " حسن اخلاق " وغیرہ پر شیفتہ ہیں مگر ان میں سے کسی ایک چیز پر اپنے تمام ذوق کو محدود و منحصر کر دینا انسانی ہستی اور اسکی جامعیت کے لیے سم قاتل ہے

بج حسن تعیں سے ظاہر ہو کہ باطن ہو

یہ قید نظر کی ہے وہ فکر کا زندان ہے

مغرب کا ایک نقطہ نگار صحت ابھی ایک کتاب کے دیباچہ میں اسی حقیقت کو نہایت پرلطف انداز سے بیان کرتا ھے ۔ افسوس اس وقت نہ وہ کتاب میرے پاس ھے نہ اسکے اصل فقرے ذھن میں ھیں ۔ تاھم جہاں تک یاد پڑتا ھے اس کا مفہوم یہ ھے :

(۱) جو لوگ چیزوں کا صرف ظاھر دیکھتے ھیں ان کی حالت واجب الرحم ھے
(۲) جو لوگ چیزوں میں حسن دیکھتے ھیں ان کی حالت بہتر ھے اور ان سے کچھ امید کی جا سکتی ھے ۔
اور (۳) اور وہ لوگ جو بلند ترین و مکمل ھیں وہ حسن کے سوا کچھ اور نہیں دیکھتے ۔

انسانی ھستی کا اگر ھر ریشہ بیدار و ھشیار ھو تو کائنات عالم میں کیا ھے جس کا اس سے تعلق نہیں ۔ کون سی چیز ھے جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کیف و لذت کا ادراک نہ ھوتا ھو اس لیے بتائیے کہ عالم میں حسن اور محض حسن کے سوا اور موجود ھی کیا ھے حسن صورت اگر تفریح بخش ھے تو کیا " حسن معنیٰ " نے صدھا اور ھزارھا انسانوں کو دیوانہ نہیں بنا دیا؟ حسن انسانی بے شک کشش انگیز ھے لیکن اگر باطنی حاسۂ مردہ و افسردہ نہ ھو تو اسی کے ساتھ حسن اخلاق و پاکیزگی خیال میں بھی کافی دلآویزی موجود ھے ۔ ارباب رسم و تقلید کا ذکر نہیں بلکہ حقیقی " صاحبان ذوق " نے " حسن مطلق " کو اپنی شیفتگی و وارستگی کا موضوع قرار دیا اور تم اپنے تنگ و محدود مذاق کی بنا پر اس کا لطف نہ اٹھا سکے تو ۔ ع

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

" بت شیریں حرکات " اور " آستیں چاک و غزل خواں و صراحی در دست " کے متصوفانہ اصطلاحی معنوں کو الگ رکھو کہ ان کا شمار تاویلات بعیدہ میں ھے ۔ ـــــ سوال یہ ھے کہ کیا حقیقتاً اپنی اصلی شکل میں یہ حسن نہیں؟ اور کیا اس سے ھمارے کیف و سرور کو جنبش نہیں ھوتی ۔ اس کا جواب یقینا ، اثبات میں ھوگا مگر حسن شناسی کا تھوڑا سا اور ثبوت دو کہ " نظام اخلاق " کے قیام و بقا سے سوسائٹی اور خود ایک فرد کو جو سرور و انبساط حاصل ھوتا ھے کیا وہ بھی مطلوب و مقصود نہیں؟ اور کیا " حسن " کے سوا کوئی اور بھی ھے جو ادھر سے بھی دست بدامن نظر آ رھا ھے؟ یہی وجہ ھے کہ " ارباب حقیقت " کے کلام میں " حسن مجاز " کی دلآویزیوں کا بھی ذکر ھے اور حسن اخلاق کا بھی ۔ " حسن مطلق " کی پرستش کے معنی یہ ھیں کہ حسن کہیں ھو، کسی صورت میں ھو ، کسی مرتبہ اور کسی شعبۂ حیات میں ھو اس کو ھر جگہ پہچانا جائے اور ھر مقام پر اس کا صحیح حق ادا کر دیا جائے ۔ یہ صحیح ھے کہ " حسن کامل " یا " حسن مطلق " سے

لطف اندوز ہونے کے لیے صلاحیت درکار ہے ۔ دیکھنے میں تمام انسان انسان ہیں مگر ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو یا تو صرف دل ہیں یا صرف دماغ ، کچھ ایسے ہیں کہ " شکم و بہیمیت " کے سوا ان کی کوئی ہستی ہی نہیں ۔ کمال حسن کی شناخت کے لیے انسانیت کی تکمیل ضروری ہے پس اگر وہ نہیں ہے تو یہ رونے کا مقام ہے ۔ دلیری اور خیرہ چشمی سے اس پر معترض ہونے کا نہیں کہ اس طرح کے کلام سے لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے ۔ اس کا جواب اتناکافی ہے کہ " حقیقت و صداقت دوسروں کی نااھلی و کم فہمی کی ذمہ دار نہیں " اور بس ۔

غرض مذکورہ بالا بیانات سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ دلی کا مذاق اور اس کا مزاج شعر و ادب بلکہ اس کی تمام تر اجتماعی ذھنیت کی تربیت مندرجہ ذیل حقیقتوں پر مبنی تھی اور یہی دلی اسکول کے اصلی خصوصیات ہیں ۔

(۱) ھندو مسلمانوں کے روادارانہ تعلقات اور ایک دوسرے کی تہذیب و ذھنیت کے باھمی اختلاط نے شاعری میں وسعت مشرب اور ہمہ گیری کی شان پیدا کر دی تھی ۔

(۲) جس زمانہ میں اردو شاعری کا خاکہ اور ہیولیٰ تیار ہو رہا تھا اس وقت ھندو اور مسلمان فقرا و مشائخ نے اپنی برکات و وجدانی ترنم ریزیوں سے اس میں پاکیزگی و روحانیتکی استعداد پیدا کر دی تھی ۔

(۳) ھندو اور مسلمان فقرا و مشائخ کے نفوس جو اعلیٰ اخلاقی محاسن سے مزین تھے اور اردو شاعری کی تربیت و پرداخت چوں کہ انھیں کے بابرکت ہاتھوں عمل میں آئی اس لیے قدرتی طور سے اس میں بلند اخلاقی کی اسپرٹ موجود تھی ۔ یہی مہذب مذاق دلی اور نواح دھلی میں پھیل گیا ۔ اور شعر و شاعری کے بابمیں یہی ذھنیت عام ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ بھی جو پاکیزگی نفس ، اعلیٰ اخلاق اور روحانی خوبیوں سے عملاً بہرہ ور نہ تھے ، جب شاعری کی جانب مائل ہوتے تو تقلیداً ان کو بھی یہی رنگ اختیار کرنا پڑا جو عادت و خاصہ ہے عام اجتماعی ذھنیت کا ۔

(۴) شاعری کا عام موضوع حسن ہے ۔ ارباب فقر و تصوف کے نزدیک اس کا مفہوم نہایت وسیع ہے ۔ جس میں مجاز و حقیقت ، اخلاقی اور مادی حسن و خوبی کی تمام ادائیں داخل ہیں ۔

(۵) دھلی میں ارباب ذوق کی شاعری کا مقصود زیادہ تر واردات قلبی کا اظہار تھا نہ وہ پیشہ تھی اور نہ اس میں نمائشی دنگل اور اکھاڑے کی شان پیدا ہوتی تھی ۔

(۲) دھلی کی شاعری کا دربار سے تعلق نہیں ہوا تھا اس لیے امرا کی
کی فرمائش سے جو تکلف تصنع اور آورد پیدا ہو جاتی ہے اس سے بڑی حد تک محفوظ رہی۔
شعرائے دھلی کے یہاں زیادہ تر شعر کی غرض خود ان کا دلی تقاضا ہوتا تھا اس لیے
باوجود زبان کی کم مائیگی کسے شعر میں تازگی و لطافت کا عنصر غالب تھا ۔

لکھنئو کی شاعری :

مذکورہ خصوصیات اگرچہ زمانۂ مابعد میں قائم نہ رہ سکیں تاہم غالب ،
مومن اور شیفتہ وغیرہ نے ایک بڑی حد تک بگڑے ہوئے مذاق میں بھی کشاکش قائم رکھی ۔
کچھ تو دھلی کی فلاکت و تباہی نے شعرائے دھلی کو دھلی سے نکلنے کے لیے مجبور کیا کچھ
پورب کے نواب اور رؤساء نے اپنی درباری عظمت و شان و شوکت کی افزائش کے خیال سے خود
ان شعراء کی طلب و جستجو کی چنانچہ نواب شجاع الدولہ کے ماموں نواب سالار جنگ نے
خان آرزو کو دلی سے بلوایا ۔ ایک زمانہ تک وہ فیض آباد میں اقامت گزیں رہے بالآخر
شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے دو برس بعد رھگرائے آخرت ہوئے ۔ میر غلام حسین ضاحک
بھی فیض آباد ھی میں بہو بیگم کے بھائی نواب مرزا علی خاں اور نواب سالار جنگ کے
سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کر رھے تھے ۔ جب بجائے فیض آباد کے لکھنئو دارالسلطنت ہوا
تو میر ضاحک کے بیٹے میر حسن اور پوتے میر مستحسن خلیق لکھنئو آئے ۔

لکھنئو کے نواب مال دار تھے ۔ ان کو شاہان دھلی کی ریس و ھمسری کا بھی
شوق تھا اس لیے نہ صرف خود شعر و شاعری کی طرف توجہ کی بلکہ شعراء کو اپنی مصاحبت
میں رکھتے ، ان پر انعام و اکرام کی فیاضانہ بارش کرتے اور اس طرح خود کو شعرا کا محسن و
مربی ثابت کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دھلی کے تمام باکمال
شعرا لکھنئو میں جمع ہوگئے ۔ صرف خواجہ میر درد اور حضرت مظہر جانجاناں رح اس
جاہ و حشم اور مال و دولت سے مسحور نہ ہو سکے اور انھوں نے آخر وقت تک دلی کو نہیں
چھوڑا بلکہ اب تک وھیں کی خاک میں آرام فرما و استراحت گزیں ھیں (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم
اجمعین) ۔

لکھنئو میں شعرائے دلی کے درباری تعلق نے گو شعر و شاعری کا آوازہ بہت بلند
کر دیا اور ھر طرف شعر و شاعری کے چرچے سے اگرچہ شاعرانہ ذخیرہ کی بہتات و کثرت ہوگئی
لیکن اسی کے ساتھ شعر و شاعری کے حقیقی جذبات اور اس کی روحانی عظمتوں میں نقص و انحطاط
بھی شروع ہو گیا اس لئے کہ شعرا کی یہ سخن سنجی اظہار جذبات کے لیے نہیں بلکہ اکثر
ان نواب و رؤساء کو خوش کرنے کے لیے ہوتی تھی ۔ لکھنئو میں جب شاہ نصیر اور انشا کی

ملاقات ہوئی تو میر انشا نے اسی طرف اشارہ کیا تھا کہ اب تو شاعری کا یہ عالم ہے کہ

لگا چھپر کھٹ کے چارپائے اور اس پہ چاروں طرف سے گجرا

تو موج دریائے چاندنی میں وہ ایسے چلتا تھا جیسے بجرا

ملازمت کی مجبوریوں اور امراء و رؤساء (جن کا مذاق اکثر سطحی ہوتا ہے) کو خوش کرنے کے لیے جو اشعار کہے جاتے ہیں ان سے نہ صرف عزت نفس کو صدمہ پہونچتا ہے بلکہ شاعر کے جذبات کی قدرتی رو بھی مدھم ہو جاتی ہے جس سے رفتہ رفتہ تازگی و لطافت کا یک لخت خاتمہ ہو جاتا ہے -

میر تقی و سودا اس آفت سے نسبتاً محفوظ رہے ان کو دربار سے بخشش ملتی تھی اور ان کے شاعرانہ افکار و مذاق میں بہت کم مداخلت کی گئی اس لیے وہ اوروں سے کسی قدر زیادہ آزاد رہے - یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں دلّی اسکول کے خصوصیات بھی زیادہ نمایاں ہیں - لیکن اب تک لکھنؤ میں برابر دلی ہی کی تقلید کی جاتی تھی -

رسالہ " زمانہ کانپور "
ستمبر ۱۹۲۹ء
(صفحات ۱۲۵ تا ۱۳۰)

ضمیمہ دوم

" اردو کی نشوونما "

— اختصار

ضمیمہ دوم

اردو کی نشوو نما

(اردو شاعری کی ذہنی تاریخ کا ایک گم شدہ باب)

از جناب اسٹر گونڈوی

...

پہلا باب :

ابتدائی دور :

اردو زبان کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور اس کا مولد و منشا کون سا مقام ہے؟ اس قسم کی تاریخی جستجو و تلاش کا شوق آجکل ترقی پر ہے " دکن میں اردو " "پنجاب میں اردو " اور ابھی حال ہی میں " بہار میں اردو " ان کاوشوں کے نمایاں نتائج ہیں ۔

اردو کا مولد و منشا :

اصل یہ ہے کہ ہندی میں عربی ، فارسی کے الفاظ اور فارسی میں ہندی الفاظ کی آمیزش کا سراغ ہر اس مقام سے جہاں ہندو مسلمانوں کو باہم مل جکر کر رہنے کا اتفاق ہوا ہو بہ آسانی مل سکتا ہے ۔ اس لیے یہ یقین رکھنا چاہیے کہ جہاں جہاں بھی ہندو مسلمانوں کو اختلاط باہمی کا موقع ملا ہے وہاں اردو زبان کا ہیولا بھی تیار ہوتا رہا ۔ ان تحقیقاتوں سے جہاں ایک طرف اردو کی لسانیاتی تاریخ مرتب ہو رہی ہے وہیں اہل ملک کے طبعی رحجان اور سوشل زندگی کا نقشہ بھی سامنے آتا جاتا ہے اور وہ مواد و عناصر بھی جمع ہوتے جا رہے ہیں جن سے ہمارے شعر و ادب کی ایک ذہنی تاریخ بھی مدون ہو سکتی ہے ۔

بعضوں نے[1] اردو زبان کا سراغ چوتھی صدی ہجری یعنی سلطان محمود غزنوی کے زمانہ تک لگایا ہے ۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود کے ساتھ جو ترک اور ایرانی آئے تھے ان کے تعلقات ہندو درباریوں سے ہوئے اور اسطرح ترکی اور فارسی زبانوں کی ہندی اور دوسری پراکرت زبانوں سے جو اس وقت سندھ گجرات اور پنجاب میں بولی جاتی تھیں آمیزش شروع ہوگئی ۔ اس کے ثبوت میں فارسی کے مشہور شاعر منوچہری کا ایک شعر جو اس کے قصیدے

---

۱ ۔ اے ہسٹری آف پرشین لینگویج از پروفیسر محمد عبدالغنی ایم اے ، پروفیسر ناگپور کالج حصہ ۱ ۔ صفحہ ۶۳

میں ہے پیش کیا جاتا ہے وہ شعر یہ ہے ؎

آلاتا مومناں دارند روزہ

آلاتا ہندواں گیرند لنگھن

پہلی صدی ہجری میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات :

بعضوں کا خیال یہ ہے کہ اگر اردو زبان کی بنیاد اسی دن قائم ہوئی جس دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہم تعلقات پیدا ہوئے تو اس کا زمانہ پہلی صدی ہجری یعنی ساتویں صدی عیسوی ہونا چاہیے جبکہ ایرانی بیڑوں کو غرق کرتے ہوئے مسلمانوں نے بحر ہند کے ساحل پر قدم رکھا ۔ آج[1] یہ امر بھی پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے کہ عرب کے مسلمان سوداگر ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے مغربی کنارے پر آباد تھے ۔ وہ ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کرتے تھے اور ان کے رہنے اور گھر بنانے میں کسی طرح کی مزاحمت نہیں کی جاتی تھی ۔ کولم میں " مہت کٹو " کے قبرستان میں علی بن عثمان کی قبر پر ۱۶۶ھ (۷۸۱ء) کا کتبہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی میں مالا بار کے ساحل پر مسلمان آباد ہو چکے تھے ۔ ہندو راجاؤں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی ۔ ان کی تجارت کے لیے آسانیاں بہم پہنچائیں ، انھیں زمین خرید نے اور مسجدیں بنانے کی اجازت دی ، کوچین کا راجہ جسے زمورن کہتے ہیں عرب سوداگروں پر بڑی مہربانی کرتا تھا ۔ اس کی اجازت سے بہت سے سوداگر اس کے یہاں آباد ہوگئے ، چنانچہ ان کی تجارت سے راج کو مالی فائدہ پہنچا اور ان کے بازوؤں کی قوت سے راج کی طاقت بڑھی ۔ ہندو راجہ مسلمانوں کی اتنی عزت کرتے تھے کہ انھوں نے خود اپنی رعایا کو مسلمان ہونے کا جوش دلایا ۔ اس زمانے میں ہندو مسلمانوں کی اس باہمی یگانگت و یکجائی نے کسی مشترکہ زبان کی بنیاد ڈالی یا نہیں؟ اسکے بارے میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا ۔ لیکن زبان و ادب کو جس باہمی اتحاد اور مشترکہ ذہنیت کی ضرورت ہے اس کی تائید اس زمانے کے زبان و ادب سے نہ سہی مگر واقعات سے یقیناً کی جا سکتی ہے ۔

غرض کہ سندھ اور سواحل مالا بار پر ہندو مسلمانوں نے باہم تبادلہ خیالات کا جو ذریعہ اختیار کیا اس کا پتہ نہیں چلتا اس لیے تاریخ اردو کے محققوں نے اسے قطعاً خارج از بحث قرار دے دیا ۔ اور اردو زبان کے شرف اولیت کے لیے دوسرے گوشوں کی چھان بین شروع

۱۔ مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا ۔ از ڈاکٹر تارا چند ۔ ہندوستانی جلد ۱۱

کر دی ۔ چنانچہ اس سلسلۂ تلاش و تحقیق میں انھوں نے ایک قابل قدر ذخیرہ جمع کر دیا ہے جو شرف اولیت کے نزاع سے کہیں زیادہ دوسرے مطالب و مباحث کے لیے کارآمد ہے ۔

اردو شاعری کا مایۂ خمیر :

غرض کہ اردو زبان و شعر کی ابتدائی تاریخ کے نظریوں میں لوگ کتنے ہی مختلف الخیال ہوں مگر شاید اس سے کسی کو انکار نہیں کہ اردو شاعری کی حقیقی تربیت دلی میں ہوئی ۔ اسی کے ساتھ اس زبان کے عالم وجود میں آنے کے لیے ہندو مسلمانوں کی متحدہ سعی بھی اتنی واضح و نمایاں حقیقت ہے کہ اس پر بحث و ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں ۔ لیکن تاریخ اردو کے سلسلے میں جو ذخیرہ معلومات ہمارے سامنے آتا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بچے کی ولادت سے قبل ہی فطرت اس کے نشوو نما کے لیے شیر مادر تیار کر دیتی ہے ۔ ٹھیک اسی طرح اردو کے عالم وجود میں آنے سے قبل ہی ہندو فقرا اور مسلمان صوفیہ کی بدولت ہندی اور فارسی ہندی مخلوط زبانوں میں شاعری کا مایۂ خمیر تیار ہو چکا تھا اور اس کا اصلی مزاج یہی سرمایہ تھا ۔ کسی نئی زبان یا نئی ذہنیت کی تخلیق قدرتاً انھیں لوگوں کی بدولت انجام پاتی ہے جن کا تعلق براہ راست عوام الناس سے ہو سلاطین اور روٴسا کا کام صرف امداد و اعانت ہوتا ہے چنانچہ اردو زبان اور اس کی شاعری کی تاسیس میں ہم اس فطری قانون کو صحیح صحیح طور پر کارفرما پاتے ہیں ۔ قبل اس کے کہ اردو شاعری کے اس مایۂ خمیر یا فقراء اور مشائخ کے کارناموں کا ذکر کیا جائے یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندو فقرا اور مسلمان صوفیا کے ان شعری کارناموں میں باہمی رواداری کی جو جھلک پائی جاتی ہے اس سے ایک متحدہ ذہنیت و مشترکہ زبان کی تشکیل کی سعی ناقابل انکار حد تک نمایاں ہے ۔

تیرھویں چودھویں صدی عیسوی :

حضرت بابا فرید شکر گنج علیہ الرحمۃ جن کی تاریخ وصال ۶۶۳ھ ہے ۔ سلسلۂ چشتیہ کے مشہور اور زبردست شیخ ہیں حضرت مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابری کلیری اور حضرت نظام الدین اولیا آپ ہی کے خلیفہ ہیں جن سے سلسلۂ چشتیہ صابریہ اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کی بنیادیں پڑیں ۔ یہ سلسلے آج ہندوستان اور ہندوستان کے باہر بھی پھیلے ہوئے ہیں ۔ پروفیسر شیرانی نے آپ کے کچھ اشعار تلاش کئے ہیں جو یہاں پیش کئے جاتے ہیں ۔

وقت سحر وقت مناجات هے
خیز دران وقت که برکات هے

نفس مبادا که بگوید ترا
خسپ چه خیزی که ابهی رات هے

بادم خود همدم و هشیار باش
صحبت اغیار بری بات هے

باتن تنها چه روی زین زمین
نیک عمل کن که وهی سات هے

پند شکر گنج بدل جان شنو
ضایع مکن عمر که هیهات هے

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہار کے مشہور صوفیا میں هیں - آپ کی تاریخ زندگی آٹھویں صدی هجری سے وابسته هے - آپ نے مدتوں کوہ راجگیر (بہار) میں ریاضت و مجاهده کیا هے - آپ کے ملفوظات و مکتوبات موسوم به معدن المعانی کتاب ارشاد السالکین اور شرح آداب المریدین مشہور هیں - آپ بھاشا میں بھی شاعری کرتے هیں - معدن المعانی کی پہلی جلد صفحه ۱۰۳ میں مذکور هے که آپ کے رفیق خواجه جلال الدین حافظ ملتانی اور آپ میں اس طرح گفتگو هوئی - " همدرین محل جلال الدین مذکور گفت که بزبان هندوی نیکو گفته است " باٹ بھلی پر سانکری ،، بعدازان بندگی مخدوم عظمه اللهٰ بزبان مبارک راند " دیس بھلا پر دور ،، آپ کا ایک کج مندرہ جو اکثر امراض کے لیے مفید بتایا جاتا هے بعض لوگوں سے سننے میں آیا هے اس میں هندی اور عربی عبارت کے علاوہ دوهرے بھی هیں - بخوف طوالت پورا کج مندرہ یہاں نقل نہیں کیا جاتا صرف ایک دوهرے پر اکتفا کی جاتی هے -

کالا هنسا نرملا بسے سمند تیر   پنکھ پسارے بکھ هرے نرمل کرے سریر

— درد ، رهے نه پیر

حضرت امیر خسرو کی پیدائش تیرھویں صدی عیسوی کی هے - سب سے پہلے اردو غزل جس میں فارسی اور هندی الفاظ باهم ملائے گئے هیں اور فارسی اوزان سے کام لیا گیا هے - آپ هی کی جانب منسوب هے - یه اشعار آپ هی کے کہے جاتے هیں -

ز حال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم ایجان نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شباں ہجراں دراز چوں زلف روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل، دو چشم جادو بصد فریبم ، ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحق روز وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت منکے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہ، کی خبر وصال سن کر مشہور ہے کہ آپ نے یہ دوہا کہا تھا ؎

گوری سووے سیج پر ڈارے مکھ پر کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوہنہ دیس

میر تقی میر اپنے نکات الشعرا میں حضرت امیر خسرو کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

" مجمع کمالات و صاحب حالات ، فضائل او اظہرمن الشمس است، احوال امیر مذکور در تذکرہا مسطور این نوشتن احقر العباد فضولیست، اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد ، درین خود تردد ے نیست ۔ از آں جملہ یک قطعہ تیمنا" نوشتہ آید ؎

زرگر پسرے چوں ماہ پارا | کچھ گھڑئیے سنواریئے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست | پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

گجرات میں سید جلال الدین حسین بخاری جن کا نام و لقب برہان الدین عبداللہ بن محمود تھا اور جن کو وہاں والے قطب عالم کہتے ہیں حضرت مخدوم جہانیاں جہانگشت کے پوتے تھے ۔ ان کے بڑے صاحبزادے کا نام سراج الدین محمد بن عبداللہ تھا ۔ ان کو شاہ عالم بھی کہتے ہیں ۔ حاکم سندھ نے اپنی ایک لڑکی کا ان سے عقد بھی کر دیا تھا۔ ان سے چند فقرے ایسے منسوب ہیں جن میں فارسی اور دکھنی زبان کی باہم آمیزش نمایاں ہے۔

شیخ عین الدین گنج العلم (۹۳-۱۳۰۶ء) جن کی پیدائش دہلی کی ہے ، محمد تغلق کے زمانے میں دولت آباد تشریف لے گئے ۔ آپ نے بھی چند رسالے فرائض مذہب پر

دکھنی زبان میں لکھے ھیں -

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے نثر میں دو کتابیں معراج العاشقین اور ھدایت نامہ لکھیں - ان میں تصوف کے مضامین اور قدیم اردو کے اھم ترین نمونے ھیں - آپ سے چند اشعار بھی منسوب ھیں جن کی صحت مشتبہ ہے - مثلاً

پانی میں نمک ڈال مزہ دیکھنا اسے
جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے

چودھویں صدی کے اواخر میں عبداللہ حسینی نے جو حضرت بندہ نواز کے پوتے تھے - حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کی کتاب نشاط العشق کا ترجمہ کیا اور اس کی شرح لکھی - پندرھویں صدی میں شاہ میران جی نے جن کا لقب شمس العشاق ہے اور جو خواجہ کمال الدین بیابانی کے مرید اور خواجہ بندہ نواز کے خلیفہ دوم تھے تلقین و ارشاد کا کام شروع کیا - موصوف اگرچہ عربی و فارسی کے عالم تھے لیکن اپنے مریدوں کو اردو زبان میں تلقین و ھدایت فرماتے تھے آپ کی تصانیف میں خوش نامہ ، خوش نغز ، شہادت الحقیقت ہے - شہادت الحقیقت ایک نظم ہے - اس کا اسلوب بیان صاف و سادہ ہے اور مضامین متصوفانہ ھیں - آپ کی کچھ کتابیں نثر میں بھی ھیں -

سولہویں صدی :

شیخ بہاء الدین باجن شیخ رحمت اللہ گجراتی بن مخدوم شیخ عزیز اللہ متوکل کے مرید ھیں - انھوں نے فارسی زبان میں ایک کتاب اپنے پیر کے حالات اور مریدوں کی ھدایت میں لکھی ہے -

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ آپ حضرت شیخ عارف بن مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولوی رح کے مرید تھے - آپ اگرچہ چشتی صابری تھے مگر جامع صفتین ھونے کے باعث اکثر سلاسل اولیاء کرام کا آپ سے تعلق ہے - آپ کی تصانیف میں انوارالعیون ، رسالہ قدسیہ ، رسالہ نورالھدیٰ ، رسالہ قرۃ العین اور رشدنامہ ھیں - آپ کے مکتوبات مولانا خضر بڈھن جونپوری نے جمع کیے ھیں - زمانۂ وفات ۹۴۵ھ ہے آپ ھندی کے بلند مرتبہ شاعر تھے اور الکھ داس تخلص کرتے تھے جو شاید لفظی ترجمہ عبدالقدوس کا ہے - آپ نے اپنی کتاب انوارالعیون میں حضرت مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات لکھے ھیں - اس میں حضرت مخدوم کی زبانی بھی کچھ ھندی کے دوھرے نقل فرمائے ھیں مثلاً

جھول لے پوت جھول لے پھر کچھ جھول آئے

یا ــ
کنواں ھوے تو باٹیں سمندر کچھ باٹی جائے

باوا ھوئے تو برجوں جھیل کچھ برجس جائے

مکتوبات قدوسیہ جو آپ کے مکتوبات کا مجموعہ ھے ایک گنجینہ معارف ھے ۔ اس میں بھی اکثر مقامات پر ھندی کے دوھے سہود قلم فرما دیتے ھیں ایک دوھرہ تبرکاً یہاں درج کیا جاتا ھے ــ

آپ گنوائیں پی ملے، پی کھوے سبھی جائے

اکتھ کتھا ھے پریم کی جے کوئی بوجھے جائے

شاہ علی محمد جیوگام دھنی گجراتی ۔ آپ سید احمد کبیر رفاعی کی اولاد میں ھیں ۔ آپ نے ایک رسالہ نکات توحید پر لکھا ھے جس کا نام جواھر اسرار اللہ ھے اس کے چند اشعار حسب ذیل ھیں :

مکھ پر بال بکھیر سو ساتھی　　چھپ کر ھوئی رات سہاگی

دل سنبھال سو بکھرے کیسا　　دن ھو آوے سورج جیسا

کھیل جدھیا بھرپیا کھیلے　　ھنس تل بھی کھیل نہ میلے

آپیں ناچے آپیں گاوے　　آپیں آپیں بھاو دکھاوے

شیخ خوب محمد حسینی گجراتی جنھوں نے ۹۸۶ھ میں تصوف کی مشہور مثنوی خوب ترنگ لکھی ۔ آپ شیخ کمال محمدسیستانی کے مرید تھے ۔

شیخ بہاء الدین برنادی خاتم التارکین ۔ آپ مخدوم شیخ فریدالدین برنادی مہاجر مکہ کے پوتے اور جانشین ھیں ۔ آپ سے بھی بہت سے خیال اور دوھرے منسوب ھیں ان کے دوست داس گھدن نے اپنی وفات کے وقت شیخ کی خدمت میں یہ پیغام بھجوایا تھا ــ

اے من نام پائیں ماتیں تھیں دکھ سکھ بھائے

یہ جو کچھ کوسہنو سو دیکھت جائے رے یہ جائے

جے بچن ست گرن کی ھے تے من کہی سنائے

داس گھدن جیوں جل ترنگی جل میں جل جو جائے

ملک محمد جائسی مشہور مسلمان صوفی ھیں ۔ ان کو سید اشرف جہانگیر اور سید محی الدین چشتی نظامی سے ارادت تھی ۔ یہ شیر شاہ کے زمانے میں ھوئے ۔ ان کی

مشہور کتاب پدماوت ۱۵۳۰ء میں تصنیف ہوئی ۔ پدماوت فارسی رسم الخط میں لکھی گئی تھی ۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ سنسکرت کے الفاظ جو مسلمانوں سے بمشکل ادا ہو سکتے تھے ۔ آسانی سے ادا ہونے لگے اور ان کی غرابت دور ہوگئی ۔ مسلمان ہندی شعرا میں ان کو بہت ہی خاص درجہ حاصل ہے ان کی کتاب پدماوت عام طور پر مشہور ہے اس لیے بخوف طوالت ان کے اشعار یہاں نہیں دئیے جاتے ۔

رسالہ " اضطراب " بنارس
مارچ ، اپریل ، مئی ، ۱۹۳۱ء
(صفحات ۲ تا ۱۰)

کتابیات

کتابیات

۱- مجموعات شعری، مضامین، کلام اور دیگر تحریرات اصغر :

۱- نشاط روح	اصغر	طبع اول مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۵ء
۲- نشاط روح	اصغر	طبع دوم صدیق بک ڈپو لکھنؤ سنہ ندارد
۳- نشاط روح	اصغر	تیسرا متداول اڈیشن ملک بک ڈپو لاہور
۴- سرود زندگی	اصغر	طبع اول انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۵ء
۵- سرود زندگی	اصغر	متداول اڈیشن تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور سنہ ندارد
۶- رباعیات رواں (مقدمہ)	اصغر	عطر چند کپور چند لاہور سنہ ندارد
۷- یادگار نسیم	مولفہ و مرتبہ اصغر (مقدمہ)	انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۰ء
۸- تحفہ جرمنی	مرتبہ و مصنفہ اصغر	انڈین پریس الہ آباد ۱۹۳۳ء
۹- تحفہ آسٹریلیا	ایضاً	ایضاً - (سنہ ندارد)
۱۰- تحفہ جاپان	ایضاً	ایضاً - ۱۹۲۹ء
۱۱- تحفہ مصر و حبش	ایضاً	ایضاً - ۱۹۲۹ء
۱۲- پیام زندگی (انتخاب مراثی)	مقدمہ اصغر	عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور ۲۷-۱۹۲۶ء
۱۳- اردو شاعری کی ذہنی تاریخ دہلی اور لکھنؤ اسکول	جناب اصغر	زمانہ ستمبر ۱۹۲۹ء
۱۴- مقدمہ مطلع انوار محشی مہاراج بہادر دہلوی	ایضاً	محبوب المطابع دہلی طبع اول ۱۹۲۹ء
۱۵- غیر مطبوعہ کلام	جناب اصغر	زمانہ جون ۱۹۲۰ء
۱۶- ایضاً	ایضاً	زمانہ دسمبر ۱۹۲۰ء
۱۷- ایضاً	ایضاً	زمانہ مئی جون ۱۹۲۱ء
۱۸- ایضاً	ایضاً	زمانہ کانپور فروری ۱۹۲۲ء
۱۹- ایضاً	ایضاً	زمانہ کانپور اپریل ۱۹۲۲ء
۲۰- ایضاً	ایضاً	زمانہ ستمبر ۱۹۲۳ء

۲۱- غیر مطبوعہ کلام	جناب اصغر	زمانہ کانپور دسمبر ۱۹۲۳ء
۲۲- بابو چنتامنی گھوش	مضمون اصغر	زمانہ کانپور ستمبر ۱۹۲۸ء
۲۳- رباعیات رواں پر ایک سرسری نظر	اصغر	زمانہ کانپور نومبر ۱۹۲۸ء
۲۴- مکتوب اصغر		نیرنگ خیال لاہور جون ۱۹۲۷ء
۲۵- غیر مطبوعہ کلام	جناب اصغر	نیرنگ خیال لاہور عید نمبر ۱۹۲۷ء
۲۶- ایضاً	ایضاً	نیرنگ خیال لاہور اپریل مئی ۱۹۳۲ء
۲۷- ایضاً	ایضاً	نیرنگ خیال لاہور سالنامہ ۱۹۳۳ء
۲۸- ایضاً	ایضاً	نیرنگ خیال لاہور سالنامہ ۱۹۳۴ء
۲۹- انجمن اردوی معلیٰ (سلسلۂ استفسارات)	مقالہ اصغر	سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۲۶ء
۳۰- غیر مطبوعہ کلام	جناب اصغر	سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۳۶ء
۳۱- غیر مطبوعہ کلام	ایضاً	رسالہ اضطراب لکھنؤ جنوری فروری ۱۹۳۱ء
۳۲- اردو کی نشوو نما	مضمون اصغر	رسالہ اضطراب لکھنؤ مارچ اپریل ۱۹۳۱ء
۳۳- غیر مطبوعہ کلام	جناب اصغر	رسالہ اضطراب لکھنؤ مارچ اپریل ۱۹۳۱ء
۳۴- غیر مطبوعہ کلام	ایضاً	علی گڑھ میگزین مارچ اپریل ۱۹۲۲ء
۳۵- ایضاً	ایضاً	علی گڑھ میگزین تعطیلات نمبر مئی تا اگست ۱۹۲۲ء
۳۶- ایضاً	ایضاً	علی گڑھ میگزین جنوری ۱۹۲۵ء
۳۷- ایضاً	ایضاً	ہمایوں لاہور ستمبر ۱۹۲۹ء
۳۸- ایضاً	ایضاً	ہمایوں لاہور جنوری ۱۹۳۲ء
۳۹- ایضاً	ایضاً	اصغر از عبدالشکور سعید برادرز الہ آباد ۱۹۳۵ء
۴۰- ایضاً	ایضاً	الناظر لکھنؤ اکتوبر دسمبر ۱۹۲۵ء
۴۱- ایضاً	ایضاً	بہارستان لاہور نومبر ۱۹۲۶ء
۴۲- ایضاً	ایضاً	مقدمہ نشاط روح دسمبر ۱۹۲۵ طبع اول
۴۳- ایضاً	ایضاً	جہان بین اثر لکھنوی بحوالہ جام جہاں نما لکھنؤ
۴۴- مضامین اصغر	ایضاً	ہندوستانی الہ آباد ۲۴ جلدیں از جنوری ۱۹۳۱ء تا دسمبر ۱۹۳۶ء
۴۵- دیباچہ تحفۂ جرمنی	ایضاً	تحفۂ جرمنی، انڈین پریس الہ آباد ۱۹۲۹ء

۴۶- خطوط بنام مولانا عبدالماجد دریابادی	جناب اصغر	نقوش لاہور خطوط نمبر ۱۹۶۸ء
۴۷- خطوط بنام محی الدین قادری زور	ایضاً	نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم
۴۸- خطوط بنام جناب جلیل قدوائی	ایضاً	نقل از خطوط جناب جلیل قدوائی
۴۹- خطوط بنام نواب سید شمس الحسن	ایضاً	نقل از خطوط جناب شمس الحسن
۵۰- مکاتیب بنام جناب عبدالماجد دریابادی	ایضاً	اصل (متن) اور دو نقول
۵۱- تحفہ چمن	مرتبہ و مرتبۂ اصغر	انڈین پریس الہ آباد
۵۲- تحفہ لندن	ایضاً	انڈین پریس الہ آباد ۱۹۲۸ء
۵۳- تحفہ فرانس --- تحفہ امریکا	ایضاً	انڈین پریس الہ آباد

۲- کتابیں جن میں اصغر پر مضامین شائع ہوئے ہیں :

۱- اصغر	عبدالشکور	اسرار کریمی پریس الہ آباد ۱۹۴۵ء
۲- انتخاب اصغر	جمیل نقوی	اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۵۲ء
۳- اصغر گونڈی کی شاعری	سرکوب الہ آبادی	برکات اکبر پریس الہ آباد (سنہ ندارد)
۴- انتقادیات	نیاز فتحپوری	
۵- تذکرہ شعرائے اردو	نظیر لدھیانوی	عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۵۳ء
۶- تخلیق و تنقید	ڈاکٹر عبدالسلام	اردو اکیڈمی سندھ کراچی طبع سوم ۱۹۶۷ء
۷- اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین خان	آئینہ ادب لاہور
۸- سرگذشت	عبدالمجید سالک	
۹- بیسویں صدی کے چند اکابر غزل گو	ڈاکٹر محمد اسلام	نظامی پریس لکھنؤ طبع اول ۱۹۶۶ء
۱۰- چند شخصیتیں چند تاثرات	ڈاکٹر محی الدین قادری زور	اردو اکیڈمی سندھ کراچی طبع اول ۱۹۶۲ء
۱۱- گنج ہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	تھری فرینڈز پبلشر راولپنڈی طبع سوم ۱۹۳۹ء
۱۲- غزل اور متغزلین	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	اردو مرکز لاہور طبع اول دسمبر ۱۹۵۳ء
۱۳- غزل اور مطالعۂ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	
۱۴- دور حاضر کی غزل گوئی	ڈاکٹر عندلیب شادانی	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور طبع اول ۱۹۵۱ء
۱۵- مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر اعجاز حسین	اردو اکیڈمی سندھ کراچی طبع اول (پاکستان) ۱۹۵۶ء
۱۶- جہاں بین	نواب ، اثر لکھنوی	دانش محل لکھنؤ طبع اول ۱۹۵۰ء

کتاب	مصنف	ناشر
۱۷- ادب کیا ہے	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	ادارہ فروغ اردو لکھنؤ طبع دوم ۱۹۵۹ء
۱۸- جدید غزل	رشید احمد صدیقی	مطبوعہ ۱۹۵۵ء
۱۹- اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	اردو مرکز پٹنہ طبع دوم ۱۹۵۲ء
۲۰- تنقیدیں اور خاکے	جلیل احمد قدوائی	اردو اکیڈمی سندھ کراچی طبع اول ۱۹۵۹ء
۲۱- تہذیب و تخلیق	سجاد باقر رضوی	مکتبۂ ادب جدید لاہور طبع اول ۱۹۶۶ء
۲۲- مقالات احسان	مرزا احسان احمد	مطبع معارف اعظم گڑھ طبع اول ۱۹۶۸ء
۲۳- یادوں کی دنیا	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ طبع اول ۱۹۶۷ء
۲۴- اردو شاعری میں اصغر کی انفرادیت (مقالہ ایم اے)	فضل القدیر	ڈھاکہ یونیورسٹی ۱۹۶۹ء

۳- دیگر کتب جن سے بطور خاص استفادہ کیا گیا :

کتاب	مصنف	ناشر
۱- مکاتیب جگر	تسکین قریشی	یونین پرنٹنگ پریس دہلی طبع اول ۱۹۶۲ء
۲- جگر کے خطوط	ڈاکٹر محمد اسلام	نظامی پریس لکھنؤ طبع اول ۱۹۶۵ء
۳- جگر مرادآبادی حیات اور شاعری	ایضاً	سرفراز پریس لکھنؤ طبع اول ۱۹۶۶ء
۴- جگر معاصرین و مخلصین کی نظر میں	ایضاً	نظامی پریس لکھنؤ طبع اول ۱۹۶۶ء
۵- یادگار جگر	ایضاً	قومی پریس لکھنؤ طبع اول ۱۹۶۳ء
۶- جگر فن اور شخصیت	شارب ردولوی	شاہین پبلشرز الہ آباد طبع اول ۱۹۶۱ء
۷- جگر اور اسکی شاعری	انور عارف	جاوید پریس کراچی طبع اول ۱۹۶۶ء
۸- مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۲ء
۹- روایت اور تجربے	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	اردو اکیڈمی سندھ کراچی طبع اول ۱۹۵۹ء
۱۰- نئے ادبی رجحانات	ڈاکٹر اعجاز حسین	

۱۱- مذہب اور شاعری	ڈاکٹر اعجاز حسین	اردو اکیڈمی سندھ کراچی طبع اول ۱۹۵۵ء
۱۲- دہلی کا دبستان شاعری	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۲ء
۱۳- لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	اردو مرکز - لاہور
۱۴- دیوان جی	ظریف لکھنوی	
۱۵- ادب اور سماج	سید احتشام حسین	کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی طبع اول ۱۹۴۸ء
۱۶- ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	
۱۷- اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۶۵ء
۱۸- اردو غزل کی نشوو نما	ڈاکٹر رفیق حسین	
۱۹- اردو غزل کے پچاس سال	ڈاکٹر عبدالاحد خان خلیل	
۲۰- اردو غزل گوئی	فراق گورکھپوری	
۲۱- تصوف اور اردو شاعری	صفی حیدر دانش	سندھ ساگر اکادمی لاہور ۱۹۴۸ء
۲۲- تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	مطبوعہ ۱۹۴۷ء
۲۳- تاثرات و تعصبات	پروفیسر ظہیر صدیقی	زیکو پریس ڈھاکا طبع اول ۱۹۶۲ء
۲۴- مطالعہ یلدرم	سید معین الرحمن	نذر سنز لاہور طبع اول ۱۹۷۱ء
۲۵- نقد عبدالحق	ایضاً*	نذر سنز لاہور طبع اول ۱۹۶۸ء
۲۶- فن تنقید اور تنقیدی مضامین	نجم الہدیٰ	مگندھ پریس ضلع پور پٹنہ (سنہ ندارد)
۲۷- عملی تنقید جلد اول	کلیم الدین احمد	لیبل لیتھو پریس پٹنہ طبع اول ۱۹۶۳
۲۸- فن اور تنقید	انور کمال حسینی	یونین پرنٹنگ پریس دہلی طبع اول ۱۹۷۰ء
۲۹- افادات مہدی	ایم مہدی حسن	شیخ مبارک علی لاہور طبع چہارم ۱۹۳۹ء
۳۰- انشائیہ	ڈاکٹر آدم شیخ	رحمی پریس بمبئی طبع اول ۱۹۶۵ء
۳۱- ہم نفسان رفتہ	رشید احمد صدیقی	آئینہ ادب لاہور طبع اول ۱۹۶۵ء
۳۲- کاشف الحقائق	سید امداد امام اثر	مکتبہ معین الادب لاہور طبع دوم ۱۹۵۶ء
۳۳- شعلۂ طور	جگر مرادآبادی	ادارہ فروغ اردو لاہور طبع اول ۱۹۶۰ء
۳۴- آتش گل	ایضاً*	فیروز پرنٹنگ پریس لاہور (سنہ ندارد)

۳۵- تذکرہ جگر	محمود علی خان	اردو اکیڈمی سندھ کراچی طبع اول ۱۹۶۱ء
۳۶- حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خان	آئینہ ادب لاہور طبع اول ۱۹۶۳ء
۳۷- فانی اور ان کی شاعری	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	مکتبہ ماحول کراچی طبع اول ۱۹۶۳ء
۳۸- فانی	پروفیسر عبدالشکور	کتابی دنیا لمٹیڈ دھلی طبع اول ۱۹۳۷ء
۳۹- تاریخ و تنقید	حامد حسن قادری	لکشمی نرائن اگروال آگرہ طبع دوم ۱۹۳۷ء
۴۰- مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط	خلیق انجم	مکتبہ برہان جامع مسجد دھلی طبع اول ۱۹۶۲ء
۴۱- وحدت الوجود والشہود	شاہد الحق صدیقی	ایجوکیشنل پریس کراچی طبع اول ۱۹۶۳ء
۴۲- ھندستان کی پہلی اسلامی تحریک	مسعود عالم ندوی	مرتضیٰ پریس رام پور طبع سوم طبع سوم (سنہ ندارد)
۴۳- تحریک ریشمی رومال	مولانا حسین احمد مدنی	اردو پریس لاہور طبع اول ۱۹۶۰ء
۴۴- مسلمانوں کا روشن مستقبل	سید طفیل احمد منگلوری	
۴۵- تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت	سید ھاشمی فرید آبادی	
۴۶- عمدۃ السلوک (حصہ دوم)	سید زوار حسین	ایجوکیشنل پریس کراچی طبع دوم ۱۹۶۰ء
۴۷- خواجہ بندہ نواز کا تصوف اور سلوک	ڈاکٹر میر ولی الدین	یونین پرنٹنگ پریس دھلی طبع اول ۱۹۶۶ء
۴۸- رموز عشق	ایضاً	ایضاً
۴۹- شریعت و طریقت	محمد دین حنفی چشتی	کوھستان پریس راولپنڈی (سنہ ندارد)
۵۰- شیخ عبدالقدوس گنگوھی اور انکی تعلیمات	اعجاز الحق قدوسی	ایجوکیشنل پریس کراچی طبع اول ۱۹۶۱ء
۵۱- تفہیم القرآن (جلد اول تا چہارم)	سید ابوالاعلیٰ مودودی	اردو پریس میکلوڈ روڈ لاہور ۱۹۵۸ء
۵۲- قرآن مترجم (بندو ترجمہ)	شاہ رفیع الدین رح، اشرف علی تھانوی رح	حاجی ملک دین محمد لاہور ۱۹۳۹ء
۵۳- قرآن مترجم (محشی)	شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا شبیر احمد عثمانی	مکتبہ دورانی اچھرہ لاہور ۱۳۷۸ھ

۵۴- جگر آثار و افکار (مقالہ پی ایچ ڈی)	ڈاکٹر احمر رفاعی	سندھ یونیورسٹی حیدرآباد ۱۹۶۹ء	
۵۵- آل احمد سرور (مقالہ ایم اے)	مسرت جبین مرزا	پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۶۷ء	
۵۶- جگر صاحب (غیر مطبوعہ)	سید رشید احمد		
۵۷- جگر مرادآبادی (غیر مطبوعہ)	نواب سید شمس الحسن		
۵۸- تفہیم ہجری و عیسوی	ابوالنصر محمد خالدی	انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی ۱۹۵۲ء	
۵۹- جامعہ کی کہانی	عبدالغفار مدھولی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دھلی طبع اول ۱۹۶۵ء	
۶۰- محشر خیال		آئینہ ادب لاہور طبع سوم ۱۹۵۷ء	
۶۱- گنجینہ ادب حصہ نثر	محمد علم الدین سالک	پنجاب یونیورسٹی پریس لاہور	

۳- رسائل و جرائد جن میں اصغر پر مضامین شائع ہوئے :

۱- سرود زندگی	اظہر علی آزاد	الناظر لکھنؤ جولائی ۱۹۳۶ء
۲- نیاز صاحب کی جراتِ بیجا	عشرت گونڈوی	الناظر لکھنؤ ستمبر ۱۹۳۶ء
۳- سرود زندگی	اظہر علی آزاد	الناظر لکھنؤ اکتوبر نومبر ۱۹۳۶ء
۴- اصغر کی جلالت قدر اور آزاد	منشی سراج احمد علوی	الناظر لکھنؤ جولائی ۱۹۳۷ء
۵- محاکمہ	جعفر علی خان اثر	الناظر لکھنؤ ستمبر ۱۹۳۷ء
۶- اصغر کی شاعری	سٹر ھادی حسن / اڈیٹر ہزار داستان	سہیل علی گڑھ دسمبر ۱۹۲۶ء
۷- سرود زندگی	خلیل الرب صدیقی	سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۳۶ء
۸- نوائے آفرین سرود زندگی کی اشاعت پر	محمد یحییٰ اعظم گڑھ	سہیل علی گڑھ جنوری ۱۹۳۶ء
۹- تنقید نشاط روح پر ایک	مرزا احسان احمد	نگار نومبر ۱۹۲۸ء
۱۰- اصغر کے شعر		نگار فروری ۱۹۳۳ء
×۱۱- اصغر پر ایک تنقیدی نظر	رضی الدین احمد	×نگار مئی ۱۹۳۳ء
×۱۲- اصغر گونڈوی کی شاعری	خواجہ احمد فاروقی	نگار ~~اکتوبر ۱۹۳۳ء~~ اپریل ۱۹۳۷ء
۱۳- سرود زندگی		نگار مارچ ۱۹۳۶ء

۱۴- اصغر کی شاعری	خواجہ احمد فاروقی	نگار اپریل ۱۹۳۷ء
۱۵- نشاط روح اور سہیل	کبیر احمد جائسی	نگار ستمبر ۱۹۵۷ء
۱۶- اصغر اور سہیل اثر کی نظر میں	حیات اللہ انصاری	نگار فروری ۱۹۵۹ء
۱۷- جگر کے شاعرانہ مرتبہ کا تعین	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	نگار فروری ۱۹۶۷ء
۱۸- اصغر کا تصوف	سعادت نظیر	نگار ۱۹۶۷ء
۱۹- اصغر گونڈوی	عابد علی عابد	نقوش ۴۷-۴۸ ۱۹۵۵ء
۲۰- اصغر گونڈوی	صغیر احمد صدیقی	نقوش شخصیات نمبر جلد دوم ۱۹۵۶ء
۲۱- اصغر کی شاعری (تبصرہ نشاط روح)		اردو اپریل ۱۹۲۶ء
۲۲- یادگار نسیم (تبصرہ)	مولوی عبدالحق	اردو اکتوبر ۱۹۳۰ء
۲۳- اصغر	مولوی عبدالحق	اردو جنوری ۱۹۳۷ء
۲۴- اصغر کی یاد میں	جلیل احمد قدوائی	اردو اکتوبر ۱۹۵۱ء
۲۵- اصغر کا ایک شعر		اردو جنوری ۱۹۵۸ء
۲۶- کلام اصغر	مرزا احسان احمد	علی گڑھ میگزین دسمبر ۱۹۲۱ء
۲۷- پیغام اصغر	بسلسلہ یوم اصغر	علی گڑھ میگزین اپریل ۱۹۳۷ء
۲۸- ماتم اصغر	مولانا احسن مارہروی	علی گڑھ میگزین اپریل ۱۹۳۷ء
۲۹- علی گڑھ تحریک نمبر		علی گڑھ میگزین ۱۹۶۰ء
۳۰- انتخاب از دیوان اصغر	مولانا حسرت موہانی	اردوئے معلیٰ جون ۱۹۳۰ء
۳۱- نشاط روح	جگت موہن لال رواں	زمانہ اکتوبر ۱۹۲۶ء
۳۲- تحفۂ جاپان، مصر و حبش وغیرہ (تبصرہ)		زمانہ دسمبر ۱۹۲۹ء
۳۳- سرود زندگی (تبصرہ)		زمانہ مئی ۱۹۳۵ء
۳۴- اصغر مرحوم		زمانہ جنوری ۱۹۳۷ء
۳۵- کلام اصغر	سید مقبول حسین احمد پوری	ہمایوں اگست ۱۹۳۷ء
۳۶- اصغر کی وفات سے مطلع ہونے پر		ایضاً
۳۷- اصغر گونڈوی	محفل ادب	ہمایوں جولائی ۱۹۵۰ء
۳۸- نشاط روح پر ایک نظر	مرزا جعفرعلی خاں اثر	مرقع مارچ ۱۹۲۶ء

۳۹- نشاط روح پر ایک نظر (تصحیح)	مرزا جعفرعلی خاں اثر	مرقع مئی ۱۹۲۶ء
۴۰- کلام اصغر اور احسان و اثر	ناطق لکھنوی	مرقع مئی ۱۹۲۶ء
۴۱- نشاط روح کا دوسرا رخ	اثر لکھنوی	مرقع مئی ۱۹۲۶ء
۴۲- گمراہ رہبر (تنقید اور اس کا جواب)	اثر لکھنوی	مرقع نومبر ۱۹۲۶ء
۴۳- حضرت اصغر اور ان کی شاعری	خواجہ مسعود ذوقی	مرقع اکتوبر ۱۹۲۶ء
۴۴- عکس تحریر		مرقع مئی ۱۹۲۷ء
۴۵- بعض مشاہیر انسان کی حیثیت سے (اصغر گونڈوی)	ذوقی	مرقع جون ۱۹۲۸ء
۴۶- اصغر گونڈوی کا رنگ تغزل	اسلوب احمد انصاری	سالنامہ اوراق لاہور ۱۹۶۸ء
۴۷- اصغر کی انفرادیت	یحییٰ امجد	ایضاً*
۴۸- اصغر گونڈوی کی شخصیت اور شاعری	مظہر عزیز	ساقی دسمبر ۱۹۳۱ء
۴۹- اصغر کی شاعری (تبصرہ نشاط روح)		معارف اکتوبر ۱۹۳۵ء
۵۰- ایضاً*		ماہ نو جون ۱۹۵۰ء
۵۱- مطالعہ اصغر	عابد رضا بیدار	آجکل جون ۱۹۵۷ء
۵۲- اصغر گونڈوی	سجاد باقر رضوی	ہم قلم دسمبر ۱۹۶۰ء
۵۳- جگر لخت لخت	جلیل احمد قدوائی	العلم اکتوبر ۱۹۶۲ء (مسلسل ۸ شمارے)
۵۴- افکار و حوادث	عبدالمجید سالک	روزنامہ زمیندار لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء
۵۵- اصغر گونڈوی	مجنوں گورکھپوری	نیا دور ۲۳-۲۴ ۱۹۶۱ء
۵۶- اصغر گونڈوی	سید رشید احمد	چٹان شمارہ ۱۰ جولائی ۱۹۶۷ء جامعہ دہلی اپریل اور مئی ۱۹۶۷ء
۵۷- اصغر کی صوفیانہ شاعری	شاہد احمد دہلوی	ساقی مئی ۱۹۳۶ء
۵۸- جگر لاہور میں	ڈاکٹر منوہر سہائے انور	نگارش امرتسر جگر نمبر
۵۹- اصغر گونڈوی		نقوش لاہور نمبر فروری ۱۹۶۲ء
۶۰- عصر شیخ	عزیز احمد	اردو ادب (۱) مکتبہ جدید لاہور کراچی

۶۱- سرود زندگی اور آزاد کاکوروی	چودھری حامد حسین	الناظر جنوری ۱۹۳۷ء
۶۲- عذر اصغر	حفیظ دمیهی	علی گڑھ میگزین اپریل ۱۹۳۷ء
۶۳- سرود زندگی (تبصرہ)	مولوی عبدالحق	اردو اپریل ۱۹۳۵ء

۵- زندہ شخصیات ، خطوط ، مکاتیب -- بالمشافہ گفتگو :

(استفسارات)

۱- سید رشید احمد	اپوسرائے فیض آباد (یوپی)	ملاقات اپوسرائے فیض آباد ۔ مراسلت
۲- پروفیسر رشید احمد صدیقی	ذاکر باغ علی گڑھ	نجی خطوط
۳- مولانا غلام رسول مہر	مسلم ٹاؤن لاہور	ملاقات مسلم ٹاؤن لاہور نجی خطوط
۴- قیصر مرادآبادی	دستگیر کالونی کراچی	ملاقات دستگیر کالونی کراچی نجی خط
۵- جلیل احمد قدوائی		ملاقات حسین ڈسلوا ھاؤس کراچی نجی خط اور بالمشافہ گفتگو
۶- مولانا شہاب مالیرکوٹلوی	بمبئی	نجی خط
۷- جناب تسکین قریشی سرورجی	محلہ بنی اسرائیل میرٹھ	نجی خط
۸- مولانا سراج الحق مچھلی شہری	۳۶۵ حسن منزل الہ آباد	ملاقات لاہور ۔ نجی خطوط ۔ بعض نادر تحریریں
۹- مولانا سید فرزند علی	ایف سی کالج لاہور	ملاقات لاہور ۔ بطریق سوال و جواب بالمشافہ گفتگو
۱۰- ڈاکٹر محمد اسلام بحوالہ بابو بدیشوری پرشاد تقدیر		ملاقات کراچی ۔ بالمشافہ گفتگو
۱۱- جناب بشیر احمد صدیقی	پرنسپل عائشہ بوانی کالج لاہور	ملاقات ناظم آباد کراچی ۔ بالمشافہ گفتگو
۱۲- پرنسپل عبدالشکور	گھیر بھیر شاہ آباد بریلی	خط
۱۳- مولانا افقر موہانی	۱۱ لاٹے کلی لکھنو	خطوط
۱۴- جناب نیاز احمد گونڈوی	جناب اصغر کی بہن کے بھتیجے	خطوط
۱۵- جناب نہال احمد گونڈوی	ذاتی گنج لکھنو	ملاقات اپوسرائے فیض آباد ۔ زبانی گفتگو

۱۶- اھلیہ اصغر و جگر (نسیم جگر)		جواب استفسارات
۱۷- مولانا عبدالغنی نرگس	حسن مرہڑ پنڈی	نجی گفتگو
۱۸- خلیل احمد عباسی	۵۷ بی سٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی	نجی گفتگو
۱۹- لطیف احمدعباسی	ایضاً	ایضاً
۲۰- رئیس احمد عباسی	گورنمنٹ کالج ساہیوال	ایضاً
۲۱- مولانا شاھدحسن سوزداری	لال کرتی پنڈی	ایضاً
۲۲- شمس الہدیٰ قیصی الفاروقی	فیض آباد	سول لائنز فیض آباد ـ ملاقات زبانی گفتگو
۲۳- حکیم یوسف حسین مدیر نیرنگ خیال	جامع مسجد راولپنڈی	ملاقات اور زبانی گفتگو جون ۱۹۶۹ء
۲۴- جناب احسان دانش	انار کلی لاھور (دولتکدہ جناب احسان)	ملاقات ۷ اپریل ۱۹۷۰ء
۲۵- جناب ابن حسن قیصر	کراچی	ملاقات ۲۵ مئی ۱۹۶۹ء
۲۶- محمدصدیق صاحب (مرید مولاناعبدالشکور الہ آباد دائرہ شاہ محمدی)	۱۹۵۳/۲ عزیز آباد	ملاقات ۲۸ مئی ۱۹۶۹ء